بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
تشریحاتِ
ترمذی
تالیف
حضرت مولانا کمال الدین المسترشد
خادم الاحادیث النبویہ
جامعہ اسلامیہ مخزن العلوم
جلد ششم
قدیمی کتب خانہ
مقابل آرام باغ۔ کراچی
تشریحات ترمذی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تشریحات ترمذی

تالیف

حضرت مولانا کمال الدین المسترشد

استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ کلفٹن کراچی

جلد ششم

قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ۔ کراچی

نام کتاب: **تشریحاتِ ترمذی**

تالیف: حضرت مولانا کمال الدین المسترشد

کمپوزنگ: مولانا شمس الحق 0300-2426745

ناشر

قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ کراچی

فون: 021-32627608
021-32623782

فہرست ابواب تشریحات ترمذی

تمت فهرس المجلد السادس

ویلیه المجلد السابع اوله

"باب ماجاء فی اشراط الساعة"

(ان شاء الله)

"المجلد الثانی" من الجامع للحافظ الامام ابی عیسیٰ الترمذی رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً

ابواب الأطعمة

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اطعمہ، طعام کی جمع ہے جس کے معنی کھانے اور خوراک کے ہیں یعنی ہر وہ چیز جو کھائی جائے اور جسم کی بقاء کا اس پر مدار ہو، تاہم اہل حجاز اور اہل عراق عام طور پر اس کا اطلاق گیہوں پر کرتے ہیں۔

اس مادہ ط، ع، م، میں چکھنے، قوت حاصل کرنے اور لذّت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں جس سے وجہ تسمیہ واضح ہو جاتی ہے۔

چونکہ طعام کے معنی میں کافی توسّع ہے لغۃً بھی اور اصطلاحاً بھی، اس لئے مشروبات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ آیت نمبر: ۲۴۹ میں ہے "فمن شربَ منہ فلیس منّی، ومن لم یطعمہ فانّہ منّی" الآیۃ۔

(حضرت طالوت نے فرمایا تو جس نے پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے)

چنانچہ خطیب المفسّرین ابو سعودؒ "ومن لم یطعمہ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں "ومن لم یطعمہ" ای لم یذقہ، من طعم الشیٔ اذا ذاقہ ماکولاً کان او مشروباً او غیرھما، یعنی طعم الشیٔ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کو چکھا جائے خواہ وہ چیز کھانے کی ہو یا پینے کی، پھر اس کی تائید میں ایک شعر بھی ذکر کیا ہے، گو کہ یہاں چکھنے سے مراد نگلنا ہے کیونکہ زبان پر رکھنے کو چکھنا کہتے ہیں مگر اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (تدبّر)

علیٰ ہذا قرآن کی اس آیت پر پادری کا اعتراض غلط ہے کہ بجائے "لم یطعمہ" کے "لم یشربہ" کہنا چاہئے تھا، اور وجہ غلطی ظاہر ہے کہ اس نے طعم کو صرف کھانے کی اشیاء تک محدود سمجھ کر اعتراض کیا ہے۔

ویسے تو بہت سی اشیاء ہیں جنہیں کھایا جاتا ہے اور کھایا جا سکتا ہے، مگر شرعی اعتبار سے صرف وہ اشیاء

قابلِ تغذی اور قابلِ تناول ہیں جو انسانی مقصد میں معاون ثابت ہوتی ہیں یا کم از کم مضر نہیں، چونکہ ہر انسان کا نصب العین اللہ عزّ وجلّ کی خوشنودی کا حصول ہونا چاہئے اور یہ مقصد اعلیٰ پاکیزہ اعمال اور اخلاق حسنہ سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے اور یہی انسان کی خلقت کا بھی مقصد ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ نبوّت میں بھی یہ شامل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''ویُحِلُّ لهُم الطیّباتِ ویُحرّمُ علیهم الخبائث''۔ (سورۃ الاعراف: ۱۵۷) (اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں)

لہٰذا جو اشیاء قوتِ علمیہ اور قوّتِ عملیہ کے بڑھانے کا ذریعہ ہیں وہ تو جائز ہیں اور جو ان دونوں قوّتوں کو ضرر پہنچائے وہ ناجائز ہوگی، چنانچہ مسکرات ومنشیات قوّتِ علمیہ کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے اور درندے وغیرہ قوّتِ عملیہ کو ضرر رساں ہونے کی بناء پر حرام وممنوع قرار دے دیئے گئے۔

کسی چیز کی تحریم سے غرض تنگی پیدا کرنا ہرگز نہیں بلکہ انسان کو گندے اعمال واخلاق سے بچانا ہے لہٰذا اگر کوئی چیز کلی طور پر خراب ہے تو شریعت نے اسے بالکلیہ حرام قرار دیا ہے جیسا کہ خنزیر اور باقی درندے، اور جو چیز عمومی ومجموعی طور پر پاک ہے مگر اس میں فاسد اور گندہ مادہ ہے تو اس کا فقط وہی گندہ حصہ ممنوع قرار دیدیا ہے جیسے دم مسفوح لہٰذا حلال جانور کا وہ خون جو رگوں میں ہوتا ہے اور چلتا رہتا ہے اسے خارج کرنے کا حکم دیا کہ اس میں ایسی باطنی سمیت وجراثیم پائے جاتے ہیں کہ ان سے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں تاہم بعض اشیاء میں خوبیاں وخامیاں دونوں شریک ہوتی ہیں ایسی چیزوں کو ناپسندیدہ اور مکروہ قرار دے دیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی برکات کا مشاہدہ آج کی دنیا میں کوئی مشکل نہیں۔ آج جتنی نئی نئی گندی بیماریاں جنم لیتی ہیں تو ان کا نقطہ آغاز وہ ممالک ہوتے ہیں جہاں اسلامی طریقہ سے کھانے کا اہتمام نہیں کیا جاتا گو کہ مسلمانوں کی لاپرواہی یا اختلاط کی وجہ سے وہ امراض اسلامی دنیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں مگر شروعات بہرحال غیر اسلامی ممالک سے ہوتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تو پوری زندگی مشعلِ راہ اور ہلاکتوں سے بچنے کا محفوظ ترین راستہ ہے جس پر چلنا دین ودنیا دونوں کی حفاظت کی ضمانت ہے، تاہم ابواب الاطعمہ اور ابواب الاشربہ اور ان کے مابعد کے ابواب حیاتِ طیّبہ اپنانے کے زرین ابواب ہیں ان کی ایک ایک کمیت اور ایک ایک کیفیت تمام دنیا کے طبیبوں اور ڈاکٹروں کے تجربات وہدایات سے زیادہ قابلِ توجہ اور قابلِ عمل ہے۔

باب ماجاء علیٰ ما کان یأکل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ؟

عن انسٍ رضی اللّٰہ عنہ قال:ماأکل النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی خِوانٍ و لاسُکرّجۃِ ولاخُبِزلہ مرقّق الحدیث۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سینی پرنہیں کھایااور نہ چھوٹی طشتری میں کھایااور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے چپاتی پکائی گئی۔ میں (یونس راوی) نے قتادہ سے کہا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس چیز پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے؟انہوں نے فرمایا چمڑے کے دسترخوان پر۔

لغات:۔قولہ ''خِــوان'' بکسرالخاء بروزنِ علاج اور یہی لغت مشہور ہے تاہم خاء کاضمّہ پڑھنا بھی جائز ہے یعنی بروزنِ غراب، یہ معرّب ہے اگر چہ قدیم لغتِ عربی میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے، یہ عموماً دھات کی بنی ہوئی بلکہ پیتل کی بنی ہوئی میزنماچوکی ہوتی تھی یایوں کہنا چاہئے کہ چھوٹا ساتخت ہوتا تھا جس پر کھانا رکھنے سے زیادہ جھکنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، چونکہ اسکے اصل مادہ میں خیانت کے معنی پائے جاتے ہیں جس کے معنی نقصان اورکم کرنے کے ہیں اسلئے اسکوخوان سے مسمّی کیا گیا کہ اس پر کھانے کی جو چیز رکھی جاتی ہے وہ کم اورناقص ہوجاتی ہے بلکہ کبھی ختم بھی ہوجاتی ہے۔

قــولــہ" سـکـرّجۃِ" بضم السیّن والکاف والراء المشدّ دۃ یعنی پے درپے تین ضموں اورراء کی تشدید اورجیم کے فتحہ کے ساتھ، چھوٹی رکابی اورتھالی کو کہتے ہیں جس میں اکثر چٹنی، رائتہ اورکھٹی چیزیں رکھی جاتی ہیں،جن سے کھانے کی خواہش بڑھ جاتی ہے، یہ بھی فارسی کالفظ ہے۔

قولہ "ولاخُبز" صیغہ مجہول ہے۔قولہ "لہ"ای للنبّی صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

قـولہ"مرقّق" باب تفعیل ترقیق سے اسمِ مفعول کا صیغہ ہے رقّت کے معنی نرم اورنازک کے ہیں چونکہ چپاتی بھی نرم ونازک ہوتی ہے اسلئے اس کومرقق سے تعبیر کیا۔قـولـہ"فـعلی ما"ای فعلی ای شیٔ ۔اس نسخے پرتو کوئی اشکال نہیں لیکن بعض روایات میں ''فعلام'' ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ حرفِ جرجب ''ما'' استفہامیہ پر داخل ہوجائے تو کثرتِ استعمال کی وجہ سے الف گرجاتا ہے گوکہ الف پڑھنااور باقی رکھنا بھی جائز ہے۔

قولہ"السُفرَ"بضم السین وفتح الفاء ''سفرۃ'' کی جمع ہے جودراصل مسافرکیلئے گول دسترخوان میں لپیٹے ہوئے کھانے کو کہتے ہیں مگر پھراس کا طلاق چمڑے کے دسترخوان پراور پھر مزید توسع سے مطلق دسترخوان

پر ہونے لگا خواہ وہ کپڑے وغیرہ کا کیوں نہ ہو۔

تشریح:۔ چونکہ اسلام ایک معتدل دین کا نام ہے اسلئے اس کا ہر فعل وعمل افراط وتفریط کے درمیان ہوتا ہے، کھانے کے اصول سے بھی اس کی نمایاں خصوصیت عیاں ہے کہ زمین پر کھانا رکھنے سے ایک طرف ضیاع کا امکان رہتا ہے اور دوسری جانب جانوروں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے جبکہ کسی اونچی چیز پر رکھ کر کھانے سے متکبرین کی مشابہت لازم آتی ہے کیونکہ یہ لوگ راحت وسہولت اور زیادہ کھانے کی غرض سے زمین سے اونچا کرنے کی خاطر میز نما تخت پر کھانا رکھ کر کھاتے تاکہ سینہ اور منہ کے قریب ہو۔اس سے بچتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی طریقہ اختیار فرمایا جو دونوں برائیوں کے درمیان ہے چونکہ ہر فضیلت دو رذیلتوں کے درمیان ہوتی ہے لہٰذا کہا جائے گا کہ دسترخوان بچھا کر اس پر کھانا میانہ وعادلانہ طریقہ ہے۔اس سے ایک طرف تواضع حاصل کی جاسکتی ہے اور دوسری جانب جانوروں اور متکبرین کی مشابہت سے بچا جاسکتا ہے۔ نیز کھانے اور فائدے کی چیز کی توہین بھی نہیں کرنی چاہئے لہٰذا کھانا زمین پر بلا دسترخوان رکھ کر نہیں کھانا چاہئے اسی طرح اگر لقمہ یا کوئی ٹکڑا گرے گا تو بجائے مٹی کے دسترخوان پر گرے گا جسے اٹھا کر کھانا عین ممکن ہوگا۔ البتہ اگر کوئی مائع خوراک ہو جیسے آئسکریم یا چائے وغیرہ تو چونکہ وہ برتن اور پیالہ وغیرہ میں ہوا کرتی ہے اسلئے دسترخوان بچھانے کی ضرورت نہیں الا یہ کہ نیچے قالین وغیرہ ہو اور اس پر گرنے کا امکان ہو، بخلاف روٹی وغیرہ کے کہ اسے نیچے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ہاں اگر روٹی کسی پلیٹ وغیرہ میں رکھے اور سالن کسی دوسری پلیٹ میں یا ثرید ہو تو پھر بھی اگر احتیاط سے کھائے اور زمین پر گرانے سے بچے تو دسترخوان کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔

جہاں تک چھوٹی پلیٹوں اور پیالوں میں کھانے کا تعلق ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان میں نہ کھانے کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ عربوں میں عموماً مل کر کھانے کا معمول تھا اور عموماً اس کیلئے بڑے پیالوں اور تھالوں کا استعمال ہوتا تھا، علیٰ ہذا یہ طریقہ پھر سننِ زوائد میں شامل ہوگا۔مگر دوسری وجہ جو سیاقِ حدیث سے معلوم ہوتی ہے اور زیادہ قرینِ قیاس ہے وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تواضع پسند تھی اور متکبرین کے طور وطریقوں سے اجتناب فرماتے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ کھانے کا نہ صرف یہ کہ شوق نہ تھا بلکہ خود بھی کم تناول فرماتے اور قلیل پر اکتفاء کرنے کی تلقین بھی فرماتے تھے، جیسا کہ ان شاء اللہ ابواب الزہد سے معلوم ہو جائیگا۔ چونکہ طشتری کا استعمال یا اس وقت ہوتا ہے جب بہت ساری چیزیں دسترخوان پر موجود ہوں اور تھوڑا تھوڑا کر کے سب کو چکھنا مقصود ہو جیسے آج کل کی دعوتوں میں ہوتا ہے یا پھر سلاد چٹنی وغیرہ

کے زور سے زیادہ کھانا مراد ہو تو یہ چیز بلاشبہ شرعاً ناپسندیدہ ہے۔

چنانچہ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں:

"الاتساع فی الشهوات من المكروهات وقد نعى الله على قوم ذالك فى كتابه العزيز فقال:اَذهبتم طيّباتكم فى حياتِكم الدنيا واستمتعتم بها[1] وكذالك التبسُّط فى الهيئات والتبعير فى المآكل والموائدوالتجمع بالالوان والفواكه والتقلل هو المحمود والتواضع هو المحبوب"۔

غرض کھانے کا مقصد عبادت پر قدرت حاصل کرنا اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا استعمال وشکریہ ہونا چاہئے اس سے مراد بوجھل ہونا اور متلذّذ وموٹا ہونا نہ چاہئے "فانّ عبادالله ليسوا بمتنعمين"[2] اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے چپاتی یا میدے کی نرم روٹی کا انتظام نہیں ہوتا تھا اہتمام تو بڑی چیز ہے بلکہ اکثر جَو کے آٹے میں پھونک کر بھوسا اڑا دیا جاتا اور باقی پکایا جاتا ایسے میں مرقق اور نرم روٹی کہاں تیار ہوسکتی تھی بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بھی چھلنیوں سے خالی تھے، وہ واقعی اللہ والے تھے۔

کرسی اور میز پر کھانا:

چونکہ آج کل اکثر مواضع میں کرسی اور میز کا استعمال عام ہوگیا ہے اس لئے میز پر کھانا اگرچہ علتِ تشبہ کی بناء پر تو ممنوع یا مکروہ نہیں ہے کیونکہ جو مشابہت ناجائز ہے وہ مقیّد ہے اسکے ساتھ جو غیر قوم کی خصوصیت ہو اور تشبہ کے قصد وارادہ سے اختیار کیا جائے جیسا کہ درّ مختار "باب مایفسد الصلوۃ وما یکرہ فیھا" میں ہے:

"فانّ التشبه بهم (اى باهل الكتاب) لايكره فى كل شئ بل فى المذموم وفيمايقصدبه التشبّه كمافى البحر"۔

اس پر علّامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"فقداشارالى ان صورة المتشابهة فيما تتعلّق به صلاح العباد لايضر"۔

(شامی صفحہ ۶۲۴ ایچ ایم سعید)

باب ماجاء على ماكان يأكل النبى ﷺ

[1] سورة الاحقاف رقم آيت: ۲۰۔ [2] رواه احمد فى مسنده ص: ۳۲۲ ج: ۲ رقم حديث: ۲۱۶۰۰ " اياى والتنعم، فان عبادالله ليسوا بالمتنعمين" ايضاً الترغيب والترهيب ص: ۱۰۲ ج: ۳ دارالكتب العلمية بيروت.

البتہ زمین پر بیٹھ کر کھانے کی حکمت تواضع اور خاکساری کو اپنانا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ زمین ہی پر بیٹھ کر اور مل کر کھایا جائے۔ اگر ہوٹلوں میں ہم اس طرز کو اپنانے سے قاصر ہیں تو اپنے گھروں اور اختیار کی جگہوں میں تو اس پر بآسانی خود بھی عمل کر سکتے ہیں اور دوسروں سے بھی کروا سکتے ہیں۔

فائدہ نمبرا:۔ حکمت اور علّت میں فرق یہ ہے کہ علّت کے ساتھ حکم کا طرد اور عکس ہوتا ہے یعنی اگر علّت دور اور ختم ہو جائے تو حکم بھی رفع ہو جاتا ہے اور اگر علّت پھر لوٹ آئے تو حکم بھی لوٹ آتا ہے جیسے مسائل عرفیہ وغیرہ کا ضابطہ ہے۔

مگر حکمت چونکہ دائمی چیز ہوتی ہے اس لئے یہاں طرد وعکس والی تفصیل نہیں چلتی، علیٰ ہذا زمین پر بیٹھ کر کھانے کی حکمت تواضع کی بناء پر بہرکیف افضل ومطلوب ہے، اگر اسکے ساتھ میز پر یا کھڑے ہو کر کھانے میں تکبّر یا تشبّہ کی علّت ہو تو پھر زمین پر بیٹھنا لازم ہو جاتا ہے کہ علت وحکمت دونوں جمع ہو گئیں۔

فائدہ نمبر۲:۔ جس طرح کھانا اونچا رکھ کر منہ کے قریب کرنا مکروہ ہے اسی طرح یہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ خود تو اونچی جگہ پر بیٹھ جائے اور کھانا نیچے رکھے مثلاً خود بستر پر بیٹھے اور کھانا زمین پر رکھے کیونکہ دسترخوان اتنا موٹا نہیں ہوتا کہ اسے بستر کے برابر کردے۔ اسی طرح اگر چارپائی پر کھانا ہو تو کھانا پائینتی کی طرف نہ رکھے بلکہ خود پائینتی کی جانب بیٹھنا چاہئے، کھانے کے بعد پہلے دسترخوان اٹھوایا جائے پھر خود اٹھے۔

میرے پاس بعض اوقات مہمان آتے ہیں ہم کھانا کمرے کے درمیان میں دسترخوان پر رکھ لیتے ہیں تاکہ ایک تو اٹھ کر کھانے کے پاس جانا پڑے، دوم یہ کہ کھانا ہم سے نیچے نہ ہو مگر بعض مہمان بچوں سے کہتے ہیں کہ دسترخوان یہاں نشستوں والے بستروں پر لاؤ، اس طرح وہ خود اوپر رہتے ہیں اور کھانا نسبتاً نیچے اور لطف یہ کہ جب میں کھانے کے برابر قالین پر بیٹھتا ہوں تو بعض حضرات اوپر بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہم حیا کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے مگر مہمان کو چاہئے کہ جس طرح اہلِ خانہ کریں اور بالخصوص جب اس میں مصلحت بھی پیشِ نظر ہو تو اس میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔

قولہ "هذا حديث حسن غريب" قال ابن العربي في العارضة الحديث صحيح خرّجه البخاري۔[۳]

---

۳ راجع للتفصيل فتح الباري ص: ٦٦٢ ج: ٩ "كتاب الاطعمة" قديمي كتب خانه كراچي.

باب ماجاء فی أکل الارنب

عن هشام بن زید قال سمعتُ انساً یقول اَنفَجنااَرنباًبمرّالظهران فسعیٰ اصحابُ رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم خلفها فادرکتها فاخذتها....الخ ۔

حضرت ہشام بن زید فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کوفرماتے ہوئے سنا کہ ہم نے مرالظہر ان نامی جگہ میں ایک خرگوش کوبھڑ کایاپس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے میں نے اسکوقابوکرکے پکڑلیاپھراسکوابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس لایا،توابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اسے چقماق کے پتھر سے ذبح کردیاپھراسکی ران یاران کابالائی حصّہ (یعنی کولہا) مجھے دے کرنبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا،توآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کوکھایا۔میں (راوی ہشام) نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھایا؟انھوں نے کہاکہ قبول فرمالیاتھا۔

لغات:۔''انفجنا''جمع متکلم کاصیغہ ہے جس کے معنی خرگوش کوبھڑکاکرنکالنے کے ہیں''نفج الأرنب''اس وقت کہاجاتاہے جب خرگوش اُکسائے جانے پربھڑک کربھاگنے لگے جیسے''نفحت الریح''ہوا کے تیزی سے چلنے کوکہاجاتاہے،غرض ہم نے اسے چھپنے کی جگہ سے نکال باہرکردیا۔

قولہ"بمروه" چقماق کے پتھرکوکہاجاتاہے جب اسے دوسرے پتھرپرماراجاتاہےتواس سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں اور جب اسے توڑاجائےتواس میں تیزدھاربنتی ہے۔ہم بچپن میں رات کوکبھی کبھی اندھیرے میں اس سے آگ نکال کرکھیلتے تھےاورجب پرندے مارتے اورچاقونہ ہوتایامچھلی شکارکرتےتواس پتھرسے چاقو کاکام لیتے جوبڑاآسان ہوتاہے۔

قولہ "اوبورکها" بفتحہ واوجبکہ کسرہ بھی جائزہےاسی طرح راءبھی مکسوراورساکن دونوں صحیح ہے،ران کے بالائی حصّےاورکولہےکی ہڈی کوکہتے ہیں،اوراسکی جمع اوراک آتی ہے۔

تشریح:۔حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہے کہ روافض کے سواباقی سب کے نزدیک خرگوش حلال ہے۔باب کی حدیث حلّت کی دلیل ہے پھرحضرت انس رضی اللہ عنہ کایہ کہنا''فبعث معی''اس کی تائیدکیلئے ہے کہ یہ محض سُنی ہوئی بات نہیں بلکہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کواسے قبول کرتے ہوئے بچشم خوددیکھاہے، پھرتعبیرکی اس تغییرکوتعارض نہ سمجھاجائےکہ پہلے کہا''فاکله''اورپھرفرمایا''قبله''کیونکہ قبول کرناملزوم ہےاور

کھانا جائز ہونالازم ہے، تاہم بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصرّف اور تغیّر شعبہ نے کیا ہے۔

ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کھانے کی نسبت روایت بالمعنیٰ ہے اور یہ کوئی کذب اور جھوٹ نہیں کیونکہ اگر خرگوش حلال نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسکو ہرگز قبول نہ فرماتے بلکہ اسکو ہاتھ بھی نہ لگاتے، بہرحال اس بارے میں مزید روایات بھی وارد ہوئی ہیں: مثلاً (نسائی[1] میں ہے کہ ایک اعرابی نے بُنا ہوا خرگوش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود تو نہیں کھایا البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کھانے کو کہا) اسکے مقابلے میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو کراہیت پر دلالت کرے اور یہ جو ترمذی نے نقل کیا ہے "انہا تدمی" کہ اسکو خون آتا ہے تو یہ عدمِ جواز یا کراہیت کی علّت نہیں ہوسکتا بلکہ خون بہنے سے تو ماقبی صاف ہوجاتا ہے ہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ طبیعت اسکو پسند نہیں کرتی وہ الگ شی ہے یعنی طبعی کراہیت ہے نہ کہ شرعی۔

علّامہ عینیؒ اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ اور باقی سب علماء کے نزدیک خرگوش حلال ہے سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور عکرمہ[2] کے، شاید امام ترمذیؒ "وقد کرہ بعض اہل العلم۔۔۔ الخ" میں ان کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، باقی شاہ صاحبؒ نے جو نسبت روافض کی طرف کی ہے ممکن ہے کہ ان کا قول بھی کراہیت کا ہو۔ واللہ اعلم

ابن العربی "عارضۃ الاحوذی" میں تحریر فرماتے ہے کہ اس حدیث سے شکار کے تعاقب میں بھاگنے اور دوڑنے کا جواز معلوم ہوا اگرچہ اس میں گرنے کا خطرہ رہتا ہے مگر طلب رزق میں ایسا کرنا جائز ہے، بظاہر اس خرگوش میں دوسرے لوگ بھی شریک ہونے چاہئے تھے مگر ہوسکتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اسے اکیلے ہی پکڑا ہو یعنی کسی کی مدد کے بغیر، حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ربیب تھے مگر پہلے حضرت طلحہ کے پاس لانے کی وجہ شاید یہ ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دور ہوں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عظیم شخصیت کی خدمت میں معمولی ہدیہ بھیجنا جائز ہے۔ کذا فی العارضہ

باب ماجاء فی أکل الارنب

[1] سنن نسائی ص:۱۹۷ ج:۲ الارنب "کتاب الصید والذبائح"۔

[2] کذا فی فتح الباری ص:۸۲۶ ج:۹ "کتاب الذبائح والصید"۔

باب ماجاء فی أکل الضب

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم سُئل عن أکل الضب فقال لا آکلہ و لا أحرّمہ"۔

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گوہ کے کھانے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ تو میں اسے کھاتا ہوں اور نہ حرام قرار دیتا ہوں''۔

لغات: ۔قولہ "الضب" بفتح الضاد وتشدید الباء ایک چالاک جنگلی جانور ہے جو زمین میں بل بنا کر رہتا ہے، اردو میں اسے ''گوہ'' کہتے ہیں مادہ کیلئے ''ضبۃ'' آتا ہے، اور اسکی جمع ''ضباب'' و ''اضب'' آتی ہے فارسی میں اسے ''سوسمار'' اور پشتو میں اسے ''سمسارہ'' کہتے ہیں۔

تشریح: ۔گوہ وضع قطع کے لحاظ سے گرگٹ کی مانند ہے البتہ گوہ کافی بڑی ہوتی ہے، ابن خالویہ کہتے ہیں کہ گوہ کی عمر سات سو برس تک ہوتی ہے، خشک علاقوں میں پائی جاتی ہے، مشہور ہے کہ یہ پانی نہیں پیتی اور چالیس دنوں میں ایک قطرہ پیشاب کرتی ہے، گویا ٹھنڈی ہوا سے اس کی اندرونی خشکی وحرارت دور ہو جاتی ہے، اپنے رہنے کیلئے مختلف سمتوں سے بل بنا کر ایک سے داخل ہو کر عموماً دوسرے سے نکل جاتی ہے، اور یہ بے ضرر جانور ہے، بعض چور لوگ اسکو چوری کی واردات کیلئے پالتے بھی ہیں کیونکہ اس میں اتنی طاقت ہے کہ جب ایک دفعہ کسی چیز پر اپنے پنجے چپکا دے تو اسے پھر کوئی انسان جدا نہیں کرسکتا اس لئے یہ لوگ اس کی دُم کے ساتھ رسّی باندھ کر دیوار پر چڑھاتے ہیں اور پھر جب وہ دیوار پر چڑھ جاتی ہے تو وہ رسّی کھینچ لیتے ہیں اس طرح یہ چپک جاتی ہے اور وہ اسی رسّی پر چڑھ کر دیوار سے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

بچپن کا واقعہ یاد آیا کہ ایک دفعہ گاؤں کے لڑکوں نے اسے ایک بل میں پھنسایا تھا اندر جگہ کم تھی اس لئے اس کی دُم باہر رہ گئی، لڑکوں نے مل کر اسے کھینچا مگر وہ نہ نکال سکے پھر آگ جلادی گئی مگر وہ پھر بھی نہیں نکلی بالآخر اسکی دُم کٹ گئی جو انتہائی مضبوط ہوتی ہے مگر گوہ کسی حال میں نہ نکلی۔

گوہ کھانے کا حکم: ۔قولہ "وقد اختلف اھل العلم فی أکل الضب" الخ مجموعی اعتبار سے اس بارے میں دو قول ہیں (۱) مکروہ (۲) جائز غیر مکروہ۔ پہلا قول حنفیہ کا ہے اور دوسرا ائمہ ثلاثہ واہل ظواہر کا۔ پھر حضرت شاہ صاحب "عرف الشذی" میں فرماتے ہیں کہ ہمارے حنفی فقہاء نے کراہت تحریمی کو اختیار کیا ہے جبکہ

احناف کے محدثین نے تنزیہی کو۔ چنانچہ حاشیہ پر جہاں ملا علی قاریؒ نے امام محمدؒ کا قول نقل کیا ہے تو وہاں اس کو احتیاط سے مقید کیا ہے "قال محمد قد جاء فی اکله اختلاف و امانحن فلانری ان یو کل[1] قال القاریؒ ای احتیاطاً لتعارض الادلة "الخ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملا علی قاریؒ کراہت کو تنزیہ پر محمول کرنا چاہتے ہیں۔

جو حضرات جواز کے قائل ہیں وہ ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کلوا" بصیغہ امر جیسا کہ مسلم[2] کی روایت میں ہے گو کہ خود تناول کرنے سے انکار فرمایا کیونکہ مکہ میں گوہ کھانے کی عادت نہ تھی کہ وہاں یہ نہیں پائی جاتی ہے۔

یا پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یہ حرام ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا ولکن لم یکن بارض قومی فاجدنی اَعَافُهُ" جیسا کہ بخاری شریف[3] میں ہے یعنی یہ حرام تو نہیں مگر مجھے اس سے گھن آتی ہے کہ یہ ہماری قوم کی سرزمین میں نہیں پائی جاتی ہے، اس روایت میں یہ بھی ہے کہ اس ارشاد کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے تناول فرمایا۔ حدیث الباب میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا آکله و لا اُحَرِّمُه" علاوہ ازیں بھی اس مضمون کی صحیح احادیث موجود ہیں۔[4]

ان روایات سے اس کی حلت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر گوہ جائز نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم "کلوا واطعموا" نہ فرماتے اور "لا احرمه" کبھی نہ کہتے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بیان تحریم وتحلیل پر مامور تھے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر اسے کھایا جاتا۔ اس لئے امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس کی حلت پر اجماع نقل کیا ہے[5] اور قاضی عیاضؒ کی نقل پر اعتراض کیا جنہوں نے بعض علماء کی طرف حرمت کی نسبت کی ہے، غرض ان روایات سابقہ کی وجہ سے بقول امام نوویؒ حرام کہنا خلاف منصوص ہے ہاں حنفیہ سے

باب ماجاء فی أکل الضب

[1] کذا فی المؤطا الامام محمد ص: ۲۸۵ باب أکل الضب "کتاب الصید و الذبائح، ادارة الحرم لاهور.

[2] صحیح مسلم ص: ۱۵۱ باب اباحة الضب "کتاب الصید والذبائح الخ".

[3] انظر فتح الباری ص: ۸۲۷ ج: ۹ رقم حدیث: ۵۵۳۷، قدیمی کتب خانه.

[4] کذافی مجمع الزوائد ص: ۳۳ تا ۳۶ ج: ۴ "کتاب الصید والذبائح" دارالکتب العلمیه بیروت.

[5] النووی علی مسلم ص: ۱۵۱ ج: ۲ باب اباحة الضب.

کراہیت کا قول ثابت ہے۔ان کے دلائل درجہ ذیل ہیں۔

(۱) امام ترمذیؒ نے وفی الباب میں ابوسعید اور ثابت بن ودیعہ رضی اللہ عنہما کی جس حدیث کی طرف اشارہ کیا تو یہ حدیثیں بالترتیب مسلم [۶]، مسند احمد، ابن ماجہ اور ابوداؤد ونسائی میں ہیں۔ان میں گوہ کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنواسرائیل کی ایک قوم جانوروں کی شکل میں مسخ ہو چکی تھی۔معلوم نہیں کہ وہ کون سے جانور ہیں۔حافظؒ نے فتح الباری میں فرمایا ''وسنده صحيح''۔

آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ امکان ظاہر کرنا کہ شاید گوہ وہی مسخ شدہ امت ہو، جو اس کی رذالت کی علامت ہے کیونکہ مسخ رذیل چیز کی شکل میں ہوتا ہے جیسے بندر اور خنزیر، باقی یہ کہنا کہ مسخ شدہ قوم باقی نہیں رہتی اور نہ ہی اس کی نسل پیدا ہوتی ہے تو یہ بات اگرچہ مشہور ہے مگر ابن العربیؒ نے عارضہ میں اسے سختی سے رد کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایسی باتیں عقل سے تو معلوم نہیں کی جاسکتیں اور نقل صحیح اس بارے میں کوئی نہیں چنانچہ وہ اس بحث کے اصول نمبر پانچ میں لکھتے ہیں:

''الخامسة قولهم ان الممسوخ لاتنسل دعوى، وهذاامر لايعلم بالعقل وانماطريق معرفته الشرع وليس فى ذالك اثريعوّل عليه''۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ انسانوں کی اکثریت باطنی اعتبار سے مسخ ہو چکی ہے پھر بھی ان کی نسلیں پیدا ہوتی ہیں تو ظاہری ممسوخ کی نسل پیدا ہونے سے کیا چیز مانع ہے؟ پھر اس حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ممسوخ کی نسل در نسل بقاء میں کوئی واضح مانع نہیں ہے ''ان امة من بنى اسرائيل مُسخت دَوَابَّ فى الارض وانى لاادرى اَىَّ الدواب هى'' (ابوداؤد ونسائی ومسلم [۷]) اس کا سیاق بتلا رہا ہے کہ ممسوخ کی بقاء ممکن ہے ورنہ تو اس تعلیل کی پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ مسلم [۸] کی روایت اس مقصد پر زیادہ ناطق ہے ''قال اُتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بضب فَاَبَىٰ ان يأكل منه وقال: لاادرى لعله من القرون التى مُسخت''۔

---

[۶] صحيح مسلم ص: ۱۵۲ ج: ۲ باب اباحة الضب، مسند احمد ص: ۴۲۶ ج: ۳ رقم حديث ۱۲۲۴۰، سنن ابن ماجه ص: ۲۳۳ باب الضب ''ابواب الصيد'' عن ثابت بن وديعه، سنن نسائى ص ۱۹۸ ج: ۲ ''الضب'' ''كتاب الصيد''، سنن ابى داؤد ص: ۱۷۶ ج: ۲ باب فى أكل الضب ''كتاب الاطعمة''. [۷] حواله بالا.

[۸] صحيح مسلم ص: ۱۵۱ ج: ۲ ''كتاب الصيد والذبائح''

(۲) مسند احمد[۹]، ابوداؤد[۱۰] اور طحاوی وغیرہ میں عبدالرحمٰن بن حسنہ کی روایت ہے۔

"وفیہ..انهم طبخوا منها (ای من الضباب) فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان امة من بنی اسرائیل مُسخت دواب الارض فاخشی ان تکون هذه فاکفئوها"۔

حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں "وسنده علی شرط الشیخین الا الضحاك فلم یخرجا له"۔[۱۱]

طریق استدلال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہانڈیاں الٹوا دینا اس کو ناپسند کرنے کی بنا پر ہی ممکن ہے۔

مجوزین ان روایات میں یوں تطبیق دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو نہ کھائی مگر اس سے منع بھی نہیں فرمایا ہے جس سے حلت معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ بات دل کو نہیں لگتی کیونکہ اس کے بارے میں امت ممسوخہ کا خدشہ ظاہر کرنا عام علت ہے، اس لئے حنفیہ کہتے ہیں کہ عدم تحریم سے متعلق جتنی بھی روایات ہیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے توقف پر محمول ہیں یعنی اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف مسکوت عنہا اشیاء بذاتِ خود مباح بھی ہوسکتی ہیں بلکہ بہت سے علماء کے نزدیک تو اشیاء میں اصل اباحت ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہیں روکا۔ پھر جب بنی اسرائیل کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسخ کا پتہ چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہانڈیاں الٹوا دیں۔ اور اہم بات یہ ہے کہ جب حلت وحرمت میں شک ہو جائے تو ترجیح حرمت کو ہوتی ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم ہے۔

نیز گوہ ایک کریہ المنظر جانور بھی ہے اس لئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر تھوکا، عارضۃ الاحوذی میں ہے "روی مسلم وابوداؤد ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لمّا قُدِّم الیه الضب تبزق"۔[۱۲] اور جہاں تک صاحب تحفۃ الاحوذی کا یہ کہنا ہے کہ اس قسم کی

---

[۹] مسند احمد ص: ۲۱۹ ج: ۵ حدیث: ۱۷۳۰۳، ایضاً اخرجه ابویعلی فی مسنده برقم: ۹۳۱، مجمع الزوائد ص: ۳۳ ج: ۴۔ [۱۰] ابوداؤد ص: ۱۷۶ ج: ۲ باب فی أکل الضب "کتاب الاطعمة، عن ثابت بن ودیعه وفیه: قال ان امة من بنی اسرائیل مسخت دواباً فی الارض وانی لاادری ای الدواب هی الخ. [۱۱] فتح الباری ص: ۸۳۰ ج: ۹ "کتاب الذبائح والصید". [۱۲] لم اجده بلفظه فی مسلم واللّٰه اعلم وعلمه اتم. الحنفی عفی عنه، سنن ابی داؤد ص ۱۶۸ ج ۲ باب مایقول اذا شرب اللبن. کتاب الاشربة.

احادیث تحلیل کی روایات پر مقدم ہیں کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ تھا کہ ممسوخ کی نسل نہیں رہتی اور جب معلوم ہوا تو نہی کی علت ختم ہوگئی اور ابن حجرؒ کی بات بھی کچھ اس طرح ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ ممسوخ کی نسل باقی نہیں رہتی؟ اوپر ابن العربیؒ کی بات نقل کی گئی ہے کہ اس دعوے پر کوئی قابلِ اعتماد اثر نہیں لہٰذا یہ دعوی بلا دلیل ہے۔ اور منع کی احادیث کو مقدم کہنا محض دعویٰ ہے۔ اور امام نوویؒ کا دعوائے اجماع علی الحلت بھی صحیح نہیں کہ خود حافظؒ نے اسے رد کیا ہے کہ ابن المنذرؒ نے حضرت علیؓ سے اس کے خلاف قول نقل کیا ہے تو حضرت علیؓ کی مخالفت کے ہوتے ہوئے اجماع کیسے ممکن ہے؟ (کذا فی حاشیۃ الکوکب [۱۳]) علاوہ ازیں ترمذی کی نقل نوویؒ کی نقل پر بہرحال مقدم ہے۔

باب ماجاء فی أکل الضبع

"عن ابی عمّارقال قلت لجابر: الضبع أصیدٌھی؟ قال نعم قلتُ اٰکُلُھا؟ قال نعم قلت أقاله رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم؟ قال نعم"۔

حضرت ابن ابی عمار فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ سے پوچھا کہ آیا بجّو شکار ہے انہوں نے فرمایا: ہاں میں نے کہا اسے کھا سکتا ہوں فرمایا ہاں میں نے عرض کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔

لغات:۔ "ضبع" بفتحۂ ضاد اور ضمۂ باء اسے فارسی میں کفتار اور ہندی و اردو میں ہنڈار یا بجّو کہتے ہیں۔ ایک معروف درندہ ہے جو انسانی گوشت کو بہت پسند کرتا ہے اس لئے یہ مردہ اور سوئے ہوئے انسانوں کو شکار کرتا رہتا ہے۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ سوئے ہوئے شخص پر اس کا حملہ بڑا عجیب ہوتا ہے یہ اس کے سر کی جانب آتا ہے پہلے سر کے نیچے جگہ کھودتا ہے جب اس کا سر نیچے ہو جاتا ہے اور گلہ اچھی طرح کھل جاتا ہے تو یک دم سے اپنی داڑھوں سے آناً فاناً گلہ کاٹتا ہے۔

"وھی تفترس الآدمی ولکن خدیعة (دھوکے سے پھاڑتا ہے) ... الی.. اذانام وصفة افتراسھاانھاتأتیه من قبل رأسه فتحتفرالارض حتی یمیل رأسه

---

[۱۳] ایضاً تفصیل کیلئے رجوع فرمائیے اعلاء السنن ص: ۱۶۱ ج: ۱۷، النھی عن أکل الضب، ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة کراچی

ویبرز حلقه فتهجم بانیابها علیه وتفریه فی لحظة"۔

قولہ "أصیدهی" ہمزہ استفہامیہ مصدر پر داخل ہے جو مبنی للمفعول ہے۔قولہ "آکلها" ہمزہ کے مد کے ساتھ کیونکہ استفہامیہ ہمزہ قطعیہ پر داخل ہے۔قولہ "أقاله رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم؟" اقالہ کی ضمیر میں ایک احتمال یہ ہے کہ "الضبع أصید هی" کی طرف راجع ہو مگر یہ خلاف ظاہر ہے۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مذکورہ قول کی طرف عائد ہو اس صورت میں یہ مطلب حنفیہ کے خلاف بنتا ہے جس کا جواب آرہا ہے۔

تشریح:۔ یہ حدیث ابواب الحج "باب ماجاء فی الضبع یصیبها المحرم" میں بھی گذری ہے اس کی بعض شرح (تشریحات جلد سوم ص ۵۰۴، ۵۰۵) پر دیکھی جاسکتی ہے۔بجّو کے حلال اور حرام ہونے کی حیثیت بھی ائمہ کے درمیان متنازع رہی ہے۔شوافع وحنابلہ اور اہل ظواہر کے نزدیک بجو حلال ہے جبکہ حنفیہ و مالکیہ اور سعید بن المسیب کے ہاں حلال نہیں پھر حنفیہ کے نزدیک تو حرام ہے جبکہ امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ (تحریمی) ہے۔

مجوزین کا استدلال باب کی حدیث سے ہے۔نیز امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بجّو کا گوشت ہمیشہ صفا اور مروہ کے درمیان بکتا رہا ہے مگر کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا ہے جو اس کے حلال ہونے کی دلیل ہے۔

مانعین کا استدلال ترمذی میں باب کی دوسری حدیث سے ظاہر تو ہے مگر اس پر فریق اول کی طرف یہ اعتراض ہے کہ اس میں دو راوی متکلم فیہما ہیں جیسا کہ ترمذی نے فرمایا "وقد تکلم بعض اهل الحدیث فی اسمٰعیل وعبدالکریم" الخ گو کہ اس کا جواب ہوسکتا ہے مگر اس سے زیادہ قوی دلیل قرآن کی آیت اور مسلم شریف کی مشہور حدیث ہے (۱) قال اللّٰه تعالیٰ "وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ"[۱] اور بجو کے خبیث ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے جو مردوں کو بھی معاف نہیں کرتا۔(۲) "نهی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن کل ذی ناب من السباع وعن کل ذی مخلب من الطیر"۔[۲]

ابن القیمؒ اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ اس بارے میں کہ داڑھ والے جانور حرام ہیں احادیث حد تواتر تک پہنچتی ہیں "وقد تواترت الآثار عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم بالنهی عن أکل کل ذی

باب ماجاء فی أکل الضبع

[۱] سورة الاعراف آیت:۱۵۷۔ [۲] صحیح مسلم ص:۱۴۷ ج:۲ باب تحریم أکل کل ذی ناب من السباع الخ "کتاب الصید والذبائح" ایضاً راجع للتفصیل اعلاء السنن ص:۱۶۳ تا ۱۶۹ ج:۱۷ باب ماجاء فی الضبع.

ناب من السباع وصحت صحة لامطعن فیھا'' الخ باقی قاضی شوکانیؒ کا اسے ذی ناب سے خارج کرنا صحیح نہیں کہ اس کے ذی ناب ہونے میں کسی نے شک نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ابن قیمؒ کا اسے سباع سے باہر کرنا بھی بے معنی کوشش ہے کہ درندگی اس کی مشہور صفت ہے لہٰذا ابن قیمؒ کا یہ استدلال الٹا ہوا کہ حرمت کا دارومدار دو وصفوں پر مبنی ہے ایک یہ کہ وہ ذی ناب ہو اور دوم یہ کہ وہ ایسے سباع میں سے ہو جو از خود حملہ آور ہو جبکہ بجو میں صرف ذی ناب ہونے کا وصف پایا جاتا ہے۔

"فانه انما حرم ما اشتمل علی الوصفین ان یکون له ناب وان یکون من السباع العادیة بطبعها کالاسد... واما الضبع فانما فیھا احد الوصفین وھو کونھا ذات ناب ولیست من السباع العادیة" الخ۔ (تحفۃ عن الاعلام)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کو کسی بھی حالت میں خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ معاف نہ کرنے والا جانور درندہ اور سبع نہیں تو پھر تو کوئی چیز بھی سباع میں سے نہیں اس لئے ابن العربیؒ ایسے لوگوں کی بات پر سخت تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان پر تعجب ہے جو گیدڑ اور لومڑی کو تو حرام کہتے ہیں حالانکہ وہ مرغی پھاڑ کر کھانے والے درندے ہیں جبکہ بجو کو حلال قرار دیتے ہیں دراں حالیکہ وہ سوئے ہوئے انسان کو پھاڑ کر کھاتا ہے "وعجباً لِمَن یحرم الثعلب وھو یفترس الدجاج ویُبیح الضبع وھی تفترس الآدمی اذا نام"۔ (عارضۃ الاحوذی)

لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ اولاً تو باب کی حدیث بجو کی حلت پر صریح نہیں کیونکہ اس میں "اَقَالَـه" کی ضمیر "اَصیدٌ ھی" کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے اور اس سے تعارض بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ثانیاً اگر اسے مقول کی طرف راجع مانیں تو پھر ہم کہتے ہیں کہ یہ حضرت جابرؓ کا اپنا گمان ہے کہ انہوں نے اس کے شکار ہونے سے حلال ہونا مستنبط کیا علی ہذا یہ قرآن کی اس مذکورہ آیت اور مندرجہ بالا مشہور بلکہ متواتر حدیث کا مقابلہ نہیں کرسکتا چنانچہ یہ حدیث ابوداؤد[۳] میں بھی آئی ہے مگر اس میں کھانے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ فقط یہ الفاظ ہیں "فقال ھو صید ویجعل فیه کبش اذا صاده المحرم" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے صید محرم کے لئے جزاء کے حکم کے طور پر قرار دیا گیا ویسے تو عام سباع بھی اصیاد ہوتے ہیں۔

صید الملوك أرانب وثعالب   واذا رکبتُ فصیدی الابطال

[۳] سنن ابی داؤد ص: ۱۷۷ ج: ۲ باب فی أکل الضبع "کتاب الاطعمة.

حالانکہ بھیڑئے اور لومڑی کے حلال ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں اس لئے ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں ''والحزاء فیه عندنا اَغلب والتحریم فیه اغلب ''۔ بہرحال یہ ایک واحد حدیث ہے جو صریح بھی نہیں لہٰذا یہ درندوں اور خبائث کی حرمت کے بارے میں نصوص قطعیہ کے لئے ناسخ یا مخصص نہیں بن سکتی خاص طور پر جب مقابلہ بھی محرم سے ہو۔ واللہ اعلم

ملحوظ ''ناب'' کو اردو میں کچلی کہتے ہیں جس کے معنی نوک دار دانت کے ہیں جو سامنے کے چار دانتوں کے برابر والے آمنے سامنے دو دانت ہوتے ہیں درندوں کے یہ دونوں دانت نوکیلی اور نمایاں ہوتے ہیں جن سے دوسرے جانداروں کو پھاڑتے اور کاٹتے ہیں اسے کُتا دانت بھی کہتے ہیں۔ جبکہ مخلب نوک دار اور نوکیلی چنگل، ناخن اور پنجے کو کہتے ہیں۔ جو پرندے دوسرے پرندوں کو شکار کرتے ہیں ان کے پنجے نوک دار اور بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، وہ انہی سے چیزوں کو پکڑ کر کھاتے ہیں۔ چونکہ درندگی ایک معیوب وصف ہے اس لئے ایسے جانور انسانوں پر حرام کر دیئے گئے ہیں تاکہ ان کے اخلاق انسان پر اثر انداز نہ ہوں۔

قولہ "وعبدالکریم بن مالك الحزری ثقة" چونکہ اس نام کے دو راوی تھے جب امام ترمذیؒ نے ایک کی تضعیف نقل فرمائی تو دفع اشتباہ کے لئے دوسرے کی توثیق کی وضاحت فرمائی اور ساتھ ساتھ دونوں کی نسبت بھی بتلادی۔

باب ماجاء فی أکل لحوم الخیل

"عن جابر قال اَطعَمَنَا رسول الله صلی الله علیه وسلم لُحوم الخیل و نهانا عن لُحوم الحُمُر"۔(حدیث حسن صحیح)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں گھوڑوں کا گوشت کھلایا اور گدھوں کے گوشت کھانے سے ہم کو منع فرمایا۔

تشریح:۔ گھوڑے کا گوشت حل وعدم حل کے حوالے سے متنازع ہے تاہم یہ اختلاف سابقہ دونوں بابوں کے اختلاف کی نسبت کم ہے، جمہور علماء یعنی شافعیہ، حنابلہ، صاحبین اور بعض صحابہ کرامؓ وتابعینؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت بلا کراہت جائز ہے۔ جبکہ ابن عباسؓ، حکم، امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ

ہے۔ (کذا نقلہ النوویؒ فی شرح مسلم[۱]) پھر بعض مالکیہ اور بعض حنفیہ کے نزدیک کراہت تنزیہی ہے جبکہ بعض حنفیہ اور محققین کے نزدیک تحریمی ہے۔ علامہ عینیؒ نے امام صاحبؒ کی طرف تحریم وتنزیہ دونوں کی نسبت کی ہے جبکہ حضرت شاہ صاحبؒ نے عرف الشذی میں تنزیہی کو مختار کہا ہے بلکہ درمختار نے امام صاحبؒ سے مرض وفات میں رجوع نقل کیا ہے۔ (کذا فی العرف) مجوزین کا استدلال باب کی حدیث سے ہے۔ اسی طرح حضرت اسماءؓ کی حدیث جس کی طرف ''وفی الباب'' میں اشارہ ہے۔ اور صحیحین[۲] میں مروی ہے بھی ان کی قوی دلیل ہے ''قالت ذبحنا علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرساً و نحن بالمدینة فأکلناہ''۔

مانعین کی دلیل سورۂ نحل[۳] کی آیات ہیں۔

''والانعام خلقھا لکم فیھا دِفءٌ و منافع و منھا تاکلون ۝ ولکم فیھا جمال حین تریحون و حین تسرحون ۝ و تحمل اَثقالکم الیٰ بلدٍ لَم تکونوا بٰلغیه اِلّا بِشِقِّ الانفس ان ربکم لرؤفٌ رحیم ۝ والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا و زینة ویخلق مالاتعلمون ۝ (آیات:۵تا۸)

طریق استدلال اس طرح ہے کہ پہلے چوپایوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے تین انعامات کا ذکر فرمایا (۱) لباس (۲) کھانے کا اور (۳) مال برداری کا انعام پھر گھوڑوں خچروں اور گدھوں کے حوالے سے دو انعامات ذکر فرمادیئے ایک سواری اور نمبر دوم زینت کا۔ اگر ان کا کھانا جائز ہوتا تو اسے ضرور ذکر کیا جاتا کیونکہ قرآن اللہ حکیم کا کلام ہے اور غذا ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بڑے انعام کو چھوڑ دیا جائے اور نسبۃً کم درجے کے انعامات کا تذکرہ کردیا جائے، خاص کر جبکہ مقام امتنان کا ہے، اگر گدھے، خچر اور گھوڑے کے حکم میں فرق ہوتا تو گھوڑے کو الگ ذکر کردیا جاتا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ گھوڑے کا گوشت کھانے کے راوی ہیں جیسا کہ دارقطنی کی روایت میں ہے لیکن خود ان کا مذہب کراہت کا ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے نقل کیا ہے۔ اس لئے

باب ماجاء فی أکل لحوم الخیل

[۱] النووی علی مسلم ص:۱۵۰ ج:۲ باب اباحة أکل لحم الخیل ''کتاب الصید و الذبائح''.

[۲] صحیح بخاری ص:۸۲۹ ج:۲ باب لحوم الخیل ''کتاب الصید والذبائح'' ایضاً فتح الباری ص:۷۹۸ ج:۹ باب النحر و الذبح ''کتاب الذبائح و الصید، صحیح مسلم ص:۱۵۰ ج:۲ باب اباحة لحم الخیل.

[۳] سورة النحل آیت:۵ تا ۸ پارہ:۱۴.

ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس نکتہ کو سوائے امام مالکؒ کے کوئی نہ سمجھ سکا ''لعظیم فھمہ و سعة علمہ''۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان سے قبل رئیس المفسرین حضرت ابن عباسؓ بھی اس باریکی کو سمجھ چکے تھے۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ حلت کے بارے میں تمام احادیث کو حالت ضرورت پر حمل کیا جائے گا کیونکہ گھوڑے کھانے کا عام معمول نہ تھا، اس طرح احادیث کا مطلب اور قرآن کا نظم ٹکرانے سے بچ جائیں گے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ آیت میں دونوں اقسام کو ایک بنانا فصاحت سے معارضہ اور نعمت پر اعتراض ہے۔ علاوہ ازیں گھوڑا ایک جہادی جانور ہے اس لئے اس کے گوشت کی اباحت سے آلہ جہاد کی تقلیل بلکہ انقطاع کا خطرہ ہے۔ گھوڑے کی وفاداری کا عالم یہ ہے کہ وہ مالک کے اشارے پر ہر خطرہ کی جگہ میں گھس جاتا ہے بلکہ کبھی تو اپنے مالک کو بچانے کے لئے جان پر کھیل کر وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ آج کل جہاد اگرچہ گھوڑوں کے ذریعہ نہیں ہوتا اور مذکورہ علت مفقود ہے تاہم چونکہ بنیادی وجہ سورۂ نحل کی آیات کا نظم ہے اس لئے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا لہٰذا کراہت بدستور باقی رہے گی۔ واللہ اعلم

علاوہ ازیں خچر کی حرمت پر اجماع ہے جبکہ جانور اپنی ماں کے تابع ہوتے ہیں پس اگر گھوڑی حلال ہوتی تو خچر بھی حلال ہوتا۔ نیز ابوداؤد[۴] میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی روایت ہے۔

''ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن أکل لحوم الخیل والبغال والحمیر (الحدیث) وایضاً اخرجہ النسائی وابن ماجہ[۵] والطحاوی۔

اس روایت میں اگرچہ صالح بن یحیی پر امام بخاریؒ نے اعتراض کیا ہے ''فیہ نظر'' کہہ کر مگر ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے جو کم از کم تائید کے درجہ میں قابل استدلال ہے، تاہم ابوداؤد کے بعض نسخوں میں امام ابوداؤد نے اس کو منسوخ ضرور کہا ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ ممانعت منسوخ نہیں بلکہ اباحت کا منسوخ ہونا راجح ہے جیسا کہ گدھوں کے گوشت کا حکم ہے یا پھر ابن العربیؒ کے قول کے مطابق اباحت کی روایات ضرورت پر محمول ہیں اس کی تائید امام زہریؒ کے قول سے بھی ہوتی ہے کما فی البذل:

''انہ قال ماعلمنا الخیل اکلت الا فی حصار (قلعہ)۔ وعن الحسن انہ قال کان

---

[۴] سنن ابی داؤد ص: ۱۷۵ ج: ۲ باب فی أکل لحوم الخیل ''کتاب الاطعمة۔

[۵] سنن نسائی ص: ۱۹۸ ج: ۲ تحریم أکل لحوم الخیل ''کتاب الصید والذبائح'' سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۰ باب لحوم البغال قبیل ابواب الصید۔

اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یاکلون الخیل فی مغازیھم۔[٦]

(بذل ص۳۵۵ ج۵)

عارضۃ الاحوذی میں ہے۔

"وفی الصحیح انھم مادخلوا خیبرالاوھم جیاع [٧] فلاحجة بتلك الحالة علی الاطلاق وحدیث اسماء قضیة فی عین فتحتمل الضرورة والذی یتحقّقه ان ذالك کان نادراًولم یکن معتاداًوبھذاالتقدیریصح نظم القرآن وتستمر الاحادیث علی سبیل البیان۔

باب ماجاء فی لحوم الحمر الأھلیة

"عن علی قال نھیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن متعة النساء زَمَنَ خیبروعن لحوم الحمرالاھلیة"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے (نکاحِ) متعہ سے خیبر کے زمانہ میں منع فرمایا اور پالتو گدھوں کے گوشت سے بھی۔

لغات:۔ "متعة النساء" سے مراد نکاحِ متعہ ہے جس کی تفصیل ابواب النکاح میں گذری ہے۔

قولہ "الحمر الاھلیة" حمر بضمتین حمار کی جمع ہے جیسے کتب اور کتاب۔ قولہ "الاھلیة" آھل بالمد مانوس، پالتو اور گھریلو جانور کو کہتے ہیں یہی معنی حمار انسی کے بھی ہیں جو کہ اگلی روایت کے اخیر میں ہے اس قید سے وحشی سے احتراز کرنا مقصود ہے کیونکہ جنگلی گدھا حلال ہے۔

تشریح:۔ امام نوویؒ شرح مسلم [١] میں لکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ کے علاوہ باقی سب علماء پالتو گدھے کی تحریم پر متفق ہیں۔ البتہ مالکیہ سے اس بارے میں تین روایات ہیں جن میں تیسری روایت کراہت کی ہے۔ تاہم

[٦] رواہ ابن ابی شیبه فی مسندہ ص: ۵۳۹ ج:۵ "کتاب الاطعمة" دارالفکر بیروت.

[٧] کذا فی مصنفه ابن ابی شیبه عن البراء قال اصاب الناس یوم خیبر جوع شدید الخ ص: ۵۴۱ ج:۵ فی الحمر الاھلیة"کتاب الاطعمة"ایضاً سنن کبری للبیھقی ص. ۳۱۹ ج:۱۴ کتاب الضحایا حفیظ الرحمن الحنفی، ندوة العلم

باب ماجاء فی لحوم الحمر الاھلیة

[١] النووی علی مسلم ص۱۴۹ ج:۲ باب تحریم أکل لحم الحمر الانسیة "کتاب الصد والذبائح"

ابن العربیؒ نے عارضہ میں میں صرف دو قول نقل کئے ہیں ایک حلال ہونے کا۔ اور دوسرا احرام ہونے کا۔ اور ترجیح حرمت کو دی ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ بخاری شریف کی روایت میں ہے" ان اللّٰه ورسوله ینهاکم عن لحوم الحمر الاهلية فانها رجس"۔[۲]

جو حضرات جواز کے قائل ہیں دراصل ان کو خیبر والے دن اس نہی کی علت میں تردد ہے کیونکہ اس میں یہ بھی امکان ہے کہ یہ نجس ہونے کی بناء پر ہو جیسا اوپر بخاری شریف کی روایت میں اس کی تصریح ذکر ہوئی۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ علت مال برداری کی ضرورت ہو۔ یا صحابہ کرامؓ نے خمس نکالنے سے پہلے ہی ان کو ذبح کیا ہو۔ یا وہ گدھے گندگی کھانے والے (جلالہ) ہوں۔ علاوہ ازیں اس آیت میں "قُل لَّآ اَجِدُ فِیمَآ اُوحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطعَمُهٗٓ اِلَّآ اَن یَّکُونَ مَیتَةً اَو دَمًا مَّسفُوحًا اَو لَحمَ خِنزِیرٍ فَاِنَّهٗ رِجسٌ" الآیۃ۔[۳] تین محرمات کے علاوہ کوئی چیز مذکور نہیں۔

مانعین کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا بخاری شریف کی روایت میں اس پر رجس کا اطلاق کیا گیا ہے لہٰذا یہی علت متعین ہے اور چونکہ یہ ایسی علت ہے جو دائم اور باقی ہے لہٰذا یہ صرف خیبر کے گدھوں کی تخصیص کی بناء پر نہیں کہا گیا۔ اسی طرح حنفیہ نے گھوڑوں کی تحریم پر قرآن کی جس آیت سے جس انداز سے استدلال کیا ہے بعینہ وہی استدلال یہاں بھی کیا جائے گا۔

جہاں تک مجوزین کے تردّد کا تعلق ہے تو بخاری شریف کی سابقہ روایت کے بعد اس تردّد کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اور جو آیت انہوں نے پیش کی ہے تو اس کا مطلب اگرچہ بظاہر حصر ہے لیکن اس کا پس منظر ملحوظ رکھنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان کی غرض کے مناقضہ کے طور پر نازل ہوئی ہے اس سے حصر مقصود نہیں۔ چونکہ کفار ان چیزوں کو حرام کہتے جن کو اللہ نے حلال کیا تھا جیسے حام، بحیرہ اور سائبہ وغیرہ اور یہ کام ضد و عناد کی وجہ سے کرتے تو اللہ نے مذکورہ آیت بطور مضادہ کے نازل فرمائی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی آپ سے کہدے "لاتاکل الیوم حلاوۃ" آج تم میٹھا مت کھاؤ تو آپ جواب میں کہتے ہیں "لا آکل الیوم اِلا حلاوۃ" تو یہاں مطلب حصر نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں آج ضرور میٹھا کھاؤں گا۔ (کذا حققه السیوطیؒ فی الاتقان نقلاً عن الامام الشافعی ص:۳۸، ۳۹)

---

[۲] رواہ البخاری ص: ۸۳۰ ج: ۲ فی کتاب الذبائح والصید باب لحوم الحمر الأنسیة فتح الباری ص: ۸۱۵ ج: ۹.

[۳] سورۃ الانعام آیت: ۱۴۶.

دوسری روایت:۔ "عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حرّم يوم خيبر كل ذی ناب من السباع والمجثمة والحمار الانسی"۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن ہر کچلی والے درندے اور نشانہ کے لئے روکے گئے جانور اور پالتو گدھوں کو حرام قرار دیا ہے۔

لغات:۔ "المجثمة" بصیغۂ اسم مفعول یعنی بضم المیم وفتح الجیم وتشدید الثاء المفتوحۃ۔ لغوی اعتبار سے جثم کے معنی ہیں کسی جانور یا انسان کا زمین سے سینہ لگا کر چمٹنا۔ لیکن یہاں مجثمہ سے مراد وہ جانور ہے جس کو نشانہ بازی کی مشق کے لئے باندھ لیا جائے جو عموماً پرندوں اور خرگوش کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسا جانور جس کو باندھ کر نشانہ بنایا جائے اور بغیر ذبح اختیاری کے مرجائے وہ حرام ہے لیکن اگر اسے مرنے سے پہلے ذبح بھی کرلیا جائے تو اس کا گوشت حلال ہے تاہم مکروہ ہے کیونکہ یہ ذبح کامل نہیں۔ یا پھر یہ فعل مکروہ ہے کہ ایسا کرنا ظلم بھی ہے اور جانور کے ضیاع کا اندیشہ بھی رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے وہ بغیر ذبح کے مرجائے۔

قولہ "وانما ذكروا حرفاً واحداً" یعنی محمد بن عمرو سے روایت کرنے والے باقی شاگرد اس حدیث کا صرف یہ حصہ روایت کرتے ہیں "نهىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كل ذی ناب من السباع" وبس باقی حصہ یعنی مجثمہ اور حمار انسی کا ذکر نہیں کرتے ہیں گویا یہ زائدہ کا تفرد ہے مگر زائدہ چونکہ ثقہ ہے اس لئے حدیث صحیح ہے۔

باب ماجاء فی الأكل فی آنية الكفار

"عن ابی ثعلبة قال سُئِلَ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن قدور المجوس قال انقوها غسلاً واطبخوا فيها ونهىٰ عن كل سبع ذی ناب"۔

حضرت ابوثعلبہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجوس کی دیگوں کے بارے میں پوچھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو دھو کر صاف کرو اور ان میں پکاؤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دھاڑ والے درندے (کھانے) سے روکا۔

لغات:۔ قولہ "قدور" قِدر کی جمع ہے قِدر بکسرۃ قاف ہانڈی، دیگ، دیگچی اور پکانے کے برتن کو کہتے ہیں۔ قولہ "المجوس" چاند سورج اور آگ کی عبادت کرنے والے یعنی روشنی کے پجاری۔ آتش پرستی ایران

کا قدیم مذہب ہے ان کا بڑا مذہبی پیشوا زردشت تھا۔ قولہ "انقوھا" انقاء سے امر کا صیغہ ہے یعنی انہیں دھو کر صاف کرلیا کریں اور (بعدازاں) ان میں کھانا پکا لیا کریں۔

تشریح:۔ جمہور فقہاء کے نزدیک اگر کفار کے برتن دھو لئے جائیں تو ان میں کھانا پکانا اور کھانا، اسی طرح غسل اور وضوء کرنا سب جائز ہیں گو کہ طبعی ناپسندیدگی بدستور باقی رہے گی۔ جہاں تک دھوئے بغیر استعمال کا تعلق ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ لوگ خمر اور خنزیر یا میتہ وغیرہ حرام اور نجس اشیاء کا استعمال کرتے ہوں تو پھر ان کا استعمال بغیر دھوئے جائز نہیں، چونکہ ان اشیاء کا استعمال ضروری نہیں اس لئے یہ دیکھا جائے گا کہ کس جگہ کے کفار صفائی ستھرائی کا خیال رکھتے ہیں اور کس جگہ کے نہیں رکھتے، پس جہاں ان کی عادت اشیاء محرمہ کے استعمال کی ہوگی وہاں ان کے برتنوں سے اجتناب لازمی ہوگا لہٰذا جہاں وہ ان اشیاء کا استعمال نہ کرتے ہوں وہاں بلا غسل ان کے برتن مستعمل کئے جاسکتے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان کی ملکیت یا استعمال بذاتِ خود مانع عن الطہارۃ یا مزیل طہارت نہیں بلکہ گندی اشیاء کا استعمال ہی محرم ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے کپڑے پاک ہیں۔ ہاں ان کے مستعمل کپڑے دھونے چاہئے کہ وہ استنجاء کا خیال نہیں کرتے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر وہ خود دھوئے تو وہ بھی قابلِ استعمال ہیں، جیسے ان کے ہوٹلوں کے برتن اور گھروں کے دھوئے ہوئے اوانی کیونکہ من حیث الانسان ہر آدمی صاف پانی سے برتن وغیرہ دھوتا ہے لہٰذا انہیں دوبارہ دھونے کی ضرورت نہیں۔

دوسری حدیث:۔ حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا اللہ کے رسول! ہم اہل کتاب کے علاقہ میں رہتے ہیں تو کیا ہم ان کی ہانڈیوں میں کھانا پکا سکتے ہیں اور ان کے برتنوں میں پانی پی سکتے ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ان برتنوں کے علاوہ کوئی اور برتن نہ ملے تو ان کو پانی سے دھولو پھر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم شکار کی زمین میں رہتے ہیں اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اپنا سدھا ہوا (شکاری) کتا چھوڑو اور اللہ کا نام لو، اور وہ کسی جانور کو مار ڈالے تو اسے کھالو اور اگر وہ کتا سدھا ہوا (شکاری) نہ ہو تو ذبح کی صورت میں کھالو اور جب اپنا تیر پھینکو اور اللہ کا نام لو اور اس سے کوئی جانور مرجائے تو اسے بھی کھاؤ!۔

لغات:۔ قولہ "فارحضوھا" حاشیۂ قوت پر ہے بفتح الحاء ای اغسلوھا۔ قولہ "المکلب" ای المسلط علی الصید یعنی مُعلَّم اور شکاری کتا۔ باقی تفصیل ابواب الصید کے شروع میں گزری ہے۔ فلیراجع

باب ماجاء فی الفارة تموت فی السمن

"عن میمونة ان فارة وقعت فی سمن فماتت فسئل عنھاالنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال القوھاوماحولھافکلوہ"۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک چوہیا گھی میں گرگئی اور مرگئی پس اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے پھینکو اور اس کے اردگرد کو (ماقی کو) پھر کھاؤ۔

لغات:۔قولہ "فارة" الف اور ہمزہ دونوں کے ساتھ پڑھنا صحیح ہے چوہیا کو کہتے ہیں مذکر کے لئے فأر بغیر تاء کے مستعمل ہوتا ہے۔قولہ "فی سمن" گھی یہ لفظ بفتحۂ سین اور سکون میم پڑھا جائے گا۔جبکہ بکسرۂ سین وفتحۂ میم موٹاپے کو کہا جاتا ہے۔قولہ "وماحولھا" ہاء کی ضمیر فارہ کی طرف عائد ہے جبکہ ماحول سے مراد چوہیا کی اردگرد والی جگہ ہے یعنی اس کا بدن جس جس حصہ سے مس ہو چکا ہو اور احتیاطاً تھوڑا زیادہ بھی پھینکا جائے۔

تشریح:۔اگر گھی وغیرہ مائع قابل انجماد اشیاء میں چوہا وغیرہ گر کر مر جائے تو جمہور کے نزدیک اگر وہ منجمد نہ ہو تو نجس ہو جاتا ہے تاہم اگر وہ منجمد ہو تو صرف وہ حصہ ناپاک تصور کیا جائے گا جو چوہے کے بدن سے متأثر ہوا ہے لہٰذا متأثرہ حصہ پھینکنے کے بعد باقی پاک ہوگا۔جبکہ بعض اہل ظواہر، امام اوزاعیؒ اور امام زہریؒ کے نزدیک گھی خواہ جامد ہو یا بہنے والا دونوں صورتوں میں اس کے آس پاس والے حصہ کو پھینک دیا جائے تو باقی پاک رہتا ہے۔امام بخاریؒ بھی اس کے قائل ہیں۔مالکیہ کے نزدیک اگرچہ پانی کی نجاست کا دارومدار تغیر احد الاوصاف پر ہے لیکن مائع اشیاء پانی سے مختلف ہیں اس لئے ابن حبیب مالکیؒ اس کو نجس اور امام مالکؒ مکروہ کہتے ہیں جیسا کہ عارضۃ الاحوذی میں ہے۔جو حضرات گھی کے مائع اور منجمد حالتوں میں فرق نہیں کرتے وہ حدیث باب کے اطلاق سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں جامد کی قید نہیں۔لیکن جمہور کہتے ہیں کہ اول تو بعض روایات میں یہ فرق کیا گیا ہے جیسا کہ ابوداؤد[1] میں حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے "اذا وقعت الفارة فی السمن فان کان جامداً فألقوھا وماحولھا وان کان مائعاً فلاتقربوہ"۔ابن حبانؒ وغیرہ

باب ماجاء فی الفارة تموت فی السمن

[1] سنن ابی داؤد ص:۱۸۱ ج:۲ باب فی الفارة تقع فی السمن "کتاب الاطعمة"

نے اس کی تصحیح کی ہے [۲] اگر بالفرض یہ روایت صحیح نہ بھی ہوتو ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ یہ فرق ناگزیر ہے کیونکہ ماحول کا اطلاق ہی جامد کا تعین کرتا ہے کیونکہ مائع میں تو ماحول متصور ہے لیکن اس کا اخراج متحقق نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ جب اس میں چوہا گرے گا اور مرے گا تو وہ تہہ تک پہنچے گا اور سارے گھی کو متاثر کرے گا نیز جب ایک حصہ کو نکالا جائے گا تو وہ خلا خود بخود پُر ہوگا پس اس کا اخراج نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بات خود ابن العربی مالکیؒ نے بھی تسلیم کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"الثالثة :قال المفسرون "القوها وما حولها" يدل على انه جامد اذلو كان مائعاً لما كان حول"۔ (عارضہ)

پھر جمہور کا آپس میں اختلاف ہے کہ آیا اس گھی سے کھانے کے علاوہ دوسرا استفادہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو حنفیہ کے نزدیک اس کی بیع اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ مشتری کو بتلایا جائے کہ اس میں چوہا گرا اور مرا ہے۔ اسی طرح چراغ جلانے اور کشتیوں پر ملنے کا کام بھی اس سے لیا جاسکتا ہے۔ اور یہی ایک روایت امام شافعیؒ سے بھی ہے۔ (کمافی التحفہ) جبکہ ابن العربیؒ نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ مسجد کے علاوہ چراغ جلانے کا انتفاع جائز ہے۔ خود ابن العربیؒ کہتے ہیں کہ اس سے چراغ جلانا اور اس کے لئے بیچنا جائز ہے۔ (کذافی عارضۃ الاحوذی) علی ہذا امام مالکؒ واحمدؒ اور ایک روایت میں امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی بیع جائز نہیں گویا کہ ان کے نزدیک مطلق انتفاع سے روکا گیا۔ جبکہ فریقِ اول کے نزدیک "فلاتقربوہ" کا امر صرف کھانے سے روکنے کے لئے ہے۔ بذل المجہود میں ہے کہ امر حادث کی نسبت اقرب اوقات کی طرف کی جائے گی یہ ضابطہ اس حدیث سے فقہاء نے مستنبط کیا ہے کیونکہ جب گھی میں چوہا مرنے کا علم ہوا اور اس وقت گھی منجمد تھا تو اس میں اگرچہ یہ احتمال تھا کہ گرتے وقت گھی مائع ہو لیکن اس کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تدبر

قولہ "وحديث ابن عباس عن ميمونة اصح" یعنی یہ حدیث امام زہریؒ سے دو طرح مروی ہے ایک میں حضرت میمونہؓ کا ذکر نہیں ہے بلکہ ابن عباسؓ کی مسندات میں سے ہے، جیسا کہ اس سے سابقہ عبارت میں امام ترمذیؒ نے فرمایا "وقدروى هذاالحديث عن الزهرى" الخ جبکہ حدیثِ باب والی سند میں یہ "عن ابن عباس عن ميمونة" ہے اور یہی یعنی "کونہ عن ابن عباسؓ عن میمونۃؓ" زیادہ صحیح ہے۔ [۳]

---

[۲] راجع مصنفه ابن ابى شيبه ص: ۵۵۰ و ۵۵۱ ج:۵ "كتاب الاطعمة"، قالت عائشة: ان كان جامداً فالقها وماحولها وكل مابقى وان كان مائعاً فلاتاكله. ۱۲ الحنفى

قولہ "وروی معمر عن الزهری عن سعيد بن المسيب عن ابی هريرة" یعنی معمر نے اس کو ابوہریرہؓ کی مسانید میں ذکر کیا ہے جبکہ یہ حضرت میمونہؓ کی مسندات میں سے ہے اس پر امام بخاریؒ کا قول نقل کر کے معمر کی خطا کی تصریح کی ہے۔

باب ماجاء فی النهی عن الأكل والشرب بالشمال

"عن عبدالله بن عمران النبی صلى الله عليه وسلم قال:لاياكل احدكم بشماله ولايشرب بشماله فان الشيطان يأكل بشماله ويشرب بشماله"۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک بائیں ہاتھ سے نہ کھائے اور نہ ہی بائیں ہاتھ سے پیئے کیونکہ شیطان اپنے بائیں (ہاتھ) سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔

تشریح:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض اشیاء معزز و محترم بنائی ہیں۔ جبکہ بعض چیزیں خسیس قسم کی ہیں ان میں سے طیب، طیب کے مناسب ہیں اور ادنیٰ، ادنیٰ کے۔ چونکہ یمین، شمال سے افضل ہے اس لئے جتنے اچھے کام ہیں وہ دائیں ہاتھ سے سرانجام دینے چاہئے جبکہ ایسے کام جو اگرچہ طبعی طور پر ناگوار ہوں لیکن ان کی انجام دہی ایک مجبوری ہو وہ بائیں ہاتھ سے انجام دینے چاہئے جیسے استنجاء وغیرہ۔

چونکہ کھانا پینا اور رزق کی جملہ اشیاء محترم ہیں اس لئے ان کا تناول سیدھے ہاتھ کا وظیفہ مقرر ہے، علاوہ ازیں اُلٹا ہاتھ ناک صاف کرنے اور استنجاء وغیرہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے تو اس سے کھانے کے دوران ذہن اس طرف بھی جاسکتا ہے اور پاکیزہ انسان اس چیز کو بہت ناپسند کرتے ہیں، اور طبعی طور پر معدہ ایسی چیزوں کو جن کی رغبت کم ہو ہضم نہیں کر پاتا بلکہ بسا اوقات تو واپس بھی پھینکتا ہے اس لئے شریعت مطہرہ میں کھانے پینے کے لئے دایاں ہاتھ مختص ہے تاہم اس اختصاص کی نوعیت میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ظاہریہ کے نزدیک بائیں ہاتھ سے کھانا حرام ہے آدمی پر واجب ہے کہ وہ دائیں ہاتھ سے کھائے اور پیئے الا یہ کہ اسے کوئی عذر لاحق ہو۔ جبکہ جمہور کے نزدیک یمین سے کھانا پینا مستحب ہے۔ حافظ عراقیؒ نے شرح ترمذی میں اکثر شافعیہ سے بھی یہی نقل کیا ہے امام غزالیؒ اور امام نوویؒ نے اس پر جزم کیا ہے البتہ قاضی شوکانیؒ نے امام شافعیؒ سے وجوب نقل کیا ہے۔

---

۳ كذا فی مصنفه ابن ابی شيبه حواله بالا.

قائلین وجوب کا استدلال ان روایات سے ہیں جن میں یا تو امر کا صیغہ آیا ہے یا پھر شمال سے کھانے پر وعید وارد ہوئی ہے اور یہ دونوں وجوب کی علامات ہیں چنانچہ صحیحین[1] کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"کنتُ فی حجر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و کانت یدی تطیش فی الصحفة فقال لی: یاغلام سَمِّ اللّٰہ و کل بیمینك و کل ممایلیك "

یعنی میں ادھر اُدھر سے لیکر کھا رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ، سیدھے ہاتھ سے کھا اور اپنے آگے سے کھایا کرو! اور مسلم[2] میں روایت ہے کہ ایک آدمی بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو اسے منع کر کے فرمایا "کُل بیمینك " اس نے کہا "لااستطعتُ" (یہ کہنا تکبر کی وجہ سے تھا کہ میں دائیں سے نہیں کھا سکتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بددعا دے کر فرمایا) "قال لااستطعتَ فمارفعها الی فیه بعدُ" یعنی اس بددعا کا اثر یہ ہوا کہ وہ شخص سیدھے ہاتھ کے انتفاع سے اور اس سے کھانے کی استطاعت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔ اسی طرح باب کی حدیث میں بھی بائیں ہاتھ سے کھانے کے بارے میں سخت شناعت کا اظہار کیا گیا ہے۔

پھر باب کی حدیث کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک طیبی نے جیسا کہ محشی نے نقل کیا ہے یعنی شیطان الٹے ہاتھ سے کھانے پر آمادہ کرتا ہے گویا شیطان خود کھاتا پیتا نہیں بلکہ اپنے دوستوں کو غلط طریقے سے کھانے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن ابن العربیؒ نے عارضہ میں اس توجیہ پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ علی ہذا اس کا ظاہری مطلب ہی صحیح ہے کیونکہ شیاطین کا کھانا صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ (کمافی عارضۃ الاحوذی)

جمہور کا استدلال:۔ بایاں ہاتھ اگرچہ دائیں سے کمتر ہے مگر دھو کر صاف کرنے سے قابل استعمال بن جاتا ہے کیونکہ بذات خود اس میں کوئی گندگی کی چیز نہیں پائی جاتی البتہ اس کا درجہ یمین سے کم ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب لینا کہ وہ کھانے پینے کے لئے بالکل ناقابل استعمال ہے اور اس سے کھانا حرام ہے صحیح نہیں حضور

باب ماجاء فی النهی عن الأکل والشرب بالشمال

[1] صحیح بخاری ص: ۸۱۰ ج: ۲ باب التسمیة علی الطعام والأکل بالیمین "کتاب الاطعمة"، صحیح مسلم ص: ۱۷۲ ج: ۲ باب-آداب الطعام والشراب الخ "کتاب الاشربة". [2] صحیح مسلم ص: ۱۷۲ ج: ۲ "کتاب الاشربة".

صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یمین سے کھانے کو پسند اور شمال سے ناپسند فرماتے اس کا مقتضیٰ کراہت ہے نہ کہ حرمت۔ مثلاً بخاری شریف [۳] کی حدیث ہے۔

"كان النبى صلى الله عليه وسلم يعجبه التمين فى تنعله و ترجله وطهوره وفى شانه كله"۔

سنن ابی داؤد [۴] میں ہے۔

"عن عائشةؓ كانت يدرسول الله صلى الله عليه وسلم اليمنىٰ لِطهوره وطعامه وكانت يده اليسرى لخلائه وما كان من اذىً"۔ وغيرذالك من الاحاديث۔

لہٰذا جن حضرات نے وجوب تیمن اور حرمت تیاسر پر جو روایات پیش کی ہیں ہم ان کو ندب واستحباب تیمن اور کراہیت اُکل بالشمال پر محمول کرتے ہیں چنانچہ باب کی مذکورہ حدیث کے بارے میں امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں "فيه استحباب الأكل والشرب باليمين وكراهتهما بالشمال وقدزادنافع الاخذو الاعطاء الخ"۔ (مسلم ص ۱۷۶ ج ۱)

باقی رہا یہ مسئلہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں ہاتھ سے کھانے والے کے لئے بددعا فرمائی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بلاعذر نظر انداز کیا جس سے معارضہ کی صورت بن گئی اور وہ بددعا کا مستحق ٹھہرا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں "وفى هذاالحديث جوازالدعاء على من خالف الحكم الشرعى بلاعذر"۔ (حوالہ بالا) الکوکب الدری میں ہے کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کفار وغیرہ کی مشابہت بہر حال مذموم ہے خواہ وہ عمل کی جگہ میں موجود نہ بھی ہوں کیونکہ شیطان وہاں محسوس نہ تھا مگر پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تشبہ سے منع فرمایا۔ لہٰذا اگر کسی بستی یا شہر میں یہود وغیرہ نہ بھی ہوں تب بھی ان کی مشابہت ممنوع ہے۔

آداب:۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما کی مندرجہ بالا حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وفى هذاالحديث بيان ثلث سنن من سنن الاكل، (۱) وهى التسمية (۲) والأكل باليمين ... (۳) والثالثة الأكل مما يليه۔

---

[۳] صحيح بخارى ص: ۶۱ ج: ۱ باب التيمن فى دخول المسجد وغيره "كتاب الصلوٰة"، ايضاً ص ۲۹ ج ۱ باب الوضوء، ايضاً ص: ۸۱۰ ج: ۲ "كتاب الاطعمة"۔ [۴] سنن ابى داؤد ص: ۶ ج: ۱ باب كراهية مس الذكر باليمين "كتاب الطهارة"۔

یعنی شروع میں بسم اللہ پڑھنا، داہنے ہاتھ سے کھانا اور اپنے ہی آگے سے کھانا مسنون ہیں کیونکہ دوسرے کے استعمال کی جگہ سے کھانا سوء معاشرہ اور ترک مروت ہے کہ کبھی دوسرا آدمی اس سے گھن محسوس کرتا ہے خاص کر مائع اشیاء میں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں بلکہ ہر حالت میں اس پر عمل ہوسکتا ہے حتیٰ کہ کھانے پینے کے وقت بھی۔ اس سے کھانے کے آداب کی تعلیم سکھانا بھی ثابت ہوئی جبکہ باب کی حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وفیه انه ینبغی احتناب الافعال التی تشبه افعال الشیاطین و ان لِلشیطان یدین"۔ (نووی شرح مسلم ص:۱۷۲ ج:۲)

علاوہ ازیں یہ کہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھولینا چاہئے اگر شروع میں بسم اللہ بھول جائے تو کھانے کے دوران "بسم اللّٰه اوله و آخره" کہہ لے۔ کہا برتن کے کنارے سے کھانا چاہئے بیچ سے نہیں۔ اگر برتن میں مختلف اشیاء ہوں تو مرضی کے مطابق جہاں سے جی چاہے اٹھالے۔ اسی طرح حکم دسترخوان کا بھی ہے۔ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے کیونکہ یہ تدبیر منزل کے خلاف ہے۔ عورتوں کا مزاج ہوتا ہے کہ اس کے کسی کام پر اعتراض اس کو سخت تکلیف سے دوچار کرتا ہے۔ سب کو مل کر کھانا چاہئے۔ (نقشِ قدم بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ششم) کچھ مزید آداب واحکام اگلے ابواب میں بیان ہوں گے۔

باب ماجاء فی لعق الاصابع بعدالأکل

"عن ابی هریرة قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا أکل احدکم فَلْیَلْعَق اصابعه فانه لایدری فی ایتهن البرکة"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی ایک کھائے تو اپنی انگلیوں کو چاٹ لے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ برکت ان میں سے کس والی میں ہے۔

لغات:۔ "فلیلعق" یہ امر کا صیغہ ہے لعق باب سمع سے چاٹنے کے معنی میں آتا ہے۔ قوله "البرکة" خیر اور زیادتی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد تغذی اور نفع ہے چونکہ تواضع اور ثواب سب نفع اور فائدہ کی چیزیں ہیں اس لئے انگلیوں کے چاٹنے کو حصول برکت کا سبب قرار دیا۔

تشریح:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب آدمی کھانے سے فارغ ہوجائے تو اپنی انگلیاں چاٹ

لے کیونکہ کھانے کے بعض اجزاء میں برکت ہوتی ہے اور نہ جانے وہ برکت کس جزء میں پائی جاتی ہے ممکن ہے کہ ان انگلیوں میں ہو، جیسا کہ گرے ہوئے لقمے اور پلیٹ میں بچے ہوئے کھانے میں بھی یہ احتمال پایا جاتا ہے لہٰذا اس احتمال کے پیش نظر ان تینوں کا خیال رکھنا چاہئے۔علاوہ ازیں اگر وہ ان انگلیوں کو چاٹے بغیر تولیہ وغیرہ سے صاف کرتا ہے تو اس کا خراب ہونا یقینی ہے۔اور اگر دھوتا ہے تو اس میں کھانے کا ضیاع اور بے ادبی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس عمل سے وہ تکبر سے بچ سکتا ہے اس لئے یہ علاج سے کم نہیں۔

اس حدیث سے ان لوگوں کی تردید ہوئی جو انگلیوں کے چاٹنے کو عیب سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے انگلیاں لعاب آلود ہو جاتی ہیں۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے منہ میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں لگتا اس سے بذات خود آدمی کو یا دیکھنے والے کو گھن آتی ہے، لیکن اس کا یہ سفسطہ قابل التفات نہیں کیونکہ یہ لوگ کھانے میں چمچ کا استعمال کرتے ہیں اور اُسے بار بار منہ میں داخل کرتے ہیں پھر وہی لعاب آلود چمچ کھانے میں بھی ڈالتے ہیں۔اسی طرح دانتوں کی صفائی کے لئے برش کا استعمال کرتے ہیں اور پھر اسے پھینکتے نہیں بلکہ رکھ کر دوبارہ وسہ بارہ استعمال کرتے ہیں جب اس سے گھن نہیں آتی تو معلوم ہوا کہ اصل علت گھن کی لعاب نہیں بلکہ عادت کا نہ ہونا ہے چونکہ چمچ کی عادت ان لوگوں کو پڑ چکی ہے اس لئے اس سے کوئی گھن نہیں کرتے جبکہ انگلیوں کے استعمال کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے عار محسوس کرتے ہیں۔رہا دوسرے کا گھن کرنا تو یہ اس وقت ہے جب کھانے کے دوران انگلیوں کو بار بار چاٹتا رہے جو نہیں ہونا چاہئے اگر بالکل اختتام پر ایک آدمی اپنی انگلیوں کو چاٹتا ہے اور پھر وہ ہاتھ کھانے میں نہیں ڈالتا تو اس سے نفرت محض نفسیات پر مبنی ہے پھر تو آدمی کو ناک سے بھی گھن آنی چاہئے اور کوئی آدمی دوسرے کے سامنے کھانے کا قابل نہیں ہونا چاہئے بلکہ انسان میں اور بھی بہت سی اشیاء ہیں جو قابل نفرت ہیں۔اگر ان وساوس کی رعایت کی جائے تو اجتماعیت پارہ پارہ ہو جائے گی۔

اس باب میں بھی سابقہ باب کی طرح اختلاف ہے۔اختلاف اور استدلالات کی نوعیت بھی وہی ہے۔اہل ظواہر چاٹنے کو واجب جبکہ جمہور مستحب کہتے ہیں۔

پھر طبرانی[1] کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین انگلیوں سے کھاتے انگوٹھے، مسبحہ

باب ماجاء فی لعق الاصابع بعد الأکل

[1] کذا فی مجمع الزوائد ص:۱۵ ج:۵ رقم حدیث:۷۹۲۳ "کتاب الاطعمة" عن عامر بن ربیعة ان النبی ﷺ کان یاکل بثلاث اصابع ویعلقهن اذا فرغ، ایضاً ص:۱۹ ج:۵ حدیث:۷۹۴۱. الحنفی عفی عنه

اور درمیان کی بڑی انگلی۔ علی ہذا چاٹنے کی ترتیب یہ ہوگی کہ پہلے وسطی کو چاٹ لے پھر شہادت کی انگلی اور اخیر میں انگوٹھے کو جبکہ ان کا باطن منہ کی طرف ہو۔ تاہم عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ بوقت ضرورت پانچ انگلیوں کو بھی استعمال کرنا جائز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کی بوٹی ہاتھ سے تناول فرمائی ہے جو تین انگلیوں سے نہیں ہوسکتا۔ چاٹنے کے بعد ہاتھ کو کسی کپڑے سے خشک بھی کیا جاسکتا ہے اور دھویا بھی جاسکتا ہے خصوصاً اگر کھانے میں چکناہٹ یا مٹھاس ہو تو دھونا اور بھی زیادہ مؤکد ہوجاتا ہے کیونکہ نہ دھونے کی صورت میں ہاتھ پر مکھیاں بیٹھیں گی اور سونے کی حالت میں کوئی موذی کیڑے مکوڑے بھی کاٹ سکتے ہیں۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے ہاتھ کو سوتے میں چوہے نے کاٹ لیا ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے:

''من نام وفی یدی غمر (گوشت کی خوشبو) ولم یغسلہ فاصابہ شئی فلایلومن الانفسہ''۔ (باب فی غسل الید من الطعام، کتاب الاطعمہ [۲])

یعنی جو آدمی ہاتھ دھوئے بغیر سوجائے اور اس کے ہاتھ پر گوشت کی بو ہو (یا چکناہٹ مثلاً) اور اسے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ سوائے اپنے آپ کے کسی اور کو ملامت نہ کرے کیونکہ غلطی اپنی ہی ہے۔

باب ماجاء فی اللقمة تسقط

''عن جابران النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اکل احدکم طعاماً فسقطت لقمتہ فلیُمط مارابہ منھا ثم لیطعمھا ولا یدعھا للشیطان''۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی ایک کھانا کھا رہا ہو اور اس سے لقمہ گرجائے تو اس سے وہ چیز ہٹادے جو اسے تشویش میں مبتلا کررہی ہے پھر اسے کھالے اور اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے۔

لغات:۔ قالہ ''لقمتہ'' التقم الشئ، کسی چیز کے نگل لینے کو کہتے ہیں کمافی الایۃ ''فالتقمہ الحوت وھو مُلیم'' [۱] لقمہ کھانے کی وہ مقدار کہلاتی ہے جو ایک ہی دفعہ کھائی جانے والی ہو جسے نوالہ کہتے ہیں۔

---

[۲] سنن ابی داؤد ص: ۱۸۲ ج: ۲ ''کتاب الاطعمة''

باب ماجاء فی اللقمة تسقط

[۱] سورة الصافات آیت: ۱۴۲

قولہ "فلیمط" بضم الیاء وکسر المیم اماطۃ سے امر کا صیغہ ہے یعنی دور کردے۔ قولہ "ما رابہ" فلیمط کا مفعول بہ ہے "راب" اور "اراب" شک اور تشویش میں ڈالنا۔ "ریب" اور "ریبۃ" شک وشبہ، گمان اور تہمت کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ یعنی اگر اس نوالہ کے ساتھ کوئی ایسی چیز لگ گئی ہو جو ناگواری طبع کا باعث ہو بشرطیکہ وہ نجس نہ ہو تو اسے صاف کر کے کھالینا چاہئے۔ جبکہ نجاست لگنے کی صورت میں اسے کھانا جائز نہ ہوگا الا یہ کہ اسے دھویا جائے۔ اور اگر دھونے کے قابل نہ ہو تو کسی جانور بلی وغیرہ کو کھلایا جائے۔ بہرحال پوری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ کھانا کسی طرح ضائع نہ ہو خواہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

قولہ "ولا یدعہا للشیطان"[۲] لقمہ گرنے کی دو وجوہ ہوسکتی ہیں کبھی آدمی بسم اللہ پڑھے بغیر کھانا شروع کرتا ہے اس صورت میں یہ شیطان کی مداخلت سے بھی گر سکتا ہے جبکہ کبھی کسی اور سبب سے بھی گر سکتا ہے، پس اگر پہلی صورت ہو تو پھر اس جملے کا مطلب واضح ہے کہ شیطان کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کے اموال ضائع کردے اس میں وہ کامیاب نہ ہونے پائے۔ اور دوسری صورت میں جب وہ خود گرا ہو مطلب یہ ہوگا کہ ایسے نوالہ کو چھوڑنے کی وجہ سے لاپرواہی، تحقیر نعمت اور تکبر ہوتا ہے جو شیطانی اخلاق ہے چونکہ شیطان اس سے خوش ہوجاتا ہے لہٰذا اسے چھوڑ کر شیطان کو خوش نہ کیا جائے۔

حدیث آخر:۔ "عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اکل طعاما لَعِقَ اصابعہ الثلث وقال اذا وقعت لقمۃ احدکم فلیمط عنہا الاذی ولیاکلہا ولا یدعہا للشیطان وامرنا ان نَسلُتَ الصحفۃَ وقال انکم لاتدرون فی ایّ طعامکم البرکۃ"۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھانا تناول فرمالیتے تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کا لقمہ گر جائے تو اس سے قابل کوفت چیز یعنی عیب کو صاف کر کے اس کو کھالے اور شیطان کے لئے اس کو نہ چھوڑے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو رکابی کے صاف کرنے کا حکم دیا اور فرمایا تمہیں نہیں پتہ کہ تمہارے کھانے کے کس حصہ میں برکت ہے۔

لغات:۔ قولہ "الاذی" اَذِیَ الشیٔ، اذیً و اَذاۃً و اَذِیّۃً گندا ہونے، تکلیف اور نقصان کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد لقمہ کے ساتھ لگی ہوئی ایسی چیز ہے جس کے ہوتے ہوئے آدمی وہ لقمہ خوشی سے نہیں کھا سکتا جیسے کنکری اور مٹی وغیرہ۔ قولہ "نَسلُتَ" سلت الصحفۃ باب نصر سے برتن کو انگلی وغیرہ سے چاٹنے اور صاف کرنے

---

[۲] اسی مضمون کی روایت ابن ابی شیبہ نے بھی ذکر فرمائی ہے ص: ۵۵۸ ج: ۵ "کتاب الاطعمۃ"۔

کو کہتے ہیں۔ قولہ "الصحفة" وہ برتن جس میں تقریباً پانچ آدمی کھانا کھاسکیں۔ اس سے بڑا قصعہ کہلاتا ہے جس میں بیک وقت دس آدمی کھاسکتے ہیں اور سب سے بڑے طباق کو جفنہ کہتے ہیں۔

تشریح:۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے جیسا کہ سابقہ باب میں گذرا ہے چونکہ عام کھانا تین انگلیوں سے کھایا جاسکتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین پر اکتفا فرماتے ورنہ وہ کھانا جیسے چاول اور بڑی ہڈی وغیرہ جس میں باقی انگلیوں سے مدد لی جاتی ہے، اس میں جتنی انگلیاں آلودہ ہوجائیں سب کو چاٹنا ضروری ہوگا۔

غرض یہاں پر تین چیزوں کا بیان ہے، گرے ہوئے لقمہ کو صاف کر کے کھالیا جائے، انگلیوں کو چاٹ لیا جائے اور رکابی اور برتن کو بھی چاٹ کر صاف کیا جائے ان تینوں کی علت یہ بتلادی کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کھانے کے کس حصہ میں ہے۔ برکت لغت میں زیادتی اور خیر ملنے کو کہتے ہیں۔ یہاں برکت سے مراد کھانے کے منافع ہیں جیسے بھرپور غذائیت، عبادت کی طاقت اور کھانے کا موافق ہونا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ آدمی جو کھانا کھاتا ہے اس میں برکت تو ہوتی ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کس جزء میں ہے جو کھالیا اس میں یا جو برتن میں باقی ہے اور انگلیوں پر لگا ہوا ہے یا پھر گرے ہوئے نوالہ میں؟ لہٰذا تحصیل برکت کی غرض سے ان سب کا اہتمام کرنا چاہئے نیز اس میں کھانے کو ضیاع سے بھی بچایا جاسکتا ہے۔ تاہم ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہاں کوئی دوسرا کھانے والا موجود ہو تو اس کے لئے برتن میں کھانا چھوڑنا زیادہ بہتر ہے۔ غرض ہم برتن میں اتنا سالن نکالیں جو ہم بآسانی ختم کر بھی سکیں لیکن اگر زیادہ ہو یا کسی اور کو ضرورت ہو یا ضرورت تو نہ ہو لیکن اسے یقین ہو کہ اگر برتن میں سالن وغیرہ بچ جائے تو ضائع نہ ہوگا بلکہ کوئی دوسرا کھالے گا تو اس صورت میں صرف برتن کو صاف کرنے کی غرض سے سالن کو ختم کرلینا ضروری نہ سمجھا جائے ہاں سالن ختم ہوگیا اب صرف برتن صاف کرنے کا مرحلہ باقی ہے تو اسے صاف کرلینا چاہئے۔ اگر کسی علاقے میں مہمان کے سامنے زیادہ کھانا رکھنے کا رواج ہو یا کھانے پینے والا محترم سمجھا جاتا ہو تو ایسی صورت میں کچھ بچا کر چھوڑنا افضل ہے۔ قالہ النووی فی شرح مسلم

اسی طرح اگر لقمہ گر جائے اور اس کے ساتھ اتنی مٹی وغیرہ لگ جائے کہ اسے صاف کرنے میں مشقت ہو تو بوجہ تحقیر و تکبر اگرچہ چھوڑنا جائز نہیں مگر مشقت سے بچنے کی غرض سے اسے اٹھا کر کسی جانور کو جیسے پرندوں وغیرہ کو کھلایا جائے تو اس میں بھی ان شاء اللہ حرج نہ ہوگا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دسترخوان پر جو چاول کے دانے وغیرہ تھوڑا بہت کھانا گر جاتا ہے اسے کچرے

میں نہیں پھینکنا چاہئے بلکہ ایسی جگہ ڈالنا چاہئے جہاں سے پرندے وغیرہ کھاسکیں۔

تیسری حدیث:۔ حضرت ام عاصم فرماتی ہیں کہ حضرت نُبیشۃ الخیرؓ ہمارے یہاں تشریف لے آئے اور ہم ایک پیالے میں کھانا کھارہے تھے تو انہوں نے ہم سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی کہ جس نے کسی برتن میں کھانا کھایا اور پھر اسے چاٹ کر صاف کیا تو وہ برتن اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

فائدہ:۔ ''باب ماجاء فی فضل الحجرالاسود والرکن والمقام '' (تشریحات ص:۱۶۱ ج:۴) میں عرض کیا جاچکا ہے کہ اس قسم کی احادیث کو ظاہر پر حمل کرنا اولی ہے اور اس میں کوئی استبعاد بھی نہیں ہے کیونکہ ہر چیز میں اللہ نے کچھ نہ کچھ شعور رکھا ہے اور بولنے کی صلاحیت بھی، اسی بنا پر ہر چیز اللہ کی تسبیح وتنزیہ کرتی ہے آج کل تو لوہا بھی بولتا ہے۔

بعض حضرات نے اس کو سببیت کے معنی پر محمول کیا ہے کہ پلیٹ وغیرہ کو صاف کرنا تواضع اور متشرع ہونے کا عمل ہے جس سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور اس کا سبب برتن بنتا ہے اس لئے نسبت مجازاً اس کی طرف کی گئی۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی کراهیة الأکل من وسط الطعام

"عن ابن عباس عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال:ان البرکة تنزل وسط الطعام فکلوامن حافتیه و لاتاکلوامن وسطه"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک برکت کھانے کے درمیان اترتی ہے لہٰذا اس کے کناروں سے کھاؤ اور بیچ سے مت کھاؤ!

لغات:۔ قولہ "وسط" یہ لفظ بسکون السین اور فتح السین دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے تاہم فتحہ کی صورت میں اس کا اطلاق بالکل درمیان پر ہوتا ہے۔ جبکہ سکون کی حالت میں طرفین کے درمیان پورے حصے کو کہا جاتا ہے اس لئے کہتے ہیں ''المتحرك ساکن والساکن متحرك''۔

قولہ "حافتیه" حافۃ کا تثنیہ ہے فا کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے کنارہ کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث میں ایک اور ادب کھانے کا بتلادیا کہ کھانا ہمیشہ ایک جانب سے لینا چاہئے

درمیان سے نہیں خواہ چاول، ثرید اور سالن وغیرہ ہو یا خشک روٹی۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بیچ میں برکت نازل ہوتی ہے۔ اس برکت سے مراد اضافہ بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ بہت سی صحیح احادیث سے متعدد واقعات ثابت ہیں اور دیگر فوائد بھی مراد ہو سکتے ہیں جیسے کنارے سے کھانا عقل کے بھی موافق ہے اور فطرت کے بھی۔ نیز کنارہ سے کھانے کی صورت میں اگر ہاتھ سے کچھ گرے گا تو اس کے آگے والے حصے میں گرے گا جو دوسروں کے لئے سبب ناگواری نہ ہوگا جبکہ درمیان میں ہاتھ مارنے سے انقطاع برکت بھی ہوگا اور دوسروں کی ناگواری طبع کا سبب بھی بنے گا۔ پھر درمیانی حصہ پر نزول برکت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''خیر الامور اوسطھا'' کے بموجب افضل بھی ہے اور مشترک بھی۔ بہرحال اس حدیث کے مطابق کھانا درمیان سے نہیں کھانا چاہئے۔ بلکہ اپنے آگے سے ہی کھالینا چاہئے درمیان سے کھانا مکروہ ہے بلکہ امام شافعیؒ نے کتاب الام میں اس آدمی کے لئے جو اس حکم سے واقف ہو حرام قرار دیا ہے۔ اگر برتن میں مختلف اشیاء ہوں جیسے کٹے ہوئے مختلف پھل ہوں تو جو مرضی ہو اٹھالے۔ تاہم اس میں بھی مذکورہ ضابطے کو ملحوظ رکھے اور کوشش یہ ہونی چاہئے کہ درمیانی حصہ اخیر تک محفوظ رہے۔ چونکہ مشکوٰۃ وغیرہ کی روایت میں ''کلوا من حوانبها'' [1] کے الفاظ آئے ہیں۔ لہٰذا اس حدیث مذکور میں تثنیہ کے صیغے سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔

باب ماجاء فی کراھیة أکل الثوم والبصل

"عن جابر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم من أکل من ھذہ قال اول مرة الثوم ثم قال الثوم والبصل والکراث فلایقربنافی مساجدنا"۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اس سے کھایا پہلی مرتبہ فرمایا ''لہسن'' پھر فرمایا لہسن، پیاز اور گندنے میں سے تو وہ ہرگز ہماری مسجدوں میں ہمارے قریب نہ ہو۔

لغات:۔ قوله "الثوم" بضمہ ''ثاء'' لہسن۔ قوله "البصل" بروزن حجر و شجر پیاز۔ قوله "الکراث" بروزن رمّان گندنا۔ جس کے پتے پیاز اور لہسن کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں اور ہاضم اور بھوک بڑھانے والے

باب ماجاء فی کراھیة الأکل من وسط الطعام

[1] کذا فی مجمع الزوائد ص:۱۸ ج:۵ "کتاب الاطعمة"، مصنفه ابن ابی شیبه ص:۵۵۸ ج:۵ "کتاب الاطعمة"

ہوتے ہیں۔

تشریح:۔الثوم وغیرہ کومجرور پڑھا جائے گا پھر" قال اول مرة الثوم" الخ یہ شک اور تردید راوی کی ہے جیسا کہ ابن حجرؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔.

جمہور علماء کا مذہب اس بارے میں یہ ہے کہ یہ اشیاء بذاتِ خود حلال ہیں مگر بدبو کی علت کی بناپر یہ فرشتوں اور لوگوں کی اذیت کا سبب بنتی ہیں اس لئے جو شخص ان کو کھالے یا اس طرح کی کوئی بدبودار شے استعمال کرے جیسے سگریٹ اور بدبو والی دوا وغیرہ تو جب تک بدبو کا ازالہ نہیں ہوجاتا اس وقت تک مسجد میں آنا مکروہ تحریمی ہے۔اسی طرح ان اجتماعات میں بھی وہ شرکت نہ کرے جہاں لوگ جمع ہوجاتے ہیں خصوصاً عبادت کی غرض سے منعقد اجتماعات جیسے عیدگاہیں اور جنازگاہیں وغیرہ۔چونکہ محقق قول کے مطابق جماعت کی نماز واجب ہے اس لئے جماعت سے کچھ پہلے بھی ان اشیاء کا استعمال مکروہ ہے ہاں وقت زیادہ ہو یا اسے کھا کر کسی طرح بدبو کا ازالہ ہوسکتا ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

بہت سے حضرات نے غیر اختیاری بدبو کو بھی اس حکم میں شامل کرکے اسے مسجد میں جانے سے منع کیا ہے جیسے منہ کی بدبو، یا بدن پر کوئی ایسے پُھنسیاں ہوں جو بدبودار ہوں یا وہ کوئی ایسا کام کرتا ہو جس سے اس کے کپڑے بدبودار بنتے ہوں جیسے چمڑے اور مچھلیوں سے بننے والے دانے کی فیکٹری میں کام کرنے والے وہ مزدور جن کو اس سے بچنا مشکل ہو۔

پھر جمہور کے نزدیک یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ تمام مساجد کو شامل ہے۔

اس کے برعکس عام ظاہریہ کے نزدیک یہ اشیاء بذاتِ خود حرام ہیں کیونکہ یہ نماز باجماعت سے مانع ہیں جو ان کے نزدیک فرض عین ہے چونکہ مقدمۂ حرام، حرام ہوتا ہے اس لئے یہ اشیاء حرام ہی ہوں گی۔نیز قاضی عیاضؒ نے بعض اہل علم سے نقل کیا ہے کہ یہ حکم صرف مسجد نبوی تک محدود ہے کیونکہ بعض روایات [1] میں لفظ "مسجدنا" مفرد کے صیغے کے ساتھ آیا ہے پس یہ دو مسئلے اختلافی ہوگئے۔

پہلے مسئلے میں جمہور کے دلائل وہ روایات ہیں جو امام ترمذیؒ نے اگلے باب میں نقل کی ہیں۔علاوہ

باب ماجاء فی کراھیة أکل الثوم والبصل

[1] کذا فی مصنفه ابن ابی شیبه ص: ۵۶۱ ج:۵ "کتاب الاطعمة"، مجمع الزوائد ص:۴۳ ج:۵ "باب فی أکل الثوم والبصل" کتاب الاطعمة.

ازیں ابوداؤد [۲] کی متعدد روایات اور صحیحین [۳] کی احادیث اس بارے میں صریح ہیں کہ یہ اشیاء حلال ہیں گوکہ ان پر خبیث کا اطلاق ہوا ہے [۴] مگر اس سے مراد حرمت نہیں بلکہ ناگواری طبع کا موجب ہے۔اور جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو جمہور کہتے ہیں کہ ''مساجد'' کا لفظ جیسا کہ حدیث باب میں ہے یا''فلایقربن المساجد'' کا صیغہ جیسا کہ ابوداؤد میں ہے مطلق مسجد پر ناطق ہے لہٰذا جن روایات میں لفظ ''مسجد''مفرد کا صیغہ آیا ہے اس سے مراد جنسِ مسجد لی جائے گی۔اس پوری بحث کا خلاصہ بذل المجہود میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''وھذاالحدیث والاحادیث التی فی الباب تدل علی ان أکل البصل والکراث والثوم مطبوخاًکان اوغیرمطبوخ جائز وعلیہ ان یقعدفی بیتہ ولایحضرالمسجدوالجماعۃ حتی یذھب ریحہ و کذامن بہ جُرحٌ متعفن یخرج منہ رائحۃ وصاحب البخروالذفروالذی استعمل دواءً کریھۃ الرائحۃ یوذی الناس بریحہ لایجوزلھم الخروج الی المسجدوالشھودالی الجماعۃ۔''(بذل المجہود ص۳۶۳ ج۵، کتاب الاطعمۃ)

چونکہ اس نہی کی علت ایذا رسانی ہے خواہ فرشتوں کی تکلیف کا باعث ہو یا انسانوں کی، اس لئے ان اوقات میں پیاز وغیرہ بدبودار اشیاء کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے، جن میں ایک یا دونوں فریقین کی ملاقات متوقع ہو، لہٰذا درسِ قرآن وحدیث یا ان کتب کے درس کے وقت جن میں فرشتوں کی آمد ہوتی ہیں۔اسی طرح شادی شدہ شخص کے لئے رات کے کھانے کے وقت یا کوئی میٹنگ واجلاس وغیرہ متوقع ہو ان چیزوں کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔علماء فرماتے ہیں کہ کراماً کاتبین اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ممکن ہے کہ اللہ نے ان کے لئے کوئی ایسا انتظام فرمایا ہو جو اس بدبو سے تکلیف نہ اٹھاتے ہوں، یہی حکم حفظہ کا ہے۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ فرشتے اگرچہ کھاتے پیتے نہیں تاہم قوتِ شامہ ان کی انسانوں کی طرح ہے۔ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ فرشتے

---

[۲] سنن ابی داؤد ص:۱۷۹ و ۱۸۰ ج:۲ "باب فی الثوم" کتاب الاطعمة. [۳] صحیح بخاری ص:۱۱۸ ج:۱ "باب ماجاء فی الثوم النی والبصل الخ" کتاب الصلوة، ایضاً ص:۸۲۰ ج:۲ کتاب الاطعمة، صحیح مسلم ص:۲۰۹ ج:۱ "کتاب الصلاة"، ایضاً ص:۱۸۳ ج:۲ "کتاب الاشربة". [۴] کذا فی روایة ابن ماجه ص:۲۴۱ ابواب الاطعمة، ایضاً مصنفه ابن ابی شیبه ص:۵۶۱ ج:۵ کتاب الاطعمة، ایضاً سنن ابی داؤد ص:۱۷۹ ج:۲ کتاب الاطعمة.

بسیط مخلوق نہیں بلکہ مرکب ہیں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سارے فرشتے یکساں نہیں۔اگر کسی کو مزید تفصیل درکار ہو تو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ کی طرف مراجعت فرمائیں۔

باب ماجاء فی الرخصة فی أكل الثوم مطبوخاً

عن سماك بن حرب سمع جابربن سمرة يقول نزل رسول الله صلى الله عليه وسلم على ابى ايوب وكان اذاأكل طعاماًبعث اليه بفضله فبعث اليه يوماًبطعام ولم يأكل منه النبى صلى الله عليه وسلم فلماأتىٰ ابوايوب النبى صلى الله عليه وسلم فذكرذلك له فقال النبى صلى الله عليه وسلم فيه الثوم فقال يارسول الله أحرام هو؟قال"لا"ولكنى أكرهُه من اجل ريحه"۔

سماک بن حرب نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سنا ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (زمانہ ہجرت میں) ابوایوبؓ کے یہاں تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانا تناول فرماتے تو اپنا بچا ہوا انہی (ابوایوب) کے پاس بھیج دیتے چنانچہ ایک دن انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا پیش کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے تناول نہیں فرمایا پھر جب حضرت ابوایوبؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر نہ کھانے کے متعلق دریافت کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں لہسن تھا، اس پر ابوایوبؓ نے عرض کیا یارسول اللہ کیا لہسن حرام ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں مگر میں اسے بو کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں۔

تشریح:۔اس حدیث سے لہسن اور پیاز وغیرہ کی کراہیت کی وجہ معلوم ہوئی جو بو ہے اس کی قدرے تفصیل سابقہ باب میں گذر چکی۔دوسرا حکم یہ معلوم ہوا کہ ایسے آدمی کے لئے جس سے صاحبِ خانہ وغیرہ عقیدت رکھتے ہوں تبرک کی غرض سے کچھ کھانا پینا بچانا چاہئے۔امام نوویؒ نے اس کو مستحب قرار دیا ہے۔اسی طرح اگر گھر والے مہمان کے سامنے ضرورت سے زیادہ کھانا پیش کرتے ہوں یا وہ لوگ خود ضرورت مند ہوں تو بھی بچانا چاہئے اگرچہ بچا ہوا تھوڑا ہی کیوں نہ ہو اور اس لئے بھی تاکہ گھر والوں کو اطمینان ہو جائے کہ مہمان نے پیٹ بھر کے کھالیا ہے۔

حدیث باب کا واقعہ ان دنوں کی بات ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی مقام قبا سے مختلف قبائل کے محلوں سے ہوتی ہوئی موجودہ مسجد نبوی کے دروازے پر آکر بیٹھ گئی تھی اور حضرت ابوایوب انصاریؓ نے پالان

اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ دیا تھا اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مہمان بن گئے تھے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ حضرت ابوایوب خالد بن زیدؓ فرماتے ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچا ہوا کھانا واپس فرماتے تو جس مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک پڑتا میں اور ام ایوب (اہلیہ) اس مقام کو تلاش کرتے اور برکت حاصل کرنے کے لئے اسی مقام سے کھاتے۔ چنانچہ ایک رات ہم نے کھانے میں پیاز یا لہسن ڈالا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واپس فرمایا جس کا ذکر حدیث باب میں ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت امام ترمذیؒ نے حضرت ام ایوبؓ سے نقل فرمائی ہے بتاتی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں تشریف لائے تو انہوں نے یعنی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پُرتکلف کھانا تیار کیا جس میں بعض سبز سبز چیزیں یعنی بو والی سبزی تھی (جیسے پیاز، لہسن یا گندنا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا تناول فرمانا پسند نہیں کیا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا تم اسے کھالو کیونکہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اپنے ساتھی (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کو تکلیف نہ پہنچاؤں۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مذکورہ اشیاء حلال ہیں اور یہ کہ یہ حکم سب فرشتوں کی بابت نہیں ہے جیسا کہ سابقہ باب میں بیان ہوا۔ اس باب میں بھی ابوالعالیہ کی روایت میں اسے حلال رزق کہا ہے۔ البتہ اگر ان چیزوں کو پکا لیا جائے جس سے ان کی بدبو زائل ہو جاتی ہے تو پھر ان کے کھانے میں کسی طرح کراہیت باقی نہیں رہتی جیسا کہ اسی باب میں حضرت علیؓ کی روایت میں اس کی تصریح ہے اور امام ترمذیؒ نے اسی مقصد کے لئے یہ باب باندھا ہے۔

باب ماجاء فی تخمیر الاناء واطفاء السراج والنار عندالمنام

"عن جابر قال قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اَغلِقُوا الباب وَاَوکُوا السقاء واَکفِئُوا الإناء او خَمِّروا الاناء وَاَطفِئُوا المصباح فان الشیطان لایفتح غُلُقاً ولا یَحِلُّ وِکاءً ولایکشف انِیَةً فان

باب ماجاء فی الرخصة فی أکل الثوم مطبوخاً

[1] کذا فی مصنفه ابن ابی شیبه ص: ۵۶۰ ج: ۵ "من یکره أکل الثوم" کتاب الاطعمة، عن ام ایوب قالت نزل علینا النبی ﷺ فصنعنا له طعاماً فیه من بعض البقول فکرهه فقال، انی لست مثلکم انی اخاف ان اوذی صاحبی. الحنفی عفی عنه

الفويسقة تُضرِم علی الناس بيتهم"۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دروازہ بند کیا کریں اور مشکیزہ کے منہ کو باندھ لیا کریں اور برتن کو الٹا رکھ دیا کریں یا برتن کو ڈھانپ دیا کریں اور چراغ بُجھا دیا کریں (یعنی سوتے وقت) اس لئے کہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھول سکتا اور نہ ہی مشکیزے کا منہ کھول سکتا ہے اور نہ ہی کسی برتن کو کھول (سیدھا کر) سکتا ہے اور اس لئے کہ چوہا لوگوں کے گھر جلا دیتا ہے۔

لغات:۔قولہ "اغلقوا" اِغلاق سے امر کا صیغہ ہے غَلَق بندش کو کہتے ہیں۔قولہ "اَوکُوا" بفتح الهمزہ وضم الکاف اِیکاء سے ہے جو وِکاء یعنی ڈوری سے باندھنے کو کہتے ہیں۔قولہ "السِقاء" بکسر السین مشکیزہ کو کہتے ہیں۔قولہ "اکفِئوُ" کَفأ کے معنی الٹا کرنے کے ہیں پس یہ اِکفاَ سے امر کا صیغہ ہے یعنی اگر برتن خالی ہو تو اسے الٹا کر کے رکھ دو ورنہ اسے ڈھانپ لیا جائے جیسا کہ اگلے جملے میں ہے۔قولہ "او خَمّروا" تخمیر کے معنی ڈھانپنے کے ہیں چنانچہ شراب کو خمر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ عقل کو نشے کے غلاف میں چھپا دیتی ہے۔اسی طرح دوپٹے کو خمار بمعنی ساتر کہتے ہیں۔

قولہ "اطفئوا المصباح" مصباح بمعنی سراج اس چراغ کو کہتے ہیں جب وہ روشن ہو یعنی جل رہا ہو "اطـفـئـوُا" بفتح الهمزة وکسر الفاء وضم الهمزة الثانية بعد الفاء اطفاء سے امر کا صیغہ ہے آگ یا چراغ اور بتی وغیرہ بُجھانے کو کہا جاتا ہے۔قولہ "غلقاً" بضمتین مغلق یعنی بند شدہ کے معنی میں ہے۔قولہ "لا یحل" بضم الحاء، حل العقدة گرہ کھولنے کو کہتے ہیں۔کوکب میں ہے کہ یہ حلول سے بھی ہو سکتا ہے۔او حل خلاف العقد بھی یعنی کھولنے کے معنی میں۔بہتر یہ ہے کہ اسے حلول سے مانا جائے۔قولہ "وکاء" بکسر الواؤ ڈوری کو کہتے ہیں۔

قولہ "الفُویسقة" بضم الفاء فاسقة کی تصغیر ہے فسق سے ہے جو خروج من شئی الی شئی کو کہتے ہیں خصوصاً شے مذموم کی جانب نکلنے کو کہا جاتا ہے۔چوہا کو فویسقہ اس لئے کہا کہ یہ اپنے بل سے نکلتا ہے اور عموماً نقصان ہی کرتا ہے۔قولہ "تضرم" بضم التاء وسکون الضاد وکسر الراء "ضرم" کے معنی آگ بھڑکنے کے ہیں یعنی چوہا لوگوں کے گھروں کو خوب جلا دیتا ہے۔

تشریح:۔امام ترمذیؒ نے ترجمۃ الباب میں "عند المنام" قید کا اضافہ کر دیا ہے جس سے وہ ایک طرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ احتیاطی تدابیر رات کو سونے سے قبل اختیار کر لینی چاہئے کہ یہ مصلحتیں رات کو ملحوظ رہتی ہیں۔دوسری جانب یہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ احکام اگرچہ ترمذی کی پہلی روایت میں مطلق ہیں لیکن مسلم

وغیرہ[1] کی اور ترمذی کی دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے۔اور امام نوویؒ نے بھی اپنی تبویب میں ''عندالنوم'' کی قید کا اضافہ کیا ہے، اس لئے سرِ شام کے وقت بچوں کو باہر جانے سے روکنا چاہئے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دن کو ان آداب کی پابندی میں حرج ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ بقول ابن العربیؒ شیطان اگر چہ ناری ہے مگر اس کا دل سیاہ ہے جبکہ انسان اصلاً خاکی ہے لیکن اس کا دل نور ایمان سے منور رہتا ہے اس لئے شیاطین اندھیرے کو پسند کرتے ہیں اور انسان روشنی کو''وکل جنس یمیل الی جنسه وما یستریح به ''۔اس لئے وہ اندھیرے کی آڑ میں چیزیں بگاڑتا ہے۔نیز دن کو انسانی آنکھ کھلی رہتی ہے وہ اسباب کی حد تک اپنی اشیاء کی حفاظت کرتی ہے جبکہ رات کو وہ بند ہو جاتی ہے تو شیاطین کھل جاتے ہیں۔مسلم[2] کی روایات میں تسمیہ کا بھی ذکر ہے لہٰذا ان امور کی انجام دہی کے وقت بسم اللہ بھی پڑھ لے۔ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اگر چہ صرف بسم اللہ ہی اس مقصد کے لئے تنہا کافی تھی مگر عالم اسباب کے ضابطے کے مطابق تسمیہ کے ساتھ یہ تدابیر بھی بتلا دیں، اور یہ کہ ان اشیاء میں تاثیر اللہ کے نام سے ہے۔مسلم[3] کی ایک روایت میں ہے کہ سال میں ایک رات ایسی ہے جس میں وباء نازل ہوتی ہے وہ جس کھلے برتن یا مشکیزے سے گذرتی ہے تو اسی میں پڑ جاتی ہے۔امام لیث بن سعدؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں اعاجم سمجھتے ہیں کہ یہ رات کانون اول میں آتی ہے''کانون رومی سال کا تیسرا مہینہ ہے''۔ہمارے حساب سے یہ دسمبر کی چھ تاریخ یا تیرہ تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔

پھر برتن ڈھانکنے کے لئے کوئی دوسرا برتن نہ ہو جو اس پر رکھ دیا جائے تو دوسری روایت کے مطابق کم از کم ایک لکڑی ہی اس کی چوڑائی میں اوپر رکھ دیں۔چراغ اور آگ بجھانے کی حکمت یہ ہے کہ کبھی رات کو چوہا کوئی بتی، کپڑا یا گھاس وغیرہ لاتا ہوا وہاں سے گذرتا ہے یا شیاطین کے اُکسانے پر لاتا ہے، جس سے آگ لگ جاتی ہے۔ہم بچپن میں بھینسوں کے باڑے میں سردی سے بچنے کے لئے رات آنے سے پہلے آگ جلاتے اور پھر بجھانے کے لئے اس پر پانی پھیرتے۔کیونکہ ایسے بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں کہ کوئی چنگاری

باب ماجاء فی تخمیر الاناء واطفاء السراج والنار عند المنام

[1] صحیح مسلم ص: ۱۷۰ ج: ۲ ''باب استحباب تخمیر الاناء الخ'' کتاب الاشربة، ایضاً سنن ابن ماجه ص: ۲۶۷ ''باب اطفاء النار عندا المبیت'' کتاب الآداب، ایضاً ابی داؤد ص: ۳۶۵ ج: ۲ کتاب الآداب.

[2] صحیح مسلم ص: ۱۷۱ ج: ۲ کتاب الاشربة. [3] حواله بالا.

جو بے احتیاطی میں رہ جاتی ہے پورے باڑے کو جلا دیتی ہے۔

بعض لوگ مچھروں سے بچنے کے لئے مچھر بتی جلاتے ہیں ان کو بھی اس بارے میں احتیاط کر لینی چاہئے کہ وہ کپڑوں کے آس پاس نہ رکھیں۔

غرض پورا اطمینان کر کے سوجانا چاہئے۔ بعض لوگ تفریح وغیرہ پر جاتے ہوئے گھر کا دروازہ تو بند کر لیتے ہیں لیکن مین سوئچ بجلی کا بند نہیں کرتے جس سے کئی واقعات آگ لگنے کے رونما ہوتے ہیں۔ عام بلب میں یہ اندیشہ چونکہ نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ دیوار یا چھت پر لگا رہتا ہے اس لئے اگر زیرو واٹ کا بلب وغیرہ رات کو جلتا رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں دیہاتوں میں لوگ لالٹین جلاتے ہیں اس کی آگ شیشے میں بند ہونے کی وجہ سے محفوظ ہوتی ہے اُسے جلائے رکھنے میں بھی حرج نہیں۔ تاہم جو لالٹین خراب ہو اور وقتاً فوقتاً اس کی آگ بھڑکتی رہتی ہو تو اس میں احتیاط ضروری ہے۔

قولہ "فان الشیطان" الخ یہ تعلیلات ہیں بطور لف نشر مرتب کے۔ اور "فان الفویسقة" سے مزید تاکید کے لئے اسلوب کلام تبدیل فرمایا کیونکہ آگ کا انجام بہت ہی خطرناک ہے۔

بہشتی زیور کے دسویں حصے میں لکھا ہے کہ "جب برتن خالی ہو جائے تو اس کو ہمیشہ دھو کر الٹا رکھو اور جب دوبارہ اس کو برتنا چاہو تو پھر اس کو دھولو"۔ بہشتی زیور میں آداب کا کافی ذخیرہ موجود ہے اس لئے ہر شخص کو اس کا پڑھنا نہایت لازمی ہے۔ آج کل شوکیس کے استعمال کا رواج عام ہو گیا ہے چونکہ برتن شیشے کے اندر محفوظ ہوتے ہیں اس لئے اگر سیدھے بھی رکھ لئے جائیں تو کافی ہے گو کہ اس میں بھی ادب کا ظاہری تقاضا الٹا رکھنا ہی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی کراھیة القِران بین التمرتین

"عن ابن عمر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يقرِن بين التمرتين حتى يستأذن صاحبه"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کھجوروں کو ملا کر کھانے سے منع فرمایا ہے الا یہ کہ اپنے ساتھی سے اس کی اجازت لے لے۔

لغات: ۔قولہ "ان یقرن" قِران بکسر القاف سے مشتق ہے جس کے معنی ملانے کے ہیں چنانچہ حج

قران وہ منسک ہے جس میں عمرہ اور حج کو ایک ہی سفر اور احرام میں ملا کر ادا کرلیا جائے۔

تشریح:۔ مسلم[1] اور ابوداؤد[2] وغیرہما میں بالترتیب ''حتی یستأذن اصحابه'' اور ''الاان تستأذن اصحابك'' کے الفاظ ہیں۔ پھر بذل المجہود ج۵ ص۳۶۵ پر بحوالہ مجمع نقل کیا ہے کہ ''الاان تستأذن'' الخ ابن عمرؓ پر موقوف ہے۔ ابن العربیؒ نے عارضہ میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث صرف ابن عمرؓ ہی سے مروی ہے کہ جب وہ قحط والے سال کچھ لوگوں کے پاس سے گذر رہے تھے اور ابن الزبیرؓ ان کو کھلا رہے تھے تو ابن عمرؓ نے فرمایا:

''لاتقارنوافان النبی صلی الله علیه وسلم نهی عن الاقران ،ثم یقول:الاان یستأذن الرجل اخاه''۔

اس ارشاد پاک سے معلوم ہوا کہ کھجور اور اس طرح اور اشیاء جیسے انگور وغیرہ کو جب مشترکہ طور پر کھایا جارہا ہو تو دو۔ دو دانے اٹھا کر نہیں کھانا چاہئے کیونکہ اس میں یا تو دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے یا کم از کم آداب مجلس کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

پھر اس نہی کی حیثیت کیا ہے؟ تو قاضی عیاضؒ نے اہل الظاہر سے تحریم نقل کی ہے۔ مگر صحیح یہ ہے جیسا کہ امام نوویؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ یہ حالات پر منحصر ہے اگر کھجور وغیرہ مشترک ہے اور اس کے ساتھ قلیل بھی ہے تو پھر قران حرام ہے کیونکہ اس طرح جو بے حیا اور بے شرم ہوگا وہ جلدی جلدی کھا کر پیٹ بھرلے گا اور باحیا شرم کے مارے بھوکے رہ جائیں گے۔ اور کبھی سفر وغیرہ میں متبادل انتظام بھی نہیں ہوسکتا خصوصاً غربت کے شکار لوگ تو اس چیز کو بہت محسوس کرتے ہیں البتہ اگر ملکیت کسی ایک کی ہے، اور وہ خود شریک بن کر نہیں کھاتا بلکہ مہمانوں یا فقراء کو کھلا رہا ہے اور ان کو اجازت دیدی کہ جیسا کھانا چاہو اور جتنا کھاسکو کھالو۔ یا خود بھی شریک ہے مگر ان کو اجازت دیدی۔ یا سب شرکاء نے صراحتاً یا دلالۃً طے کرلیا کہ جو جیسا کھانا چاہے یا ان کو جلدی فارغ ہونا مطلوب تھا۔ یا کھانا صرف تلذذ کے لئے تھا تو اِن صورتوں میں قران جائز ہے۔ اسی طرح اگر مالک

باب ماجاء فی کراهیة القران بین التمرتین

[1] صحیح مسلم ص: ۱۸۱ ج: ۲ کتاب الاشربة. [2] سنن ابی داؤد ص: ۱۸۰ ج: ۲ "باب الاقران فی التمر عندالاکل" کتاب الاطعمة ولفظه : نهی رسول الله ﷺ عن الاقران الا ان تستاذن اصحابک، ایضاً سنن ابن ماجه ص: ۲۳۹ کتاب الادب، ایضاً مصنفه ابن ابی شیبه ص: ۵۶۲ ج:۵ کتاب الأطعمة، ایضاًمجمع الزوائد ص: ۳۶ ج: ۵ "باب القران فی التمر" کتاب الاطعمة

طعام خود قران کرنا چاہے تو بھی جائز ہے تاہم آداب مجلس کے خلاف ہے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ یا خود ایک ایک اٹھالے یا سب کو اختیار دیدے۔

بہر حال کوئی بھی کھانا جو دو یا دو سے زیادہ آدمی مل کر مشترکہ طور پر کھائیں تو یہ اگرچہ اس بات کی اجازت ہے کہ جس نے جتنا کھایا وہ اس کے لئے مباح ہے، تو یقیناً کوئی کم کھائے گا اور کوئی زیادہ کوئی بھی نوالے نہیں گنتا۔ تاہم ان تمام صورتوں میں عرف وعادت کالحاظ رکھنا لازمی ہے، اور عرف کے مطابق مہذب لوگ اپنے ساتھیوں کا خیال رکھنا ضروری سمجھتے ہیں وہ ایثار پر تو خوش ہوتے ہیں مگر دوسروں کا حق ضائع کرنا گوارا نہیں کرتے۔

جدید تحقیق کے مطابق دنیا میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو دوسروں کو کھلانے سے اتنی خوشی محسوس کرتے ہیں جو خود کھانے سے زیادہ ہوتی ہے اور تجربہ بھی اس پر شاہد ہے۔ گو کہ آج کل بخل کا دور دورہ ہے جو علامات قیامت میں سے ایک ہے۔

باب ماجاء فی استحباب التمر

"عن عائشة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: بیت لاتمر فیه جیاع اهله"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس گھر میں کھجور نہیں وہ اہل خانہ بھوکے ہیں۔

تشریح:۔ جیاع جائع کی جمع ہے۔ یہ ارشاد اہل مدینہ کے لئے ہے کیونکہ ان کی اکثر غذا کھجور ہی تھی لہٰذا جہاں لوگوں کی غذا کچھ اور چیزیں ہوں ان کو وہی اشیاء گھروں میں رکھنا چاہئے۔ تاہم کھجور کی شان جداگانہ ہے کہ اسے ہر وقت کھایا جاسکتا ہے، نہ پکانے کی زحمت اس میں ہے اور نہ ہی سڑ جانے کا اندیشہ پایا جاتا ہے اور سفر پر جاتے وقت بھی اپنے ہمراہ لے جائی جاسکتی ہے۔ بہر حال اس حدیث سے دو باتیں نمایاں طور پر ثابت ہوئیں ایک یہ کہ سال بھر کے لئے کھانے کا انتظام زہد اور توکل کے خلاف نہیں، کیونکہ کھجور کی فصل تو سال میں ایک دفعہ آتی ہے، جس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آئندہ فصل کی آمد تک اس کی ذخیرہ اندوزی جائز ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ گھر میں معمولی غذا بھی کافی ہے، زیادہ لحم شحم کے پیچھے بھاگنے اور اسے گھر میں ہر وقت رکھنے کی کیا ضرورت ہے، کیونکہ جس کے گھر میں کھجوریں ہیں وہ لوگ بھوکے شمار نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس حدیث

سے زہد کی ترغیب بھی معلوم ہوتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں مواسات کی ترغیب ہو کہ مدینہ منورہ چونکہ دارالہجرت تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ لوگ نو آمدہ مہاجرین کی مدد جاری رکھیں اس کے لئے ضروری تھا کہ گھروں میں اس کا انتظام موجود ہو، کیونکہ جب گھر کھجور سے خالی ہوں گے تو وہ لوگ مسافروں اور مہاجرین کی کیا خبر گیری کریں گے۔ علی ہذا ہر علاقے والے کے لئے اس نیت سے گھر میں ہر وقت دستور کے مطابق انتظام کر لینا چاہئے کہ اگر اچانک مہمان آجائیں تو ان کا اکرام و تواضع ہو سکے۔

باب ماجاء فی الحمد علی الطعام اذا فرغ منه

"عن انس بن مالك ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: ان اللّٰه لیرضیٰ عن العبدان یأکل الاکلة او یشرب الشربة فیحمده علیها"۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ اس بندے سے راضی ہوتے ہیں جو کوئی لقمہ کھائے یا کوئی گھونٹ پانی کا پیئے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرے۔

لغات: ۔قولہ "الاکلة" یہ اور "الشربة" فاءِ کلمہ کے فتحہ کے ساتھ یعنی اول میں ہمزہ مفتوح اور دوم میں شین مفتوح ہے مرۃ کے معنی میں آتے ہیں کیونکہ فعلہ بالفتح مرۃ کے لئے آتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُکلة میں ہمزہ مضموم ہو پھر نوالہ اور لقمہ کے معنی میں ہوجائے گا۔ قولہ "علیها" یعنی اکلہ او شربہ کے ہر ایک پر۔

تشریح: ۔اس پر اتفاق ہے کہ کھانے پینے کے بعد حمد مستحب ہے۔ تاہم اس کے الفاظ مختلف ہیں جن میں سے بعض امام ترمذیؒ نے شمائل ترمذی "باب ماجاء فی قول رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قبل الطعام وبعد مایفرغ منه" میں نقل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے الفاظ مروی ہیں۔[1] حمد کی اقل مقدار "الحمد للہ" ہے۔ شاید یہ اختلافِ الفاظ مختلف احوال کی وجہ سے ہو کہ کھانا جتنا اچھا ہو اللہ کی حمد اتنی زیادہ ہونی چاہئے۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ نے "تنبیہ الغافلین" میں ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ جس کھانے میں چار

باب ماجاء فی الحمد علی الطعام اذا فرغ منه

[1] راجع مجمع الزوائد ص: ۲۰ ج: "باب مایقول بعد الطعام" کتاب الاطعمة، ایضاً الترغیب والترهیب ص: ۱۰۶ ج: ۳ "الترغیب فی حمد اللّٰه تعالیٰ بعد الاکل"۔

باتیں ہوں وہ بہت عمدہ کھانا ہے (۱) حلال ہو (۲) شروع میں اللہ کا نام لیا گیا ہو (۳) کھانے والے زیادہ ہوں (۴) فارغ ہونے پر اللہ کی تعریف کی گئی ہو۔

تفسیر خازن میں سورۂ ہود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہما السلام سے گفتگو کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان فرشتوں سے پوچھا آپ کیوں نہیں کھاتے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ہم بغیر قیمت ادا نہیں کئے کھاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی قیمت تو ہے انہوں نے کہا کہ کیا قیمت ہے فرمایا: "تذکرون اسم اللّٰہ علی اولہ وتحمدونہ علی آخرہ" تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت میکائیل علیہ السلام کو دیکھ کر فرمایا: "حق لھذا ان یتخذہ ربہ خلیلاً"۔

ابن السنی المتوفی ۳۶۴ھ نے عمل الیوم واللیلۃ (ص ۴۱۵) میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث ذکر فرمائی ہے۔

"قال: کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا أکل طعاماً قال: الحمدللّٰہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمین"۔

یہ روایت ابوداؤد [۲] وترمذی میں بھی ہے۔

ملا علی قاریؒ اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ کھانے کے بعد حمد کرنا بطور شکر بھی ہے اور طلب زیادۃ بھی کیونکہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: "لئن شکرتم لازیدنکم" الآیۃ [۳] اور چونکہ کھانا کھانے سے تجدید نعمت ہوتی ہے اس لئے تجدید حمد بھی ہونی چاہئے، اور ساتھ اس کے بُرے اثرات سے استعاذہ وپناہ بھی ہے۔ پھر اس دعاء میں اہتمام شان اور مقتضائے حال کی وجہ سے حمد کو مقدم کیا۔ اور پانی کی ضرورت تو کھانے کی وجہ سے پیش آتی ہے اس لئے اس کے بعد "وسقانا" ذکر فرمایا۔ اور پھر نعمت ظاہری سے نعمت باطنی کی جانب انتقال فرما کر "وجعلنا مسلمین" فرمایا۔ (کذا فی المرقات) بہر حال یہ دعا کھانے کے بعد ہے۔ اور جب دسترخوان اٹھالیا جائے تو یہ پڑھے "الحمدللّٰہ کثیراً طیباً مبارکاً فیہ غیر مکفِیٍّ ولا مودع ولا مستغنیً عنہ ربنا" (کذا فی ابی داؤد، [۴] باب مایقول اذا طعم، من حدیث ابی امامۃ قال کان رسول اللّٰہ

---

[۲] سنن ابی داؤد ص: ۱۸۲ ج: ۲ "باب مایقول اذا طعم" کتاب الاطعمۃ، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۶ "باب مایقول اذا فرغ من الطعام" ابواب الاطعمۃ. [۳] سورۃ ابراھیم آیت: ۷. [۴] سنن ابی داؤد ص: ۱۸۲ ج: ۲ مکتبہ حقانیہ ملتان.

صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا رفعت المائدۃ الخ)۔

باب ماجاء فی الأکل مع المجذوم

"عن جابران رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أخذبیدمجزوم فادخلہ معہ فی القصعۃ ثم قال کُل بسم اللّٰہ ثِقۃً باللّٰہ وتوکلاً علیہ"۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کوڑھی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ پیالہ میں داخل کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ اللہ کا نام لیکر، اللہ پر بھروسہ اور اسی پر اعتماد کرتے ہوئے۔

لغات:۔قولہ "مجزوم" ای صاحب جذام ، جذام ایک مشہور بیماری ہے اردو میں اسے کوڑھ کہا جاتا ہے علی ہذا مجذوم کو کوڑھی کہیں گے۔قولہ "القصعۃ" اس کے بارے میں پہلے گذرا ہے یعنی وہ طباق جس میں دس آدمیوں کا کھانا آسکتا ہے۔قولہ "ثقۃ" مصدر ہے بمعنی الوثوق پھر یہ مفعول مطلق ہے فعل مذکور کا یعنی "کُل ثقۃ باللّٰہ"۔اسی طرح توکلا بھی کُل سے مفعول مطلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ عموماً کوڑھی اس عار سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کی بیماری دوسروں کو لگ جائے تو لوگ ملامت کریں گے ،اور کبھی وہ ان لوگوں کی اذیت سے بھی ڈرتا ہے جن کو وہ چاہتا ہے، جیسے بیوی بچے تو ان کے ساتھ بھی نہیں کھاتا یہاں تو حضور محبوب علیہ السلام تھے اس لئے وہ آدمی جھجک محسوس کررہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر اس کو تسلی دیدی کہ نہ تو آپ کو عار لاحق ہوگا اور نہ ہی ندامت۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا عامل مقدر ہو اور وہ واحد متکلم کا صیغہ ہو "ای کل معی أثِقُ ثِقۃً باللّٰہ وأتوکلُ توکلاً علیہ"۔

تشریح:۔ جذام کیا ہے؟ قرون وسطی میں یعنی پانچویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی تک جذام سے پوری دنیا میں ڈر موجود تھا لوگ کوڑھی کو مردہ قرار دے کر اسے علامتی جنازے اور تدفین کے بعد شہر بدر کرتے۔بعض علاقوں کے لوگ تو ملک بدری کے وقت اس کے گلے میں گھنٹی باندھ دیا کرتے ،تاکہ اس کے آنے پر دوسروں کو پتہ چل کر بھاگنے کا موقع مل سکے۔اگر وہ کسی غار میں رہائش پذیر ہوجاتا تو بعض خدا ترس لوگ اس کے کھانے کا انتظام یوں کرتے کہ کھانا لے جاکر اس سے دور رکھ کر اس کو آواز دیتے کہ آؤ کھانا لے جاؤ اور خود اس جگہ سے ہٹ جاتے۔ یہ بیماری آج کی طرح پوری دنیا میں پائی جاتی تھی، تاہم بنیادی طور پر یہ گرم اور مرطوب علاقوں کا مرض ہے پچانوے (۹۵) فیصد کوڑھی دنیا کے صرف گیارہ ممالک میں پائے جاتے ہیں

جیسے ہندوستان اور برازیل وغیرہ۔ اس بیماری کے ازالہ کے لئے علاج کے پروگراموں کی بدولت اس کی شرح میں کافی حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے اعداد وشمار کے مطابق ۱۹۸۵ء میں جذام کے رجسٹر مریضوں کی تعداد دنیا بھر میں ۵۴ لاکھ تھی اور تخمیناً یہ تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔

یہ بیماری ایک بیکٹیریا کی وجہ سے ہوتی ہے بیکٹیریاں عام جراثیم سے اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ یہ بجائے گرم حصہ کے نسبتاً ٹھنڈے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں مثلاً جلد، ناک اور منہ وغیرہ، جذام کی ایک قسم تو معمولی نوعیت کی ہے مگر دوسری قسم بہت خطرناک ہے، جذام کے جراثیم بدن میں داخل ہونے کے بعد دو سے دس سال تک جذام ہوسکتا ہے، اس سے جسم کے ٹھنڈے حصوں پر زخم آنا شروع ہوجاتے ہیں اور گہرے ہوتے ہوتے متاثرہ جگہ کو تقریباً ختم کردیتے ہیں خصوصاً ناک تقریباً ختم ہوجاتی ہے اور آدمی شیر جیسی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

مریض کی ناک کی رطوبت میں موجود بیکٹیریا، چھینک یا کھانسی میں خارج ہوجاتے ہیں، اور قریبی فضا میں تحلیل ہوکر دوسرے آدمی کے سانس کے ساتھ بدن میں داخل ہوجاتے ہیں جس سے جذام کا حملہ ہوسکتا ہے، خصوصاً زخم یا خراش کے راستہ سے داخل ہونے کا قوی اندیشہ رہتا ہے۔ تاہم سائنسدان اس کے پھیلاؤ کے اسباب جاننے میں ابھی تک سرگرداں ہیں کیونکہ جو لوگ جذامیوں کا علاج معالجہ کرتے ہیں، ان میں کم ہی شاذ ونادر اگر کوئی کیس ایسا ہوا ہو کہ ڈاکٹر یا کوئی ملازم اس بیماری کا شکار ہوا ہو لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے سائنسدان کہتے ہیں کہ اس کے متعدی ہونے کا امکان صرف پانچ فیصد ہے، اور اسباب کی لاعلمی ہی کی وجہ سے اس بیماری کے مکمل خاتمے کی تدابیر ابھی تک کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ ۹۵ فیصد سے زیادہ لوگوں میں خودکار مدافعتی نظام حملہ آور بیکٹیریا کو ہلاک کردیتا ہے۔ (مائیکروسوفٹ انسائیکلوپیڈیا)

اس تحقیق وتجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جذام عام وبائی امراض کی طرح متعدی بیماری نہیں ہے۔ اور حدیث باب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک اور حدیث میں کوڑھی سے بچنے کا صاف حکم آیا ہے "فر من المجذوم فرارك من الاسد"[1] اور مسلم شریف کی روایت میں

باب ماجاء فی الأكل مع المجذوم

[1] رواه البخاری ص: ۸۵۰ ج: ۲ "باب الجذام" كتاب الطب ولفظه: فر من المجذوم كماتفر من الاسد، ايضاً اخرجه بلفظه ابن ابی شيبة فی مصنفه ص: ۵۶۸ ج: ۵ كتاب الاطعمة، ايضاً اخرجه احمد فی مسنده كذا فی معجم المفهرس ص: ۳۳۰ ج: ۱، ايضاً اخرجه عبدالرزاق فی مصنفه ص: ۲۴ ج: ۱۰ حديث: ۴۳۴۵.

ہے کہ بنو ثقیف کے وفد میں ایک جذامی شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیج کر راستہ سے واپسی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ''ان قد بايعناك فارجع'' [۲] اور یہ تو بظاہر تعارض ہے۔

اس تعارض کو حل کرنے کے لئے علماء نے متعدد جوابات دیئے ہیں۔ جن میں سے سب سے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متعدی بیماری سے اسباب کی حد تک بچنا چاہئے لیکن اگر بیماری لگ جائے تو اس اختلاط اور مرض کی تعدی کو مؤثر حقیقی اور واجبی قرار دینا عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔ چونکہ لوگوں میں عام تأثر یہی پایا جاتا تھا کہ ایسے مریض سے اختلاط کی بناء پر لامحالہ بیماری لاحق ہو جاتی ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تأثر کو غلط ثابت کرنے کے لئے صاحب جذام کے ساتھ کھانا تناول فرمایا تاکہ اس عقیدہ کو باطل قرار دیدیں، جہاں تک اسباب کی حد تک متعدی ہونے کا تعلق ہے تو اپنی جگہ صحیح ہے، یعنی جیسے عام اسباب اپنے درجے میں کچھ تأثیر رکھتے ہیں۔ اسی طرح وبائی امراض کا حال بھی ہے۔ لہٰذا باب کی حدیث اسی طرح ''لاطيرة ولاعدوى'' الحدیث نفی عقیدہ باطلہ کے لئے ہے اور ''فِرّ من المجذوم فرارك من الاسد'' وغیرہ احادیث درجہ اسباب میں احتیاط کے طور پر تعلیم پر مبنی ہے۔

قولہ "هذا حديث غريب" اس حدیث کی تخریج ابوداؤد [۳]، نسائی [۴]، ابن ماجہ [۵]، ابن حبان اور حاکم [۶] نے بھی کی ہے۔ قولہ "والمفضل بن فضالة شيخ آخر مصرى" امام ترمذیؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ''مُفَضَّل بن فَضَالہ'' نام کے دو راوی ہیں ایک سے باب کی حدیث مروی ہے یہ بصری ہیں جو ضعیف من السابعہ ہیں۔ جبکہ دوسرے مصری ہیں وہ ثقہ ہیں گو کہ ابن سعد نے ان کو بھی ضعیف کہا ہے مگر یہ ان کا سہو ہے وہ ثامنہ میں سے ہیں۔ قولہ "وروى شعبة هذا الحديث" الخ یعنی شعبہ کی روایت میں یہ واقعہ حضرت عمرؓ کا ذکر کیا ہے تاہم یہ منقطع ہے مگر امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: ''وحديث شعبة اثبت عندى واصح'' اس واقعہ میں مجذوم کا نام حضرت معیقیب ہے۔

---

[۲] صحیح مسلم ص:۲۳۳ ج:۲ "باب اجتناب المجذوم" کتاب السلام، ایضاً رواه ابن ماجه ص:۲۵۳ ابواب الطب.
[۳] سنن ابی داؤد ص:۱۹۱ ج:۲ "باب فی الطيرة والخط" آخر كتاب الطب. [۴] سنن نسائی ص:۱۸۳ ج:۲ "بيعة من به عاهة" كتاب البيعة. [۵] سنن ابن ماجه ص:۲۵۳ "باب الجذام" ابواب الطب. [۶] ایضاً رواه ابن ابی شیبه فی مصنفه ص:۵٦٨ ج:۵ "الأكل مع المجذوم" كتاب الاطعمة

باب ماجاء أن المؤمن يأكل في مِعىً واحدِ

"عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الكافر يأكل في سبعة أمعاء والمؤمن يأكل في مِعىً واحد"۔ (حسن صحيح)[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کافر سات انتڑیوں میں کھاتا ہے اور مؤمن ایک انتڑی میں کھاتا ہے۔

لغات:۔ قولہ "أمعاء" بفتح الهمزة معی کی جمع ہے معی بکسر المیم بروزن إلی یعنی الف مقصورہ کے ساتھ بھی ہے اور یا پر تنوین بھی جائز ہے۔ جبکہ دوسری قرأت اس میں میم مفتوحہ والف ممدودہ کی ہے۔ اسے آنت بھی کہتے ہیں اور انتڑی بھی۔

تشریح:۔ اس حدیث پاک کا مطلب کیا ہے؟ تو اس بارے میں علماء وشارحین کے اقوال دس سے متجاوز ہیں، جن میں سے سات تو ترمذی کے حاشیہ پر بھی مذکور ہیں جو بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں اس لئے ان کو یہاں نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، امام ترمذیؒ کا اشارہ خاص واقعہ کی طرف ہے۔ ان تمام توجیہات میں ہمارے نزدیک سب سے عمدہ توجیہ یہ ہے کہ اس میں تمثیل اور مجازی معنی مراد ہے اور سات کا عدد حقیقی معنی پر محمول نہیں بلکہ مبالغہ پر حمل ہے جیسے اس آیت میں ہے" والبحر يمده من بعده سبعة ابحر "[2] پس مطلب یہ ہوا کہ کافر اتنا زیادہ کھاتا ہے گویا وہ سات یعنی بہت ساری انتڑیوں کو بھرتا ہے، یہ حکم اگرچہ بظاہر عام نہیں ہے کیونکہ بعض مؤمن کافر سے زیادہ کھاتا ہے، تاہم مؤمن اور کافر کے مقاصد میں فرق ہے کافر کا مقصد خواہش کی پیروی ہے جبکہ مؤمن کا مطلوب رضائے ربانی اور اس کے لئے عبادت پر تقویت حاصل کرنا ہے، اس لئے کافر کی کوشش پیٹ بھر کر کھانا ہوتا ہے جبکہ مؤمن کی کوشش کمر سیدھی رکھنا، تاہم اس کو ایک اور تقیید کی ضرورت ہوگی یعنی کامل مؤمن کی شان یہ ہوتی ہے کیونکہ عام مؤمن بھی اپنا اصلی مقصد سو فیصد ملحوظ نہیں رکھتا۔ البتہ اس مطلب میں

باب ماجاء ان المؤمن يأكل في معي واحد

[1] الحديث اخرجه عبد الرزاق في مصنفه ص: ۳۴ ج: ۱۰ حديث: ۴۳۷۶، ايضاً سنن ابن ماجه ص: ۲۳۴ ابواب الاطعمة، ايضاً مصنفه ابن ابي شيبه ص: ۵۲۹ ج: ۵ كتاب الاطعمة، ايضاً مسند احمد بن حنبلؒ ص: ۱۱۱ ج: ۲ حديث ۸۰۵۳ داراحياء التراث العربي بيروت. [2] سورة لقمن آيت: ۲۷.

عوارض کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ کبھی کافر ریاضت اور بیماری کی وجہ سے کم کھاتا ہے اور مؤمن معدے کی قوت یا مرض کی بنا پر زیادہ کھاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ عرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ یہ خبر بمعنی انشاء کے ہے، یعنی مؤمن کو مناسب یہ ہے کہ وہ کم کھائے، یہ ترغیب اگرچہ عام ہی ہے تاہم وقت اور حالات کے پیش نظر اس کا تقاضا متفاوت سمجھنا چاہئے۔ ہجرت کے زمانہ میں مہاجرین کو جس بھوک اور افلاس کا سامنا تھا اس کے بموجب مقامی لوگوں کو کم کھانے کی بارہا ترغیب دی جاتی جیسا کہ اگلے باب میں بھی ہے۔ اس کا نقد فائدہ یہ ہوتا تھا کہ نووارد مہمانان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انتظام آسان ہو جاتا۔ اسی علت کے پیش نظر حضرت عمرؓ کا قول بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ ابن العربیؒ نے عارضہ میں نقل کیا ہے "وقدهم عمرفی سنة المجاعة ان يجعل مع اهل كل بيت مثلهم "یعنی افلاس اور قحط والے سال حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ جس گھر میں جتنے افراد ہیں ان کے ساتھ اتنے ہی محتاجین شامل طعام کرلیں۔ مگر جب حالات اچھے ہوں اور زیادہ کھانے سے دینی فائدہ ہوتو پھر بجائے کم کھانے کے زیادہ کھانا افضل ہوگا کیونکہ مؤمن کی غرض اصلی تو دینی فائدہ ملحوظ ہونا چاہئے۔

چنانچہ ابن الجوزیؒ اپنی کتاب "صید الخاطر" میں لکھتے ہیں:

"وقدقال احمدبن حنبل :اكره التقلّل من الطعام فان اقواماًفعلوه فعجزواعن الفرائض وهذاصحيح فان المتقلل لايزال يتقلل الى ان يعجزعن النوافل ثم الفرائض ثم يعجز عن مباشرة اهله واعفافهم وعن بذل القوى فى الكسب لهم وعن فعل خيرقد كان يفعله ولايهولنك ماتسمعه من الاحاديث التى تحث على الجوع فان المراد بهااماالحث على الصوم واماالنهى عن مقاومة الشبع فاماتنقيص المطعم على الدوام فمؤثرفى القوى فلايجوز"۔ (صید الخاطر ص: ۲۲ دار الفکر)

مطلب یہ ہے کہ دینی فائدہ کے درپے رہنا چاہئے خواہ وہ کم کھانے میں ہو یا زیادہ میں اچھے کھانوں اور طاقت کی ادویات کا بھی یہی حکم ہے، کہ اگر ان کے استعمال سے نیکی کمانے کا ارادہ ہوتو وہ عبادت میں شامل ہو جاتے ہیں اور اگر غلط ارادہ اس کا باعث ہوتو وہ گناہ کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں، گویا نیت اور غرض ہی وہ چیزیں ہیں جو مباحات کو عبادات میں بھی تبدیل کرسکتی ہیں اور معصیت میں بھی۔ ہاں فوق الشبع بقصد شہوت حرام ہے یعنی اتنا کھانا کہ اس سے نقصان ہو (کمافی الدر المختار، کتاب الحظر والاباحۃ)

الاشباہ میں ہے'' الاکل فوق الشبع حرام بقصد الشھوۃ وان قصد بہ التقویٰ علی الصوم او مؤاکلۃ الضیف فمستحب''۔(الاشباہ والنظائر ص:۴۳ قدیمی کتب خانہ)

لہٰذا نہ کم کھانا مطلقاً محمود ہے اور نہ ہی زیادہ کھانا علی الاطلاق مذموم ہے، تاہم عام حالات میں کم کھانا نسبۃً اچھا ہے مگر اتنا کم بھی نہیں کہ اس سے نفس کا حق مارا جائے کیونکہ نفس کو قابو کرنا اگرچہ لازمی ہے مگر اس کی حق تلفی ہرگز روا نہیں۔

دوسری حدیث:۔امام ترمذیؒ نے ایک اور حدیث بھی نقل فرمائی ہے جس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک کافر مہمان ہوا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے واسطے (دودھ دوھنے کا) حکم دیا ایک بکری کے بارے میں چنانچہ وہ دوہ لی گئی تو اس نے سارا دودھ پی لیا پھر دوسری دوہ لی گئی، اس نے وہ بھی پی لیا پھر ایک اور تو وہ اس کو بھی پی گیا یہاں تک کہ وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا پھر صبح کو بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ایک بکری کا دودھ نکالنے کا حکم دیا جب وہ دودھ دوہا گیا تو اس نے وہ دودھ پی لیا پھر جب دوسری کا حکم دیا تو وہ پورا نہ پی سکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں پیتا ہے۔

تشریح:۔گویا امام ترمذیؒ کے نزدیک سابقہ حدیث کا پس منظر یہی ہے لہٰذا یہ ایک مخصوص واقعہ کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلام لانے سے اس آدمی میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیلاً اس پر بحث فرمائی ہے کہ ہر انسان میں دو نفس یا دو روحیں ہوتی ہیں ایک بہیمی دوسری ناطقہ اور ملکی کبھی ایک غالب رہتی ہے اور کبھی دوسری۔ لہٰذا جب وہ کافر تھا تو بہیمیت غالب تھی اور جب مسلمان ہوا تو ملوکیت غالب آئی۔ بہیمیت کا تقاضا زیادہ کھانا ہے اور ملکوتیت کا تقاضا کم کھانا۔

باب ماجاء فی طعام الواحد یکفی الاثنین

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: طعام الاثنین کافی الثلثۃ وطعام الثلثۃ کافی الاربعۃ"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو آدمیوں

کا کھانا تین کو کافی ہے اور تین کا کھانا چار کے لئے کافی ہوجاتا ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں مل کر کھانے اور کفایت شعاری کی ترغیب ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس کھانے سے دوآدمیوں کے پیٹ بھر سکتے ہیں وہ تین آدمیوں کی قناعت کے لئے کافی ہوجاتا ہے، مثلاً اگر دوآدمیوں کے لئے چار روٹیاں سیر ہونے کے لئے درکار ہوں تو اگر وہ ایک آدمی اپنے ساتھ اور شریک کر کے ہر واحد ڈیڑھ روٹی سے کچھ کم کھالیں تو یہ بھی کافی ہے کیونکہ اس صورت میں بھوک مارنے کی ضرورت یقیناً ختم ہوجائے گی اور ساتھ ساتھ ایک بھوکے آدمی کا کام بھی ہوجائے گا، علی ھذا القیاس جیسا کہ باب کی اگلی حدیث میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

اس حدیث کو بھی اسی طرح سمجھا جائے جو سابقہ باب میں بیان ہوا یعنی اس میں کم کھانے کی ترغیب اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور مواسات کو اُجاگر کرنا ملحوظ ہے، اور یہ کہ کم کھانے کے فوائد بہت ہیں جبکہ زیادہ کھانا نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے۔

آج کل کتنے لوگ ہیں جو زیادہ کھانے کی وجہ سے بیمار ہیں شوگر تو وبائی شکل اختیار کر چکی ہے، کم کھانے سے کوئی نہیں مرتا جبکہ کثرت سے کھانا جان لیوا ثابت ہوا ہے۔ آج اگر اس حدیث پر عمل ہوجائے اور سترہ کروڑ پاکستانی عوام اگر دن کے تین اوقات کے کھانے میں سے صرف ایک روٹی کم کرلیں تو یومیہ سترہ کروڑ روٹیوں کی بچت ہوگی جن سے بہت سارے غریب گھرانوں کی کفالت ہوسکتی ہے، اور یہ ممکن ہے کہ آٹے کے موجودہ بحران پر قابو بھی پایا جاسکے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی أکل الجراد

"عن عبداللہ بن ابی أوفی أنہ سئل عن الجراد فقال غزوتُ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سِتّ غزوات نأکل الجراد"۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی (نزیل کوفہ المتوفی ۸۷ھ) رضی اللہ عنہ سے ٹڈی کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھ غزوات میں شریک رہا ہوں، ہم ٹڈیاں کھاتے تھے۔

لغات:۔ "الجراد" بفتح الجیم وتخفیف الراء جمع کا صیغہ ہے مفرد جرادۃ ہے اس میں تذکیر و تانیث لفظ حمامۃ کی طرح برابر ہیں۔ بعض حضرات نے اس کو "جرد" سے مشتق مانا ہیں چونکہ جرد کے معنی ننگا کرنے کے ہیں

ٹڈیوں کا لشکر اور غول جس کھیتی سے گذر جائے تو اس کے پتے کھا کر ساری فصل کو پتوں اور پھلوں سے فارغ کر دیتا ہے۔

تشریح:۔ امام نوویؒ [1] نے ٹڈی کی حلت پر اجماع نقل کیا ہے گو بعض شافعیہ سے اس کی کراہیت منقول ہے تاہم اس میں اتنا سا اختلاف ضرور ہے، کہ آیا یہ بغیر ذبح کے محض مارنے سے حلال ہو جاتی ہیں یا ذبح شرطِ حلت ہے؟ تو امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ اور جمہور کے نزدیک ٹڈی جیسے بھی مر جائے اس کا کھانا جائز ہے چاہے ذبح سے مرے یا شکار کرنے سے خواہ شکار کرنے والا مجوسی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح خود مر جانے والی یا کوئی سبب رونما ہونے سے دم توڑنے والی سب برابر ہیں۔ جبکہ امام مالکؒ ما ہو المشہور کے مطابق اور ایک روایت میں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ تب حلال ہے جب اس کا سر کاٹ لیا جائے یا کوئی عضو کاٹ کر مارا جائے یا اسے زندہ آگ میں ڈال کر پکایا جائے۔ اگر وہ خود بخود مر جائے تو اس کا کھانا جائز نہ ہوگا۔ ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں فرمایا ہے کہ یہ حکم تمام ٹڈیوں کو شامل نہیں بلکہ بعض ٹڈیاں کھائی نہیں جا سکتیں۔

"والجراد اشکال: منه ماکول ومنه مالا یوکل لضرره وقلة فائدته فی التغذیة ...

وجراد الحجاز کله ماکول وجراد الاندلس غیر ماکول انما هو ضرر محض۔"

(عارضۃ الاحوذی)

المسترشد عرض کرتا ہے کہ ماہرین نے ٹڈیوں کی خاصیات میں یہ جو کہا ہے کہ اس میں دس جانوروں کے نمونے موجود ہیں کہ اس کی ران اونٹ کی مانند اور ٹانگیں شتر مرغ کی طرح اور دم سانپ جیسی اور گردن بیل جیسی وغیرہ وغیرہ تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ حکم تمام ٹڈیوں کو شامل نہیں کیونکہ ہم نے جو چھوٹی اقسام ٹڈیوں کی دیکھی ہیں ان میں یہ خواص نہیں پائے جاتے اس لئے بظاہر یہ وہ ٹڈیاں ہیں جو پرندوں کی طرح بڑی ہیں۔ پہلے زمانے میں ان کو قحط کی ٹڈیوں سے تعبیر کیا جاتا تھا، کیونکہ یہ غول در غول علاقے میں داخل ہو کر کھیتوں کا صفایا کر دیتی تھیں اور ریت میں جگہ بنا کر انڈے دیتی تھیں جبکہ بہت معمولی اور عام ٹڈیوں میں یہ چیز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا کھانا ثابت ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں دونوں قول ہیں

باب ماجاء فی أکل الجراد

[1] کذا فی النووی علی مسلم ص: ١٥٢ ج: ٢ "باب اباحة الجراد" کتاب الصید والذبائح.

عام یہی ہے کہ ثابت ہے کیونکہ بخاری[۲] اور ابوداؤد[۳] وغیرہ کی روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کی تصریح ہے۔ بخاری شریف اور ابوداؤد میں ''فکنانا کل معه'' کے الفاظ ہیں جس میں صرف موجودگی کا بیان بھی مراد ہوسکتا ہے کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھائی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تناول فرمانے کا ذکر بھی ہوسکتا ہے۔

باب ماجاء فی أکل لحوم الجلّالة و ألبانها

"عن ابن عمر قال نهی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن أکل الجلّالة و البانها"۔ (حسن غریب)[۱]

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جلالہ کے گوشت اور دودھ کے کھانے پینے سے منع فرمایا ہے۔

دوسری حدیث:۔"عن ابن عباس ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم نهی عن المجثمة وعن لبن الجلالة وعن الشرب من فی السقاء"۔[۲]

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجثمہ کے کھانے وجلالہ کے دودھ پینے اور مشکیزہ کے دھانے سے منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

لغات:۔قوله "المجثمة" اس کی قدرے تفصیل ابواب الصید میں گذری ہے وہاں امام ترمذیؒ نے اس پر باب باندھا ہے ''باب ماجاء فی کراهیة أکل المصبورة'' اس حدیث میں مجثمہ کی تفسیر بھی کی گئی ہے ''وهی التی تصبر بالنبل'' یعنی وہ جانور جو نشانہ بازی کے لئے باندھا اور تیروں سے نشانہ بنایا جاتا ہے، جس کا عربوں میں رواج تھا، ج، ث، م، مادہ میں زمین کے ساتھ چمٹنے کے معنی پائے جاتے ہیں، جس جانور کو باندھ لیا جاتا ہے وہ مجثمہ اس لئے کہلاتا ہے، کہ وہ اُڑنے اور بھاگنے سے قاصر ہو کر پیوست زمین رہتا ہے

---

۲ صحیح بخاری ص: ۸۲۶ ج: ۲ ج: ۲ "باب أکل الجراد" کتاب الذبائح و الصید الخ. ۳ سنن ابی داؤد ص: ۱۷۸ ج: ۲ "باب فی أکل الجراد" کتاب الاطعمة، ایضاً رواه مسلم ص: ۱۵۲ ج: ۲ کتاب الصید و الذبائح، ایضاً سنن نسائی ص: ۲۰۱ ج: ۲ کتاب الصید و الذبائح، ایضاً سنن کبری للبیهقی ص: ۱۲۱ و ۱۲۲ ج: ۱۴ کتاب الصید و الذبائح.

باب ماجاء فی أکل لحوم الجلالة و ألبانها

۱ الحدیث اخرجه ابوداؤد فی سننه ص: ۱۷۵ ج: ۲ کتاب الاطعمة، ایضاً سنن کبری للبیهقی ص: ۳۲۳ ج: ۱۴ حدیث: ۲۰۰۱۵ کتاب الضحایا. ۲ الحدیث اخرجه البیهقی فی سننه الکبری ص: ۳۲۴ حدیث: ۲۰۰۱۹ ج: ۱۴ کتاب الضحایا.

اگر ایسے جانور کو ذبح نہ کیا جائے تو وہ حلال نہیں، کیونکہ یہ ذبح اضطراری کے حکم میں نہیں۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ اس نہی کی دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ اس سے حیوان کو تکلیف اور اذیت ملتی ہے جو حرام ہے، دوسرے یہ بغیر ذبح کے مرجاتا ہے۔ علی ہذا اگر کوئی جانور از خود زمین سے چمٹا ہوا بیٹھا ہو تو اسے شکار کرنے میں کوئی کراہیت نہیں۔

قولہ "الجلالۃ" بفتح الجیم وتشدید اللام الاول وہ جانور جو مینگنیاں وغیرہ گندگی کھاتا ہو۔ بعض لوگوں نے جلالہ کے لفظ کی تشدید کو اور مبالغہ کے صیغے کو دیکھ کر کہا ہے کہ وہ جانور جو کثرت سے فضلہ کھائے خواہ وہ انسانی فضلہ ہو یا کسی اور جاندار کا۔ یہ لفظ دراصل "جِلّۃ" بالکسر سے بنا ہوا ہے جِلّۃ کے معنی مینگنیوں اور لید وغیرہ کے ہیں۔

تشریح:۔ گندگی کھانے والے جانور کے گوشت کھانے، دودھ پینے، اور اس پر سواری کرنے کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں:

تحفۃ الاحوذی میں امام خطابیؒ سے مذاہب کی تفصیل کچھ یوں نقل کی گئی ہے، کہ حسن بصریؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ جبکہ اسحاق بن راہویہؒ اچھی طرح دھونے کی شرط پر کھانے کے جواز کے قائل ہیں۔ باقی ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک اس کا کھانا مکروہ ہے یعنی تحریماً اگرچہ عام شافعیہ تنزیہی کے قائل ہیں۔ اور تقریباً یہی اختلاف جلالہ کے انڈے اور قربانی میں بھی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ایسے جانور کی قربانی نہیں کرنی چاہئے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جیسے انسان شراب پینے اور خنزیر کھانے سے ناپاک نہیں ہوتا ایسا ہی جلالہ نجس نہیں ہوتا۔ ہم نے کتاب کے شروع میں بتلایا تھا کہ قلب الحقائق سے حکم تبدیل ہوجاتا ہے لہٰذا جو چیزیں نجاست سے متولد ہوں مگر ان پر نجاست کا اثر نہ ہو جیسے گوبر میں سبزی اُگائی اور حقیقت تبدیل ہوجائے تو اعتبار مآل کو ہوگا، ہاں البتہ صرف صورت کی تبدیلی سے حکم تبدیل نہ ہوگا۔ لہٰذا اگر جلالہ کے گوشت وغیرہ پر گندگی کا کچھ اثر ظاہر نہ ہوا ہو تو اس کا کھانا اور دودھ استعمال کرنا جائز ہے، جیسا کہ بذل المجہود میں جلالہ کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ لکھتے ہیں:

"والجلالۃ التی تعاد أکل العذرۃ وھذا اذا ظھر اثر النجاسۃ فی لحمھا ولبنھا، واما مادام لم یظھر اثرھا یجوز اکلھا وبعد ظھور الاثر ینبغی ان تحبس حتی زال اثر النجاسۃ منھا"۔ (بذل ص۳۵۴ ج۵)

یعنی جلالہ وہ ہے جو کثرت سے گندگی کھانے کا عادی ہو پھر اگر اس پر اثرات رونما ہو جائیں [۳] تو جب تک باندھ کر اور متبادل غذا کھلا کر ان اثرات کا ازالہ نہ کر دیا جائے اس وقت تک اس کے کھانے سے اجتناب کر لینا چاہئے، گو کہ احتیاط اسی میں ہے کہ بغیر ظہور اثر کے بھی اسے کچھ دنوں تک باندھ کر پاک غذا کھلائی جائے چنانچہ ابن عمرؓ مرغی کو تین یوم تک باندھنے کے بعد ہی ذبح فرماتے۔

حدیث باب میں تیسرا مسئلہ مشکیزے کے منہ سے منہ لگا کر پانی پینے کی ممانعت ہے۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس نہی کی تین وجوہات ہیں: ایک یہ کہ اس طرح پینے سے منہ کے مستعمل پانی کا کچھ حصہ مشکیزے کے اندر واپس جا سکتا ہے۔ دوم یہ کہ منہ کی بُو کا اثر مشکیزے کے دھانے پر باقی رہ سکتا ہے جسے دوسرے لوگ پسند نہیں کریں گے۔ سوم یہ کہ اس طرح اندر کا پانی نظر بھی نہیں آتا اس لئے یہ امکان پایا جاتا ہے کہ کوئی ناگوار چیز منہ کے اندر چلی جائے چنانچہ ایک آدمی کے بارے میں آتا ہے کہ وہ منہ لگا کر پانی پی رہا تھا تو اس کے منہ میں مشکیزے سے سانپ چلا آیا نیز ایسا کرنے سے منہ میں یک دم زیادہ پانی جا سکتا ہے جو تکلیف کا سبب ہے اور کپڑوں پر گر سکتا ہے۔ اور جس روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اسی طریقے سے پانی نوش فرمایا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ علل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں پائے جاتے تھے "لبرکته وعطريته وطهارته وأمنه من الغوائل والحوادث"۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نہی اس واقعہ سے متاخر ہو۔ یا پھر وہ حاجت پر محمول ہے۔ (انتہی ما فی العارضہ)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ رات کو اندھیرے میں پانی پینا ہو تو اچھی طرح اطمینان کر لیا جائے کہ پانی بالکل صاف ہے۔ آج کل شہروں میں فریجوں کا استعمال عام ہے لوگ بوتلوں میں پانی رکھتے ہیں چونکہ پانی رکھتے وقت اس کا اطمینان کر لیا جاتا ہے اس لئے بند بوتل میں کسی چیز کے داخل ہونے کا امکان نہیں رہتا اس لئے بوتل کے ساتھ منہ لگا کر پانی پینا اس اعتبار سے تو جائز ہونا چاہئے لیکن اگر بوتل میں پانی رہ جاتا ہے اور دوسرے کی ناگواری طبع کا سبب بن رہا ہے تو پھر کراہت باقی رہے گی۔ اسی طرح اگر رات کو گلاس وغیرہ میں پانی ڈال کر پینا ہو تو بھی اطمینان کر لینا چاہئے کہ گلاس صاف اور خالی ہے۔

آج کل ڈبوں میں جوس ملتا ہے، چونکہ وہ پیک ہوتا ہے اور ایک ہی آدمی کے لئے ہوتا ہے پھر اسے

---

[۳] والجلالة، هي الابل التي يكون اكثر علفها العذرة وارواح العذرة توجد في عرقها وجررها. السنن الكبرى للبيهقي ص: ۳۲۳ ج: ۱.

گلاس میں نکالنا بھی کافی دشوار ہوتا ہے اس لئے نلکی کے ذریعے پینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس نلکی اور ڈبے کو پھینکا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی أکل الدجاج

"عن زهدم الجرمی قال دخلت علی ابی موسیٰ وهو یاکل دجاجة فقال اُدن فکل فانی رأیت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یاکله"۔ [1]

حضرت زہدم جرمی فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوموسیٰؓ کے یہاں گیا اور وہ مرغی کا گوشت کھا رہے تھے، انہوں نے فرمایا: قریب ہو جاؤ اور کھاؤ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغی کا گوشت تناول فرماتے ہوئے دیکھا ہے۔

لغات:۔ دجاج جمع ہے اور دجاجہ مفرد ہے دونوں میں دال پر تینوں حرکات جائز ہیں تاہم فتحہ سب سے اچھا ہے پھر کسرہ اور ضمہ کی صرف گنجائش ہے۔ بعض حضرات نے فتحہ مرغی کے لئے اور کسرہ مرغ کے لئے مختص مانا ہے، کاش وہ یہ فرق اس کے برعکس کرتے، تدبر۔ بہر حال دجاج اسم جنس ہے سب پر اطلاق ہوتا ہے مگر مفرد میں مرغ کے لئے دیک آتا ہے نہ کہ دجاجۃ۔ دجّ یدجّ کے معنی اسراع اور جلدی کرنے کے ہیں چونکہ مرغیاں بھی اکثر متحرک رہتی ہیں بار بار گھر سے باہر آتی جاتی ہیں اس لئے ان کو دجاج کہتے ہیں۔

قولہ "زهدم الجرمی" بفتح الزاء وسکون الہاء بروزن جعفر جرمی بفتحہ جیم وسکون الراء بصری اور ثقہ راوی ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث سے مرغی کے کھانے کا جواز ثابت ہوا جو بالاجماع حلال ہے۔ باب کی اگلی حدیث حسن وصحیح ہے علاوہ ازیں بھی متعدد صحیح احادیث سے مرغی کی حلت معلوم ہوئی ہے۔ گو کہ بعض نے جلالہ کو مستثنیٰ کیا ہے جس کا ذکر سابقہ باب میں گذر گیا۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں۔

"فالذی اکل النبی صلی اللّٰه علیه وسلم من اللحم الابل والبقر والغنم والدجاج والارنب والحمار الوحشی والحباریٰ"۔

باب ماجاء فی أکل الدجاج

[1] الحدیث اخرجه البخاری ص: ۸۲۹ ج: ۲ "باب لحم الدجاج" کتاب الذبائح، ایضاً صحیح مسلم ص: ۴۷ ج: ۲ کتاب الایمان، ایضاً سنن کبری للبیهقی ص: ۳۲۶ ج: ۱۴ حدیث: ۲۰۰۰۲۵۔

حباریٰ کا ذکر اگلے باب میں آرہا ہے۔

فارمی مرغیوں کا حکم:۔ آج کل فارم میں مرغیوں کو جو دانہ کھلایا جاتا ہے اس میں مچھلی اور خون کو ملایا جاتا ہے چونکہ دم مسفوح نجس اور حرام ہے اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان مرغیوں کا کھانا جائز ہے یا حرام و مکروہ اور یہ مسئلہ بھی بظاہر جلالہ کی طرف لوٹتا ہے تاہم جلالہ جو گندگی کھاتا ہے وہ عین نجاست ہوتی ہے جبکہ مرغیوں کا دانہ مکسچر ہوتا ہے نیز دوسری اجناس کے غلبہ کے علاوہ اس خون میں تبدیلی بھی لائی جاتی ہے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ اس غذا میں قلب الحقیقت کی بنا پر خون کا عنصر اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتا چنانچہ جلالہ کا حکم بھی یہی گذرا ہے کہ اگر اس کے جسم پر نجاست کا اثر و غیرہ نہ ہو تو وہ حلال ہے، جیسا کہ درمختار میں جلالہ کے بارے میں لکھا ہے:

"ولو اکلت النجاسة وغیرها بحیث لم ینتن لحمها حلت کما حل اکل جدی غُذِی بلبن خنزیر لأن لحمه لا یتغیر وما غذی به یصیر مستهلکاً لا یبقیٰ له اثر"۔

اس پر علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"وعن هذا قالوا: لا بأس بأکل الدجاج لانه یخلط ولا یتغیر لحمه وروی انه علیه الصلوٰة والسلام یأکل الدجاج وماروی ان الدجاج تحبس ثلاثة ایام ثم تذبح فذلك علی سبیل التنزه۔" زیلعی (الدرالمختار مع ردالمحتار ص ۳۴۱ ج ۶ کتاب الحظر والاباحة، ایچ ایم سعید کراچی)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف گندگی کے کھانے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا اثر بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔ اگر اثر رونما ہو کر باقی ہو تو ازالۂ اثر تک کھانا حرام ہے اور اگر اثر نہ پڑا ہو یا ختم ہو چکا ہو تو بلا کراہیت جائز ہے۔

قوله "وفی الحدیث کلام اکثر من هذا" یعنی یہاں پر امام ترمذیؒ نے اس حدیث کا صرف متعلقہ حصہ نقل کیا ہے ورنہ یہ کافی طویل حدیث ہے، پھر اس حدیث سے نسبۃً زیادہ حصہ مصنفؒ نے شمائل ترمذی میں "باب ماجاء فی صفة ادام رسول الله صلی الله علیه وسلم" میں ذکر کیا ہے۔

"عن زهدم الجرمی قال کنا عند ابی موسیٰ قال فقدم طعامه وقدم فی طعامه لحم دجاج وفی القوم رجل من بنی تیم الله احمر کانه مولی (رومی) قال فلم یدن فقال له ابوموسیٰ: ادن فانی قد رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم اکل منه قال انی رأیته یاکل شیئاً (گندگی) فقذرته فحلفتُ ان لا اطعمه ابداً"۔ (شمائل ص ۱۰، ایچ ایم سعید کراچی)

یہ حدیث زیادہ تفصیلی دیکھنی ہوتو عارضۃ الاحوذی وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔شمائل کے حاشیہ پر اس حدیث سے چند مسائل مستنبط کر کے لکھے گئے ہیں: (۱) جو آدمی عین کھانے کے وقت آجائے اس کو بھی دعوت دینا چاہئے (۲) اگر وہ انکار کرے تو اس کی وجہ پوچھی جاسکتی ہے بلکہ پوچھنا چاہئے (۳) اگر وہ وجہ ممکن الزوال ہو تو اس کا ازالہ کرلینا چاہئے (۴) اگر آدمی کسی چیز سے قسم کھائے مگر اس کی دوسری جانب مقابل شرع کے مطابق ہو تو قسم توڑلینا چاہئے (اور پھر کفارہ دے) (۵) اگر کوئی کام شرعاً منع نہ ہو گو نفس کو ناگوار گذرتا ہو تو اس پر چلنا چاہئے یعنی نفس کی پیروی کے بجائے شرع کا اتباع کرلینا چاہئے۔

ملحوظ:۔ بعض لوگ کھانے پینے کی چیزوں میں مہمان کو زبردستی کھلاتے پلاتے ہیں یعنی اتنا اصرار کرتے ہیں کہ مہمان اخلاقاً مجبور ہوجاتا ہے اگر مہمان ازراہ تکلف انکار نہ کرتا ہو تو اتنا اصرار اضرار کے زمرے میں آتا ہے، چنانچہ راقم کی زیادہ چائے پینے سے نیند بھی اڑجاتی ہے اور بھوک بھی مرجاتی ہے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں سے جب یہ عذر پیش کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ ایک کپ سے کچھ نہیں ہوتا اس طرح کبھی متعدد جگہوں سے کئی کپ پینے کی وجہ سے خواب آور گولی کھانے سے بھی نیند نہیں آتی اور بھوک نہ لگنے کی وجہ سے کمزوری بڑھ جاتی ہے آیا اس طرح کرنا مہمان نوازی کا اعلیٰ نمونہ ہے؟؟؟

باب ماجاء فی أکل الحُبارىٰ

"عن ابراهیم بن عمربن سفینة عن ابیه عن جده قال: اکلت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم لحمَ حُبارىٰ"۔[1]

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سُرخاب پرندے کا گوشت کھایا ہے۔

لغات:۔ قولہ "حُبارىٰ" بضم الحاء اخیر میں الف مقصورہ ہے اسم جنس ہے تذکیر وتانیث اس میں برابر ہیں۔ سرخاب یہ ایک لمبی گردن والا تیز رفتار پرندہ ہے جس کی چونچ طویل اور رنگ خاکی ہوتا ہے۔ حماقت میں ضرب المثل ہے مگر اس کے باوجود اپنے بچے سے شدید محبت کرتا اور اسے اُڑنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ کہتے

باب ماجاء فی أکل الحباریٰ

[1] الحدیث اخرجه ابو داؤد ص: ۱۷۶ ج: ۲ "باب فی أکل لحم الحباریٰ" کتاب الاطعمة.

ہیں کہ اس کے پیٹ میں ایک پتھر ہوتا ہے جو احتلام اور اسہال کے روکنے کے لئے مفید ہے۔

تشریح:۔ اس روایت سے سُرخاب کا حلال و ماکول ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔ روایت اگر چہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے تاہم اس مسئلہ میں کسی کو اختلاف نہ ہونے کی وجہ سے سند میں دونوں ابراہیم کی وجہ سے اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ سخاویؒ نے فتح المغیث میں لکھا ہے:

"وکذا اذا تلقت الامة الضعيف بالقبول يعمل به على الصحيح حتى انه ينزل منزلة المتواترفى انه ينسخ المقطوع به ولهذاقال الشافعىؒ فى حديث "لاوصية لوارث" أنه لايثبته اهل الحديث ولكن العامة تلقته بالقبول وعملوابه حتى جعلوه ناسخاًلِآية الوصية "۔ (ماتمس الیہ الحاجۃ دراول ابن ماجہ ص ۲۴ طبع قدیمی کتب خانہ)

قوله "ويقول بُريه بن عمر" یعنی ابن ابی فُدیک (مصغر) اپنی روایت میں ابراہیم کے بجائے بُریہ بصیغۂ تصغیر کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے بریہ کو لقب کہا ہے۔ امام بخاریؒ اور امام عقیلیؒ اس حدیث کو مجہول السند قرار دیتے ہیں مگر اس کا مضمون بلاشک صحیح ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ معلوم ہوا کہ کبھی حدیث سنداً ضعیف اور عملاً قوی و صحیح ہو سکتی ہے۔

باب ماجاء فى أكل الشِواء

"قال ابن جريج اخبرنى محمدبن يوسف ان عطاء بن يساراخبره أن أم سلمة أخبرته انها قربت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم جنباًمشوياً فأكل منه ثم قام الى الصلوٰة وماتوضأ"۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عطاء بن یسار کو خبر دی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بُھنا ہوا پہلو پیش کیا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے تناول فرمایا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور وضو نہیں کیا۔

لغات:۔ قوله "الشواء" بکسرۂ شین والف ممدودہ کے ساتھ تاہم شین پر ضمہ بھی جائز ہے بُھنا ہوا گوشت کہلاتا ہے۔ قولہ "جنبا" اس کے کئی معنی آتے ہیں، پہلو، سمت، گوشہ، کنارہ اور بدل و مقابلہ وغیرہ یہاں مراد معنی اول یعنی پہلو ہے جس کو بازو سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ قوله "مشوياً" مفعول کا صیغہ ہے شویٰ سے یعنی بُھنا ہوا، حنیذ و مسموط اس کے مرادفین ہیں یہ گوشت انگاروں میں دبا کر پکایا تا تھا۔ (لسان العرب)

تشریح:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قسم کا پکایا ہوا گوشت کھانا ثابت ہے۔ بھنا ہوا بھی جیسا کہ باب کی حدیث میں ہے۔ اور قدید بھی یعنی گوشت کی بوٹیاں دھوپ میں سکھا کر اس کا سالن بنایا جائے اور قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت حنیذ[1] کا جو ذکر آیا ہے، اس سے بھی مشوی یعنی بھنا ہوا مراد ہے۔ ان میں زیادہ لذیذ اگرچہ بھنا ہوا ہوتا ہے۔ تاہم ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ قدید زیادہ مفید ہے کیونکہ اس کی مدح اور ترغیب مروی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گوشت میں زیادہ شوربا بنانے پر زور فرماتے۔ دوسرے اس میں ثرید بھی بن سکتی ہے جو عمدہ کھانا شمار ہوتا ہے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ستر اونٹ نحر کرنے کے بعد ان سے ایک ایک بوٹی ہانڈی میں ڈالنے کا حکم فرمایا اور پکنے کے بعد اس کا شوربا نوش فرمایا۔ نیز ترمذی ہی میں ہے "ان المرق احد اللحمین "۔ (انتہی مافی العارضۃ) یہ حدیث عنقریب آرہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ لذیذ اور عمدہ کھانے جائز ہیں، البتہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ایسے کھانوں کی نوبت زندگی بھر میں شاید انتہائی کم مرتبہ پیش آئی ہوگی وہ بھی اس وقت جب کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کوئی مہمان آئے ہوں، اس کی شاید ایک بھی مثال نہ مل سکے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر یا خواہش کے اظہار پر ایسا کیا گیا ہو۔ لہٰذا ہونا یہ چاہئے کہ چاہت اور خواہش کے باوجود لذیذ کھانوں کے درپے نہیں ہونا چاہئے اور اس میں اسلام کا ایک بڑا فلسفہ مضمر ہے کیونکہ جو قوم لذیذ کھانوں کے درپے ہو جاتی ہے، وہ کام سے دور چلی جاتی ہے وہ عباد الرحمن کے بجائے عباد الزمان بن جاتی ہے جو وقت اور زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے خصوصاً قوم کے لیڈر اگر ایسا کریں تو اس کی تباہی ان کے سر پر منڈلانے لگتی ہے۔

ہمیں سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں فاقے، تکلیفات اور امت کے لئے آہ و بکا ہی نظر آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر اختیاری تھا وہ چاہتے تو قیصر و کسریٰ کی طرح سونے کی میز پر موتی کی طشتری میں کھا سکتے تھے لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو ان کا نام شاید آج تک منبروں اور گنبدوں کی پر کیف فضاؤں میں باقی نہ رہتا۔ والعیاذ باللہ

باب کی حدیث میں جس گوشت کا ذکر ہے وہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نوادرات میں سے

باب ماجاء فی أکل الشواء

[1] کما قال اللہ عزوجل، فمالبث ان جاء بعجل حنیذ سورۃ ہود آیت:۶۷.

ہے۔ جہاں تک عام زندگی کا تعلق ہے تو اس کا ذکر اور نقشہ حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے ''ما أکل النبی صلی الله علیه وسلم خبزاً مرققاً ولا شاة مسموطة حتی لقی الله عزوجل''۔ (رواہ البخاری [۲]) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چپاتی اور بھنی ہوئی بکری (کا گوشت) تناول نہیں فرمایا۔ تا آنکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے جا ملے۔ گویا باب کا واقعہ اتنا نایاب اور شاذ ہے جو کالمعدوم ہے۔ یا پھر حضرت انسؓ کو نادر ہونے کی بنا پر اس کا علم نہ ہوسکا اور سلب کلی کے طور پر بھنے ہوئے گوشت کے تناول فرمانے کی نفی کردی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مامست النار کے کھانے سے وضوء نہیں ٹوٹتا اس کا محلِ بیان ترمذی جلد اول ہے جس سے بحمد اللہ ہم فارغ ہو چکے ہیں۔

باب ماجاء فی کراهیة الأکل متکئاً

''عن ابی جُحیفة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: أما أنا فلا آکُلُ متکئاً''۔ [۱]

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاں تک میرے مزاج کا تعلق ہے تو میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا ہوں۔

لغات: قوله ''متکئاً'' اِتکاء سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ متکئ کون ہوتا ہے، اس کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ کسی چیز کے ساتھ ٹیک لگانے کو بھی کہتے ہیں، جیسا کہ ترجمہ میں یہی مطلب لیا گیا ہے چونکہ یہ اس لفظ کا ظاہری ومتبادر مطلب ہے اس لئے اسے اختیار کیا گیا، ورنہ حدیث کے سیاق کو دیکھتے ہوئے یہ مطلب متعین نہ سمجھا جائے جیسا کہ تشریح سے معلوم ہوگا۔ ایک جانب مائل ہو کر (بائیں) ہاتھ کے سہارے بیٹھنے کو بھی اتکاء کہتے ہیں اور چارزانو یعنی آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کو بھی اتکاء کہا جاتا ہے۔ بہت سے علماء کرام نے صرف پہلے دو معنی بیان کئے ہیں، جبکہ تیسرا مطلب اس حدیث کے اہم مطالب میں سے ہے چنانچہ ابن قیمؒ زاد المعاد میں متکئ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وفسر بالتربع وبالاتکاء علی الشئ وفسر بالاتکاء علی الجنب والثلاثة من

---

[۲] صحیح بخاری ص: ۸۱۱ ج: ۲ ''باب الخبز المرقق الخ'' کتاب الاطعمة.

باب ماجاء فی کراهیة الأکل متکئاً

[۱] الحدیث اخرجه ابوداؤد ص: ۱۷۳ ج: ۲ ''باب فی الأکل متکئاً'' کتاب الاطعمة، سنن ابن ماجه ص: ۲۳۵ ''باب الأکل متکئاً'' ابواب الاطعمة، ایضاً مصنفه ابن ابی شیبه ص: ۵۶۶ ج: ۵ کتاب الاطعمة.

الاتکاء"۔ (دیکھئے مختصر زاد المعاد ص ۲۴۷ طبع دار السلام ریاض)

اور ابن کثیرؒ سورۂ کہف آیت نمبر ۳۱ "متکئین فیھا علی الا رآئك" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"الاتکاء قیل الاضطجاع وقیل التربع فی الجلوس وھو أشبه بالمراد ھھنا ومنه الحدیث الصحیح اما انا فلا آکل متکئاً فیه القولان"۔

(تفسیر ابن کثیر ص ۸۴ ج ۳، قدیمی کتب خانہ)

تشریح:۔ مندرجہ بالا تینوں معانی ومطالب کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جائے گا، کہ کھانا کھاتے وقت ٹیک لگانا، آلتی پالتی مار کر بیٹھنا اور بائیں جانب جھک کر الٹے ہاتھ پر تکیہ لگانا خلافِ اولیٰ ہے۔

کھانے کے آداب میں سے بیٹھنے کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ یا تو آدمی دوزانو پنجوں کے بل بیٹھے جیسا کہ حضرت انسؓ کی روایت میں ہے: "رأیت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم مقعیاً یاکل تمراً" (مسلم ج ۲ ص ۱۸۰، طبع قدیمی کتب خانہ) اور یا پھر بائیں پاؤں کو بچھا کر داہنی پنڈلی کو کھڑا کر کے بیٹھ جائے۔ پہلی صورت میں آدمی جلدی فارغ ہو جاتا ہے اور یہی مطلوب شرعی بھی ہے چنانچہ مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

"عن انس قال أُتی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بتمر فجعل النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یقسمه وھو محتفز یاکل منه اکلاً ذریعاً وفی روایة زھیر "اکلاً حثیثاً"۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "ذریعاً اور حثیثاً" دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی جلدی کھانا تاکہ آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم جلدی اپنے کام کے لئے فارغ ہو جائیں۔ (مسلم ص ۱۸۰ ج ۲) اور علامہ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ محدّث کے لئے ضروری ہے، کہ وہ سریع المشی، سریع الکتابۃ اور سریع القرأت ہو پھر فرماتے ہیں:

"قال عبدالفتاح: وانا اضیف الی تلك الصفات الثلاث فی المحدث وفی طالب العلم ایضاً صفة رابعة وھی ان یکون سریع الأکل لکسب الوقت والاستفادة من الزمن الغالی وان قل"۔

(دیکھئے "صفحات من صبر العلماء علی شدائد العلم والتحصیل ص ۳۳۳ حاشیہ منہ نمبر ۵، المکتبۃ الغفوریہ کراچی)

اسی بنا پر بہت سے علماء ثرید کو اس لئے بھی ترجیح دیتے ہیں کہ اس سے وقت کی بچت ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ ایک ایک پیسہ بچانے کی فکر تو کرتے ہیں مگر ایک ایک لمحہ کی بچت سے بے نیاز رہتے ہیں حالانکہ ایک ایک لمحہ ایک روپیہ سے کئی گنا زیادہ قیمت رکھتا ہے اس سے زیادہ افسوس ان علماء وطلبہ پر ہے،

جو وقت خرچ کرنے میں بڑا اسراف کرتے ہیں۔ حتی کہ ان کے بے دریغ خرچ سے عوام الناس نے بھی کہنا شروع کیا کہ مولوی لوگ تو فارغ ہی ہوتے ہیں، ان کا کام سوائے کھانے پینے اور سونے کے اور کیا ہے۔ اسی تأثر کی بنا پر جب کوئی آدمی ہم سے ملتا ہے تو ایک آسان مسئلہ پوچھنے کے لئے لمبی تقریر شروع کرتا ہے جیسے وہ ہمیں گپ شپ میں مصروف کر کے بڑا احسان کر رہا ہے۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ بات جلدی کرو ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے تو اسے تعجب ہوتا ہے، خدارا اس تأثر کو توڑنے کی کوشش کیجئے۔

کھانے کے آداب کا ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ دونوں قدموں اور سُرین پر بیٹھ کر پنڈلیوں یعنی گھٹنوں کو کھڑا کر دیا جائے، مسلم کی جو حدیث اوپر اولاً ذکر ہوئی امام نوویؒ نے اس کا مطلب یہی لیا ہے، وہ لکھتے ہیں: قوله "مقعياً ای جالساً علی الیتیه ناصباً ساقیه"۔ (شرح نووی بر مسلم ص ۱۸۰ ج ۲، قدیمی کتب خانہ)

اگر کہا جائے کہ صرف قدموں پر بیٹھ جائے اور پہلی صورت میں تورّک کر کے بیٹھ جائے تو یہ بھی اس علت اور منشا کے عین مطابق ہوگا جس کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھنے کا مندرجہ بالا طریقہ اختیار فرمایا تھا۔ یعنی تواضع کرنا، کم کھانا اور کھانے کی قدر و اہتمام کرنا۔ تاہم اقعاء کی پہلی صورت شاید مجبوری میں اختیار کی گئی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں پر اقعاء کے وہی معنی متعین ہو جو امام نوویؒ نے ذکر کئے ہیں معنی اول مراد نہ ہو علی ہذا کہا جائے گا کہ بین السجدتین اقعاء سے مراد معنی اول اور کھانے میں ثانی ہیں۔ واللہ اعلم

بہر حال مذکورہ ہیأت کے علاوہ جو بھی طریقہ ہوگا وہ آداب کے منافی ہوگا۔ تاہم امام غزالیؒ نے پیاز کھانے کو کروٹ لگا کر کھانے کی کراہیت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ (کمافی التحفۃ) لہٰذا کہا جائے گا کہ پان، ٹافیاں اور چھالیا وغیرہ بھی مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔ ردالمحتار شامی میں ہے: "ولا بأس بالأكل متكئاً او مكشوف الرأس فی المختار"۔ (کتاب الحظر والاباحۃ، حاشیہ ردالمحتار ص ۳۴۰ ج ۶، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

اس میں "لا بأس" کے لفظ سے جہاں ایک طرف متکئ کھانے کے خلاف اولیٰ ہونے کی طرف اشارہ ہے وہیں دوسری جانب ننگے سر کھانے کو بھی خلاف اولیٰ قرار دیا جا رہا ہے۔

چونکہ متکئی کی مذکورہ صورتوں میں زیادہ قبیح شکل چار زانو یعنی آلتی پالتی مارنے کی ہے، کہ یہ متکبرین کا شیوہ ہے، اس طرح کھانا بھی زیادہ کھایا جاتا ہے۔ اور اہم نقصان یہ ہے کہ اس سے پیٹ بڑھ جاتا ہے اس لئے یہ ٹیک لگا کر کھانے کی نسبت زیادہ قابل احتراز ہے۔ اوپر ابن کثیر کا حوالہ بھی گذر گیا۔ جس میں انہوں نے حدیث کا مصداق اسی صورت کو بنایا ہے۔ تحفۃ الاحوذی میں ہے۔

"واختلف فی الکراهة واقوی ماوردفی ذالك مااخرجه ابن ابی شیبه[۲] من طریق ابراهیم النخعی قال: کانوایکرهون ان یأکلوا اتکاءً مخافة ان تعظم بطونهم والی ذالك یشیربقیة ماوردفیه من الاخبارفهوالمعتمد"۔

عرف الشذی میں ہے "واماالتربیع فحلوس قبیح"۔

امام ترمذیؒ نے ابواب الفتن میں صحیح حدیث نقل کی ہے:

"قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم:خیرامتی القرن الذی بعثتُ فیهم ثم الذین یلونهم ولااعلم اذکرالثالث ام لاثم ینشوءُ اقوام یشهدون ولایستشهدون ویخونون ولایؤتمنون ویفشوفیهم السمن"۔ (باب ماجاء فی القرن الثالث ص ۴۶ ج ۲، ایچ ایم سعید کراچی)

اس لئے موٹاپے کے شوق اوراس کے اسباب سے بچنا چاہئے تاہم بیٹھنے کی ہیئات سنن زوائد میں سے ہیں اس لئے مربع بیٹھنے سے گناہ نہ ہوگا۔

باب ماجاء فی حُبِّ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم الحلواء والعسل

"عن عائشة قالت کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یحب الحلوآء والعسل"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم میٹھی چیز اور شہد کو پسند فرماتے تھے۔

لغات:۔ "الحلواء" مداور قصر دونوں کے ساتھ پڑھنا لغۃً جائز ہے۔ عام علماء وشارحین ہر میٹھی چیز کو حلوا قرار دیتے ہیں۔ جبکہ امام خطابی وغیرہ فرماتے ہیں کہ حلوا کا اطلاق صرف ان میٹھی اشیاء پر ہوتا ہے جو مصنوع ہوں یعنی ان کو بنایا، یا پکایا جائے۔

تشریح:۔ اگر حلواء سے مراد مطلق میٹھی چیز ہوتو پھر اس کے بعد عسل کا ذکر، ذکر خاص بعد العام ہوگا جس سے شہد کی شرافت اور افادیت کو اُجاگر کرنا مراد ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث شریف میں ہے "الایمان بضع وسبعون شعبة...وفیه ...والحیاء شعبة من الایمان"۔ (متفق علیہ، [۱] مشکوٰۃ ص: ۱۲ ج: ۱)

---

[۲] مصنف ابن ابی شیبه ص: ۵۶۵ ج: ۵ کتاب الاطعمة.

باب ماجاء فی حب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم الحلواء والعسل

[۱] صحیح بخاری ص: ۶ ج: ۱ "باب امور الایمان الخ" کتاب الایمان، صحیح مسلم ص: ۴۷ ج: ۱ "باب بیان عدد شعب الایمان الخ" کتاب الایمان.

اور اگر حلواء سے مراد خاص اشیاء ہو۔ جیسا کہ امام خطابیؒ کی رائے کے حوالے سے گذر گیا یعنی جس میں صنعت کو دخل ہوتو پھر اس سے مراد وہ حلواء نہیں ہے، جو آج کل حلواء کے نام سے مشہور ہے جو آٹے سے بنایا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد کھجور ہے جو دودھ سے گوندھی جاتی تھی چنانچہ الکوکب الدری کے حاشیہ پر امام ثعلبیؒ کی کتاب اللغۃ سے نقل کیا ہے:

"ان حلوی النبی صلی اللہ علیہ وسلم التی کان یحبھا ھی المجیع بالجیم وزن عظیم وھو تمر یعجن بلبن وقد روی انہ کان یحب الزبد والتمر وفیہ رد علی من زعم ان المراد بالحلوی انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یشرب کل یوم قدح عسل یمزج بالماء واما الحلوی المصنوعۃ فما کان یعرفھا وقیل المراد بالحلوی الفالوذج (فالودہ) لا المعقودۃ علی النار۔

یعنی آگ پر پکایا ہوا آٹے کا بنا ہوا حلوا مراد نہیں ہے، تاہم اس حلوا کے کھانے اور پسند کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اس کو محض اس لئے اہمیت دینا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند فرماتے غلط تشریح ہے۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کا یہ مطلب نہیں، کہ وہ اس کے متلاشی اور طالب رہتے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب کھانے میں میٹھی چیز ہوتی تو اسے زیادہ شوق سے تناول فرماتے۔ جس سے اندازہ ہوتا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے۔ (کذا فی التحفۃ نقلا عن الخطابیؒ وابن التین)

علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرکہ کو پسند کرنا بھی ثابت ہے، حالانکہ وہ کھٹا ہوتا ہے اور بازو کا گوشت پسند کرنا بھی ثابت ہے تو یہ انسانی طبائع ہیں، جو مختلف ہوتے ہیں اور ایک ہی آدمی کی طبعیت میں مختلف رنگ دیکھے جاسکتے ہیں، آدمی ایک وقت میں ایک چیز کو پسند کرتا ہے اور دوسرے وقت بالکل مختلف شے کو چاہتا ہے۔ کما ھو المشاھد

اصل بات یہ ہے کہ جسم میں جس چیز کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، طبیعت خود بخود اس کی طرف بقدر ضرورت مائل ہوجاتی ہے، مثلاً جب بھوک لگتی ہے تو آدمی سیر ہونے تک کھاسکتا ہے زیادہ نہیں، پیاس کی صورت میں پانی کی طلب ہوتی ہے۔ خون کی کمی میں گوشت وغیرہ کا تقاضا بڑھ جاتا ہے، اور مرچ وغیرہ کھانے کے بعد میٹھے کی طلب شروع ہوجاتی ہے وبالعکس۔ لہٰذا محض اس حدیث کی بناء پر میٹھے کو مسنون سمجھ کر ثواب کی نیت سے کھانا مطلوب شرعی نہیں ہے۔ گو کہ کاملین کا حال یہ ہے کہ جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہوتی وہ

ان کو بھی طبعاً پسند ہو جاتی ہے، جیسے حضرت انسؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لوکی کے ٹکڑے رکابی میں ٹٹولتے ہوئے دیکھا تو ان کو بھی کدو طبعاً پسند ہو گیا [۲] ''ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء''۔ [۳]

باب ماجاء فی اِکثار المَرَقَةِ

''عن علقمة بن عبدالله المزنی عن ابیه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا اشتریٰ احدکم لحماً فلیکثر مرقته فان لم یجد لحماً اصاب مرقه وهو احد اللحمین''۔

حضرت عبداللہ مزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص گوشت خریدے تو اس کو چاہئے کہ اس میں زیادہ شوربہ بنائے کہ اگر اسے گوشت (کی بوٹی کھانے کو) نہ ملے تو شوربہ تو مل جائے گا اور وہ بھی گوشت کی (گویا) ایک قسم ہے۔

لغات:۔ قولہ ''مرقته'' مَرَق بفتحۂ میم وراء شوربہ اور مَرَقة بالتاء شوربے کی قسم یا تھوڑے شوربے کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ مذکورہ بالا حکم گوشت کی خریداری کے ساتھ مختص نہ سمجھا جائے بلکہ عام ہے، خواہ پکانے کے لئے خریدا ہوا گوشت ہو یا اپنے جانور کا یا کسی کی طرف سے ہدیہ کا گوشت ہو۔ بہرصورت ہونا یہ چاہئے کہ اس کو خشک تلنے اور بھوننے کے بجائے سالن کی شکل میں پکائے اور پانی نسبۃً زیادہ ڈالے۔ اس طرح اس کا نفع زیادہ ہو جائے گا۔ کہ اب وہ پانی حکماً گوشت کے مانند طاقت ور بن گیا کہ اس میں گوشت کی طاقت اور چکناہٹ منتقل ہو گئی اور لذت بھی گوشت جیسی ہے اس کا مشاہدہ گوشت کی یخنی اور سوپ میں کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس سے دوسروں کی خبر گیری بھی ہو سکتی ہے، کہ اڑوس پڑوس میں بھی دیا جا سکتا ہے، جیسا کہ باب کی اگلی حدیث میں ہے۔

باب کی پہلی حدیث اگرچہ محمد بن فضآء کی وجہ سے ضعیف ہے مگر اگلی حدیث سے اس مضمون کی تاکید ہوتی ہے۔

دوسری حدیث:۔ ''عن ابی ذر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لایحقِرَنَّ احدکم شیئاً من المعروف وان لم یجد فلیلق اخاه بوجه طلیق واذا اشتریت لحماً او طبخت قدراً فاکثر مرقته

---

[۲] کذافی صحیح البخاری ص: ۸۱۰ ج: ۲ ''باب من تتبع حوالی القصعة الخ'' کتاب الاطعمة، ایضاً ص: ۸۱۵ ج: ۲ کتاب الاطعمة. [۳] سورة الجمعة آیت: ۴ پارہ: ۲۸.

واغرف لِجارِكَ منه"۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، تم میں سے کوئی شخص نیکی کا کوئی بھی کام معمولی نہ سمجھے اور اگر (ہدیہ، برتاؤ کے لئے) کوئی چیز اسے نہ ملے تو اپنے (اسلامی) بھائی سے خندہ پیشانی سے تو مل لے اور جب تم گوشت خرید دیا ہانڈی پکاؤ تو اس میں شوربہ زیادہ بناؤ اور اس میں سے چلو بھر اپنے ہمسایہ کو دیدو۔

لغات وتشریح:۔ معروف کے معنی جانی پہچانی اور مانوس چیز کے ہیں چونکہ نیکی کے کام جیسے انصاف، امداد، خدمت، اکرام اور مالی تعاون وغیرہ لوگوں میں مشہور ہوتے ہیں، اس لئے ہر نیکی کو معروف کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نیکی کے کام شریعت میں اور مسلمانوں میں جانے پہچانے اور متعارف ہوئے ہیں، بخلاف منکر کے کہ وہ نا آشنا و نامانوس ہوتے ہیں جب لوگ اسے دیکھتے ہیں تو اس پر نکیر کرتے ہیں، یعنی مہذب اسلامی معاشرہ میں۔ قولہ "طلیق" بشاشت اور خوشی کو کہتے ہیں۔ بوجہ طلیق کے معنی ہیں، خندہ پیشانی، خندہ روئی، خوش مزاجی اور شگفتگی وشگفتہ روئی وہنس مکھ وغیرہ۔

یعنی آدمی کو دوسروں کا خیر خواہ ہونا چاہئے، اس کا سینہ جذبہ خیر رسانی سے لبریز ہونا چاہئے، اس سے جو کچھ ہو سکے دوسروں کو خیر اور فائدہ پہنچائے چاہے مالی ہو یا جانی۔ اگر کچھ نہ کر سکے تو کم از کم یہ تو کرے کہ جب دوسروں سے ملے تو اس انداز سے ملے کہ دوسرا دیکھ کر خوش ہو جائے، اور کسی مسلمان کے دل میں سرور وخوشی داخل کرنا بھی نیکی ہے۔ لہٰذا ملاقات کے وقت چاہئے کہ آدمی سلام میں پہل کرنے کی کوشش کرے اور اس کے ساتھ مسکراہٹ بھی اختیار کرے۔ تاہم بے ہودہ بکواس اور تمسخر یہ وقہقہہ دِلانے والا مزاح اس حدیث کا مصداق یا مراد نہیں ہے، جیسے بعض لوگ مذاق ہی مذاق کرتے رہتے ہیں، اور اس کے لئے لطیفوں اور جھوٹ یا فضول گوئی کو بنیاد بناتے ہیں۔

باب ماجاء فی فضل الثرید

”عن ابی موسی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: کمل من الرجال کثیرولم یکمل من النساء اِلامریم بنت عمران واسیۃ امرأۃ فرعون وفضل عائشۃ علی النساء کفضل الثریدعلی سائر الطعام“۔ [1]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں میں بہت سے لوگ کامل ہوئے۔ جبکہ عورتوں میں سے کامل نہ ہوئیں مگر مریم بنت عمران اور آسیہ فرعون کی بیوی اور عائشہ کی فضیلت و برتری عورتوں پر ایسی ہی ہے جیسے ثرید کی برتری باقی کھانوں پر۔

لغات:۔ قولہ ”کمل“ تینوں بابوں سے آتا ہے نصر، کرم اور علم سے لہٰذا میم پر تینوں حرکات پڑھنا جائز ہیں، کمال سے ماضی کا صیغہ ہے۔ کمال کی دو قسمیں ہیں (۱) کمال اول (۲) کمال ثانی۔ اول متمم الشی فی مرتبۃ الذات کو کہتے ہیں اور ثانی متمم الشی فی مرتبۃ الصفات کو کہا جاتا ہے۔ یہاں کمال ثانی کا بیان ہے کیونکہ بات صفات اور خوبیوں کی ہورہی ہے، نہ کہ ذات کی۔ قولہ ”الثرید“ بفتحۃ ثاء وکسرۂ راء بروزن عظیم وشریف، وہ کھانا جو شوربہ میں روٹی کے ٹکڑے ڈال کر بنایا جائے خواہ شور با گوشت والا ہو، اس میں گوشت بھی ہو یا کسی اور چیز کا جیسے ٹماٹر کا شوربہ ہو یا گوشت کا ہو مگر اس میں بوٹی نہ ہو۔

تشریح:۔ بعض روایات میں حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہؓ کا بھی بطور حصر ذکر ہے [2] چونکہ مردوں میں کاملین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لئے ان کے بیان میں کلام کو حصر سے خالی رکھا۔ جبکہ عورتوں کے کمال کے لئے ادوات حصر جو لم اور الا کے الفاظ ہیں ذکر فرمادیئے۔ بعض حضرات نے کمال سے مراد صفات نبوت پر فائز ہونا لیا ہے علی ہذا پھر یہ دونوں خواتین انبیاء کی جماعت میں شامل ہوں گی، یہ رائے امام اشعریؒ کی طرف

باب ماجاء فی فضل الثرید

[1] الحدیث اخرجه البخاری فی کتاب المناقب ”باب فضل عائشة رضی اللہ عنها“ ومسلم فی کتاب فضائل الصحابه والنسائی فی عشرة النساء، وابن ماجه ”باب فضل الثرید علی الطعام“ ابواب الاطعمة، بحواله سنن دارمی ص: ۱۴۴ ج: ۲ قدیمی کتب خانه۔ [2] راجع لفضائل فاطمة رضی اللہ عنها مستدرک حاکم من ص: ۱۶۱ ج: ۳ تا ص: ۱۷۱ ج: ۳ ”کتاب معرفة الصحابة“ وفیه ان النبی ﷺ قال حسبک من نساء العالمین اربع، مریم بنت عمران وآسیة امرأة فرعون وخدیجة بنت خویلد وفاطمة بنت محمد، هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه ص: ۱۶۸ ج: ۳۔

منسوب ہے کہ وہ چھ عورتوں کو نبیہ قرار دیتے تھے، حواء، سارہ، ہاجرہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، آسیہ اور مریم۔ ان آخری دونوں کا ذکر حدیث باب میں بھی ہے۔ تاہم جمہور علماء نبوت کے لئے ذکورت شرط قرار دیتے ہیں لہٰذا کوئی عورت نبیہ نہیں بن سکتی۔ اس بارے میں فریقین کے دلائل چونکہ ظنی ہیں اس لئے کہا جائے گا کہ یہ مسئلہ عقائد سے تعلق نہیں رکھتا بس یہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ جس کی نبوت بعینہ ثابت ہے اس پر بعینہ ایمان لانا لازم ہے اور جس کی نبوت اجمالاً ثابت ہو اس پر اجمالی ایمان کافی ہے، لہٰذا جن انبیاء کے نام معلوم ہیں ان پر باشخاصھم ایمان لازمی ہے، اور باقی جتنے بھی انبیاء ہیں ان پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے خواہ ان میں عورت کیوں نہ ہو۔ چنانچہ علامہ کمال بن ابی شریف المتوفی ۹۰۵ھ ہجری شیخ ابن ہمام کی (کتاب المسایرہ کی شرح المسامرہ کے ص:۱۲۰ و ص:۱۳۰) پر ایک نفیس بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''والادلة من الجانبين ظنية ...وفيه لكَ ان تمنع وجوب اعتقاد اشتراط الذكورة فى النبى'' الخ۔

بہرحال جمہور کے نزدیک اس حدیث میں کمال سے مراد صفات نبوت تک ارتقاء مراد نہیں بلکہ انسانی اختیاری کمالات اور درجۂ ولایت تک رسائی مراد ہے، اس طرح جمہور کے نزدیک یہ حصر تمام عالمین کی عورتوں کی بنسبت نہ ہوگا بلکہ اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے ہوگا کیونکہ ولایت کے درجہ پر تو بہت سی عورتیں فائز ہو چکی ہیں مگر جن عورتوں کی بعینہا مدح سرائی قرآن میں آئی ہے، وہ یہی تین خواتین ہیں باقی بہت سی عورتوں کا ذکر یا تو کسی واقعہ کے ضمن میں آیا ہے یا پھر اجمالاً ہوا ہے لہٰذا کہا جائے گا کہ ولایت کا مقام پانے والی خواتین بہت زیادہ ہیں مگر قرآنی سندِ تعریف وعفت اور مقبولیت بعینہا صرف ان تینوں کو حاصل ہے، اور جب ولایت کمال ہے تو نبوت بطریق اولیٰ کمال ہے۔

افضل کون ؟:۔ یہاں یہ بحث بھی چھیڑی گئی ہے کہ دنیا کی خواتین میں افضل ترین کون ہے؟ حضرت مریم؟ حضرت خدیجہ؟ حضرت فاطمہ؟ یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنھن چونکہ اس حدیث میں فضیلت کا بیان ہے اور اس فضیلت میں ثرید کی مثال ذکر کی گئی ہے تو ثرید میں بلاشبہ بہت سے فوائد ہوتے ہیں لیکن مع ہذا اس کا تمام کھانوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لئے علماء نے اس پر بحث کی ہے کہ افضل خاتون کون ہے، یہ مسئلہ مناقب کا ہے جو ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں اجمالاً و اختصاراً اتنی سی بات عرض ہے کہ عام علماء کی رائے یہ ہے کہ بعض وجوہ سے ایک افضل ہے اور بعض سے دوسری، چونکہ دلائل محتمل وظنی ہیں اس لئے یہ مسئلہ بھی عقائد کا نہیں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر بحث فرمائی

ہے، کہ کن کن مسائل سے آدمی اہل سنت والجماعت سے خارج نہیں ہوتا اس کے ضمن میں ایک مثال یہی دی ہے، یعنی یہ ان مسائل میں سے ہے جو نہ تو قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہیں نہ احادیث مشہورہ سے ثابت ہیں اور نہ ہی صحابہ کرامؓ نے اس بارے میں لب کشائی کی ہے، تا آنکہ کچھ اہل علم آئے جنہوں نے ان مسائل کو چھیڑا اور اختلاف رونما ہوا ''کفضل الانبیاء علی الملائکۃ وفضل عائشۃ علی فاطمۃ رضی اللّٰہ عنہما''۔ قالہ فی مقدمۃ الکتاب

باب ماجاء انهَشُوا اللحم نهشاً

''عن عبداللّٰہ بن الحارث قال زوّجنی ابی فدعا اُناساً فیھم صفوان بن اُمَیّۃ فقال: ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: انھسوا اللحم نھساً فانہ اَھناُ واَمرءُ''۔ [1]

حضرت عبداللہ بن حارث سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے میری شادی کردی، تو کچھ لوگوں کو مدعو کیا جن میں حضرت صفوان بن امیہؓ بھی تھے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھالیا کرو کہ اس طرح کھانا مزیدار اور خوشگوار تر ہوتا ہے۔

لغات:۔ قولہ ''اناسا'' اناس اصل ہے الناس کی پھر کثرت استعمال سے ہمزہ ساقط ہوا اور لام کو نون میں مدغم کردیا تو الناس ہوگیا۔ (لسان العرب) ''والناس اسم جمع'' تفسیر روح المعانی۔

قولہ ''انھسوا'' نھساً سے امر کا صیغہ ہے بعض نسخوں اور روایتوں میں شین کے ساتھ آیا ہے، بعض اہل لغت نے دونوں میں فرق نہیں کیا ہے مگر بعض اہل لغت یہ فرق بتاتے ہیں کہ اگر اگلے دانتوں سے نوچ لیا جائے تو اس کے لئے نھس کا لفظ یعنی سین مہملہ کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے جبکہ ڈاڑھوں سے نوچنے کو نھش بالشین المعجمہ کہا جاتا ہے۔ [2] قولہ ''اَھناُ'' جو کھانا مرغوب اور غرض کے مطابق ہو اسے ھَنِیٔ کہتے ہیں۔ اور قولہ ''امرأ'' مرئی سے ہے جو کھانا ہضم ہو کر بخوبی جزو بدن اور موجب صحت وقوت بنے وہ مرئی ہے۔

باب ماجاء انھشوا اللحم نھشاً

[1] الحدیث اخرجه الدارمی ص: ۱۴۵ ج: ۲ حدیث: ۲۰۷۰ کتاب الاطعمة، ایضاً رواه احمد فی مسنده ۳/۴۰۰۔

[2] نھس ونھش میں فرق: النھس ھو اخذ اللحم بانیابھم من اعلیٰ العظم او اخذ اللحم باطراف اللسان والنھش الاخذ بجمیعھا، حاشیه: ۲ سنن ابی داؤد ص: ۱۷۴ ج: ۲ کتاب الاطعمة۔

تشریح:۔ چونکہ عربوں میں نیم پختہ گوشت کھانے اور پسند کرنے کی عادت تھی، اور بڑی بڑی بوٹیاں بناتے تھے جن میں ہڈی پر گوشت لگا رہتا تھا اس لئے ہمارے زمانے کی طرح انگلیوں سے گوشت علیحدہ کرنا مشکل ہوتا تھا، کیونکہ ہم تو گوشت کو گلا کر کھاتے ہیں بلکہ کبھی تو وہ گوشت دیگ کے اندر ہی ہڈی سے خود بخود علیحدہ ہو جاتا ہے۔ پھر اسے نوچنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی نیز ہمارے ہاں بوٹیاں چھوٹی چھوٹی بنانے کا دستور ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوچ کر کھانے کا مشورہ دیا جو لذیذ تر بھی ہوتا، خاص کر وہ گوشت جو ہڈی کے ساتھ چپکا ہوا ہو چونکہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر معدے میں جاتا ہے اس لئے زود ہضم بھی ثابت ہو جاتا ہے، پھر ابن العربیؒ نے عارضہ میں لکھا ہے کہ خالی ہڈی کو واپس برتن میں نہ رکھے، بلکہ اپنے سامنے دسترخوان پر رکھ دے یا پھر اپنے ہاتھ ہی میں تھامے رکھے۔ آج کل تو وسعت کا زمانہ ہے کھانے کے لئے دسترخوان بچھانے کا رواج عام ہو گیا ہے بلکہ سلیقہ مند لوگ زائد بوٹیوں کے لئے الگ خالی پلیٹ بھی دسترخوان پر رکھتے ہیں، اور بعض ہوٹلوں میں میز کے نیچے برتن یا ڈبہ وغیرہ ہوتا ہے لہٰذا اسی کا استعمال کیا جائے۔

اس حدیث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ گوشت کا یہی طریقہ کھانے کے لئے متعین ہے، بلکہ اگلے باب میں چھری سے کاٹ کر کھانا بھی ثابت ہے، اور ابوداؤد[۳] وبیہقی کی جس روایت میں چھری کے استعمال سے منع آیا ہے وہ روایت صحیح نہیں ہے۔ چونکہ اس روایت میں کھانے کے مذکورہ طریقے کی علت لذیذ تر اور خوشگوار ہونا بتلائی ہے اس لئے اگر یہ علت کسی اور طریقے میں پائی جائے تو وہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

قولہ "وقد تکلم بعض اهل العلم فی عبدالکریم المعلم" مگر اس تکلم کے باوجود عبدالکریم ضعیف نہیں ہے بلکہ مختلف فیہ ہے۔

---

[۳] سنن ابی داؤد ص: ۱۷۴ ج: ۲ "باب فی الأکل من اعلی الصفحة" کتاب الاطعمة، سنن کبریٰ للبیهقی ص: ۱۰۴ ج: ۱۱ حدیث: ۱۴۹۹۱ ابواب الولیمة قال رسول اللہ ﷺ لاتقطعوا اللحم بالسکین فان ذالک من صنع الاعاجم ولکن انهسوه فانه اهنأ وامرأ. حفیظ الرحمن الحنفی ندوة العلم کراچی.

باب ماجاء عن النبی ﷺ فی الرخصة فی قطع اللحم بالسکین

"عن جعفربن عمروبن أمية الضمری عن ابیه انه رأی النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم احتزمن کتف شاة فأکل منهاثم مضیٰ الی الصلوٰة ولم یتوضأ"۔ [1]

حضرت جعفر بن عمرو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے، جو چھری سے بکری کے شانے سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر تناول فرمایا۔

لغات:۔ قولہ "احتز" حَزٌّ سے افتعل کے وزن پر فعل ماضی ہے، حز کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ قولہ "کتف" بفتحۂ اول وکسرۂ ثانی مونڈھے اور کندھے کو کہتے ہیں جبکہ "سکین" چھری کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس روایت سے گوشت کو چھری کے ذریعے کاٹ کر کھانا ثابت ہوا جیسا کہ گذشتہ باب میں اس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے اسی پر قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ پھلوں کے کھانے میں بھی اختیار ہے چاہے تو آدمی سیب اور کھیرا وغیرہ دانتوں سے کاٹ کر کھائے یا چھری سے کاٹ لے۔ اسی طرح اگر روٹیوں کو چھری سے کاٹنے کی ضرورت پیش آجائے جیسے بعض مدارس اور بعض بڑے بڑے لنگر خانوں میں ہوتا ہے تو وہ بھی جائز ہے، اور اس سلسلہ میں نہی کی روایت صحیح نہیں۔ کمامرّ کیونکہ اس میں ابو معشر ہیں جو ضعیف ہیں۔ [2]

باب ماجاء اَیُّ اللحم کان أحب الی رسول اللّٰہ ﷺ؟

"عن ابی هريرة قال أُتِیَ النبیُّ صلی اللّٰہ علیه وسلم بلحم فَدُفِعَ الیه الذراع وکان یعجبه فَنَهَسَ منها"۔

باب ماجاء عن النبی ﷺ فی رخصة فی قطع اللحم بالسکین

[1] الحدیث اخرجه البخاری ص:۸۱۴ ج:۲ کتاب الاطعمة ومسلم ص:۱۵۷ ج:۱ کتاب الحیض، سنن کبری للبیهقی ص:۱۰۴ ج:۱۱ ابواب الولیمة. [2] قال البیهقی بعدنقل حدیث البخاری، وفی هذا دلالة علی جواز قطعه بالسکین وان الخبر الذی قبله ان صح فانما اراد به واللّٰہ اعلم انه اذا نهسه کان اطیب کالخبر الاول ص:۱۰۴ ج:۱۱. الحنفی عفی عنه

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت کا ہدیہ پیش کیا گیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازو پیش کیا گیا چونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا تو (اس لئے قبول فرما کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دانتوں سے نوچ نوچ کر تناول فرمایا۔

لغات:۔ قولہ "الذراع" بکسر الذال بروزن کتاب اصل میں کلائی کو کہتے ہیں، یعنی کہنی سے ہتھیلی تک کا حصہ جسے ساعد بھی کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس کو پسند کرنے کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ جلدی تیار اور پک جاتا ہے، جس سے وقت کی بچت اور تکلفات سے اجتناب مقصود تھا۔ دوم یہ لذیذ بھی ہوتا ہے۔ سوم یہ نجاست کے مواضع سے دور بھی ہوتا ہے۔ مع ہذا اس میں اور دانتوں سے نوچنے میں تواضع بھی ہوتی ہے۔ ایک وجہ اگلی روایت میں بیان کی گئی ہے۔

دوسری حدیث:۔ یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازو کا گوشت صرف اس لئے زیادہ پسند تھا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کبھار گوشت میسر ہوتا پس بازو کا گوشت جلدی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا کیونکہ یہ جلدی پک جاتا۔

لغات:۔ اس حدیث میں "یعجل" مجہول کا صیغہ ہے اور "الیہ" کی ضمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے جبکہ "لانہ" کی ضمیر لحم ذراع کی جانب لوٹتی ہے۔ قولہ "نضجا" پکنے اور تیار ہونے کو کہتے ہیں اس لئے یہ لفظ کھجور کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے نضج التمر بھی کہتے ہیں اور نضج اللحم نضجاً بھی۔

تشریح:۔ اس حدیث میں اور باب کی سابقہ روایت میں کوئی تعارض نہ سمجھا جائے، کیونکہ اس میں پسندیدگی کی مطلق نفی مراد نہیں ہے بلکہ پسند کرنے کی ایک وجہ بتلائی ہے جبکہ سابقہ روایت مطلق عن القید ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ اپنی اس روایت میں اس توہم کا ازالہ کرنا چاہتی ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کو کیسے پسند فرمایا حالانکہ یہ تو لذائذ میں سے ہے تو انہوں نے دفع کی غرض سے فرمایا کہ یہ پسندیدگی بھی زہد کی بنا پر تھی کہ اس سے فراغت جلدی ملتی ہے۔

باب ماجاء فی الخلّ

عن جابرؓ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال:نعم الِادام الخلُّ۔[۱]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سرکہ کیا ہی اچھا سالن ہے۔

لغات:۔ "خــل" بفتح الخاء وتشدید اللام سرکے کو کہتے ہیں جبکہ بکسر الخاء جگری دوست کو کہا جاتا ہے، سرکہ گنّے یا پھلوں کے رس کو دھوپ میں رکھ کر بنایا جاتا ہے، جو ترش اور کھٹا ہوتا ہے شراب سے بھی بنایا جاسکتا ہے اگرچہ شراب سے بنانے کے جواز میں اختلاف ہے جو فقہ میں بیان ہوا ہے۔ **قوله** "اِلادام" مفرد ہے اور جمع اُدُمْ آتی ہے جیسے کتاب اور کتب، ادام ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو روٹی کے ساتھ کھائی جائے یعنی سالن۔

تشریح:۔ سرکے کو سالن قرار دینے کا مطلب امام خطابیؒ نے یہ بتلایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کی چیزوں میں تکلفات سے بچنے کی ایک ترغیب دی ہے، کہ جو چیز بآسانی میسر ہو اور عام ہو اسی پر اکتفا کر لینا چاہئے لذیذ کھانوں کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہئے کہ ہوس پرستی سے دین تباہ ہو جاتا ہے اور آدمی ذہنی انتشار میں مبتلا رہتا ہے، جیسا کہ آج کل عام مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے کہ زیادہ اور اچھے کھانوں کے چکر میں سارا وقت دنیا کمانے پر خرچ کرتے ہیں، اور پھر بھی خواہشات پوری نہیں ہوتیں نتیجہ یہ نکلا کہ نہ کسی کے پاس خشوع والی نماز پڑھنے کی فرصت ہے اور نہ ہی تلاوت کی۔ بلکہ بہت سے بے چارے تو نماز ہی نہیں پڑھتے ہیں۔

حدیث آخر:۔ " عن ام هانیٔ بنت ابی طالب قالت دخل علیّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فقال:هل عندکم شئی؟فقلت"لا"اِلا کِسریابسة وخل فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم :قَرِّبیه فمااقفر بیت من اُدم فیه خلّ"۔

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میرے یہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء فی الخل

[۱] الحدیث اخرجه ابوداؤد ص: ۱۷۹ ج: ۲ "باب فی الخل" کتاب الاطعمة، ایضاً سنن ابن ماجه ص: ۲۳۸ ابواب الاطعمة۔

تشریف لائے، تو فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی چیز (کھانے کی) ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں البتہ خشک (روٹی کے) ٹکڑے اور سرکہ ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ پیش کردو کیونکہ جس گھر میں سرکہ ہو وہ سالن سے خالی نہیں ہوتا۔

لغات:۔ "کسر" بکسر الکاف وفتح السین روٹی کے ٹکڑوں کو کہتے ہیں اس کا مفرد کسرۃ آتا ہے۔ **قولہ** "اقفر" قفر خالی کو کہتے ہیں اور قفار وہ زمین جو پانی سے خالی ہو "قبر حرب بمکان قفر" اسی طرح قفار بغیر سالن والے کھانے کو بھی کہتے ہیں۔**قولہ** "من أدم" بسکون الدال مفرد کا صیغہ ہے "فیہ خل" جملہ "بیت" کی صفت ہے اور "من أدم" درمیان میں فصل ہے۔

تشریح:۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس گھر میں سرکہ موجود ہو وہ سالن سے خالی نہیں کہلاتا، اس میں بھی زہد کی ترغیب ہے، کہ چونکہ کھانے کا اصل مقصد پیٹ پالنا ہے اور طاعات کے لئے کمر کو سیدھا رکھنا ہے التذاذ اور نفس کو خوش کرنا نہیں ہے، لہٰذا جس چیز سے اصلی مقصد پورا ہوسکتا ہے اس کی نفی نہیں کرنی چاہئے، جیسے نفس لباس سے زینت نہ بھی ہو تستر تو ہوتا ہے۔

قولہ "وام هانئي ماتت بعد علي بن ابي طالب بزمان"۔

امام ترمذیؒ دراصل ایک اعتراض کا جواب دینا چاہتے ہیں، کہ ام ہانی کی یہ روایت تو منقطع ہے کیونکہ امام شعبیؒ کا سماع ام ہانی سے ثابت نہیں جیسا کہ امام بخاریؒ کی رائے ہے، اور امام ترمذیؒ نے بھی علل کبیر میں نقل فرمایا ہے، تو امام ترمذیؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ امام شعبیؒ کا سماع حضرت علیؓ سے ثابت ہے کہ انہوں نے عورت کو رجم کرنے کے بعد فرمایا "رجمتها بسنة النبي صلى الله عليه وسلم" کما عند البخاری [۲] اور ام ہانیؓ اپنے بھائی حضرت علیؓ کے بعد وفات پائی ہیں لہٰذا سماع ممکن ہے، اس لئے انقطاع کا اعتراض صحیح نہیں غرض روایت جمہور کی شرط پر پوری ہے۔

باب ماجاء في أكل البطيخ بالرطب

"عن عائشةؓ ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يأكل البطيخ بالرطب"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خربوزہ تازہ کھجور کے ساتھ

---

[۲] ایضاً مصنفه عبدالرزاق ص: ۱۶۱ ج:۷ "باب الرجم والاحصان".

تناول فرماتے۔

لغات:۔ "البطیخ" بکسرۃ باء وتشدید الطاء المکسورۃ بروزنِ مرِّیخ عام اہل لغت وشارحین کے نزدیک خربوزے کو کہتے ہیں۔ الکوکب الدری کے حاشیہ پر ہے کہ ملا علی قاریؒ نے شرح شمائل میں اس کو تربوز کے معنی میں لیا ہے جو بظاہر غلط فہمی ہے۔ حضرت گنگوہی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس غلط فہمی کا منشاء یہ ہے کہ ابوداؤد[1] کی روایت میں ہے "نکسر حرّ ھذا ببرد ھذا" یعنی ہم اس کی گرمی کو اس دوسرے کی ٹھنڈک سے توڑتے ہیں، اور کھجور تو گرم ہے اور خربوزہ بھی گرم ہے تو معلوم ہوا کہ اس سے مراد تربوز ہی ہے، مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اس برودت سے مراد حسی ٹھنڈک ہے نہ کہ مزاج کی برودت، اور جن لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ یہاں پر کچا خربوزہ مراد ہے، کیونکہ پکا ہوا گرم ہوتا ہے تو وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ کچا تو کھایا نہیں جاتا کذا فی الکوکب الدری۔ قولہ "الرطب" بضمۂ راء اور فتحۂ طاء پکی ہوئی تازہ کھجور کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ معجم اوسط[2] میں طبرانی نے اور ابونُعیم نے طب میں ایک ضعیف حدیث میں دونوں کو ایک ساتھ کھانے کا طریقہ یہ نقل کیا ہے، کہ کھجور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیدھے ہاتھ میں ہوتیں اور خربوز بائیں ہاتھ میں۔ اس کی حکمت ابوداؤد[3] کی مندرجہ بالا روایت میں خود بیان ہوئی ہے، کہ ملا کر کھانے سے ان کے مزاج میں اعتدال پیدا ہوتا ہے، کیونکہ ہر ایک دوسرے کی حدت اور تیزی کو توڑ دیتا ہے، جیسا کہ عناصر و مفردات کا ضابطہ ہے، نیز اس سے خربوزہ کی مٹھاس میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور کھجور کی خشکی مضمحل ہو جاتی ہے۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے علاج کا ثبوت ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہ کسی مضر چیز کا مقابلہ اس کی ضد سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ بیک وقت ایک سے زائد اشیاء کھانے میں شامل کرنا جائز ہیں خصوصاً جب وہ متضاد ہوں۔ تاہم بعض متضاد اشیاء کو ملانے سے ایسا مزاج جنم لیتا ہے جو صحت کے لئے مضر ہوتا ہے اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی أکل البطیخ بالرطب

[1] سنن ابی داؤد ص: ۱۸۰ ج: ۲ "باب الجمع بین اللونین عند الاکل" کتاب الاطعمة.

[2] کذا فی مجمع الزوائد ص: ۳۲ ج: ۵ حدیث: ۷۹۹۷ کتاب الاطعمة عن انس بن مالک ان رسول اللہ ﷺ کان یاخذ الرطب بیمینه والبطیخ بیساره فیاکل الرطب بالبطیخ وکان احد الفاکهة الیه. ۱۲ الحنفی عفی عنه

[3] سنن ابی داؤد ص: ۱۸۰ ج: ۲ کتاب الاطعمة.

باب ماجاء فی أَکل القِثّآء بالرطب

عن عبداللّٰہ بن جعفرقال کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یأکل القثاء بالرطب"

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ککڑی کھجور کے ساتھ کھاتے تھے۔

لغات:۔ قولہ "القثاء" بکسرۃ قاف وتشدید الثاء ککڑی کو کہتے ہیں کھیرے پر بھی اطلاق ہوتا ہے تاہم یہاں ککڑی مراد ہے۔

تشریح:۔ اس کی حکمت بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی علاوہ ازیں یہ دونوں ایک ساتھ کھانے سے صحت مندی اور وزن میں اضافہ بھی ہوتا ہے، اس لئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میری والدہ نے مجھے رخصتی سے قبل یہ دونوں چیزیں کھلائیں جس سے میرے جسم میں فربہی ہوگئی۔

باب ماجاء فی شرب ابوال الابل

عن انسؓ ان اناسامن عُرینۃَقدموا المدینۃفاجتووھافبعثھم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی ابل الصدقۃ وقال: اشربوا من البانہاوابوالھا"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ مدینہ آئے تو آب وہوا موافق نہ آنے سے ان کے پیٹ پھول گئے اور رنگ زدہ ہوگئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کے اونٹوں کی طرف بھیجا اور فرمایا تم ان کے دودھ پیا کرو اور پیشاب کو۔

اس حدیث کی تشریح جلد اول میں گذری ہے۔(دیکھئے تشریحات ترمذی جلد اول "باب ماجاء فی بول مایوکل لحمہ" ص:۲۴۵)

باب الوضوء قبل الطعام وبعدہ

"عن سلمان قال قرأت فی التوراۃ ان برکۃ الطعام الوضوء بعدہ فذکرت ذالك للنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم واخبرتہ بماقرأت فی التوراۃ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :برکۃ

الطعام الوضوء قبله والضوء بعده"۔[1]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا، کہ کھانے کی برکت وضوء کرنا (منہ ہاتھ دھونا) ہے، کھانے کے بعد پس میں نے اس کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور جو میں نے تورات میں پڑھا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دیدی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانے کی برکت تو اس سے پہلے ہاتھ دھونا اور اس کے بعد ہاتھ منہ دھونا ہے۔

تشریح:۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے سے پہلے تورات میں یہ مضمون پڑھا تھا، تو جب اسلام لائے اس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور ان سے اس کی تصدیق کرانا چاہی کہ کہیں یہود نے اس میں تحریف نہ کی ہو یا پھر مقصد یہ تھا کہ برکت کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے ساتھ مختص ہے یا اس سے پہلے بھی دھونے سے برکت ہو جاتی ہے؟ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے اور آخر دونوں میں برکت ہے۔ اگر سوال تصدیق کے بارے میں تھا تو جواب کا مقصد یہ ہے کہ اس میں تحریف ہوئی ہے، کیونکہ اصل حکم کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد دونوں پر مشتمل تھا مگر یہود نے پہلے والے حکم کو غائب کر دیا۔ اور دوسری صورت میں جواب کا مطلب یہ ہے کہ ہماری شریعت میں کھانے سے پہلے بھی ہاتھ دھونے سے برکت حاصل کی جاسکتی ہے۔

وضوء کا اطلاق اگرچہ شریعت میں ہاتھ پاؤں سمیت منہ وغیرہ دھونے اور سر کے مسح پر ہوتا ہے، تاہم لغت اور عرف میں اس کے معنی صرف ہاتھ دھونے یا ہاتھ اور منہ دھونے کے ہیں اور یہاں یہی مراد ہیں، گو کہ بعض حضرات نے جیسے صوفیہ کرام وغیرہ اس کو شرعی وضوء پر بھی حمل کرتے ہیں۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں ''والناس یرون الوضوء قبل الطعام ینفی الفقر وبعده ینفی اللمم'' اور ابن ماجہ کی ایک ضعیف ثلاثی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔[2]

حدیث باب کے بارے میں امام منذریؒ فرماتے ہیں کہ یہ درجہ حسن سے کم نہیں۔ لہٰذا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے بارے میں اگرچہ کوئی صحیح روایت نہیں ہے تاہم ایسی روایات ہیں جو اشارۃً اس پر دلالت

باب الوضوء قبل الطعام وبعده

[1] الحديث اخرجه الحاكم في المستدرك ص:۳۵ ج:۵ كتاب الاطعمة. [2] سنن ابن ماجه ص:۲۳۵ "باب الوضوء عندالطعام" ابواب الاطعمة قال رسول الله ﷺ من احب ان يكثر الله خير بيته فليتوضأ اذا حضر غداؤه واذا رفع. ۱۲

کرتی ہیں، مثلاً صفائی ستھرائی کے متعلق احادیث جن سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھاتے وقت ہاتھ دھونا کھانے کے آداب اور مستحبات میں سے ہے، اور باب کی روایت بھی حسن ہے۔

آج جبکہ راقم یہ باب لکھ رہا ہے اخبارات میں لاکھوں روپیہ کے اشتہارات اقوام متحدہ اور صابن بنانے والی کمپنیوں کی جانب سے چھپے ہیں یہ اشتہارات ہاتھ دھونے کے عالمی دن منانے کے موقعہ پر شائع کئے گئے ہیں جن میں ایک بہت بڑے ہاتھ کی تصویر کے ساتھ لکھا ہے کہ زندگی بچانے کی طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے، عالمی سطح پر آج پروگرام کئے جارہے ہیں اور اس بات کی تشہیر کی جارہی ہے کہ صابن سے ہاتھ دھونے سے ڈائیریا (اسہال) اور نمونیا کی اموات میں کمی واقع ہو جاتی ہے ہاتھ دھونے سے ہیپاٹئس سے بھی بچاجا سکتا ہے۔

تاہم کھانے کے بعد ہاتھ کی انگلیاں چاٹ کر دھوئے یا کسی کپڑے اور ٹشو پیپر وغیرہ سے خشک کردے چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہے۔

"عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اکل احدکم فلا یَمسَحَنَّ یدہ بالمندیل حتی یَلعقھا او یُلعقھا"۔ [۳]

یہاں برکت سے مراد نفع اور فوائد ہیں کہ ہاتھ دھونے سے آدمی صحت مند رہتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی گھن نہیں آتی اور کھانے کے بعد ہاتھوں کی صفائی سے آدمی بہت سی ناگوار چیزوں سے بچار ہتا ہے۔ نہ ہاتھ پر مکھیاں بیٹھیں گی نہ رات کو کیڑے مکوڑے اور چوہے کاٹیں گے اور نہ ہی کپڑے میلے ہوں گے وغیرہ وغیرہ کچھ مزید باتیں اگلے باب میں آئیں گی۔

باب ماجاء فی ترک الوضوء قبل الطعام

"عن ابن عباسؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج من الخلاء فقُرِّبَ الیہ طعام فقالوا: اَلَا ناتیك بوَضوء ؟ قال انما اُمِرتُ بالوضوء اذا قمت الیٰ الصلوٰۃ"۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء سے نکلے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا لایا گیا، تو حاضرین نے کہا کہ کیا ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وضوء کا پانی نہ لائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے وضوء کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب میں نماز پڑھنے کے لئے اٹھوں۔

---

[۳] سنن ابی داؤد ص: ۱۸۲ ج: ۲ "باب فی المندیل" کتاب الاطعمۃ.

لغات:۔ ''خــلاء'' سماء کے وزن پر خالی جگہ کو کہتے ہیں۔ تاہم منقول عرفی کے طور پر اس کا استعمال بیت الخلاء کے لئے ہوتا ہے کہ وہ بھی ضرورت کے سوا اوقات میں خالی رہتا ہے۔ قـولـہ "فقالوا" یعنی حاضر مجلس میں سے بعض صحابہ کرامؓ نے فرمایا۔ قـولـہ "بـوضـوء" بفتح الواو، وضو کا پانی جبکہ بضم الواو معنی مصدری یعنی وضوء کرنے کے لئے آتا ہے یہاں بفتحۂ واو ہی ہے۔

تشریح:۔ صحابہ کرامؓ کا یہ کہنا از قبیل عرض ہے جیسے ''الا تـنـزل عـنـدنـا'' یعنی کیا آپ وضو نہیں کرتے ہیں؟ چونکہ صحابہ کرامؓ یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد الحدث وضو واجب ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بیت الخلاء سے نکلے ہیں تو دیگر مصروفیات کھانے وغیرہ سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضوء یاد دلایا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ظن رد کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے وضوء کا حکم ہے، جب میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوں، یہ مطلب حدیث کے ظاہر کے موافق ہے اس میں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ہر نماز کے لئے وضوء کرنا کسی پر بھی واجب نہیں اس لئے کہا جائے گا کہ یہاں جواب عام احوال پر مبنی ہے، ورنہ باوضوء ہونے کی صورت میں تجدید وضوء لازمی نہیں۔ یہ مسئلہ تفصیلاً تشریحات ترمذی جلد اول ص ۲۱۰ تا ۲۱۴ پر گذرا ہے دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فمن شاء الاطلاع فلیراجع (باب الوضوء لکل صلوٰۃ وباب ماجاء انہ یصلّی الصلوٰت بوضوء واحد)

تاہم امام ترمذیؒ نے جس مقصد کے لئے یہ باب باندھا ہے وہ اس طرح اُجاگر ہوسکتا ہے کہ یا تو اس حدیث میں وضوء سے نظافت یعنی لغوی وضو لیا جائے اور صحابہ کرامؓ کا مقصود یہ تھا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ نہیں دھوتے؟ چونکہ صحابہ کرامؓ اس کو لازمی تصور کرتے تھے، تو جواب کا مطلب یہ ہوگا کہ جب ہاتھوں یا جسم پر نجاست حسی نہ ہو تو اس کو دھونا طہارت حکمی کے ضمن میں آتا ہے۔ اور طہارت حکمی کا حکم تو نماز کے وقت ہے لہٰذا جن اعمال کے لئے طہارت حکمی لازمی نہیں وہاں پانی کا استعمال واجب نہیں، غرض آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض نفی وجوب وضوء شرعی ولغوی ہے، نفس وضوء کی نفی مراد نہیں ہے، علی ہذا اس سے ہاتھ دھونے یا وضوء کرنے کی کراہیت پر استدلال کرنا درست نہیں جیسا کہ امام سفیان ثوریؒ نے کیا ہے، اور امام ترمذیؒ نے ان کا قول اسی باب میں نقل کیا ہے ہاں اگر کوئی شخص بہرحال ہاتھ دھونے یا وضوء کرنے کو ضروری اور سنت تصور کرتا ہو اور پابندی سے اس پر عمل پیرا ہو تو پھر سب کے نزدیک مکروہ ہونا چاہئے۔ علی ہذا امام احمدؒ اور امام مالکؒ کی طرف جو عدم استحباب یا کراہیت کے قول کی نسبت کی جاتی ہے اس کو اسی لزوم والی صورت پر حمل کیا جائے گا، پھر جنبی آدمی ہاتھ کے ساتھ منہ بھی دھوئے عام حالات میں کلی کرنا سنت نہیں۔

خلاصۂ بحث یہ ہوا کہ اگر ہاتھ گندے یا میلے ہوں تو کھانے سے پہلے اُنہیں دھونا لازمی یا کم از کم مستحب ہے یعنی نجاست اور میل کے تناسب سے حکم میں زیادتی و کمی آتی رہے گی لیکن اگر ہاتھ صاف ہوں آدمی پہلے باوضوء ہو یا کچھ دیر پہلے ہاتھ صاف کر چکا ہو تو کھانے سے پہلے غُسل کی تجدید کو لازمی قرار دینا مکروہ ہوگا جیسا کہ باقی احکامِ مندوبہ کا حکم وضابطہ ہے۔ واللہ اعلم

قولہ "وکان یکرہ ان یوضع الرغیف تحت القصعة" یعنی امام سفیان ثوریؒ روٹی پر برتن وغیرہ رکھنے کو مکروہ اور ناپسند فرماتے، کیونکہ اس سے روٹی کی بے قدری اور بے ادبی ہوتی ہے۔ استاد محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی نور اللہ مرقدہ نے اس موقع پر درس میں فرمایا کہ حضرت بنوری صاحب رحمہ اللہ جب طالب علم کو روٹی پر پلیٹ رکھتا ہوا لیجاتے دیکھتے تو اسے منع فرماتے۔

باب ماجاء فی أکل الدُبآء

"عن ابی طالوت قال: دخلت علی انس بن مالك وهو یأکل القَرعَ وهو یقول: یالكِ شجرةً ما اَحبَّكِ اِلَیَّ لِحُبِّ رسول الله صلی الله علیه وسلم اِیَّاكِ"۔

حضرت ابوطالوت فرماتے ہیں کہ میں حضرت انسؓ کے یہاں چلا گیا دراں حالیکہ وہ کدو کا سالن تناول فرما رہے تھے، اور فرماتے اے پیڑ تو کس قدر مجھے پسند ہے؟ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے محبت تھی۔

"عن انس بن مالكؓ قال رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یَتَتَبَّعُ فی الصحفة یعنی الدُباء فلاازال أُحِبُّه"۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ پیالے میں کدو (کے ٹکڑے) تلاش کر رہے تھے پس میں اس سے ہمیشہ کے لئے (مستقل) محبت کرنے لگا۔

لغات:۔ ''الدُباء بضم الدال وتشدید الباء والمد، قصر بھی جائز ہے کدو کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ''قرع'' بفتح القاف وسکون الراء بھی کدو کو کہتے ہیں۔ قولہ "یالك اور مااحبكِ" تعجب کے صیغے ہیں۔ ''شجرة'' تمیز ہے۔

تشریح:۔ اس باب کی دونوں حدیثوں سے لوکی اور کدو کی فضیلت معلوم ہوئی اور اطباء نے بھی اس

کے بہت سے فضائل بیان کئے ہیں، گویا کہ یہ غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے اور آج کل اگر چہ مصنوعی کھاد کی وجہ سے ترکاریوں کی لذت معدوم ہوتی چلی جارہی ہے، لیکن جب اس کا رواج عام نہیں ہوا تھا تو ہم اپنے باغ میں لوکی کاشت کرتے بلاشبہ تمام سبزیوں سے لوکی زیادہ لذیذ معلوم ہوتی۔

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا ہے، اس لئے اس نیت سے اس کا اہتمام کرنا ایک مستحسن اقدام ہے امام نوویؒ وغیرہ نے اسے افضل قرار دیا ہے، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اسے پسند کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں گو کہ قابل رشک ضرور ہے۔ جس طرح باپ کی صورت وسیرت اولاد میں دیکھی جاسکتی ہے کہ ''الولد سِرٌ ابیہ'' اسی طرح استاذ اور مرشد کی طبعیت بھی شاگرد اور مسترشد کے جسم میں سرایت کرتی ہے حتی کہ بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ قوی تعلق والے اساتذہ ومشائخ کی بیماریاں بھی خوبیوں کی مانند عقیدت مندوں میں منتقل ہو جاتی ہیں، تو جس طرح خوبیاں وبیماریاں موروثی ہوتی ہیں اسی طرح روحانی وراثت میں بھی خوبیاں مل جاتی ہیں۔ اس کا عام مشاہدہ بچوں میں بآسانی کیا جاسکتا ہے جب ماں باپ کسی چیز اور پیشے کو پسند کرتے ہیں تو بچے بھی اس کو پسند کرنے لگ جاتے ہیں۔

یہاں یہ اشکال باعث قلق نہیں بننا چاہئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے میں ادھر اُدھر کیوں ہاتھ گھمایا جبکہ وہ دوسروں کو اپنے ہی آگے سے کھانے کا حکم دیتے؟ کیونکہ یا تو مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سائیڈ اور جانب میں ہاتھ دائیں بائیں پھراتے تھے یا پھر منع کرنے کی وجہ شرکاء کا گھن کرنا ہے جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی طرح کوئی گھن نہیں ہوتی بلکہ وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب مبارک حتی کہ پیشاب کو باعث برکت سمجھتے وضوء کا پانی پسینہ اور سر کے بال بے بدل تو ان کے نزدیک حصول برکت کے قوی اسباب تصور کئے جاتے اور سارے صحابہ کرامؓ ان مبارک اشیاء کی تحصیل کے لئے کوشاں رہتے۔ علی ہذا اگر کوئی شخصیت شرکاء کی نظر میں بہت ہی محترم ہو اور کسی کے آگے سے کھانے یا چیز اٹھانے سے عقیدت پر منفی اثر نہ پڑتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں تاہم درمیان سے نہیں کھانا چاہئے اسی طرح ظاہر احادیث کی وجہ سے اپنے آگے سے ہی کھانا چاہئے۔

باب ماجاء فی أکل الزیت

عن زید بن اسلم عن ابیه ان عمربن الخطاب قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: کلواالزیت وادّھنوابه فانه من شجرۃ مبارکة۔[۱]

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، کہ زیتون کھالیا کرو اور اس کا تیل بدن پر مَلا کرو کہ یہ مبارک درخت سے نکلتا ہے۔

لغات: ۔قولہ 'الزیت" زیتون درخت کے تیل کو کہتے ہیں۔قولہ "ادھنوابه" ادہان بتشدید الدال سے امر کا صیغہ ہے یعنی زیتون کا تیل روٹی کے ساتھ کھاؤ اور بدن کو اس سے مالش کرو۔قولہ "مبارکة" برکت کے معنی زیادتی کے ہیں مگر پہلے گذرا ہے کہ فائدہ اور نفع کو بھی برکت کہتے ہیں یہاں یہی مراد ہے، کیونکہ عربستان خشک علاقہ ہے اس لئے بدن کی مالش خشکی سے بچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

تشریح: ۔اس حدیث سے زیتون کی فضیلت معلوم ہوئی جو ہر زیتون کو شامل ہے تاہم مشرق وسطیٰ شام وغیرہ کے زیتون بالخصوص مبارک ہیں کہ ایک تو اس کی فضیلت سورۂ نور کی آیت سے معلوم ہوتی ہے[۲] دوسرے وہ سرزمین حضرات انبیاء علیہم السلام کی مولد و مرقد ہے اس لئے وہ باقی اراضی سے ممتاز ہے۔جب اصل مبارک ہوگی تو فرع بھی برکت سے لبریز ہوگی۔علی ہذا باب کی حدیث میں برکت کو اصلی معنی یعنی خیر پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔گویا جس طرح کھجور حجاز مقدس کا خاص پھل ہونے کی بدولت برکت کا حامل ہے، اسی طرح زیتون ارض انبیاء کی بناء پر مبارک ہے۔امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو غریب کہا ہے تاہم امام منذریؒ فرماتے ہیں کہ امام حاکمؒ نے اسے صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے[۳] لہٰذا یہ باوجود غرابت کے صحیح ہوئی۔

باب ماجاء فی أکل الزیت

[۱] الحدیث اخرجه الدارمی ص: ۱۳۹ ج:۲ حدیث: ۲۰۵۲ کتاب الاطعمة. [۲] کما قال اللّٰہ تعالیٰ، یوقد من شجرۃ مبارکة زیتونة لاشرقیة ولاغربیة الخ سورۃ النور آیت:۳۵. [۳] کذا فی مستدرک للحاکم ص: ۴۹ ج:۵ کتاب الاطعمة، قال رسول اللّٰہ ﷺ ایتدموا بالزیت وادھنوا به فانه من شجرۃ مبارکة ھذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ.۱۲ الحنفی

باب ماجاء فی الأکل مع المملوک

عن ابی هریرة یخبرهم ذالك عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال اذا کفی احدکم خادمه طعامه حَرَّه ودُخانه فلیأخذبیده فلیُقعد معه فان ابیٰ فلیأخذلقمة فلیُطعمه ایاها"۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ابو خالد کو اس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا غلام (یا خادم) اس کے کھانے یعنی پکانے کی گرمی اور دھوئیں کی مشقت اپنے ذمہ لے لے تو اسے چاہئے کہ اس خادم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھانے کے لئے بٹھائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایک نوالہ لیکر اسے کھلا دے۔

لغات:۔ قولہ "کفا" الف مقصورہ کے ساتھ فعل ماضی کا صیغہ ہے۔ اور "احدکم" مفعول بہ ہے جبکہ "خادمہ" فاعل ہے خادم سے مراد یہاں صرف غلام نہیں بلکہ ہر قسم کے ملازم کو شامل ہے خواہ وہ آزاد کیوں نہ ہو۔ ہاں گھر کی آزاد ملازمہ کا ہاتھ پکڑنا اور اسے اپنے ساتھ کھانے کے لئے بٹھانا جائز نہیں لہٰذا وہ دیگر نصوص کی وجہ سے مستثنیٰ ہے۔ کفی کے معنی کسی کی طرف سے کسی کام کی کفایت کرنے یعنی قائم مقام ہونے کے ہیں۔ "طعامہ" مفعول ثانی اور "حرہ ودخانہ" طعام سے بدل ہیں۔

قولہ "فلیُقعد" اور "فلیُطعمہ" دونوں بضم الیاء اور کسر العین ہیں کہ دونوں متعدی افعال ہیں۔ قولہ "ایاھا" مفعول بہ ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث پاک میں مکارم اخلاق کا ایک پہلو بیان کیا گیا ہے، کہ اگر کسی کا خادم اور ملازم اس کی خدمت میں کھانا تیار کر کے پیش کرے یا تیار کھانا لا کر رکھ دے تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانے میں شریک کیا جائے تاکہ اس کی دلجوئی بھی ہو جائے اور بھوک کی ضرورت بھی پوری ہو جائے، تاہم جو شخص ایسا نہیں کرتا اور اپنے ملازم کے ساتھ کھانے سے اجتناب کرتا ہے جیسے اکثر لوگ اپنے خانساماں اور باورچی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تو کم از کم اتنا تو کر دے کہ اسے محروم نہ چھوڑے بلکہ کچھ نہ کچھ اسے پکڑا دے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں ہے "فلیناوله اُکلة او اُکلتین" [1] بضم الہمزۃ، کیونکہ بڑی بے مروتی کی بات ہوگی کہ خادم

باب ماجاء فی الأکل مع المملوک

[1] صحیح بخاری ص: ۸۲۰ ج: ۲ "باب الأکل مع الخادم" کتاب الاطعمة، ایضاً سنن دارمی ص: ۱۳۶ ج: ۲ حدیث: ۲۰۷۴ کتاب الاطعمة

کے سامنے کھایا جارہا ہے اور اسے نظر انداز کیا جارہا ہے، اس لئے سب سے بہتر تو یہ ہے کہ اسے اپنے ساتھ شریک کیا جائے لیکن بعض طبائع نفیس ہوتے ہیں جبکہ بعض لوگ طبعاً متکبر ہوتے ہیں، اس لئے شریعت نے ان کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے بطور تنزل فرمایا کہ چلو اسے ہاتھ میں دو مگر بالکل محروم تو نہ کرو یہ صورت اگر چہ اس کے لئے اچھی نہیں لیکن سب سے بُری صورت یعنی کچھ بھی نہ دینے سے تو پھر بھی بہتر ہے کیونکہ اس سے احساس بیدار ہوگا۔

باب ماجاء فی فضل إطعام الطعام

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه و سلم قال:اَفشُوا السلام و اَطعِموا الطعام و اضربوا الهام تورثوا الجنان "۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلام پھیلاؤ! کھانا کھلاؤ اور کھوپڑیوں کو مارو! تم جنت کے وارث بنا دیئے جاؤ گے۔

لغات:۔قولہ "افشوا" بفتح الہمزۃ افشاء اور فُشوّ کے معنی ظاہر کرنے اور منکشف ہونے کے ہیں عام کرنے اور پھیلانے کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو سلام کرو کسی خاص آدمی تک مخصوص نہ کرو۔قولہ "الھام" ھامۃ کی جمع ہے کھوپڑی کو کہتے ہیں یہاں مراد کافروں کی کھوپڑیاں ہیں ان کی کھوپڑیاں اُڑانا اور مارنا جہاد سے کنایہ ہے۔قولہ "الجنان" بکسر الجیم جنت کی جمع ہے "ج ن" مادہ میں اخفاء کے معنی پائے جاتے ہیں، چنانچہ جنات نظروں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے جن کہلاتے ہیں، جنت بھی نظروں سے غائب یا درختوں میں مستور ہوتی ہے۔قولہ "تورثوا" صیغہ مجہول ہے۔

تشریح:۔ یہ ارشاد پاک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقعہ پر مدینہ پہنچنے پر فرمایا تھا، چونکہ حدیث شریف میں ہے "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده"[1] اس لئے اول ملاقات میں سلام کے الفاظ مسنون قرار دیئے گئے تاکہ دوسرا شخص مطمئن ہو جائے۔اور اس میں دعا بھی ہے، پھر سلام میں

باب ماجاء فی فضل اطعام الطعام

[1] رواه البخاری ص:٦ ج:١ "باب المسلم من سلم المسلمون الخ" كتاب الايمان، ايضاً صحيح مسلم ص:۴۸ ج:١ كتاب الايمان.

ضابطہ کا دارومدار دو چیزوں پر ہے اول یہ کہ اس کی بنا تواضع پر ہونی چاہئے، گویا کہ یہ حصول تواضع کا قوی سبب ہے۔ دوم یہ کہ اس میں دوسرے کے احترام کو اُجاگر کرنا ملحوظ ہے، اس لئے بادی بالسلام یعنی پہل کرنے والے کو تکبر سے خالی قرار دیا گیا اور فرمایا کہ راکب غیر راکب پر سلام کرے، جیسا کہ مسلم شریف میں ہے "یسلم الراکب علی الماشی والماشی علی القاعد والقلیل علی الکثیر"۔[۲]

آداب سلام:۔ امام نوویؒ شرح مسلم[۳] میں اس مرفوع حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ یہ آداب سلام میں سے ایک ہے، پھر آگے لکھتے ہیں کہ سلام میں پہل کرنا سنت اور جواب واجب ہے۔ اگر سلام کرنے والے زیادہ ہوں تو گو کہ سب کو سلام کرنا چاہئے تاہم ایک شخص کے کرنے سے باقی کا ذمہ فارغ ہوجاتا ہے، یعنی سنت کفایہ ہے۔ اسی طرح اگر مخاطب ایک ہو تو اس پر جواب دینا واجب ہوجاتا ہے[۴] ہاں جماعت کی صورت میں جواب فرض کفایہ ہے یعنی واجب کفایہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ سب جواب دیں مگر ایک کا جواب بھی کافی ہوجاتا ہے، امام ابو یوسفؒ سب کے لئے جواب لازمی قرار دیتے ہیں، سلام کی اقل مقدار السلام علیکم ہے اور مخاطب واحد ہونے کی صورت میں بھی جمع کا صیغہ یعنی علیکم افضل ہے، اگرچہ علیک بھی جائز ہے اس پر ورحمة اللّٰہ وبرکاته کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے، جس کی دلیل ایک تو وہ آیت ہے جس میں سلام کے بعد "ورحمة اللّٰہ وبرکاته علیکم اهل البیت "[۵] مذکور ہے۔ دوم نماز میں سب مسلمان تشہد میں "السلام علیك ایها النبی ورحمة اللّٰہ وبرکاته" پڑھتے ہیں، سلام کرتے وقت "علیکم السلام" کہنا مکروہ ہے، کہ حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "لاتقل علیك السلام فان علیك السلام تحیة الموتی "[۶] تاہم اگر کسی نے ایسا کیا تو عند البعض جواب کا مستحق نہ ہوگا مگر ماہو الصحیح والمشہور کے مطابق جواب کا مستحق ہوگا۔

سلام کے جواب میں بھی "ورحمة اللّٰہ وبرکاته" کا اضافہ افضل ہے سلام اور جوابِ سلام کم از کم اتنا زور سے کہنا چاہئے کہ مخاطب سن سکے، جواب فوری دینا لازمی ہے۔ اگر خط میں یا زبانی غائب کی طرف سے سلام پہنچے تو پڑھتے ہی اور سنتے ہی جواب دینا لازمی ہے۔ (شرح مسلم للنووی ص:۲۱۲ ج:۲)

۲۔ صحیح مسلم ص:۲۱۲ ج:۲ کتاب السلام، ایضاً سنن دارمی ص:۳۵۷ ج:۲.

۳۔ النووی علی مسلم حواله بالا. ۴۔ راجع لاحادیث السلام سنن دارمی من ۳۵۷ تا ۳۶۰ ج:۲ کتاب الاستیذان.

۵۔ سورة هود آیت:۷۳. ۶۔ الحدیث اخرجه ابوداؤد ص:۳۶۱ ج:۲ "باب کراهیة ان یقول علیك السلام" کتاب الادب، ایضاً مسنداحمد ص:۵۳۲ ج:۴ حدیث:۱۵۵۲۵ داراحیاء التراث العربی بیروت.

فائدہ:۔ اگرایک آدمی دور ہے تو سلام کرتے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنا جائز ہے تا کہ اسے سلام یا جواب کاعلم ہوجائے مگر قریب ہی سے ہاتھ کا اشارہ مکروہ ہے کہ غیر مسلموں کا شعار ہے۔

جنت کے وارث ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کا جہنم والاٹھکانا ختم کردیا جاتا ہے اور جنت ہی میں اسے بسایا جاتا ہے گویا کہ ہرآدمی کے دومقامین ہیں، وہ جہنم میں ہمیشہ کی زندگی گذارنے سے جنت کے مقام سے محروم کردیا جاتا ہے والعیاذ باللہ وبالعکس۔

یا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے وہاں سے دنیا میں بھیجے گئے اب جس کو جنت ملے گی گویا وہ اپنے جدامجد کی قیام گاہ میں جاتا ہے۔ یا پھر مطلب یہ ہے کہ جس طرح میراث ایک قوی سبب ہے ملک کا اسی طرح یہ اعمال جنت ملنے کے قوی اسباب ہیں۔

حدیث ثانی:۔ میں ''اعبدوا الرحمٰن'' کا مطلب یہ ہے کہ ''وَحِّدوا اللّٰہ'' تنہا اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی اور کو شریک مت کرو ہاں عام عبادت کے معنی میں لینا بھی صحیح ہے۔

باب ماجاء في فضل العشاء

عـن انـس بن مالك قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تَعَشَّوا ولو بكف من خَشَف فان ترك العَشاء مهرمة"۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کا کھانا کھایا کرو، اگر چہ مٹھی بھر ردی کھجور ہی ہو کیونکہ رات کا کھانا چھوڑنا بڑھاپے کا سبب ہے۔

لغات:۔ قـولـہ "عَشَـاء" بفتح العین بروزن سَماء شام کے کھانے کو کہتے ہیں۔ قـولـہ "تعَشّوا" عشی اور عشیۃ سے ماخوذ ہے شام اور آخر النہار کو کہتے ہیں، چونکہ اہل عرب رات کا کھانا عموماً غروب آفتاب کے وقت کھاتے اس لئے اس کو عشاء کہا جاتا ہے، اگر چہ اس حدیث میں غروب سے پہلے کھانے کی ترغیب نہیں ہے بلکہ سونے سے پہلے کھانے کی بات کی گئی ہے اس لئے ترجمہ میں اسے رات کے کھانے سے تعبیر کیا ہے۔

قولہ "ولو بکف" ای بملء الکف۔ قولہ "خشف" بفتحتین ناقص اور ردی کھجور کو کہتے ہیں۔ قولہ "مهرمة" بفتح المیم والراء ای مظنۃ للضعف والھرم، ہرم بڑھاپے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ رات کو کچھ کھائے بغیر سونے سے کمزوری لاحق ہوتی ہے جو بڑھاپے کا سبب ہے۔

تشریح:۔ یہ حدیث اصحاب کتب ستہ میں سے صرف امام ترمذیؒ نے ذکر کی ہے، سند کے اعتبار سے بہت کمزور ہے جیسا کہ خود امام ترمذیؒ فرماتے ہیں "ھذاحدیث منکر " کیونکہ عنبسہ راوی ضعیف اور عبدالملک بن علاق مجہول ہیں، لہٰذا متن میں تعشوا اگرچہ امر کے صیغے کے ساتھ آیا ہے، مگر اس سے وجوب ثابت نہیں ہوسکتا تاہم طبی نقطۂ نظر سے رات کا کھانا اگرچہ کم مقدار کا ہو صحت اور توانائی برقرار رکھنے کے لئے مفید ہے کیونکہ جب آدمی خالی پیٹ سوتا ہے تو خالی معدے کی حرارت، اس کی رطوبت کو خشک اور کم کردیتی ہے، جو نشو ونما میں بہت اہم ہے یہ قدیم اطباء کی بیان کردہ وجہ ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق اس کی دو وجوہ ہیں (۱) اگر کوئی معدے کا مریض ہو تو خالی پیٹ سو جانے سے معدے کی تیزابیت بڑھے گی۔ (۲) خالی پیٹ سونے سے شوگر کا لیول کم ہوجاتا ہے اور چونکہ دماغ تو گلوکوز اور چکناہٹ استعمال کرتا ہے اس لئے دماغ کی غذا میں کمی آئے گی جس سے سستی اور اُکتاہٹ جنم لے گی چونکہ عربوں میں صبح دس بجے اور مغرب کے وقت کھانا ہوتا تھا اس لئے یہ دورانیہ تقریباً چوبیس گھنٹے بن جائے گا بخلاف روزے کے۔

باب ماجاء فی التسمیه علی الطعام

"عن عمر بن ابی سلمة انه دخل علیٰ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وعنده طعام قال:اُدن یابُنَیَّ فسَمِّ اللّٰه وکُل بیمینك وکُل ممایلیك"۔[1]

حضرت عمر بن ابی سلمہؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں داخل ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانا رکھا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ننھے قریب ہو اور بسم اللہ پڑھ کر سیدھے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے پاس سے کھاؤ!

تشریح:۔ حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب ہیں، جب ان کے والد ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو والدہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء فی التسمیة علی الطعام

[1] الحدیث اخرجه البخاری فی کتاب الاطعمة "باب التسمیة علی الطعام" ومسلم فی کتاب الاشربة "باب آداب الطعام والشراب" وابوداؤد فی کتاب الاطعمة "باب الأکل بالیمین" ومالک فی المؤطا کتاب صفة النبی ﷺ "جامع ماجاء فی الطعام والشراب" بحواله سنن دارمی ص: ۱۲۹ ج: ۲ کتاب الاطعمة.

سے ہوا، دستور جاہلیت کے برعکس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت اور شفقت فرماتے اور پیار کرتے "یابنی" فرما کر ان کو اپنی صلبی اولاد کی طرح پکارتے، اور اپنے پاس کھانے میں شریک فرماتے۔

قولہ "فسم اللّٰہ" یعنی بسم اللہ پڑھو جیسا کہ اگلی روایت میں ہے "اذا أکل احدکم طعاماً فلیقل بسم اللّٰہ" حضرت شاہ صاحبؒ عرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ روایات سے فقط "بسم اللّٰہ" کے الفاظ ثابت ہیں اس سے زیادہ نہیں لہٰذا امام نوویؒ اور امام غزالیؒ نے اس پر جو اضافہ مستحسن قرار دیا ہے وہ بلا دلیل ہے۔ تاہم مستدرک حاکم نے ایک روایت کی تخریج کی ہے "قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم خبز ولحم وتمر وبسر ورطب اذا اصبتم مثل ھذا فضربتم بایدیکم فکلوا بسم اللّٰہ وبرکۃ اللّٰہ" اور کہا ہے ھذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ (مستدرک ص:۱۳۶ ج:۵)۔ واللہ اعلم

اگر کوئی شخص بسم اللہ پڑھنا شروع میں بھول جائے تو کھانے کے دوران پڑھ لے جیسا کہ اگلی روایت میں تصریح ہے۔ جتنے لوگ کھانے میں شریک ہوں ان سب کو بسم اللہ پڑھنا چاہئے جیسا کہ باب کی اگلی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ گو کہ حاضرین کی جانب سے ایک کا تسمیہ کافی ہے بعد میں آنے والے سے نہیں۔ پھر امام نوویؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ نے لکھا ہے[۲] کہ بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنی چاہئے تا کہ دوسرے شرکاء کے لئے یاددہانی ہو۔ ہاں البتہ کھانے کے اختتام پر الحمد للہ آہستہ پڑھنا چاہئے تا کہ دوسروں کے کھانے کے انقطاع کا سبب نہ بنے۔ ہاں اگر سب لوگ فارغ ہوئے ہوں تو پھر کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح بسم اللہ حلال کھانے پر پڑھنی چاہئے۔ شامی میں تاتارخانیہ اور قنیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

"واذا قلت بسم اللّٰہ فارفع صوتك حتیٰ تلقن من معك، ولا یرفع بالحمد الا ان یکونوا فرغوا من الأکل وانما یسمیٰ اذا کان الطعام حلالاً ویحمد فی آخرہ کیف ما کان۔ (شامی ص۳۴۰ ج۶، ایچ ایم سعید کراچی، کتاب الحظر والاباحۃ)

پھر بسم اللہ جس طرح کھانے کی چیزوں پر پڑھنا مسنون یا مستحب ہے اسی طرح مشروبات پر بھی مستحب ہے حائضہ، جنب وغیرہ سب کے لئے یہ حکم یکساں ہے۔

بذل المجہود میں ہے کہ حنابلہ کے نزدیک تسمیہ واجب ہے جبکہ جمہور کے نزدیک سنت ہے "واختلفوا فی التسمیۃ علی الطعام فقال اصحاب احمد بالوجوب والجمہور علی انہ سنۃ (بذل ص:۳۵۱

[۲] النووی علی مسلم ص: ۱۷۱ ج: ۲ کتاب الاشربۃ.

ج:۵) درمختار کی کتاب الحظر والاباحۃ میں ہے"وسنة الأكل البسملة اوله والحمدله آخره، وغسل اليدين قبله وبعده ويبدأ بالشباب قبله وبالشيوخ بعده" اس پر علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے وقت کلی کرنا مسنون نہیں الا یہ کہ وہ جنب ہو۔ (ص:۳۴۰ ج:۶)

حدیث آخر:۔ اس باب میں دوسری حدیث حضرت عکراش بن ذویبؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ بنومرّہ نے مجھے اپنی زکوٰۃ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، پس جب میں مدینہ پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین اور انصار کے درمیان بیٹھے ہوئے پایا، فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ام سلمہؓ کے گھر میں لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ چنانچہ ایک پیالہ بہت ثرید اور گوشت والا لایا گیا، تو ہم اس کی طرف متوجہ ہو کر کھانے لگے میں اس کے اطراف میں اپنا ہاتھ اِدھراُدھر گھمانے لگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آگے سے تناول فرما رہے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بائیں ہاتھ سے میرا داہنا ہاتھ پکڑا اور پھر فرمایا، عکراش! ایک ہی جگہ سے کھاؤ کیونکہ سارا ہی کھانا ایک جیسا ہے۔ پھر بعد ازاں ایک طباق لایا گیا جس میں کئی قسم کی کھجوریں تھیں، تمر و رطب عبیداللہ (راوی) کو شک ہے (کہ تمر کہا یا رطب) پس میں اپنے آگے سے کھانے لگا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ طباق میں گھوم رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عکراش! جہاں سے چاہو کھاؤ کیونکہ یہ ایک قسم کی چیز نہیں ہے، پھر پانی لایا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ دھو لئے اور اپنے ہاتھوں کی تری سے اپنے چہرے، بازوؤں اور سر کو مسح کیا اور فرمایا: اے عکراش! یہ اس چیز سے وضوء ہے جو آگ سے پکی ہو۔

لغات:۔ قولہ "جفنة" بڑا پیالہ اور ڈونگا اس کی جمع جفان اور جفن آتی ہے قرآن مجید میں ہے "وجفان كالجواب"۔ قولہ "الثريد" شوربے میں روٹی کو چور کر بھگونا عرب اس کے ساتھ گوشت کی بوٹیاں شامل کرتے تھے، جیسا کہ حدیث باب میں ہے۔ قولہ "الوزر" بفتح الواؤ گوشت کی ایسی بوٹیاں جو ہڈی سے خالی ہوں۔ قولہ "فخبطت" یعنی میرا ہاتھ اس ڈونگے میں بے ترتیب سا گھوم رہا تھا۔ قولہ "الوان" لون کی جمع ہے اس کے ایک معنی رنگ کے ہیں اور دوسرے نوع اور قسم کے ہیں یہاں یہی مراد ہے۔

تیسری حدیث:۔ باب کی تیسری حدیث حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو "بسم الله" پڑھ لے اگر وہ شروع میں پڑھنا بھول جائے تو یوں کہے "بسم الله في اوله وآخره" اور اسی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھ صحابہؓ کے ساتھ کھانا تناول فرمارہے تھے، کہ ایک بادیہ نشین آیا اور وہ کھانا دو ہی لقموں میں کھا کر ختم کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھئے اگر یہ بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا تم سب کے لئے کافی ہو جاتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ سب کے لئے پڑھنی چاہئے، اور یہ کہ تسمیہ سے کھانے میں برکت ہو جاتی ہے اور یہ کہ تسمیہ بہر حال پڑھنا چاہئے۔ شروع میں بھول جائے تو کھانے کے دوران کسی بھی وقت یاد آنے پر پڑھ لے [۳] کھانے کے دوران پڑھنے سے بظاہر سابقہ کوتاہی کا ازالہ اور برکت کا تدارک ہو جاتا ہے، بخلاف وضوء کے کہ اگر آدمی وضوء کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو درمیان میں تسمیہ مسنون نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کھانے میں تسمیہ آغاز کے بعد مذکورہ باب کی حدیث سے ثابت ہے، جبکہ وضوء کے بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وضوء امر بسیط ہے جبکہ کھانا مرکب یعنی کئی حصوں پر مشتمل ہے چنانچہ دو لقمے بھی کھانا ہے اور بیس بھی۔ جبکہ وضوء میں تھوڑی سی جگہ خشک رہنے سے وضوء متحقق نہیں ہوتا۔ چنانچہ شیخ ابراہیم حلبیؒ شرح منیۃ المصلی میں لکھتے ہیں:

"ولو نسی التسمیۃ فذکرھا فی خلال الوضوء فسمّیٰ لاتحصل السنۃ بخلاف الأکل کذافی العنایۃ معللاًبان الوضوء عمل واحد بخلاف الأکل وھو یستلزم فی الأکل تحصیل السنۃ فی الباقی لااستدراك مافات قالہ ابن ھمام والاولیٰ انہ استدراك لمافات بالحدیث وھو قولہ علیہ السلام اذا أکل احدکم فنسی ان یذکر اسم اللّٰہ علیٰ طعامہ فلیقل بسم اللّٰہ اولہ وآخرہ۔ رواہ ابوداؤد [۴] والترمذی ولاحدیث فی الوضوء۔ (کبیری ص۲۲، سہیل اکیڈمی لاہور)

باب ماجاء فی کراھیۃ البیتوتۃ وفی یدہ ریح غمر

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان الشیطان حسّاس لحّاس

---

[۳] کذا فی الاحادیث التی فی مجمع الزوائد ص: ۱۰ تا ۱۲ ج: ۲ کتاب الاطعمۃ. [۴] سنن ابی داؤد ص: ۱۷۳ ج: ۲ "باب التسمیۃ علی الطعام" کتاب الاطعمۃ، قال اذا أکل احدکم فلیذکر اسم اللّٰہ فان نسی ان یذکر اسم اللّٰہ فی اولہ فلیقل بسم اللّٰہ اولہ وآخرہ، ایضاً رواہ الطبرانی فی الکبیر مجمع الزوائد ص: ۱۲ ج: ۵ کتاب الاطعمۃ.

فاحذروہ علیٰ انفسکم من بات وفی یدہ ریح غمر فاصابہ شئی فلایلومنّ الا نفسہ"۔[۱]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ شیطان تیز حس وادراک اور بہت چاٹنے والا ہے تم اس سے اپنے آپ کو بچائے رکھو، جو شخص رات گذارے دراں حالیکہ اس کے ہاتھ میں سے گوشت کی بوُ آرہی ہو اور اسے کوئی تکلیف واذیت پہنچے تو وہ سوائے خود کے کسی کو ملامت نہ کرے۔

لغات:۔قولہ "حساس" حِس سے مشتق ہے بمعنی ادراک کے۔قولہ "لحاس" لحس کے معنی زبان سے ہاتھ وغیرہ آلودہ وچکنی چیز کو چاٹنے کے ہیں، دونوں الفاظ تشدید کے ساتھ ہیں جو مبالغے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔قولہ "غَمَر" بفتحتین چکناہٹ ودسومت وغیرہ آلودگی کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔باب کی دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رات کے، کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کا بطور خاص اہتمام کرنا چاہئے، کیونکہ سوتے میں کوئی چیز جیسے کیڑے مکوڑے اور چوہے وغیرہ کھانے کے اثرات اور خوشبو سونگھتے سونگھتے ہاتھ تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر اسے کاٹنا شروع کر دیتے ہیں، ایسے واقعات کئی دفعہ پیش آئے ہیں کہ سوتے میں چوہے نے لوگوں کو کاٹا ہے یہ بے احتیاطی کے نتائج ہوتے ہیں

چونکہ اصل مقصد ان موذی جانوروں سے بچنا ہے اس لئے اگر صابن کا استعمال کیا جائے تو وہ زیادہ مفید ہے، ہاں بغیر صابن کے دھوکر کسی کپڑے وغیرہ سے اس طرح خشک کرنا کہ کھانے کے اثرات بالکلیہ ختم ہو جائیں تو یہ بھی کافی ہے، علاوہ ازیں نظافت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آدمی کے ہاتھ ہر حالت میں صاف ستھرے ہوں اور یہی شریعت مطہرہ کی تعلیم ہے۔

مسئلہ:۔بعض لوگ کھانے کے دوران روٹی کے ٹکڑے سے ہاتھ پونچھتے ہیں۔بعض چھری اس سے صاف کرتے ہیں۔جبکہ بعض لوگ روٹی کے اوپر پیاز اور سلاد وغیرہ یا پلیٹ رکھتے ہیں، یہ سب خلاف ادب ومکروہ ہیں۔علامہ شامیؒ لکھتے ہیں۔"یکرہ وضع الملحۃ والقصعۃ علی الخبز ومسح الیداو السکین بہ"۔

(ص:۳۴۰ ج:۶، کتاب الحظر والاباحۃ)

آخر ابواب الأطعمة

باب ماجاء فی کراھیۃ البیتوتۃ وفی یدہ ریح غمر

[۱] الحدیث اخرجہ ابوداؤد کتاب الاطعمۃ "باب غسل الید من الطعام" واحمد فی مسندہ وابن ماجہ وابن حبان فی صحیحہ بحوالہ سنن دارمی ص:۱۴۲ ج:۲ حدیث:۲۰۶۳ کتاب الاطعمۃ۔

أبواب الأشربة

چونکہ کھانا اصل ہے اور پیاس عموماً کھانے کی وجہ سے لگتی ہے، اس لئے اطعمہ کو پہلے ذکر کیا اور اشربہ اس کے بعد، نیز قرآن مجید کی ترتیبِ ذکری کو بھی ملحوظ رکھا گیا، اللہ عزّ وجل نے فرمایا: "کلوا واشربوا ولاتسرفوا"[۱] گو ہمارے نزدیک واو ترتیب پر دال نہیں۔ اشربہ، شراب کی جمع ہے جس کا اطلاق پانی اور باقی مائع تمام مشروبات پر ہوتا ہے چنانچہ اس بحث میں نبیذ کی جملہ اقسام اور پانی پینے کے آداب وغیرہ احکام کا ذکر ہوگا جو مختلف ابواب کے ذیل میں مذکور ہونگے جبکہ پہلا باب شراب کی وعید پر مشتمل ہے۔

باب ماجاء فی شارب الخمر

عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم كل مسكر خمرو كل مسكر حرام، ومن شرب الخمرفي الدنيافمات وهويُدمِنهالم يشربهافي الآخرة"۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نشہ آور چیز خمر (شراب) ہے اور ہر نشہ آور شے حرام ہے، اور جس نے دنیا میں شراب پی اور مرگیا دراں حالیکہ وہ ہیشگی سے پیتا رہا (اور پھر بغیر توبہ کے مرگیا) تو وہ آخرت (جنت) میں اسے نہیں پیئے گا۔

لغات:۔ قولہ "مسکر" سُکر سے ہے جس سے نشہ پیدا ہو۔ قولہ "خمر" اس کے لغوی معنی چُھپانے کے ہیں چنانچہ چادر اور دوپٹے کو خمار اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اوڑھنے سے جسم اور سر چھپ جاتا ہے، اس کے دوسرے معنی شدت اور قوت کے ہیں۔ کما صرح بہ صاحب الہدایہ اور شراب میں یہی معنی ہمارے نزدیک ملحوظ ہے۔ قولہ "یدمنھا" ادمن یدمن بمعنی مداومت کے ہیں ادمن الشيء ای اَدامه کسی چیز پر مداومت اور ہیشگی سے عمل کرنا۔

ابواب الاشربة

[۱] سورة الاعراف آیت: ۳۱

تشریح:۔ اس حدیث مبارک میں تین باتیں قابل ذکر ہیں:۔(۱) یہ کہ ہرنشہ آور مشروب خمر ہے یا یہ نام بعض مخصوص قسم کا ہے؟(۲) یہ کہ مسکرات کی قلیل وکثیر سب کا حکم ایک ہے یا مختلف؟(۳) شراب پینے کا عادی آدمی جنت میں جانے کی صورت میں شراب پیئے گا یا نہیں؟ ان میں سے پہلے دونوں مسائل اختلافی ہیں یہاں ان دونوں پر قدرے تفصیل سے بحث کرنا مناسب ہے۔

(۱) پہلے مسئلے میں أئمہ ثلاثہ اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ أئمہ ثلاثہ اور جمہور کے نزدیک ہرنشہ آور مشروب خمر ہے خواہ وہ کسی بھی چیز سے بنایا گیا ہو انگور، کھجور، جو، گندم اور شہد وغیرہ اس میں برابر ہیں۔ جبکہ امام اعظمؒ کے نزدیک خمر صرف انگور سے بنائی گئی شراب کو کہا جاتا ہے، جس کی تعریف یہ ہے ''ھی عصیر العنب اذاغلیٰ واشتدّوقذف بالزبد'' بعض حضرات نے ''ھی النِئی من ماء العنب اذاصار مسکراً'' سے تعریف کی ہے مصداق دونوں کا ایک ہے، یعنی انگور کا وہ کچا اور خام رس اور شیرہ جب اسے کچھ دنوں کے لئے بغیر پکائے یوں ہی خام چھوڑ رکھ دیا جائے یہاں تک کہ وہ جوش مارے اور تیز ہوکر جھاگ اٹھادے اس وقت وہ مسکر بھی بن جاتا ہے، اور بالاجماع خمر بھی کہلاتا ہے، اس کے علاوہ مسکرات کی جو باقی اقسام ہیں وہ اگرچہ سکر اور نشہ کی وجہ سے ناجائز ہوں گی۔ مگر خمر اور ان کے احکام میں فرق ہے۔ تاہم صاحبین کے نزدیک خمر کی تعریف میں آخری قید یعنی ''قذف بالزبد'' خمر بننے کے لئے لازمی نہیں ہے بلکہ صرف جوش مارنا کافی ہے۔ اس لئے ہدایہ[1] میں ہے ''وقیل یؤخذفی حرمۃ الشرب بمجرد الاشتداد احتیاطاً'' گویا پینا تو قذفِ زبد کے بغیر بھی حرام ہے مگر ''حد'' نافذ کرنے کے لئے قذفِ الزبد کا لحاظ رکھا جائے گا اسی میں احتیاط ہے۔

أئمہ ثلاثہ کے دلائل:۔ (۱) ان کا پہلا استدلال باب کی حدیث سے ہے کہ ''کل مسکرٍ خمر''۔[2]

(۲) دوسرا استدلال ترمذی وغیرہ کی مرفوع حدیث سے ہے جو ترمذی میں ''باب ماجاء فی الحبوب التی

باب ماجاء فی شارب الخمر

[1] ھدایہ ج:۳ ابواب الاشربۃ. [2] الحدیث اخرجہ البخاری ص:۸۳۳ ج:۲ کتاب المغازی، ایضاً اخرجہ فی کتاب الادب وکتاب الاحکام، ومسلم ص:۱۶۷ ج:۲ "باب بیان ان کل مسکر خمر وان کل خمر حرام" کتاب الاشربۃ، ابوداؤد ص:۱۶۲ ج:۲ "باب ماجاء فی السکر" کتاب الاشربۃ، سنن ابن ماجہ ص:۲۴۲ "باب کل مسکر حرام" ابواب الاشربۃ، سنن نسائی ص ۳۲۴ ج:۲ کتاب الاشربۃ مؤطا لمالک ضحایا۸، مسنداحمد ص:۴۵۲ ج:۱.

يتخذ منها الخمر ''میں آرہی ہے''ان من الحنطة خمراً أو من الشعير خمراً أو من التمر خمراً أو من الزبيب خمراً و من العسل خمراً''۔اسی باب میں ایک اور مرفوع حدیث ہے''الخمر من هاتين الشجرتين النخلة والعنبة''۔ یہ حدیث مسلم [۳] میں بھی ہے۔ جبکہ پہلی حدیث نسائی کے علاوہ خمسہ نے روایت کی ہے۔ (۳) خمر، مخامرۃ العقل سے مشتق ہے یعنی بمعنی ستر و اختلاط کے اور یہ خصوصیت تو ہر نشہ آور چیز میں پائی جاتی ہے۔

حنفیہ کی دلیل:۔ احناف کہتے ہیں کہ خمر کی حرمت قطعی ہے، جیسا کہ اللہ عز وجل کا ارشاد ہے:

''انما الخمر و الميسر و الانصاب و الازلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون''(سورۂ مائدہ آیت نمبر:۹۰ پارہ نمبر:۶)

دوسری طرف انگور سے بنائی گئی شراب بغیر کسی اختلاف کے خمر ہے، جبکہ باقی اجناس اور خمر کی مذکورہ تعریف کے علاوہ باقی صورتوں میں مسکرات کی اقسام کے خمر ہونے میں اہل لغت کا اختلاف ہے۔ بعض اہل لغت اگرچہ انہیں بھی خمر کہتے ہیں، مگر جمہور اہل لغت ان کو خمر نہیں مانتے ہیں۔ لہٰذا انگور کا مذکورہ قیود سے موصوف مشروب قطعی اور بالاجماع خمر ہوا۔ جبکہ باقی میں اختلاف کی وجہ سے ظن پیدا ہوا پس انگور سے بنی ہوئی شراب خمر کا قطعی مصداق ہے جبکہ باقی مسکرات مظنون معانی ہیں۔ اور لفظ کو قطعی مصداق پر حمل کرنا اولیٰ واصح ہوتا ہے بمقابلہ ظنی کے یہ ایسا ہے جیسے ائمہ ثلاثہ نبیذ التمر کو پانی نہیں مانتے اور اس سے وضوء کو جائز نہیں سمجھتے جیسا کہ ''باب الوضوء بالنبيذ''میں تفصیلاً گذرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص:۲۸۲ ج:اپر)

جوابات:۔ جمہور کے دلائل کا جواب یہ ہے، کہ جن روایات میں عام مسکرات کو خمر کہا ہے تو یہ اطلاق باعتبار لغت کے نہیں ہے، کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ عربوں کو ان کی زبان سکھادیں، بلکہ بیان احکام کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ لہٰذا ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام منشیات بعلتِ سُکر ونشہ کے حرام ہیں لہٰذا جس چیز میں یہ علت ہوگی تو وہ حرمت کے زمرے میں آئے گی اور کسی کو نشہ چڑھ جائے تو اس پر حد بھی لگے گی، جبکہ خمر یعنی انگور کی شراب من حیث الذات حرام، نجس، رِجس اور موجبِ حد ہے۔ اور جن احادیث مبارکہ میں سُکر کی علت بیان نہیں کی گئی ہے جیسے ان کے دوسرے استدلال کی روایات، تو ان اشیاء پر خمر کا اطلاق مجازاً ہے، کیونکہ جو کام خمر یعنی انگور کے خام پانی سے ہوتا ہے، یعنی نشہ تو وہ باقی اجناس کی شراب میں بھی

---

[۳] صحیح مسلم ص:۱۶۳ ج:۲ کتاب الاشربة، ایضاً رواه ابوداؤد ص:۱۶۲ ج:۲ والنسائی واحمد فی مسند کذافی سنن دارمی ص:۱۵۴ ج:۲ حدیث:۲۰۹۶ کتاب الاشربة.

پایا جاتا ہے۔اور قرآن وسنت میں مجاز کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ابن الملک اور ابن سیدہ وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے صاحب تحفۃ الاحوذی نے ''باب ماجاء فی الحبوب التی یتخذمنھاالخمر'' میں ''ان من الحنطۃ خمراً'' کی شرح میں لکھا ہے:''قال ابن الملک تسمیتہ خمراً مجاز لإزالتہ العقل'' گوکہ اپنے طور سے پھر اس کی تردید کی ہے اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"نعم جزم ابن سیدہ "فی المحکم" بان الخمرحقیقتہ انماھی للعنب وغیرھامن المسکرات یسمیٰ خمراًمجازاً"۔

اعتراض:۔ اگر باقی اقسام حقیقتاً خمر نہیں تو پھر جب خمر کی حرمت نازل ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس نی عنب (یعنی شیرہ) کے سوا اجناس کی شراب تھی تو اسے کیوں بہا کر ضائع کر دیا؟ حالانکہ وہ اہل لسان تھے۔

جواب:۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شیرۂ انگور کے سوا تمام اقسام کو خمر سمجھتے تھے، بلکہ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ مسکر تھا اور مسکرات تو حرام ہیں لہٰذا جب خمر کی حرمت نازل ہوئی اور علت تو اس حرمت کی سکر ہی تھی اس لئے انہوں نے سب کو ضائع کر دیا۔

جہاں تک جمہور کے تیسرے استدلال کا تعلق ہے کہ عصیر العنب اور باقی اقسام میں علت یکساں ہے یعنی عقل کو مغلوب کرنا اور چھپانا لہٰذا سب برابر ہیں کیونکہ اس لحاظ سے سب خمر ہیں۔

اس کا جواب صاحب ہدایہ نے دیا ہے:''وانماسمیٰ خمراًلتخمُرہ لالمخامرتہ العقل'' یعنی شیرۂ انگور کو خمر عقل کو چھپانے کی بناء پر نہیں کہتے، بلکہ تخمر یعنی تغیر، اشتداد اور قوت کی وجہ سے کہتے ہیں، اور یہ علت نی العنب میں جس پیمانے پر پائی جاتی ہے باقی اقسام میں اس طرح نہیں پائی جاتی۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ہدایہ کے بعض شارحین نے اس عبارت کا دوسرا مطلب بیان کیا ہے جس کو شیخ ابن ہمامؒ نے رد کیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے تنزیلی جواب بھی دیا ہے کہ اگر مان لیا جائے کہ شراب کو خمر ستر عقل کی وجہ سے کہا جاتا ہے، تو پھر جواب یہ ہے کہ اس عموم کے باوجود خمر کی تخصیص نی العنب کے ساتھ ہوئی ہے یعنی لغۃ میں جیسے نجم ظہور کے معنیٰ میں ہے، مگر پھر بھی یہ مخصوص ستاروں کے لئے بولا جاتا ہے اُفق پر ہر نمودار ہونے والے ستارے کو نہیں کہتے ہیں، بلکہ صرف ثریا پر اس کا اطلاق ہوتا ہے فکذا ہذا۔

دوسری بحث:۔ اس بحث کا موضوع یہ ہے کہ آیا تمام مسکرات حرام ہیں اور ان کا حکم بھی خمر ہی کا ہے یا ان میں اور عصیر العنب کے احکام میں فرق ہے؟ تو پہلے یہ جاننا چاہئے کہ انگور کے خام شیرہ کے علاوہ جو مسکرات

ہیں ان کی اقسام میں فرق ہے۔آسان لفظوں میں ہم ان کی مجموعی اعتبار سے دو قسمیں بنا سکتے ہیں پہلی قسم میں تین قسم کے مشروبات آتے ہیں (۱) انگور کا شیرہ پکا کر شراب بنانا جب ثلثین یا نصف بچ جائے۔ (۲) کھجور سے بنائی ہوئی شراب۔ (۳) اور تیسری کشمش کی خام شراب یہ تین اقسام عصیر العنب جس کی تعریف ابھی گزری یعنی ھی عصیر العنب اذا علیٰ الخ کے ساتھ شمار کر کے اشربہ اربعہ کے نام سے مشہور ہیں۔ جبکہ دوسری قسم کے مشروبات ان کے علاوہ گندم اور جو یا شہد وغیرہ کسی بھی چیز سے بنائی ہوئی شراب کی ہے۔

ائمہ ثلاثہ اور امام محمد رحمہم اللہ ان اقسام میں اور شراب کی اس قسم میں جو انگور سے بنائی گئی ہو فرق نہیں کرتے ہیں بلکہ سب کو خمر کہتے ہیں [۴] اور سب کا حکم ایک ہی بتاتے ہیں یعنی جس طرح ان مسکرات کی مقدار کثیر حرام ہے اسی طرح مقدار قلیل بھی حرام اور موجب حد ہے اگر چہ اس سے نشہ نہ چڑھتا ہو۔ حضرت شاہ صاحبؒ عرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ حنفیہ میں سے ارباب فتوی نے امام محمدؒ کے قول پر فتوی دیا ہے، اور حضرت تھانوی صاحبؒ نے بھی المسک الذکی میں فرمایا ہے کہ امام صاحب کو جمہور کی مستدل حدیث پہنچی نہ ہوگی ورنہ وہ اس پر ضرور عمل فرماتے، کیونکہ اصولی طور پر جب حدیث ثابت ہو جائے تو اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے۔

بہر حال شیخینؒ کے نزدیک قسم ثانی کے مسکرات میں ضابطہ یہ ہے کہ ان کی تھوڑی سی مقدار جس سے نشہ پیدا نہ ہوتا ہو عبادت کی قوت کے حصول کی نیت سے پینا جائز ہے، جبکہ زیادہ پینا یا مستی وشادمانی کی نیت سے پینا حرام ہے۔ جبکہ اشربہ اربعہ مطلقاً حرام ہیں تاہم عصیر العنب اور باقی تینوں میں اتنا سا فرق ہے کہ عصیر العنب کی حرمت باقی تینوں سے اشد ہے، اور متعدد احکام میں ان کے مابین فرق ہے چنانچہ صاحب ہدایہ نے وہ احکام کچھ یوں بیان کئے ہیں۔ خمر کی عین ذات حرام ہے لہٰذا ایک قطرہ پینا بھی حرام ہوگا اگر چہ سکر نہ ہو۔ یہ پیشاب کی طرح نجس ہے، اس کو حلال سمجھنے والا کافر ہے۔ مسلمان کے لئے اس کی خرید وفروخت وغیرہ جائز نہیں۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ اس کی تھوڑی سی مقدار پینے سے بھی حد لگے گی اور اس کو سرکہ بنانا ہمارے نزدیک جائز ہے۔

باقی تینوں اشربہ کے بارے میں صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

"الّاان حرمة هذه الاشربة (الثلثة) دون حرمة الخمر حتى لايكفر مستحلها ويكفر مستحل الخمر لان حرمتها اجتهادية و حرمة الخمر قطعيه و لايجب

---

[۴] راجع للتفصيل مؤطا لمحمد ص: ۳۱۵ كتاب الحدود ، ادارة الحرم لاهور.

الحد بشربھا حتیٰ یسکر" الخ یعنی سابقہ احکام کے برخلاف۔

(راجع للتفصیل ہدایہ کتاب الاشربہ جلد چہارم)

حضرت شاہ صاحبؒ العرف الشذی میں فرماتے ہیں: ''ان ھذہ المسئلة لم اجدفیھا مایشفی الصدور''۔

یہ بحث مائع مسکرات سے متعلق تھی جہاں تک جامد منشیات کا تعلق ہے جیسے افیون تو المسک الذکی میں ہے کہ اجماعاً ایسی چیزوں کا اس قدر کھانا جائز ہے جو مسکر نہ ہو، اور اگر زیادہ کھانا چاہے جس میں نشہ پیدا ہونے کا احتمال ہو تو ان چیزوں میں کوئی ایسی چیز ملا دے جو مانعِ سکر ہو پھر کھالے کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ انتہیٰ علی ہذا جو لوگ نسوار کھانے اور سگریٹ پینے کو حرام قرار دیتے ہیں ان کا دعویٰ بلا دلیل ہے کیونکہ ان کے عادی لوگ نشے کی زد میں نہیں آتے ہاں البتہ ان چیزوں کی دوسری قباحتیں اپنی جگہ مسلم ہیں جیسے بدبو، بیماری کا اندیشہ، بلا وجہ پیسوں کا ضیاع اور دوسروں کو تکلیف اور گھن وغیرہ کا موجب بننا وغیرہ وغیرہ۔ البتہ چرس اور ہیروئین دونوں تباہ کن ہیں اور اس کے پینے سے ایک تو آدمی نشے میں دُھت رہتا ہے۔ دوسرے جسمانی اور مردانہ لحاظ سے ان کا پینے والا طاقت وتوانائی سے محروم ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں اس سے عقل میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔

ادویات اور پرفیوم میں شامل کیا جانے والا ''الکحول'': ۔عام طور سے ادویات یا سپرے والی خوشبو میں بغرض حفاظت الکوہل یا الکحول نامی مائع مادہ ملایا جاتا ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ بھی شراب کی طرح نجس ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ الکحول دو طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے (۱) خام تیل یعنی پیٹرول سے۔ (۲) گلوکوز سے۔ پہلی صورت میں پچانوے (۹۵) فیصد سے زیادہ حصہ پیٹرول کا ہوتا ہے اور باقی کچھ نباتات اور زہر وغیرہ ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری صورت میں گنّے اور چقندر وغیرہ کے رس کے جھاگ سے کیمیائی عمل سے اور بذریعہ تخمیر بنایا جاتا ہے دونوں صورتوں میں انگور کی کوئی آمیزش اس میں نہیں ہوتی ہے لہٰذا ادویات وغیرہ میں اس کے ہونے سے کوئی مضائقہ لازم نہیں آتا۔

تیسری بات: ۔اس باب میں تیسری بحث حدیث کے جز ثانی سے متعلق ہے کہ عادی شرابی جنت میں شراب پی سکے گا یا نہیں؟ اس حدیث کے مطابق جو آدمی بکثرت شراب پیتا ہے اور جسے عرف میں شرابی کہا جاتا ہے وہ جنت میں شراب نہیں پیئے گا۔ اس حکم کے بارے میں شارحین کافی پریشان ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ وجہ اشکال یہ ہے کہ نہ تو مرتکب کبیرہ کافر ہو جاتا ہے اور نہ ہی جنت میں کسی چیز پر پابندی ہوتی

ہے بلکہ وہاں تو ہر وہ چیز ملتی ہوگی جس کی دل میں خواہش پیدا ہوگی۔

عام ضابطے کے مطابق جو مؤمن گناہ سے توبہ کر لے تو وہ ایسا ہی شمار ہوتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو "التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ" ۵ اور جو شخص بغیر توبہ کے انتقال کر جائے تو اس کا معاملہ اللہ عزوجل کے دستِ اختیار میں ہوتا ہے چاہے تو معاف فرمادے اور چاہے تو اسے سزا دیدے۔ تاہم اہلسنت والجماعت کے نزدیک وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، بلکہ سزا کاٹنے کے بعد اپنے ایمان کی وجہ سے جنت میں داخل ہوگا۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ جو آدمی شراب حلال سمجھ کر پیتا رہے یا خاتمہ بالخیر سے محروم ہو جائے۔ والعیاذ باللہ تو پھر تو مطلب آسان اور واضح ہے کہ حلال سمجھنے والا کافر ہو جاتا ہے اور خاتمہ بالخیر سے محروم جنت میں داخل نہیں ہوگا تو شراب نہیں پی سکے گا۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے باوجود نہیں پیئے گا تو یہ مشکل ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، تو ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہ توجیہ کی ہے کہ اس نے ایک ایسی چیز کے حصول میں عجلت اور جلدی سے کام لیا جس کی تاخیر اور انتظار کا حکم تھا تو جس طرح اپنے مورِث کو قتل کرنے سے قاتل وارث کو محروم از میراث کر دیا جاتا ہے اسی طرح یہ بھی محروم کر دیا جائے گا۔

مگر اس سے وہ اشکال حل نہیں ہوا کہ جنت میں ہر خواہش پوری کر دی جائے گی۔ بعض نے کہا کہ اس شرابی کی چاہت ختم کر دی جائے گی جیسے دنیا میں بعض لوگ میٹھے کو پسند نہیں کرتے اسی طرح باوجود دستیابی کے شرابی، شراب کی خواہش نہیں کرے گا، تو سزا بھی مل جائے گی اور اسے محسوس بھی نہ ہوگا، اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کم درجے کے جنتی اپنے آپ کو بہت اعلیٰ سمجھتے ہوں گے اور کسی طرح احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں گے، فکذا ھذا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

دوسری حدیث:۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے شراب پی لی تو اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہ ہوں گی، پس اگر اس نے توبہ کر لی تو اللہ (توبہ) قبول فرمالیں گے، اگر وہ دوبارہ لوٹے گا (یعنی ثانیاً پیئے گا) تو اللہ اس کی چالیس ایام کی نمازیں قبول نہیں فرمائیں گے، پھر وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ قبول فرمائیں گے، اور اگر وہ پھر لوٹتا ہے تو اللہ اس کی چالیس روز کی نمازیں قبول نہیں فرمائیں گے پس اگر اس نے توبہ کر لی تو اللہ قبول کریں گے، پس اگر وہ چوتھی بار لوٹ آئے تو اللہ

۵ رواہ ابن ماجہ ص: ۳۱۳ "باب ذکر التوبۃ" ابواب الزھد.

اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں فرمائیں گے، پس اگر وہ (آب کی بار) توبہ کرے گا تو اللہ قبول نہیں فرماتا اور اسے نہر خبال سے پلائیں گے، کہا گیا: اے ابوعبدالرحمٰن نہر خبال کیا چیز ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ دوزخیوں کے پیپ کی نہر ہے۔

تشریح:۔ ابوعبدالرحمٰن، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔ یعنی اہل جہنم کے زخموں سے کثیر مقدار میں جو پیپ خارج ہوتا ہے وہ نہر کی شکل اختیار کرے گا اور اسی میں سے شرابیوں کو پلایا جائے گا۔ اس حدیث میں ''صباح'' کا لفظ آیا ہے اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صرف صبح کی نماز مراد ہو اور وجہ تخصیص اشرفیت ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ اس سے پورے دن کی نمازیں مراد ہیں اور ذکر الجزء والمراد منہ الکل عام استعمال ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گندی غذا کا اثر چالیس دنوں تک باقی رہتا ہے، تاہم بعض صوفیہ نے اس میں غلو سے کام لیا ہے کہ اگر کسی بکری کا بچہ مادہ خنزیر کا دودھ پیئے تو اسے چالیس دن تک صاف ستھری غذا کھلائی جائے گی اس کے بعد ذبح کر کے کھانا جائز ہوگا۔ مسئلہ کی وضاحت جلالہ کے ضمن میں گذری ہے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تین بار اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں اس کے بعد نہیں، تو ابن العربیؒ تو فرماتے ہیں کہ موت تک توبہ قبول ہونے پر اجماع ہے لہٰذا اس حدیث کو وہ صحیح نہیں مانتے لیکن پہلے گذرا ہے کہ قاضی شوکانیؒ نے فرمایا کہ جمہور کے نزدیک حدیث حسن بھی حجت ہے۔ جبکہ امام بخاریؒ اور ابن العربیؒ حسن کو صحیح نہیں مانتے، اس لئے جمہور کے نزدیک اس کی توجیہ لازمی ہے۔

لہٰذا جمہور کے نزدیک یا تو یہ تشدید اور تغلیط پر محمول ہے اور نفی توبہ سے رحمت کاملہ کی نفی ہے یعنی اس کی توبہ قبول تو ہو جاتی ہے مگر دل میں جو کدورت گناہ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے وہ مکمل صاف نہ ہوگی اور باری تعالیٰ کی رحمت کاملہ اسے اپنی آغوش میں نہیں لے گی۔

یا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی بار بار گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سخت ہو جاتا ہے پھر آدمی یا تو توبہ کرتا ہی نہیں ہے یا پھر ہلکا سا ارادہ کرتا ہے مگر اس میں عزم نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق نہیں دیتا اور یہی وجہ ہے کہ گناہ پر اصرار سے خاتمہ بالسوء کا خطرہ رہتا ہے، پھر نماز کے علاوہ باقی اعمال قبول ہوں گے یا وہ بھی قبول نہیں ہوتے تو اس میں دونوں احتمال ہیں ظاہر یہ ہے کہ کوئی عمل قبول نہیں ہوگا کیونکہ نماز عماد الدین ہے جب یہ قبول نہ ہوگی تو باقی تو بطریقِ اولیٰ قبول نہیں ہوں گے۔

ملا علی قاریؒ مرقات میں لکھتے ہیں کہ عدم قبول سے مراد ثواب نہ ملنا ہے باقی اگر اس نے شرائط کے

ساتھ نمازیں پڑھی ہونگی تو اس کا ذمہ فارغ ہوجائے گا اور قضا واجب نہ ہوگی۔

باب ماجاء کل مسکر حرام

"عن عائشة ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم سُئِل عن البِتع فقال: کل شراب اسکر فهو حرام"۔ [1]

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے شہد کی نبیذ کے بارے میں پوچھا گیا (یعنی حل وحرمت کے متعلق) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی مشروب جونشہ پیدا کرے تو وہ حرام ہے۔

لغات:۔ قولہ "البتع" بکسر الباء وسکون التاء جبکہ تاء کی حرکت بھی جائز ہے شہد کی نبیذ اور شراب کو کہتے ہیں۔ بعض اہل لغت نے انگور کی شراب پر بھی اطلاق کیا ہے۔

تشریح:۔ حضرت گنگوہی صاحب رحمہ اللہ الکوکب الدری میں فرماتے ہیں کہ سوال اگر چہ مخصوص نبیذ کے بارے میں تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون کلی کے عنوان میں جواب دیا تاکہ اس پر جزئیات کی تعریفات ہوسکیں۔ اس ضابطے کا مطلب یہ ہے کہ جو مشروب نشے کے درجے میں داخل ہوجائے یعنی اس کے پینے سے نشہ پیدا ہوتا ہو تو وہ حرام ہے اور اس پر اجماع ہے کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے، البتہ اختلاف اس میں ہے کہ شہد وغیرہ کی شراب مطلقاً حرام ہے خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر یا پھر نشے کی مقدار کثیر ممنوع اور قلیل جائز ہے؟ بشرطیکہ تقوی علی العبادۃ کی نیت سے ہو تو ائمہ ثلاثہ اور امام محمد رحمہم اللہ نے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے، جبکہ شیخین رحمہما اللہ دوسری صورت کو پسند کرتے ہیں کیونکہ حدیث سے علت سکر کی طرف اشارہ ملتا ہے، تاہم ارباب فتویٰ نے امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی ہے تفصیل گذشتہ باب کی دوسری بحث میں گذری ہے فلا نعیدہ۔

باب ماجاء کل مسکر حرام

[1] الحدیث اخرجه البخاری ومسلم وابوداؤد والنسائی وابن ماجه ومالک فی المؤطا واحمد فی مسنده بحواله سنن دارمی ص: ۱۵۴ ج: ۲ حدیث: ۲۰۹۷ کتاب الاشربة.

باب ماأسکر کثیرہ فقلیلہ حرام

”عن جابر بن عبداللّٰہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال:ماأسکر کثیرہ فقلیلہ حرام“۔[۱]

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس چیز (مشروب) کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے تو اس کا قلیل بھی حرام ہے۔

تشریح:۔جیسا کہ پیچھے گذرا ہے کہ قلیل کی حرمت خمر میں تو متفقہ ہے اور باقی اشربہ ثلاثہ میں بھی قلیل ممنوع ہے گو خمر اور اشربہ ثلاثہ کی حرمت میں قدرے فرق پایا جاتا ہے، تاہم حنفیہ کے نزدیک خمر کے علاوہ باقی اشربہ جیسے گندم، جو اور شہد وغیرہ کی شراب مین اصل علت سکر ہے لہٰذا جس چیز میں سکر ہوگا وہ حرام ہوگی اور جس میں نشہ نہ ہوگا وہ حرام نہ ہوگی، البتہ یہاں دوسری علت بھی حرمت کی پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر نبیذ وغیرہ مشروبات بطور تلہی و مستی اور ہیجان پیدا کرنے کی غرض سے ہو، یا وہ قلیل، زیادہ پینے کا سبب بنتا ہو تو پھر قلیل مسکرات کا بھی حرام ہوگا اگر چہ قلیل میں نشہ پیدا کرنے کی بالفعل طاقت نہ ہو، اور یہی حنفیہ کے نزدیک مفتیٰ بہ ہے حضرت شاہ صاحبؒ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے بعد العرف الشذی میں فرماتے ہیں:

”(واقعہ)فی شرح الھدایة ان اباحفص الکبیرافتی بحرمة النبیذ فقیل له خالفتَ اباحنیفة افقال:ماخالفته فانه یحرم اذاکان لِلتلهِی واناس الزمان یشربونه علی التلهی“...۔

وہ مزید فرماتے ہیں:”ویجب العمل بماقال الجمهورومحمدبن حسن“، یعنی مفتیٰ بہ قول جمہور کا ہے۔ ہدایہ کے شارحین نے امام صاحبؒ سے نقل کیا ہے، کہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر مجھے ساری دنیا کی چیزیں اور ان جیسی مزید دی جائیں تو بھی میں نبیذ ایک قطرہ نہیں پیوں گا، کیونکہ اس میں اختلاف ہے اور اگر مجھے دنیا کی ساری اشیاء دی جائیں تا کہ میں نبیذ کو حرام قرار دوں تو میں ایسا بھی نہیں کرونگا کیونکہ اس میں اختلاف

باب ماأسکر کثیرہ فقلیلہ حرام

[۱] اخرجه النسائی ص:۳۲۶ ج:۲ کتاب الاشربة، اخرجه الطبرانی فی الکبیرحدیث:۴۸۸۰ وفی الاوسط ایضاً حدیث:۶۴۴۶، کذا فی مجمع الزوائد ص:۵۸ ج:۵ حدیث:۸۱۰۹ کتاب الاشربة.

ہے۔(راجع للتفصیل العرف الشذی علی الترمذی)

دوسری حدیث:۔"عن عائشة قالت:قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم:کل مسکرحرام ماأسکرَالفرق منه فملأ الکف منه حرام قال احدهمافی حدیثه الحُسوةُ منه حرام"۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ہرنشہ آور چیز (مشروب) حرام ہے جس کاایک فرق (بڑاپیمانہ ہے) نشہ پیدا کرے تو اس کاایک چلو بھی حرام ہے (اور میرے دونوں شیخین محمد بن بشار یاعبداللہ معاویہ) ایک ان دو میں سے اپنی حدیث میں کہتے ہیں کہ اس کاایک گھونٹ بھی حرام ہے یعنی ایک نے چلو کالفظ استعمال کیااور دوسرے نے گھونٹ کا۔

لغات:۔قولہ"الفرق"را کاسکون اور فتحہ دونوں جائز ہیں وہ پیمانہ جس میں سولہ رطل آجائیں یہاں یہ کنایہ ہے کثرت سے۔فرق کی مقدار میں اور بھی اقوال ہیں۔قولہ"حسوة"بضم الحاء وسکون السین ایک مُٹھی اور چلو کو کہتے ہیں یہاں پر چلو اور گھونٹ دونوں تحدید کے لئے نہیں ہیں بلکہ قلت سے کنایات ہیں۔

باب ماجاء فی نبیذالجَرِّ

"عن طاؤس ان رجلاأتیٰ ابن عمرفقال:نهیٰ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن نبیذالجَرِّ؟ فقال: نعم فقال طاؤس:واللّٰه انی سمعته منه"۔

حضرت طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت ابن عمرؓ کے پاس آیااور کہنے لگا: کیارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھڑے میں نبیذ بنانے سے ممانعت فرمائی ہیں؟ تو ابن عمرؓ نے فرمایا:''ہاں'' طاؤس فرماتے ہیں: بخدامیں نے ابن عمرؓ سے یہ کہتے سنا ہے۔[1]

لغات:۔قولہ"نبیذ"فعیل وزن ہے گویامفعول سے بنا ہے یعنی منبوذ سے،انگور یاکھجور وغیرہ پانی میں ڈال کرر کھ اور چھوڑ دیاجائے یہاں تک کہ پانی میٹھا ہوجائے خواہ اس میں نشہ آئے یانہ آئے دونوں صورتوں

باب ماجاء فی نبیذ الجر

[1] اسی مضمون کی روایت عن سوید بن مقرن قال اتیت رسول اللّٰه ﷺ بنبیذ جر فسألته عنه فنهانی عنه فاخذت الجرة فکسرتها، رواه احمد فی مسنده ص:۴۷۷ ج:۳ حدیث:۱۵۲۷۷، ایضاً مجمع الزوائد ص:۵۹ ج:۵، ایضاً مصنفه عبدالرزاق ص:۱۲۳ ج:۹ کتاب الاشربة والظروف.

میں اسے نبیذ کہتے ہیں۔قولہ "جر" بفتح الجیم وتشدید الراء جرۃ کی جمع ہے جیسے تمر اور تمرۃ اس کی جمع جرار بھی آتی ہے اس مٹکے اور گھڑے کو کہتے ہیں جو مٹی سے بنایا جائے۔

تشریح:۔ طاؤس ابن کیسانؒ المتوفی ۱۰۶ھ تابعی ہیں بعض نے نام ذکوان اور طاؤس لقب بتلایا ہے طاؤس مور کو کہتے ہیں جو ایک خوبصورت پرندہ ہے۔ یہاں سائل کے سوال میں ہمزۂ استفہامیہ مقدر مانا جائے گا جیسا کہ نسائی کی روایت میں مذکور ہے انتہی۔[۲]

عربوں میں یہ دستور تھا کہ مٹکوں اور گھڑوں کے مسامات تارکول وغیرہ سے بند کر کے ان میں نبیذ بناتے تھے، اور اس چیز سے نبیذ میں جلد ہی سکر آجاتا تھا اس لئے شراب کی حرمت کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے تمام اوانی وظروف پر پابندی لگادی جن سے نبیذ میں سکر پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، تاہم یہ پابندی جمہور کے نزدیک پھر اٹھالی گئی تھی۔ جبکہ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور ایک روایت کے مطابق امام اسحٰقؒ کے نزدیک یہ بدستور باقی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا مذہب بھی یہی بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

"ثم ان هذاالنهى كان فى اول الامرثم نُسِخَ بحديث بريدة رضى الله عنه....الى ان قال....هذاالذى ذكرناه من كونه منسوخاًهومذهبناومذهب جماهيرالعلماء قال الخطابى:القول بالنسخ هواصح الاقاويل وقال قوم:التحريم باق وكرهواالانتباذفى هذه الاوعية ذهب اليه مالكؒ واحمدؒ واسحٰقؒ وهومروى عن ابن عمروابن عباس رضى الله عنهم۔ (مسلم مع النووی ص:۱۶۴ ج:۱)

نسخ کی دلیل اگلے سے پیوستہ باب میں آرہی ہے۔

ابن العربیؒ نے بھی عارضہ میں لکھا ہے:

"اختلف العلماء فى هذااختلافاًكثيراًروى عن مالكؒ منع ذالك وبه قال احمدؒ واسحٰقؒ وروى عنه (اى عن اسحق) اجازته"الخ۔

علیٰ ہذا حضرت ابن عمرؓ کے جواب "نعم" کی کسی توجیہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ انہوں نے یہ جواب اپنے ذوق کے مطابق دیا ہے تاہم وہ نسخ کے قائل کیوں نہیں تھے، تو ممکن ہے کہ وہ بطور سد ذرائع اس کی ممانعت فرماتے ہوں، کیونکہ لوگ عموماً احتیاط نہیں کرتے ہیں اور نبیذ کو زیادہ دیر کے لئے چھوڑ لیتے ہیں یہاں تک

---

[۲] سنن نسائی ص:۳۲۶ ج:۲ "باب النهى عن نبيذ الجر مفرداً" كتاب الاشربة.

کہ وہ مسکر بن جاتی ہے یا ادنیٰ درجے کا سکر اس میں آجاتا ہے مگر لوگ پھر بھی اسے پیتے ہیں تو پابندی کا فائدہ حرام سے دور رکھنا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ امام ابوحنیفہؒ نے ہدی کے شعار سے منع فرمایا تھا کیونکہ لوگ اس میں غلو کیا کرتے تھے گویا مفتی کو حالات کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔

باب ماجاء فی کراهية أن يُنبذَ في الدُّبّاء والنقير والحنتم

"عن عمرو بن مُرَّةَ قال سمعتُ زاذان يقول سألت ابن عمر عمانهى عنه رسول الله صلى الله عليه وسلم من الاوعية وأخبِرناه بلغتكم وفَسِّره لنا بلغتنا قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحنتمة وهى الجرة ونهى عن الدُّبّاء وهى القرعة ونهى عن النقير وهى اصل النخل يُنقر نقراًاو يُنسج نسحاً ونهى عن المزفّت وهو المقيّر وَاَمَرَان يُنتبذ فى الاسقية"۔

عمرو بن مرّہ فرماتے ہیں میں نے زاذان سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابن عمرؓ سے ان برتنوں کے بارے میں دریافت کیا جن کے استعمال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ اس کا بیان اپنی زبان میں کیجئے اور وضاحت ہماری زبان میں کیجئے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنتم سے منع فرمایا ہے اور وہ ہرے رنگ کا گھڑا ہوتا ہے، اور منع فرمایا ہے دباء سے اور وہ خشک کدو ہے۔ اور منع فرمایا ہے نقیر سے اور وہ کھجور کی جڑ کا تراشا ہوا گھڑا ہوتا ہے یا چھلا ہوا مٹکا، اور منع فرمایا ہے مزفت سے اور وہ تارکول کا لیپ دیا ہوا مٹکا ہوتا ہے۔ اور مشکیزوں میں نبیذ بنانے کا حکم دیا ہے۔

لغات:۔ قولہ "الاوعية" وِعاء بکسر الواو کی جمع ہے برتن کو کہتے ہیں۔ قولہ "الحنتمة" امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس کے چھ معانی نقل کئے ہیں اور ان میں سے ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ ہرے رنگ کے مٹکے کو کہتے ہیں "واما الحنتم فاختلف فيها فاصح الاقوال واقواها انها جِرار خضر"[1] بہرحال یہ لفظ بفتح الحاء وسکون النون اور بفتحہ تاء پڑھا جائے گا۔ قولہ "الجرة" بفتح الجیم وفتح الراء المشددہ مٹی کا مٹکا۔ قولہ "الدباء" بضم الدال وتشدید الباء کدو کو کہتے ہیں۔ اس میں سے بیج اور گودا نکال کر بوتل کی طرح بناتے ہیں، ہمارے ہاں پہلے لوگ جب کھیت میں کام کرتے تو اس میں پانی اپنے پاس رکھتے خصوصاً لسّی اس میں کافی ٹھنڈی رہتی ہے۔

باب ماجاء فی کراهية ان ينبذ فى الدباء الخ

[1] النووی علی مسلم ص: ۳۴ ج: ۱ کتاب الایمان۔

قولہ "القرعة" بروزن نملۃ یہ وہی مذکورہ کدو ہے۔ قولہ "النقیر" یہ قتیل کی طرح بمعنیٰ منقور کے ہے نقر کے لغوی معنی کریدنے، تراشنے اور کھودنے کے ہیں اصطلاح میں اس کی تفسیر وہی ہے جو حدیث باب میں کی گئی ہے، یعنی کھجور کے تنے کا جڑ والا حصہ اندر سے خالی کر کے مٹکا نما بنانا۔ قولہ "اوینسج" اس لفظ کو جیم اور حاء دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے اگر جیم کے ساتھ ہے تو اس کا مطلب وہی ہے جو نقیر کی تفسیر میں بیان ہوا تاہم بعض حضرات نے جیم کے ساتھ پڑھنے کو وہم قرار دیا ہے اور حاء کی روایت کو صحیح کہا ہے جس کے معنی بیرونی حصہ کو چھیل کر ملائم کرنے اور اندرونی کو خالی کر کے مٹکا بنانے کے ہیں۔

قولہ "المزفت" بتشدید الفاء المفتوحہ اس کے معنی وہی ہیں جو حدیث میں اس کے بعد بیان کئے گئے ہیں یعنی "مقیر" چنانچہ امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں: "واما المقیر فھو المزفت"[۲] مقیر بضم المیم وفتح القاف وتشدید الیاء المفتوحہ پڑھا جائے گا۔ زفت اور قیر دونوں کے معنی تارکول کے ہیں۔ تارکول لگانے سے مسامات بند ہو جاتے ہیں پھر اس میں بھی نبیذ مسکر بن جاتی ہے جس طرح سابقہ برتنوں کی اقسام میں نبیذ جلدی مسکر بن جاتی ہے۔

تشریح:۔ جیسا کہ سابقہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ان برتنوں کا استعمال ابتداءِ زمانہ حرمتِ خمر میں ممنوع قرار پایا تھا بعد میں اس کی اجازت دی گئی تھی، اور اب جمہور کے نزدیک ان کا استعمال جائز ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس کے لئے مستقل باب اس باب کے بعد قائم کیا ہے، بہرحال یہ ممانعت مطلق استعمال سے نہ تھی بلکہ نبیذ بنانا اور رکھنا ان میں ممنوع تھا، کیونکہ ایک تو مسامات بند ہونے کی وجہ سے سکر کا قوی اندیشہ تھا۔ دوم یہ برتن عموماً شراب کے لئے استعمال ہوتے تھے تو ان کے نجس ہونے کے ساتھ ان کے استعمال سے شرابیوں سے مشابہت آتی یا شراب یاد آجاتی۔ علاوہ ازیں شریعت مطہرہ کا یہ بھی اصول ہے کہ جب کسی چیز پر سخت پابندی لگاتی ہے تو اس کے مقدمات پر بھی پہرہ بٹھا دیتی ہے جیسے فرمایا: "ولا تقربوا الزنا" الآیہ[۳]۔ تاہم ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ جس چیز کو لعینہ حرام وممنوع قرار دے دیا جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے حرام وناجائز ہوتی ہے جبکہ کسی چیز کو علت کی وجہ سے حرام دینے کی صورت میں اس علت کی نفی سے عند الحاجۃ حرمت مرتفع ہو جاتی ہے۔

"واذا نھی عن الشیٔ بعینہ لم تؤثر فیہ الحاجۃ واذا کان لمعنی فی غیرہ اثرت فیہ الحاجۃ لارتفاع الشبھۃ معھا"۔ (عارضۃ الاحوذی)

---

[۲] حوالہ بالا۔ [۳] سورۃ الاسراء آیت: ۳۲۔

علیٰ ہذا جب صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں شراب کی نفرت شدت اختیار کرگئی تو ان برتنوں کے استعمال میں تشدید کی ضرورت ختم ہوگئی اور عندالحاجۃ صحابہ کرامؓ کی درخواست پر حرمت ختم کردی گئی۔

باب ماجاء فی الرخصة أن ینتبذ فی الظروف

"عن سلیمان بن بُریدة عن ابیه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انی کنتُ نهیتکم عن الظروف وان ظرفالایُحِل شیأً ولایحرمه وکل مسکرحرام"۔

حضرت بُریدہ بن الحصیبؓ فرماتے ہیں: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے تمہیں (چار) برتنوں (میں نبیذ بنانے کے لئے ان) کے استعمال سے روکا تھا تاہم کوئی برتن کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں کرتا اور ہر نشہ آور (چیز) حرام ہے۔

دوسری حدیث:۔ اس باب میں دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا تو (کچھ عرصہ بعد) انصار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس دوسرے برتن نہیں ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تو ان کے استعمال میں حرج نہیں۔

تشریح:۔ یہ حدیث نسخ پر صریح ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی جمہور کا مذہب ہے۔ عارضہ میں ہے کہ امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ نے نسخ کی علت دفع حرج اور تخفیف کو بتایا ہے۔

چونکہ ممانعت کی علت گویا ان وجوہات میں سے ایک تھی جن کا ذکر سابقہ بابوں میں کیا گیا مثلاً سد ذرائع وغیرہ مگر دوسری جانب ضرورت جب ان سے مزاحم بن گئی اور حرمت کی علت اتنی طاقتور بھی نہ تھی، اس لئے حاجت کی علتِ اباحت کو ترجیح دے کر ان کے استعمال کو جائز فرمایا، اور اگر ہم یہ کہیں کہ حرمت موقت تھی یا جب صحابہ کرامؓ نے درخواست فرمائی تو من جانب اللہ اسی وقت وحی جواز کی نازل ہوئی تو پھر کسی توجیہ کی ضرورت نہیں۔

تاہم یہ بات خوب ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ آج کل ہوس پرستی کا دور ہے لوگ معمولی ضرورت کی بناء پر حرام اشیاء کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اصحابِ ترجیح صاحب ہدایہ اور قاضی خان جیسے لوگ

ہوتے ہیں یہ کام ہر کس و ناکس کا نہیں ہے، کہ جو ضرورت سمجھ میں آجائے تو اسے مبیح قرار دیدے کلّا و حاشا۔ اگر کسی کی جوان لڑکی کالج میں پڑھتی ہے تو اسے اس لئے یاری کی اجازت دینا تا کہ وہ اپنی تعلیم تسلی سے مکمل کرے ایک خیالی ضرورت ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس

باب ماجاء فی الانتباذ فی السقاء

"عن عائشة قالت كنا ننبذ لرسول الله صلى الله عليه وسلم فى سقاءٍ يوكأ اعلاه له عزلاء، ننبذه غدوة ويشربه عشاء وننبذه عشاء ويشربه غُدوة"۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نبیذ بناتے تھے ایسے مشکیزہ ...ں جس کے اوپر کا منہ باندھا جاتا تھا اور اس کے نیچے میں ایک چھوٹا سوراخ ہوتا تھا ہم صبح کھجوریں ڈالتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے شام کو پیتے اور شام کو بناتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو نوش فرماتے۔

لغات:۔ قولہ "ننبذُ" بکسرۂ باء باب ضرب سے بھی آتا ہے اور باب افعال و تفعیل سے بھی آتا ہے علیٰ ہذا پھر نون اول مضموم ہوگا۔

قولہ "سقاء" بکسرۂ سین والف ممدودہ پانی کے مشک اور دودھ کے مشکیزے کو کہتے ہیں۔

قولہ "یوکأ" بصیغہ مجہول مہموز اللام ہے "ای یوکأ بالوِکاء" یعنی جس چیز کا منہ ڈوری سے باندھا جاتا ہے۔ تاہم امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ مہموز نہیں ہے بلکہ صحیح "یوکی" یاء کے ساتھ ہے۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے چاہے مہموز ہو یا معتل۔

قولہ "عزلاء" بفتح العین وسکون الزاء وبالمدود چھوٹا سا سوراخ جو مشکیزے کے نیچے حصہ اور جانب میں ہوتا ہے اور اسی سے پانی پیا جاتا ہے گویا اس سے ٹونٹی کا کام لیا جاتا ہے جیسے کولر میں اوپر سے پانی ڈال کر بند کر دیا جاتا ہے اور نیچے ٹونٹی سے پانی نکالا جاتا ہے۔

قولہ "غدوة" بضم الغین عموماً دن کے پہلے حصے کو اور "عشاء" بکسر العین مابعد الزوال کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس روایت سے مشکیزے میں نبیذ بنانے کا جواز معلوم ہوا۔ ترمذی کی روایت اگر چہ درجہ حسن میں ہے کیونکہ حضرت حسن بصریؒ کی والدہ "خیرہ" ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مولاۃ مقبولہ

ہیں تاہم یہ حدیث مسلم[۱] وابوداؤد[۲] وغیرہما میں بھی ہے۔

البتہ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ مسلم وغیرہ کی حدیث میں تین دنوں کا ذکر ہے جبکہ باب کی حدیث میں ایک دن کا چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

"کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ینبذله الزبیب فی السقاء فیشربه یومه والغدو بعد الغدفاذا کان مساء الثالثة شربه وسقاه فان فضل شئی اهراقه"۔

اور یہ تو بظاہر تعارض ہے۔

اس تعارض کے حل کے لئے ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ اختلاف موسموں کے تفاوت پر مبنی ہے چونکہ گرمیوں میں تغیر جلدی آتا ہے اس لئے حضرت عائشہؓ کی حدیث موسم گرما پر محمول ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سردی کے موسم سے متعلق ہے۔ یا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں مقدار قلیل کا ذکر ہے یعنی تھوڑی سی مقدار میں نبیذ تیار کی جاتی تھی جو ایک وقت میں ختم ہو جاتی اگر زیادہ ہوتی تو تین دن تک بھی استعمال فرماتے جیسا کہ ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مشکوں کا فرق ہو حضرت عائشہؓ کے گھر میں جو مشک تھی وہ چھوٹی یا پرانی ہوگی اور حضرت میمونہؓ کے گھر میں جو مشک تھی وہ بڑی یا نئی ہوگی، چھوٹی میں قلیل نبیذ ہی بن سکتی ہے اور پرانی میں مسامات کی بندش کی وجہ سے سکر جلد آنے کا اندیشہ ہوتا ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت میمونہؓ کے گھر کا حال بیان کیا ہے جہاں مشک میں یہ دونوں علتیں نہ تھیں، پھر یہ اختلاف اسی طرح ہو جائے گا جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے طریقے میں حضرت عائشہؓ اور حضرت میمونہؓ کی حدیثوں میں اختلاف ہے جسکی ایک توجیہ امام مالکؒ کے قول کے ضمن میں یہی کی گئی ہے کہ یہ دو الگ الگ غسل خانوں پر مبنی ہے۔ کما مر فی بابه فلانعیده

باب ماجاء فی الانتباذ فی السقاء

[۱] صحیح مسلم ص: ۱۶۸ ج: ۲ کتاب الاشربة۔ [۲] سنن ابی داؤد ص: ۱۶۶ ج: ۲ "باب فی صفة النبیذ" کتاب الاشربة، سنن نسائی ص: ۳۲۸ ج: ۲ کتاب الاشربة۔ الحنفی عفی عنه

باب ماجاء فی الحبوب التی یُتّخَذُمنها الخمر

"عن النعمان بن بشیرقال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم:ان من الحنطة خمراًومن الشعیرخمراًومن التمرخمراًومن الزبیب خمراًومن العسل خمراً"۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گندم کی بھی شراب ہوتی ہے، جو کی بھی شراب بنتی ہے چھواروں کی بھی خمر ہوتی ہے اور کشمش سے بھی بنتی ہے اور شہد کی بھی شراب ہوتی ہے۔

لغات: ۔قوله فی ترجمة الباب "الحبوب" حَبٌّ کی جمع ہےاور حَبَّةٌ کی جمع ''حبات'' آتی ہے دانے کو کہتے ہیں تاہم مطلق غلوں اور پھلوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔

قوله "الحنطة" بکسر الحاء گیہوں اور گندم کو کہتے ہیں۔قوله "الشعیر" جو۔قوله "التمر" خشک کھجور اور چھوارے کو کہتے ہیں۔قوله "الزبیب" کشمش۔

تشریح: ۔ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ان اشیاء کی بنی ہوئی شراب کو خمر بطور مجاز کہا ہے۔ابن سیدہؒ نے بھی محکم میں جزم کیا ہے اس پر کہ اصل خمر تو انگور کی ہوتی ہے باقی مسکرات کو مجازاً خمر کہا جاتا ہے (کذافی تحفۃ الاحوذی)۔حدیث سے متعلقہ بحث تفصیل سے ''باب ماجاء فی شارب الخمر'' میں گذری ہے۔فلیراجع۔

باب کے اخیر میں حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے'' الخمر من هاتین الشجرتین النخلة والعنبة ''ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں فرماتے ہیں کہ یہ حکم اہل مدینہ کے لئے تھا کیونکہ ان کی شراب انہی دونوں یعنی کھجور اور انگور سے بنتی تھی۔

ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ جو لوگ انگور کے علاوہ اشربہ پر خمر کا اطلاق حقیقی مانتے ہیں ہوسکتا ہے کہ ان کی مراد حقیقۃ شرعی ہو اور جو لوگ اس کی نفی کرتے ہیں وہ لغوی اعتبار سے نفی کرتے ہیں۔(کذافی التحفۃ عن فتح الباری) اس میں حنفیہ کے موقف کو تسلیم کیا گیا ہے۔

باب ماجاء فی خلیط البُسر و التمر

"عن جابر بن عبداللّٰہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نہی ان یُنتبذ البُسر و الرُّطب جمیعاً"۔ [1]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچی پکی کھجوروں کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے۔

دوسری حدیث:۔اس باب کی دوسری حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں انگور اور چھواروں کے ملانے اور مٹکوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کا اضافہ ہے۔

لغات:۔قولہ فی ترجمۃ الباب "خلیط" مختلف النوع چیزوں کے مجموعے کو خلیط کہا جاتا ہے گویا کہ فعیل بمعنی مفعول ہے خَلَطَ الشیٔ بالشیٔ کے معنی ملانے اور خلط ملط کرنے کے ہیں۔قولہ "البُسر" نیم پختہ کھجور، گدّر کھجور۔ویسے ہر تازہ شے کو بھی کہتے ہیں مگر یہاں کچی و نیم پختہ کھجور مراد ہے۔قولہ "الرطب" بضم الراء وفتح الطاء پکی ہوئی تازہ کھجور۔

تشریح:۔اس باب کی حدیث سے مرکب نبیذ بنانے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے مگر اس ممانعت کا درجہ کیا ہے تو اس میں متعدد اقوال ہیں۔امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ اور عام شافعیہ اس کو حرام قرار دیتے ہیں، اگر چہ اس میں سُکر نہ آیا ہو۔جبکہ مالکیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں ایک تحریم کا دوسرا کراہت کا۔یہ اختلاف ابن العربیؒ نے عارضہ میں نقل کیا ہے۔جبکہ امام نوویؒ شرح مسلم جلد دوم صفحہ ۱۶۴ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

> "ومذہبنا و مذہب الجمہور ان ہذا النہی لکراہۃ التنزیہ ولا یحرم ذالک مالم یصر مسکراً وبہذا قال جماہیر العلماء وقال بعض المالکیہ ہو حرام وقال ابو حنیفۃؒ وابو یوسفؒ فی روایۃ عنہ لا کراہیۃ فیہ ولا بأس بہ" الخ۔ [2]

جبکہ ترمذی کے حاشیہ پر اختلاف اس طرح نقل کیا ہے:

باب ماجاء فی خلیط البسر و التمر

[1] الحدیث اخرجہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ ص:۵۰۴ ج:۵ کتاب الاشربۃ والطبرانی فی الکبیر مجمع الزوائد ص:۵۶ ج:۵۔ [2] النووی علی مسلم "باب کراہیۃ انتباذ التمر والزبیب مخلوطین" کتاب الاشربۃ۔

"قال مالکؒ واحمدؒ یحرم شرب نبیذخلط فیه شیأن وان لم یسکر عملاً بظاهر الحدیث وهو احدقولی الشافعی وقال ابو حنیفة لم یحرم ان لم یکن مسکراً وهو القول الثانی للشافعی۔

گویا کہ ائمہ کے اقوال اس بارے میں کافی سارے ہیں۔ بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ خلیط میں نشہ داخل ہونے کے بعد اس کی حرمت پر اتفاق ہے لیکن سکر سے پہلے حنفیہ کے نزدیک یہ بلا کراہت جائز ہے۔ جبکہ جمہور کے نزدیک یہ بھی منع ہے۔ ایک ایک قول کے مطابق حرام ہے اور ایک ایک قول میں مکروہ ہے وہ اس حدیث کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے اسے اطلاق پر رکھتے ہیں۔ مگر بعض حضرات اتنے سے فرق کے قائل ہیں کہ نہی کی علت سکر ہے لہٰذا قبل السکر کراہت تنزیہی ہوگی اور بعد از سکر تحریم ہوگی۔ جبکہ بعض حضرات یہ فرق بھی نہیں مانتے جیسے امام احمدؒ۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ چونکہ بعض روایات سے خلیط کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ ابوداؤد [۳] وکتاب الآثار [۴] میں ہے لہٰذا باب کی حدیث کا جواب صاحب ہدایہ نے یہ دیا ہے، کہ یہ شروع زمانہ ہجرت پر محمول ہے کیونکہ اس میں غربت زیادہ تھی اور کھانے کی اشیاء کی کمی تھی، تو خلیط پر پابندی کا مقصد یہ تھا کہ لوگ کفایت شعاری کو اپنائے اور دوسروں کے ساتھ مواسات اور ہمدردی رکھیں۔ پھر یہ نہی صرف منصوص علیہ اشیاء تک محدود ہے یا باقی اشیاء بھی ان پر قیاس کی جاسکتی ہیں؟ تو اس بارے میں دونوں اقوال ہیں۔ جبکہ ضابطہ یہ ہے "کل مسکر حرام" [۵] کمامرّ۔

باب ماجاء فی کراهیة الشرب فی آنیة الذهب والفضة

"عن الحکم قال سمعتُ ابن ابی لیلیٰ یحدث ان حُذیفة استسقی فاتاه انسان باناء من فضة فرماه به وقال انی کنت قدنهیته فابی ان ینتهی ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم نهی عن الشرب فی آنیة الذهب والفضة ولُبس الحریروالدیباج وقال: هی لهم فی الدنیاولکم فی الآخرة"۔

---

[۳] سنن ابی داؤد ص: ۱۶۵ ج: ۲ "باب فی الخلیطین" کتاب الاشربة.

[۴] کتاب الآثار ص: ۱۹۰ مکتبه امدادیه ملتان، ایضاً حاشیه: ۳ المؤطا لمحمد ص: ۳۱۶ کتاب الحدود.

[۵] قد مر تخریجه "باب ماجاء فی شارب الخمر".

حضرت حکم سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں نے (عبدالرحمن) ابن ابی لیلیٰ کو بیان کرتے سنا ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے پانی طلب کیا تو ایک آدمی نے چاندی کے برتن میں پانی پیش کیا حضرت حذیفہؓ نے اس پیالے کو پھینک دیا اور فرمایا: میں نے اسے منع کیا مگر یہ نہ مانا بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور چاندی کے برتنوں میں پینے سے منع فرمایا ہے اور ریشم و دیباج کے پہننے سے (بھی) منع فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اشیاء کفار کے لئے ہیں دنیا میں اور آپ کے لئے ہیں آخرت میں۔

لغات:۔ قولہ "استسقی" سَقیاً بفتح السین پانی کو اور بضم السین بارش کو کہتے ہیں باب ضرب سے آتا ہے سین تا طلب کے لئے ہیں یعنی پانی طلب کیا۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ از روئے لغت استسقاء پانی مانگنے کو کہتے ہیں، اور از روئے شرع بارش مانگنے کو یہاں معنی لغوی مراد ہے۔ قولہ "الحریر" ریشم اور ریشمی کپڑے دونوں کو کہتے ہیں یہاں مراد ثانی ہے کیونکہ ممانعت پہننے کی ہے بیچنے یا خریدنے کی نہیں۔ قولہ "الدیباج" وہ کپڑا جو اعلیٰ قسم کے ریشم یعنی ابریسم سے بنا ہوا ہو لہٰذا یہ ذکر خاص بعد العام ہے۔

تشریح:۔ بخاری شریف [۱] کی ایک روایت میں ہے کہ پانی لانے والا شخص دہقان تھا جو ایک پیالے میں پانی لایا تھا۔ حافظؒ فرماتے ہیں کہ دہقان فارسی میں بستی کے بڑے شخص کو کہتے ہیں۔ جبکہ بخاری [۲] ہی کی ایک دوسری روایت میں مجوسی کی تصریح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص ذمی تھا۔ حافظؒ فرماتے ہیں کہ اس کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ [۳]

پھر ترمذی کی روایت سے اس برتن کا فقط پھینکنا ثابت ہے مگر حافظؒ نے اسماعیلی کی روایت نقل کی ہے جس سے ٹوٹنا ثابت ہوتا ہے، گویا کہ مقصود پھینکنے سے توڑنا نہ تھا بلکہ صرف تنبیہ اور تادیب ملحوظ تھی۔

سونے چاندی کا استعمال:۔ اس پر اتفاق ہے کہ عورتیں سونے چاندی کے زیورات بنوا سکتی ہیں اور استعمال بھی کرسکتی ہیں، کیونکہ زیورات میں زینت ہے جو عورتوں کے لئے اپنے محل و موقعہ پر مطلوب و محمود ہے، لیکن باقی استعمال سونے اور چاندی کا جائز نہیں، خواہ کھانے پینے کے لئے ہو یا دوسرے کاموں کے لئے ہو

باب ماجاء فی کراهیة الشرب فی آنیة الذهب و الفضة

[۱] صحیح بخاری ص: ۸۴۱ "باب الشرب فی آنیة الذهب" کتاب الاشربة، ایضاً مصنفه ابن ابی شیبه ص:۵۱۷ ج:۵ کتاب الاشربة وفیه: فاراد ان یضرب به وجهه الخ. [۲] صحیح بخاری ص:۸۱۶ ج:۲ "باب الاکل فی اناء مفضض" کتاب الاطعمة. [۳] کذا فی فتح الباری ص:۱۱۷ ج:۱۰ قدیمی کتب خانه.

جیسے سرمہ دانی، سلائی وغیرہ استعمال کرنا اس میں مرد، عورتیں اور بچے سب برابر ہیں۔ تاہم چاندی کی انگوٹھی اس حکم سے مستثنٰی ہے کہ مرد بھی ساڑھے چار ماشے کم استعمال کرسکتا ہے۔ قاضی شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں اس پر زور لگا کر کہا ہے کہ یہ ممانعت صرف کھانے پینے کی اشیاء کے استعمال تک محدود ہے باقی استعمال کی چیزیں ان دونوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں، ان سے پہلے داؤد ظاہری نے بھی ایسا ہی فرمایا تھا، جبکہ بعض شافعیہ عراقیین نے کہا ہے کہ امام شافعیؒ کا قول قدیم عدم تحریم کا ہے گو کہ کراہیت کے وہ بھی قائل ہیں تاہم شافعیہ کا مفتیٰ بہ قول وہی ہے جو باقی ائمہ اور جمہور کا ہے یعنی مطلقاً تحریم خواہ کسی بھی استعمال کے لئے ہو۔

چنانچہ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

"واجمع المسلمون علی تحریم الأکل والشرب فی اناء الذهب واناء الفضة علی الرجل وعلی المرأة لم یخالف فی ذالك احدمن العلماء إلا ماحکاه اصحابنا العراقیون ان للشافعی قولاً قدیماً انه یکره ولایحرم وحکوا عن داؤد الظاهری تحریم الشرب وجواز الأکل وسائر وجوه الاستعمال وهذان النقلان باطلان ... الی ان قال .... وانما فرق بین الرجل والمرأة فی التحلی لما یقصد منها من التزین للزوج والسید ... قال: هذا مذهبنا وبه قال مالكؒ وابو حنیفةؒ والعلماء کافة"۔ (نووی شرح مسلم ص: ۱۸۷، ۱۸۸ ج: ۲)

جمہور کی دلیل کے طور پر ان تمام روایات کو پیش کیا جاسکتا ہے جن میں سونے چاندی کے استعمال پر وعیدیں آئی ہیں۔ [۴] حدیث باب کے علاوہ اس قسم کی احادیث کافی زیادہ ہیں۔ علاوہ ازیں صاحب ہدایہ نے کتاب الکراہیۃ میں ممانعت کی ایک اور وجہ بھی بیان فرمائی ہے، کہ اس سے مشرکین کے طور وطریقہ اور وضع وقطع میں مشابہت لازم آتی ہے اور اس کے استعمال سے دنیادارانہ ومتکبرانہ تأثر ابھرتا ہے جو ممنوع ومذموم ہے، چنانچہ معروف حدیث ہے "من تشبه بقوم فهو منهم"۔ [۵] ابن تیمیہؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب

---

[۴] راجع للتفصیل مجمع الزوائد ص: ۸۵ ج: ۵ کتاب الاشربة، ایضاً مصنفه ابن ابی شیبة ص: ۵۱۷ و ۵۱۸ ج: ۵ کتاب الاشربة. [۵] الحدیث اخرجه عبد الرزاق فی مصنفه ص: ۳۷۱ ج: ۱۰ حدیث: ۲۱۱۵۲، ایضاً معجم اوسط للطبرانی حدیث: ۸۳۲۵ مجمع الزوائد ص: ۲۶۲ ج: ۱۰، ایضاً سنن ابی داؤد ص: ۲۰۳ ج: ۲ کتاب اللباس، ایضاً جمع الفوائد ص: ۶۰۲ ج: ۱ کتاب اللباس.

بنام "اقتضاء الصراط المستقیم مخالفة اصحاب الجحیم" لکھی ہے اس میں جہاں کفار کی مشابہت کی ممانعت پر احادیثِ مبارکہ نقل کی ہیں، وہیں اعاجم کی مشابہت کی ممانعت پر بھی روایات نقل کی ہیں "وقد روی عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنهما عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم انه نهی عن التشبه بالاعاجم"[۱]

پھر اس پر تفریع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ سے سندھی نعال کے استعمال کی بابت پوچھا گیا کہ آدمی پہن کر گھر سے باہر جاسکتا ہے؟ تو انہوں نے مرد اور عورت دونوں کے لئے ناپسند کیا البتہ بیت الخلاء کے لئے اور ان میں وضوء کرنے کی اجازت دی۔

"قال محمد بن حرب سُئِل احمد عن نعل سندیّ یخرج فیه؟ فکرهه للرجل والمرأة وقال ان کان لِلکنیف والوضوء فلا بأس وقال اکره الصرار وقال هو من زِیّ الاعاجم"۔ (ص:۸۴)

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی اپنی ہی ثقافت اور شناخت ہونی چاہیے، وہ غیر مسلموں کی کسی بھی تہذیب وثقافت کے مجاز نہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں سندھ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور ان کی ثقافت غالب تھی اس لئے سندھی نعال کو مکروہ قرار دیا ورنہ آج بحمد اللہ سندھ کی اکثریت مسلمان ہے۔

مطلق تشبہ مذموم نہیں:۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح کفار کی مشابہت مکروہ یا حرام ہے تو اسی طرح اعاجم کی بھی ممنوع ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے مگر یہ تشبہ علی الاطلاق مکروہ نہیں بلکہ جو امر مذموم میں ہو اور تشبہ کی نیت ہو۔ بلا قصد اگر کسی ضرورت کی چیز میں مشابہت آجائے تو اس میں کراہیت نہ ہوگی۔ چنانچہ درمختار میں ہے:

"فان التشبه بهم لا یکره فی کل شئی بل فی المذموم وفیما یقصد به التشبه کمافی البحر"۔

اس پر علامہ شامیؒ ردالمحتار میں لکھتے ہیں:

"فانا نأکل ونشرب کمایفعلون بحر.... قال هشام رأیت علی ابی یوسفؒ نعلین مخصوضین بمسامیر فقلتُ: أتری بهذا الحدید بأساً؟ قال: "لا" قلت: سفیانؒ وثور

---

[۱] اسی طرح طبرانی کبیر میں ہے ان النبی ﷺ قال لاتقطعوا الخبز بالسکین کماتقطعه الاعاجم الخ مجمع الزوائد ص:۳۰ ج:۵.

بن یزید کرھا ذالك لان فیه تشبھا بالرھبان فقال کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یلبس النعال التی لھا شعروانھا من لباس الرھبان" فقد اشار الی ان صورة المشابھة فیما تعلق به صلاح العباد لا یضر" الخ۔ (شامی ص:۶۲۴ ج:۱)

"لہٰذا آج کل گاڑیوں اور جدید آلات کا استعمال جائز ہوا۔ تاہم حضرت گنگوہی صاحبؒ امر حسن میں بھی مشابہت کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ (انظر تشریحات ص:۳۱۴ ج:۳)

قولہ "ولبس الحریر والدیباج" حدیث کے اس ٹکڑے سے ریشم کے استعمال کی بھی ممانعت معلوم ہوئی۔ تاہم اس میں بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں: مثلاً عورتیں اس کو استعمال کر سکتی ہیں، جنگ میں اگر مجاہد کو ضرورت ہو۔ تاہم آج کل اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ پہلے اس پر سے تلوار پھسلتی تھی جو آج استعمال نہیں ہوتی۔ اس سے دشمن پر رعب طاری ہوتا تھا مگر آج کل دشمن دور سے حملہ کرتا ہے۔ اگر کسی ریشمی کپڑے کا تانا ریشم کا نہ ہو بانا اگرچہ ریشم کا ہو تو اس کا استعمال درجہ حرمت سے کم ہے۔ اسی طرح تین چار انگلیوں کی مقدار میں کوئی ڈیزائن وغیرہ بنا ہوا ہو تو بھی جائز ہے۔ اسی طرح ریشمی کپڑے پر ٹیک لگانے کی بھی گنجائش ہے، کسی کو خارش کی بیماری ہو تو وہ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ متن ہدایہ میں ہے:

"لا یحل للرجال لبس الحریر ویحل للنساء.....الا ان القلیل عفو وھو مقدار ثلثة اصابع أو اربع کالاعلام والمکفوف بالحریر.....قال ...(ای القدوری) ... ولا بأس بتوسده والنوم علیه عند ابی حنیفة وقالا یکره.....قال.....ولا بأس بلبس الحریر والدیباج فی الحرب عندھما.....ویکره عند ابی حنیفةؒ...قال ولا بأس بلبس ما سداه حریر ولحمته غیر حریر کالقطن والخز فی الحرب وغیره" الخ۔ (کتاب الکراھیة ج:۴)

واضح رہے کہ فقہاء جہاں بھی "لا بأس" کا لفظ استعمال کریں تو اس میں خلاف اولیٰ کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

قولہ "وقال ھی لھم فی الدنیا ولکم فی الآخرة" یعنی کفار چونکہ اپنے آپ کو شریعت کے احکام کا پابند نہیں سمجھتے اس لئے سونا چاندی اور ریشم مردوں کے اوپر حرام ہونے کے باوجود یہ لوگ انہیں استعمال کرتے ہیں، چونکہ آپ پر یہ منع ہیں لہٰذا کفار آخرت میں ان سے محروم ہوں گے اور آپ کو یہ سب چیزیں ملیں گی۔

پھر ظاہر یہ ہے کہ ریشم کی ممانعت تنعم سے اجتناب کی تلقین ہے لہٰذا ریشم کے علاوہ ایسی چیزوں سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے جو اہل تنعم کے رغائب ومشاغل میں بطور خاص شامل ہوں۔

باب ماجاء فی النھی عن الشرب قائماً

عن انس ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم نھی ان یشرب الرجل قائماً، فقیل: "الاکل" قال: ذاك اشد (حسن صحیح)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کو کھڑے کھڑے پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ (ان سے) کھانے کے بارے میں پوچھا گیا (کہ کھڑے ہوکر کھانا کیسا ہے؟) فرمایا کہ وہ تو اور بھی بُرا ہے۔

دوسری حدیث:۔ اس باب میں دوسری حدیث حضرت جارود بن العلاء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہ بھی نہی پر صریح ہے۔ تاہم باب کی تیسری حدیث ترجمۃ الباب سے مطابق نہیں اس کو امام ترمذیؒ نے صرف اس مقصد کے لئے ذکر کیا ہے، کہ قتادہ کبھی ابومسلم سے بلا واسطہ بھی روایت کرتے ہیں۔ جیسا کہ جارود کی پہلی حدیث نہی عن الشرب قائماً میں ہے اور کبھی بواسطہ یزید بن عبداللہ عن ابی مسلم بھی روایت کرتے ہیں جیسا کہ جارود کی دوسری حدیث ''ضالة المسلم حرق النار'' میں ہے۔ لہٰذا بلا واسطہ حدیث کو منقطع نہ سمجھا جائے۔

قولہ "ضالة" گمشدہ اونٹ یا گائے ایسے جانور مراد ہیں جن کو گمشدگی کے باوجود کوئی خطرہ نہ ہو لہٰذا اس کو لینا ''حرق النار'' قرار دیا حرق بفتح الحاء والراء جبکہ راء کا سکون بھی جائز ہے، ای سبب حرق النار یعنی اگر کسی نے بنیت تملک لے لیا تو یہ اس کے عذاب کا سبب بنے گا۔ کیونکہ اگر اس کو چھوڑ دیا جاتا تو مالک کو مل جاتا کہ زمانہ دیانت کا تھا۔ یعنی ایسی چیز جس کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو تو اسے بنیت تملک نہیں اٹھانا چاہیئے۔ گمشدہ چیزوں سے متعلق بحث ابواب الاحکام ''باب ماجاء فی اللقطة وضالة الابل والغنم'' میں گذری ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائماً

"عن ابن عمر قال كنا ناكل على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن نمشي ونشرب ونحن قيام"۔(حسن صحيح غريب)[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چلتے پھرتے کھایا کرتے تھے اور کھڑے کھڑے پیا کرتے تھے۔

دوسری حدیث:۔اس باب میں دوسری حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوئے زمزم کا پانی پیا ہے۔

تیسری حدیث:۔اور باب کی تیسری حدیث میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے دونوں حالتوں میں پیتے دیکھا ہے۔

تشریح:۔چونکہ کھڑے ہوئے شخص کے لئے پانی پینے کے بارے میں دونوں طرح کی روایات ثابت ہیں، ایک قسم نہی کی اور دوسری قسم جواز کی۔اس لئے امام ترمذیؒ نے بالترتیب دو الگ الگ باب قائم کر لئے پہلا نہی کے لئے اور دوسرا جواز کے لئے۔

یہ مسئلہ اگرچہ(تشریحات ترمذی ص۱۹۶ جلد اول ''باب فی وضوء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کیف کان'') میں گذرا ہے مگر وہاں ضمناً ذکر ہوا تھا اس لئے یہاں دوبارہ معاد کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ اس بارے میں روایات دونوں جانب ثابت ہیں، نہی کے بارے میں ترمذی نے پہلے باب میں حدیث ذکر کی ہے۔امام مسلمؒ[2] نے بھی (مسلم شریف جلد ثانی ص۱۷۳ پر) اس کے لئے متعدد احادیث ذکر فرمائی ہیں ''وفيه... لايشربنّ احد منكم قائماً فمن نسى فليستقىء''۔

باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائماً

[1] الحديث اخرجه ابن ماجه واحمد، بحواله سنن دارمی ص:۱۶۲ ج:۲ حديث:۲۱۲۵ كتاب الاشربة، ایضاً شرب قائماً کی روایات کیلئے دیکھئے مجمع الزوائد ص:۹۰ ج:۵ كتاب الاشربة.

[2] صحيح مسلم ص:۱۷۳ ج:۲ "باب الشرب قائماً" كتاب الاشربة.

جبکہ اثبات کی روایات بھی صحیح ہیں جیسا کہ اسی باب میں ہیں۔ مسلم [۳] میں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آبِ زمزم کھڑے ہو کر پینا مروی ہے۔ بخاری [۴] ''باب الشرب قائماً'' میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر پانی پیا پھر فرمایا کہ بعض لوگ اسے مکروہ سمجھتے ہیں، حالانکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے جیسا میں نے کیا۔ (بخاری شریف ص ۸۴۰ ج ۲)

اس بناء پر علماء نے مختلف موقف اختیار فرمائے ہیں، جن میں قابلِ ذکر پانچ اقوال ہیں۔

(۱)...صاحب منیۃ المصلی نے فرمایا کہ زمزم اور وضوء کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے باقی مکروہ ہے ''ویکرہ الشرب قائماً الاھذا (ای فضل الوضوء) وشرب ماء زمزم''۔

(۲)....بعض اہل ظاہر کہتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کی روایات نہی کی احادیث سے منسوخ ہیں اور زمزم کا پانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عذر کی بناء پر کھڑے ہو کر پیا تھا۔

(۳)...بذل میں ہے امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ نہی کی روایات منسوخ ہیں۔

(۴)...امام نوویؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نہی کی روایات کراہیتِ تنزیہی پر محمول ہیں، یہی امام خطابیؒ، ابن بطالؒ وغیرہ جمہور کا قول معلوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ''وھذا أحسن المسالک واسلمھا وابعدھا من الاعتراض''۔ ابن العربیؒ نے بھی عارضہ میں بحث کے اخیر میں لکھا ہے: ''فاشربْ قاعداً تأدباً واعلم جوازہ قائماً''۔

ہمارے شیخ محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر بیٹھنے کی مناسب جگہ نہ ہو تو کھڑے ہو کر پینا چاہئے جیسے راستوں کا پانی اور گنے کا شربت وغیرہ۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا شائستگی کے خلاف ہے، جبکہ بیٹھ کر پینا عمدہ ہیئت ہے ''فان الشرب قاعداً من الھیئات الفاضلۃ واقرب لحموع النفس والرّیّ'' الخ۔

(۵)....ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہی کی روایات طبی نقطۂ نظر پر محمول ہیں کہ کھڑے کھڑے پانی

---

[۳] صحیح مسلم ص: ۱۷۳ و ۱۷۴ ج: ۲ کتاب الاشربۃ، ایضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۱۳ ج: ۵ کتاب الاشربۃ.

[۴] صحیح بخاری ص: ۸۴۰ ج: ۲ ''باب الشرب قائماً'' کتاب الاشربۃ، ایضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۱۴ ج: ۵ کتاب الاشربۃ، مجمع الزوائد ص: ۸۹ ج: ۵ حدیث: ۸۲۴۴.

پینے سے معدہ متاثر ہوسکتا ہے کیونکہ اس طرح پانی معدے کی تہہ تک جا پہنچتا ہے۔ واللہ اعلم

پھر آخری حدیث میں ''یشرب قائماً وقاعداً'' کا یہ مطلب نہیں کہ قائماً وقاعداً دونوں یکساں معمول تھے بلکہ یہاں نفسِ فعل کا اثبات مقصود ہے ورنہ عام معمول بیٹھ کر ہی پینے کا تھا، لہٰذا اگر ایک دو دفعہ کھڑے ہوکر پانی پینا ثابت ہوجائے تو اس کو سنت نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ عام ضابطہ ہے کہ خلاف عادت کام صرف بیان جواز یا کسی عذر پر محمول ہوتا ہے جیسے راکباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طواف ثابت ہے مع ھذا اسے سنت نہیں کہہ سکتے اس طرح کی اور بھی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

حضرت تھانوی صاحبؒ المسک الذکی میں فرماتے ہیں کہ ہمیشہ بیٹھ کر کھانے پینے میں تکبر پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے کہ بے حد وقار کبھی تکبر کا باعث ہوجاتا ہے، اور پادری لوگ کھڑے ہوکر کھانے کو بڑا معیوب سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بُری بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ بیٹھ کر کھائے پیئے۔ اور اگر کبھی اظہارِ تواضع کے لئے یا ویسے ہی کھڑے ہوکر بھی کھا پی لے تو جائز ہے بلکہ اظہارِ تواضع کے لئے کبھی ایسا کرنا یہ بھی مستحب ہے۔ انتہیٰ

المسترشد عرض کرتا ہے: کہ کبھی آدمی میں آداب پر مسلسل عمل کرنے سے ایک گونہ عجب پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے اس لئے کبھی کبھار اس کے خلاف کرنے سے اپنی تقصیر کا بوجھ سر پر آپڑتا ہے جو ایک مطلوبہ چیز ہے پس کہا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا بیانِ تعلیم کے لئے کیا۔ (تدبر)

رہا کھڑے ہوکر کھانے کا مسئلہ تو اس میں دو اعتبار ہیں ایک یہ ہے کہ کوئی سوکھی اور خشک قسم کی اشیاء یا کھجور جیسی چیزیں ہوں۔ دوم یہ کہ اس چیز کا کھڑے کھڑے اور چلتے پھرتے کھانا خلافِ مروت اور معیوب نہ سمجھا جاتا ہو اور نہ ہی وہ لا پرواہی کی وجہ سے ہو تو ایسی چیز اگر چلتے پھرتے کھالی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں گو کہ اس کا معمول بنانا اچھا نہیں جبکہ اس کے برعکس اشیاء چلتے پھرتے یا بازاروں میں کھانے سے عدالت مجروح ہوجاتی ہے۔

پہلے باب کی حدیث میں کھانے کو حالتِ قیام میں پینے کی بنسبت جواشد یعنی زیادہ بُرا قرار دیا ہے یہ اس لئے کہ کھانے کا ادب واحترام پانی سے زیادہ ہونا چاہئے۔

باب ماجاء فی التنفس فی الاناء

"عن انس بن مالك ان النبی صلی الله علیه وسلم كان یتنفس فی الاناء ثلاثاً ویقول هو اَمرَءُ واَروٰی"۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم برتن سے پانی پینے کے دوران تین مرتبہ سانس لیتے اور فرماتے کہ اس طرح پینا زیادہ خوشگوار اور پیاس زیادہ بجھانے والا ہوتا ہے۔

"عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم: لاتشربوا واحداً كشرب البعیرولكن اشربوامثنیٰ وثُلٰث وسمّوا اذاانتم شربتم واحمدوا اذاانتم رفعتم"۔

یعنی اونٹ کی طرح یک بارگی مت پیو بلکہ دو، تین سانسوں میں پیا کرو اور جب پینے لگو تو بسم اللہ پڑھو اور جب برتن ہٹاؤ تو الحمد للہ پڑھو۔

لغات:۔ "**یتنفس**" تنفُّس کے معنی سانس لینے کے ہیں۔ قولہ "اَمرأ" جو موافق آئے خواہ کھانا ہو یا پانی وغیرہ، فارسی میں اسے گوارتر کہتے ہیں جیسا کہ بین السطور لکھا ہے اردو میں خوشگوار کہہ سکتے ہیں۔

قولہ "اروٰی" "رِی" بکسر الراء سے اسمِ تفضیل ہے یعنی پیاس زیادہ بجھانے والا، فارسی میں بین السطور ترجمہ سیراب کنندہ تر کیا ہے۔

تشریح:۔ ترمذی کی پہلی روایت میں "یتنفس فی الاناء" کا لفظ ہے۔ مگر مسلم[2] کی ایک حدیث میں "یتنفس فی الشراب" کے الفاظ ہیں اس لئے ترجمہ میں "پینے کے دوران" الفاظ میں مسلم شریف کی روایت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، تاکہ یہ اعتراض وارد نہ ہو کہ برتن کے اندر تو سانس لینا منع ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ لہٰذا ترمذی کی روایت میں فی الاناء سے مراد "فی اثناء الشراب" ہے۔[3]

اس حدیثِ مبارکہ میں اس عمل کی حکمت بھی مذکور ہے کہ اس طرح پینے سے کوئی نقصان بھی نہیں

باب ماجاء فی التنفس فی الاناء

[1] الحدیث اخرجه مسلم وابوداؤد وابن ماجه ومالک فی المؤطا واحمد بحواله سنن دارمی ص: ۱۶۱ حدیث: ۲۱۲۰، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۹۱ ج: ۵ حدیث: ۸۲۵۵ ج: ۲. [2] صحیح مسلم ص: ۱۷۴ ج: ۲ "باب كراهیة التنفس فی نفس الاناء الخ" كتاب الاشربة. [3] والافضل ان یتنفس خارج الاناء قبل الشرب اوعندالاستراحة من جرعةلشرب جرعة اخری، مصنفه ابن ابی شیبه ص: ۱۵۲ ج: ۵ كتاب الاشربة.

ہوتا ہے اور پیاس بھی اچھی طرح بجھ جاتی ہے۔ ایک اور حکمت اگلی حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک ہی دفعہ میں پینے سے اونٹ سے مشابہت آتی ہے جو کہ مذموم ہے۔[ع] ہم نے بڑے جانوروں کو دیکھا ہے کہ پانی پیتے وقت منہ پانی میں رکھ کر ناک کے ذریعے سانس لیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے قطرے پانی میں ناک سے آ کر گرتے رہتے ہیں، انسان کو ایسی چیزوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

ہم نے اس کا بھی تجربہ کیا ہے کہ جب آدمی شدید گرمی اور پیاس کا شکار ہوتا ہے مثلاً کوئی وزنی چیز اٹھا کر چڑھائی چڑھنے کے بعد متصل پانی پیئے اور یکبارگی پیئے تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور گلہ وسینہ تو یک دم خراب ہو جاتے ہیں جس کا تجربہ راقم نے خود بھی کیا ہے اس لئے ہمارے ہاں دیہاتوں میں یہ عام سی بات ہے کہ جب لوگ مذکورہ پوزیشن میں ہوتے ہیں تو ان کو جلدی پانی نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح ''ایکسیڈنٹ'' اور آپریشن کے بعد بھی۔ جانوروں کے بچے کی ولادت کے بعد جب لوگ پانی دیتے ہیں تو پانی کے اوپر گھاس ڈالتے ہیں تاکہ بھینس وغیرہ اسے جلدی جلدی نہ پی سکیں۔

اس کی مثال محسوسات میں یوں دی جاتی ہے جیسے آگ بجھانے کے لئے اگر یک دم سے پانی ڈالا جائے تو راکھ اڑ جاتی ہے اور جب پہلے آہستہ آہستہ پانی چھڑک دیا جائے اور پھر پانی ڈالا جائے تو راکھ بھی نہیں اڑتی اور آگ بھی بآسانی بجھ جاتی ہے۔ اس لئے پہلے تھوڑا سا پانی پیا جائے پھر نسبتاً زیادہ اور ثالثاً جتنا پینا چاہے، یکبارگی پینے سے معدے کی حرارت دماغ میں چلی جاتی ہے۔

تاہم یہ نہی طبی اعتبار سے شفقۃً ہے یا تشبہ بالحیوانات کی وجہ سے ہے اس لئے اگر کسی نے ایک ہی سانس میں پیا تو گناہ گار نہ ہوگا مگر خلافِ ادب ضرور ہوگا۔ اور اگر نقصان ہو جائے تو صرف اپنے آپ کو ہی ملامت کرتا رہے۔

باب ماذکر فی الشرب بِنَفَسَین

"عن ابن عباس ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان اذاشرِب یتنفس مرّتین"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب پانی پیتے

[ع] اسی طرح مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے عن عکرمۃ انہ کرہ الشرب بنفس واحد وقال ھو شرب الشیطان ص: ۵۲۱ ج:۵ کتاب الاشربۃ. حفیظ الرحمٰن الحقی ندوۃ العلم

تو دو سانسوں میں نوش فرماتے۔

تشریح:۔ اس کے ظاہری مطلب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دو سانسوں میں بھی پینا ثابت ہے، یہ اس وقت ہوگا جب آدمی کو پیاس زیادہ نہ لگی ہو۔ سابقہ باب کی آخری حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے ''ولکن اشربوا مثنیٰ وثلث ''۔ مگر اس کو حافظؒ نے تین بار پینے کی طرف راجع کیا ہے کہ جب دو مرتبہ سانس لیا جائے گا تو بھی تین مرتبہ پینا متحقق ہوگا گویا تیسری بار سانس جو اختتام کے لئے ہوتا ہے اسے نہیں گنا گیا۔ (تدبر) ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

"ویُذکرعنہ (علیہ السلام) انہ کان اذاشرب تنفس فی الاناء ثلاثۃ انفاس یحمداللہ فی کل نفس ویشکرہ فی آخرھن"۔[۱] (مختصر زاد المعاد ص ۱۰۴)

بعض دیگر روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ تینوں بار برتن منہ کے قریب کرتے وقت بسم اللہ پڑھتے اور ہٹاتے وقت الحمد للہ۔[۲] علیٰ ہذا ہر مرتبہ برتن منہ سے الگ کر کے سانس لیا جائے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی کراھیۃ النّفخِ فی الشراب

"عن ابی سعیدالخدری ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم نہیٰ عن النفخ فی الشراب فقال رجل: القَــذَاۃَ اَراھافی الاناء فقال: اھرقھا فقال فانی لااروئ من نفس واحد قال: فَاَبِنِ القدح عن فیك۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا تو اس پر ایک شخص نے پوچھا کہ اگر میں برتن میں کوئی تنکا دیکھ لوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے بہا دو، اس نے پھر پوچھا کہ میں ایک سانس میں سیراب نہیں ہوتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو برتن کو منہ سے دور کرو (یعنی سانس لینے کے بعد دوبارہ وسہ بارہ پیو)۔

باب ماجاء فی الشرب بنفسین

[۱] رواہ الطبرانی فی الکبیر: ۱۰۴۷۵ مجمع الزوائد ص: ۹۲ ج: ۵۔

[۲] کذا فی معجم اوسط للطبرانی، عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ ﷺ کان یشرب فی ثلاثۃ انفاس اذا ادنی الاناء الی فیہ سمی اللّٰہ فاذا اخرہ حمداللّٰہ یفعل ذالک ثلاث مرات، مجمع الزوائد ص: ۹۲ ج: ۵ حدیث: ۸۲۵۹ کتاب الاشربۃ۔

لغات:۔قولہ''النفخ''بفتح النون وسکون الفاء، منہ سے پھونک مارنا۔قولہ''القذاۃ''آنکھ میں گرجانے والے تنکے کو بھی کہا جاتا ہے اور مطلق تنکے کو بھی کہتے ہیں یہاں مطلق تنکا مراد ہے۔ یہ لفظ بفتح القاف پڑھا جائے گا اعراب کے لحاظ سے یہاں منصوب علی شریطۃ التفسیر ہے۔قولہ "فابن" امر کا صیغہ ہے ابانت سے۔

قولہ "القدح" پیالے اور گلاس وغیرہ کو کہتے ہیں۔(یعنی برتن کو منہ سے الگ کرو)

تشریح:۔اس باب میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت بھی آئی ہے ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ جس طرح برتن میں سانس نہیں لینا چاہیے اسی طرح اس میں پھونک بھی نہیں مارنی چاہیے، جس کی متعدد وجوہات ہیں مثلاً جو ہوا سانس یا پھونک کے ذریعے خارج ہوتی ہے تو اس میں لعاب کے ذرات مکس ہو جاتے ہیں جن سے گھن محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ لعاب برتن میں کرے گا۔اسی طرح اس ہوا میں بدبو کا بھی امکان ہے اور یہ گھن کا سبب ہے۔

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ سانس کے ذریعے جو تازہ ہوا ہم اندر داخل کرتے ہیں اس میں موجود آکسیجن ہمارے پھیپڑوں کے ذریعے رگوں اور خلیوں تک پہنچ کر محلول غذا اور خون کے ذرات کو جلا دیتی ہے، تا کہ انرجی پیدا ہو جائے جس سے کاربن ڈائی اکسائیڈ پیدا ہو جاتی ہے یہ ایک سمی اور زہریلی کثیف گیس ہوتی ہے جو ناک اور منہ کے ذریعہ عمل تنفس سے خارج ہو جاتی ہے، چونکہ وہ نسبتاً ثقیل اور کثیف ہوتی ہے اس لئے برتن میں سانس لینے سے وہ کھانے پینے کی چیز سے مل جاتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ صحت کے لئے کوئی مفید چیز نہیں اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم صرف پانی تک محدود نہیں بلکہ ہر مائع کھانے پینے کی چیز کو شامل ہے خاص کر جب آدمی کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شریک ہوں، لہٰذا اگر برتن میں کوئی ناگوار چیز نظر آجائے تو اسے یا تو برتن کو ٹیڑھا کر کے گرا دیا جائے یا پھر کسی چیز جیسے چمچ وغیرہ سے نکال دیا جائے۔اسی طرح اگر چائے، دودھ یا دوسرا کھانا وغیرہ گرم ہو تو اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے بھی نہ پھونکے بلکہ انتظار ہی کیا جائے۔

باب ماجاء فی کراھیۃ التنفس فی الاناء

"عن عبداللّٰہ بن ابی قتادۃ عن ابیہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال:اذاشرب احدکم فلایتنفس فی الاناء"۔

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی ایک پیئے تو برتن میں سانس نہ لے۔

باب ماجاء فی النهی عن اختناث الاسقیة

"عن ابی سعیدروایة انه نهی عن اختناث الاسقیة"۔[1]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکیزوں کے منہ الٹ کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

لغات:۔قولہ "اختناث" خَنَثَ باب ضرب سے مشک کا منہ الٹا کر کے اس طرح موڑنے کو کہتے ہیں جس سے اس کی اندرون طرف باہر آجائے۔قولہ "الاسقیة" سقاء کی جمع ہے چمڑے کا مشکیزہ۔

تشریح:۔ادنیٰ تأمل سے یہ بات بآسانی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ الحکیم والعلیم نے منہ کے اوپر ناک اور ناک کے اوپر آنکھیں پیدا فرمائی ہیں جس کا مطلب یہ ہے، کہ جب ہم کوئی چیز کھاتے اور پیتے ہیں تو دور ہی سے دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ چیز کھانے پینے کے قابل ہے یا نہیں اور جب اسے منہ کے قریب لاتے ہیں تو اس کی بو سے مزید علم حاصل ہوجاتا ہے، پھر مزید علم قوت ذائقہ سے ہوجاتا ہے جبکہ معدہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتا ہے۔

علی ہذا کھانے پینے کی کوئی بھی چیز پہلے ہمیں اچھی طرح دیکھ لینی چاہئے اور پھر سونگھ لینی اور پھر چکھ لینی چاہئے تب ہم فیصلہ کرلیں کہ وہ نگلنے کے قابل ہے یا نہیں۔

اگر کوئی چیز ہماری نظر سے اوجھل ہو تو اس میں یہ حکمت ملحوظ نہیں رہ جاتی۔علی ہذا اندھیرے میں یا آنکھوں سے پوشیدہ چیز کو منہ میں نہیں ڈالنا چاہئے بلکہ دیکھ بھال کر ہی کھانا چاہئے۔

اسی بناء پر مشکیزے کے منہ کو منہ میں ڈال کر پانی پینے سے ممانعت آئی کہ اندر کا پانی خراب بھی ہوسکتا ہے، اس میں موذی چیز تنکے یا جاندار بھی ہوسکتے ہیں جو سیدھے معدے میں داخل ہوں گے، علاوہ ازیں اس

باب ماجاء فی النهی عن اختناث الاسقیة

[1] الحدیث اخرجه البخاری، وابوداؤد والنسائی وابن ماجه ومالک فی المؤطا واحمد بحواله سنن دارمی ص: ۱۶۰ ج: ۲ حدیث: ۲۱۱۹ کتاب الاشربة.

سے یک دم سے پانی منہ میں جا بھی سکتا ہے جو سانس کی نالی میں جا سکتا ہے، مع ہذا مشکیزے کا منہ، پینے والے کے منہ کی بدبو سے بدبودار بھی ہوسکتا ہے جو دوسروں کے لئے گھن کا سبب اور پانی کے ضیاع کا موجب بنے گا، اس آخری وجہ کی بناء پر ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ کھانا کھاتے وقت جب پانی پئے تو پہلے منہ کو صاف کردے پھر گلاس وغیرہ برتن کے کنارے کو منہ کے اندر زیادہ داخل نہ کرے بلکہ ہونٹ پر رکھ کر پانی چوس لے یا برتن کو جھکائے تو پانی خود بخود اندر چلا جائے گا۔

بعض لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے جب وہ بوتل پیتے ہیں تو بوتل کا منہ پورا کا پورا اپنے منہ میں داخل کرتے ہیں۔ اگر بڑی بوتل ہو اور اس کے پینے میں اور لوگ بھی اس کے ساتھ شریک ہوں اور کوئی گلاس نہ ہو تو وہ اس میں خاص خیال رکھیں کہ بوتل کا کنارہ ہونٹ پر رکھ کر بوتل کو جھکائیں چونکہ بوتل کا اندرون حصہ باہر سے نظر آتا ہے اس لئے اس میں پہلی وجہ متحقق نہیں ہوتی۔ پس اگر چھوٹی بوتل ہو جو انفرادی پینے کے لئے ہو اور پینے میں اس طرح احتیاط ہوسکتی ہو کہ پانی یک دم سے منہ میں داخلے سے روک سکتا ہو تو اس طرح پینے میں کوئی مضائقہ نہیں اگرچہ شائستگی اس میں ہے کہ گلاس میں ڈال کر پی لے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

"عن عیسیٰ بن عبداللّٰہ بن اُنیس عن ابیہ قال:رأیت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قام الی قربة معلّقة فَخَنَثَهاثم شرب من فیها"۔

حضرت عبداللہ بن اُنیس (بالتصغیر) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جو لٹکے ہوئے مشکیزے کے پاس کھڑے ہوکر اس کا منہ موڑا اور پھر اس کے منہ سے پانی پیا۔

دوسری حدیث:۔ اس باب میں دوسری روایت حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے تو ایک لٹکے ہوئے مشکیزے سے کھڑے کھڑے پانی پیا تو میں نے جا کر اس مشکیزے کا منہ کاٹ لیا (تاکہ بطور تبرک ہمارے پاس رہے)۔[1]

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

[1] اسی مضمون کی روایت عن ام سلیم ان النبی ﷺ دخل علیها وفی بیتها قربة معلقة قال فشرب من القربة قائماً قال فعمدت الی فم القربة وقطعتها، وعن عائشة ان النبی ﷺ دخل علی امرأة من الانصار وفی البیت قربة معلقة فاختنثها فشرب وهو قائم، بحواله مجمع الزوائد ص: ۸۹ ج:۵ کتاب الاشربة. حفیظ الرحمٰن الٰهی عفی عنہ

لغات:۔قولہ"قِربة"بکسرۃ قاف مشکیزہ۔قولہ''معلقۃ''تعلیق سے ہے یعنی لٹکا ہوا۔قولہ"فخنثها" اس کا منہ پلٹا جیسا کہ سابقہ باب میں گذرا ہے۔

تشریح:۔اس باب کی روایات سے معلوم ہوا کہ سابقہ باب کی احادیث میں وارد نہی تحریم کے لئے نہیں اگر چہ بعض اہل ظواہر اس کو تحریم پر حمل کرتے ہیں، مگر جمہور کے نزدیک وہ ارشاد اور بیان آدابِ شائستگی کے لئے ہے۔لہٰذا اس کا درجہ مکروہ تنزیہی سے زیادہ نہیں۔ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشکیزے کے منہ سے پینا یا تو ضرورت پر محمول ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی برتن نہ ہو یا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ مبارک خوشبو کا منبع تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نہی کی روایات بڑے مشکیزے پر محمول ہوں جبکہ باب کی روایاتِ اباحت چھوٹے پر محمول ہیں۔تدبر

اس سے معلوم ہوا کہ نل اور ٹونٹی پر منہ لگا کر پانی نہیں پینا چاہئے مگر عند الضرورت بلا کراہت جائز ہوگا۔

حضرت کبشہ کا مشکیزے کا منہ کاٹنا تبرک کے حصول کے لئے تھا جس کی کچھ تفصیل (تشریحات ترمذی جلد چہارم ص ۱۲۶) پر گذری ہے''باب ماجاء بای جانب الرأس یبدأ فی الحلق''(حج) کے ضمن میں۔فلیراجع

باب ماجاء أن الأيمنين أحق بالشرب

"عن انس بن مالك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم أتى بلبن قد شِيب بماء وعن يمينه اعرابى وعن يساره ابوبكرفشرب ثم اعطىٰ الاعرابىّ وقال: الايمن فالايمن"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسا دودھ پیش کیا گیا جس میں پانی ملایا گیا تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ایک اعرابی اور بائیں ابوبکر بیٹھے تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے بنفس نفیس نوش فرمایا پھر ماقبی اعرابی کو دیا اور فرمایا کہ زیادہ حقدار دایاں ہے پھر اس کے دائیں۔

لغات:۔قولہ"شِيبَ" شوب اور شیب خواہ واوی ہو یا یائی دونوں کے معنی ملانے کے ہیں قال اللہ تعالیٰ:ثم ان لهم عليها لشوباً من حميم''(سورۂ صفت آیت ۶۷) پھر ان کو کھولتا ہوا پانی (پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا۔یہاں حدیث میں اس کو کچی لسی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

تشریح:۔ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ امام زہریؒ سے امام مالکؒ کی مذکورہ روایت

مختصر ہے جبکہ زہریؒ سے سفیان بن عیینہ کی روایت پوری ہے جس میں ہے حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے جبکہ میں دس برس کا تھا اور وصال ہوا تو میں بیس سال کا تھا میری ماں مجھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ترغیب اور حکم دیا کرتی تھیں چنانچہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے تو ہم نے ان کے لئے اپنی ایک بکری کا دودھ دوہا اور اس میں پانی ملایا۔

"فشرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکرؓ عن یسارہ واعرابی عن یمینہ وعمرناحیة فقال عمر:یارسول اللہ ناوِل ابابکر،فناول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاعرابی وقال:الایمن فالایمن"۔

اعراب کے لحاظ سے اس کو منصوب ومرفوع دونوں پڑھنا جائز ہیں۔ بنابرنصب یہ مفعول بہ ہے فعل ناصبہ مقدر کا جو"اُعطی"یا"اُقدم"بصیغہ متکلم یا"قدموا"بصیغہ خطاب ہے۔جبکہ رفع کی صورت میں اس کو خبر اور مبتدا ہر دو بنانا جائز ہے۔اور ایک دوسری روایت میں"الایمنون"حالت رفعی میں آیا ہے جس سے رفع کی تائید ہوتی ہے"ای الایمن احق یامقدم"مثلاً یا"الاحق بالتقدیم الایمن ثم الایمن"۔[1]

یہاں دو باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں، ایک یہ کہ یمین والے کا یہ استحقاق کس درجے کا ہے۔ اور دوسری یہ کہ یہ حکم عام ہے اور ہر شے کو شامل ہے یا صرف کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ خاص ہے؟؟؟

(۱)...... پہلی بات کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ یہ حکم جھگڑا ختم کرنے اور نظم کے لئے ہے، کیونکہ اگر افضل کو مدارِ حکم بنایا جاتا تو بسا اوقات افضل کی معرفت اور تمیز مشکل بلکہ متنازعہ بن جاتی ہے اور تنگ دلی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ تیامن اس شخص کی فضیلت کی وجہ سے نہیں بلکہ جہتِ یمین کی وجہ سے ہے کیونکہ یمین شمال سے افضل ہے۔علی ہذا یمین پر کوئی بھی ہو مگر وہ مقدم ہوگا۔ پھر جمہور کے نزدیک یمین کی ترجیح صرف مستحب ہے واجب نہیں ہے البتہ ابن حزمؒ اس کو واجب مانتے ہیں۔

(۲)...... دوسری بات کے متعلق امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ضابطہ صرف پانی میں ہے کیونکہ وہ مباح الاصل ہے۔مگر ابن العربیؒ نے اس کو مسترد کیا ہے کہ پانی اگرچہ اصلاً تو مباح ہے مگر وہ جس کے قبضے میں

باب ماجاء ان الایمنین احق بالشرب

[1] رواہ ابن ابی شیبة ص: ۵۲۴ ج: ۵ من کان اذا شرب ماء بدأبالایمن، کتاب الاشربة.

ہوتا ہے اسی کی ملک ہوتا ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"فی هذه الاحادیث بیان هذه السنة الواضحة وهو موافق لماتظاهرت علیه دلائل الشرع من استحباب التیامن فی کل ماکان من انواع الاکرام ...الی ان قال... واماتقدیم الافاضل والکبارفهوعندالتساوی فی باقی الاوصاف ولهذا یقدم الأعلم والاقرء علی الاسن الشیب فی الامامة فی الصلوٰة"۔

(نووی شرح مسلم ص:۱۷۴ ج:۲)

یعنی جہاں یمین اور شمال کا فرق ہوگا تو اکراماً للیمین دائیں کو مقدم کیا جائے گا اور جہاں یہ تمایز نہ ہو تو پھر الافضل فالافضل کا ضابطہ ہوگا۔

ابن العربیؒ نے عارضہ میں کچھ مسائل اس حدیث سے مستنبط کئے ہیں:

(۱) اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بہت قدر فرماتے اس لئے فرمایا: "یارسول الله ناوِل ابابکر"!۔

(۲) دودھ میں پانی ملانے سے اس کا حکم خلیطین (ممنوع) کی طرح نہیں۔ (انتہیٰ) البتہ جو دودھ بیچنے کے لئے ہو اس میں پانی وغیرہ کی ملاوٹ حرام ہے کہ یہ غش محرم میں داخل ہے۔

(۳) دیہاتیوں کے ساتھ مجالست میں اگر کوئی فائدہ ہو تو یہ جائز ہے۔

المسترشد:۔ چونکہ دیہاتی لوگ عموماً فضول باتیں اور لایعنی مباحث میں الجھتے رہتے ہیں تو شاید ان کو یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہوگی، جس کا مطلب یہ ہے کہ عموماً چونکہ گنواروں کی مجلسوں میں فضولیات کی بھرمار ہوتی ہے اس لئے ان سے بچنا چاہئے خصوصاً جب وہ علماء کی قدر بھی نہ جانتے ہوں اور ان کے سامنے بکواس کرتے رہتے ہوں۔ ہاں اگر کوئی ہوشیار سا دیہاتی ہو تو اس کے ساتھ مجالست میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(۴) اگر ایک آدمی کسی عالم کے پاس (یا مسجد وغیرہ میں) پہلے آکر بیٹھ جائے تو وہ اس نشست کا بنسبت افضل کے زیادہ مستحق ہے چنانچہ یہاں اعرابی پہلے بیٹھے ہوں گے اس لئے ان کو حضرت ابوبکرؓ کے لئے نشست سے اٹھایا نہیں البتہ افضل کو جگہ دینا چاہئے۔

البتہ یہ ضابطہ عام مجالس کا ہے جہاں تک خصوصی محفلوں کا تعلق ہے تو وہاں افضل بہرحال مقدم ہوں

گے۔ چنانچہ نماز کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا تھا کہ میرے قریب بڑے اور دانا لوگ کھڑے ہوں،[۲] علی ہذا اگر کوئی مشورہ ہو یا جلسہ ہو تو ہر آدمی کو اس میں شرکت اور اسٹیج پر بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح امور انتظامیہ میں بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں (مع الزیادۃ)۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء أن ساقی القوم اٰخرھم شُرباً

"عن ابی قتادة عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: ساقی القوم اخرھم شربا"۔[۱]

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قوم کو پلانے والا خود اخیر میں پیئے گا۔

تشریح:۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ الکوکب میں فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت ہے کہ جب تقسیم کنندہ اس چیز کا مالک نہ ہو بلکہ صرف تقسیم پر مامور ہو پس مالک کو اختیار ہے گو کہ کریمانہ اخلاق ایثار ہے۔

ابن العربیؒ عارضہ میں اس حکم کی حکمت یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر تقسیم کرنے والا خادم اور مفضول ہو تو اس کو چاہئے کہ پہلے مخدوم اور افضل کو دیدے اور اگر تقسیم کرنے والا افضل شخص ہو تو کمال فضیلت یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیدے۔

نیز خود پہلے لینے میں حرص کا اظہار ہوتا ہے جو کہ مذموم ہے علاوہ ازیں شریعت کا یہ زرین اصول ہے کہ حقوق اور خصوصاً مشترک حقوق میں احتیاط کی تلقین کرتی ہے کہ آدمی حتی الامکان خود کو دوسروں کی حق تلفی سے بچانے کی کوشش کرے جس کی آسان صورت یہ ہے کہ پہلے دوسرے مستحقین کو مطمئن کرے تا کہ کسی کو اپنے حق کا دعویٰ نہ رہے پھر اخیر میں اپنا حق وصول کرلے۔

---

[۲] عن عبداللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ لیلنی منکم اولوا الاحلام والنهی الخ صحیح مسلم ص: ۱۸۱ ج: ۱ کتاب الصلاة.

باب ماجاء ان ساقی القوم آخرھم شرباً

[۱] رواه مسلم بنحوه وابوداؤد، ابن ماجه واحمد، بحواله سنن دارمی ص: ۱۶۴ ج: ۲ حدیث: ۲۱۳۵، ایضاً اخرجه الطبرانی فی الاوسط مجمع الزوائد ص: ۹۵ ج: ۵، ایضاً مصنفه ابن ابی شیبه ص: ۵۲۸ ج: ۵ کتاب الاشربة.

باب ماجاء اَیُّ الشراب کان أحبُّ الی رسول الله ﷺ؟

عن عائشة قالت كان أحب الشراب الى رسول الله صلى الله عليه وسلم الحُلو البارد۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پینے کی چیزوں میں سب سے زیادہ پسند میٹھا ٹھنڈا مشروب تھا۔

لغات:۔ ''الحلو'' بضم الحاء وسکون اللام میٹھا۔

تشریح:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار پانی میں شہد ملا کر نوش فرماتے۔ اور کبھی کھجور وغیرہ جن سے پانی میٹھا ہو جاتا، اور چونکہ مشروبات کی خواہش گرمیوں میں عموماً پیدا ہوتی ہے اس لئے ٹھنڈا پانی میٹھا کر کے پینے کو پسند فرماتے۔ یہ پسندیدگی اس پانی کی افضلیت کی وجہ سے نہ تھی ورنہ افضل تو زمزم ہے، بلکہ لذت کی وجہ سے تھی۔ پہلے گذرا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ میں ملایا ہوا پانی بھی پیا ہے لہٰذا یہ تمام صورتیں مختلف مواقع پر رونما ہوئیں ان میں کسی طرح کا تعارض نہ سمجھا جائے۔ لہٰذا کبھی ایک مشروب کو پسند فرماتے اور کبھی دوسرے کو۔

''باب ماجاء ما یستحب علیہ الافطار'' میں نیل الاوطار کے حوالے سے گذرا ہے کہ حلاوت کو ایمان سے ایک گونہ مناسبت ہے شاید اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حلو بارد کو پسند فرماتے۔ اگر چہ یہ طبعی طور پر بھی ممکن ہے جیسا کہ آج کل بازاروں میں میٹھے مشروبات کی دوکانوں پر رش دیکھا جا سکتا ہے۔
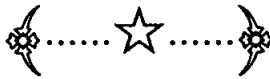
باب ماجاء ای الشراب کان احب الی رسول الله ﷺ

[1] الحديث اخرجه مصنف ابن ابی شيبه ص: ۵۲۴ ج:۵ كتاب الاشربة، ايضاً مجمع الزوائد ص:۸۸ ج:۵ حديث: ۸۲۴۰، ايضاً مستدرك حاكم ص:۶۵ ج:۵ حديث:۷۳۵۷ كتاب الاشربة، مسنداحمد ص:۵۵۵ ج:۱ حديث: ۳۱۱۹.

ابواب البر والصلۃ

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قولہ "البر" بکسر الباء وتشدید الراء نیکی اور حسن سلوک کے معنی میں آتا ہے۔ تاہم جب اس کا اطلاق ماں باپ اور رشتہ داروں کے حوالے سے ہوتا ہے تو اس وقت یہ عقوق کے مقابل آتا ہے۔ چونکہ عقوق کے معنی نافرمانی، بدسلوکی اور حقوق تلفی کے ہیں اس لئے بر بمعنی فرمانبرداری، نیک سلوک یعنی اچھے برتاؤ اور حقوق کی ادائیگی کے ہے۔ تاہم یہاں بر سے عام معنی یعنی مطلق نیک برتاؤ مراد ہے تاکہ تمام ابواب کو شامل ہو۔

قولہ "الصلۃ" مقابل قطع ہے وصل کے معنی ملانے کے ہیں مگر یہاں مراد صلہ رحمی ہے تو چونکہ قطع رحم، رشتہ داروں اور عزیزوں سے لاتعلقی کو کہتے ہیں اس لئے صلہ رحمی اچھے تعلقات کا نام ہے، اور اچھے تعلقات کا مفہوم ہر ایک جانتا ہے۔ جس کا خلاصہ، ایک دوسرے کی مدد برحق، میل جول اور ہر قسم کا جائز تعاون ہے۔ علی ہذا صلہ کا ذکر بعد البر ذکر خاص بعد العام ہے۔

باب ماجاء فی برّ الوالدین

حدثنا بهز بن حكيم حدثني ابي عن جدي قال قلت يارسول الله من ابرُّ؟ قال: امكَ، قال قلت ثم من؟ قال: امكَ قال قلت ثم من؟ قال: امك قال قلت ثم من؟ قال: ثم اباكَ ثم الاقرب فالاقرب"۔

بہز بن حکیم بیان کرتے ہیں کہ میرے والد یعنی حکیم نے مجھے یہ حدیث میرے دادا یعنی معاویہ بن حیدہ سے بیان کی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا اللہ کے رسول! میں کس کے ساتھ اچھا برتاؤ کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ، میں نے پھر پوچھا کہ پھر کس سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ماں سے، میں نے پھر دریافت کیا کہ اس کے بعد کس سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ اپنی ماں سے، میں نے پھر پوچھا کہ پھر کس سے؟ فرمایا اپنے باپ کے ساتھ اور پھر جو رشتہ میں جتنا قریب ہو تو اس کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

لغات:۔قولہ "ابر" بفتح الھمزہ والباء وتشدید الراء واحد متکلم کا صیغہ ہے اور بر سے مشتق ہے جس کے معنی حسن سلوک کے ہیں کما مر۔قولہ "امك" منصوب ہے ای بِرّ اُمّكَ!۔

تشریح:۔اس حدیث سے ماں باپ اور عزیزوں و دیگر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین وتاکید ثابت ہوئی۔تاہم براور نیک سلوک میں ماں باپ باقی اقربہ پر اور ماں سب پر مقدم ہے۔یہ رائے بہت سے علمائے کرام کی ہے جیسا کہ حاشیہ پر علامہ سیوطیؒ سے نقل کیا ہے۔اور امام نوویؒ کی بھی یہی رائے ہے۔نیز اس حدیث میں ماں کے ساتھ بر کو تین مرتبہ ذکر کرنے میں اس کی تثلیث کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ماں بچے کی پانی کی حالت سے جوانی کے وقت تک کئی مشکل مراحل سے گذرتی ہے جن کو چار مراتب پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پہلا مرحلہ حمل کا ہے۔دوسرا جنم دینے کا۔تیسرا دودھ پلانے اور نہلانے دھلانے کا ہے۔جبکہ چوتھا تربیت کا ہے۔پہلے تین میں ماں تنہا سب صعوبتیں جھیلتی ہے اس لئے اس کو امتیازی طور پر تین بار نیک سلوک کا حکم دیا۔جبکہ چوتھے میں وہ باپ کے ساتھ شریک ہے اس آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے "حَمَلَتهُ اُمُّه کُرهاً ووَضَعته کُرهاً وحَملُه وفِصٰلُه ثلٰثون شهراً"۔(سورۂ احقاف آیت:۱۵)

اس بارے میں اہل علم کی دوسری رائے یہ ہے کہ حدیث شریف میں یہ تکرار تکثیر حق کے لئے نہیں بلکہ تاکید کے لئے ہے کیونکہ اکثر لوگ باپ کا خیال زیادہ رکھتے ہیں اور ماں کی پرواہ کم کرتے ہیں تو حقوق اگرچہ دونوں کے برابر ہیں اور اولاد کو دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرنا لازمی ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کا ذکر مکرر فرما کر لوگوں کی کوتاہی اور تقصیر کو دور کرنے کی تاکید فرمائی۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ تعظیم واکرام تو باپ کا زیادہ ہونا چاہئے اور خدمت ماں کی زیادہ، یہ توجیہ کوئی تیسری رائے نہیں ہے بلکہ یہ بھی وہی مساوات والی صورت ہے اور مطلب یہ ہے کہ ماں باپ دونوں اولاد پر حقوق میں برابر کے شریک ہیں، البتہ بعض اعتبارات سے ایک کا حق زیادہ ہے اور بعض دیگر اعتبارات سے دوسرے کا حق زیادہ ہے "فتلک بتلک"۔چونکہ باپ کا درجہ فی نفسہ ماں کے درجے سے زیادہ بلند ہے اور یہ تفاوت جنسی، طبعی اور شرعی ہے اس لئے ادب باپ کا زیادہ کرے تاکہ تدبیر المنزل پر اثر نہ پڑے اور ویسے بھی عورتوں میں تواضع ہوتی ہے وہ اولاد سے زیادہ ادب کا تقاضا و مطالبہ بھی نہیں کرتیں، بلکہ اولاد سے بے تکلفی پسند کرتی ہیں اس کے برعکس ماں کا تعلق صنف نازک سے ہے اس لئے اس کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑے جبکہ باپ کو زیادہ خدمت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی دوکان سے سودا سلف خریدنے اور منگوانے کی ضرورت عام

طور پر عورتوں کو پڑتی ہیں۔ تدبر

ہاں جب دونوں بوڑھے ہو جائیں تو پھر دونوں خدمت کے یکساں محتاج ہو جاتے ہیں اس لئے ماں کی خدمت کے ساتھ ساتھ باپ کی خدمت بھی بڑھائے اور باپ کے اکرام کے ساتھ ماں کے اکرام کا درجہ بھی بڑھائے۔

ماں باپ کے مختلف حقوق:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَقَضیٰ رَبُّكَ الا تَعبُدو االاایاہ وَبالوالِدینِ اِحساناً'' الآیۃ۔[1] امام قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب واحترام کو اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورۂ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے ''اَنِ اشکُرلِی وَلِوالِدیكَ''[2] یعنی میرا شکر ادا کرو اور والدین کا بھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم ہے اور اللہ کے شکر کی طرح والدین کا شکر گذار ہونا واجب ہے۔

امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ اگر والدین ظلم کریں تب بھی ان کی فرمانبرداری کی جائے گی اور ان کو راضی رکھا جائے۔ انہوں نے فرمایا اگر وہ ظلم کریں تب بھی۔ ماں باپ کا صرف یہی حق نہیں کہ ان کی خدمت کی تو بس حق پورا ادا کیا، بلکہ جن لوگوں سے ان کی قرابت یا دوستی ہو ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرے اور والدین کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان کے متعلقین کا بھرپور خیال رکھا جائے۔ امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ ایک اعرابی (بدوی عرب) سفر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ملا اس اعرابی کا باپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوست تھا، اعرابی نے ابن عمرؓ سے کہا: تم عمرؓ کے بیٹے نہیں ہو؟ ابن عمرؓ نے کہا کہ کیوں نہیں، اس کے بعد آپؓ نے اعرابی کو ایک گدھا دیدیا جسے وہ ساتھ لائے تھے اور اپنے سر سے عمامہ اتار کر دیدیا، اس پر بعض ساتھیوں نے کہا کہ اس اعرابی کے لئے تو دو درہم بھی بہت تھے، تو ابن عمرؓ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنے باپ کی دوستی کو نبھاؤ، اسے ختم نہ کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارا نور بجھا دے گا۔

ابواب البر والصلۃ

باب ماجاء فی بر الوالدین

[1] سورۃ الاسراء آیت: ۲۳۔ [2] سورۃ لقمان آیت: ۱۴۔

(الادب المفرد باب نمبر۲ حدیث نمبر۴۰ وکذا رواہ مسلم بمعناہ ص۳۱۴ ج۲، باب فضل صلۃ اصدقاء الاب والام ونحوھما [۳])

اس کی مزید تفصیل دیکھنی ہو تو راقم نے نقش قدم حصہ دوم یا نقش اخلاق میں تیسرے باب کے شروع میں قدرے زیادہ وضاحت سے بیان کی ہے فلیراجع۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"البِرُّ شئی هَیِّن، وجه طلق وکلام لَیِّن" وقد قال الله تعالیٰ "ولا تقل لهما اف ولا تنهرهما وقل لهما قولاً کریماً واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما کما ربیانی صغیراً"۔

(سورۂ اسراء آیت نمبر:۲۳،۲۴)

باب منه

"عن ابن مسعود قال سألتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت: یارسول الله ایُّ الاعمال افضل؟ قال: الصلوٰة لمیقاتها، قلتُ: ثم ماذا یارسول الله؟ قال: برّ الوالدین، قال قلت: ثم ماذا یارسول الله؟ قال: الجهاد فی سبیل الله ثم سکتَ عنی رسول الله صلی الله علیه وسلم ولو استزدتُه لزادنی"۔ حسن صحیح

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! اعمال میں سب سے اچھا کونسا عمل ہے؟ فرمایا اپنے وقت پر نماز پڑھنا فرماتے ہیں میں نے پھر کہا کہ یارسول اللہ اس کے بعد کون سا ہے؟ فرمایا: ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا، فرمایا میں نے کہا کہ یارسول اللہ اس کے بعد کون سا افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی، تاہم اگر میں مزید پوچھتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزید جوابات دیتے۔

لغات:۔ قولہ "ایُّ" یہ لفظ چار معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (۱) شرطیہ کے لئے جیسے "اَیَّمَا الاَجَلَینِ قَضَیتُ فَلَاعُدوَانَ عَلَیَّ"۔ الآیۃ [۱] (۲) استفہامیہ جیسے "اَیُّکُم زَادَتہ هٰذِه

---

[۳] اسی مضمون کی روایات کیلئے مصنف ابن ابی شیبہ ص:۹۹ ج:۶، ایضاً مجمع الزوائد ص:۱۷۵ تا ۱۸۵ ج:۸ کتاب البر والصلة.

باب منه

[۱] سورة القصص آیت:۲۸.

اِیمَاناً ''۔[۲] (۳) موصولہ جیسے ''ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ مِن کُلِ شِیعَۃٍ اَیُّھم اَشَدُّ عَلی الرحمٰنِ عِتیاً ''۔[۳]
(۴) برائے بیان کمال جیسے ''مُحَمَّدٌ رَجُلٌ اَیُّ رَجُلٍ''۔اس حدیث میں بمعنی ثانی برائے استفہام ہے۔

قولہ "ثم ماذا" ثم یہاں تراخی زمان کے لئے نہیں ہے بلکہ تراخی رتبہ کے لئے ہے یعنی نماز کے بعد کس عمل کا درجہ بلندو بالا ہے؟ قولہ "ولو استزدته" عبداللہ بن مسعودؓ کا مقولہ ہے اور سین طلب کے لئے ہے یعنی اگر میں مزید جوابات طلب کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے۔

تشریح:۔ یہ سوال ارکانِ اسلام کے بارے میں نہیں تھا ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں ''الایمان باللہ ''فرماتے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ منشائے سوال سمجھنے والا کون ہوسکتا ہے؟ لہٰذا کہا جائے گا کہ یہ سوال تصدیق کے علاوہ اور اعمالِ قلب کے علاوہ جوارح کے اعمال کے متعلق تھا، اور اگر اس سوال کو عام مانا جائے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب سائل پر اعتماد کی وجہ سے ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابن مسعودؓ کے علم پر اعتماد تھا کہ وہ ایمان کو تو بہتر اور بنیاد سمجھتے ہی ہیں اس لئے اس کو جواب میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

اس حدیث کے اس جزء کی شرح (تشریحات ترمذی جلد ا ص ۴۱۷) پر گذری ہے ''باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل''میں تاہم وہاں یہ روایت حضرت ام فروۃؓ سے بھی مروی ہے اور یہی سائلہ ہیں اور وہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور بھی ہے اور وہاں جواب ''الصلوٰۃ لاول وقتھا '' سے دیا گیا ہے جبکہ یہاں ''الصلوٰۃ لمیقاتھا'' کے الفاظ ہیں۔

بہرحال اس قسم کے سولات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد صحابہ کرامؓ نے پوچھے ہیں۔مگر سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نماز کو مقدم فرمایا ہے جیسا کہ حدیث الباب میں ہے اور کبھی ایمان کو اور کبھی جہاد کو بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا ہے۔

اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں مگر دو جواب افضل ہیں۔

(۱):۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکیم تھے اور ماہر حکیم مریض کے مزاج کے مطابق اور موسم کے موافق علاج کرتا ہے تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی میں ایک پہلو سے نماز کو وقت پر ادا کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تو اس کو وہی جواب دیتے۔اور جب دوسرے میں جہاد کرنے کی ضرورت محسوس فرماتے تو اس کے لئے وہی

---

[۲] سورۃ التوبۃ آیت: ۱۲۴۔ [۳] سورۃ مریم آیت: ۶۹۔

علاج تجویز فرماتے۔یا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم موسم اور حالات کو دیکھتے جب جہاد کا موقع ہوتا تو اس پر زور دیتے۔اور جب غزوہ سے واپسی ہوتی تو دیگر اعمال پر زور دیتے۔اور یہی چیز بلاغت کہلاتی ہے''مطابقۃ الکلام لمقتضیٰ الحال''۔

(۲) افضلیت کلی مشکک ہے اس کے افراد جہاد وغیرہ ہیں لہٰذا ایک کے افضل ہونے سے دوسرے کا مفضول ہونا لازم نہیں آتا۔

اس حدیث مبارکہ میں پہلے نماز کا ذکر ہوا اور پھر بر الوالدین کا۔یہ گویا اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے''اَنِ اشکُرلِی وَلِوَالِدیکَ''۔[ع] اس لئے بعض علماء فرماتے ہیں کہ ماں باپ کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ پانچوں نمازوں کے بعد ان کے لئے دعا مانگی جائے۔

باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین

عن ابی درداء قال ان رجلا اتاه فقال ان لی امرأة وان امی تأمرنی بطلاقها فقال ابوالدرداء: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: الوالد اوسط ابواب الجنة فان شئت فاضع ذالك الباب او احفظه وربماقال سفیان "ان امی وربماقال": "ابی"۔(حدیث صحیح)

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے پاس ایک شخص نے آکر کہا کہ میری ایک بیوی ہے اور میری ماں اس کو طلاق دینے کا حکم دیتی ہے، تو ابودرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ والد جنت کے دروازوں میں سے بہتر دروازہ ہے پس اگر تو اسے ضائع کرنا چاہتا ہے تو ضائع کردو یا اس کی حفاظت کر۔سفیان بن عُیینہ کبھی والدہ اور کبھی والد نقل کرتے۔

لغات:۔قولہ "اوسط" درمیانہ، معتدل اور ممتاز کو کہتے ہیں۔قولہ "اَضِع" امر کا صیغہ ہے اَضاع سے۔تقول کے قانون کے مطابق بنا ہے یعنی اصل میں اضیع تھا یا کی حرکت جو کسرہ ہے ماقبل کو دیا پھر یاء التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کی گئی تو اَضع بن گیا۔

تشریح:۔اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ جنت کے دروازوں میں اوسط یعنی اعلیٰ اور بہترین دروازے ہیں، ان کی رضامندی اور خدمت ہی سے اس دروازے سے داخل ہونا ممکن ہوسکتا ہے۔جس

ع سورۃ لقمان آیت:۱۴۔

روایت میں لفظ ''امی'' اور ''ابی'' کا ذکر ہے تو وہ صراحتاً معلوم ہوا اور دوسرا اس پر قیاس ہوگا۔

اس حدیث سے ماں باپ کی حد درجہ اطاعت وفرمانبرداری کی تلقین وترغیب معلوم ہوتی ہے حتی کہ اپنی مرضی وخواہش کو بھی ماں باپ کی خواہش پر قربان کرنے کا حکم ہے خصوصاً جب ماں باپ سنجیدہ ہوں، چنانچہ اگر وہ مرضی کی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیں تو بھی ان کی اطاعت کرنی چاہئے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے پیغام طلاق چھوڑا تھا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس پر عمل بھی کیا جس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اسی طرح ترمذی ابوب الطلاق میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی گذری ہے:

"قال كانت تحتي امرأة أُحِبُّها و كان ابي يكرهها فامرني ان اطلقها فابيت فذكرتُ ذالك للنبي صلى الله عليه و سلم فقال: ياعبدالله بن عمرؓ طَلِّق امرأتك"۔

کیونکہ سنجیدہ ماں باپ کبھی بھی اولاد کو غلط مشورہ نہیں دیتے ہیں، لہٰذا ان کی اطاعت میں ضرور کوئی مصلحت ہوگی البتہ یہ ضابطہ بھی ملحوظ ہونا چاہئے کہ ''لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق''۔[1]

اگر ماں باپ ایسے الٹے سیدھے مطالبے کریں جن کو پورا کرنے سے خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو یعنی شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو ایسے میں اطاعتِ والدین جائز نہیں مثلاً بیوی پردہ کرتی ہے اور نیک صالح ہے اور ماں باپ پردہ کی وجہ سے اس کو نہیں چاہتے ہیں تو بیٹے کو دیکھنا چاہئے کہ اگر طلاق دینے سے بیوی کو تکلیف ہوتی ہو، اس کے دوسرے نکاح کا انتظام آسانی سے نہیں ہوسکتا ہو اور اس شخص کو خود بھی ایسی ہی مشکل درپیش ہو تو اسے طلاق سے بچنا چاہئے اور کوئی صورت بیچ کی اختیار کر لینی چاہئے، مثلاً ماں باپ سے کہے کہ میں سمجھادوں گا یہ ٹھیک ہوجائے گی وغیرہ۔ بہرحال ایسے میں اطاعت لازمی نہیں خصوصاً جب بیوی پر ظلم کا خطرہ ہو۔ لیکن اگر دونوں کا متبادل انتظام ہوسکتا ہو یا آدمی کا انتظام دوسرے نکاح کا تو نہیں ہوسکتا، لیکن وہ بیوی کے بغیر بھی رہ سکتا ہے اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر اطاعت مستحب ہے۔ غرض ماں باپ کو ایذارسانی سے بچانا واجب ہے۔ لہٰذا بیوی اگر ان کو ناجائز طریقہ سے ایذا پہنچاتی ہو تو طلاق واجب ورنہ نہیں۔ لہٰذا ماں باپ کے کہنے پر بیوی

باب ماجاء في الفضل في رضا الوالدين

[1] رواه احمد في مسنده ص: ۶۷۶ ج: ۱ حديث: ۳۸۷۹ ولفظه: لاطاعة لمخلوق في معصية الله عزوجل، ايضاً مصنفه عبدالرزاق ص: ۲۵۵ ج: حديث: ۳۷۹۸ كتاب الصلاة، ايضاً رواه ابن ماجه بحواله مصنفه عبدالرزاق۔

پر ظلم اور ناجائز دباؤ ڈالنا یا ایسی طلاق دینا جس سے عورت بُری حالت کا شکار اور ظلم میں گرفتار ہوتی ہو جائز نہیں۔

مسئلہ:۔ معارف القرآن میں ہے کہ جب کوئی چیز فرض عین یا واجب علی العین نہ ہو کفایہ کے درجہ میں ہو تو اولاد کے لئے وہ کام بغیر ماں باپ کی اجازت کے جائز نہیں، اس میں مکمل علم دین حاصل کرنا اور تبلیغ دین کے لئے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدر فرض علم دین جس کو حاصل ہو وہ عالم (متبحر) بننے کے لئے سفر کرے یا تبلیغ ودعوت کے لئے سفر کرے تو بغیر اجازت والدین کے جائز نہیں۔ (معارف ص:۴۵۳ ج:۵)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں والدین رشتہ کرنے پر راضی نہ ہوں تو اس رشتہ پر اصرار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جب والدین بنا بنایا رشتہ توڑ واسکتے ہیں تو ابتداءً رشتہ طے کرنے سے بطریقِ اولیٰ روک سکتے ہیں۔

دوسری حدیث:۔ "عن عبد الله بن عمرو عن النبی صلی الله علیه وسلم قال رِضا الرب فی رضا الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد"۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کی رضامندی والد کی خوشنودی میں ہے اور رب تعالیٰ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔[۲]

لغات:۔ "رِضا" بکسر الراء والف مقصورہ جبکہ ممدودہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے خوشی، رضامندی اور مرضی کے معنی میں آتا ہے۔ قولہ "سخط" بفتحتین بروزن شجر جبکہ بضم السین وسکون الخاء بھی استعمال ہوتا ہے اس کے معنی رضا کے برعکس ہیں یعنی ناگواری، غصہ اور ناراضگی کے۔

تشریح:۔ والد سے مراد "من لہ الولد" بھی لے سکتے ہیں پھر والدہ بھی اس فضیلت میں شامل ہوگئی یا پھر والدہ اس پر قیاس ہے کیونکہ دونوں کی رضا کی علت مشترک ہے، چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے والدین کو راضی رکھنے اور ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اس لئے جو شخص والدین کو راضی رکھے گا اور ان کی اطاعت کرے گا وہ درحقیقت اللہ کے حکم کی تعمیل کرے گا، گو کہ والدین کو راضی رکھنا ایک طبعی سا امر بھی ہے تاہم یہ جذبہ ایک وقت تک رہتا ہے پھر کمزور یا ختم ہو جاتا ہے، مثلاً اپنے بچے پیدا ہو گئے تو اب محبت کا رُخ والدین سے ان کی طرف مڑ جاتا ہے خصوصاً جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں اور الٹے سیدھے مطالبے کرنے لگیں ایسے میں ان کو خوش رکھنا

---

[۲] ایضاً رواہ البزار مجمع الزوائد ص:۱۷۵ ج:۸ حدیث: ۱۳۳۸۹ وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ طاعۃ اللہ طاعۃ الوالد ومعصیۃ اللہ معصیۃ الوالد، حوالہ بالا۔ الحنفی عفی عنہ

امر شرعی کی تکمیل ہی ہے ورنہ تو اہل مغرب ان کو گھروں سے نہ نکالتے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا اچھا خاصا فرمانبردار ہوتا ہے مگر والدین اپنی غیر سنجیدہ فرمائشوں سے اس کو نافرمانی پر گویا مجبور کرتے ہیں اس لئے والدین کو چاہئے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل اختیار نہ کریں جس سے اولاد میں نافرمانی کا بیج بویا جاتا ہے۔

باب ماجاء فی عقوق الوالدین

"عن عبدالرحمٰن بن ابی بکرة عن ابیه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: اَلا احدثکم باکبرالکبائر؟ قالوا: "بلیٰ یارسول اللّٰه" قال: الاشراك باللّٰه وعقوق الوالدین قال وَجَلَسَ وکان متکئاً قال وشهادة الزوراوقول الزور فمازال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقولها حتیٰ قلنالیته سکت"۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ اپنے والد (ابوبکرہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ کرامؓ نے فرمایا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم (سیدھے) بیٹھ گئے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے: فرمایا اور جھوٹی گواہی یا فرمایا جھوٹی بات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل یہ بات دُہرا رہے تھے یہاں تک کہ ہم (اپنے دلوں میں) کہنے لگے: کاش آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو جائیں۔ (کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھک رہے ہیں)۔

لغات:۔ "اکبرالکبائر" بڑے سے بڑے گناہ۔ قولہ "عقوق" بضم العین اصل میں "عق" سے مشتق ہے جو قطع اور شق یعنی پھٹنے کو کہتے ہیں چونکہ نافرمانی سے دونوں الگ الگ ہو جاتے ہیں، بیٹا ایک طرف اور ماں باپ دوسری جانب ہو جاتے ہیں اس لئے اس کے معنی نافرمانی کرنے اور تکلیف دینے کے بتاتے ہیں۔ پہلے گذرا ہے کہ برا ور صلہ، دونوں عقوق کے مقابل ہیں۔ قولہ "شھادۃ الزوراوقول الزور" اس میں لفظ "او" شک من الراوی کے لئے ہے، شہادت خاص ہے قول سے۔

تشریح:۔ کبائر، کبیرۃ کی جمع ہے کبیرہ گناہوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ اس حدیث میں ان کا احاطہ

نہیں کیا گیا ہے۔ کبیرہ گناہ کون سے اور کتنے ہیں اس کی تفصیل (تشریحات ترمذی ص ۴۸۸ ج ۱ "باب فی فضل الصلوٰۃ الخمس") میں گذری ہے ابواب الصلوٰۃ بعد بحث الاذان ملاحظہ ہو۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اہل علم نے کبائر کو معدود و محصور مانا ہے اور درجن بھر گناہوں کو کبیرہ کہا ہے جو مختلف احادیث میں مروی ہے مثلاً تین باب کی حدیث میں چوتھا اگلی حدیث میں، زنا، ربوا، قتل نفس ناحق طریقے سے، پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگانا، سحر اور جادو، یتیم کا مال کھانا، فرار عن الزحف، الحادفی الحرم، شراب پینا اور چوری کرنا وغیرہ۔

مگر بعض علماء ان کے منضبط و منحصر فی العدد کے قائل نہیں پھر ان کے مختلف اقوال ہیں:۔ کسی نے کہا کہ جس پر وعید آئی ہے وہ کبیرہ گناہ ہے۔ کسی نے کہا کہ جس گناہ پر اصرار کیا جائے وہ کبیرہ ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کہ کبیرہ وصغیرہ امور اضافیہ میں سے ہیں ہر گناہ اپنے ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے اور مافوق گناہ کی بنسبت صغیرہ ہے۔ علی ہذا سب سے زیادہ اور سب سے بڑا گناہ شرک ہے، کہ اس کے اوپر کوئی بڑا گناہ نہیں اور باقی گناہ حسب تفاوت کبائر ہیں پھر وہی کبائر اپنے مافوق کے بنسبت صغائر بھی ہیں۔

باب کی حدیث میں عقوق والدین کو شرک کے بعد دوسرے نمبر پر ذکر کرنے میں اس کی شناعت کی طرف اشارہ ہے، گویا کہ ماں باپ کے حقوق، حقوق اللہ کے بعد سب حقوق العباد پر مقدم ہیں چنانچہ ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں:

"جعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم برّالوالدین ثانی التوحید لقولہ "اکبر الکبائر الاشراک باللّٰہ ثم عقوق الوالدین "[1] وقولہ فی افضل الاعمال "الصلوٰۃ لمیقاتہا ثم برالوالدین "[2] جعلہ فی ضمن حق اللّٰہ فی حدیث آخر فقال رضاالرب فی رِضا الوالد و سخط الرب فی سخط الوالد"۔[3]

چونکہ حدیث کی اس ترتیبِ نزولی سے شہادۃ الزور کی اہمیت بظاہر کم ہونے کا اندیشہ تھا، کہ اس کو تیسرا درجہ دیا گیا اس لئے اس کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے بیٹھ گئے اور اسے

باب ماجاء فی عقوق الوالدین

[1] رواہ مسلم ص: ۶۴ ج: ۱ "باب الکبائر و اکبرھا" کتاب الایمان.

[2] رواہ البخاری ص: ۷۶ ج: ۱ کتاب مواقیت الصلاۃ، مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۹۹ ج: ۶ کتاب الادب.

[3] رواہ الترمذی والبزار کذا فی مجمع الزوائد ص: ۱۷۵ ج: ۸

بار بار تکرار کرتے رہے جیسے تاکید میں ہوتا ہے۔ اور محبوب کی بات چیت تو اگرچہ طوالت سے احسن بن جاتی ہے اور لذت میں اضافہ ہوتا ہے مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اطناب وتکرار سے مشقت وتکلیف اٹھانا پڑ رہی تھی اس لئے صحابہ کرامؓ نے خاموشی کی تمنا کی۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کبائر میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول کیا اپنے والدین کو بھی کوئی شخص گالی دیتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' ایک آدمی دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور یہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔

لغات:۔ سبّ اور شتم میں بعض حضرات کے نزدیک ترادف ہے، دونوں کے معنی گالی گلوچ کرنے کے ہیں۔ مگر بعض اہل لغت نے یہ فرق کیا ہے کہ سبّ عام ہے ہر طرح بُرے بھلے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کا حصہ مسجد میں سے مت روکو اگر وہ اجازت چاہیں، تو ان کے صاحبزادے بلال نے فرمایا ''واللّٰہ لَنَمنعھُنّ وفیہ... فاقبل علیہ عبداللّٰہ فسبّہ سبًّا ماسمعتُ سبہ مثلہ قط''۔ (رواہ مسلم[۱]) جبکہ ''شتم'' خالص گالیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

تشریح:۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے ذہن میں یہ بات تھی کہ شائد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماں باپ کو براہِ راست اور روبرو گالی کی بات فرما رہے ہیں، اس لئے ان کو تعجب ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ایسا کون ہوسکتا ہے کہ جو اپنے ماں باپ کو براہِ راست گالیوں کا نشانہ بنائے۔ آج کل تو یہ چیز اور یہ صورت بھی واقع ہے مگر اس وقت یہ بہت مستبعد تھا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ آدمی جب دوسرے کے ماں باپ کی توہین کرتا ہے تو یہ اس کے اپنے ماں باپ کی تذلیل کا ذریعہ بنتا ہے اور یہی چیز دراصل گالی دینے کے برابر ہے۔ (تشریحات ترمذی جلد سوم ص: ۲۶۷) پر ابن العربیؒ کے استاذ ابوبکر الشاشی کا یہ قول گذرا ہے کہ ''کل من رضی فی الشریعۃ بالسبب حُکم علیہ انہ رضی بالمسبب اِلامن نام فی رمضان فاحتلم'' یعنی جو سبب پر راضی ہوا اسے مسبب پر راضی سمجھا جائے گا سوائے احتلام کے۔ انظر (باب

---

[۱] صحیح مسلم ص: ۱۸۳ ج: ۱ "باب خروج النساء الی المساجد الخ" کتاب الصلاۃ.

ماجاء فی من استقاء عمداً) تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب میں براہِ راست سبّ وشتم کی نفی نہیں فرمائی جس میں یہ اشارہ مقصود ہے کہ خیر القرون میں اگر چہ یہ صورت مستبعد ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوگا۔

مسئلہ:۔اس حدیث مبارکہ سے سد ذرائع کا اصول بھی معلوم ہوا جو اسلام کے زرین اصولوں میں سے ایک ہے ہمارے حنفیہ کے یہاں اگر چہ اس کی اتنی زیادہ رعایت نہیں کی جاتی۔مگر مالکیہ کے نزدیک اس کی بہت اہمیت ہے اور ہونی بھی چاہئے کیونکہ بقول ابن العربیؒ کے اہل کتاب اس اصول سے لاپرواہی کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئے۔آج کل چونکہ ہوس پرستی کا لیول کافی اونچا ہے اس لئے علماء کو اس اصول پر سختی سے عمل بھی کرنا چاہئے اور اپنے فتاوی مرتب کرنے میں اس کو ملحوظ بھی رکھنا چاہئے۔

باب ماجاء فی اکرام صدیق الوالد

"عن ابن عمرؓ قال:سمعتُ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اِن اَبرّالبرِّان یَصِلَ الرجل اھلَ وُدِّابیہ"۔(صحیح)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نیکیوں میں سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ نیک سلوک کرتا رہے۔

لغات:۔قولہ "ابرالبر" پہلا صیغہ اسم تفضیل کا ہے اور دوسرا مصدر ہے۔نیز پہلا لفظ بفتحتین اور دوسرا بکسرتین پڑھا جائے گا۔قولہ "وُدِّ" بضم الواو وتشدید الدال محبت ومودۃ کو کہتے ہیں،یعنی باپ سے محبت کرنے والے جو محاورہ میں دوست کہلاتے ہیں اوپر ترجمہ میں یہی مختصر ترجمہ کیا گیا ہے۔

تشریح:۔شریعت مطہرہ کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے اچھا سلوک کرتے رہے لیکن یہ طرزِ سلوک چونکہ بڑے پیمانے پر تو مشکل ہے کیونکہ اکثر لوگ اجنبی ہوتے ہیں۔پھر مزاجوں میں بھی فرق بلکہ کبھی کبھی منافرت پائی جاتی ہے، جیسے دارحرب اور دار اسلام کے لوگ باہم محبت نہیں کرتے۔اس لئے کم از کم اس حد تک ان تعلقات کو خوشگوار بنانے اور ان میں بہتری لانے کا حکم ہوا جو یا کسی خونی رشتے کی بناء پر ہیں یا کسی اور قدر مشترک کی بناء پر۔پھر یہ بھی ضابطہ ہے کہ جب تعلق بن جائے تو حتی الامکان اسے توڑنا نہیں چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ طلاق بصورت شدید ضرورت مباح تو کر دی گئی ہے مگر تمام مباحات میں اسے مبغوض ترین قرار دیا گیا ہے کہ اس سے بنا بنایا تعلق ختم اور رشتے کی عمارت مسمار ہو جاتی،

ہے۔ چونکہ دوستانہ تعلق بھی ایک گونہ رشتے کی مانند ہے کہ جس طرح رشتے سے لوگ بلکہ اجانب ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں اسی طرح دوستانہ تعلقات سے دوست آپس میں شیر وشکر بن جاتے ہیں۔ اور اچھا تعلق بھی ایک نیکی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''احب الاعمال الی اللہ ادومھا وان قلّ'' (رواہ البخاری ومسلم[1])

اس لئے دوستانہ تعلقات کو بھی جاری وباقی رکھنا مطلوب ہے اور یہ شرافت کا بھی تقاضا ہے کہ اشراف اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ہمیشہ رکھتے ہیں، تو جس طرح قطع رحم جائز نہیں اور ماں باپ کے عزیز واقارب کا رشتہ محفوظ رکھنا لازمی ہے اسی طرح ان کے دوستوں کے ساتھ قطع تعلق بھی جائز نہیں اور یہ حکم حسب مراتب سب کو شامل ہے، علی ہذا اپنے ماں باپ کے تعلقات والوں کے ساتھ، اپنے تمام رشتہ داروں، اساتذہ ومشائخ اور اپنی بیوی وغیرہ سب کے متعلقین کا خیال رکھنا چاہئے۔ ابن العربیؒ نے عارضہ میں ایک حسن حدیث کی تخریج کی ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا:

''ھل بَقِیَ علیّ من برّ والدیّ شئی ابرّھما بعد وفاتھما؟ قال: نعم الصلوٰۃ علیھما، والاستغفار لھما وانفاذ عھدھما واکرام صدیقھما وصلۃ الرحم التی لا توصل الا بھما''۔[2]

لہٰذا بعد الموت بھی والدین کا حق باقی رہتا ہے۔

باب ماجاء فی بر الخالۃ

''عن البرآء بن عازب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الخالۃ بمنزلۃ الام''۔

باب ماجاء فی اکرام صدیق الوالد

[1] صحیح بخاری ص:۹۵۷ ج:۲ ''باب القصد والمداومۃ علی العمل'' کتاب الرقاق، صحیح مسلم ص:۲۶۶ ج:۱ ''باب فضیلۃ العمل الدائم الخ'' کتاب الصلوۃ، سنن نسائی ص:۱۲۴ ج:۱ کتاب القبلۃ، ابن ماجہ ص:۳۱۲ کتاب الزھد، ایضاً رواہ ابوداؤد فی صلاۃ التطوع واحمد فی مسندہ، المعجم المفھرس ص:۱۶۱ ج:۲ دار الدعوۃ، استنبول.

[2] رواہ ابوداؤد ص:۳۵۳ ج:۲ ''باب فی بر الوالدین'' کتاب الادب، ایضاً سنن ابن ماجہ ص:۲۶۰ و ۲۶۱ ''باب صل من کان یصل ابوک'' کتاب الادب، ایضاً الترغیب والترھیب ص:۲۲۲ ج:۳ ''الترغیب فی بر الوالدین'' دار الکتب العلمیۃ بیروت. الحنفی غفرلہ ولوالدیہ

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خالہ ماں کی مانند ہے۔

تشریح:۔خالہ کو ماں کی مانند قرار دینے کا مطلب تقریباً وہی ہے جیسا کہ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے"العم صِنوُابیہ" [1] اور عقلی وطبعی اعتبار سے بھی یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جب اصل ایک ہی ہوتو فروع میں کوئی خاص تفاوت نہیں ہوتا ہے۔تو جس طرح ایک درخت کی دوشاخیں صنوان کہلاتی ہیں اوران کی جڑ اوراصل ایک ہی ہوتی ہے اس لئے بہت سے احکام میں وہ دونوں شریک ہوتے ہیں۔اسی طرح ماں اور خالہ بھی ہیں لہٰذایہ بھی کافی سارے احکام میں شریک ہیں۔اور جس طرح چچا عصبہ ہے اسی طرح خالہ کو حضانت کا حق حاصل ہے۔علیٰ ہذاجب بچے کی ماں فوت ہوجائے تو پرورش کے ایام میں وہ خالہ کے پاس رہے گا تاکہ وہ اس کی دیکھ بھال کرتی رہے۔کیونکہ باقی عورتوں میں ماں جیسی شفقت نہیں پائی جاتی ہے۔جبکہ بچے کو مادری شفقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو صرف خالہ میں ہوتی ہے۔

قولہ"وفي الحديث قصة طويلة" حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی یہ طویل حدیث جس کی طرف امام ترمذیؒ نے اشارہ کیا ہے(بخاری شریف ص۶۱۰ جلد دوم) میں مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد عمرۃ القضاء سے فارغ ہوکر واپس جانے لگے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے"یاعم یاعم" کہتی ہوئی چل پڑی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا"دونكِ ابنة عمكِ"یعنی اپنی چچازاد کو پکڑو اور سنبھال کر رکھو چنانچہ انہوں نے اٹھالیا،مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت جعفر اور حضرت زید(بن حارثہ) رضی اللہ عنہما نے بھی حقِ حضانت کا دعویٰ کیا کہ اس کی پرورش کا حق ہمیں ہی حاصل ہے،حضرت علی رضی اللہ نے یہ دلیل پیش کی کہ میں نے اسے پہلے لیا ہے اور وہ میری چچازاد بھی ہے،حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چچازاد تو میری بھی ہے مگر اس کے ساتھ میری بیوی اس کی خالہ بھی ہے،اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے بھائی کی بیٹی ہے(کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مابین مواخاۃ فرمائی تھی)"فقضیٰ بھاالنبی

باب ماجاء في بر الخالة

[1] رواه مسلم ص:۳۱۶ ج:۱ كتاب الزكوٰة، سنن ابى داؤد ص:۲۳۶ ج:۱ "باب فى تعجيل الزكوٰة" كتاب الزكوٰة، مسند احمد ص:۱۵۱ ج:۱ حديث:۷۲۷.

صلی اللّٰہ علیہ و سلم لِخالتھاو قال الخالۃ بمنزلۃ الام ''(چنانچہ وہ حضرت جعفرؓ کی بیوی کی پرورش میں آئی) حدیث کا مزید حصہ دیکھنا ہوتو (بخاری شریف جلد۲ باب عمرۃ القضاء الخ میں ملاحظہ فرمائیں۔

حدیث آخر:۔"عن ابن عمررضی اللّٰہ عنھماان رجلاًاتی النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم فقال یارسول اللّٰہ انی اصبت ُذنباً عظیماً"الخ۔

یعنی ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگا اے اللہ کے رسول! میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے تو کیا میری توبہ ہوسکتی ہے؟ یعنی قبول ہوسکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیری کوئی خالہ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس اس کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

تشریح:۔ اس گناہ کو عظیم کہنے کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:۔ ایک یہ کہ وہ گناہ صغیرہ تھا مگر نفوس قدسیہ پر صغائر کا بھی انتہائی بوجھ اور ثقل محسوس ہوتا ہے اس لئے اسے عظیم سے تعبیر کیا۔ دوسرا یہ کہ ممکن ہے کہ وہ بذات خود بڑا گناہ ہو جو بظاہر قطع رحمی کی صورت میں تھا، اس لئے اس کے تدارک کے لئے صلہ رحمی سے علاج کا طریقہ بتلایا۔ اور اگر کوئی دوسرا گناہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کے ازالے کا یہ طریقہ اس صحابی کی خصوصیت ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عام ہو کیونکہ بڑی نیکی سے کبیرہ گناہ کم یا ختم ہوجاتا ہے جس کی کچھ تفصیل ''باب ماجاء فی ثواب الحج والعمرۃ'' میں (تشریحات ترمذی جلد سوم ص۴۱۲) پر گذری ہے اور کچھ تذکرہ ''باب ماجاء فی فضل الطھور (تشریحات ترمذی جلد اول ص۷۱) پر بھی گذرا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام نیکیوں سے صغائر تو معاف ہوجاتے ہیں لیکن کیا کبائر بھی معاف ہوجاتے ہیں؟ تو متقدمین سے اس بارے میں کوئی تفصیل مروی نہیں۔ عام متاخرین کہتے ہیں کہ کبائر کے لئے توبہ شرط ہے۔ تاہم بعض حضرات کے نزدیک بڑی نیکی سے بھی کبیرہ معاف ہوسکتا ہے، بشرطیکہ وہ حقوق سے اور خاص کر حقوق العباد سے متعلق نہ ہو کیونکہ اس کے لئے معافی یا تلافی بھی شرط ہے۔

اشکال:۔ حدیث باب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس صحابی کو شدید ندامت لاحق ہوگئی تھی اور اصل توبہ تو ندامت سے عبارت ہے تو پھر خالہ سے حسن سلوک پر عفو کیوں مشروط کیا گیا؟ حالانکہ توبہ سے تو بالاتفاق ہر گناہ معاف ہوجاتا ہے۔

حل:۔ اولاً تو توبہ بھی کبھی مشروط بشرط ہوسکتی ہے کیونکہ اللہ تعالی پر کوئی چیز واجب تو ہے نہیں لہٰذا وہ

قبولِ توبہ کے پابند نہیں وہ رد بھی کرسکتا ہے اور مؤخر بھی کرسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوا ہو کہ ان کی قبولیتِ توبہ کی شرط یہ ہے کہ وہ والدین یا خالہ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

ثانیاً ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا گناہ معاف ہوا تھا مگر پھر بھی خالہ کے ساتھ برّ ونیکی کا حکم دیا تاکہ تصفیۂ قلب مکمل طور پر ہو جائے جیسے بعض صحابہ گناہ کے بعد توبہ کے ساتھ صدقہ بھی دیا کرتے تھے تاکہ گناہ سے جو میل دل پر آتا ہے اس کا مکمل ازالہ ہو اور روحانی کیفیت جلد بحال ہو جائے۔

قولہ "هل لك من ام" اس میں لفظ "من" تبعیض کے لئے بھی ہوسکتا ہے لہٰذا پھر لفظ ام نانی کو بھی شامل ہوگا۔ جبکہ بعض روایات میں "والدین" بصیغہ تثنیہ آیا ہے[۲] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ "من" زائدہ ہو پھر مطلب یہ ہوگا "اَلَكَ ام" بہرحال اس حدیث سے خالہ کا مقام معلوم ہوا کہ وہ والدہ کی قائم مقام ہے۔

باب ماجاء فی دعاء الوالدین

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ثلاث دعوات مستجابات لاشك فيهن دعوة المظلوم ودعوة المسافر ودعوة الوالد على ولده"۔[۱]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین دعائیں ایسی ہیں جن کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں (یعنی ضرور قبول ہوتی ہیں) مظلوم کی دعا، مسافر کی دعا اور والد کی بددعا اولاد کے حق میں۔

لغات:۔ "دُعــاء" اگرچہ لغت میں مطلق پکارنے کے معنی میں آتا ہے مگر اصطلاح میں اس پکار کو کہا جاتا ہے جس میں اللہ عزوجل کی مدد مانگی جاتی ہے۔ اس کے صلہ میں اگر لام آجائے تو بمعنی نیک دعاء کے آتا ہے جیسے دعا لہ، اور اگر صلہ میں علی آجائے جیسے دعا علیہ تو بمعنی بددعاء کے آتا ہے۔ امام ترمذیؒ نے ترجمہ میں مطلق چھوڑا کیونکہ دعوۃ الوالد اگرچہ علی کے ساتھ آیا ہے لیکن باقی دونوں میں صلے مذکور نہیں اگرچہ مظلوم کی دعا سے بھی

---

[۲] كذا فى المستدرك للحاكم ص: ۱۸ ج:۵ "كتاب البر والصلة" حديث: ۷۲۱۹، ايضاً رواه ابن حبان فى صحيحه بحواله الترغيب والترهيب ص: ۲۲۲ ج:۳.

باب ماجاء فى دعاء الوالدين

[۱] الحديث اخرجه ابن ماجه ص: ۲۷۵ "باب دعوة الوالد ودعوة المظلوم" كتاب الدعاء، ايضاً مسند احمد ص: ۲۴ ج:۳ حديث: ۸۳۷۵ ايضاً ص: ۱۷۲ ج:۳.

بظاہر بددعا ہی مراد ہے، دعا کی جمع ادعیہ آتی ہے۔

تشریح:۔اس روایت میں ان تینوں دعاؤں کی قبولیت کی تصریح ہے۔ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اگرچہ مجہول ہے لیکن اصول اس کی تائید کرتے ہیں''والحدیث مجهول وربما شهدت له الاصول ابو جعفر المؤذن راویه عن ابی هریرة لایعرف ''امام ترمذیؒ نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔تاہم امام سیوطیؒ نے الجامع الصغیر میں اس کے کثرت طرق کا دعوی کیا ہے۔ترمذی''باب ماجاء فی کراھیة اخذ خیار المال فی الصدقة''ابواب الزکوٰۃ میں ابن عباسؓ کی صحیح حدیث گذری ہے کہ نبی علیہ السلام نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تھا تو ان کو جو ہدایات دی تھیں ان کے اخیر میں ہے''واتق دعــوة المظلوم فانها لیس بینها و بین الله حجاب ''اس پر مسند احمد کی روایت میں یہ بھی اضافہ ہے''وان کان کافراً ''[۲] یعنی مظلوم کی بددعا بہرحال قبول ہوتی ہے گو کہ وہ ایسے اعمال کا ارتکاب کر چکا ہو جو دعا کی قبولیت سے مانع ہوں۔تاہم اگر مظلوم فاسق یا کافر ہو تو دعا کی قبولیت سے مراد حصول مطلوب ہوگی نہ کہ مقصود اصلی جو کہ اکرام اور اللہ کی رضا ہے۔(انظر تشریحات جلد:۳ص:۴۶)

بہرحال یہ طے ہے کہ جو دعا دل کی جتنی گہرائی اور بے بسی کے عالم میں ہوگی اتنی ہی زیادہ قابل قبول ہوگی، چونکہ مظلوم بے بس ہوتا ہے اور اللہ کے سوا اپنا کوئی سہارا نہیں دیکھتا وہ تمام اسباب سے کٹا ہوا ہوتا ہے اس کی آخری امید اللہ کی ذات سے وابستہ ہوتی ہے اور یقیناً ایسے میں اللہ عزوجل ضرور مدد کرتا ہے۔اسی طرح مسافر بھی اجنبیت کے عالم میں اللہ کو پکارتا ہے جو بے بسی کا اظہار ہے۔رہا والد تو ہر ایک جانتا ہے کہ جب تک ماں باپ کو اولاد سے خیر و بھلائی کی توقع ہوتی ہے اس وقت تک وہ اولاد کے حق میں ترقی کی دعائیں مانگتے ہیں مگر جب اولاد نافرمانی کی حد کراس کرتی ہے تو ناامید ہو کر ماں باپ اس سے جان چھڑانے کے لئے اللہ سے دعا مانگنے لگتے ہیں جو قبول ہوتی ہے۔اور چونکہ ماں باپ کی نیک دعا بھی اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہے مگر نیک دعا اور بددعا میں واضح فرق ہے کہ اول الذکر حالت اختیار میں ہوتی ہے جبکہ ثانی الذکر حالت اضطرار میں ہوتی ہے اس لئے حدیث میں اسی کی تخصیص کی گئی کیونکہ یہاں ان دعاؤں کا ذکر مقصود ہے جو بہرحال قبول ہوتی ہیں نفس قبولیت کا تذکرہ مقصود نہیں ہے۔(تدبر)

---

[۲] مسند احمد ص:۶۲۳ ج:۳ حدیث:۱۲۱۴۰ وفی روایة: دعوة المظلوم مستجابة وان کان فاجراً ففجوره علی نفسه مسند احمد ص:۵۶ ج:۳ حدیث:۸۵۷۷.

باب ماجاء فی حق الوالدین

"عن ابی ھریرة قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: لایجزی وَلَدٌ والداً اِلّا ان یجدہ مملوکاً فیشتریه فیعتقه"۔ (حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی اولاد اپنے باپ کا بدلہ نہیں دے سکتی الا یہ کہ اسے غلام پائے اور اس کو خرید کر آزاد کر دے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں اور اس سے سابقہ باب کی حدیث میں والد کے لفظ سے حکم کو باپ تک محدود نہ سمجھا جائے کیونکہ والد بمعنی "من لہ الولد" بھی آتا ہے جو ماں کو بھی شامل ہے۔ اسی طرح ولد کے لفظ سے صرف بیٹا ہی مراد نہ لیا جائے کیونکہ ولد بمعنی مولود بھی آتا ہے جس کا اردو ترجمہ اولاد کے ہے۔

اولاد پر ماں باپ کے حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں:۔ ایک زندگی اور حیات کا سبب بننا۔ دوم تربیت و پرورش۔ جہاں تک تربیت و پرورش کا تعلق ہے تو اگرچہ اس احسان کا بدلہ ہو بہو اسی شکل میں چکانا تو ممکن نہیں تاہم ان کی خدمت کر کے بطور جزا بالمثل کے ممکن ہے لیکن پہلے احسان کا بدلہ خدمت سے کہاں ممکن ہے؟ یہ تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ وہ غلام ہوں اور ان کو خریدا جائے تاکہ وہ غلامی سے آزاد ہوں، چونکہ غلامی بھی ایک قسم کی موت ہے اس لئے گویا یہ بھی جزاء بالمثل کی طرح بدلہ شمار کیا گیا۔

قولہ "فیعتقه" اس میں اعتاق کی نسبت بیٹے کی طرف کی گئی ہے جس سے بعض اہل ظواہر نے یہی سمجھا کہ خریدنے کے بعد بطور استیناف کے عتاق کی ضرورت ہوگی نفس ملک میں آنے سے وہ آزاد نہ ہوگا۔ مگر ائمہ اربعہ فرماتے ہیں کہ باپ ہو یا کوئی بھی ذی رحم محرم وہ ملک میں آتے ہی خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ یہاں نسبت سبب کی وجہ سے کی گئی کہ بیٹا اس کی آزادی کا سبب بن گیا ہے۔ جمہور کا مستدل اس حدیث سے ہے "من ملك ذارحم محرم فهو حر" (رواہ ابوداؤد ص ۵۵۰ ج ۲، باب فیمن ملک ذارحم محرم، ابن ماجہ ص ۱۸۱، ولفظہ للترمذی وغیرہ)

باب ماجاء فی قطعیۃ الرحم

”عن ابی سلمة قال اشتکیٰ ابوالدرداء فعاده عبدالرحمٰن بن عوف فقال: خیرهم واوصلهم ماعلمت ابومحمد، فقال عبدالرحمٰن سمعتُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: قال اللّٰه تبارك وتعالیٰ: أنااللّٰه وأناالرحمٰن خلقتُ الرحم وشققتُ لهامن اسمی فمن وصلهاوصلته ومن قطعهابتتّه“۔[1]

ابوسلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداءؓ بیمار ہوئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ عیادت کرنے ان کے پاس گئے، ابودرداءؓ نے فرمایا کہ میرے علم کے مطابق ابومحمد سب سے بہتر اور سب سے زیادہ تعلق گذار ہیں تو عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا: کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: کہ میں اللہ ہوں، اور میں رحمٰن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اس کا نام اپنے نام پر رکھا ہے (یعنی اپنے نام رحمٰن کے مطابق وہمنام) پس جو شخص اس کو جوڑے گا میں بھی اسے (اپنی رحمت سے) جوڑوں گا اور جو اس کو کاٹے گا میں بھی اس کو (اپنی رحمت سے) کاٹوں گا۔

ترکیب:۔ ”فقال“ کی ضمیر ابودرداء کی طرف لوٹتی ہے۔ ”خیرهم واوصلهم“ معطوف علیہ ومعطوف مل کر مبتدأ ہے اور ”ابومحمد“ خبر ہے جو عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی کنیت ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ”ابومحمد“ کو مبتدأ مؤخر بنا کر ”خیرهم واوصلهم“ کو خبر مقدم مانا جائے۔ بناہر دو تقدیر ”ماعلمت“ جملہ معترضہ ہے، جس کی وجہ آگے تشریح میں آرہی ہے۔

لغات:۔ قوله ”اشتکیٰ“ شکایت کرنے اور بیمار ہونے کے معنی میں آتا ہے اور یہاں یہی بیمار ہونے کے معنی مراد ہیں۔ شَکَا یشکو نصر ینصر سے بمعنی بیماری کی تکلیف محسوس کرنے کے آتا ہے۔ قوله ”الرحم“ ر،ح،م، مادہ میں شفقت کے معنی پائے جاتے ہیں اصطلاح میں بچہ دانی کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد قرابت کا رشتہ ہے یعنی خونی رشتہ خواہ محارم ہوں جیسا کہ بعض کی رائے ہے یا مطلق رشتہ دار ہوں جیسا کہ بعض دیگر کا خیال

باب ماجاء فی قطعیة الرحم

[1] اخرجه ابوداؤد ص: ۲۴۵ ج: ۱ ”باب فی صلة الرحم“ کتاب الزکوٰة، ایضاً الترغیب والترهیب ص: ۲۲۹ ج: ۳ دارالکتب العلمیة بیروت.

ہے۔ قولہ "بتّہ" بَتَّ الشئ بتوتا بمعنی منقطع ہونے کے ہیں جبکہ بَتَّتَ متعدی استعمال ہوتا ہے یعنی بمعنی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے۔

تشریح:۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے موقعہ پر جب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ عیادت کی غرض سے ان کے پاس تشریف لائے یہ تمجیدی کلمات ارشاد فرمائے کیونکہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے یا تو کسی دور کی قرابت کا خیال رکھتے ہوئے عیادت فرمائی۔ یا پھر محض مواخاۃ اسلامی اور دوستانہ تعلقات کی بناء پر عیادت کی چونکہ ایسا شخص جو عام سے رشتے کی اتنی قدر کرتا ہو اقربہ کا یقیناً قدرداں ہوتا ہے اس لئے حضرت ابودرداءؓ نے اس پر ان کی تعریف فرمائی۔ تاہم بیچ میں "ماعلمت" کا اضافہ کر کے تعلیمات نبوی پر عمل کر کے دائرہ مدح وتعریف کے اندر اندر رہے کیونکہ کسی کی ایسی تعریف نہیں کرنی چاہئے جو آدمی کے علم میں نہ ہو۔ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے منہ پر تو بہت زیادہ تعریفیں کرتے ہیں لیکن دل میں اور غائبانہ طور پر اس کی تصدیق کرنے کو تیار نہیں ہوتے ہیں، دوسری طرف عُجب اور خودنمائی کے شوق کے شکار کو ایسے کلمات سے نوازنا جو اس کے مرتبے سے زیادہ ہوں زہر آلود شہد کی مانند ہے، بخاری شریف میں حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص نے دوسرے کی تعریف کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ارے تم نے تو اس کی گردن کاٹ ڈالی کئی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کو دہرایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے اگر کوئی کسی کی تعریف کرنا چاہے تو "احسبُ فلاناً" کہہ دے یعنی تعریف میں یہ کہے کہ میرے علم کے مطابق یہ شخص ایسا ہے "باب اذ زکیٰ رجل رجلا کفاہ" اور "باب ما یکرہ من الاطناب فی المدح ولیقل مایعلم"۔ (ص:۳۶۶ ج:۱)

ان تعریفی کلمات کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے مذکورہ حدیث قدسی بیان فرمائی۔ قولہ "خلقتُ الرحم" اگر رحم سے مراد بچہ دانی ہو تو پھر خلق بمعنی ایجاد کے ہے یعنی میں نے رحم کو وجود بخش کر اس کو جسم بنایا اور اگر بمعنی قرابت کے ہو تو پھر خلق بمعنی تقدیر کے ہے یعنی میں نے قرابتیں مقرر و مقدر کی ہیں۔

قولہ "وشققتُ لہامن اسمی" ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ بعض ملحدین نے اس سے اللہ اور رحم کے درمیان نسب ثابت کیا ہے جو سراسر غلط ہے کیونکہ یہاں مراد تشبیہ دینا مقصود ہے جیسے اللہ کو بھی عالم کہا جاتا ہے اور بندے کو بھی حالانکہ دونوں کے درمیان کوئی نسب اور مماثلت نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ نے رحم کے اندر شفقت اور باہمی محبت ڈالی ہے، جو رحمن ذات کی رحمت سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی علی ہذا یہ محض اسمی مشارکت

ہے نہ کہ معنوی۔ ہاں اسم کا اثر ہوتا ہے اور اپنے معنی سے مناسبت بھی ہوتی ہے جو یہاں موجود ہے۔ (تدبر)

قولہ "فمن وصلها وصلتة" یعنی جو شخص قرابت کی رعایت کرے گا، تو میں اس کو پورا ثواب دوں گا اور جو اس میں کوتاہی کرے گا تو میں اس کو ثواب سے محروم کردوں گا۔

اس حدیث مبارکہ سے صلہ رحمی کی تاکید اور اسے نظر انداز کرنے پر وعید معلوم ہوتی ہے۔ بخاری شریف میں ہے "لایدخل الجنة قاطع" [۲] قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا یہ روایت اگلے باب میں بھی آرہی ہے۔ جبکہ صلہ رحمی سے آخرت اور دنیا دونوں اعتبار سے برکات کا نزول ہوتا ہے۔ دنیا میں خوشی اور عزت اور دولت اور موت کے بعد دیر تک شہرت وذکر خیر نصیب ہوتا ہے اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور جنت ملتی ہے۔ مزید تفصیل اگلے باب میں۔

اخیر میں امام ترمذیؒ نے معمر کے طریق کو غلط قرار دیا ہے جس میں ابوسلمہؓ اور ان کے والد عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے درمیان ردّاد کا واسطہ بڑھایا ہے "وفیه مافیه"۔

باب ماجاء فی صلة الرحم

"عن عبدالله بن عمرو عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا قطعت رحمه وصلها"۔ [۱] (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص نہیں ہے جو صلہ رحمی کے بدلے میں صلہ رحمی کرے بلکہ (درحقیقت) صلہ رحمی کرنیوالا وہ شخص ہے کہ اس کا رحم کاٹا جائے تو وہ اسے جوڑ دے، یعنی جب اس سے تعلق منقطع کیا جائے تو یہ اسے بحال کرے۔

لغات:۔ "صِلة" اصل میں وصلاً تھا لہٰذا اس میں ہاء واوِ محذوفہ کے عوض میں آیا ہے جیسے عدة۔ قولہ "الواصل" باب کی اگلی روایت میں قاطع کا لفظ آرہا ہے جس کے مطلب میں امام سفیانؒ نے فرمایا یعنی قاطع الرحم

[۲] صحیح بخاری ص:۸۸۵ ج:۲ "باب اثم القاطع" کتاب الادب، صحیح مسلم ص:۳۱۵ ج:۲ "باب صلة الرحم وتحریم قطعیتها" کتاب البر والصلة، ایضاً الترغیب والترهیب ص:۲۳۳ ج:۳، ابوداؤد ص:۲۴۵ ج:۱ کتاب الزکوٰة.

باب ماجاء فی صلة الرحم

[۱] الحدیث اخرجه البخاری ص:۸۸۶ ج:۲ "باب لیس الواصل بالمکافی" کتاب الادب وابوداؤد ص:۲۴۵ ج:۱ "کتاب الزکوٰة" الترغیب والترهیب ص:۲۳۱ ج:۳.

لہذا یہاں واصل الرحم مراد ہو یعنی صلہ رحمی کرنے والا۔ قولہ ''المُکافی'' بروزن مُجازی لفظاً ومعناً کافأ یکافئُ مُکافأۃً کے معنی بدلہ دینے کے ہیں۔

تشریح:۔ اس ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ احسان کے بدلے میں احسان کرنا اور اچھے تعلقات کے ردعمل میں اچھے تعلقات اور نیک سلوک سے پیش آنا تو ہر آدمی کا کام ہے یہ تو ادنیٰ شخص بھی کرسکتا بلکہ کرتا ہے یہ کوئی اتنی باکمال شخصیت کا کارنامہ نہیں۔ اصل اور کامل واصل وہ شخص ہے جس سے ناطہ توڑا جائے اور یہ اسے دوبارہ وسہ بارہ پھر بحال کرتا رہے۔

دوسری حدیث:۔ ''لایدخل الجنة قاطع'' ای قاطع رحم [۲] اس کا ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ قطع رحمی کرنے والا شخص جنت میں نہیں جائے گا۔ شارحین نے اس کے متعدد مطالب بیان کئے ہیں۔

(۱) جو شخص قطع رحمی کو حلال سمجھتا ہے تو چونکہ حرام کو حلال سمجھنے والا دائرہ ایمان سے خارج ہوتا ہے اس لئے وہ جنت میں نہیں جائے گا لہٰذا یہ عدم دخول مؤبد ودائمی ہے۔

(۲) یہ سابقین کے ساتھ نہیں جائے گا یعنی بقدر گناہ عذاب چکھنے کے بعد جائے گا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی عرف شذی والی توجیہ بھی اس کے قریب ہے یعنی جب تک وہ اس وصف سے موصوف ہوگا تو جنت میں داخل نہ ہوسکے گا مگر جب عذاب سے پاک ہوگا تو پھر یہ گناہ اس کے ذمہ نہیں رہے گا۔ (۳) یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خاصیتِ مفرد کا بیان ہو یعنی قطع رحمی کی اپنی خاصیت وتاثیر جنت سے روکنا ہے گو قیامت کے دن فیصلہ مجموعہ اعمال پر ہوگا۔ پہلے دو جواب حاشیہ پر ہے۔ جبکہ تیسرا جواب امام راغبؒ کے مفرداتِ قرآن کے ضابطے پر مبنی ہے۔

باب کی دونوں ارشادات سے صلہ رحمی کی تاکید معلوم ہوئی۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی کی وجہ سے نسب یاد رکھنا واجب ہے۔

صلہ رحمی کرنے کا طریقہ:۔ فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے رشتہ داروں سے قریب رہتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ حسب استطاعت کبھی کبھار ان کو تحفہ وہدیہ بھیجا کرے، ان سے ملنے کے لئے جائے۔ اگر ہدیہ کی طاقت نہ ہو تو نفس زیارت کے لئے ضرور جائے، اگر اس کے لائق کوئی خدمت ہو تو اسے بخوشی قبول کرے۔ اگر وہ اقارب سے دور رہتا ہو تو خط وکتابت کا رابطہ رکھنے سے بھی یہ حق ادا ہوجائے گا۔ آج

---

[۲] کمافسرہ سفیان قال سفیان یعنی قاطع رحم الترغیب والترہیب ص: ۲۳۳ ج: ۳.

کل فون کی سہولت نے اس مقصد کے حصول کو اور بھی آسان بنا دیا ہے۔اس کے برعکس جو آدمی نہ ان سے ملتا ہے نہ ہدیہ بھیجتا ہے اور نہ ہی کوئی رابطہ رکھتا ہے تو وہ صلہ رحمی کو توڑتا ہے۔(تنبیہ الغافلین ص:۵۰)

غرض اپنے رشتہ داروں سے ملنا، ان کی ایذا رسانی پر صبر کرنا، ان کی خدمت کرنا، ان کی خیرخواہی کا جذبہ رکھنا اور ان سے بہتر تعلقات سنوارنا صلہ رحمی ہے حتیٰ کہ اگر اقارب میں کوئی غیر مسلم ہو تو بھی ان سے اچھے مراسم رکھنے چاہئے۔امام بخاریؒ نے اس کے لئے مستقل دو باب قائم کئے ہیں۔ایک میں ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی والدہ جو مشرکہ تھی صلح کے زمانے میں مدینہ آئی حضرت اسماءؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ''ان امی قدِمت وھی راغبۃ أفَاَصِلُھا؟قال نعم صلی امك ''یعنی میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ کچھ راغب ہے تو کیا میں اس کی خدمت اور خاطر تواضع کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیکر فرمایا ہاں ان سے نیک سلوک اور اچھا برتاؤ کرو۔(باب صلۃ الوالد المشرک ص:۸۸۴ ج:۲ [۳])

فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی میں دس حکمتیں ہیں:(۱) اس سے اللہ عزوجل خوش ہوتے ہیں (۲) یہ فرشتوں کی خوشی کا بھی ذریعہ ہے (۳) اس سے اہل قرابت بھی خوش ہوجاتے ہیں (۴) لوگ بھی ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں (۵) یہ ابلیس کی مایوسی و پریشانی کا بہترین ذریعہ ہے (۶) اس سے عمر میں برکت حاصل ہوتی ہے (۷) اس سے رزق و مال میں زیادتی ہوتی ہے (۸) اس کے فوت ہونے والے بزرگ باپ دادا بھی اس سے خوش ہوتے ہیں (۹) اس سے لوگوں میں اس کی محبوبیت بڑھ جاتی ہے (۱۰) یہ موت کے بعد اجر کا ذریعہ ہے یعنی دعائیں لینے کا بہترین سامان ہے۔(تنبیہ الغافلین ص:۵۰، نقش قدم کامل ص:۳۷۹)

باب ماجاء فی حُبِّ الولد

عن ابرھیم بن میسرۃ قال سمعت ابن ابی سُویدیقول سمعتُ عمربن عبدالعزیز یقول:زعمت المرأۃ الصالحۃ خولۃ بنت حکیم قالت خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ذات یوم وھو محتضن اَحَدَابِنی ابنتہ وھویقول:انکم لَتُبَخِّلون وتُجَبِّنون وتُجَھِّلون وانکم لَمِن رَیحان

---

[۳] اخرجہ البخاری فی الھبۃ باب:۲۹ والجزیۃ باب:۱۸ والادب باب:۸ ومسلم فی کتاب الزکوۃ، ایضاً ابوداؤد فی کتاب الزکوٰۃ بحوالہ الترغیب والترھیب ص:۲۲۱ ج:۳.

اللّٰہ"۔(منقطع واخرجه احمدفی مسنده)[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک نیک خاتون خولہ بنت حکیم کہتی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے، دراں حالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کے دوصاحبزادوں میں سے ایک کو گود میں لئے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے رہتے تم لوگ (اولاد) بخل پر مجبور کرتے ہو اور بزدل بناتے ہو اور جہل پر اُکساتے ہو، تم لوگ اللہ کی طرف سے تسکین بخش رزق ہو۔ (یا بہت خوشبودار ہو)

لغات:۔قولہ "زعمت" زعم دومعنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے (۱) اعتقادِ فاسد (۲) قول، یہاں یہی آخری معنی مراد ہے۔قولہ "خولة بنت حكيم" یہ المرأة الصالحة سے بدل ہے۔قولہ "محتضن" "احتضان" سے ہے گود میں لینے کو کہتے ہیں، حِضن سینے سے بغل اور پہلو تک کے حصے کو کہتے ہیں۔ حضانۃ پرورش کو کہتے ہیں کہ اس میں بھی گود میں لینا پڑتا ہے۔قولہ "لتبخلون" تینوں صیغے باب تفعیل سے ہیں۔قولہ "ریحان" رحمت، راحت اور رزق کو کہتے ہیں بمعنی خوشبو کے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ بچوں کو پیار کرتے وقت منہ سے لگایا جاتا ہے ان کا بوسہ لیا جاتا ہے اور سونگھے جاتے ہیں۔علامہ عینیؒ نے سونگھنے کے معنی کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس کی تائید بعض روایات سے ہوتی ہے۔

تشریح:۔یہ واقعہ حضرات حَسَنین میں سے کس کا ہے؟ تو اس میں دونوں احتمال ہیں حضرت حسن رضی اللہ بھی ہوسکتے ہیں اور حضرت حسین رضی اللہ بھی۔ بنابر ہر تقدیر حدیث میں ''ابنتہ'' سے مراد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔حدیث میں جن تین باتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کسی طرح کا تردد نہیں، کیونکہ اولاد کی محبت ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے آدمی بخل اختیار کرتا ہے کہ اسے ہر وقت اپنے بچوں کی خوشی اور روشن مستقبل کی فکر لاحق رہتی ہے اور پھر وہ پیسوں سے محبت کرنے لگتا ہے کیونکہ اس سے بھی بچوں کے لئے خوشی خریدی جاسکتی ہے۔اسی طرح آدمی موت سے بھی ڈرتا ہے کہ اس پر ہر وقت یہ سوچ سوار رہتی ہے کہ اگر میں مرجاؤں گا تو میرے بچے یتیم بن جائیں گے اس طرح وہ شفقت پدری سے محروم ہوجائیں گے ان کی صحیح پرورش نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ نتیجۃً وہ بزدل بن جاتا ہے۔

پھر بعض لوگ اپنی اولاد کی وجہ سے بسا اوقات نامناسب روش بھی اختیار کرلیتے ہیں جو ایک گونہ جہل

باب ماجاء في حب الولد

[1] مسنداحمد ص:۵۵۹ ج:۶ حدیث:۲۶۷۶۹۔

ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جہل سے مراد مقابلِ علم ہو کیونکہ بعض لوگ اولاد کی وجہ سے ضروری علم یا تبحرِ علمی سے محروم رہتے ہیں۔

چونکہ ان باتوں سے اولاد کے مقام کا انحطاط معلوم ہوتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا کہ تم اللہ کی طرف سے سونگھنے کا عطیہ ہو جس سے تسکین وراحت نصیب ہوتی ہے، یعنی ایک طرف اولاد کی وجہ سے آدمی نقصان اٹھا سکتا ہے جبکہ دوسری جانب اولاد چین اور سکون کا سامان ہے لہٰذا کوئی آدمی فرطِ محبت کی وجہ سے اولاد کی طرف سے نقصان نہ اٹھانے پائے۔ بلکہ اپنے دین کا بھی خیال رکھے اور ان کی تربیت بھی کرتا رہے گو اس کے لئے بچوں کو مارنا پڑے ہاں زیادہ مارنا ممنوع ہے تین تھپڑ تک مارنے کی اجازت ہے بشرطیکہ منہ پر نہ ہوں، غرض ان سے محبت بھی کرو اور ادب بھی سکھاؤ۔

باب ماجاء فی رحمة الولد

"عن ابی هريرة قال ابصرالاقرع بن حابس النبیّ صلی اللّٰه عليه وسلم وهويقبّل الحسن وقال ابن ابی عمر:"الحسن او الحسين "فقال:ان لی من الولدعشرة ماقبلت احداًمنهم فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم:انه من لايَرحم لايُرحم"۔(حسن صحيح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ اقرع بن حابس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ کو چوم رہے تھے ابن ابی عمر (راوی) کہتے ہیں کہ وہ حسن تھے یا حسین؟ (یعنی دونوں میں سے ایک تھے) تو حابس نے کہا کہ میرے تو دس بچے ہیں اور میں نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں چوما ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی پر رحم نہیں کرتا (یعنی شفقت نہیں کرتا) تو اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا ہے۔

تشریح:۔ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ میں نے اپنے دس بچوں میں سے کسی ایک کا بھی بوسہ نہیں لیا ہے اس رسم پر مبنی تھا جو جاہلیت میں عام تھی کہ بچوں کو پیار کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے پٹھانوں میں بھی یہ رسم جڑیں پکڑ چکی ہے اگر کوئی شخص اپنے ماں باپ کے سامنے اپنی بیوی سے بات کرے یا بچہ گود میں اٹھائے تو لوگ اسے بے شرم سمجھتے ہیں، گویا کہ یہ جاہلی عرفی حیا ہے چونکہ یہ قساوتِ قلبی کی علامت ہے اس لئے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی فرما کر واضح کر دیا کہ اس کے نتائج ایسے شخص کے بارے میں اچھے نہیں نکلتے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر آدمی کے ساتھ اس کے حال کے مطابق معاملہ وسلوک فرماتے ہیں، نرم دلوں کے ساتھ نرمی کا اور سخت مزاجوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے ہیں چنانچہ ایک حدیث قدسی میں ہے ''انا عند ظن عبدی بی''[1] گو یہ اعتقاد کے بارے میں ہے تاہم اس سے برتاؤ کا اصول لیا جا سکتا ہے کہ جو معاملہ آدمی کا اللہ کے ساتھ ہو اور اس پر جو سزا جزا ملتی ہیں اسی طرح جو سلوک آدمی کا اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہو گا اس کی بھی اچھی بُری سزا ملے گی، چونکہ اولاد کے ساتھ شفقت اپنے اوپر اللہ کے رحم کا سبب ہے جبکہ اس کے برعکس بچوں کے ساتھ سختی کرنا اپنے اوپر سختی کا موجب ہے اور بوسہ لینا اس سلوک کی علامات میں سے ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حکم لگایا، اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو چومنا بہیمانہ شہوت کا نتیجہ نہیں بلکہ رحیمانہ اخلاق اور مشفقانہ طرز حیات کی نشانی ہے۔

باب ماجاء فی النفقة علی البنات

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من کانت له ثلاث بنات او ثلاث اخوات او ابنتان او اُختان فاحسن صحبتهن واتقی اللّٰہ فیهن فله الجنة"۔ (حَسَنٌ)

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں یا تین بہنیں ہوں یا دو لڑکیاں یا دو بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا رہے اور ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے تو اس کو جنت ملے گی۔

تشریح:۔ اس روایت میں لفظ ''او'' راوی کے شک کے لئے نہیں بلکہ تنویع کے لئے ہے جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ روایت اگرچہ سند کے اعتبار سے اتنی قوی تو نہیں تاہم اس مضمون کی متعدد احادیث مروی

باب ماجاء فی رحمة الولد

[1] رواه البخاری ص: ۱۱۰۱ ج: ۲ "باب قول اللّٰہ ویحذرکم اللّٰہ نفسه الخ" کتاب الرد علی الجهمیة وغیرهم التوحید، مسلم ص: ۳۵۴ ج: ۲ کتاب التوبة، سنن ابن ماجه فی الادب، سنن دارمی ص: ۳۹۵ ج: ۲ حدیث: ۲۷۳۱ کتاب الرقاق مسند احمد ص: ۵۳۶ ج: ۴ حدیث: ۵۵۸۶ ایضاً رواه الحاکم فی المستدرک والطبرانی وابن المبارک وابن حبان والدولابی، بحواله حاشیه سنن دارمی ص: ۳۹۵ ج: ۲. حفیظ الرحمن الحنفی غفرله ولوالدیه ولاساتذته

ہونے کی وجہ سے کم از کم درجہ حسن کی ہے۔[۱] اس ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیٹیوں یا بہنوں کی صحیح پرورش کرے تو وہ اس عمل کی وجہ سے جنت کا مستحق ہو جاتا ہے گو کہ اللہ پر کوئی چیز واجب تو نہیں لیکن اس کی عادت شریفہ یہ ہے کہ نیک مخلصانہ اعمال پر جنت دیتے ہیں چونکہ لڑکوں کی پرورش، ان کی تعلیم پر خرچ کرنا تو ہر ایک برداشت کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کل یہ لوگ مجھے کھلائیں گے۔ جبکہ لڑکیوں کی بہترین تربیت دنیوی لالچ سے خالی ہوتی ہے یہ صرف اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہوتی ہے اس لئے عند اللہ لڑکیوں کی تربیت پر اتنا بڑا انعام مقرر کیا گیا کیونکہ یہ عمل تکلیف سے خالی نہیں کہ ایک ایسی جگہ پیسے لگانا، تکلیف اٹھانا اور صبر کرنا جہاں سے دنیاوی مفادات ملنے کا خاطر خواہ امکان نہ ہو یقیناً کسی نیک جذبے سے ہی ہو سکتا ہے۔

دوسری حدیث:۔ "عن عائشة قالت قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: من أبتلى بشئي من البنات فصبر عليهن كن له حجاباً من النار"۔ (حسن)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس شخص کو کچھ لڑکیوں میں مبتلا کیا گیا اور اس نے ان پر صبر کیا تو وہ لڑکیاں اس کے لئے جہنم سے آڑ ہوں گے۔

لغات:۔ قوله "أبتلى" بصیغہ مجہول بَلاء کے معنی آزمانے اور مصیبت میں گرفتار کرنے کے آتے ہیں۔ یہاں بمعنی امتحان و آزمائش کے ہے۔

قوله "من شئي" اگر من بیانیہ ہو تو شیٔ سے مراد عدد ہے۔ اور اگر ابتدائیہ ہو تو شیٔ سے مراد ناگواری ہے۔

تشریح:۔ چونکہ لوگ لڑکوں کی پیدائش پر خوش ہوتے ہیں اور لڑکیوں پر خوش نہیں ہوتے کہ ان کے زعم میں یہ ان پر بوجھ ہوتی ہیں، یا ان کی وجہ سے وہ عار سے دوچار بھی ہو سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس لئے اس حدیث میں ان کی پیدائش اور ان کی تادیب و تعلیم وغیرہ کو ابتلاء سے تعبیر کیا کہ لوگ ان کو بادلِ ناخواستہ قبول کرتے ہیں۔ تو اس حدیث مبارکہ میں ان کو بتلایا گیا کہ جو شخص ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت اور شادی وغیرہ مراحل سے یوں گذرے کہ ان تمام مراحل میں پیش آنے والی تکلیفات پر صبر کرے اور ان پر اجر و ثواب کی نیت کرے تو یہ لڑکیاں قیامت کے دن عذاب سے آڑ بن کر والدین کی نجات کا ذریعہ بنیں گی گویا جس طرح بعض اعمال کے فوائد نقد

باب ماجاء في النفقة على البنات

[۱] كمافي مجمع الزوائد ص: ۲۰۲ تا ۲۰۴ ج: ۸ كتاب البر والصلة.

اور جلد دنیا میں ملتے ہیں اور بعض کے آخرت میں تو بچوں کا معاملہ بھی کچھ اس طرح ہے کہ لڑکوں کی کمائی اور محنت ومزدوری ودیگر فوائد دنیا ہی میں سامنے آتے ہیں مگر لڑکیوں کے ساتھ جو اجر وثواب وابستہ کیا گیا ہے وہ آخرت میں ملے گا۔ عقلمند شخص وہ ہوتا ہے جو اشیاء کے لوازمات اور تاثیرات کو جانتا ہو۔ اگر کھجور کا درخت جلد پھل نہ دے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ درخت ہی فضول ہے۔ چونکہ آخرت کا ثواب کمانے کے لئے نیت بھی شرط ہوتی ہے اس لئے ان لڑکیوں کی پرورش کے دوران ثواب کی نیت بھی کر لینی چاہئے۔ اور یہ کہ ان کی تربیت اور تعلیم بھی ایسی ہونی چاہئے جو آخرت کے کاموں میں سے ہو۔ ویسے تو لوگ آج کل روشن خیال بنانے کو بھی تعلیم وتربیت کہتے ہیں۔

تیسری حدیث:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت ان کے یہاں آئی جس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں، اس نے بھیک مانگی لیکن وہ میرے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہ پا سکی جو میں نے اسے دیدی پس اس نے اس کے دو ٹکڑے کر کے اپنی دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دیئے اور خود اس میں سے نہیں کھایا پھر اٹھ کر چلی گئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قصے کی خبر دیدی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص ان لڑکیوں کی طرف سے کچھ آزمائشوں میں مبتلاء ہو جائے تو وہ (بشرط ماصبر) اس کے لئے جہنم سے حجاب ہوں گی۔

تشریح:۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ "الکوکب" میں فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس واقعہ پر تعجب ہوا حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر ام المؤمنین چونکہ اولاد کی حلاوت سے واقف نہ تھیں اس لئے یہ منظر ان کو عجیب لگا کہ ایک بھوکی عورت نے کس طرح اپنے آپ پر بچیوں کو ترجیح دی۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ سائل کو محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ اگر زیادہ چیز دینے کے لئے نہیں مل رہی یا اس کے دینے کی استطاعت نہیں تو کم از کم کچھ نہ کچھ دینا چاہئے گو کہ وہ بہت معمولی کیوں نہ ہو، سوال کے متعلق تفصیلی بحث باب من تحل لہ الزکوٰۃ میں گذری ہے فلا نعیدہ (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد سوم ص: ۱۰۱ تا ۱۰۸ بحث اول وثانی)

یہاں علامہ عینیؒ نے ایک اعتراض کیا ہے کہ بعض روایات[۲] میں تین کھجوروں کا ذکر ہے کہ اس عورت نے ایک ایک کھجور لڑکیوں کو دی اور تیسری کو خود کھانے کا ارادہ کیا مگر جب اسے منہ کے قریب کیا تو لڑکیوں نے وہ

---

[۲] کذا فی معجم الصغیر للطبرانی ۲/ ۳۰ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۰۴ ج: ۸.

بھی مانگ لی تو ماں نے اس کے دو ٹکڑے کر کے ان کو ایک ایک ٹکڑا دیدیا اس طرح دونوں روایتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

مگر اس کا جواب یہ ہے کہ راوی کی نظر مغز و معنی پر ہوتی ہے لہذا ممکن ہے کہ اصل میں تین کھجوریں ہوں مگر اختصاراً تیسری کا ذکر کیا گیا کیونکہ اصل غرض اسی سے متعلق ہے کہ خود بھوکی رہی اور بچیوں کو کھلایا۔

حدیث آخر:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من عال جاريتين دخلتُ انا وهو الجنة كهاتين واشار باصبعيه ''جس نے دو لڑکیوں کو کھلا پلا کر پالا تو میں اور وہ جنت میں ان دو (انگلیوں) کی طرح ساتھ داخل ہوں گے اور اشارہ کیا دو انگلیوں سے۔

عول کے معنی روزی اور مدد وغیرہ کے آتے ہیں لیکن یہاں وہ سب چیزیں مراد ہیں جو عیال داری کے لئے درکار ہوتی ہے مثلاً کپڑے، تعلیم و تربیت کے اخراجات اور علاج کی سہولت وغیرہ، پھر یہ ذمہ داری کم از کم شادی کے وقت تک لازمی ہے صرف چند دن کے حسن سلوک سے یہ فضیلت حاصل نہ ہوگی بلکہ پیدائش سے لیکر مسلسل بلوغت اور شادی تک مراد ہے شادی کے بعد چونکہ یہ ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے اس لئے باپ فارغ ہو جاتا ہے ہاں لازمی سلوک کے علاوہ درجہ استحباب میں کچھ نہ کچھ خیال پھر بھی رکھنا چاہئے کہ گاہے بگاہے کچھ کپڑے یا پیسے وغیرہ بھیج دے یا جب وہ اپنے میکے آجائے تو ان کا حسب استطاعت خیال رکھے تاکہ ان کا دل نہ ٹوٹے۔ بعض لوگ بچیوں کا مہر لیکر خود ہڑپ کر جاتے ہیں اور بچیوں کو فروخت کئے ہوئے مال کی طرح بھول جاتے ہیں یہ ظلم ہے اور سراسر ناانصافی و قطع رحمی ہے اس سے بچنا لازمی ہے۔

پھر جنت میں داخل ہونے میں معیت کا مطلب اتصال ہے یعنی جنت کا دروازہ تو اگرچہ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھولا جائے گا تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دوسرے لوگ حائل و رکاوٹ نہیں بنیں گے جیسے صدیقین اور علماء ہیں تو یہ شخص بھی صدیقین اور علماء کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ داخل ہوگا تو جس طرح خاص خادم اپنے مخدوم کے ساتھ قریب قریب رہتا ہے اسی طرح یہ شخص بھی ہوگا گو خادم اور مخدوم میں اتصال کے باوجود بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ فضیلت خاصیات المفردات میں سے ہے۔ (تذکر و تدبر)

باب ماجاء فی رحمة الیتیم و کفالته

"عن ابن عباس ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: من قبض یتیماً من بین المسلمین الی طعامه و شرابه ادخله اللّٰہ الجنة البتّة الا ان یعمل ذنباً لا یغفر"۔ (تفرد الترمذی بتخریجه)[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسلمانوں میں سے کسی یتیم کو اپنے کھانے پینے میں شامل کرے تو اللہ اسے ضرور جنت میں داخل فرمائیں گے الا یہ کہ وہ ایسا گناہ کرے جس کی بخشش نہ ہوتی ہو۔ یعنی کفر و شرک

لغات:۔ "من قبض" قبض کے معنی ہاتھ میں لینے اور قبضے میں لینے کے آتے ہیں یہاں مراد ٹھکانہ دینا ہے۔ قولہ "یتیماً" یتم ییتم یتماً، باب ضرب سے تنہا رہ جانے کے آتا ہے اصطلاح میں وہ نابالغ بچہ جس کا باپ مرجائے گویا وہ بھی بے سہارا ہونے کی وجہ سے تنہا ہوتا ہے۔ قولہ "من بین المسلمین" قبض کے ساتھ متعلق ہے۔ قولہ "الی طعامه و شرابه" یتیم کو اپنا کھانا کھلانا مراد ہے خواہ دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھائیں یا الگ الگ گو پہلی صورت افضل ہے۔ قولہ "البتة" بتا تاً بمعنی قطعاً و یقیناً کے آتا ہے ہمزہ قطعی ہے لہٰذا درج کلام میں ساقط نہیں ہوتا۔

تشریح:۔ سابقہ باب اور اس باب کی احادیث کا مضمون تقریباً ایک ہے کہ بچیوں اور یتیموں کی کفالت پر جنت ملتی ہے وجہ اشتراک یہ ہے کہ یہ دونوں کمزور مخلوق ہیں، لڑکیاں عموماً احساس کمتری میں مبتلاء ہوتی ہیں جبکہ یتیم بچے احساس محرومی کا شکار ہوتے ہیں پس جو شخص ان کو سہارا دے گا اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کو عجز و محرومی کی آگ سے نکال باہر کردے کیونکہ محروم آدمی اپنی محرومی کی وجہ سے ہر وقت تڑپتا رہتا ہے۔ دوسری جانب یہ اصول ہے کہ اخروی مکافات آدمی کے عمل کے مطابق ہوتی ہے تو جس طرح لڑکیوں اور یتیم کے کفیل نے ان کو محرومی کی بھٹی سے نکالدیا اسی طرح اللہ عزوجل اس کو قیامت کے دن جنت کی محرومی سے محفوظ اور جہنم کی آگ سے مامون بنا کر جنت میں داخل فرمائے گا۔

باب ماجاء فی رحمة الیتیم و کفالته

[1] ایضاً رواه الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۱۱۵۴۲ ما من مسلم قبض یتیماً بین مسلمین الی طعامه و شرابه الا ادخل الجنة البتة الا ان یعمل ذنباً لا یغفر الخ مجمع الزوائد ص: ۲۰۹ ج: ۸ حدیث: ۱۳۵۲۵۔

تاہم اس قسم کے فضائل میں یہ ضابطہ ذہن میں رہے کہ یہ خاصیات مفرد ہوتے ہیں جن کے بارے میں پہلے بارہا عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ فضیلت اس فعل کی ہوتی ہے لیکن اگر اس کے ساتھ مخالف عمل مخلوط ہوگا تو اس کی قوت کے مطابق اس عمل کی تاثیر کم یا ختم ہوگی اس لئے حدیث باب کے اخیر میں فرمایا ''الا ان یعمل ذنبا لا یغفر'' لہٰذا اگر اس سے مراد شرک ہو تو پھر تو سارے نیک اعمال رائیگاں چلے گئے۔ اور ذنب سے مراد اگر مادون الشرک گناہ ہوں جیسے حقوق العباد تو پھر کفالت یتیم پر یہ فضیلت زیادہ مؤثر نہ ہوگی بلکہ حقوق کا حساب پہلے دینا پڑے گا الا یہ کہ صاحب حق معاف کردے۔

دوسری حدیث:۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ان دونوں کی طرح ہوں گے اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں سے اشارہ فرمایا یعنی سبابہ (اشارہ کی انگلی) اور درمیانی سے۔[۲] **قولہ "کافل"** کفالت کرنے والا یعنی مربی اور پرورش کرنے والا۔

تشریح:۔ یتیم کی کفالت سے مراد اس کی پرورش ہے جس میں ہر زمانے کے عرف کے مطابق معروف اشیاء داخل ہیں مع ہذا چونکہ وہ شفقتِ پدری سے محروم ہوتا ہے تو اس پر شفقت کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ علی ہذا اگر کوئی شخص یتیم کو گھر میں جگہ تو دیتا ہے اور اسے کھلا پلاتا بھی ہے مگر اس سے غیر معمولی خدمت لیتا ہے یا اس سے کموا کر اسی کی کمائی میں سے اس کو دیتا ہے تو یہ للہیت نہ ہوئی بلکہ ذاتی مفادات ہیں، ہاں اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ یتیم سے بالکل خدمت نہ لے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ جس طرح اپنے بچوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے اسی طرح یا اس کے قریب قریب سلوک اس سے کرے گو قلبی محبت میں فرق ناگزیر ہے، غرض کفیل، یتیم کے لئے بمنزلہ باپ بن جائے تو وہ اس فضیلت کو حاصل کرلے گا۔

پھر جنت میں معیتِ ظاہری سے من کل الوجوہ مساوات لازم نہیں آتی بلکہ باوجود اس معیت کے معنوی و باطنی تفاوت رہے گا جیسے ایک ہی دفتر میں بہت سے لوگ کام کرتے ہیں مگر ان کے گریڈز اور مناصب وعہدوں میں فرق ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ آخرت کے مراتب چونکہ ایمان وعرفان و عمل کے تفاوت پر مبنی ہوتے ہیں، تو جس طرح ایک بڑے اور چھوٹے عالم میں ظاہری کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن باطن میں

---

[۲] ایضاً اخرجه البخاری فی الطلاق باب: ۲۵ وفی الادب باب: ۲۴ وابوداؤد فی الادب باب: ۱۲۳ بحواله الترغیب والترهیب ص: ۲۳۴ ج: ۳.

بڑا فرق ہوتا ہے اسی طرح جنتیوں کے باطنی کیفیات واحوال ومقامات بھی مختلف ہوں گے (تدبر وتشکر) بلاشبہ اعمال میں یہ بڑی خوشخبری ہے کہ یتیم کا مربی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں بھی معیت کی نعمت حاصل کرے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں وہ شخص ہوں جس کے لئے جنت کا دروازہ سب سے پہلے کھولا جائے گا، میں ایک عورت کو دیکھوں گا جو مجھ سے آگے جانے کی کوشش کرے گی میں اس سے پوچھوں گا تو کون ہے؟ وہ کہے گی میں نے اپنے یتیموں کی پرورش کی تھی۔ (اخرجہ ابو یعلی وقال رُواتہ لابأس بھم۔ [۳] کذا فی التحفۃ الاحوذی)

باب ماجاء فی رحمة الصبیان

"عن زربِیّ قال سمعت انس بن مالك يقول جاء شيخ يريدالنبي صلى الله عليه وسلم فَأَبطَأ القوم عنه ان يوسّعوا له فقال النبي صلى الله عليه وسلم: ليس منامن لم يرحم صغيرناولم يُوَقِّر كبيرنا"۔

حضرت زربی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا ہے کہ ایک بزرگ شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو حاضرین نے ان کو جگہ دینے میں دیر کی پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے۔

تشریح:۔ قولہ "لیس منا" الخ جمہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص ہمارے طور وطریقے پر نہیں۔ یا ہمارے کامل دین پر نہیں کیونکہ جب کوئی آدمی آدابِ زندگی کا خیال نہیں رکھتا تو وہ کامل مؤمن کیسے ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس باب کے اخیر میں نقل کیا ہے۔ تاہم امام سفیانؒ اس تفسیر کو پسند نہیں فرماتے بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ اسے ظاہر پر چھوڑنا چاہئے تا کہ زیادہ مؤثر ثابت ہو یعنی عوام کے سامنے ایسی روایات میں تاویل کرنے سے ان کی نظر میں اہمیت ختم یا کم ہوجاتی ہے کہ وہ یہ سوچیں گے کہ ہم تو ویسے بھی کامل نہیں لہٰذا اس پر عمل نہ کرنے سے کیا نقصان ہوگا۔

---

[۳] رواه ابويعلىٰ واسناده حسن ان شاء الله الترغيب والترهيب ص:۲۳۶ ج:۳ وقال العلامة الهيثمى، رواه ابويعلىٰ وفيه عبدالسلام بن عجلان وثقه ابوحاتم وابن حبان وقال يخطى ويخالف وبقيه رجال ثقات. مجمع الزوائد ص:۲۰۸ ج: حديث: ۱۳۵۱۹ كتاب البر والصلة.

پھر سفیان سے مراد ثوری ہے یا ابن عیینہ تو دونوں قول ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے اس لئے کامل مؤمن وہی ہوتا ہے جو اپنی پوری زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے مطابق بنائے۔ دوسری طرف اسلام میں اخلاق وآداب کا بھر پور خیال رکھنا اور باری تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہونا انسانی زندگی کا نقطۂ عروج ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ بلکہ ہر مخلوق کے ساتھ اس کی شان اور حیثیت کے مطابق سلوک کیا جائے لہٰذا معاشرے میں جو لوگ کمزور ہوں تو وہ قابل رحم ہیں ان پر شفقت کی جائے۔ اور جو لوگ قابل قدر ہیں تو ان کی عزت افزائی کی جائے۔ پس جو شخص ایسا نہیں کرے گا وہ اس اصول کو پامال کرنے کی وجہ سے کامل مؤمن نہیں بن سکتا۔

لہٰذا کامل مؤمن بننے کے لئے ضروری ہے کہ بچوں پر رحم کیا جائے کہ وہ کمزور اور محتاج ہوتے ہیں جبکہ اپنے سے عمر میں یا فضل وعلم میں بڑے کی قدر کی جائے۔

تیسری حدیث:۔ باب کی تیسری حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی ضابطہ پایا جاتا ہے۔ پس جو شخص نیکی و بھلائی کا حکم نہیں دیتا اور بُرائی سے نہیں روکتا وہ بھی اس وعید میں شامل ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کس کی ذمہ داری ہے؟ تو صاحب ہدایہ نے جلد سوم کے آخری صفحہ پر ایک مسئلہ کے ضمن میں امام صاحب سے نقل کیا ہے کہ ہاتھ سے روکنا حکومت کا کام ہے کہ اسے قدرت حاصل ہے۔ عام لوگ گویا فقط زبانی تنقید کے مجاز ہیں ہاتھ سے تنفیذ ان کی ذمہ داری نہیں ''والامر بالمعروف بالید الی الامراء لِقدرتھم، وباللسان الی غیرھم'' مگر جس مسئلے کے ضمن میں یہ قول ذکر کیا گیا ہے یعنی ''ومن کسر لمسلم بربطاً'' الخ۔ اس میں صاحب ہدایہ فرماتے ہیں ''وقیل الفتویٰ فی الضمان علی قولھما'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف جس طرح زبانی طور سے لازمی اور ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح ہاتھ سے روکنا بھی سب کے لئے ہے اور یہی راجح ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ بھی العرف الشذی میں فرماتے ہیں ''ولا یختص الامر والنھی بالامام بل لِکل واحدٍ من المسلمین'' الخ۔ البتہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرق کیا ہے کہ اگر ایک آدمی گناہ کرتا ہوا ملے تو اسے روکنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ اسے ڈانٹے اور مار بگائے مگر گناہ سے فراغت کے بعد تعزیر دینے کا حق صرف حکومت کی ذمہ داری ہے۔

باب ماجاء فی رحمة الناس

"قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من لم یرحم الناس لا یرحمه اللّٰہ"۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتا۔

تشریح:۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ انسان کے اعلیٰ مقاصد میں سے سب سے اعلیٰ، اخلاق ربانی سے متخلق ہونا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات میں سے ایک رحم بھی ہے اس لئے جو شخص اس وصف سے محروم ہوگا وہ مکافات عمل کی بنیاد پر اللہ کی رحمت سے محروم کردیا جائے گا، جبکہ ترس کھانے والا شخص اللہ کے رحم وکرم کے زیر سایہ رہتا ہے۔ پھر طبرانی کی روایت میں ہے "من لا یرحم من فی الارض لا یرحمه من فی السماء" [۱] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ حکم اور معاملہ صرف انسانوں کے لئے مختص نہیں بلکہ ہر تر جگر والے کے ساتھ ہونا چاہئے، گویا ان اشیاء کو سرکاری مال سمجھ کر ان کی حفاظت کو اپنا فرض بنانا چاہئے۔ چنانچہ ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے دوزخ میں چلی گئی جس نے اسے باندھ لیا تھا نہ تو اُسے کھلاتی پلاتی تھی اور نہ ہی اُسے کھول کر آزاد چھوڑتی تا کہ وہ خود کھائے۔ [۲] جبکہ ایک بدکردار عورت پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے جنتی بن گئی۔ یہ دونوں روایتیں بخاری شریف میں ہیں۔ [۳]

پھر ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ رحم میں سے یہ بھی ہے کہ اگر آپ پر کسی کا حق ہے تو اسے ادا کریں اور آپ کا حق دوسروں پر ہو تو اسے معاف (یا کم) کردیں۔ پھر محشی نے رحمت کی نفی کامل کے ساتھ مقید کی ہے جو خاص قسم ہے۔

ہمارے یہاں پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں آج صورت حال یہ ہے کہ لوگ اپنے حقوق کی وصولی کے لئے تو لڑنا جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں مگر دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کو ضروری نہیں سمجھا جاتا یہ تأثر نہ صرف

باب ماجاء فی رحمة الناس

[۱] طبرانی کبیر حدیث: ۲۵۰۲ مجمع الزوائد ص: ۲۴۲ ج: کتاب البر والصلة ولفظه ارحم من فی الارض یرحمک من فی السماء، ایضاً رواہ الطبرانی بلفظه باسناد جید بحوالہ الترغیب والترھیب ص: ۱۴۰ ج: ۳.

[۲] رواہ البخاری ص: ۳۱۸ ج: ۱ "باب فی فضل سقی الماء" کتاب المساقاة.

[۳] صحیح بخاری ص: ۴۹۵ ج: ۱ کتاب الانبیاء، ایضاً الترغیب والترھیب ص: ۱۴۷ ج: ۳.

یہ کہ غلط ہے بلکہ حدیث باب کے بموجب خدائے تعالیٰ کی رحمت سے محرومی کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر آپ اس کے اثرات دیکھنا چاہتے ہیں تو حالات وواقعات کے تسلسل میں غور کریں۔

دوسری حدیث:۔ شعبہ کہہ رہے ہیں کہ منصور نے یہ حدیث مجھے خط کی صورت میں بھیج دی تھی پھر جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے زبانی بھی پڑھادی اباالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ رحمت بدبخت انسان ہی سے سلب کی جاتی ہے۔[۴]

لغات:۔ قولہ "لاتنزع" بصیغہ مجہول نزع کے معنی اُتارنے، سلب کرنے اور نکالنے کے ہیں۔ چونکہ قلب کی نرمی عنداللہ مطلوب ہے بلکہ قلب کی تخلیق اور جبلت ہی نرمی کے ساتھ ہوئی ہے مگر جو شخص اسے بروئے کار نہیں لاتا تو وہ قلب قاسی اور سخت ہو جاتا ہے اور قسوتِ قلب بدبختی کی علامت ہے، قساوتِ قلبی کے اسباب میں سے اہم سبب معاصی میں انہماک ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز بدبختی کی بنا پر ہوتی ہے، قساوت قلبی، اس کے اسباب اور علاج کی تفصیل مطلوب ہو تو راقم کی کتاب (نقش قدم، فصل نمبر:۱۴) میں ملاحظہ ہو۔

تیسری حدیث:۔ رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتے ہیں تم زمین والوں پر رحم کرو سو آسمان والے تم پر رحم کریں گے۔

لغات:۔ رحم، رحمٰن کی طرف سے الجھی ہوئی شاخ (کی مانند) ہے جو شخص اسے جوڑے گا اللہ بھی اسے جوڑے گا اور جو شخص اسے توڑے گا اللہ بھی اسے توڑے گا۔[۵] قولہ "ارحموا من فی الارض" مراد اگرچہ عالم سفلی اور زمینی سب جاندار ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا تاہم ذوی العقول کو تغلیب دے کر لفظ "من" لایا گیا۔ قولہ "من فی السماء" مراد اللہ تعالیٰ ہے اور آسمان کی طرف نسبت تعظیماً ہے نہ کہ بطور ظرف ومکان۔ یا مراد فرشتے ہیں کیونکہ جب اللہ کسی سے محبت فرماتے ہیں تو اعلان ہوتا ہے کہ فلاں شخص سے میں محبت کرتا ہوں فرشتوں تم بھی اس سے محبت کرو پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ اعلان فرماتے ہیں حتیٰ کہ سب سے نچلے آسمان والے فرشتے دنیا والوں میں یہ اعلان کرتے ہیں اس کی مزید تفصیل اور بہترین تحقیق کے لئے حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا مطالعہ مفید ہے۔ قولہ "شجنة" شین کی تینوں حرکات یعنی زبر، زیر اور پیش جائز ہیں مگر کسرہ

---

[۴] ایضاً اخرجه ابوداؤد كتاب الادب باب:۵۸ بحواله الترغيب والترهيب ص: ۱۴۲ ج:۳ قال، رواه ابوداؤد واللفظ له والترمذی وابن حبان في صحيحه وقال الترمذی حديث حسن وفی بعض النسخ حسن صحيح.

[۵] اخرجه ابوداؤد فی الادب باب:۵۸ بحواله الترغيب والترهيب ص: ۱۴۰ ج:۳.

اولیٰ ہے جیم ساکن ہے گھنی ٹہنی، الجھی ہوئی شاخ اور گھنے درخت کو کہتے ہیں۔ بعض نے الجھی ہوئی جڑوں پر بھی اطلاق کیا ہے اس میں اقارب کے میل ملاپ کی طرف اشارہ ہے۔ قولہ "من الرحمٰن "یعنی اللہ کی طرف سے اس میں شفقت ودیعت کی گئی ہے جس کی بناء پر ذوی الارحام ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ دیکھئے ماں کس طرح اپنے بچے سے پیار کرتی ہے یہ اسی محبت مودعہ کا اثر تو ہے، اس کی کچھ تفصیل پہلے گذر چکی ہے فلانعیدہ۔

باب ماجاء فی النصیحة

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الدین النصیحة ثلاث مرار قالوا: یارسول الله لِمن؟ قال: لِله ولِکتابه ولِائمة المسلمین وعامتهم"۔[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا کہ خیرخواہی کرنا دین کا خلاصہ ہے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول کس کی؟ فرمایا اللہ کی، اس کی کتاب کی، ائمہ مسلمین کی اور سب مسلمانوں کی، یہ روایت مسلم شریف میں تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں ولکتابہ کے بعد ولرسولہ" کا بھی ذکر ہے۔[2]

لغات:۔ قولہ "الدین " سید شریف التعریفات میں لکھتے ہیں کہ دین اور ملت دونوں متحد بالذات اور مختلف بالاعتبار ہیں کہ شریعت کو جب اس حیثیت سے ملحوظ کیا جائے کہ اس کی اطاعت ہوتی ہے تو وہ دین ہے اور اس حیثیت سے کہ اسے لکھا اور جمع کیا جاتا ہے ملت کہلاتی ہے۔ خیالی نے بھی یہی بات کی ہے گویا کہ ملت املاء سے ہے، جبکہ اس حیثیت سے کہ اس سے رجوع ہوتا ہے مذہب کہلاتا ہے وقیل "الفرق بین الدین والملة والمذهب ان الدین منسوب الی الله تعالیٰ والملة منسوبة الی الرسول والمذهب منسوب الی

باب ماجاء فی النصیحة

[1] رواه مسلم ص: ۵۴ ج: ۱ "باب بیان ان الدین نصیحة" کتاب الایمان وابوداؤد ص: ۳۲۸ ج: ۲ "باب فی النصیحة" کتاب الادب، ایضاً رواه النسائی فی البیعة باب النصیحة للامام، ورواه البزار عن ابن عمر ورجاله رجال الصحیح، بحواله سنن دارمی ص: ۴۰۲ ج: ۲ حدیث: ۲۷۵۴.

[2] صحیح مسلم ص: ۵۴ ج: ۱ کتاب الایمان. حفیظ الرحمن عفی عنه ندوة العلم کراچی

المجتهد۔(۹۴،۹۵)

قولہ "النصیحة" نصح الشئ نصحاً کسی چیز کا خالص ہونا جو غیر کی ملاوٹ وآمیزش سے خالی ہے گویا یہ غش اور کھوٹ کے مقابلہ میں آتا ہے اس کا اردو ترجمہ خیر خواہی سے کرنا گویا لازم المعنیٰ ہے کیونکہ جب دل ہر قسم کے حسد اور دیگر امراض سے خالی ہوگا اور کسی کے ساتھ برتاؤ اور سلوک جعلسازی وخودغرضی سے خالی ہوگا تو وہ دل اور سلوک خالص ہوگا جس کو اردو میں خیر خواہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریح:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جامع کلمہ وجملہ میں دین کا مفہوم سمجھا دیا کہ بندہ اپنے اور خدا کے مابین کوئی کھوٹے کا معاملہ نہ رکھے۔اسی طرح اس کی کتاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ائمہ اور سب اہل ایمان کے ساتھ اپنا معاملہ باطن وظاہر میں صاف رکھنا ہی دین کا لب لباب ہے۔

پس اللہ کی خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات وصفات کے بارے میں صحیح عقیدہ رکھے، اس کی عبادت میں نیت خالص رکھے اور اس کے اوامر پر عمل اور نواہی سے اجتناب کرے۔کتاب اللہ کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تصدیق کرے، اس پر عمل کرے، اس کی تلاوت اور نشر واشاعت میں پوری مستعدی کا اظہار کرے، اس کے متعلق غلط تاویلات، تحریفات اور اقوال مبتدعہ کی مدلل نفی کرے۔اللہ کے رسول کی نصیحت کے معنی یہ ہیں کہ ان کی نبوت پر ایمان لائے، ان کی تعظیم وتوقیر کرے، ان کے لائے ہوئے دین کو من وعن مانا جائے، اس کے آگے سر تسلیم خم کرے، ان کے لائے ہوئے دین کی مدد کرے اور دشمنان دین کا مقدور بھر مقابلہ کرے اور مع ہذا اسے پھیلانے کی کوشش کرے۔ائمۃ المسلمین کی نصیحت یہ ہے کہ بلاوجہ ان کی مخالفت نہ کی جائے اگر ان کو جائز طریقے سے نصرت کی ضرورت ہو تو خود کو پیش کرے اور اگر وہ ظلم کریں تو اس پر صبر کرکے لوگوں کو ان کی مخالفت پر نہ اُکسائے، افسوس ہے آج کل مسلمانوں کی حالت زار کو الفاظ میں بیان بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر ایک طرف حکمرانوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ راتوں رات اپنے ہم وطنوں کے ایمان کا سودا کرلیں گے جبکہ دوسری طرف جو لوگ ان کے خلاف سڑکوں پر مظاہرے کرتے رہتے ہیں ان کا ساتھ دینا ایک طرف اس حدیث کے ظاہر کے خلاف ہے اور دوسری جانب ایسے مظاہروں کے قائدین اکثر یہ کام کسی خیر خواہی کے جذبے کے تحت کم ہی کرتے ہیں، اس لئے صحیح وسقیم کے درمیان فرق ناممکن ہوگیا ہے یہ صورت حال وہی اندھا فتنہ ہے جس کے بارے میں متعدد احادیث مروی ہیں اور فیصلہ مشکل ہے۔

عام مسلمانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی صحیح راہ نمائی کی جائے ان کو اپنے اور حتی الامکان دوسروں

کے شر سے بچانے کی کوشش کی جائے، ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے، مزید تفصیل راقم کی کتاب نقش قدم کامل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (نقش قدم فصل نمبر: ۱۰ص:۱۹۱)

دوسری حدیث: ۔حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اس پر کہ نماز قائم کروں گا، زکوٰۃ دوں گا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا۔

چونکہ نماز عبادات بدنی کی اصل و بنیاد ہے اور زکوٰۃ مالی عبادات کی، اس لئے ان دو کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ اس بیعت پر قائم رہے جس کی آسان دلیل یہ ہے کہ صاحب تحفہ نے امام طبرانیؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے غلام سے گھوڑا خریدنے کے لئے کہا تو اس نے تین سو کا خرید کران کی خدمت میں مالک یعنی بائع سمیت پیش کیا تا کہ پیسے وصول کرلے حضرت جریرؓ نے گھوڑا دیکھ کر فرمایا یہ تین سو سے زیادہ کا ہے بائع نے کہا چار سو میں لیں گے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ کا ہے اس نے کہا پانچ سو؟ حضرت جریرؓ نے فرمایا نہیں اس سے بھی زیادہ کا ہے غرض اس کو آٹھ سو کا خریدا اور فرمایا ''انی بایعت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) علی النصح لکل مسلم''۔

باب ماجاء فی شفقة المسلم علی المسلم

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم:۔المسلم اخو المسلم لایخُونُه ولایَکذِبُه ولایخذُله ، كل المسلم علی المسلم حرام عِرضه ومالُه ودمُه التقوی هٰهُنا بحسب اِمرءٍ من الشّران یحتقِرَ اَخَاهُ المسلم"۔(حسن غريب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے نہ تو وہ اس کے ساتھ خیانت کرتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اس کو رسوا کرتا ہے ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی عزت لینا اور اس کا مال وخون حرام ہے تقوی یہاں (دل میں) ہوتا ہے آدمی کے بُرا ہونے کے لئے اتنی بات بھی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی توہین کرے۔

لغات: ۔قوله "لایخونه" خیانت سے ہے۔قوله "ولایخذله" خذلان سے ہے جُدا ہونے اور بے یار و مددگار چھوڑنے کو کہتے ہیں چونکہ مدد نہ کرنے سے وہ عموماً رسوا ہو جاتا ہے اس لئے ترجمہ لازم بالمعنی سے

کیا گیا۔ قولہ "عِرضہ" بکسر العین وسکون الراء اس کے کئی معانی ہیں یہاں بمعنی عزت کے ہے۔ قولہ "التقوی ھٰھنا" مسلم شریف[1] کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے مبارک کی طرف اشارہ کیا یعنی تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔ قولہ "بحسب امرئی" باز ائدہ ہے یہ مبتدا ہے اور "ان یحتقر" الخ اس کی خبر ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث پاک میں مسلمانوں کی باہمی معاشرت کا اصول بتلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں بھائیوں کی طرح رہنا چاہئے۔ لہٰذا "لا یخونہ" الخ خبر بمعنی انشاء ہے یعنی نفی بمعنی نہی کہ ان کو ایک دوسرے سے خیانت نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی دوسرے سے جھوٹ بولنا چاہئے اور اگر کسی مسلمان بھائی کو اس کی مدد کی ضرورت ہو تو اس کی مدد کرنی چاہئے اسے بغیر مدد کے بے آسرا نہیں چھوڑنا چاہئے، اس کی عزت اور مال وجان کو قابل حرمت بلکہ واجب الاحترام سمجھیں اس لئے کہ اس کی آبروریزی حرام ہے اور جان ومال کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اور چونکہ تقوی تو دل میں ہوتا ہے لہٰذا کسی کو ظاہری عمل کی وجہ سے حقیر ومعمولی نہ سمجھا جائے کیا معلوم شاید اُس کا باطن اِس کے باطن سے اچھا ہو یا اُس کا خاتمہ اِس سے اچھا ہو۔ یا مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں تقوی ہو وہ ان اصولوں پر چلے گا وہ اپنے مسلمان بھائی سے خیانت والا معاملہ نہیں کرے گا خواہ اس کی ذات سے متعلق ہو یا اس کے مال اور اہل وعیال وغیرہ سے، خاص کر رشتہ دار اور پڑوسی سے، پھر خیانت عام ہے باتوں کی خیانت بھی مال میں ملاوٹ کی طرح اور حق تلفی کی مانند ہے، اسی طرح متقی آدمی مسلمان بھائی کی ہر طرح ممکن جائز مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے وہ اپنے اسلامی بھائی کو بے یار ومددگار نہیں چھوڑتا ہے اور نہ ہی اس کی تحقیر وتوہین کرتا ہے اور جو شخص ایسا کرے گا تو یہ اس کی بُرائی کے لئے کافی ہے یعنی اگر وہ اس کے علاوہ دوسری بُرائیاں نہ بھی کرے تو مذکورہ بُرائی اس کی ہلاکت کے لئے کافی ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ بظاہر بہت نیک ہو اور اعمال صالحہ پر کاربند ہو مگر مذکورہ بالا خامیوں کی وجہ سے وہ آدمِی بُرا ہی ہے وہ شریعت کی نظر میں اچھا نہیں ہے۔

اس حدیث شریف کا مضمون انتہائی اہم اصول پر مشتمل ہے اس کے اپنانے سے آدمی کامرانی سے ہمکنار ہو سکتا ہے جبکہ اس کو نظر انداز کرنے سے آدمی خُسران کی وادی میں ہلاکت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ آج ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں کہ نفلی عبادات کے تو سخت پابند ہوتے ہیں اور اپنے طور سے تقوی کا ایک معیار

باب ماجاء فی شفقة المسلم علی المسلم

[1] صحیح مسلم ص: ۳۱۷ ج: ۲ "باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ" کتاب البر والصلة.

مقرر کر کے اس پر سختی سے عمل کرتے رہتے ہیں لیکن وہ امام المتقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اصول ضروری نہیں سمجھتے ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقوی کے معیار کے طور پر بیان فرمایا ہے ایسے خود ساختہ تقوی پر چلنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اپنے وضع کردہ تقوی پر چلنے سے کچھ بھی اخروی کامیابی حاصل نہ ہوگی اگر آخرت کی کامیابی چاہئے تو امام المتقین صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ تقوی کو ہی اپنانا پڑے گا۔

دیکھئے امام ترمذیؒ نے اس حدیث سے کس طرح بہترین عنوان اخذ کیا ہے ''شفقة المسلم على المسلم'' آپ مسلمانوں پر شفقت کیجئے اللہ آپ پر شفقت فرمائیں گے۔

دوسری حدیث:۔ ''عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً''۔(صحیح)

یعنی جس طرح عمارت کی پختگی کے لئے ایک دوسرے کا سہارا لازمی ہے کہ جب ایک بلاک کا کچھ حصہ ایک بلاک پر آجائے اور کچھ دوسرے پر اس طرح کی دیوار مضبوط ہوتی ہے بمقابلہ اس دیوار کے جس کے بلاک الگ الگ کھڑے کر دیئے گئے ہوں کیونکہ ایسی دیوار کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح ایک دیوار کو جب دوسری سے ملایا جاتا ہے تو دونوں مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہیں، ہو بہو اسی طرح حال مسلمانوں کا ہے اگر وہ ایک دوسرے کی پشت پناہی کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ دشمن کا فریب ان کو کمزور بنادے کیونکہ ان کی طاقت اتنی مستحکم ہوگی جو معمولی وار سے بلکہ طاقت ور وار سے بھی کمزور نہیں ہو سکے گی۔

تیسری حدیث:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے بے شک تم میں سے ایک اپنے بھائی کے لئے آئینہ (کی مانند) ہے پس اگر اس میں کوئی عیب نظر آئے تو اُسے ہٹادے۔ یہ حدیث ضعیف ہے مگر مضمون اس کا صحیح ہے۔

لغات:۔ قولہ "مِراۃ" بکسر المیم ومد الہمزہ آئینے کو کہتے ہیں۔ قولہ "اَذیً" اَذیۃ سے بمعنی گند کے آتا ہے اور ایذاء سے بمعنی تکلیف کے۔ اگر یہاں پہلا معنی لیا جائے تو پھر مطلب عیب ہے۔ قولہ "فلیمطه" اماطت بمعنی ازالہ کے ہے یعنی اسے زائل کردے۔

مختصر تشریح:۔ اس حدیث کا ایک مطلب یہ ہے کہ چونکہ آدمی کو عموماً اپنے عیوب نظر نہیں آتے ہیں اس لئے آدمی اپنا علاج خود نہیں کر سکتا کیونکہ علاج تو تشخیص کے بعد ہی ہوتا ہے لہٰذا جس طرح آدمی کو اپنے چہرے کے داغ دھبے وغیرہ کسی آئینہ میں ہی نظر آتے ہیں اس لئے ہر مسلمان دوسرے کے لئے آئینے کا کام

دے، لہٰذا دوسرا شخص اس کو آگاہ کرے کہ تیرے اندر یہ عیب ہے اور چونکہ آئینہ چہرے کا عیب پکار کر نہیں بتلاتا بلکہ صرف دکھلاتا ہے لہٰذا کسی کو عیب بتلانا ہو تو آئینے کی طرح چپکے سے بتلا دے، پھر معیوب انسان اپنا عیب آئینے میں دیکھ کر آئینہ نہیں توڑتا بلکہ اپنی اصلاح کرتا ہے تو اسی طرح اس کو عیب بتانے والے کے پیچھے نہیں لگنا چاہئے بلکہ اپنی صفائی ستھرائی میں لگنا چاہئے۔

آج کل مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کو اس کا عیب بتایا جائے تو وہ دشمنی پر اُتر آتا ہے اس لئے بتلانے میں کمال ہوشیاری سے کام لینا چاہئے خاص کر جبکہ یہ حدیث ضعیف بھی ہے، اس لئے بتلانے کو روبرو ضروری نہ سمجھا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف یہ تھا کہ اگر کسی میں عیب دیکھتے تو عام ارشاد فرماتے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں مثلاً جس سے وہ آدمی خود بخود سمجھ جاتا۔ پھر علماء نے نصیحت کے آداب میں سے یہ بھی لکھا ہے کہ واعظ جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرے مثلاً آج کل ہم لوگ بہت کمزور ہو گئے ہیں ہمارے اندر تقوی کا عالم یہ ہے کہ ایک آدمی راستہ میں بیٹھ کر پیشاب کرتا ہے اور ہم اس کو معیوب بھی نہیں سمجھتے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا مطلب اس حدیث کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی کو دوسرے کے اندر عیب نظر آجائے تو اس سے اپنی حالت کو ملاحظہ کرے کہ کہیں میرے اندر تو یہ خامی نہیں تو اگر اس کے اندر ہو گی اور دوسرے کے اندر اسے وہ خامی بُری محسوس ہوئی تھی تو وہ اپنے سے اس کا ازالہ کرے گا جیسے آئینہ میں اپنے عکس پر داغ دھبے نظر آجائیں تو آدمی آئینہ نہیں دھوتا بلکہ اپنا منہ دھوتا ہے۔ یہ دونوں توجیہات محشی نے بیان کئے ہیں اور اول کو ظاہر قرار دیا ہے۔

باب ماجاء فی الستر علی المسلمین

"عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال:من نَفَّسَ عن مسلم كُربةً من كُرَبِ الدنيا نَفَّسَ اللّٰه عنه كربة من كرب يوم القيٰمة ومن يَسَّرَعلى معسرفی الدنيايَسَّراللّٰه عليه فی الدنيا والآخرة ومن سترعلى مسلم فی الدنيا ستراللّٰه عليه فی الدنياوالآخرة واللّٰه فی عون العبد ما كان العبد فی عون اخيه"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دنیا کے مصائب میں سے کوئی معمولی سی مصیبت بھی کسی مسلمان سے دور کر دے تو اللہ قیامت کے دن مصائب میں سے

بڑی مصیبت اس سے دور فرمائیں گے، اور جو شخص کسی تنگ دست کو دنیا میں سہولت دے تو اللہ دنیا و آخرت دونوں میں اس کے لئے آسانی فرمائیں گے، اور جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے تو اللہ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے، اور اللہ بندے کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

لغات:۔ قولہ "نَفَّسَ" تنفیس سے بمعنی دور کرنے اور زائل کرنے کے ہیں۔ قولہ "کربۃ" بضم الکاف واسکان الراء جبکہ "کرب" بضم الکاف وفتح الراء ہے پہلا لفظ مفرد ہے اور دوسرا جمع کربۃ یہاں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اول میں تنوین تنکیر وتحقیر کے لئے ہے جبکہ دوم میں تعظیم کے لئے۔ علی ہذا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی کوئی بھی مصیبت و پریشانی دور کرے یا چھوٹی سی مصیبت دور کرے تو اللہ قیامت کے دن اس کی بڑی مصیبت دور فرمائیں گے۔ کربۃ ہر پریشانی و رنج کو کہتے ہیں۔ قولہ "ستر" پردہ ڈالنا یہاں مراد عیب چھپانے کے معنی میں ہے۔ بعض نے کپڑے دینے کا مطلب بھی لیا ہے۔

تشریح:۔ یہ حدیث ابواب الحدود میں بھی گذری ہے وہاں امام ترمذیؒ نے اس طرح باب قائم فرمایا ہے "باب ماجاء فی الستر علی المسلم" یہاں اگرچہ ایک نسخہ کے مطابق جمع کا صیغہ ہے مگر ایک نسخہ "مسلم" بصیغہ مفرد بھی مروی ہے جمع کا نسخہ زیادہ راجح ہے تاکہ تکرار نہ آئے۔

چونکہ جزا مثل عمل ہوتی ہے اس لئے آسانی کے بدلے آسانی اور پردہ پوشی کے بدلے پردہ پوشی کی جزا ملے گی، تاہم انسان جو بھی عمل کرتا ہے اس کی جزا اس عمل کے عوض سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جس کی اقل مقدار دس گنا ہے اور اللہ جس کے انعام میں مزید جتنا اضافہ کرنا چاہے تو یہ اس شخص اور اللہ کے درمیان خصوصی معاملہ ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو شخص عادی مجرم نہ ہو بلکہ کسی عارض کی بنا پر اس سے قصور ہو جائے تو اس کی ایسی حرکت جس پر سزا مقرر ہو خواہ حد ہو یا تعزیر کو نظر انداز کرنا یعنی گواہی سے گریز کرنا مستحب ہے بشرطیکہ اس سے کسی بندے کا حق متعلق نہ ہو حقوق العباد کی صورت میں ایسی گواہی دینی چاہئے کہ حد بھی نہ لگے اور صاحب حق کو اس کا حق بھی مل جائے مثلاً چوری کئے ہوئے مال کے بارے میں "سرق" کا لفظ استعمال نہ کرے بلکہ "اَخَذَ" کا لفظ بولے، جبکہ پیشہ ور چور اور عادی مجرم کا حکم پردہ پوشی نہیں ہے، کیونکہ اس سے معاشرہ بگڑ جاتا ہے اس لئے ایسے پیشہ ور مجرم کے بارے میں بہ نیتِ اصلاحِ معاشرہ اطلاع دینا ہی افضل ہے۔

یہ تو حقوق کے بارے میں ہے جہاں تک ذاتی عمل کا تعلق ہے تو اگر کسی میں عیب نظر آجائے خواہ اس کا تعلق فعل سے ہو یا اخلاق سے تو اس کا حکم سابقہ باب میں بیان ہوا ہے۔

قولہ"واللّٰہ فی عون العبد" الخ اس سے معلوم ہوا کہ رفاہی کاموں پر جزا صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی ملتی ہے چنانچہ اس کا فائدہ نقد بھی ملتا ہے خصوصاً اپنے عزیز واقارب کے ساتھ حسن سلوک کا فائدہ تو بہت ہی نمایاں ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی الذّبِّ عن المسلم

"عن ابی الدرداء عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال:من رَدَّ عن عِرض اخیہ رَدَّاللّٰہ عن وجھہ النار یوم القیمۃ"۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت کا دفاع کرے اللہ قیامت کے روز اس کے چہرے سے جہنم کی آگ دور فرمائیں گے۔

لغات:۔ "الذب" زور سے ہٹانے اور دور کرنے کو کہتے ہیں یہ لفظ گویا ذباب سے ہے جس کے معنی مکھی کے ہے گویا مکھی ہٹانے کو کہتے ہیں گوکہ یہاں مطلق دفاع مراد ہے اور عموماً اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

قولہ "عِرض" بکسرہ عین عزت وآبرو کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ چونکہ غیبت کرنے اور عیب جوئی کرنے والے شخص کی مثال مکھی کی طرح ہوتی ہے کہ جس طرح مکھی جسم کی اس جگہ پر بیٹھتی ہے جہاں زخم اور گندگی موجود ہو، صاف جگہ پر نہیں بیٹھتی اسی طرح غیبت کرنے والا شخص بھی دوسروں کے عیوب تلاش کرکے ان کو کریدتا رہتا ہے اور اس کی پیپ کو پوستا رہتا ہے اس لئے جو شخص اس کا دفاع کرتا ہے وہ گویا اپنے بھائی کے زخموں سے مکھیاں اڑاتا ہے اور اس کے زخموں کو پھیلنے اور بدبودار ہونے نہیں دیتا۔

چونکہ عیب جوئی سے آدمی کی آبرو متاثر ہوجاتی ہے اور انسان کے جسم میں سب سے زیادہ آبرو والی جگہ اس کا چہرہ ہوتا ہے، اس لئے اس دفاع کے بدلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن اس کے چہرے یعنی ذات کی، آگ سے حفاظت فرمائیں گے کہ اس نے اپنے بھائی کے چہرے کو محفوظ رکھا تھا، پھر یہ دفاع غائبانہ زیادہ افضل ہے بنسبت موجودگی کے پھر یہ حکم بہتان اور غیبت سب کو شامل ہے۔ اگر غیبت کرنے والا کوئی

ایسا شخص ہے جو خود بھی بظاہر صاحب وجاہت ہے اور اس پر نکیر کرنا رُو بَرُو مشکل ہو تو آدمی کو چاہیئے کہ فوراً موضوعِ سخن کو دوسری طرف موڑ دے یا وہاں سے اُٹھ کر چلا جائے۔

باب ماجاء فی کراهية الهجر للمسلم

"عن ابی ایوب الانصاری ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لایحل لِلمسلم ان یهجراخاه فوق ثلاثٍ یلتقیان فیصدّهذا، ویصدُّ هذاوخیرهماالذی یبدأُ بالسلام"۔[1]

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسی مسلمان کے لئے روا نہیں کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے ترکِ تعلق وکلام کرے تین دن سے زیادہ (بایں طور) کہ جب دونوں کی ملاقات (یعنی آمنا سامنا) ہو تو یہ بھی اعراض کرے اور وہ بھی (ملنے سے) گریز کرے ان میں سے بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔

لغات: ۔قولہ "الھِجر" بکسر الھاء وسکون الجیم آپس میں بات چیت بند کرنے اور تعلق منقطع کرنے کو کہتے ہیں گویا بمعنی ترک کے تو ہے لیکن وطن چھوڑنا یہاں مراد نہیں بلکہ اپنے بھائی سے تعلقات چھوڑنا مراد ہے۔

قولہ "فیصد" "صدّیصدصداًوصدوداً باب نصر سے منہ پھیرنے اور روکنے دونوں معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں معنی اول یعنی مُنہ موڑنا مراد ہے جو بمعنی پہلو تہی کے ہے جبکہ صُد بضم الصاد پہلو کو کہتے ہیں۔

تشریح: ۔اگرچہ ہمارے یہاں نصوص میں مفہوم مخالف معتبر نہیں لہٰذا اصولی طور پر اس حدیث سے تین دن یا اس سے کم کے لئے قطع کلامی پر استدلال درست نہیں ہونا چاہیئے۔تاہم یہاں ایک دوسرا اصول بھی قابل ذکر و قابل اعتبار ہے وہ یہ ہے کہ انسان جو گناہ کرتا ہے مجموعی لحاظ سے ان کی دو قسمیں بنتی ہیں ایک حیوانی اور دوم شیطانی۔حیوانی سے مراد وہ گناہ ہیں جو انسانی طبیعت کا تقاضا ہوتے ہیں جبکہ شیطانی گناہ وہ ہیں جو شیطان کے اُکسانے پر معرض وجود میں لائے جاتے ہیں شیطانی گناہوں کا درجہ بمقابلہ حیوانی کے زیادہ شنیع و بدتر ہے۔

باب ماجاء فی کراهية الهجر للمسلم

[1] اخرجه البخاری فی الادب باب: ۵۷ و ۶۲ والاستئذان باب: ۹ ومسلم فی البر حدیث: ۲۳و ۲۵، ۲۶، وابوداؤد فی الادب باب: ۴۷ ومالک فی المؤطا حسن الخلق حدیث: ۱۵ بحواله الترغیب والترهیب ص: ۳۰۴ ج: ۳.

چونکہ انسان کے مزاج میں عام جانداروں کی طرح غضب وغصہ ودیعت کیا گیا ہے اس لئے طبعی طور پر ہر انسان کو ناگوار شے پر غصہ آتا ہے اور پھر کچھ دیر تک باقی رہتا ہے لیکن آدمی کو چاہئے کہ غصہ جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرے الا یہ کہ کسی جگہ غصہ مطلوب وممدوح ہو جیسے جہاد میں دشمنوں کے خلاف لڑنا مطلوب شرعی ہے لیکن جہاں غصہ مذموم ہو وہاں غصے کو طول دینا حیوانی گناہ کے دائرے سے تجاوز کر کے شیطانی گناہ کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

علی ہذا اگر کسی کو اپنے بھائی پر غصہ آجائے تو شریعت نے اس کی رعایت کے طور پر زیادہ سے زیادہ تین دن تک اس کو قطع کلامی کی اجازت دی ہے اس سے زیادہ کی ہرگز اجازت نہیں، بلکہ زیادہ کی صورت میں ایسے لوگوں کے اعمال بھی قبول نہیں ہوتے جب تک کہ وہ تعلقات کو بحال نہ کریں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مذکورہ حکم ذاتی مفادات اور دنیوی تعلقات کے بارے میں ہے اگر کوئی شخص دین کی خاطر یا کسی دینی مصلحت کے پیش نظر کسی سے قطع کلامی کرتا ہے تو وہ صورتیں مذکورہ وعیدات سے مستثنیٰ ہوں گی، مثلاً شوہر اپنی بیوی یا باپ اپنے بیٹے سے تادیباً بات چیت بند کرتے ہیں تو وہ ممنوع نہیں۔ اس طرح روایات میں کسی قسم کا تعارض نہیں رہتا کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کا اپنے صاحبزادے سے کلام بند کرنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہینے تک ازواجِ مطہرات سے قطع کلامی کرنا، غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ کرامؓ سے پچاس دنوں تک متارکت اور حضرت عائشہؓ کی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے قطع کلامی یہ تمام صورتیں تادیب اور غیرت ایمانی پر محمول ہیں۔ علی ہذا آج اگر ایک آدمی ایسا ہو جو علماء کے متعلق یا دین کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرتا ہو اور اسے روکنا مشکل ہو تو اس سے قطع کلامی جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو اس کے ساتھ مل بیٹھنے میں ایمان بھی خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے، ہاں ہمدردی اور شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش جاری رکھی جائے اور کسی طرح اسے راہِ راست لے آئے۔

پھر ان دو آدمیوں میں سے جو بھی اس جمود کو توڑ کر بات چیت میں پہل کرے گا اور عفو ودرگذر کرے گا وہ بلاشبہ اچھا ہے جس کی اقل مقدار ابتداء بالسلام ہے۔ حدیث باب کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سلام کرے گا، وہ اس وعید سے محفوظ رہے گا، اور جب دوسرا سلام کا جواب دے گا تو وہ بھی گناہِ ہجران سے بچ جائے گا گو کہ اس کا درجہ پہلے والے شخص سے کمتر ہوگا یعنی اسی بات چیت کے بارے میں۔ اسی طرح جو شخص ان میں سے منہ موڑے گا اور سلام بھی نہیں کرتا یا جواب بھی نہیں دیتا تو وہ گویا شیطان کی مٹھی میں ہے اس کا باطن قابلِ

رحم ہے اس کو اپنی اصلاح کی ضرورت معلوم ہونی چاہئے۔

باب ماجاء فی مواساةِ الأخ

"عن انس قال لماقدم عبدالرحمٰن بن عوف المدينة اخىٰ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بينه وبين سعدبن الربيع ،فقال له:هَلُمَّ أقا سمك مالى نصفين ولى امرأتان فاطلق إحدٰهما فاذاانقضت عدتهافتزوجها،فقال: بارك اللّٰه لك فى أهلك ومالك دُلُونى على السوق فدلوه على السوق فمارجع يومئذٍ الاومعه شئى من اَقطٍ وسمن قداستفضله،فراه رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بعدذالك وعليه وَضَرُصفرة فقال: مَهيَم؟ فقال تزوجت امرأة من الانصار قال: فما أصدَقتَها؟ قال"نواة"قال حميد:اوقال وزن نواة من ذهب فقال:اَولِم ولوبشاة"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ جب عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور سعد بن ربیع کے درمیان بھائی بندی فرمائی تو سعدؓ نے فرمایا: آؤ میں اپنے مال کو آپ کے ساتھ آدھا آدھا تقسیم کر لیتا ہوں، اور یہ کہ میری دو بیویاں ہیں ان میں سے (آپ کی پسندیدہ) ایک کو طلاق دیدوں گا پس جب اس کی عدت گذر جائے گی آپ اس سے شادی کر لیں گے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا کہ اللہ آپ کے بال بچوں اور مال میں برکت دے مجھے بازار کا پتہ بتلادیں چنانچہ انہوں نے بازار کا راستہ بتلادیا پس نہیں لوٹے وہ اس دن مگر دراں حالیکہ ان کے پاس کچھ پنیر اور گھی تھا جو کما کر لائے تھے، چنانچہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا کہ ان پر زردی کا اثر تھا (یعنی بیوی کے کپڑوں سے لگے ہوئے رنگ کا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواباً کہا کہ میں نے ایک انصاری عورت سے شادی کر لی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہر میں کیا دیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ایک گٹھلی کے برابر سونا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعوتِ ولیمہ کرو گو ایک ہی بکری سے ہو۔

لغات: ۔قولہ "مواساة" آسیٰ یواسی مواساة ہمدردی اور غم خواری کو کہتے ہیں چاہے مال سے ہو یا بغیر مال کے۔قولہ "اخیٰ" یہ بھی مواساة کی طرح ہے یعنی مواخاة سے بمعنی بھائی چارا اور بھائی بندی و دوستی کو کہتے ہیں۔قولہ "هلم" اس میں ہاءِ تنبیہ کے لئے ہے اور اصل لفظ اَلُمّ ہے اَلَمَّ الشئی نزدیک ہونے کو کہتے ہیں پھر ہمزہ کو ساقط کر کے ہائے تنبیہ کو شامل کر کے هلم بنا بمعنی تعال "آؤ"۔قولہ "وَضَرُ صُفرة" بفتح الواو والضاد

بمعنی اثر کے ہے۔ جبکہ صفرۃ بضم الصاد وسکون الفاء وہ زردی جو کسی خوشبو کی ہو۔ ایک روایت میں ''اثر صفرۃ'' کے الفاظ ہیں۔

قولہ "مھیم؟" ایک روایت میں ہے ''ماھذا'' جیسا کہ ترمذی باب ماجاء فی الولیمۃ کی روایت میں گذرا ہے۔ لہٰذا مھیم بمعنی استفہام کے ہے اس میں میم ثانی کو مجزوم پڑھا جائے گا۔ اگر رنگ کا اثر زیادہ تھا تو پھر یہ استفہام انکاری ہے کیونکہ مردوں کے لئے رنگین خوشبو لگانا ممنوع ہے، پھر جواب کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ میں نے نہیں لگائی ہے بلکہ بیوی کے کپڑوں پر سے لگی ہے۔ اور اگر رنگ قلیل تھا تو پھر مھیم نفسِ استفہام کے لئے ہے جو بمعنی استعلام ہوگا۔ حاشیہ میں ہے کہ یہ یمانی کلمہ ہے بمعنی ما امرک وما شانک؟۔

تشریح:۔ اس حدیث کی پوری تشریح (تشریحات ترمذی ج ۴ ص ۴۳۹) پر گذری ہے دیکھئے باب ماجاء فی الولیمۃ، ابواب النکاح۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر سے فراغت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار صحابہؓ کے درمیان مواخاۃ فرمائی جن کی تعداد نوے تھی۔ آدھے مہاجر اور آدھے انصار تھے۔ یہ صحابہ ایک دوسرے سے میراث لینے کے بھی مستحق ہوتے تھے[1] یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ''واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض'' [2] پھر یہ حکم منسوخ ہوا گویا جنگِ بدر تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ اس مواخاۃ کے مطابق حضرت سعد بن الربیعؓ جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے ہیں نے اپنے اسلامی بھائی حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کو مذکورہ پیش کش کی کہ مدینہ میں میرا مال سب سے زیادہ ہے آؤ میرا مال آدھا تم لے لو اور میری بیویوں میں جو تمہیں پسند آئے میں اسے آزاد کرلوں تم اسے اپنے نکاح میں رکھ لو، [3] مگر حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ چونکہ تجارت کا ذوق رکھنے والے صحابی تھے دوسری طرف حضرت سعدؓ کی یہ پیشکش کوئی معمولی آفر بھی نہ تھی بلکہ بہت بڑی قربانی تھی جسے انہوں نے شکریہ کے ساتھ واپس کرتے ہوئے تجارت کی لائن گذر بسر کے لئے اختیار فرمالی، جس میں اللہ نے بہت برکت دی یہاں تک کہ حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ امیر صحابہ میں شمار ہونے لگے گویا خلوصِ نیت کے ساتھ دوسروں کے حق میں دعا منعکس ہوکر داعی کے حق میں بھی قبول ہوجاتی ہے۔

باب ماجاء فی مواساۃ الاخ

[1] راجع للتیفصیل البدایۃ والنھایۃ لابن کثیر الدمشقی ص:۲۲۷ تا ۲۴۰ ج:۳،۴ "فصل فی مؤاخاۃ النبی ﷺ بین المھاجرین والانصار" دارالکتب العلمیۃ بیروت۔ [2] سورۃ الاحزاب آیت:۶۔

[3] کذا فی صحیح البخاری ص:۵۳۳ ج:۱ کتاب المناقب. حفیظ الرحمن الحنفی

باب کی حدیث سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان گہرے مراسم خوش گوار تعلقات اور انتہائی ایثار و ہمدردی کا ثبوت ملتا ہے جو اسلامی معاشرہ کا مثالی نمونہ ہے۔ یہ حدیث ان کے باہمی مضبوط تعلقات اور مستحکم معاشرتی مواساۃ کی ایک جھلک ہے۔ ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات پر مرسوم و مرقوم ہیں جن کی مثالیں تاریخ میں اور کہیں بھی نہیں ملتیں۔ یہ اسلامی رشتے کا اثر تھا۔

آج کل مسلمان عموماً ایک دوسرے سے نالاں رہتے ہیں شاید کسی کے ذہن میں یہ آئے کہ یہ اسلام کی وجہ سے ہے کلّا و حاشا ایسا ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اولین مسلمان بھی ایک دوسرے سے متنفر ہوتے۔ مگر جب آج کے مسلمانوں نے صدق دل سے اسلام کو اپنے سینوں میں جگہ نہ دی بلکہ صرف ظاہری لیبل مسلمان ہونے کا اپنے اوپر لگا لیا تو یہ تأثر ابھرنے اور جنم لینے لگا کہ گویا مسلمان نفرتیں پھیلاتے ہیں، بالفاظ دیگر جس طرح بادلوں سے بارش برستی ہے اور کسی کڑوے درخت میں اس کا پانی جمع ہو جاتا ہے تو وہ پانی جب ٹپکنے لگتا ہے تو کڑوا معلوم ہوتا ہے یہ آسمان سے کڑوا نہیں آیا تھا بلکہ درخت کی تلخی نے اسے تلخ اور کڑوا بنایا۔ اسی طرح خبیث النفس آدمی میں جب اسلام یا علم سرایت کرتا ہے تو اس کے اثرات بُرے محسوس ہوتے ہیں۔ حدیث کی باقی شرح خصوصاً دعوتِ ولیمہ اور باقی دعوتوں کی اقسام و احکام (تشریحات ترمذی ج:۴ص:۴۴۰ تا ص:۴۴۶) پر ملاحظہ ہو۔

باب ماجاء فى الغيبة

"عن ابى هريرة قال:قيل يارسول الله ماالغيبة؟قال:ذكركَ اخاكَ بمايكره،قال:اَرأيت ان كان فيه ماأقول؟قال:ان كان فيه ماتقول فقداغتبته وان لم يكن فيه ماتقول فقدبَهَتَّه"۔[1] هذا حديث حسن صحيح۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اے اللہ کے رسول غیبت کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرا اپنے کسی بھائی کا ایسا تذکرہ جو اسے

باب ماجاء فى الغيبة

[1] الحديث اخرجه مسلم وابوداؤد والنسائى، وقد روى هذا الحديث من طرق كثيرة وعن جماعة من الصحابة.

ناپسند ہو اس شخص نے کہا بتائیں اگر وہ بات جو میں کہہ رہا ہوں اس میں موجود ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ بات اس میں پائی جاتی ہو جو تم کہہ رہے ہو تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں نہیں جو تم کہہ رہے ہو تو پھر تو تم نے اس پر تہمت لگائی۔

لغات: ۔قولہ "غیبت" امام قرطبیؒ نے غیبت کی تعریف یوں کی ہے "ھی ذکر العیب بظھر الغیب" یعنی کسی کے پیٹھ پیچھے عیب بیان کرنا غیبت ہے۔اور اگر کسی کا عیب اس کے رُوبرُو بیان کرے تو اسے "لمز" کہتے ہیں چونکہ دوسرے پر طعنہ زنی درحقیقت اپنا ہی عیب بیان کرنا ہے اس لئے اللہ نے فرمایا "ولاتلمزوا انفسکم" [۲] یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو۔قولہ "ارأیت" ای اخبرنی مجھے بتائیں۔قولہ "بَھَتَّہ" واحد مذکر مخاطب کا صیغہ، بہتان سے ہے ایک ایسی بات کسی طرف منسوب کرنا جس سے وہ بَری اور پاک ہو بہتان کہلاتا ہے۔بہتاً کے معنی چونک پڑنے کے ہیں کیونکہ مبہوت جب یہ خبر سنتا ہے تو ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

تشریح: ۔امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "لاخلاف ان الغیبۃ من الکبائر" یعنی غیبت کے کبیرہ گناہ ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور قرآن میں اس کی صریح ممانعت آئی ہے "ولا یغتب بعضکم بعضاً" [۳] کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ غیبت کرنے والے کی مثال مکھی کی مانند ہوتی ہے جس طرح مکھی جسم کی گندی جگہ پر بیٹھتی ہے اسی طرح غیبت کرنے والا مغتاب کے عیوب اُجاگر کرتا ہے۔جس سے معاشرت بگڑ جاتی ہے، کیونکہ ظنون وشکوک بلکہ غلط فہمیاں اور نفرتیں جنم لیتی ہیں اس لئے شریعت نے اس پر سخت پابندی لگادی اور چونکہ یہ ایک شیطانی گناہ ہے اس لئے دوسری حدیث میں اسے زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ قرار دیا ہے اور اس لئے بھی کہ زنا سے تو آدمی توبہ تائب ہو کر بری الذمہ ہوسکتا ہے لیکن غیبت کرنے والا کہاں مغتاب کے پاس جانا گوارا کرتا ہے کہ میں نے تیری غیبت کی ہے مجھے معاف کردو۔

تاہم اگر غیبت سرزد ہوجائے اور مغتاب کو معلوم نہ ہوا ہو تو اس کا ممکنہ کفارہ یہ ہے کہ مغتاب کے لئے مغفرت کی دعا کی جائے چنانچہ بیہقی [۴] میں ہے "ان من کفارۃ الغیبۃ ان یستغفرلمن اغتبابہ تقول اللّٰھم اغفرلنا ولہ" پھر یہ دعا جہراً پڑھنی چاہئے تاکہ سامعین کے سامنے اپنی ضمنی تکذیب بھی ہوجائے اور ان کو بھی احساس ہوجائے۔البتہ اگر غیبت کسی دینی مصلحت پر مبنی ہو تو پھر جائز ہوگی جیسے راویوں پر جرح۔اور آج کل کے

---

[۲] سورۃ الحجرات آیت: ۱۱۔　[۳] سورۃ الحجرات آیت: ۱۲۔

[۴] رواہ البیھقی فی الدعوات الکبیر وقال فی ھذا الاسناد ضعف مشکوۃ المصابیح ص: ۴۱۵. قدیمی کتب خانہ.

روشن خیال قسم کے لوگوں سے عوام کو آگاہ رکھنے کے لئے ان کے ناموں کی تصریح کرنا یا کسی رشتہ ومشورہ میں کسی حقیقت تک پہنچنے کے لئے کسی کو موضوع بحث بنانا وغیرہ بشرطیکہ حد ضرورت سے زیادہ نہ ہو۔ پھر غیبت ہر ایک کی حرام ہے خواہ کوئی بچہ یا غلام کیوں نہ ہو۔ اسی طرح غیبت کسی بھی ایسے طریقے سے حرام ہے جس سے کسی کا عیب ظاہر ہو جاتا ہو خواہ قول وعمل سے ہو یا نقل اتارنے اور اشارہ کرنے سے ہو۔ (مزید تفصیل راقم کی کتاب نقشِ قدم کامل میں دیکھی جاسکتی ہے)

باب ماجاء فی الحسد

"عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لاتقاطعوا ولاتدابروا ولاتباغضوا ولاتحاسدوا وکونوا عبادالله اخوانا ولایحل للمسلم ان یهجراخاه فوق ثلاث "۔(حسن صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ مت موڑو، آپس میں بغض نہ رکھو، اور باہمی حسد نہ کرو بلکہ اللہ کے بندے اور باہم بھائی بن کر رہو اور جائز نہیں کسی مسلمان کے لئے کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑ دے (یعنی بات چیت بند کردے)۔

لغات:۔قولہ "لاتقاطعوا الخ" چاروں الفاظ باب مفاعلہ سے نہی کے صیغے ہیں جو جانبین سے فعل میں شراکت کو مقتضی ہے پس تقاطع، قطع سے ہے وصل کے مقابل آتا ہے "تدابر" "دُبُر" سے ہے بمعنی پیٹھ پھیرنے کے کنایہ ہے اعراض سے۔ "تباغض" "بُغض" سے ہے نفرت ودشمنی کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ "تحاسد" حسد سے ہے کسی کی نعمت کے زوال اور اپنے لئے حصول کی تمنا کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔الحمدللہ راقم نے نقشِ قدم فصل نمبر ۱۰ میں "حسد" پر تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے، حسد کا بنیادی سبب تو کینہ اور بغض ہے تاہم علاوہ ازیں کچھ اسباب اور بھی حسد کے بیان ہوئے ہیں جن کی تعداد سات ہیں (۱) عداوت کہ جب دشمن سے انتقام لینا مشکل ہو جائے تو حسد جنم لیتا ہے (۲) تعزز یعنی اپنے ہم پلہ آدمی کی عزت کا ناگوار ہونا (۳) تکبر کہ جب حاسد کی نظر ایسے شخص کی نعمت پر پڑ جائے جو اس کی نظر میں کمتر ہو تو وہ برابری یا محسود کی ترقی وبرتری کے خوف سے حسد کرنے لگتا ہے (۴) تعجب یعنی جب اپنی نظر

میں اپنے سے کمتر پر نعمت دیکھے تو تعجب کرتا ہے اور اسے ہٹانے کی تمنا کرنے لگتا ہے (۵) جب اپنے مقصد کے حصول میں کسی کو شریک یا رکاوٹ دیکھے تو راستہ صاف کرنے کی غرض سے حسد کرتا ہے (۶) حُبِ جاہ وریاست جس میں مزاحم بننے والے پر حسد ہوتا ہے (۷) خباثت نفس وباطن۔

علی ہذا سب سے زیادہ حسد ان لوگوں میں ہوگا جہاں یہ سارے اسباب بیک وقت پائے جاتے ہوں اور جہاں یہ اسباب جتنے کم ہوں گے اسی تناسب سے حسد میں کمی ہوگی اور جہاں بالکل کوئی سبب نہ پایا جائے وہاں کوئی حسد نہ ہوگا۔

بہرحال حسد ایک گندی بیماری ہے جو رذائل اخلاق میں غیر معمولی طور پر مہلک سمجھے جانے والی شیطانی خصلت ہے۔ ابلیس حسد نہ کرتا تو ملعون نہ بنتا۔ قابیل قاتل نہ بنتا۔ یہود گمراہ نہ ہوتے۔ اور ابوجہل عدو اللہ نہ بنتا۔ حسد نیکیوں کو ایسا کھاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجہ۔[۱]

بہرحال اگر کسی کو حسد کا عارضہ لاحق ہو تو اس سے نکلنے کی کوشش لازمی ہے جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے کہ کیوں تجھے مسلمان کی نعمت پر تنگ دلی محسوس اور زوال کی تمنا ہورہی ہے پھر حسد کے مقتضا کے خلاف چلتے ہوئے محسود کے لئے دعا کرتا رہے اور کسی سے حسد کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی حسد کے مطابق کوئی عمل کرے۔ ممکن ہے کہ اللہ اس کا دل صاف کر کے اس پر رحم فرمادے۔ یہ حکم حسد کی اس نوع کا ہے جس میں دوسرے کی نعمت کے زوال اور اپنے لئے حصول کی تمنا ہو لیکن اگر اس کے زوال کی تمنا نہ ہو بلکہ آدمی چاہے کہ میں اس جیسا بن جاؤں تو یہ چیز قسم اول کی طرح حرام وناجائز نہیں بلکہ اگر ایسی تمنا اور کوشش کسی دینی کام میں ہو تو یہ محمود ہے اور مطلوب بھی ہے جیسا کہ اگلی حدیث میں ہے حسد کی اس قسم کو غبطہ کہا جاتا ہے اور اگر کسی امرِ مباح میں یہ کیفیت آجائے مثلاً کسی کے پاس بہت سارا مال ہے یا اور طرح کی کوئی دنیوی نعمت ہے اور دوسرا اس کی تمنا کرتا ہے تو یہ اگر چہ حرام تو نہیں مگر اس سے بچنا افضل اور درجۂ کمال ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کو کسی نعمت میں دیکھا کہ وہ اس نعمت کی وجہ سے بگڑتا جارہا ہے جیسے مالدار آدمی تو اس نیت سے اس کے زوال کی تمنا کرنا کہ وہ فاسق نہ بن جائے بھی جائز ہے۔ عارضہ میں ہے:

باب ماجاء فی الحسد

[۱] سنن ابی داؤد ص: ۳۲۴ ج: ۲ "باب الحسد" کتاب الادب، سنن ابن ماجہ ص: ۳۱۰ "باب فی الحسد" ابواب الزھد، ایضاً رواہ البیھقی وغیرھما بحوالہ الترغیب والترھیب ص: ۳۴۷ ج: ۳.

"قال علماء نا:الا ان تکون تلك النعمة یستعین بھاعلی المعصیة فاذااحب زوالھالذالك عنه کان جائزاً"۔

حدیث کے باقی تین الفاظ کی تشریح مقابل الفاظ کے تناظر میں سمجھنا آسان تر ہے جیسا کہ لغات کے بیان میں گذرا ہے۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ مقاطعہ باہمی حقوق واجبہ کے ترک کو کہتے ہیں۔ جبکہ تدابر یعنی اعراض محسوس اور معقول دونوں کو شامل ہے۔ محسوس کی صورت جیسے ایک دوسرے سے منہ موڑنا اور راستہ تبدیل کرنا اور معقول جیسے عقائد وآراء اور اقوال میں اختلاف کرنا۔ جبکہ بغض محبت کے مقابلے میں آتا ہے یعنی ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے کی کوشش نہ کرو۔ محشی نے لمعات سے نقل کیا ہے کہ دین میں اختلاف مت کرو کیونکہ بدعات کے ارتکاب سے نفرتیں اور عداوتیں جنم لیتی ہیں۔

دوسری حدیث:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی حسد اچھا نہیں مگر دو خوبیوں میں۔ ایک خصلت اور خوبی اس شخص کی جس کو اللہ نے مال دیا ہو پس وہ اس میں سے رات اور دن کی ساعات میں خرچ کرتا رہتا ہے۔ دوسری خوبی اس شخص کی جس کو اللہ نے قرآن (کا علم) دیا ہو پس وہ رات اور دن کی گھڑیوں میں اس کے مطابق رہتا ہے۔

لغات:۔ "اثنتین" اس روایت میں اثنتین سے مراد خصلتین ہیں۔ قوله "رجل" اور رجل مرفوع ہے جو قائم مقام مضاف ہے تقدیر اس طرح ہے "خصلة رجلٍ"۔ اور اگر "اثنین" کا لفظ ہو یعنی بغیر تائے تانیث کے تو پھر رجل مجرور ہے بنا بر بدلیت اور حذف کی ضرورت نہیں۔ قوله "آناء" جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد "اِنَیٌ" ہے جیسے "اَمعاء و مِعَیٌ" ہے مراد ساعات ہیں۔ قوله "یقوم بہ" سے مراد عمل ہے جو تلاوت اور دیگر تمام متعلقہ امور جیسے تعلیم، قضا، فتوی اور اس کے احکام کے مطابق خود عمل کرنے وغیرہ سب کو شامل ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث مبارکہ کے مطلب میں شارحین کی آراء مختلف ہیں۔ باب کی سابقہ روایت میں آپ نے پڑھ لیا کہ حسد کی وہ قسم جو کسی دینی امر سے متعلق ہو اور اس میں دوسرے کی دینی نعمت کے زوال کی تمنا نہ ہو بلکہ اپنے لئے حصول کی خواہش اور کوشش ہو تو یہ جائز ہے اس کو غبطہ کہا جاتا ہے۔ ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہی مطلب متعین کیا ہے۔ جبکہ بعض حضرات اس کو مبالغہ فی التحریص پر محمول کرتے ہیں یعنی اگر حسد جائز ہوتا تو پھر انہی دو خصلتوں میں جائز ہوتا جیسا کہ حاشیہ پر ہے یعنی اس سے حسد کا جواز بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ان دو خصلتوں کو اُجاگر کرنا مقصود ہے، یہ ایسا ہے جیسے ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ اگر میں کسی کو یہ اجازت دیتا کہ وہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو اپنے شوہر کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا،[۲] تو جس طرح اس حدیث میں سجدے کا جواز بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ عورت پر شوہر کی اطاعت لازم کرنا مراد ہے۔اس مبالغے کے لئے مذکورہ تعبیر اختیار فرمائی اسی طرح باب کی حدیث میں بھی ہے۔

باب ماجاء فی التباغض

"عن جابر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:ان الشیطان قد أیِسَ ان یعبدہ المصلون ولکن فی التحریش بینھم"۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بے شک شیطان اس بات سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ مسلمان اس کی عبادت کریں،لیکن ان کی باہم لڑانے کے بارے میں مایوس نہیں ہوا۔

لغات:۔ تباغض کا مطلب سابقہ باب میں گذرا ہے۔قولہ "أیِسَ" بفتح الہمزہ وکسر الیاء ماضی کا صیغہ ہے ایاساً مصدر ہے مایوسی کو کہتے ہیں۔قولہ "التحریش" "حرّشَ بین القوم ایک دوسرے کے خلاف لڑانے اور بھڑکانے کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث میں "شیطان" سے مراد ابلیس علیہ اللعنۃ ہے اور "مصلون" سے مسلمان مراد ہیں۔جبکہ مسلم شریف[۱] کی روایت میں اس پر "فی جزیرۃ العرب" کا اضافہ ہے۔مگر عبادت شیطان سے مراد کیا ہے تو اس میں متعدد اقوال ہیں۔

پہلا قول:۔ یہ ہے کہ اس سے بتوں کی عبادت مراد ہے پس مطلب یہ ہوا کہ شیطان کو یقین ہو چلا ہے کہ جزیرۃ العرب میں لوگ پھر کبھی بھی شرک اور بتوں کی پوجا پاٹ کی جانب نہیں لوٹیں گے جیسا کہ ساڑھے چودہ سو سال سے مشاہدہ اور تاریخی حقیقت ہے اس لئے امام نوویؒ نے اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا ہے اور جہاں تک مسیلمہ کذاب کے فتنے کا تعلق ہے تو اگر چہ اس میں بعض لوگوں

---

[۲] الحدیث اخرجہ الترمذی کتاب النکاح باب:۱۰، ایضاً ابن ماجہ کتاب النکاح باب:۴، ایضاً ابوداؤد کتاب النکاح باب:۴۰، ایضاً رواہ الحاکم فی المستدرک والبزار واحمد والنسائی، بحوالہ الترغیب والترہیب ص:۳۵ ج:۳۔

باب ماجاء فی التباغض

[۱] صحیح مسلم ص:۳۷۶ ج:۲ "باب تحریش الشیطان وبعثہ الخ" کتاب صفۃ المنافقین۔

کا مرتد ہونا ثابت ہے لیکن انہوں بتوں کی عبادت نہیں کی تھی۔ البتہ شیطان اپنا کام ان کی باہمی نفرتوں سے نکالتا ہے جن کی بنا پر لوگ آپس میں اختلافات اور جھگڑوں بلکہ قتال کا شکار ہو جاتے ہیں جیسا کہ آج کل مشاہدہ عام ہے۔

دوسرا قول:۔ یہ ہے کہ عبادت سے مراد ارتداد ہے اور مطلب یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی امت کے گمراہ ہونے اور مرتد ہونے سے شیطان مایوس ہو چکا ہے، گو اِکادُکا واقعات ارتداد کے ہوں گے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ پوری امت والعیاذ باللہ صراط مستقیم سے ہٹ جائے۔ یہ قول علامہ تورپشتیؒ کا ہے۔

تیسرا قول:۔ ملاعلی قاریؒ کا ہے کہ شیطان اس سے مایوس ہو گیا ہے کہ یہود ونصاریٰ کی طرح یہ لوگ بھی توحید کے ساتھ شرک کو ملا دیں گے۔ اس توجیہ کے مطابق پہلی توجیہ کی طرح جزیرۃ العرب کی قید لازمی ہوگی۔ جبکہ دوسری توجیہ میں حکم عام مسلمانوں کو شامل ہے خواہ وہ جزیرۃ العرب سے باہر رہنے والے کیوں نہ ہوں۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس قسم کی احادیث کا حکم ابدالابد کے لئے نہیں ہوتا ہے بلکہ قیامت کے قریب تک کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں اور اُس حدیث میں کوئی تعارض نہ سمجھا جائے کہ جب تک روئے زمین پر اللہ، اللہ کہنے والا ہوگا اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی، اور یہ کہ قیامت شرار الناس پر قائم ہوگی وغیر ذالک من الاحادیث۔[۲]

سوال:۔ اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ امت کے آپس میں جھگڑے اور اختلافات ہوں گے تو پھر ایسے یقینیات سے دامن بچانا کیونکر ممکن ہے؟ اور انسان ایسے میں کیونکر مکلف بن سکتا ہے؟

جواب:۔ اس قسم کی احادیث یا جیسے "لتتبعنّ سنن مَن قبلکم" الخ[۳] سے بلاشبہ یہ سب کچھ رونما ہونا معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی یہود وغیرہ کی مشابہت اور باہمی جھگڑے ممنوع ہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرامین کا مقصد یہ ہے کہ امت کی غالب اکثریت ان چیزوں میں مبتلا ہوگی مگر ایک طائفہ منصورہ ایسا بھی ہونا چاہئے جو قیامت تک اپنا دامن بچائے رکھے۔ تدبر وتشکر

---

[۲] راجع للاحادیث مشکوٰۃ المصابیح ص: ۴۸۱ مکتبۃ الحسن لاھور.

[۳] رواہ البخاری ص: ۱۰۸۸ ج: ۲ "کتاب الاعتصام" ایضاً اخرجہ فی الانبیاء مسلم ص: ۳۳۹ ج: ۲ کتاب العلم ابن ماجہ ص: ۲۸۷ ابواب الفتن.

باب ماجاء فی اصلاح ذات البین

"عن اسمآء بنت یزید قالت قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :لایحل الکذب اِلافی ثلاث :یُحَدِّث الرجل امرأتہ لِیُرضیھاوالکذب فی الحرب ،والکذب لیصلح بین الناس وقال محمودفی حدیثہ :لایصلح الکذب الافی ثلاث"۔

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جھوٹ بولنا جائز نہیں مگر تین مواقع پر (جائز ہے) کوئی شخص اپنی بیوی سے جھوٹی بات کرے تا کہ اسے راضی کردے، اور جنگ (جہاد) میں جھوٹ بولنا اور اس لئے جھوٹ بولنا تا کہ لوگوں کے درمیان صلح کرادے۔ یہ الفاظ امام ترمذیؒ کے ایک شیخ محمد بن بشار کے ہیں جبکہ ان کے دوسرے شیخ محمود بن غیلان نے ''لایحل'' کے بجائے ''لایصلح الکذب ''نقل کیا ہے مطلب دونوں کا ایک ہے۔

باب کی پہلی حدیث شہر بن حوشب راوی کی وجہ سے اور ارسال کے شبہ کی بناء پر درجہ صحت سے کم ہے مگر باب کی دوسری حدیث صحیح ہے جو حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ وہ شخص جھوٹا (غلط جھوٹا) نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے (اور اس کے لئے) اس نے بھلی بات کہی یا اچھی بات پہنچائی۔

لغات:۔قولہ "ذات البین" ذات کا لفظ کسی شے کی حقیقت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم کبھی اس سے مراد صفات بھی ہوتی ہیں یہاں یہی مراد ہے جبکہ ''بین'' کا لفظ اصالۃً ظروف کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس کا اطلاق دو چیزوں کے درمیان حالت پر بھی ہوتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔ علی ہذا لفظ ذات یا تو زائد ماننا پڑے گا یا پھر ''بین'' معنی ظرفی پر محمول کرنا ہوگا پس معنی یہ ہوگا یہ باب لوگوں کے درمیان باہمی تعلقات کی اصلاح کے بارے میں ہے۔

قولہ "لیس بالکاذب" ای بالکاذب المذموم ۔قولہ "او نما خیراً" لفظ ''او'' شک من الراوی کے لئے ہے۔ ''نما'' جب میم کی تخفیف کے ساتھ ہو تو اچھی بات پہنچانے کو کہتے ہیں اور جب میم کی تشدید کے ساتھ ہو تو بمعنی چغلی کے آتا ہے جبکہ ''انما'' میں دونوں قول ہیں۔

تشریح:۔اس حدیث مبارکہ کی آسان تشریح ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس میں تینوں کذبات کو حقیقی

جھوٹ پر محمول کیا جائے اور ان کو کذب مذموم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تحکم حدیث باب جیسا کہ علماء کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ جبکہ دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ ان کذبات کو اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جو نسبت کذبات ثلاثہ کی کی گئی ان کو معاریض اور توریہ پر محمول کیا جائے جس کا مطلب ہے لفظ کے معنی متبادر کو چھوڑ کر غیر متبادر لیا جائے تو بنسبت الی المخاطب اگر چہ یہ جھوٹ سا ہو گا لیکن عند المتکلم یہ سچ ہی ہوگا۔ چنانچہ ابن العربیؒ نے اس مسئلے پر ''باب ماجاء فی النصیحۃ'' میں بحث فرمائی ہے پھر اس کی مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مثاله ان يقول لاهله :ابتعتُ لكِ هذاالثوب بخمسة دنانيروهويريددراهم "۔

چونکہ دنانیر کا اطلاق دراہم پر ہوتا ہے مگر علی القلیل اس لئے غیر متبادر ہوا تو عورت اس سے مراد دنانیر سمجھے گی جبکہ وہ دراہم ہیں۔

"و كقوله للرجل سمعت من تكره يدعوك ويذكرك بخير،يريدبذالك عنددعائه للمسلمين فانه داخل فيهم"۔

یعنی ایک شخص سے کہا جائے کہ تم جس آدمی کو اپنا دشمن ومخالف سمجھتے ہو وہ تو تیرے حق میں دعائیں مانگتا ہے تو یہ جھوٹ بھی نہ ہوگا کہ اس کی مراد عام مسلمانوں کے لئے دعا ہے جس میں مخاطب بھی آ گیا ہے جبکہ وہ مخاطب اس کو خصوصی طور پر اپنے حق میں سمجھے گا۔

"وفي الحرب مثل ان يقول لِلعدُوّ :قدجاءكَ مالاطاقة لك به يعني بالدين والاسلام ونحوذالك "۔

یعنی یہ کہنے سے کہ تمہارے پاس ایسی چیز آئی ہے جس کا مقابلہ تم نہیں کر سکتے ہو، دشمن اس کو فوج پر محمول کرے گا مگر آپ کی مراد اس سے دین اسلام ہوگی تو یہ سب صورتیں معاریض کی ہوئیں۔ لہٰذا حدیث کو احتیاطاً اسی صورت پر محمول کرنا چاہئے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اقوال کو بھی معاریض کہیں گے۔

تحقیقی تشریح: ۔ مذکورہ اختلاف درحقیقت ایک فرعی اختلاف ہے بنیادی اختلاف یہ ہے کہ آیا صدق اور کذب کا حسن اور قبح عقلی وذاتی ہیں یا شرعی؟ تو مسلم الثبوت میں المقالۃ الثانیۃ کے تحت اس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اتنی سی بات تو اجماعی ہے کہ افعال کا حسن وقبح اس اعتبار سے کہ کونسی چیز کمال ہے

اور کونسی نقصان ہے اور کونسی چیز دنیوی غرض سے موافق ہے اور کونسی نقصان دِہ ہے عقل سے معلوم کی جاسکتی ہے کیونکہ ساری دنیاوالے اشیاء میں ایسی اچھائی اور برائی کی تمیز بغیر شریعت کے جانتے ہیں مثلاً علم کا حَسن ہونا اور جہل کا قبیح ہونا، البتہ حسن اور قبح بمعنی عنداللہ مدح اور ذم کا استحقاق بھی عقلی ہے یا محض شرعی ہے؟؟؟

تو اشاعرہ کہتے ہیں کہ شرعی ہیں لہٰذا شریعت جس چیز کا حکم دے تو وہ حسن اور جس سے روکے تو وہ قبیح ہوگی حتی کہ اگر شریعت اس حکم کو منسوخ کر کے مامور بہ اور منہی عنہ کو مامور بہ قرار دیدے تو حکم بھی بدل جائے گا حَسن قبیح بن جائے گا اور قبیح حَسن۔

جبکہ اکثر حنفیہ (ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک حُسن اور قُبح مطلقاً عقلی ہیں یعنی ذاتی ہیں یا ایسی صفت کی بناء پر ہیں جو لازم الذات ہو، تاہم ہمارے حنفیہ کے نزدیک اس کے عقلی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حکم شرع کے بغیر بھی وہ مشروع ہو بلکہ یہ نزول شرع پر موقوف ہے حتی کہ اگر اس فعل کے بارے میں شرع وارد نہ ہو تو وہاں کوئی حکم شرعی نہ ہوگا۔

تاہم محققین حنفیہ جیسے امام ابومنصور الماتریدی وغیرہ کے نزدیک بعض اشیاء کا حُسن وقبح تو عقلی ہیں لیکن سب کا نہیں۔

"ثم من الحنفية من قال ان العقل قديستقل فی ادراك بعض احكامه تعالىٰ فاوجب الايمان وحَرَّم الكفرو كل مالايليق بجنابه تعالىٰ حتى على الصبى العاقل ورُوى عن ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ: لاعذرلاحدفی الجهل بخالقه لمايرى من الدلائل" الخ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان کا حُسن اور کفر کا قُبح عقلی ہیں حتی کہ اگر ایک بچہ کسی جنگل میں تنِ تنہا بالغ ہوجائے تو اس پر از روئے عقل لازم اور واجب ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک پر ایمان لائے اور جو صفات اللہ کے شایان ہیں ان پر بھی ایمان لائے جبکہ صفاتِ نقصان سے اللہ کی تنزیہ بھی اس پر واجب ہے تاہم نماز روزہ وغیرہ اس پر بغیر اخبار شارع کے واجب نہ ہوں گے کہ ایمانیات عقلی ہیں اور فرعیات نقلی ہیں۔

علی ہذا حدیثِ باب کا مطلب اشاعرہ کے نزدیک تو بالکل آسان ہے کہ جب شارع نے کذب کی مندرجہ بالا صورتیں جائز قرار دیدیں تو یہ حسن بن گئیں لہٰذا اب ان میں کسی طرح کا کوئی قبح باقی نہ رہا لہٰذا ان کے نزدیک حدیث کو ظاہر معنی اور کذب حقیقی پر محمول کرنے میں کوئی اصولی پیچیدگی نہیں۔

لیکن ہمارے حنفیہ اور معتزلہ کے نزدیک اس کو کذب حقیقی پر محمول کرنے سے یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ اگر صدق وکذب کا حُسن وقبح عقلی ہیں تو پھر ایک قبیح چیز کیسے جائز ہوسکتی ہے جبکہ شارع اور حکیم قبیح کا حکم نہیں دیتا؟

بلاشبہ یہ ایک وزنی اعتراض ہے مگر اس کا حل یہ ہے کہ اولاً تو ہمارے نزدیک ان کذبات سے مراد معاریض ہیں علی ہذا یہاں کسی قبیح کو جائز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ثانیاً علامہ بہاری رحمہ اللہ نے مسلم الثبوت میں فرمایا ہے: ''والحق عندنا الاطلاق الاعم فلا یرد النسخ علینا ''یعنی ہمارے نزدیک حق بات اور صحیح موقف یہ ہے کہ حُسن اور قبح عام ہیں کبھی فعل کی ذات میں ہوتے ہیں، کبھی صفات لازمہ وحقیقیہ کی وجہ سے اور کبھی کسی عارض کی وجہ سے۔ لہٰذا جس طرح ایک حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے تو ہم اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ قبل النسخ اس کا حسن عارض کی وجہ سے تھا جواب ختم ہوا تو اسی طرح کذب میں بھی قبح عارضی ہوسکتا ہے۔ ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی باب ماجاء فی النصیحۃ میں بھی یہی بات کہی ہے:

"حقیقة: الکذب حرام لا لِذاته کما تقوله المبتدعة (المعتزلة) وانما هو لما فیه من المضرة ولذالك یجب لِدفع المضرة کستر المسلم المظلوم علی الظالم"۔

(عارضہ ص: ۸۷ ج: ۷)

ثالثاً ہم کہتے ہیں کہ اگر مان لیا جائے کہ صدق اور کذب کا حسن وقبح عقلی ہیں تو پھر ہم کہتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ امور عارضہ کبھی کبھار اتنے زیادہ اور طاقت ور ہوتے ہیں جن کی بنا پر ذاتی تقاضا مغلوب ہوجاتا ہے، اس کو علم بلاغت والے مقتضائے حال سے بھی تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ علامہ تفتازانیؒ نے مطول میں ''الحمد للہ'' کی شرح میں کہا ہے کہ لفظ الحمد کو اسم ذات پر کیوں مقدم کیا حالانکہ اسم ذات مقدم ہونا چاہئے تھا۔

غرض کبھی شرع کا ایک حکم کسی شر قلیل کے وجود پر موقوف ہوتا ہے مگر حکیم خیر کثیر کا حکم شر قلیل کی وجہ سے ترک نہیں کرتا پس جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ ان کذبات میں جو فوائد ہیں وہ ان کے قبائح ذاتیہ سے کہیں زیادہ ہیں لہٰذا قبح ذاتی حُسن عارضی کے ساتھ منافی نہیں۔

یہاں مسلم الثبوت کی عبارت قارئین کی افادہ کی غرض سے نقل کی جاتی ہے:

"وقالوا (ای الاشاعرہ) او لَّالو کان ذاتیا لم یختلف وقد یتخلّف فان الکذب

مثلاًیجب لعصمة نبیّ وانقاذِ برّی عن سفاّك والجواب ان هناك ارتكاب اقل القبیحتین لاان الكذب صارحَسَناًقیل یردعلیه ان هذاالكذب ههناواجب فیدخل فی الحسن اقول الحسن لغیره لاینافی القبح لذاته وهذامعنی قولهم الضرورات تبیح المحذورات ...الی ان قال ...قال الشیخ فی الاشارات: الشر داخل فی القدربالعرض "۔

اس پر محشی لکھتے ہیں:

"فان التقدیرالإلهی انمایتعلق اولاًوبالذات بالخیرلکنه قدیکون متوقفاًعلی وجودالشرالقلیل ولیس من شان الحکیم ان یترك الخیرالکثیرلاجل الشرالقلیل"الخ ۔

یہ بحث انتہائی دلچسپ ہے مگرخوفِ تطویل سے بچنے کے لئے اسی قدر پر اکتفاء کرتا ہوں کیونکہ آج کل اساتذہ وطلبہ کا مزاج بن گیا ہے کہ مشکل اور طویل ابحاث سے اپنا دامن اس طرح بچائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے قیام وصیام کا پابند شخص گندگی سے اپنے دامن کی حفاظت کرتا ہے۔بہرحال انحطاطِ علم پر رونے سے زیادہ توقعات وابستہ کرنا خیالِ محال ہے، یہ امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ کوئی مُحصّل ہمارے آنسوؤں کو خشک کرنے اور رونے کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کے لئے آگے بڑھے گا اور محقق عالم بننے کا ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر کرے گا۔الا ماشاء اللہ وماذالک علی اللہ بعزیز

بہرحال اگر کسی کو یہ نفیس بحث دیکھنی ہوتو مسلم الثبوت کا مقالہ ثانیہ مع الحواشی اور ابن قیمؒ کی مفتاح دارالسعادۃ وغیرہ کتب سے مراجعت فرمائے۔

باب ماجاء فی الخیانة والغِش

"عن ابی صرمة ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال:من ضارّضارّالله به ومن شاق شاق الله علیه "(حسن غریب)۔

حضرت ابوصِرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی کو نقصان پہنچائے اللہ اس کو نقصان پہنچائے گا اور جو شخص کسی کو مشقت میں ڈالے (یا کسی سے پہلو تہی کرے) تو اللہ تعالی

اس کو مشقت میں ڈالے گا (یا اللہ اس سے اعراض کرے گا)۔

دوسری حدیث:۔ باب کی دوسری حدیث حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص ملعون (رحمت سے دور) ہے جس نے کسی مسلمان کو نقصان پہنچایا، یا اس کے ساتھ دھوکہ اور دغا کیا۔ (حدیث غریب)

لغات:۔قولہ "الخیانۃ" یہ لفظ امانت کے مقابل آتا ہے۔ خیانت کی تفصیل "باب ماجاء فی شفقۃ المسلم علی المسلم"، میں "لایخونہ" کے تحت گذری ہے۔ قولہ "الغِش" بکسر الغین یہ دونوں الفاظ گویا نصیحت وخیرخواہی کے مدمقابل آتے ہیں اس لئے غش کا اطلاق دھوکے، ملاوٹ اور کینہ وغیرہ سب پر ہوتا ہے۔ قولہ "من ضارّ" راء کی تشدید کے ساتھ ضرر اور مضرت سے ہے۔ قولہ "ضارّ اللہ بہ" یعنی اللہ اس کو ضرر میں مبتلا فرمائیں گے۔ قولہ "ومن شاق" بتشدید القاف، مشقت سے بھی ہوسکتا ہے اور شق بمعنی پہلوتہی سے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ جس آدمی سے اختلاف ہوتا ہے تو وہ ایک شق یعنی کنارے پر ہوتا ہے اور یہ دوسرے پر ہوتا ہے اوپر ترجمہ میں بین القوسین اس معنی کو بیان کیا گیا ہے۔

تشریح:۔ حضرت ابوصرمہؓ بکسر الصاد کی یہ روایت مسند احمد، سنن ابی داؤد ونسائی اور ابن ماجہ[1] میں بھی ہے۔ خیانت اور دھوکہ دونوں شیطانی صفات ہیں جس طرح شیطان آدمی کو جھوٹی تسلیاں دیتا ہے اور فریب دے کر اسے صحیح راستے سے ہٹاتا ہے اور جھوٹ کو مزین کرکے اس کی نظر میں حسین بناتا ہے، اسی طرح گناہ کے جملہ امور سے اس کا دل بہلاتا ہے جبکہ وہ درحقیقت دھوکہ ہے، اسی طرح جو شخص یہ کام اپنے کسی بھائی کے ساتھ کرے گا گویا وہ شیطان کا بھائی ہے، اس لئے دوسری حدیث میں اسے ملعون یعنی اللہ عزوجل کی رحمت سے بعید قرار دیا، اعاذنا اللہ من غضبہ وعذابہ۔

باب ماجاء فی الخیانۃ والغش

[1] سنن ابی داؤد ص: ۱۵۶ ج: ۲ "باب فی القضاء" کتاب القضاء، سنن ابن ماجہ ص: ۱۶۹ "باب من بنی فی حقہ مایضر بجارہ" ابواب الاحکام، مسند احمد ص: ۴۸۷ ج: ۴ حدیث: ۱۵۳۲۸، عن ابی صرمۃ عن رسول اللہ ﷺ: من ضار اضرہ اللہ ومن شاق شقہ اللہ علیہ. الحنفی عفی عنہ

باب ماجاء فی حق الجوار

"عن مجاهد ان عبدالله بن عمرو ذُبحت له شاة فی اهله فلما جاء قال اَهَدَيتُم لِجارنا اليهودي؟ اَهَدَيتُم لِجارنا اليهودي؟ سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: مازال جبرئيل يوصيني بالجار حتى ظننتُ انه سَيُوَرِّثُه"۔ [۱]

حضرت مجاہد سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کے لئے ان کے گھر میں بکری ذبح کی گئی تھی جب وہ تشریف لائے تو (گھر والوں سے) پوچھا کہ کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو بھی (گوشت کا) ہدیہ دیا ہے، (دومرتبہ فرمایا پھر حدیث بیان کرنے لگے) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل مجھے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اس قدر تاکید فرماتے کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید اسے وارث قرار دیں گے۔

تشریح:۔قولہ "الجوار" اصح وافصح بکسر الجیم ہے جبکہ ضمہ بھی جائز ہے۔قولہ "اَهديتم" یہاں ایک ہمزہ مقدر ہے جو برائے استفہام ہے یعنی أأهديتم، إهداء سے ہے بمعنی ہدیہ دینا۔قولہ "سيورثه" ورّث باب تفعیل سے میراث دینے کو کہتے ہیں۔ جبکہ مجرد سے میراث لینے کے معنی میں آتا ہے، پھر سیورثہ کی ضمیر اللہ کی طرف بھی راجع ہوسکتی ہے اور جبرئیل کی طرف بھی، اس صورت میں نسبت مجازی ہوگی۔

تشریح:۔اس حدیث سے ہمسایہ کے حق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنا مؤکد ہے ایک طرف حضرت عبداللہ بن عمرو کا کلام ذوالمرام اور دوسری جانب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی بارہا تاکید اور وصیت، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو وارث بنادیا جائے گا۔

پھر اس توریث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ تاکید صرف نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مختص تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کوئی مادی ومالی میراث نہیں ہوتی ہے گو کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ گمان اپنے پڑوسی کے بارے میں اپنی میراث کے بارے میں بھی ہو اور یہ اس وقت کی بات ہو جب آپ صلی

باب ماجاء فی حق الجوار

[۱] اخرجه ايضاً ابوداؤد ص: ۳۵۴ ج: ۲ "باب فی حق الجوار" كتاب الادب، وقال الحافظ وقد روى هذ المتن من طرق كثيرة وعن جماعة من الصحابة رضى الله عنهم الترغيب والترهيب ص: ۲۴۶ ج: ۳۔

اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہیں دیا گیا تھا کہ انبیاء علیہم السلام نہ میراث لیتے ہیں اور نہ ہی دیتے ہیں۔ [۱] لیکن بے غبار بات یہ ہے کہ یہ حکم امت کے بارے میں ہے لہٰذا عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ "یوصینی جبرئیل بان آمُرَ الامۃ برعایۃ حقوق الجار حتی ظننتُ انّ یحکم بتوریث احد الجارین الآخر"۔ کما فی الحاشیۃ

بہرحال ہر ایک جانتا ہے کہ اس کلام میں بہت تاکید اور مبالغے سے ہمسایہ کے حقوق اُجاگر کئے گئے ہیں، علاوہ ازیں قرآن سمیت بہت سی احادیث مبارکہ میں پڑوسی کا حق بیانِ مؤکد کے ساتھ مروی ہے مثلاً باب کی دونوں حدیث اور بخاری شریف کی حدیث "من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلیکرم جارہ" اور (ص:۸۸۹ ج:۲) کی ایک روایت میں ہے "فلایؤذی جارہ" اور بخاری کے اسی صفحہ پر ہے "واللّٰہ لایؤمن، واللّٰہ لایؤمن، واللّٰہ لایؤمن، قیل ومن یارسول اللّٰہ؟ قال: الذی لایأمن جارہ بوائقہ" (شرارتوں سے) اس کے علاوہ بھی بہت احادیث ہیں مگر اختصار کے پیش انہیں ذکر نہیں کیا جاسکا۔

قصہ مختصر پڑوس کے حقوق تو ہیں مگر کیا ہیں تو اس پر اتفاق ہے کہ حسن سلوک کے تمام شعبے مراد ہیں۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس سلوک میں سارے جیران وہمسایہ داخل ہیں خواہ وہ کوئی بھی ہو اس میں کافر و مسلمان نیک وفاسق اور امیر وفقیر سب شامل ہیں البتہ جس پڑوسی سے حقوق کے اسباب جتنے زیادہ ہوں گے، وہ اس حسن سلوک مثلاً ہدیہ وغیرہ کا نسبۃً زیادہ مستحق ہوگا مثلاً ایک پڑوسی رشتہ دار بھی ہے اور مسلمان بھی اور استاذ بھی تو اس کا حق غیر استاذ سے زیادہ ہے پھر مسلمان اور رشتہ دار کا علی ہذا القیاس اسی طرح جو پڑوسی جتنا قریب ہوگا وہ زیادہ مستحق ہوگا بنسبت دور والے کے اگرچہ دور والے کا بھی حق ہے اور چاہئے یہ کہ آدمی تمام اہل محلہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے مگر قریب والے پڑوسیوں کے حقوق بطور خاص قابل لحاظ بلکہ واجب الرعایۃ ہیں۔

اس پر بھی اتفاق ہے کہ نفس پڑوس کی بناء پر کوئی آدمی پڑوسی کا وارث نہیں بنتا جیسا کہ حدیث باب سے ظاہر ہے البتہ حق شفعہ میں اختلاف ہے:۔ ہمارے نزدیک حق جوار میں شفعہ بھی داخل ہے جبکہ شوافع وغیرہ کے نزدیک یہ حقوق الجوار میں شامل نہیں۔ کما بین فی محلہ

---

[۱] کما ورد فی الحدیث ان الانبیاء لم یورّثوا دیناراً ودرھماً الخ رواہ ابوداؤد کتاب العلم باب الحث علی طلب العلم، وابن ماجہ والترمذی واحمد وابن حبان وغیرھم وسندہ حسن، سنن دارمی ص:۱۱۰ ج:۱، وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا معشر الانبیاء، رواہ البخاری ومسلم وابوداؤد والترمذی والنسائی ومالک فی المؤطا واحمد، المعجم المفہرس ص:۱۸۴ ج:۷.

ہمسائیگی کے چند اہم حقوق:۔ (معارف الحدیث ج٦ص٣٠٩) پرمعجم کبیر للطبرانی کے حوالے سے حضرت معاویہ بن حَیدَہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی گئی ہے فرماتے ہیں:

"قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم :حق الجار ان مرض عُدتّه وان مات شَیّعتَه وان استقرضَكَ اقرضتَه وان اعور سترتَه وان اصابه خیرھَنَّاْتَه وان اصابته مصیبة عزیته ولاترفع بناءك فوق بنائه فَتَسُدَّ علیه الریح ولاتؤذیه بریح قِدرك اِلاان تغرف له منها"۔[۳]

یعنی پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہوجائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کرو اور اگر انتقال کرجائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ (یعنی تدفین میں تعاون کرو) اور اگر وہ قرض مانگے تو اس کو قرض دو اور اگر وہ کوئی بُرا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو اور اگر اسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارک باد دو اور اگر کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو اور اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اس کے گھر کی ہوا بند ہوجائے اور اپنی ہانڈی کی مہک سے اس کو ایذاء مت پہنچاؤ اِلا یہ کہ اس میں سے تھوڑا سا اس کے گھر بھی بھیج دو۔

اور ارشاد ہوا:

"وان اشتریتَ فاکھة فاھدِله فان لم تفعل فادخلھا سِرّاًولایخرج بھاولدك لیغیظ بھاولده"۔

اور اگر تم کوئی پھل خرید کر لاؤ تو اس میں سے پڑوسی کے ہاں بھی ہدیہ بھیجو اور اگر ایسا نہ کرسکو تو اس کو چھپا کے لاؤ اور پھر تمہارا کوئی بچہ وہ پھل لے کر باہر نہ نکلے کہ پڑوسی کے بچے کے دل میں اسے دیکھ کر جلن پیدا ہو۔ (ایضاً حوالہ بالا ص:٣١٠ج:٦ بحوالہ کنز العمال)

غرض پڑوسی کے ساتھ انتہائی اچھا برتاؤ کرنا اسلامی تعلیمات کے اخلاقی اور معاشرتی اصول کا زرین اصول ہے اس سے دونوں کی زندگی خوشگوار ہوجاتی ہے، جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا قوی سبب ہے۔ مزید تفصیل راقم کی کتاب نقش اخلاق (نقش قدم کامل) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

---

[۳] اخرجه الطبرانی فی الکبیر ۱۹/۴۱۹ بحواله مجمع الزوائد ص:۲۱۳ ج:۸ حدیث:۱۳۵۴۵ کتاب البر والصلة، ایضاً رواه ابن حبان عن معاذ بن جبل الترغیب والترھیب ص:۲۴۳ ج:۳.

آخری حدیث:۔ باب کی آخری حدیث بھی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتھیوں میں سب سے اچھا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے ساتھی سے اچھا برتاؤ کرتا ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے اچھا پڑوسی وہ ہے جو اپنے ہمسایہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہو۔ اللہ عزوجل کا فرمان ہے ''والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب ''[۴] نیکی کرو ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ ''والصاحب بالجنب'' کی تفسیر میں ابوسعودؒ لکھتے ہیں:

"ای الرفیق فی امر حسن کتعلم وتصرف وصناعة وسفرفانه صحبكَ وحصل بجانبك ومنهم ممن قعدبجنبك فی مسجداومجلس اوغیرذالك من ادنیٰ صحبة اِلتأمت بینك وبینه وقیل هی المرأة"۔

باب ماجاء فی الاحسان الی الخادم

عن ابی ذرقال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم :اخوانکم جعلهم اللّٰه فِتیَةً تحتَ ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه من طعامه ولْیُلْبِسْه من لباسه ولایکلفه مایغلبه فان کلفه مایغلبه فلیُعِنه"۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (یہ غلام) تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے زیردست غلام بنایا ہے، پس جس شخص کا بھائی اس کے ماتحت ہو تو اس کو اپنے کھانے میں سے کھلائے اور اپنے لباس سے اس کو پہنائے اور اسے کسی ایسے کام کا پابند نہ بنائے جو اس کے بس کا نہ ہو تاہم اگر اسے کسی بھاری کام پر لگائے تو خود اس کی مدد کرے۔

لغات:۔ قولہ "احسان" اس کے صلے میں جب الی آجائے تو بمعنی نیک سلوک کے آتا ہے جیسا یہاں آیا ہے جبکہ بغیر ''الیٰ'' کے اخلاص کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ حدیث جبرئیل میں ہے ''ما الاحسان؟'' ہے۔ قولہ "اخوانکم" ایک روایت میں ہے ''ھم اخوانکم'' جبکہ بخاری شریف کتاب الایمان کی روایت

---

[۴] سورۃ النساء آیت:۳۶۔

میں ''اخوانکم خولکم '' [1] کے الفاظ آئے خَول بفتح الخاء والواو خادم۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ ''واصل (خ،و،ل) الاصلاح'' چونکہ خادم بھی آدمی کے امور کی اصلاح کرتا ہے اس لئے اسے خول کہتے ہیں۔

قولہ "فتیة" بکسر الفاء فتی کی جمع ہے غلام کو کہتے ہیں چنانچہ بعض حضرات نے اسی معنی لغوی کو دیکھتے ہوئے موقف اپنایا ہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلام تھے کہ اللہ نے فرمایا:

"واذقال لفتاه" [2] وقال فی آیة اخریٰ "وقال لفتیانه اجعلو بضاعتهم فی رحالهم"۔ (سورۂ یوسف آیت: ۶۲)

قوله "تحت یده" یعنی تحت قدرته۔ (العارضة)

تشریح:۔ غلام اگرچہ اصالۃً آزاد پیدا ہوتا ہے مگر جب وہ کفر اختیار کرتا ہے تو اللہ نے اس کو غلامی کی ذلت آموز سزا میں مبتلا فرمایا لیکن مع ہذا احرار کو اس کے ساتھ نرمی کرنے کا حکم دیا کہ وہ اللہ کا مجرم ہے لوگوں کا نہیں۔ پس اگر وہ توبہ تائب ہو جائے تو اس کی نسل آزاد ہوگی ورنہ وہ بھی ماں باپ کی سزا کے طور پر غلامی کے مستحق ہوگی کیونکہ آباء کے اعمال کا اچھا بُرا اثر اولاد پر ہونا لازمی ہے۔

چونکہ یہ اسلام کی آمد سے پہلے کی ایک عام رسم تھی جو جنگی قیدیوں کے بجائے قتل یا قیدی بنانے کے متبادل کے طور پر دنیا میں رائج تھی تو شریعت نے اس کو ختم تو نہ کیا مگر غلاموں کو آزاد کرنے اور ان کے ساتھ نرمی کرنے کو نیکی کا بہت بڑا باب قرار دیا، تاکہ لوگ غلاموں کو آزاد کرتے رہیں یا پھر ان کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کریں چنانچہ حدیث کا پہلا لفظ ''اخوانکم'' اس پر ناطق ہے، لہٰذا آدمی کو آقا کا تأثر دینے کے بجائے بھائی بندی کا تأثر قائم کرنا چاہئے اس حدیث شریف کا یہ حکم استحباب پر محمول ہے لہٰذا افضل یہ ہے کہ آدمی خود جیسا کھاتا ہے اور جو لباس زیب تن کرتا ہے غلام کو بھی اسی طرح دے مگر یہ واجب نہیں، لہٰذا اسے کم درجے کی چیز دینا بھی جائز ہے البتہ راوی حدیث حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اس استحبابی حکم کا اس طرح اہتمام فرماتے جیسے امر وجوبی کا ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اسے ظاہر پر حمل کرتے تھے۔

دوسری حدیث:۔ ''لایدخل الجنة سَیِّء الملكة '' [3] یعنی اپنے غلاموں کے ساتھ ناروا سلوک

باب ماجاء فی الاحسان الی الخادم

[1] صحیح بخاری ص: ۹ ج: ۱ "باب المعاصی من امر الجاهلیة الخ" کتاب الایمان۔ [2] سورة الکهف آیت: ۶۱۔

[3] الحدیث اخرجه احمد وابویعلیٰ باسناد حسن وبعضه عندالترمذی وغیره، الترغیب والترهیب ص: ۱۷ ج: ۳۔

کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

لغات:۔"سَیِّیءُ" ساء یسوء (س، و، ء) مادہ میں عیب اور برائی کے معنی پائے جاتے ہیں۔"ملکة" ملک سے ہے یعنی جو مملوک کے ساتھ بُرا برتاؤ کرے اور وہ ملکہ بھی محتمل ہے جو مقابل حال آتا ہے یعنی جو حالت اور وصف پختہ عادت بن جائے۔

تشریح:۔علی ہذا مطلب یہ ہوگا کہ جس آدمی کی یہ بُری عادت ہو جو ہمیشہ اپنے غلاموں اور خادموں سے سختی سے پیش آتا ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا، کیونکہ جنت رحمت باری کا اثر ہے لہٰذا اس میں وہ لوگ جائیں گے جو اللہ کی مخلوق پر شفقت کرتے ہیں بخلاف ان لوگوں کے جو سخت مزاج ہوں ان کے لئے تو دوزخ ہے کہ لوہا آگ سے نرم ہوتا ہے اور پتھر گرم ہونے سے پگھلتا ہے۔ پہلے بار ہا گذرا ہے کہ اس قسم کی احادیث کو خاصیت المفرد پر حمل کرنا چاہئے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دخول اولی کی نفی مراد ہو یعنی ایسے لوگ جو رُحماء نہیں وہ اپنی سختیوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جاسکیں گے۔

آج کل تو غلام نہیں ہیں لیکن نوکر تو ہوتے ہیں لہٰذا ان کے ساتھ نیک برتاؤ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا غلاموں کے ساتھ ہے کہ اگرچہ بُرا سلوک کرنے کی صورت میں وہ نوکری چھوڑ سکتے ہیں اور خود کو ذلت سے آزاد کرسکتے ہیں، مگر ان میں سے اکثریت کی بعض ایسی مجبوریاں ہوتی ہیں جو نوکری چھوڑنے سے مانع ہوتی ہیں لہٰذا ان کی مجبوری سے غلط استفادہ اتنا ہی گناہ ہے جتنا غلام کے ساتھ ناروا سلوک کا ہے۔ ہاں اگر کوئی نوکر اور ملازم صحیح ڈیوٹی نہیں کر رہا یا خائن ہے یا کوئی اور عیب اس میں ہو تو اسے نوکری سے فارغ کیا جاسکتا ہے لیکن احسن طریقے سے کہ اسے بروقت بتلایا جائے جو اس کا حق بنتا ہے وہ پورا دے اور اچھے الفاظ میں معذرت کرلی جائے۔

باب النهی عن ضرب الخُدَّام وشتمِهم

"عن ابی هریرة قال قال ابوالقاسم صلی اللّٰه علیه وسلم نبیُّ التوبة :من قذف مملوکه بریئاً مِمّاقال له ،اقام اللّٰه علیه الحدیوم القیٰمة اِلاان یکون کماقال"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی توبہ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جوشخص اپنے مملوک کوتہمت لگائے دراں حالیکہ وہ اس الزام سے پاک ہوتواللہ اس کوقیامت کے دن حدلگائیں گے الا یہ کہ وہ ایسا ہی ہوجیسا اس نے کہا ہے۔

لغات:۔ ''شتم'' گالی دینے اور بُرا بھلا کہنے کوکہا جاتا ہے۔قولہ"نبی التوبة"ابوالقاسم سے بدل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کالقب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت استغفار فرماتے۔قولہ"قذف" لغت میں پھینکنے کو کہتے ہیں مگر اصطلاح میں پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کوکہاجاتا ہے یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظُلم کابدلہ اگر دنیا میں نہ ملے تو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ سزا ختم ہوگئی کیونکہ مظلوم کے لئے اللہ قیامت کے دن ظالم سے انتقام لیں گے اَعاذنا اللہ منہ۔چونکہ باندی اور غلام اپنے آقا سے گالیوں اور بہتان کابدلہ تو لے نہیں سکتے،اورشبہ کی وجہ سے حدقذف بھی جاری نہ ہوتی اس لئے یہ سزا آخرت میں بھگتنا ہوگی۔

قولہ"الاان یکون"الخ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ استثنا مشکل ہے کیونکہ ''بریئاً'' اس استثنا کی نفی کرتا ہے اور پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے کہ ''بریئاً'' کاتعلق نفس الامر سے نہیں بلکہ آقا کے خیال سے ہے یعنی وہ باندی یاغلام نفس الامر میں تو زانی ہے لیکن قاذف کے ظن واعتقاد میں پاک ہے۔علی ہذا مطلب یہ ہوگا ''من قذف مملوکه وهو بریء فی ظنه واعتقاده'' الخ یعنی اگر وہ ایک بری اور پاک غلام یاباندی پر جسے وہ خود بھی پاک سمجھتا ہے الزام وتہمت لگائے تو اسے قیامت کے دن حد لگے گی الا یہ کہ وہ واقعی زانی ہوتو پھر حد نہیں ہوگی۔

دوسری حدیث:۔ حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کومار رہا تھا کہ اتنے میں اپنے پیچھے کسی کہنے والے کوسنا جوکہہ رہا تھا غور سے سنو اے ابومسعود! غور سے سنو اے ابومسعود!

جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تجھ پر زیادہ قادر ہے بنسبت تیری قدرت کے اس غلام پر چنانچہ ابومسعود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد اپنے کسی غلام کو نہیں مارا ہے۔

تشریح:۔ اس ارشاد پاک سے معلوم ہوا کہ کمزور اور ضعیف کو مارتے وقت یہ تصور کرنا چاہئے کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے اور جب چلتی ہے تو پھر اس کے آگے کوئی طاقت مزاحمت کی تاب نہیں لاسکتی لہٰذا غلام وخادم ہوں یا بیوی بچے اور شاگرد وغیرہ سب کا حکم یہی ہے۔ بعض بڑے بڑے سردار اور زمیندار اپنے مزدوروں کو بے دردی سے مارتے ہیں ان کو بھی اللہ کا خوف کرنا چاہئے، تاہم جن لوگوں کی سرپرستی کسی کو حاصل ہو تو تادیب شرعی کی نیت سے ان کا مارنا جائز ہے جس کے لئے امام ترمذیؒ نے اگلا باب قائم کیا ہے۔

باب ماجاء فی ادب الخادم

”عن ابی سعید قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :اذاضرب احدکم خادمہ فذکر اللّٰہ فارفعوا ایدیکم “۔الحدیث اخرجہ البیہقی فی شعب الایمان لکن ابوھارون خارجی وشیعی متھم بالکذب۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو مار رہا ہو اور وہ اللہ کا نام لے لے تو اپنے ہاتھ (اس سے) اٹھالو (یعنی مزید مارنا بند کرو)۔

تشریح:۔ سابقہ باب سے خادم کے مارنے کی نفی معلوم ہوتی تھی تو اس سے یہ شبہہ ہوسکتا تھا کہ خادم کو کسی بھی صورت میں مارنا جائز نہ ہوگا، تو امام ترمذیؒ نے اس باب میں اس توہم کا ازالہ کیا اور ترجمة الباب کے ساتھ حدیث کی مناسبت اس طرح ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ باب کا مسئلہ اس حدیث سے اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ اس ارشاد میں مارنے کی نفی نہیں فرمائی بلکہ فرمایا کہ مارنے کے دوران اگر غلام وغیرہ تمہیں اللہ کا واسطہ دے کہ مجھے معاف کردو تو آپ اسے معاف ہی کردیں جس سے ضرب کا جواز معلوم ہوا۔

پھر یہ روایت اگرچہ ابوہارون کی وجہ سے ضعیف ہے لیکن اس کا مضمون صحیح ہے، چنانچہ ادب سکھانے کی

خاطر بیوی کا مارنا تو قرآن سے ثابت ہے[1] اور تادیب شرعاً امر مطلوب ہے جس میں کبھی کبھار بیٹے اور شاگرد کو مارنے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اور یہی مطلب ہے اس فرمان[2] کا "ولا ترفع عنهم عصاك أدبا" (مشکوٰۃ ص:۱۸) تاہم مارنے کی اپنی حد ہے جس کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے خلاصہ یہ ہے کہ مارنے میں سر اور چہرے کو بچا کر تین ڈنڈے یا تھپڑ مارنا جائز ہے، بشرطیکہ زخمی کرنے والے نہ ہوں۔ ابن العربیؒ لکھتے ہیں کہ اگر پڑوسی غلام کی شکایت کرے تو اس کی شکایت پر بھی مارا جائے اور مارتے وقت اس غلطی کا تذکرہ بھی کرے تاکہ ڈانٹ ڈپٹ اور مارنے کا فائدہ بھی حاصل ہو علی ہذا یہ حکم بچے کا بھی ہوگا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی العفو عن الخادم

"عن عبداللّٰه بن عمر قال جاء رجل الى النبى صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: يارسول اللّٰه كم أعفو عن الخادم؟ فصمتَ عنه النبى صلى اللّٰه عليه وسلم ثم قال يارسول اللّٰه كم أعفو عن الخادم؟ قال: كل يوم سبعين مرة۔" (حسن غريب)[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! اپنے خادم کو کتنی بار معاف کرلیا کروں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، اس نے پھر پوچھا اے اللہ کے رسول! میں کتنی مرتبہ اپنے غلام کو معاف کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر روز ستر مرتبہ۔

تشریح:۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سائل کے سوال پر خاموشی اختیار کرنا وحی کے انتظار کی بنا پر بھی ممکن ہے اور سوال کو ناپسند کرنے کی وجہ سے بھی ممکن ہے کیونکہ معافی ایک ایسی نیکی ہے جس کو معدود کرنے سے وہ محدود ہو جاتی ہے جبکہ نیکی اور خصوصاً دائمی نیکی کو کسی عدد کے ساتھ منحصر نہیں کرنا چاہئے بلکہ زندگی بھر اس پر عمل

باب ماجاء فی ادب الخادم

[1] كما قال اللّٰه عزوجل فاهجروهن فى المضاجع واضربوهن الخ سورة النساء آيت: ۳۴.

[2] رواه احمد ص: ۲۱۶ ج: ۶ حديث: ۲۱۵۷۰. حفيظ الرحمن الحنفى

باب ماجاء فی العفو عن الخادم

[1] الحديث اخرجه ابوداؤد ص: ۳۵۵ ج: ۲ باب فى حق المملوک کتاب الادب، ایضاً سنن کبری للبیهقی ص: ۵۱۷ ج: ۱۱ حديث: ۱۶۲۲۶.

کرنا چاہئے۔

اعتراض:۔ اگر معافی کو عدد سے منسلک کرنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا تو پھر خود ستر کا عدد کیوں متعین فرمایا؟

جواب:۔ اگر یہ خاموشی وحی کے انتظار میں مانی جائے پھر تو کوئی اشکال نہیں لیکن اگر دوسری توجیہ کی بناء پر ہو تو پھر جواب یہ ہے کہ سبعین کا عدد انحصار کے لئے نہیں ہے بلکہ کثرت سے کنایہ ہے جیسے اس آیت میں ہے "ان تستغفرلهم سبعين مرة" الایہ[۲] یا پھر مطلب یہ ہے کہ ستر مرتبہ معافی کے بعد جرم کرنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

اس رویت میں امام ترمذیؒ نے "حسن غریب" کہا ہے مگر ملا علی قاریؒ مرقات میں نقل کرتے ہیں کہ ترمذی کے بعض نسخوں میں اسے "حسن صحیح" کہا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس روایت پر ابوداؤد سکوت کریں اور منذری تصحیح کریں تو وہ صحیح ہوتی ہے اس روایت کو منذری نے جید الاسناد کہا ہے۔

باب ماجاء فی اَدَب الولد

"عن جابر بن سمرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لَاَن يُوَدِّ ب الرجل ولده خير من ان يتصدق بصاع"۔(حديث غريب) لان ناصح بن علاء الكوفى ليس بالقوى فهو حديث ضعيف۔

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ آدمی کا اپنے بیٹے کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ دینے سے افضل ہے۔

لغات:۔ قولہ "لَاَن يُوَدِّبَ" لام برائے تاکید بمعنی القسم آتا ہے جبکہ ان مصدریہ فعل مضارع کو بمعنی مصدر بناتا ہے۔ حاصل کلام اس طرح ہے "والله تاديب الرجل ولده" الخ ادب لغت میں اصالۃً دعوت دینے کو کہتے ہیں مگر خصال حمیدہ اور شائستگی کو بھی ادب اس لئے کہتے ہیں کہ یہ خیر و بھلائی کی طرف بُلاتے ہیں۔ یہاں مراد تہذیب، سلیقہ اور اچھے طور وطریقہ کی تعلیم ہے۔

تشریح:۔ چونکہ انسانی زندگی بغیر آداب کے خوشگوار نہیں بن سکتی اس لئے شریعت نے آداب زندگی

---

[۲] سورۃ توبہ آیت: ۸۰

کی اہمیت کو بار ہا اُجاگر کیا ہے اور آداب کا دامن بہت وسیع ہے اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ بیٹے کو مکمل مہذب بنانا ایک صاع کے صدقہ سے افضل ہے بلکہ وہ تو کئی نیکیاں ہیں لہٰذا یہاں ایک ہی ادب مراد ہے مثلاً بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت پہلے بایاں پاؤں داخل کرنا ایک ادب ہے اور نکلتے وقت دایاں پہلے نکالنا دوسرا ادب ہے علیٰ ہذا القیاس پھر اس کی افضیلت ایک صاع کے صدقہ سے اس بنا پر ہے کہ ادب سکھانے کے بعد جب اس پر عمل درآمد ہوگا تو یہ ایک جاری وساری صدقہ ہوگا جبکہ صاع تو جلد ہی ختم ہو جاتا ہے گو کہ وہ بھی بڑھتا رہتا ہے لیکن وہ اضافہ اخروی ہے جبکہ ادب تو دنیا میں بھی بڑھتا چلا جاتا ہے تو آخرت میں بطریقِ اولیٰ بڑھے گا۔ (تدبر)

نیز ادب سکھانا ایک علمی افادہ ہے جبکہ صدقہ مالی تعاون ہے۔ ثالثاً اس لئے کہ ولد کی تادیب یقیناً اپنے محل میں واقع ہوتی ہے جبکہ صدقہ میں بے محل وقوع کا بھی احتمال ہے۔ رابعاً تادیب درجۂ لزوم میں ہے جبکہ صدقہ درجۂ نفل ہے اور واجب کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ خامساً بیٹا جب متادب بنے گا تو دوسروں کو بھی وہ آداب سکھائے گا۔ لہٰذا یہ ایک متعدی نیکی ہے جبکہ صاع تو کھانے سے ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث:۔ باب کی دوسری حدیث ''ایوب بن موسیٰ عن ابیہ عن جدہ '' ہے اس سند میں ابیہ کی ضمیر تو ایوب کی طرف لوٹتی ہے جس کا مصداق موسیٰ بن عمرو ہیں لیکن ''عن جدہ '' کی ضمیر میں دو احتمال ہیں (۱) اگر یہ ایوب کی طرف راجع ہو تو ایوب کے دادا عمرو بن سعید ہیں جو تابعی ہیں زمانۂ پیدائش دورِ خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہے لہٰذا روایت مرسل ہوگی۔ (۲) اور اگر ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹتی ہو تو پھر مصداق سعید بن العاص ہیں یہ اگرچہ عہد پاک میں حین حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے لیکن سماع میں شک ہے اس لئے امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو بنا بر ہر صورت مرسل قرار دیا ہے۔

بہرحال اس سند کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی باپ بیٹے کو حسن ادب سے زیادہ بہتر تحفہ نہ دے سکا۔ نحلاً بضم النون اور نحلۃ بکسرۂ نون عطیہ، ہبہ اور تحفے کو کہتے ہیں۔ اس تفضیل کی وجہ بدیہی ہے کیونکہ انسان کی سعادت وکمالات کا دارومدار دو چیزوں پر ہے ایک حکمتِ نظریہ اور دوم حکمتِ عملیہ عمل علم پر موقوف ہے اور علم تادیب وتعلم پر، جب باپ اپنے بیٹے کو مہذب بناتا ہے تو وہ علم وعمل دونوں اعتباروں سے کامل بن جاتا ہے اور مملوک کے درجہ سے ملوک کے مقام تک پہنچ جاتا ہے، پھر حسن ادب کا مطلب وہی ہے جو عند الشرع معتبر ہے جیسے حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو بطور نصیحت آداب کے چند کلمات ارشاد فرمائے تھے

جن کو قرآن نے بھی نقل کیا ہے اس سے اچھی تہذیب وتربیت کا عالی مقام بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے ورنہ تو قرآن اس کو بطور مدح نقل نہ کرتا۔

باب ماجاء فی قبول الهدية والمكافاة عليها

"عن عائشة ان النبى صلى الله عليه وسلم كان يقبل الهدية ويثيب عليها"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے اور اس کا بدلہ عطا فرماتے۔

لغات: ۔قولہ "الھدیۃ" عقیدت ومحبت کی بنا پر کسی کو ایسا تحفہ دینا جس کا کوئی عوض پہلے نہ ملا ہو گو کہ بعد میں عوض مل جائے ۔قولہ "مکافاۃ" مجازات اور بدلہ کو کہتے ہیں ۔قولہ "ویثیب علیھا" اثابۃ سے بمعنی بدلہ دینے کے اس لئے نیکی کو ثواب کا کام کہتے ہیں کہ ثواب بمعنی جزا اور بدلہ کے ہے۔

تشریح: ۔حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے مگر صدقہ قبول نہ فرماتے اس کی وجہ ابواب الزکوۃ "باب ماجاء فی کراھیۃ الصدقۃ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم" الخ میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص:۱۱۹ جلد سوم) پھر اخلاقِ کریمانہ کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ میں قدر وقیمت کی رعایت نہیں فرماتے بلکہ ہدیہ پیش کرنے والے کی دلداری کے پیشِ نظر معمولی قسم کا تحفہ بھی قبول فرماتے چنانچہ ارشاد ہے "لواھدی لی کراع لقبلتُ ولو دُعیت علیہ لَاَجبتُ" اگر مجھے بکری کا ایک پیر بھی ہدیہ کر لیا جائے تو میں ضرور قبول کروں گا اور اگر اس کی دعوت دی جائے تو میں ضرور جاؤں گا۔ (شمائل ترمذی)[1]

چونکہ اکرام مسلم واجب ہے اور ہدیہ اکرام کا بہترین طریقہ ہے لہٰذا ہدایا کا تبادلہ اس مقصد کے حصول میں بڑا معاون ثابت ہوجاتا ہے لہٰذا اگر ہدیہ قبول کرنے سے کوئی شرعی مانع نہ ہو تو اسے رد نہیں کرنا چاہئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری عادت شریفہ یہ تھی کہ ہدیہ قبول کرنے کے بعد اس کا بدلہ بطور نعم البدل عنایت فرماتے کیونکہ جب ہدایا کا تبادلہ طرفین سے ہو تو محبت اور تعلق میں کمال اور پختگی آتی ہے بلکہ اس کو ترقی نصیب ہوتی ہے اور اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم بھی دی ہے فرمایا "مَن اُعطِیَ عطاءً فوجد فلیجزبہ

باب ماجاء فی قبول الهدایا الخ

[1] شمائل ترمذی ص: ۲۴ "باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ ﷺ" فاروقی کتب خانہ لاہور۔

ومن لم یحدفلیثن فان من اثنیٰ فقدشکرومن کتم فقد کفر"۔(ابوداؤدوترمذی)[۲]

علی ہذا اگرآدمی مالی بدلہ نہ دے سکے تو کم ازکم اس آدمی کے لئے خیر کے چند کلمات کہے یا دعا دے تو بھی بدلہ ادا ہوجائے گا چنانچہ ترمذی کی ایک روایت میں ہے "من صُنِعَ الیه معروف فقال لفاعله جزاك الله خیراً فقد ابلغ فی الثناء"[۳] کیونکہ جب اس کا بدلہ اللہ پر چھوڑے گا تو اس سے بہتر کیا بدلہ ہوسکتا ہے۔

احادیث[۴] کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خطیر ساتحفہ ہے تو اس کا بدلہ حسی چیز سے دینا چاہئے اور اگر حقیر سی چیز ہے تو اگر چہ اسے حقیر نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ ہی اس کا تأثر دینا چاہئے تاہم زبانی دعا اور شکر وثناء سے بھی بدلہ ہوجائے گا، اس کی کچھ وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

حدیث الباب سے استدلال کر کے مالکیہ کہتے ہیں کہ ہدیہ کا بدلہ واجب ہے کیونکہ "کان" کا لفظ مواظبت پر دلالت کرتا ہے جو موجب وجوب ہے اور یہی امام شافعیؒ کا بھی قدیم قول ہے مگر حنفیہ کے نزدیک مکافاۃ یعنی ہدیہ کا عوض اور بدلہ دینا مستحب یا زیادہ سے زیادہ مسنون ہے واجب نہیں بلکہ بدلے کی نیت سے ہدیہ دینا تو بیع بثمن المجہول ہے جو صحیح نہیں، گو کہ جب بدلہ ملے گا تو انتہاءً وہ بیع کہلائے گی اور اس لئے عوض ملنے کے بعد ہدیہ سے رجوع نہیں ہوسکتا لیکن ابتداء میں تو ہبہ تبرع ہی ہے۔ رہا مالکیہ کا استدلال تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو "کان" احادیث میں استمرار کے لئے نہیں آتا کمامرّ غیر مرۃ۔ ثانیاً مواظبت سے اس وقت تک وجوب ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ ترک پر وعید نہ آئی ہو جیسے نماز میں تکبیراتِ انتقالات اور وضوء میں مضمضہ واستنشاق وغیرہما۔

(ہبہ سے رجوع کے متعلق مسئلہ "باب ماجاء فی کراھیۃ الرجوع من الھبۃ" میں گذری ہے، دیکھئے تشریحات ص۲۲۱ ج۵)

---

[۲] سنن ابی داؤد ص: ۳۱۵ "باب فی شکر المعروف" کتاب الادب.

[۳] ایضاً رواه الطبرانی فی الکبیر مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸.

[۴] راجع للاحادیث مجمع الزوائد ص: ۲۳۲ تا ۲۳۶ ج: ۸.

باب ماجاء فی الشکر لمن احسن الیک

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :من لا یشکرُ الناسَ لایشکرُ اللّٰهَ"۔ (حدیث صحیح)[1]

باب کی اگلی روایت حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں لفظ "لا" کے بجائے "لم" آیا ہے۔ یعنی جو شخص لوگوں کا شکرادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔

تشریح:۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ اس حدیث میں ناس اور لفظ اللہ کے اعراب کے اعتبار سے چار روایات ہیں (۱) دونوں منصوب (۲) دونوں مرفوع (۳) پہلا مرفوع دوسرا منصوب اور نمبر (۴) اس کے برعکس۔

اوپر ترجمہ میں پہلے اعراب کو ملحوظ رکھا گیا اور مطلب یہ ہے کہ جو آدمی لوگوں کے احسان کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا کیونکہ اس کی طبیعت میں ناشکری سرایت کر چکی ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے کہ لوگوں کے احسانات کا شکریہ ادا کرو مگر وہ اس حکم کی تعمیل نہیں کر رہا جس سے اللہ کے حکم عدولی کا ارتکاب لازم آتا ہے جو ناشکری ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے احسانات ظاہری اسباب پر مبنی ہیں تو جب وہ اسباب ظاہری کو نہیں سمجھتا اوران کی قدر نہیں کرتا تو اللہ کی نعمتیں تو مخفی اسباب پر مبنی ہوتی ہیں یہ شخص اس درجے تک کیسے پہنچ پائے گا؟

اگر دونوں مرفوع ہیں تو پھر صلہ یعنی "من" کے لئے ضمیر کو مستتر ماننا پڑے گا اور تقدیر یہ ہوگی "من لایشکرہُ الناسُ لایشکرہُ اللّٰہ" یعنی جس شخص کا شکریہ لوگ ادا نہ کریں اللہ بھی اس کے عمل کی قدر نہیں کرتا کیونکہ لوگ تو زمین پر اللہ کے گواہ ہیں اور ظاہر ہے کہ لوگ تو اس کا شکریہ نیک سلوک اور احسان پر ادا کریں گے، تو لوگوں کا شکریہ ادا نہ کرنا اس آدمی کے نیک سلوک کی نفی سے کنایہ ہے یعنی انتفائے لازم سے انتفائے ملزوم مراد ہے پس ایسا شخص جو لوگوں کو شکریہ کا موقعہ نہیں دیتا یعنی کسی کے ساتھ کچھ بھی مواسات وہمدردی نہیں کرتا تو اس کا عمل عنداللہ مشکور نہیں ہوگا کیونکہ "وکان سعیه مشکوراً" الآیۃ[2]۔ تو نیک سلوک کرنے والوں

باب ماجاء فی الشکر من احسن الیک

[1] رواہ ابوداؤد ص: ۳۱۴ ج: ۲ کتاب الادب، مسنداحمد ص: ۵۰۸ ج: ۲ حدیث: ۷۴۵۲۔ [2] سورۃ بنی اسرائیل آیت: ۱۹۔

کے لئے ہے۔

جبکہ تیسرے احتمال یعنی ناس کے رفع اور لفظ اللہ کے نصب کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اللہ کا شکر گذار نہ ہو لوگ اس کا شکرادا نہیں کرتے، کیونکہ اللہ کی نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمتوں کو صحیح مصرف میں لگائے اور جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ بدکار رہتا ہے لوگ اس کی تعریف کیسے کریں گے؟

چوتھی صورت میں تقدیر اس طرح ہوگی "من لایشکر الناسَ لایشکرہُ اللّٰہ" یعنی جو شخص لوگوں کا شکرادا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس آدمی کا شکرادا نہیں کرتا یعنی وہ اس کو دی ہوئی نعمتوں کا فائدہ نہیں دیتا مثلاً قلب ہوگا مگر اس میں ملکوتی فکر نہ ہوگی، آنکھیں ہوں گی مگر ان میں عبرت کی نگاہ نہ ہوگی علیٰ ہذاالقیاس۔

باب ماجاء فی صنائع المعروف

عن ابی ذر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: تَبَسُّمُکَ فی وجہ اخیکَ لک صدقۃ وامرک بالمعروف ونھیک عن المنکر صدقۃ وإرشادک الرجل فی ارض الضلال لک صدقۃ وبصرک للرجل الردی البصر لک صدقۃ وإمَاطتک الحجرَ والشوک والعظم عن الطریق لک صدقۃ وإفراغک من دلوک فی دلو اخیک لک صدقۃ"۔(حسن غریب)[1]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی کے رُوبرُو تیری مسکراہٹ تیرے لئے صدقہ ہے اور تیرا حکم کرنا اچھی بات کا اور رُوکنا بُری بات سے صدقہ ہے، اور تیرا رہنمائی کرنا (پریشان حال) آدمی کی ناآشنا جگہ میں تیرے لئے صدقہ ہے اور نابینا آدمی کی دستگیری ورہنمائی کرنا تیرے لئے صدقہ ہے اور راستے سے تیرا پتھر ہٹانا اور کانٹا اور ہڈی ہٹانا تیرے لئے صدقہ ہے، اور تیرا اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا تیرے لئے صدقہ ہے۔

لغات:۔ "الصنائع" صنیع وصنیعۃ کی جمع ہے بمعنی احسان کرنے کے۔ قولہ "تبسمک" تبسم کے معنی مسکراہٹ کے ہیں۔ قولہ "ارض الضلال" ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں راستہ معلوم کرنے کی علامات نہ ہوں۔ قولہ "الردی البصر" نابینا بصر بفتحتین بروزن شجر دیکھنے کی قوت اور نگاہ کو کہتے ہیں ردی البصر وہ شخص کہلاتا ہے

باب ماجاء فی صنائع المعروف

[1] ایضاً رواہ بمثلہ ابن حبان فی صحیحہ والبیھقی مختصراً عن ابی ذر، الترغیب والترھیب ص:۳۷۷ ج:۳.

جوقوۃ باصرہ سے محروم ہو یعنی اندھا ہو البتہ یہاں پہلا بَصر بمعنی تبصیر ہے۔ قولہ "اماطة" ازالہ اور ہٹانے کو کہتے ہیں۔ قولہ "اِفراغك" بہانے اور ڈالنے کو کہتے ہیں۔ قولہ "دلو" ڈول کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ عام طور پر جہاں نیک سلوک کے حوالے سے لفظ 'اخیک' آجائے تو اس سے مراد اسلامی اخوۃ ہوتی ہے، ان اعمال کو صدقات سے تعبیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے صدقہ پر ثواب ملتا ہے کہ وہ ایک مسلمان یا کسی انسان کی خوشی کا سبب ہے تو اسی طرح ان اعمال کی وجہ سے جو مسلمان بھائی کی راحت کے اسباب ہیں بھی صدقہ کا ثواب ملتا ہے کہ دونوں کی علت ایک ہی ہے۔

باب ماجاء فی المِنحة

"عن البراء بن عازب يقول سمعتُ النبى صلى الله عليه وسلم يقول: من مَنَحَ منيحةَ لبن اووَرِقٍ اوهدىٰ زُقاقاً كان له مثل عتق رَقَبةٍ "۔ (حسن صحيح)[1]

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ جو شخص کسی کو دودھ والے جانور کا (بقدر ضرورت) عطیہ دیدے یا چاندی کا (بطور قرض) عطیہ دے یا کسی راستہ بھولے ہوئے کی رہنمائی کرے تو اس کو ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا۔

لغات:۔ قولہ "المنحة" اسی طرح منیحہ دونوں کے معنی عطیہ کے بھی آتے ہیں بایں معنی کہ موہوب لہ کو اس کا مالک بنادیا جائے اور عاریہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، کہ کسی کو دودھ والا جانور جیسے بکری، گائے، بھینس یا اونٹنی دے کہ جب تک تمہیں ضرورت ہو اس کا دودھ استعمال کرتے رہو جب میں چاہوں گا یا تیری ضرورت ختم ہوجائے تو واپس لے لوں گا سواری کے لئے گاڑی دینا یا کوئی اور چیز استعمالِ منافع کے لئے دینا بھی منیحہ کہلاتا ہے۔ قولہ "ورق" بکسر الراء وسکونھا چاندی کو کہتے ہیں امام ترمذیؒ نے آگے اس کی تفسیر فرمائی ہے کہ یعنی کسی کو دراہم بطور قرض دیدے۔

قولہ "اوهدى زقاقاً" بضم الزاء اصل میں راستے کو کہتے ہیں یہاں مراد وہ شخص ہے جو راستے کا پتہ

باب ماجاء فی المنحة

[1] الحديث اخرجه مسلم فى كتاب الزكوة ومسنداحمد ص: ۳۴۱ ج: ۵ حديث: ۱۷۹۳۶، ايضاً ص: ۳۶۱ ج: ۵ حديث: ۱۸۰۴۵، ايضاً حديث: ۱۸۰۶۰.

نہیں جانتا کہ یا تو اندھا ہے یا پھر راستہ بھول گیا ہے پس مطلب ''ھدی زقاقا'' کا یہ ہوا کہ اسے راستہ بتلائے مگر ایک روایت [۲] میں ''ھدّی'' دال کی تشدید کے ساتھ آیا ہے تو یہ یا تو مبالغے کا صیغہ ہے یا پھر ہدیہ کے معنی میں ہے پس اس صورت میں زقاق سے مراد کھجوروں کے درختوں کی قطار ہوگی یعنی کسی کو اپنے باغ میں سے چند درخت کھجوروں کے دے، کہ وہ اس کا پھل خود حاصل کرلیں چونکہ باغ کے درخت عموماً قطار میں ہوتے ہیں اس لئے ان کو زقاق یعنی صف اور قطار سے تعبیر کیا، مگر اول راجح ہے کما فسرہ المصنفؒ۔

تشریح:۔ جس طرح غلام اپنی غلامی کی وجہ سے پریشان حال ہوتا ہے مگر اپنی بے بسی کی وجہ سے آزادی حاصل نہیں کرسکتا تو جو شخص اسے آزاد کرتا ہے وہ غلام کے ہر عضو کے بدلے اپنے اعضاء جہنم کی آگ سے آزاد کرلیتا ہے کہ نیکی اور عمل کی جزاء نیکی کے مطابق ہوتی ہے، اسی طرح ایک آدمی ضرورت مند ہے اس کے گھر میں دودھ کا انتظام نہیں یا راستے کی وجہ سے اپنی منزل تک نہیں پہنچ پارہا ایسے میں کوئی آدمی اس کی مدد مذکورہ صورتوں میں کرلیتا ہے اور اسے پریشانی کی قید سے اور ضرورت کی مشقت سے آزاد کرلیتا ہے تو گویا یہ نیکی، غلامی سے آزادی دلانے کے مترادف ہے اس لئے دونوں کا ثواب مماثل ہوا گو کہ درجات میں تفاوت ممکن ہے۔ (تدبر)

باب ماجاء فی اِماطة الاَذیٰ عن الطریق

''عن ابی هريرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال بینما رجل یمشی فی الطريق اذ وجد غُصنَ شوكٍ فَاَخَّرَه فشكر اللّٰهُ له فغفرله''۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس دوران کہ ایک شخص راستہ میں جارہا تھا تو اس نے ایک کانٹے دار ٹہنی پائی تو اسے ہٹادیا اللہ تعالیٰ نے اس کی قدر فرمائی اور اس کی بخشش فرمائی۔ (حدیث حسن صحیح)

لغات:۔ ''اماطة'' بمعنی ازالہ اور ہٹانے کے۔ قولہ ''الاذیٰ'' تکلیف اور ناگواری کا سبب بننے والی چیز جیسے پتھر، پانی، کانٹے اور دیگر موذی اشیاء جو راستہ میں پڑی ہوں۔ قولہ ''عصن'' شاخ یا ٹہنی۔ قولہ ''شوك'' کانٹے کو کہتے ہیں۔ قولہ ''فاخره'' تاخیر بمعنی ابعاد اور ہٹانے کے ہیں۔

قولہ ''فشكر الله له'' ای جزاه یعنی اللہ کو یہ عمل پسند آیا اور اس پر اس شخص کی مغفرت فرمائی۔

---

[۲] كذا فی مسند احمد ص: ۳۸۶ ج: ۵ حديث: ۱۸۱۹۰.

تشریح:۔ صحیحین[1] میں حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے:

"الایمان بضع وسبعون شعبة فافصلهاقول لااِله اللّٰه وادناهااماطة الاذی عن الطریق والحیاء شعبة من الایمان"۔

امام ترمذیؒ نے شاید ترجمۃ الباب کو اسی حدیث سے اخذ کیا ہے، اس میں "اَذیٰ" بمعنی موذی کے ہے یعنی تکلیف دِہ چیز خواہ وہ کچھ بھی ہو غرض ایمان میں اعلیٰ مقاصد سے لیکر ادنیٰ مفاسد کے ازالے جیسے مقاصد تک اور حقوق اللہ سے لیکر حقوق العباد بلکہ حقوق الخلقت تک تمام امور شامل ہیں، حسب مراتب اعلیٰ پر عالی درجات اور ادنیٰ پر نچلے درجات ملنے کا وعدہ ہے، مگر یہاں یہ اشکال وارد ہوسکتا ہے کانٹا جیسے موذی اشیاء کو ہٹانا جب اعمال صالحہ کا ادنیٰ درجہ ہے تو اس پر مغفرت کیسے مرتب ہوئی؟ اس کا جواب ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہ دیا ہے کہ یا تو اس سے دل میں نرمی اور رحم کا جذبہ پیدا ہوا اور پھر اس کی بدولت توبہ واستغفار کی توفیق نصیب ہوئی یا اس شخص کی نیکیاں اور بُرائیاں دونوں مساوی و برابر تھیں جب یہ ادنیٰ نیکی اس کے نیکیوں والے پلّے میں ڈالی گئی تو وہ بھاری ہوگیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے کیا معلوم یہی نجات کا ذریعہ بن جائے خواہ پہلی وجہ کے مطابق ہو کہ اس سے ہمارے دلوں میں انشراح پیدا ہو یا پھر اس سے نیکیوں کی شرح بڑھ جائے اور بجائے پچاس فیصد کے اکاون فیصد ہوجائے۔

باب ماجاء ان المجالس بالاَمانة

"عن جابربن عبداللّٰه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال اذاحَدَّثَ الرجل الحدیث ثم اِلتَفَتَ فهی امانة"۔(حدیث حسن)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص کوئی بات کرے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے تو یہ بات امانت ہے۔

باب ماجاء فی اماطة الاذی عن الطریق

[1] اخرجه البخاری فی الهبة باب :۳۵ والمظالم باب: ۲۴ والعقیقة باب: ۲والبر باب :۳۸ ومسلم فی الایمان، وابوداؤد فی الادب باب: ۱۶ وابن ماجه فی المقدمة باب: ۹، الترغیب والترهیب ص: ۳۷۶ ج: ۳.

تشریح:۔ ترجمۃ الباب کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ کسی بھی مجلس کی بات بیان کرنا اور غیروں سے ظاہر کرنا جائز نہیں کیونکہ وعظ ونصیحت اور تعلیم وغیرہ عام مجالس کی باتوں کا افشا بالاتفاق جائز بلکہ مطلوب ہے پس مراد وہ مجالس ہیں، جو دو یا زیادہ آدمیوں کے درمیان ہوں اور ان میں کی جانے والی باتوں کا اخفا مقصود ہو یعنی راز کی باتوں کا اظہار جائز نہیں علی ہذا ترجمۃ الباب میں ''المجالس'' کا الف لام عہد کے لئے ہے اور ''بالامانۃ'' میں حرف جر مقدر کے ساتھ متعلق ہے تقدیر اس طرح ہے ''حق المجالس التی یراد اِخفاء ھا بالامانۃ''۔

کلام کا مقصد جس طرح صریح کلام سے سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے اسی طرح عرف اور دلالت سے بھی اخذ کیا جاسکتا ہے پس جس مجلس کی باتیں راز سے تعلق رکھتی ہوں ان کا اظہار جائز نہیں خواہ کہنے والا اس کی امانت کی تصریح کرے یا نہ کرے لیکن کسی طرح یہ معلوم ہوجائے کہ وہ یہ باتیں عام بتانا نہیں چاہتا ہے مثلاً وہ کسی کو مجمع سے الگ لے جاکر بات کرے، یا کہے کہ میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کہنا چاہتا ہوں، یا باتوں باتوں میں ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کوئی قریب سے تو نہیں گذر رہا، یا مجلس کے اختتام پر ادھر ادھر دیکھے کہ کسی نے ہماری یہ باتیں تو نہیں سُنی ہوں گی، یہ تمام صورتیں اخفاء اور راز داری پر دلالت کرتی ہیں لہٰذا اس مجلس کی باتیں امانت ہوں گی الا یہ کہ وہ ایسی بات ہو جس کے چھپانے میں کسی دوسرے شخص کا ضرر متوقع ہو خواہ جانی ہو یا مالی ہو یا عفت وعزت سے متعلق ہو ایسے میں متعلقہ شخص کو آگاہ کرنا لازمی ہے تاکہ وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کرے چنانچہ ابوداؤد میں اس حدیث پر یہ اضافہ موجود ہے ''الاثلاثۃ مجالس سفك دم حرام أو فرج حرام او اقتطاع مال بغیر حق''۔[۱]

باب ماجاء فی السخاء

"عن اسماء بنت ابی بکر قالت قلتُ یارسول اللّٰہ انہ لیس لی من شئی الاما أدخل عَلَیَّ الزبیر، أفَأُعطی ؟؟ قال نعم، لاتوکی فیُوکیٰ علیكِ، یقول لاتحصی فیُحصیٰ علیك"۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میری ذاتی

باب ماجاء ان المجالس بالامانۃ

[۱] سنن ابی داؤد ص: ۳۲۰ ج: ۲ "باب فی نکل الحدیث" کتاب الادب. حفیظ الرحمن الحنفی ندوۃ العلم کراچی

ملک میں کوئی چیز نہیں ہے سوائے اس کے جو زبیر لا کر مجھے دیتے ہیں (یعنی گھر میں لاتے ہیں) تو کیا میں وہ دے سکتی ہوں؟ (یعنی اس میں سے مجھے صدقہ دینے کا اختیار ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہاں'' تم بندھن مت لگانا ورنہ تجھ پر بندھن لگا دیا جائے گا (یعنی ڈوری مت کسو ورنہ تیری رزق دانی کی ڈوری کس کر تنگ کر دی جائے گی) (راوی کہتا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گن گن کر مت رکھو ورنہ تیرے ساتھ بھی گنتی اور حساب کا معاملہ ہوگا۔

لغات:۔ سخاوت فضائل اعمال اور اخلاق کریمانہ میں عمدہ وصف ہے چونکہ ہر فضیلت دو رذیلتوں کے درمیان ہوتی ہے اس لئے سخاوت بخل اور اسراف کے مابین معتدل درجے کا نام ہے، جو ضرورت اور مروّت کے مطابق طیب خاطر سے مالی حقوق کی ادائیگی سے عبارت ہے خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔

قولہ "لاتوکی" ایکاء سے ہے وِکاء وہ ڈوری کہلاتی ہے جس سے مشکیزے یا تھیلے کو باندھا جاتا ہے کنایہ ہے عدم بخل سے کیونکہ پہلے زمانے میں لوگ راشن کی چیزیں آٹا وغیرہ خشک مشکیزے میں رکھتے تھے۔
قولہ "لاتحصی" یہ راوی کی تفسیر ہے احصاء دراصل کنکریوں کے ساتھ گننے کو کہتے ہیں جس میں غلطی کا امکان تقریباً معدوم ہوتا ہے۔ احصاء کے دوسرے معنی پورے پورے استعمال کے بھی آتے ہیں مفسرین نے ''وَاِن تَعُدُّوا نعمة الله لاتُحصوها''[1] میں دونوں مطلب بیان کئے ہیں علیٰ ہذا مطلب یہ ہوگا کہ کھانے کی چیزیں گن گن کر اس نیت سے نہ رکھنا کہ سب خود ہی گھر میں کھائیں گے اور کسی کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیں گے۔
قولہ "فیوکی وفیحصی" دونوں صیغے مجہول کے ہیں یعنی تیرے ساتھ بھی اللہ کی طرف سے پھر ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

تشریح:۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا جو حضرت زبیر بن العوام کی بیوی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی ہیں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتی ہیں، کہ میرا ذاتی ملکیت میں تو کوئی مال نہیں ہے دوسری جانب بنت الصدیق ہونے کے ناطے بغیر صدقہ کے بھی نہیں رہ سکتی تو کیا میں اپنے شوہر کے کمائے ہوئے مال سے صدقہ دینے کی مجاز ہوں؟ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب مرحمت فرما کر خرچ کرنے اور صدقہ دینے کی رغبت دلائی۔

باب ماجاء في السخاء

[1] سورة النحل آیت: ۱۸۔

اس حدیث میں دو باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں ایک یہ کہ عورت شوہر کے مال میں کس حد تک خرچ کرنے اور صدقہ دینے کا حق رکھتی ہے، دوسری یہ صدقہ کرنا اور سخاوت مال بڑھنے کا سبب ہے اس کے برعکس بخل مال کی برکت کی قلت یا انعدام کا موجب ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل ''باب ماجاء فی نفقة المرأة من بیت زوجها'' ابواب الزکوٰۃ میں گذری ہے (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد سوم ص ۱۵۷) خلاصہ اس کا یہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر عورت شوہر کے مال میں سے صدقہ نہیں دے سکتی تاہم اذن عام ہے خواہ صراحتاً ہو یا عرفاً ودلالۃً، اس میں ہر علاقے اور قوم کا عرف ملحوظ رکھنا لازمی ہے بلکہ ہر آدمی کے مزاج کا خیال بھی ملحوظ رکھا جائے گا خصوصاً آج کل چونکہ بخل کا دور دورہ ہے لوگوں کی اکثریت دینوی جمع کو اخروی جمع پر ترجیح دیتی ہے اس لئے آج صدقے کی اہمیت کافی گھٹ گئی ہے بخلاف اسلاف اور متقدمین کے اور خصوصاً عرب اور خاص الخاص زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ صدقہ سے خوشی محسوس فرماتے لہٰذا اس قسم کی احادیث کو عربوں اور خصوصاً صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عرف ومزاج کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

رہی دوسری بات تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو محققین کے نزدیک مسلّم ہے بلکہ مجرب ہے اور قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت سے اور خصوصاً اقارب کے ساتھ نیک سلوک سے مال بڑھ جاتا ہے، چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے شرح البخاری ''فضل الباری'' میں اس آیت ''وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ'' (الطلاق آیت نمبر ۷) اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہئے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اسی میں سے خرچ کرے، کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

''ایک نابینا طالب علم نے اپنے وہم وتخیل کی بنا پر مجھے مجبور کیا کہ مجھ کو بھی دست غیب کا عمل سکھادو، میں نے اس کو اس آیت کے مدلول پر عمل کرنے کو کہہ دیا گو اس آیت کا شانِ نزول اور کچھ ہے مگر اشارہ عام مضمون کی طرف ہے۔ میں نے کہا کہ یہ وعدہ ایزدی ہے اس کا خلاف ناممکن ہے اور امت میں سے بہت سے لوگوں کا یہی تجربہ ہے۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ جو ایسا کرے گا اس کی روزی میں وسعت ہوگی۔ (فضل الباری ص:۴۰۹ ج:۱)

باب کی حدیث اس مضمون پر صریح ہے اور حدیث صحیح ہے شیخین نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔[۲]

---

[۲] صحیح بخاری ص: ۱۹۲، ۱۹۳ ج: ۱ ''باب التحریض علی الصدقة والشفاعة فیها'' کتاب الزکوة.

(وکذا رواہ ابوداؤد والنسائی [۳])

دوسری حدیث:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ سخی شخص اللہ سے قریب رہتا ہے، جنت کے قریب ہوتا اور لوگوں سے بھی قریب ہوتا اور دوزخ سے دور رہتا ہے جبکہ بخیل اللہ (کے رحم) سے دور ہوتا ہے جنت سے بھی بعید ہوتا اور لوگوں سے بھی دور رہتا ہے اور جہنم کے نزدیک رہتا ہے، اور جاہل سخی خدا کے نزدیک بخیل عبادت گذار کی بنسبت زیادہ محبوب ہے۔

یہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور بلکہ منقطع ہے اور امام ترمذیؒ کے کلام میں مرسل سے منقطع مراد ہے تاہم اس کے طرق متعدد ہیں۔ (اخرجہا البیہقی فی شعب الایمان والطبرانی فی الاوسط [۴]) لہٰذا اس کا صحیح مطلب جاننا اور بعض الفاظ کی توجیہ لازمی ہے۔ پس اللہ کے قریب ہونے سے مراد باعتبار مسافت نہیں ہے کیونکہ اللہ عزوجل مکان وجہت سے منزہ ہے بلکہ یہاں اس کی رحمت کا قریب ہونا اور زیادہ ثواب ملنا مراد ہے، جبکہ جنت سے قرب باعتبار مکان بھی ہوسکتا ہے اور لوگوں کے قریب ہونے سے مراد محبت کرنا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرب مکانی مراد ہو کیونکہ سخی آدمی کے پاس مہمان زیادہ آتے ہیں اور دوست بکثرت ہوتے ہیں جو اکثر وبیشتر اس کے آس پاس بیٹھے رہتے ہیں۔

"والجاهل السخی" الخ اس عبارت کے دو مطلب ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ جاہل سے مراد وہ شخص ہو جس کے پاس فرض کے بقدر علم تو ہوتا ہے لیکن وہ متبحر عالم نہیں ہوتا ہے، ایسے شخص کو عرف میں جاہل کہا جاتا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ ایک آدمی ضروری علم کے ساتھ سخاوت کرتا ہے اور نوافل کا اہتمام نہیں کرتا تو یہ شخص اس عبادت گذار سے افضل ہے، جو اگرچہ ضروری علم کے ساتھ نوافل کا اہتمام کرتا ہے مگر سخاوت نہیں کرتا، یہ اس فلسفہ پر مبنی ہے کہ پہلا شخص دنیا سے بے زار ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو مال میرے پاس ہے یہ رہ جانے والا ہے لہٰذا اس کو آگے بھیجا جائے جبکہ دوسرے کا دل دنیا میں لگا ہوا ہے، اس لئے وہ مال جمع کرتا رہتا ہے، دیکھئے یہ بینکوں کے ملازمین کس خشوع وخضوع سے نماز پڑھتے ہیں مگر حرام کی کمائی بڑی احتیاط

---

[۳] سنن ابی داؤد ص: ۲۴۵ ج: ۱ "باب فی الشح" کتاب الزکوٰۃ، سنن نسائی ص: ۳۵۵ ج: ۱ "الاحصاء فی الصدقۃ" کتاب الزکوٰۃ، ایضاً مسند احمد ص: ۴۸۲ ج: ۷ حدیث: ۲۶۳۷۲.

[۴] اخرجه الطبرانی فی الاوسط حدیث: ۲۳۶۱ والعقیلی فی الضعفاء الکبیر ۲/۱۱۷ وابن عدی فی الکامل ۲/۱۲۳۸ والبیهقی فی شعب الایمان ۷/۴۲۸، ۴۲۹ بحواله مجمع الزوائد ص: ۲۳۸ ج: ۳ کتاب الزکوٰۃ. الحنفی

سے جمع کرتے رہتے ہیں البتہ ایسا عالم جو متبحر ہو اور دوسروں کو بھی علمی فائدہ پہنچاتا ہو تو وہ سخی جاہل سے افضل ہے۔ قالہ فی العارضۃ

دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہاں سخاوت اور بخل کا تعلق حقوقِ واجبہ سے جوڑا جائے تو جو آدمی زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ اور لازمی حقوق ادا کرتا ہے وہ اگرچہ نوافل بکثرت نہیں پڑھتا مگر پھر بھی وہ اس عبادت گذار سے افضل ہے، کہ نوافل تو بہت پڑھتا ہے مگر واجبی حقوق کی ادائیگی نہیں کرتا، وجہ ظاہر ہے کہ اول فرائض پر عمل پیرا ہے جبکہ دوسرا فقط نوافل میں لگا ہوا ہے اور فرائض سے تغافل برت رہا ہے بلاشبہ فرائض کا درجہ نوافل سے اعلیٰ ہے۔ (سخاوت کی مزید تفصیل اور فضائل دیکھنے ہوں تو نقش قدم فصل نمبر ۵ ملاحظہ ہو) غرض دنیا کی محبت ہر بُرائی کی جڑ ہے اور زہادت ہر نیکی کی بنیاد ہے۔

باب ماجاء فی البُخل

"عن ابی سعیدالخدری قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: خصلتانِ لاتجتمعان فی مؤمن البُخلُ و سوء الخلق"۔ حدیث غریب اخرجہ ایضاً احمد و ابو داؤد و الحاکم۔[۱] قال ابن العربیؒ فی العارضۃ: ھذا الحدیث وان کان غریباً فانہ تعضدہ احادیث و تعارضہ اُخر۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو عادتیں یعنی بخل اور بدخلقی کسی مؤمن میں (بطور ملکہ کے) جمع نہیں ہوسکتیں۔

ترکیب:۔ بعض حضرات نے نکارت مبتداء سے بچنے کی غرض سے ''لاتجتمعان'' کو ''خصلتان'' کے لئے صفت مُخصِصہ بنایا ہے اور ''البخل و سوء الخلق'' کو ''خبر'' جبکہ بعض نے ''البخل و سوء الخلق'' کو مبتدا اور ''خصلتان'' ''موصوف صفت کو ''خبر مقدم'' بنایا ہے۔ لیکن ان دونوں ترکیبوں سے حدیث کا مطلب صحیح طور پر ادا نہیں ہوسکتا جیسا کہ ادنیٰ تأمل سے ظاہر ہوتا ہے، اس لئے صحیح ترکیب یہ ہے کہ ''خصلتان'' مبتداء ہے اور ''لاتجتمعان'' خبر ہے اور جہاں تک نکارتِ مبتداء کا مسئلہ ہے تو یا تو کہا جائے گا کہ ''البخل و سوء

باب ماجاء فی البخل

[۱] رواہ ابوداؤد فی الادب باب: ۱۰۰، ایضاً الترغیب والترھیب ص: ۲۵۸ ج: ۳ رواہ الترمذی وغیرہ، وفی اعلاء السنن اخرجہ الترمذی وفی سندہ ضعف ص: ۲۵۶ ج: ۱۸، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ کراچی۔

الخلق'' بناء بر بدلیت از مبتدا تخصیص کے لئے کافی ہیں۔

مگر اس سے بھی زیادہ آسان جواب یہ ہے کہ نکارتِ مبتداء کی ممانعت کوئی منصوص علیہا چیز نہیں ہے جس میں رائے کو دخل نہ ہو بلکہ یہ ایک مفید رائے ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ جس کلام میں مبتدا نکرہ ہو تو چونکہ وہ کلام فائدے سے عموماً خالی ہوتا ہے اس لئے ایسا کلام ممنوع ہے، مگر جہاں یہ وجہ نہ ہو تو وہاں یہ پابندی کیوں لاگو ہوگی؟ اس لئے کہا جائے گا کہ کلام کا دارومدار فائدے پر ہے پس اگر نکارتِ مبتداء کے باوجود کلام مفید ہوسکتا ہے تو بلاشبہہ وہ ترکیب صحیح ہی ہوگی، چنانچہ اس قسم کی ایک اور حدیث میں جب علامہ طیبیؒ نے ایسا تکلف کیا تو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے رضی سے یہی بات نقل کر کے اسے رد کر دیا اور رضی تو نحو کا امام ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے: ''خصلتان معلقتان فی اعناق المؤذنین للمسلمین صیامهم وصلاتهم''۔ (رواہ ابن ماجہ،[۲] مشکوٰۃ ص:۶۷) اس میں طیبیؒ نے ''للمسلمین'' کو خبر بنایا ہے ''خصلتان'' کی مگر اس سے مطلب یکسر تبدیل ہو جاتا ہے اس پر شیخ لکھتے ہیں:

'' ولاشك ان المتبادران قوله معلقتان خبرو نكارة المبتداء قدتكلمنافيه مِرارًاأن المدارعلى الافادة كماذكره الرضى الخ۔ (مشکوٰۃ ص ۶۷ حاشیہ نمبر ۹)

اس لئے اوپر ترجمہ میں ''خصلتان'' کو مبتدا اور ''لاتجتمعان'' کو خبر بنایا گیا ہے تاکہ حدیث کا مطلب تبدیل یا مسخ نہ ہو۔

تشریح:۔ سابقہ باب میں سخاء کی تعریف سے بخل کی تعریف خود بخود معلوم ہوتی ہے کہ ''انما الاشياء تعرف باضدادها'' لہٰذا کہا جائے گا کہ شرع جہاں مال خرچ کرنے کا حکم دے یا مروّت اس کا تقاضا کرے وہاں خرچ نہ کرنا بخل ہے خواہ حقوق اللہ کی مد میں ہو یا حقوق العباد۔

گو کہ خلافِ شرع اور خلافِ مروّت دونوں اوصاف مذموم اور قبیح ہیں تاہم وہ بخل جو مخالفتِ شریعت کے زمرے میں آتا ہے زیادہ شنیع ہے اس سے جو خلاف مروت کہلاتا ہے۔

اس حدیث کا مطلب شارحین کے لئے کافی مشکل رہا ہے وجہ اشکال یہ ہے کہ اس ارشاد پاک کے مطابق بخل اور بداخلاقی ایمان کے منافی ہیں حالانکہ مؤمن میں ان دونوں کا مشاہدہ تو کیا جاسکتا ہے جس سے ان کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے۔

---

[۲] سنن ابن ماجه ص: ۵۲ "باب السنة فی الاذان" ابواب الاذان.

پھر اس اشکال سے بچنے کے لئے متعدد توجیہات پیش کی گئی ہیں مثلاً مؤمن سے مراد کامل ہے لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ کامل مؤمن میں یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوتیں اور جن مؤمنین میں مشاہدہ کیا جاتا ہے وہ گویا کاملین نہیں ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں خامیاں بطور ملکہ اور عادت راسخہ کے جمع نہیں ہوسکتی ہیں گو کبھی کبھار ہوسکتی ہیں۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہ دونوں خصلتیں بھرپور انداز میں جمع نہیں ہوسکتی ہیں اگر چہ مقدار قلیل ممکن ہے۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ اگر اخلاق کی تعریف اور حقیقت سمجھ میں آجائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان تینوں توجیہات کا مطلب اور مآل ایک ہی ہے صرف تعبیرات کا فرق ہے۔ الحمدللہ راقم نے اخلاق کے موضوع پر کتاب لکھی ہے اس میں اخلاق کی تعریف تفصیل سے دی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اخلاق دراصل ان ملکات اور راسخ کیفیاتِ نفسانیہ کا نام ہے جو اللہ عزوجل پیدائش کے وقت کسی آدمی میں ودیعت فرماتا ہے، یہ وہ صلاحیتیں ہوتی ہیں جب بچہ بڑا ہوجاتا ہے تو ان کے مطابق افعال کا صدور بآسانی ہوتا ہے مثلاً ایک دن کا نومولود بچہ ہے مگر اس کے اندر شجاعت، عفت اور حکمت پائی جاتی ہیں تو اگر چہ فی الوقت ان کے آثار نظر نہیں آتے مگر جوان ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اثرات مرتب ہونا شروع ہوجاتے ہیں، اگر کسی عارض سے وہ اس کی مخالفت کرے تو اس سے اخلاق پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں پڑتا مثلاً ایک آدمی کے اندر خرچ کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے تو یہ شخص سخی کہلائے گا لیکن اگر بعارض وہ کسی وقت خرچ کے موقعہ پر خرچ نہ کرے تو یہ بدستور سخی ہی کہلانے کا مستحق ہے تاآنکہ کنجوسی اس کا مزاج ثانی نہ بن جائے، پھر اخلاق کے بڑے بڑے ستون تین ہیں، شجاعت، عفت اور حکمت ان کے اجتماع سے عدالت جنم لیتی ہے۔ تفصیل نقش قدم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علیٰ ہذا چونکہ مؤمن تو وہی ہوتا ہے جس کا باطن صاف ہو یا کم از کم رذائل اخلاق سے بچنے کی کوشش کرتا ہو لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ بحیثیت مومن وہ بخل کر کے مالی حقوق کو پامال کرے اور بداخلاقی و بدتمیزی کر کے معاشرتی حقوق کو روندے خاص کر تسلسل سے تو یہ کام ہو ہی نہیں سکتا، اگر اس کے باوجود کوئی ایمان کا دعوی کرتا ہے تو اسے اپنے خاتمے کے لئے فکرمند رہنا چاہئے کیونکہ ایسی خرابیاں عاقبت کو خراب کرسکتی ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ غرض یہاں از روئے ایمان اور بحیثیت ایمان کی بات ہو رہی ہے۔

"قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم :ان العبدلیعمل عمل اھل النار وانہ من اھل الجنۃ

ویعمل عمل اهل الجنة وانه من اهل النار وانما الاعمال بالخواتیم"۔ (متفق علیہ [۳])

یعنی بد باطن کی وجہ سے آدمی بالآخر دوزخیوں کی راہ لیتا ہے۔ اعاذنا اللہ منہ لہٰذا ہر مؤمن کو چاہئے کہ اپنے باطن کو صاف وشفاف بنالے تاکہ اسلام کے احکام کے حوالے سے انشراح قلب میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا رہے، یہاں تک کہ جب موت آجائے تو انشراح نور علی نور بن جائے۔

باب کی دوسری حدیث:۔ "لایدخل الجنة خِبٌّ ولا بخیل ولا منان"۔ [۴]

دغاباز، کنجوس اور احسان جتانے والا جنت میں نہیں جائیں گے۔

لغات:۔ قولہ "خِبٌّ" بکسر الخاء وتشدید الباء جبکہ فتحہ بھی جائز ہے مکار، فریب کار اور دھوکہ باز کو کہتے ہیں جو کہتا کچھ ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے عارضہ میں ابن العربیؒ لکھتے ہیں: " الخب هو الماكر الذی یظهر للناس من الخیر خلاف مایسرّه فیمایعود الیهم "۔ قولہ "منان" مَنٌّ سے ہے بفتح المیم وتشدید النون اس کے صلہ میں جب "علیٰ" آجائے تو بمعنی احسان کرنے اور احسان جتلانے کے آتا ہے اور بغیر صلہ "علیٰ" کے بمعنی قطع کے آتا ہے جیسے مَنَّ الحبل رسی کاٹ دی۔ اس حدیث میں دونوں احتمال ہیں کہ یا تو معنی یہ ہو کہ احسان جتلانے والا جنت میں نہیں جائے گا یا مطلب یہ ہے کہ صلہ رحمی توڑنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

تشریح:۔ اس حدیث کے مطلب میں بھی متعدد اقوال ہیں ایک یہ کہ خب سے مراد کافر ہے جیسا کہ اگلی روایت میں مؤمن کے ساتھ تقابل سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد دخول اولی کی نفی ہے کیونکہ جنت صاف ستھری جگہ ہے وہاں گندے اعمال اور نازیبا اخلاق کے حامل لوگ نہیں جاسکتے یہاں تک کہ صاف ہو جائیں یا اللہ کے معاف کرنے سے یا جہنم کی آگ سے، ہاں جو گندگی ایسی ہے جو ختم نہیں ہوسکتی تو دوزخ میں جلنے کے باوجود بھی وہ پاک نہیں ہوں گے جیسے مشرکین اور دیگر کفار۔

ایک مطلب وہی ہے جو اوپر والی حدیث کی شرح میں گذر گیا کہ ایسے عیوب عموماً خاتمہ بالخیر سے مانع بنتے ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ اور عام فہم مطلب وہ ہے جو بارہا گذرا ہے کہ یہ خاصیات المفرد ہیں یعنی ان افعال کی تاثیر یہ ہے کہ جنت سے روکتے ہیں تاہم قیامت کے دن فیصلہ مفردات کے بجائے مرکب اعمال پر ہوگا تدبر۔

ابن العربیؒ لکھتے ہیں کہ احسان جتلانے والا گویا اللہ کی مشابہت اختیار کرتا ہے کیونکہ انعامات دے

---

[۳] صحیح بخاری ص:۹۷۸ ج:۲ کتاب القدر، ایضاً ص:۹۶۱ ج:۲ "باب فی الاعمال بالخواتیم" کتاب الرقاق، ایضاً رواه احمد فی مسنده ص:۴۵۸ ج:۲ حدیث:۲۲۳۲۸.

[۴] ایضاً الترغیب والترهیب ص:۲۵۸ ج:۳.

کر احسانات جتانا اور تکبر تو اللہ کا وصف ہے، بندے کو تو عاجزی اور تواضع اختیار کر لینی چاہئے یعنی اپنا کام کر لینا چاہئے خدا کا کام اور اس کی صفات خاصہ میں شرکت و مداخلت نہیں کرنی چاہئے، خاص کر جب آدمی کو اپنے خاتمے کا علم بھی نہ ہو اور اگر بالفرض علم بھی ہو جائے تو پھر انبیاء علیہم السلام کی سنت، تواضع کو اپنانا چاہئے۔

قال: "و کذالك لایدخل الجنة منّان وھو الذی یفخر بنعمته علی المنعم علیه فان ذالك انما ھو لِله سبحانه ولرسوله اذاالکِبریاء لِلّٰه فی السمٰوٰت والارض والتکبر مذموم فی حق العبد لرؤیته نفسه فوق غیره وھو لایعلم خاتمة أمره وان علم فمن حقه ان یتواضع کما فعلت الرسل الکرام التی تحققت خواتیمھا وتواضعتِ لأمرِ ربِّھا"۔

زندگی　آمد　برائے　بندگی
زندگی　بے　بندگی　شرمندگی

باب کی تیسری حدیث:۔ "المؤمن غِرٌّ کریم والفاجر خَبٌّ لئیم"۔[۵]

مومن سادہ لوح اور جلد دھوکہ میں آجانے والا اور شریف النفس ہوتا ہے جبکہ فاجر دھوکہ باز اور کمینہ ہوتا ہے۔

لغات:۔ "غِرٌّ" بکسر الغین وتشدید الراء بمعنی سادہ لوح، سیدھا سادہ اور جلد دھوکہ میں آجانے والا کے۔قولہ "کریم" لئیم کی ضد ہے بمعنی شریف الطبع، سخی، عالی ظرف اور صاحب عزت کے۔قولہ "لئیم" بروزن کریم۔ یہ لفظ لؤمًا سے مشتق ہے بفتح اللام وسکون الھمزۃ "لَـؤُم فـلان" کم ذات ہونا، نچلے اور گھٹیا درجہ کا ہونا، خسیس، کم ظرف اور بخیل ہونا وغیرہ اس کے مفہوم میں شامل ہیں، چونکہ کریم میں سخاوت کے معنی پائے جاتے ہیں اس لئے لئیم میں اس کی ضد یعنی بخل کے معنی کو ملحوظ رکھنا بھی مناسب ہے۔

تشریح:۔ حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مؤمن جاہل ہوتا ہے اس لئے دھوکہ کھا جاتا ہے بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ "المرأ یقیس علی نفسه" کے اصول کی بنا پر مؤمن دوسرے کو بھی سچا سمجھتا ہے خاص کر جب

---

[۵] رواہ ابوداؤد ص:۳۱۲ ج:۲ "باب فی حسن العشرۃ" کتاب الادب، ایضاً رواہ احمد فی مسندہ ص:۱۰۳ ج:۳ حدیث:۸۸۷۳۔

دوسرا دھوکہ باز ہو تو اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور بڑے بڑے دعوے کرتا ہے چونکہ مؤمن کا دل صاف ہوتا ہے اس لئے فاجر کی باتیں اس خالی لوح پر جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں، دیکھئے ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام سے جھوٹ بولا اور قسم کھائی کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں چنانچہ اس کی قسم جھوٹی تھی مگر حضرت آدم علیہ السلام کے پاس اللہ کے نام سننے کے بعد کوئی اور چارہ نہیں رہا تھا۔ اور بخاری شریف کتاب الانبیاء میں روایت ہے:

"رأى عيسىٰ رجلاً يسرق فقال له اسرقتَ قال كلّا والذى لااله الاهو فقال عيسىٰ: امنتُ باللّٰه و كذّبتُ عَينَىَّ"۔ (بخاری ص: ۴۹۰ جلد: ۱، باب قول اللہ عزوجل واذکر فی الکتاب مریم الخ)

غرض مؤمن حسن ظن اور دنیوی امور میں عدم دلچسپی اور درگذر و تسامح کی بنا پر دھوکہ کھا جاتا ہے جبکہ فاجر بدگمانی کی وجہ سے اچھی اور سچی بات کو شک کے تناظر میں دیکھتا ہے کہ اس کا کام یہی ہوتا ہے، اس کی آسان مثال یہ ہے کہ اکثر سیاسی لوگ ہمارے علماء کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں اور علماء ان کے وعدوں پر بھروسہ کر کے نقصان اٹھاتے ہیں۔

لیکن یہاں شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں ایک اعتراض کر کے پھر اس کا جواب دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحیحین کی روایت۔ کے مطابق ایک آدمی کو بدر میں گرفتار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے بہت زیادہ اعذار اور حیلے بہانے کر کے رہائی حاصل کر لی مگر جب گھر پہنچا تو کہنے لگا کہ میں نے محمد کو دھوکہ دیا، پھر وہ شخص دوبارہ گرفتار ہوا اور حسب سابق پھر معذرت کرنے لگا "فقال النبى صلى الله عليه وسلم: لايُلدَغُ المؤمن من جُحرٍ واحدٍ مرتين" الخ [۶] اس لئے نبی علیہ السلام نے اسے نہیں چھوڑا تو بظاہر باب کی حدیث اور صحیحین کی حدیث میں تعارض ہے۔ ان میں تطبیق یہ ہے کہ حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن حیلہ ساز اور عیّار نہیں ہوتا جو کسی معاملے کی پہلے سے حیلہ سازی کرتا ہے جبکہ صحیحین کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن جب کسی مرحلے سے گذر جائے اور اس میں ایک بار دھوکہ کھائے تو دوبارہ اس معاملے میں پھر دھوکے میں نہیں آتا، لہٰذا کوئی تعارض نہ رہا۔

---

۶ الحديث اخرجه البخارى فى كتاب الادب باب: ۸۳، ومسلم كتاب الزهد، وابو داؤد كتاب الادب باب: ۲۹، وابن ماجه ابواب الفتن باب: ۱۳، واحمد فى مسنده ص: ۲۶۲ ج: ۲ حديث: ۵۹۲۸.

اس حدیث کوسراج الدین قزوینی نے موضوعات میں شمار کیاہے کیونکہ اس کا راوی بشر بن رافع امام احمدؒ کے نزدیک ضعیف ہے مگر صلاح الدین علائی نے ابن معین سے نقل کیا ہے: "لیس بہ بأس" کمافی حاشیۃ القوت وفیھا التفصیل۔ نیز اس کے متابع بھی موجود ہیں، صاحب تحفہ لکھتے ہیں: اخرجہ احمد وابو داؤد[ے] والحاکم۔ ابن العربیؒ نے عارضہ میں بھی اس پر اعتراض نہیں کیا ہے لہٰذا یہ کم از کم درجہ حسن تک پہنچ سکتی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

باب ماجاء فی النفقۃ علی الاھل

"عن ابی مسعود الانصاری عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: نفقۃ الرجل علی اھلہ صدقۃ"۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کا خرچ کرنا اپنے اہل خانہ پر صدقہ ہے۔

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ صدقہ کی صحت اور ثواب کا دارومدار صرف اس پر نہیں ہے کہ غیروں اور فقراء کو کچھ دیا جائے بلکہ اپنے اہل خانہ پر خرچ کرنے سے بھی صدقے کا ثواب مل جاتا ہے خواہ اہل خانہ سے مراد بیوی لی جائے یا دیگر افراد خانہ لئے جائیں، اسی طرح وہ نان نفقہ واجبی ہو جیسے بیوی اور نابالغ بچوں پر یا غیر واجبی ہو جیسے ان کے علاوہ دوسرے افراد خانہ پر۔ البتہ بظاہر یہ ثواب اس وقت ملے گا جب وہ اس انفاق میں ثواب کی نیت کرے چنانچہ صحیحین کی روایت اس طرح ہے "اذا انفق المسلم نفقۃ علی اھلہ وھو یحتسبھا"۔[ل] ہاں البتہ صدقات سارے مساوی اور برابر نہیں ہیں بلکہ نفس ثواب میں شرکت کے باوجود ان میں تفاوت پایا جاتا ہے، بہر حال اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ہم اپنے معاملات اور مباح اعمال یا وہ اعمال جو ہمارے ذمے کسی کے حق کے طور پر واجب ہیں۔ ان کو بھی بنیت ثواب عبادت بنا سکتے ہیں۔

ے سنن ابی داؤد ص: ۳۱۲ ج: ۲ کتاب الادب، ومسند احمد ص: ۱۰۳ ج: ۳.

باب ماجاء فی النفقۃ علی الاھل

ل صحیح بخاری ص: ۸۰۵ ج: ۲ "باب فضل النفقۃ علی الاھل" کتاب النفقات، ایضاً مسنداحمد ص: ۳۶۷ ج: ۶ حدیث: ۲۱۸۴۲، واخرجہ مسلم فی الزکوٰۃ ص: ۳۲۴ ج: ۱ حدیث: ۴۸، والنسائی فی الزکوٰۃ باب: ۶۰ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۴۲ ج: ۳.

دوسری حدیث:۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہتر دینار وہ دینار ہے جسے آدمی اپنے عیال (گھر والوں) پر خرچ کرے اور (پھر) وہ دینار ہے جس کو آدمی اللہ کی راہ میں اپنی سواری پر خرچ کرے اور (پھر) وہ دینار ہے جس کو آدمی اللہ کے راستہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرے۔ ابوقلابہ (راوی) فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیال سے ابتدا فرمائی، پھر فرمایا (ابوقلابہ نے) کہ کس شخص کا ثواب اس آدمی سے زیادہ ہوسکتا ہے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتا ہے جس کی وجہ سے اللہ ان کو سوال سے محفوظ رکھتا ہے اور اسی انفاق کی وجہ سے اللہ ان کو مستغنی کر دیتا ہے۔[۲] (ھذا حدیث حسن صحیح)

تشریح:۔ اگر چہ ''واو'' ترتیب پر دلالت نہیں کرتی مگر راوی ابوقلابہ نے ترتیب ذکری کو دیکھتے ہوئے اولاد پر خرچ کرنے کا ثواب باقی دو قسموں سے زیادہ قرار دیا کہ اگر چہ یہ تینوں اخراجات بڑے اجر وثواب کے باعث ہیں مگر اہل وعیال کا درجہ زیادہ اعلیٰ ہے، پھر فی سبیل اللہ شریعت کی اصطلاح میں جہاد کے لئے استعمال ہوتی ہے لہٰذا اس کا اصل مصداق تو مجاہدین ہیں مگر مع ہذا طلب علم اور دین کے کسی بھی کام کی غرض سے گھر سے نکلنے پر بھی سبیل اللہ کا اطلاق بعض احادیث سے ثابت ہیں لہٰذا اس حدیث کو عموم پر رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

باب ماجاء فی الضیافة وغایة الضیافة کم ھو؟

" عن ابی شریح العدوی انه قال :اَبصَرَت عَینَایَ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وسَمِعَتهُ اُذُنَایَ حین تکلم به قال:من کان یؤمن باللّٰه والیوم الآخرفلیکرم ضَیفَه جائزته قالوا :وماجائزته؟قال یوم ولیلة قال: والضیافة ثلاثة ایام وماکان بعدذالك فھوصدقة ومن کان یؤمن باللّٰه والیوم الآخرفلیقل خیراًاولیسکت "۔(ھذاحدیث حسن صحیح)

حضرت ابوشریح العدوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ ارشاد فرمارہے تھے تو اس وقت میری آنکھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھیں، اور میرے کان سُن رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے تو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اس کے امتیازی کھانے کا خیال رکھے، صحابہ کرامؓ نے پوچھا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا ایک شب وروز (خصوصی)

---

[۲] الحدیث اخرجه مسلم ص: ۳۲۲ ج: ۱ کتاب الزکوٰة، الترغیب والترھیب ص: ۱۴۱ ج: ۳

مہمانی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہمان نوازی تین دن تک ہے اس کے بعد جو کھلایا جائے گا وہ (محض) صدقہ ہوگا اور جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے تو وہ بھلی بات کرے یا پھر خاموش رہے۔

لغات:۔ قولہ "جائزتہ" اس لفظ کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ مہمان جب جانے لگے تو اسے رخصت کرتے وقت اتنا کھانا دے دیں جو اس کے ایک شب و روز کے لئے کفایت کرے۔ یہ مطلب صحرائی اور جنگلوں کے سفر کے ساتھ مناسب ہے۔ دوسرا یہ کہ نفس مہمان نوازی تو تین شب و روز ہے مگر پہلا دن بطور خاص اہتمام والا ہونا چاہئے جس میں اپنے معمول سے زیادہ عمدہ کھانا امتیازی طور سے تیار کیا جائے۔ اس کی تائید مسلم کی روایت سے ہوتی ہے جس میں جائزہ کو عطف کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے "الضیافة ثلاثة ایام وجائزته یوم ولیلة"۔[1]

ترمذی کی روایت کے مطابق "جائزته" منصوب ہے کہ یہ "فلیکرم" کا مفعول ثانی ہے کیونکہ "فلیکرم" بمعنی اعطاء کے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منصوب بنزع الخافض ہو "ای فلیکرم ضیفه بجائزته"۔

تشریح:۔ اسلام کی آمد سے پہلے بھی عربوں کی بعض عادات و رسومات ایسی تھیں جو سنت ابراہیمی کی بنیادوں پر قائم تھیں یا پھر انسانیت سے ہم آہنگ تھیں۔ اسلام نے ایسی رسومات کو جوں کا توں اپنی حالت پر برقرار رکھا ہے۔ ازاں جملہ ایک ضیافت کی روایت تھی جو عربوں میں رائج تھی، اس روایت میں حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ نے اس کی مزید تاکید نقل فرمائی ہے جو اپنی عادت کے مطابق فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کے دوران میری آنکھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھیں، اور کان یہ ارشاد سُن رہے تھے۔ ترمذی ہی میں ابواب الحج کی پہلی حدیث بھی انہی سے مروی ہے، اس میں بھی انہوں نے یہی اندازِ گفتار اپنایا ہے، کسی راوی کے یہ اندازِ تعبیر اختیار کرنے کا مقصد حدیث کے کمالِ حفظ سے کنایہ ہوتا ہے، یا محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے اپنے قلب کو محظوظ و منور کرنا ہوتا ہے کہ تذکرۂ حبیب سے جو لطف ملتا ہے اس کا اندازہ محبّ ہی کر سکتا ہے۔ اس ارشاد پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان لایا ہے وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ اسلام نے صحیح رسومات و روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان کی تائید اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تاکید بھی فرمائی لہٰذا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ضیافت کا حکم اب پہلے سے زیادہ

باب ماجاء فی الضیافة وغایة الضیافة کم هو

[1] صحیح مسلم ص: ۸۰ ج: ۲ "باب الضیافة ونحوها" کتاب اللقطة.

مؤکد ہے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان عقیدہ کا لازمی جزء ہے:۔ راقم نے اپنے کانوں سے بعض پروفیسروں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اہل مغرب یعنی یہود ونصاریٰ کو کافر نہیں کہنا چاہئے، کیونکہ اس سے منافرت پھیلتی ہے اور دہشت گردی کو تقویت ملتی ہے۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا، ان کا زعم یہ ہے کہ ایمان بالرسول لازمی نہیں اور اللہ وآخرت کو تو وہ لوگ مانتے ہیں پھر وہ کیوں کافر ہوئے؟؟؟

یہ لوگ ان نصوص سے استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن پر ایمان کا ذکر نہیں ہے مثلاً سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۳ اور ۱۱۴ میں ہے:

"لیسُوا سواءً من اهل الکتاب امة قائمة یتلون اٰیٰتِ اللّٰه اناءَ اللیل وهم یسجدون یؤمنون باللّٰه والیوم الآخر ویأمرون بالمعروف واولئك من الصالحین"۔

اسی طرح باب کی حدیث میں بھی ایمان بالرسول والکتاب کا ذکر نہیں ہے۔

جواب:۔ ویسے تو اہل زیغ کا اصول یہی ہے کہ وہ ان نصوص سے استدلال کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں جن میں اجمال یا اختصار ہوتا ہے مگر آج کل کے روشن خیال طبقے نے اس طرز استدلال کو اپنا مشن بنایا ہے چونکہ ان لوگوں کا مقصد دین اسلام سے لوگوں کو ہٹانا ہے اس لئے ان کی تحریروں اور تقریروں میں یہ عنصر نمایاں ہے یہ لوگ اپنا ایک معیار مقرر کر لیتے ہیں جس میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اہل مغرب کے منشاء کے مطابق ہو بلکہ بسا اوقات یہ مشن ان کو سونپا جاتا ہے پھر یہ لوگ سفسطانیہ طرزِ استدلال سے نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور صریح درجنوں نصوص کو نظر انداز بلکہ ان کا انکار کر لیتے ہیں۔ راقم نے اپنی کتاب ''تجدد پسندوں کے افکار کا جائزہ'' میں اس پر نسبتاً تفصیلی بحث کی ہے۔

یہ لوگ صرف ایک لکیر پر چلتے ہیں اور باقی علوم کے جتنے اصول ہیں ان سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ صَرف نظر کرتے ہیں حالانکہ بلاغت کا مسلمہ اصول ہیں، کہ بعض مخاطب کے سامنے یا بعض اوقات ایک بات مجمل بیان کی جاتی ہے جبکہ وہی بات دوسرے موقعہ پر تفصیلی بیان کی جاتی ہے یا اس لئے اجمال ہوتا ہے کہ وہ بات دوسری جگہ تفصیلاً آچکی ہوتی ہے فقہاء وبلغاء کے کلام میں اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں کہ ایک بات ایک جگہ مقید ہوتی ہے مگر دوسری جگہ اس میں وہ قید ذکر نہیں کی جاتی ہے حالانکہ وہ ملحوظ بلکہ ضروری ہوتی ہے،

جیسا کہ علامہ شامیؒ نے شرح عقود رسم المفتی میں بوضاحت بیان کیا ہے، مفسرین نے اس نکتے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ''القرآن یفسر بعضہ بعضاً''۔

لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ سورۂ اٰل عمران کی یہ آیت جس حالت میں نازل ہوئی ہے اس کا مقتضا یہی تھا کہ اس میں فقط اتنا ہی بیان ہو جبکہ دوسری درجنوں آیات میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول والقرآن کی بار ہا تصریح کی گئی ہے۔ ایسی آیات کی تعداد بہت زیادہ ہے تاہم بطور نمونہ یہاں معدودے چند ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) ''قل اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول فان تولّوا فان اللّٰہ لایحب الکفرین ''۔ (اٰل عمران آیت ۳۲)

(۲) ''یااھل الکتاب لِمَ تکفرون بایٰتِ اللّٰہ وانتم تشھدون ''۔ (اٰل عمران آیت نمبر ۷۰ تا ۷۸)

(۳) ''ویقولون علی اللّٰہ الکذب وھم یعلمون ''۔

(۴) ''ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخسرین ''۔

(۵) ''کیف یھدی اللّٰہ قوماً کفروا بعد ایمانھم وشھدوا ان الرسول حق وجاء ھم البیّنٰتُ واللّٰہ لایھدی القوم الظّٰلمین اولٰئک جزاء ھم ان علیھم لعنۃ اللّٰہ والملآئکۃ والناس اجمعین۔ خالدین فیھا لایخفف عنھم العذاب ولاھم ینظرون ''۔ (اٰل عمران آیت ۸۸)

(۶) وقولہ تعالیٰ ''ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاء ھم البیّنٰتُ واولٰئک لھم عذاب عظیم ''۔ (اٰل عمران آیت ۱۰۵)

(۷) وقولہ تعالیٰ ''وما محمد الّا رسول ''۔ (اٰل عمران آیت ۱۴۴)

(۸) وقولہ تعالیٰ ''لانفرق بین احد من رسلہ ''۔ (سورۂ بقرہ آیت ۲۸۵)

(۹) وقولہ تعالیٰ ''لاتحسبنّ الذین یفرحون بمآ اتوا وّ یُحبُّونَ ان یُحمَدُوا بمالم یفعلوا فلاتحسبنّھم بمفازۃٍ من العذاب ولھم عذاب الیم ''۔ (اٰل عمران آیت ۱۸۸)

(۱۰) وقولہ تعالیٰ '' ان الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین فی نار جھنم خٰلدین فیھا اولٰئک ھم شر البریۃ ''۔ (سورۃ البینہ آیت ۶)

(۱۱) وقولہ تعالیٰ ''ان الذین یکفرون باللّٰہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللّٰہ ورسلہ و

یقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالك سبیلاً اولئك هم الکفرون حقاً واعتدنا للکفرین عذاباً مهیناً"۔ (سورۃ النساء آیت ۱۵۱)

اگر طول کا خطرہ نہ ہوتا تو مزید آیات پیش کی جاتیں مگر طالب حق کے لئے تو اشارہ بھی کافی ہونا چاہئے یہ تو کافی تعداد میں آیات ہیں۔

لہٰذا اہل تجدد کے اس قسم کے نظریات کے پرچار کا مقصد صرف اور صرف گمراہی کو فروغ دینا ہے۔ رہی باب کی حدیث تو سمجھ لینا چاہئے کہ بعض اصطلاحات اسماء اعلام کے طور پر استعمال ہوتی ہیں جیسے "من قال لا اله الا الله دخل الجنة" [۲] اور "مفاتیح الجنة شهادة ان لا اله الا الله"۔ [۳] (مشکوٰۃ ص ۱۵) لہٰذا کہا جائے گا کہ باب کی حدیث میں اللہ اور آخرت پر ایمان مبدأ اور معاد یعنی پورے اسلام کا اسم علم ہے یعنی بحیثیت مسلمان آدمی کو اپنے مہمان کا اکرام کرنا چاہئے۔

اکرام ضیف:۔ اکرام ضیف یہ ہے کہ اس سے خندہ پیشانی سے ملے، ملاطفت اور نرمی سے بات کرے اسے مناسب جگہ پر بٹھا دیا جائے، اور یہ تأثر دے کہ آپ کی آمد سے بڑی خوشی محسوس ہوئی، اس سے کھانے کے بارے میں پوچھے بغیر کھانا حاضر کیا جائے ہاں اگر کھانے کا وقت گذر گیا ہو تو پھر پوچھنے میں کوئی حرج نہیں، ممکن ہے کہ اس نے کھایا ہو، ایسے میں مہمان کو از خود کہنا چاہئے کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔

کھانے سے پہلے کسی اور چیز سے اس کی تواضع کی جائے تو زیادہ اولیٰ ہے تاکہ فوری طور پر کچھ اکرام ہو جائے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جلد ہی مہمانوں کی خدمت میں عجل سمین پیش فرمایا تھا۔ اپنی استطاعت کے مطابق عمدہ سے عمدہ کھانا ان کی خدمت میں پیش کیا جائے خصوصاً ابتداء ضیافت میں۔'' ان کے کھانے سے مسرور ہونا چاہئے، کھانے کے دوران مہمان سے گاہے گاہے کہا جائے کہ آپ کیوں نہیں کھا رہے؟ بچے یا ایسے افراد کو مہمانوں کے ساتھ کھانے پر نہیں بٹھانا چاہئے جن سے تکدر خاطر ہو۔

قوله "قالوا وما جائزته"؟ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا سوال مدت کے بارے میں تھا کہ جائزے کی مدت کتنی ہے کیونکہ نفس جائزہ وہ جانتے تھے۔

ضیافت کا حکم:۔ بعض صحیح روایات سے بظاہر مہمان نوازی کا وجوب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے

---

[۲] روی بمعناه مسلم ص: ۴۱ ج: ۱ کتاب الایمان عن عثمان قال قال رسول الله ﷺ من مات وهو یعلم انه لا اله الا الله دخل الجنة.

[۳] رواه احمد فی مسنده ص: ۳۲۱ ج: ۶ حدیث: ۲۱۵۹۷.

متعلق بعض احادیث کے الفاظ یوں ہیں "لیلة الضیف حق واجب"۔ [۴] بعض میں ہے کہ اگر مہمان کو کھانا نہیں کھلایا گیا اور اس نے خالی پیٹ رات گذاری تو اس کا حق میزبان پر دَین ہے۔ (کمارواہ ابوداؤد [۵]) اور بعض میں ہے کہ اس کا حق لینا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اگر وہ لوگ تمہیں نہ کھلائیں تو ان سے مہمانی کا حق زبردستی لے لو [۶] وغیرذالک من الروایات۔ [۷] باب کی حدیث سے بھی لزوم معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض اہل ظاہر نے تو وجوب کی تصریح کردی جبکہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل بادیہ پر واجب ہے جبکہ شہری لوگوں پر واجب نہیں، کیونکہ شہر میں ہوٹل ہوتے ہیں مگر باقی ائمہ ثلاثہ" فرماتے ہیں کہ مہمان نوازی زیادہ سے زیادہ سنت ہے جو مکارم اخلاق کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤکد فرمائی ہے۔

مذکورہ احادیث سے جمہور نے متعدد جوابات دیئے ہیں مثلاً شروع میں جب مسلمانوں کی آبادی کم تھی اور وسائل بھی قلیل تھے تو ضیافت واجب تھی مگر بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا، یا پھر وجوب پہلے بھی نہ تھا البتہ استحباب زیادہ مؤکد تھا جبکہ بعد میں زیادہ تاکید منسوخ کردی گئی یہ دونوں جوابات اسی طرز پر دیئے گئے جیسے جمعے کے غسل کے بارے میں جمہور نے تاکید کی روایات سے دیئے ہیں۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ضیافت کو واجبی حق قرار دینا عام نہ تھا بلکہ یہ عاملین کے لئے مخصوص تھا کہ اہل ذرع واہل ضرع پر عاملین کی ضیافت واجب ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ مضطر کے لئے ہے یا پھر یہ لزوم حکومت کی طرف سے اہل ذمہ پر عائد کیا گیا تھا۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ نسبتاً زیادہ اطمینان بخش جواب یہ ہے کہ یہ وجوب از روئے مکارم اخلاق وحسن معاشرت ہے وجوب تشریعی نہیں لہٰذا اگرچہ ضیافت واجب تو ہے مگر ضیافت نہ کرنے کی صورت میں آدمی بے مروت کہلائے گا، کہ اس نے وہ حکم پامال کردیا جو بامروت شخص پر مروت کے طور پر واجب ہوتا ہے اور اس کا ضمیر مہمان کو محروم و مایوس کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے لہٰذا ایسا شخص بے ضمیر اور بے مروت کہلانے کا مستحق تو ہوگا، مگر شرعاً آخرت میں اس پر ان شاء اللہ سزا مرتب نہ ہوگی چنانچہ امام ابوداؤد" نے اپنی سنن میں ضیافت کے باب میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد ایک اور باب باندھا ہے "باب فی نسخ الضیف فی الاکل من مال غیرہ" [۸]

---

[۴] کذا فی سنن ابن ماجہ ص: ۲۶۱ کتاب الادب ولفظه لیلة الضیف واجبة، وابوداؤد ص: ۱۷۰ ج: ۲ "باب من الضیافة الخ" کتاب الاطعمة۔ [۵] سنن ابی داؤد حوالہ بالا۔

[۶] صحیح بخاری ص: ۹۰۶ ج: ۲ "باب اکرام الضیف وخدمته" کتاب الادب۔

[۷] راجع للتفصیل الترغیب والترهیب ص: ۲۵۰ تا ۲۵۳ ج: ۳۔

[۸] سنن ابی داؤد ص: ۱۷۱ ج: ۲ کتاب الاطعمة۔

اوراس میں یہ آیت نقل کی ہے ''لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل'' الایۃ [۹] ۔لہٰذا سابقہ روایات مؤول ہیں۔

مہمان کی ذمہ داری:۔شریعت مطہرہ کا یہ عام اصول ہے کہ جہاں کوئی معاملہ دو یا دو سے زیادہ فریق کے درمیان مشترک ہو تو وہاں ہر فریق کے لئے مناسب حال حکم ہوتا ہے ہر فریق کو یہ تعلیم دینا شریعت کا زرین ضابطہ ہے، کہ وہ دوسرے فریق کا بطور خاص خیال رکھے ازاں جملہ ایک ضیافت بھی ہے اس میں میزبان کو سختی سے اس کا پابند بنایا کہ وہ اپنے مہمان کو راضی رکھنے اور اس کی راحت کی ہر ممکن کوشش کرے۔

مگر چونکہ مہمان بہرحال ایک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے اس لئے ضرورت تھی کہ مہمان کو بھی بتادیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے دسترخوان سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ باب کی دونوں حدیثوں میں یہ تصریح کردی گئی کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے کیونکہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی، اگر وہ صاحب خانہ کی کرم نوازی سے غلط فائدہ اٹھانا چاہے گا اور تین دن کے بعد بھی جانے کا نام نہیں لے گا تو مزید کھانا صدقہ شمار ہوگا اب ایک غیور اور خوددار شخص خود سوچے کہ آیا وہ صدقہ کھانا پسند کرتا ہے یا اپنی عزت کی حفاظت پسند کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا ''ولا یحل لہ ان یثوی عندہ حتی یحرجہ''۔امام ترمذیؒ نے ''یثوی'' کا مطلب خود بیان فرمایا ہے ''یعنی الضیف لایقیم عندہ حتی یشتد علی صاحب المنزل والحرج ھو الضیق''۔یعنی مہمان اتنا نہ ٹھہرے کہ جس سے صاحب خانہ تنگ آجائے، ثوی یثوی بروزن رمی یرمی بمعنی الاقامۃ۔ [۱۰]

ضیافت سے متعلق مزید تفصیل درکار ہو تو ملاحظہ ہو نقش قدم کامل حصہ دوم، نقش اخلاق فصل ہفتم مہمان کے حقوق اور آداب ضیافت وآداب برائے مہمان۔

---

[۹] سورۃ البقرۃ آیت:۱۸۸۔

[۱۰] وقال الخطابی: معنی لایثوی، لایحل للضیف ان یقیم عندہ بعد ثلاثۃ ایام من غیر استدعاء منہ حتی یضیق صدرہ فیبطل اجرہ انتہی، وقال الحافظ وللعلماء فی ھذا الحدیث تاویلان: احدھما ان یعطیہ مایجوز بہ ویکفیہ فی یوم ولیلۃ اذا اجتاز بہ وثلاثۃ ایام اذا قصدہ، والثانی یعطیہ مایکفیہ یوماً ولیلۃ یستقبلھما بعد ضیافۃ، الترغیب والترھیب ص: ۲۵۱ ج:۳. حفیظ الرحمن الحنفی عفی عنہ

باب ماجاء فی السعی علی الارملة والیتیم

"عن صفوان بن سُلیم یرفعه الی النبی صلی الله علیه وسلم قال:الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاھدفی سبیل الله او کالذی یصوم النھارویقوم اللیل"۔[۱]

حضرت صفوان بن سلیم سے روایت ہے جسے وہ مرفوع بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: بیوہ اور مسکین (کی مدد) کی کوشش کرنے والا اللہ کی راہ میں مجاہد کی مانند ہے یا اس شخص کی طرح ہے جودن کوروزہ رکھتاہےاوررات کونماز پڑھتاہے۔

لغات:۔قولہ "الساعی" سعی سے ہےلیکن یہاں دوڑنے کے معنی میں نہیں بلکہ محنت ومشقت اور کسب کے معنی میں ہے چونکہ محنت کرنے والاعموماً تیز ہوتاہےاس لئے اسے ساعی کہتے ہیں۔قولہ "الارملة" بفتح الھمزة والمیم وبینھماراء ساکنة۔ارمال سے مشتق ہےفقرومسکنت کوکہتے ہیں جوعورت بغیرشوہرکے ہووہ عموماًغریب محتاج ہوتی ہےاس لئے اسے ارملہ کہتے ہیں۔قولہ" المسکین" من لاشیء له ،بعض حضرات نے یہ معنی فقیرکے بیان کئے ہیں اور مسکین اس کوکہاہےجس کے پاس کچھ نہ کچھ ہومگروہ ناکافی ہو۔بعض نے یہ حکم فقیرکابتلایاہے۔بہرحال مراداس سےمحتاج اورغریب ہے۔

تشریح:۔حضرت صفوان تابعی ہیں مگرروایت مرفوع نقل کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مرسل ہے تاہم دوسری سند میں موصولاً مروی ہےاس لئے شیخین نے بھی اس کی تخریج کی ہے،[۲] امام ترمذیؒ نے ترجمة الباب میں لفظ یتیم کاذکرکیاہےجبکہ حدیث میں مسکین کالفظ واردہواہے یہ تعمیم کی طرف اشارہ ہے۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جتنا ثواب مجاہد یاصیام وقیام کے پابندکوملتاہے اتناہی ثواب اس عامل کویااس شخص کوبھی ملتاہے جوبیوہ اورمحتاج کی فکرمیں مشغول اوران کی مددکے لئے کوشاں ہوتاہے چونکہ مجاہد کی محنت سے بیت المال میں غنیمت جمع ہوجاتی ہے،جس سے بیواؤں اور بےکسوں کوفائدہ ہوتاہےاسی طرح

باب ماجاء فی السعی علی الارملة والیتیم

[۱] الحدیث اخرجه ایضاً البخاری فی النفقات باب: ۱، ومسلم فی الزھد حدیث: ۴۱ وابن ماجه فی التجارات باب: ۱، بحواله الترغیب والترھیب ص: ۲۳۸ ج:۳۔

[۲] صحیح بخاری ص: ۸۰۵ ج: ۲ عن ابی ھریرة ، کتاب النفقات، صحیح مسلم ص: ۴۱۱ ج: ۲ "باب فضل الاحسان الی الارملة والمسکین والیتیم کتاب الزھد.

اس شخص کی کمائی سے بھی ان کی مدد ہوتی ہے اس لئے دونوں گویا مساوی ہیں یا جس طرح مجاہد بیت المال میں حصے کا مستحق ہوتا ہے اسی طرح عامل بھی ہوتا ہے، بہرحال یہاں تشبیہ ثواب میں مراد ہے چونکہ مجاہد اور روزہ دار اور نمازی کے ثواب کا ایک معیار معلوم ہے اس لئے عام طور سے ان کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، جس سے شریعت کے احسان عظیم کا پتہ چلتا ہے کہ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے اعمال کو توسیع دے کر بڑے مشقت والے اعمال کے برابر ثواب دیا جاتا ہے۔

باب ماجاء فی طلاقة الوجه وحُسن البشر

"عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كل معروف صدقة وان من المعروف ان تلقى اخاك بوجه طلق وان تفرغ من دلوك فى اناء اخيك"۔[1]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکی کے کاموں میں سے یہ بھی ہے کہ تم اپنے (اسلامی) بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو اور یہ کہ تم اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈالو۔

لغات:۔ قولہ "طلاقۃ وطَلِیْق" دونوں مصدر ہیں پھر طلق میں لام کا کسرہ بھی جائز ہے اور سکون بھی، بمعنی ہنس مکھ، خندہ رو اور کھلا ہوا ہشاش چہرہ۔

قولہ "البِشر" بکسر الباء بمعنی خندہ روئی وخوشی کے ہے۔ قولہ "المعروف" وہ کام جس کی اچھائی اور خوبی از روئے نقل وعقل دونوں ثابت ہو جیسے راستے کا صاف کرنا وغیرہ، یہ لفظ "منکر" کے مقابلے میں آتا ہے جو نا آشنا ہوتا ہے۔

تشریح:۔ حدیث کی تشریح "باب ماجاء فی صنائع المعروف" میں عنقریب گذری ہے اعادہ کی ضرورت نہیں صرف اتنی بات عرض ہے کہ جب آدمی اپنے بھائی سے خوشی خوشی ملتا ہے اور مسکرا کر ملاقات کرتا ہے تو اس سے وہ مانوس ہو جاتا ہے اور قلب کا میلان اور صفائی معلوم کر لیتا ہے، کیونکہ ہر آدمی کا چہرہ اس کے دل ودماغ کی

باب ماجاء فى طلاقة الوجه وحسن البشر

[1] الحديث اخرجه ايضاً احمد فى مسنده ص: ٣٠٥ ج: ٣ حديث: ١٤٢٩٩، ايضاً ص: ٢٣٢ ج: ٣ حديث: ١٣٣٦٣، ايضاً الترغيب والترهيب ص: ٢٨٢ ج: ٣.

اسکرین کا کام دیتا ہے لہٰذا جب ملاقات خندہ پیشانی سے ہوتی ہے تو اس سے ایک اچھا تأثر اُبھرتا ہے جس کی اچھائی پر عقل اور نقل دونوں متفق ہیں اور جب اس کے بھائی کو ملنے سے خوشی ہوگی تو اس پر صدقے کا ثواب ملے گا کیونکہ صدقے سے بھی خوشی ملتی ہے تو جس طرح صدقے کی خوشی باعث اجر وثواب ہے اسی طرح اچھے انداز سے ملاقات بھی خوش افزا ہونے کی وجہ سے باعث ثواب ہے۔ تدبر

باب ماجاء فی الصدق والکذب

"عن عبداللّٰہ بن مسعودقال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :علیکم بالصدق فان الصدق یھدی الی البِرِ وان البِرَّ یھدی الی الجنۃ ومایزال الرجل یصدق ویتحری الصدق حتی یکتب عنداللّٰہ صدیقاً وایّاکم والکذب فان الکذب یھدی الی الفجوروان الفجوریھدی الی النارومایزال العبدیکذب ویتحری الکذب حتی یکتب عنداللّٰہ کذّاباً"۔(حسن صحیح)[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سچائی کو اپنے اوپر لازم کرلو کیونکہ سچ بھلائی کا راستہ بتلاتا ہے اور بھلائی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور آدمی مسلسل سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کا اہتمام کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے یہاں انتہائی سچا لکھا جاتا ہے، اور تم اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ کیونکہ جھوٹ آدمی کو صریح خرابی تک پہنچاتا ہے اور خرابی جہنم تک پہنچاتی ہے اور آدمی مسلسل جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ بناتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں وہ انتہائی جھوٹا لکھا جاتا ہے۔(یعنی قرار پاتا ہے)

لغات:۔صدق اور کذب کی تعریفیں تو مشہور ہیں کہ جو حکایت اپنے محکی عنہ کے مطابق ہو وہ صدق ہے اور جو موافق نہ ہو وہ کذب ہے تاہم کذب میں کاف کا فتحہ اور ذال کا کسرہ زیادہ فصیح ہے بنسبت کاف کے کسرہ اور ذال کے سکون کے اس لئے قرآن مجید میں ذال کے سکون کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔قولہ"صدیق" مبالغے کا صیغہ ہے اسی طرح کذاب بھی ہے۔

باب ماجاء فی الصدق والکذب

[1] الحدیث اخرجہ البخاری فی الادب باب: ۶۹ ومسلم فی البر حدیث: ۱۰۳ وابوداؤد فی الادب باب: ۸۰ وابن ماجہ فی المقدمۃ باب: ۷ بحوالہ الترغیب والترھیب ص: ۳۶۶ ج: ۳۔

تشریح: ۔صدق اور کذب کے حسن اور قبح سے متعلق بحث ''باب ماجاء فی اصلاح ذات البین'' میں تحقیقی تشریح کے عنوان کے ضمن میں گذری ہے۔فلیراجع ،باب کی حدیث میں صدق کے التزام اور جھوٹ سے اجتناب کا تاکیدی حکم ہے اور اس کے ساتھ دونوں کا نفع ونقصان بھی بیان فرمایا گیاہے،تاہم اگر صدق سے کسی کو غیر معمولی نقصان کا خطرہ ہو تو وہاں خاموشی اختیار کرلینی چاہئے اسی طرح کبھی جھوٹ کہنے سے ایک بے گناہ کی جان محفوظ ہوسکتی ہے جیسے ظالم بادشاہ کسی نیک آدمی اور حق گو عالم کی گرفتاری کے لئے پولیس بھیجتا ہے تو اس کا پڑوسی اگر اس کو اپنے گھر میں پناہ دے کر پولیس کو تلاشی میں ناکام بنادے اور جب وہ اس کے متعلق پوچھے تو یہ لاعلمی ظاہر کردے تو اس کا عظیم فائدہ ان شاء اللہ جھوٹ کے نقصان پر غالب رہے گا،گوکہ اس صورت میں بھی اس کو توریہ اختیار کرنا چاہئے جیسا کہ پہلے گذرا ہے،لہٰذا کہا جائے گا کہ ناگزیر وجوہات باب کی حدیث سے مستثنیٰ ہیں۔

اس حدیث میں ایک اہم ضابطہ بیان ہوا ہے کہ نیکی ،نیکی کے لئے جالب ہے جبکہ بدی ،بدی کے لئے جاذب ہے لہٰذا ایک نیکی کرنے سے دوسری نیکی کی توفیق ملتی ہے خصوصا وہ نیکی جو پہلی کی نوع سے ہومثلاً ایک صدقہ سے دوسرا صدقہ آسان ہوجاتا ہے علی ہذا القیاس اسی طرح ایک گناہ سے دوسرے کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے خصوصاً جب اسی نوع کا ہومثلاً ایک بار چوری کرنے سے دوسری آسان تر معلوم ہوتی ہے، یہاں تک کہ آدمی چور بن جاتا ہے وعلی ہذا القیاس۔غرض نیکیوں کے بھی خاندان ہوتے ہیں اور گناہوں کے بھی شجرے ہوتے ہیں نیکی ،نیکی سے مانوس ہوتی ہے اور بدی ،بدی سے۔

دوسری حدیث: ۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل اس سے دور چلا جاتا ہے۔[۲]

لغات: ۔قولہ ''نتن'' بفتح النون الاول وسکون التاء بدبو کو کہتے ہیں۔قولہ '' ماجاء بہ'' مراد اس سے وہ جھوٹی بات ہے جو اس نے کہی ہے۔

تشریح: ۔اس سے معلوم ہوا کہ جہاں اقوال کی دیگر تاثیرات ہیں اسی طرح ان میں خوشبو اور بدبو بھی ہوا کرتی ہے اچھی بات خوشبودار ہوا کرتی ہے اور غلط بات غلیظ اور متعفن وبدبودار ہوتی ہے ،ابن العربیؒ نے عارضہ میں سوال اٹھایا ہے کہ ''بات کیسے بدبودار ہوسکتی ہے جبکہ بُو تو اجسام کا وصف ہے پھر اس کا جواب دیا ہے کہ

---

[۲] رواہ ایضاً ابن ابی الدنیا فی کتاب الصمت، الترغیب والترھیب ص: ۳۶۹ ج:۳.

اجسام میں بو کی تخلیق ذاتی وطبعی نہیں ہے بلکہ عادی ہے لہٰذا اللہ جب چاہے اقوال واعراض میں بھی بو وغیرہ اوصاف پیدا کرسکتا ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ یہ مسئلہ بھی "باب ماجاء فی اصلاح ذات البین" میں تحقیقی تشریح کے ضمن میں گذرا ہے کہ آیا اشیا کا حسن وقبح ذاتی ہیں یا عادی یہ مسئلہ بھی اسی طرح ہے کہ آیا تاثیرات ذاتی ہیں یا عادی، فلیراجع۔

نیز آج کل کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوال اعراض نہیں بلکہ جواہر کے ضمن میں معرض وجود میں آتے ہیں، یہ بحث پیچیدہ ہے یہاں اس پر تسلی بخش بحث مشکل ہے اگر تحقیق درکار ہو تو راقم کی کتاب "شعاعی تصویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت" سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، نیز حجۃ اللہ البالغہ میں عالم مثال کی بحث سے اس میں مدد بلکہ تشفی ملتی ہے۔

چونکہ اس حدیث کی سند میں یحییٰ بن موسیٰ نے اپنے شیخ سے استفسار کیا تھا "حدثکم عبدالعزیز؟ الخ" یہاں ہمزہ استفہام مقدر ہے "ای احدثکم؟ اس لئے انہوں نے جواب میں "نعم" سے یعنی اثبات میں جواب دیا۔

باب ماجاء فی الفُحش

"عن انس قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم :ماکان الفُحش فی شیٔ الا شَانَه وماکان الحیاء فی شیٔ اِلا زَانه"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدگوئی شامل نہیں ہوتی کسی معاملے میں مگر اسے معیوب بنادیتی ہے اور حیا کسی چیز میں شامل نہیں ہوتی مگر اسے زینت بخشتی ہے۔

دوسری حدیث:۔ "خیارکم احاسنکم اخلاقاًولم یکن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فاحشاًولا متفحشاً"۔

تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ غیر ارادی طور پر بدگوئی کرتے اور نہ ہی ارادۃً فرماتے۔

لغات: قولہ "الفُحش" بضم الفاء سخت اور ناز یبا جواب اور قول کو کہتے ہیں۔ قال ابن العربیؒ.

''الفحش هو الكلام بمايكره سماعه ممايتعلق بالدين ''یعنی دینی اعتبار سے غلط بات۔''قال وهو من اعظم ذنوب اللسان ''۔(عارضہ)بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کا دامن افعال تک پھیلا ہوا ہے، چنانچہ زنا پر فاحشہ کا اطلاق معروف ومشہور بلکہ ماثور ہے۔قوله "الاشانة" ''شین ''بفتح الشین عیب کو کہتے ہیں۔

قولــــه "الازانــــه" شانہ کے مقابل ہے زین بفتح الزاء زینت اور خوب صورتی کو کہتے ہیں۔

قوله "فاحشا" جس کی طبیعت میں بدگوئی کی خصلت ہو۔قوله "متفحشا" جو بدگوئی میں تکلف کرتا ہو اور اہتمام کے ساتھ بالارادہ قبیح بات منہ سے نکالتا ہو۔پس مطلب یہ ہوا کہ فحش بات کرنا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت تھی اور نہ ہی کسبی تھی۔

تشریح:۔خَلق بالفتح ظاہری بناوٹ اور شکل وصورت کو کہتے ہیں جبکہ خُلق بالضم باطنی ملکات کو کہتے ہیں خواہ وہ ملکات اصلیہ ہوں یا فاضلہ ،جن کو ہم اخلاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ پہلی قسم میں یعنی خَلق بالفتح میں تو انسان عام جانداروں کی طرح ایک جاندار ہے مگر اس کا امتیازی مقام اخلاق کی بنا پر ہے۔آج کل ہمارے یہاں اخلاق کی حیثیت بالکل مٹادی گئی ہے حتی کہ جب تخصص میں داخلے کے لئے طلبہ آتے ہیں تو ان کو عجب، کبر، حسد اور حقد وغیرہ کی تعریفیں بھی نہیں آتی ہیں اور ان اشیاء میں فرق بھی نہیں جانتے ہیں حالانکہ یہ تو کبائر ہیں ان سے اجتناب فرض عین ہے جو ان کی معرفت کی صورت میں ہی ممکن ہے۔الحمدللہ راقم نے اس موضوع پر مستقل کتاب ''نقش قدم کامل'' لکھی ہے۔

اس حدیث میں فحش بات کو نہایت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے جبکہ بھلی بات اور حیا کی تحسین کی گئی ہے جس سے ان دونوں کی شرعی حیثیت اور مقام کا صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے، نیز اس میں اچھے اخلاق کے حامل لوگوں کو بہترین افراد قرار دیا گیا ہے، جس سے اخلاق کا اونچا مقام بھی معلوم ہوتا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم فحش گوئی سے پاک تھے نہ تو کبھی سہواً ان کی زبان پر بُری بات آئی ہے اور نہ ہی ارادۃً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی غلط بات کی ہے، یہی حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کا بھی تھا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہراً وباطناً قولاً وعملاً پاکیزگی معلوم ہوتی ہے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے اعلی انسانیت کا نمونہ تھے اور ہمیں اس نمونے کے مطابق چلنے کا حکم ہے، اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے افعال، اخلاق اور اقوال، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے اور بنائے ہوئے معیار کے مطابق بنائیں تب ہم کامل اور کامیاب انسان کہلائیں گے۔

باب ماجاء فی اللعنة

"عن سمرة بن جندب قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لاتلاعنوا بلعنة الله ولا بِغَضَبه ولا بالنار"۔[۱]

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم ایک دوسرے کو اللہ کی لعنت سے مخاطب نہ کرو (یعنی یوں نہ کہو کہ: تم پر اللہ کی لعنت ہو) اور نہ اس کے غضب سے اور نہ ہی دوزخ سے۔ (جیسے تم پر اللہ کا غضب ہو، تم دوزخ میں جاؤ یا اے دوزخی وغیرہ مت کہو)

دوسری حدیث:۔ "لیس المؤمن بالطعّان ولا اللعّان ولا الفاحش ولا البَذِیّ"۔ مومن نہ طعنہ دینے والا ہوتا ہے اور نہ لعنت کرنے والا اور نہ بے ہودہ ہوتا ہے اور نہ ہی بکواس کرنے والا ہوتا ہے۔

تیسری حدیث:۔ "ان رجلاً لعن الریح عندالنبی صلی الله علیه وسلم فقال لاتلعن الریح فانها مامورة وانه من لعن شیئاً لیس له باهل رجعت اللعنة علیه"۔[۲]

ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا پر لعنت بھیجی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہوا پر لعنت ملامت نہ کرو کیونکہ یہ (اللہ کی طرف سے) پابند ہے اور جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت بھیجے جو اس کی مستحق نہ ہو تو وہ لعنت پلٹ کر اس پر واپس جاتی ہے۔

لغات:۔ قولہ "اللعنة" اللہ کی رحمت سے دوری کی بددعا خواہ رحمت خاصہ سے ہو یا رحمت عامہ سے۔ قولہ "طعّان واللعّان" دونوں مبالغے کے صیغے ہیں پہلا طعن سے ہے اور دوسرا لعن سے، طعن اصل میں نیزہ زنی کو کہتے ہیں مگر کڑوی بات چونکہ نیزہ مارنے کے مترادف ہوتی ہے اس لئے تہمت لگانے اور عیب جوئی کو طعنہ کہتے ہیں۔

جراحات السنان لها التیام
ولا یلتام ماجرح اللسان

باب ماجاء فی اللعنة

[۱] الحدیث اخرجه ابوداؤد ص: ۳۲۴ ج: ۲ "باب فی اللعن" کتاب الادب۔ [۲] الحدیث اخرجه ایضاً ابوداؤد ص: ۳۲۴ ج: ۲ کتاب الادب وابن حبان فی صحیحه، الترغیب والترهیب ص: ۵۱۳ ج: ۳۔

ابن العربیؒ فرماتے ہیں: ''وانما سمّاه طعناً لان سهام الكلام معنیً كسهام النصال حساً وجرح اللسان كجرح اليد''۔قوله" الفاحش" اس کا مطلب اگرچہ سابقہ باب میں گذرا ہے تاہم یہاں اس کو عام لینا زیادہ افضل ہے بایں طور کہ فاحش وہ ہے جو کلام اور افعال دونوں میں حد سے گذرتا ہو جبکہ ''البذی'' وہ ہے جو باتوں میں بے ہودہ بکتا ہو، پھر بذی بتشدید الیاء بھی پڑھ سکتے ہیں اور بتخفیف الیاء وبعدها ہمزہ بھی جبکہ دونوں حالتوں میں باء مفتوح اور ذال مکسور ہے۔

تشریح:۔امام ترمذیؒ نے اس باب میں تین احادیث ذکر فرمائی ہیں پہلی حدیث خاص ہے تخاطب کے ساتھ جبکہ دوسری عام ہے غائبین کو بھی شامل ہے۔تیسری حدیث اس نہی کی علت ہے کہ لعن طعن اس لئے حرام ہے کہ جب لعنت زبان سے نکلتی ہے تو پھر ضائع نہیں جاتی بلکہ کہیں نہ کہیں واقع ہو جاتی ہے اگر وہ چیز جس پر لعنت بھیجی گئی ہے مستحق ہو تو اسی پر واقع ہو جائے گی ورنہ لعنت کرنے والے کی طرف واپس لوٹ کر پڑ جائیگی۔

ابن العربیؒ عارضہ میں اس تیسری حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: ''والمعنى فيه ان ذالك يوجب وقوعها بمن قالها ان لم يكن المخاطب (الملعون) اهلاً لها...الى...حديث غريب ومعناه صحيح''۔اسی طرح دوسری حدیث بھی باوجود غرابت کے صحیح ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عادت شریفہ یہ تھی کہ اگر کسی شخص سے ناپسندیدہ کام صادر ہو جاتا تو اس کا نام ذکر کرنے کے بجائے عام تعبیر کرتے جیسے مہاجرام قیس یا اس حدیث میں ''رجلاً'' وغیرہ۔بعض روایات کے مطابق کمافی ابی داؤد[۳] اس آدمی سے ہوا نے چادر کھینچ لی تھی جس پر اس کو غصہ آیا اور ہوا پر لعنت بھیجی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس پر تنبیہ فرمائی اور واضح فرمایا کہ لعنت کا ضرر بہت زیادہ ہے اگر ایسی چیزوں پر لعنت بھیجی جائے جو امور تکوینیہ کی پابند ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے میں ان کا کوئی قصور نہیں تو لامحالہ اس کا نقصان لعنت کرنے والے کی طرف ہی لوٹے گا۔

بہر حال ان احادیث ثلاثہ سے لعنت اور فحش گوئی کی سخت مذمت وممانعت معلوم ہوتی ہے، مسلم شریف[۴] میں ہے کہ ایک عورت نے جو قافلے میں شامل تھی اونٹنی پر لعنت بھیجی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسی اونٹنی ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی جس پر لعنت بھیجی گئی ہو چنانچہ اس کو آزاد چھوڑنے کا حکم دیا جس کی

---

[۳] سنن ابی داؤد ص: ۳۲۴ ج: ۲ کتاب الادب۔

[۴] صحیح مسلم ص: ۳۲۳ ج: ۲ "باب النهی عن لعن الدواب وغيرها" كتاب البر والصلة.

تعمیل کی گئی۔ مسلم ⁵ ہی کی ایک اور حدیث ہے "لا ینبغی لصدیق ان یکون لعاناً" چونکہ تھوڑی بہت لعنت اور خامی سے بچنا تو شاید انسانی بس سے باہر ہے "الا من عصمه اللّٰه" اس لئے اس حدیث میں اور اسی طرح باب کی دوسری حدیث میں طعّان اور لعّان، مبالغے کے صیغے لائے گئے۔ امام نوویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"ولم یقل لاعنا واللاعنون لان هذا الذم فی الحدیث انما هو لمن کثر منه اللعن لا لمرة ونحوها ولانه یخرج منه ایضاً اللعن المباح وهو الذی ورد الشرع به وهو لعنة اللّٰه علی الظالمین، لَعَنَ اللّٰه الیهود والنصاریٰ، لَعَنَ اللّٰه الواصلة والواشمة وشارب الخمر وآکل الربوا وموکله وکاتبه وشاهدیه والمصورین...وغیرهم ممن هو مشهور فی الاحادیث الصحیحة"۔ (مسلم ص ۳۲۲ ج ۲)

یعنی لعنت کی ممانعت سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کو اوصاف رذیلہ سے یاد کر کے لعنت کرے یا جو منصوص ہیں کیونکہ ان دونوں اقسام پر لعنت بھیجنا جائز ہے اسی طرح جس کا خاتمہ بالکفر نص سے ثابت ہو وہ بھی ملعون ہے۔

یہ بحث رحمت خاصہ کے بارے میں تھی جو جنت سے دوری کی بددعا ہے جہاں تک رحمت عامہ یعنی دنیوی فوائد ومنافع کا تعلق ہے تو اس میں نسبتاً گنجائش زیادہ ہے اگر چہ دونوں کام نصح وہمدردی کے منافی ہیں اس لئے مطلق لعنت سے بچنا چاہئے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

"لان اللعنة فی الدعاء یراد بها الابعاد من رحمة اللّٰه تعالیٰ ولیس الدعاء بهذا من اخلاق المؤمنین الذین وصفهم اللّٰه تعالیٰ بالرحمة بینهم والتعاون علی البر والتقویٰ وجعلهم کالبنیان یشد بعضه بعضاً وکالجسد الواحد وان المؤمن یحب لاخیه ما یحب لنفسه فمن دعا علی اخیه المسلم باللعنة وهی الابعاد من رحمة اللّٰه فهو من نهایة المقاطعة والتدابر وهذا غایة ما یوده المسلم للکافر ویدعو علیه ولهذا جاء فی الحدیث الصحیح لعن المؤمن کقتله لان القاتل یقطعه عن منافع الدنیا وهذا یقطعه عن نعیم الآخرة ورحمة اللّٰه تعالیٰ۔ وقیل:

---

⁵ حوالہ بالا ایضاً رواه الحاکم وصححه ولفظه قال: لا یجتمع ان تکونوا لعانین مدلقین بحواله الترغیب والترهیب ص: ۳۱۲ ج: ۳۔

معنی لعن المؤمن کقتله فی الاثم وهذا اظهر"۔ (نووی شرح مسلم ص۳۲۳ ج۲)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ لعنت بھیجنے والا نہ صرف ملعون کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ خود بھی غیر معمولی نقصان اٹھاتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے: "لایکون اللعّانون شفعاء ولاشهداء یوم القیٰمة"۔ (مسلم ص۳۲۳ ج۲ [۲]) مزید تفصیل شرح نووی بر مسلم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

باب ماجاء فی تَعَلُّمِ النسب

"عن ابی هریرة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: تعلّموا مِن انسابکم ماتصلون به ارحامکم فان صلة الرحم مَحَبَّةٌ فی الاهل مَثراةٌ فی المال مَنسَأةٌ فی الاثر"۔ [۱] (حدیث غریب تفردبه الترمذی من اصحاب الستة)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے نسب سے جُڑے لوگوں کے کم از کم اتنے نام یاد رکھو جن کے ذریعے آپس کی صلہ رحمی کر سکو کہ صلہ رحمی رشتہ داروں سے محبت کا ذریعہ ہے مال بڑھنے کا سبب ہے اور ذکرِ خیر تادیر کا ذریعہ ہے۔

لغات:۔ "انساب" "نسب کی جمع ہے بفتح النون والسین پدری قرابت کو کہتے ہیں۔ "ماتصلون به" چونکہ تمام نسب حضرت آدم علیہ السلام تک یاد کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی زیادہ مفید ہے اس لئے صرف اس مقدار کو یاد رکھنے کا حکم آیا جن کو یاد رکھنے کا عملی فائدہ حاصل ہو، جو جَدِّ اعلیٰ اور اس کی شاخوں پر مشتمل ہے۔ قوله "مثراة" ثراء سے ہے ثروت دولت مندی و مالداری کو کہتے ہیں یہ لفظ بفتح المیم وسکون الثاء پڑھا جائے گا۔ قوله "منساة" یہ بھی بفتح المیم وسکون النون ہے نساء سے ہے جو بمعنی تاخیر کے ہے "قال اللّٰه: ماننسخ من اٰية اوننسها"۔ [۲]

تشریح:۔ اس حدیث سے نسبی رشتوں کو یاد کرنے اور محفوظ رکھنے کی تاکید اور اس کی حکمت ثابت ہوتی ہے جہاں تک صلہ رحمی کے حکم کا تعلق ہے تو اس پر تفصیلی بحث گذری ہے، رہی اس کی حکمت تو اس ارشاد پاک میں

---

[۲] ایضاً رواه ابوداؤد ص: ۳۲۴ ج: ۲ کتاب الادب.

باب ماجاء فی تعلم النسب

[۱] الحدیث اخرجه الطبرانی فی الکبیر ۹۸/۱۸ بحواله مجمع الزوائد ص: ۱۹۵ ج: ۸ حدیث: ۱۳۴۶۲ کتاب البر والصلة. [۲] سورة البقرة آیت: ۱۰۶.

اس کے تین فوائد بیان ہوئے ہیں ایک یہ کہ صلہ رحمی آپس میں محبت کا ذریعہ ہے اور یہ بات بالکل واضح اور مشاہدے کے مطابق ہے۔ دوم یہ کہ اس سے مال میں اضافہ ہوتا ہے اس کی قدرے تفصیل بھی پہلے گذری ہے کہ مال خرچ کرنے سے اور خصوصاً اہل قرابت کے ساتھ سلوک کرنے سے مال بڑھتا رہتا ہے اور یہ بھی مجرب ہے۔ رہی تیسری بات تو اس کے تین مطلب بیان ہوئے ہیں:۔ ایک یہ کہ منسأۃ فی الاثر سے مراد عمر میں اضافہ ہے گویا اثر سے مراد اجل ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ صلہ رحمی اجل کی تاخیر کا ذریعہ ہے، یعنی جو لوگ صلہ رحمی کرتے ہیں اللہ ان کی عمر بڑھاتا ہے بایں صورت کہ اللہ نے زیادہ عمر والوں کے لئے صلہ رحمی کو آسان بنادیا ہے اور مقدر فرمایا ہے کہ جو لوگ صلہ رحمی کریں گے ان کی موت کو مؤخر کروں گا اور یہ معنی تقدیر مبرم کے منافی نہیں کیونکہ اللہ نے ان کے لئے تقدیر میں صلہ رحمی کو آسان کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے اور پھر اسی پر عمر کا اضافہ بھی مقدر فرمایا ہے۔ تدبر

یا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی عمر میں برکت دی جاتی ہے جن کو ضیاع وقت سے محفوظ رکھ کر مسلسل اور زیادہ عمل کی توفیق دیتا رہتا ہے، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ وقت کا ایک طول ہوتا ہے اور دوسرا عرض ہوتا ہے وقت میں برکت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے عرض کو کشادہ کیا جاتا ہے، چنانچہ کبھی آدمی ایک ہی دن میں پوری کتاب لکھ لیتا ہے حالانکہ دن تو وہی بارہ گھنٹے کا ہوتا ہے مگر چوڑائی بڑھادی جاتی ہے۔

دوسرا مطلب اس آخری جملے کا یہ ہے کہ ایسے آدمی کا ذکر جمیل لوگوں میں عرصہ دراز تک باقی رکھا جاتا ہے جس سے اس کو اُخروی فائدہ ہوتا ہے اوپر ترجمہ میں اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ ایسے آدمی کو نیک صالح اولاد دی جاتی ہے جس سے اس کی یادگار بطور ذکر خیر اور عمل صالح کے باقی رہتی ہے خواہ یہ ذریۃ صلبی ہو یا روحانی ہو، چنانچہ آج ایسے علماء کی روحانی اولاد بکثرت پائی جاتی ہے جو ان کا نام لے کر ''رحمہ اللہ'' اور ''رضی اللہ عنہ'' وغیرہ دعاؤں سے ان کو یاد رکھتے ہیں۔ صحاح ستہ میں یہ حدیث.... صرف امام ترمذیؒ نے ذکر کی ہے علاوہ ازیں امام احمد وحاکم وغیرہ نے بھی تخریج کی ہے۔[۳]

نوٹ:۔ نسب اگرچہ باپ کی جانب سے اقرباء کو کہتے ہیں تاہم اس حدیث میں ذوالارحام یعنی مادری رشتے بھی مراد ہیں کیونکہ جس طرح پھوپھی کے ساتھ حسن سلوک ان تین فوائد کا موجب ہے اسی طرح

---

[۳] مستدرک حاکم ص:۸۷ ج:۵ حدیث:۷۴۴۲ کتاب البر والصلۃ، هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه، ایضاً مجمع الزوائد ص:۱۹۵ ج:۸، جمع الفوائد ص:۱۳۳ ج:۲ دارالکتب العلمیۃ بیروت.

خالہ کے ساتھ نیک برتاؤ بھی ان منافع کا سبب ہے۔ اسی طرح دور کے اعزہ واقارب سے بھی اچھا تعلق ہونا چاہئے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب قریش کے ساتھ رشتہ داری کی بنیاد پر نیک سلوک فرماتے۔

باب ماجاء فی دعوة الاخ لاخیه بظهر الغَیب

"عن عبداللہ بن عمروعن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال:مادعوۃ اسرع اجابةً من دعوۃ غائب لِغائب "۔(غریب والافریقی یُضَعَّفُ الخ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غائب کی دعاء غائب کے حق میں قبول ہونے میں کوئی دعا اس سے زیادہ جلد قبول ہونے والی نہیں۔

لغات:۔ ''بظهر الغیب'' پیٹھ پیچھے، ظہر کا لفظ زائد برائے تاکید ہے۔

تشریح:۔ چونکہ مدعولہ کی موجودگی میں ریاء اور لالچ وطمع کی آمیزش دعاء کی قبولیت کو متاثر یا ختم کر سکتی ہے اس لئے غائبانہ کی تخصیص فرمادی پھر غائب سے مراد دور نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کے حق میں دعا مراد ہے جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں شخص میرے لئے دعائیں مانگ رہا ہے لہٰذا اگر وہ دونوں ایک ہی سیٹ پر بیٹھے ہوں مگر دل دل میں ایک دوسرے کے لئے دعائیں مانگیں تو بھی وہ غائبانہ کہلائے گی اس کی قبولیت کی وجہ اخلاص نیت اور نصح وخیر خواہی ہے۔

باب ماجاء فی الشتم

"عن ابی هریرة ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال المُستبّان ماقالافعلی البادیٔ منهما مالم یعتدالمظلوم"۔[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گالم گلوچ کرنے والے دونوں جو کچھ کہتے ہیں وہ پہل کرنے والے پر وبال ہے جب تک کہ مظلوم (جس کو گالی پہلے دی گئی ہے) انتقام میں زیادتی نہ کرے۔

باب ماجاء فی الشتم

[1] الحدیث اخرجه مسلم فی البر حدیث: ۶۹ وابوداؤد فی الادب باب: ۳۹ بحواله الترغیب والترهیب ص: ۳۱۱ ج: ۳۔

لغات:۔ قولہ "المستبّان" بتشدید الباء مُستبٌّ کا تثنیہ ہے جو باب افتعال کا اسم فاعل ہے یعنی اِستبَّ کا باب افتعال بھی باب تفاعل کی طرح کبھی جانبین سے مشارکت فعل کے لئے آتا ہے لہٰذا استبَّ کے معنی باہم گالی گلوچ کرنے کے ہیں۔ قولہ "فعلیٰ البادیٔ الخ" المستبّان کی خبر ہے "ای اثم قولهما علی البادیٔ"۔ چونکہ "ما" موصولہ معنی شرط کو متضمن ہے اس لئے خبر پر "فا" داخل کردیا پھر "البادیٔ" کے اخیر میں ہمزہ ہے کیونکہ یہ بدء سے اسم فاعل ہے۔

تشریح:۔ باب کی تیسری روایت میں شتم اور سبّ کو فسوق کہا ہے اس طرح ایک روایت میں گالیاں بکنے والوں کو شیطان کہا ہے جیسا کہ مسند احمد [۲] اور الادب المفرد للبخاری میں ہے "المستبّان شیطانان" الخ جس سے گالیوں کی شناعت معلوم ہوتی ہے تاہم اگر کوئی شخص کسی کو گالی دیدے تو دوسرا جواب دینے اور انتقام لینے کا حق شرعاً محفوظ رکھتا ہے اگر وہ چاہے تو خاموش ہوجائے جو عزیمت کا درجہ اور صبر کا مقام ہے لیکن اگر وہ جواب دینا چاہے تو اسے اجازت ہے تاہم امام غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ خلاف واقعہ جواب دینے کی اجازت ہرگز نہ ہوگی لہٰذا اسے ایسا جواب دینا چاہئے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو اور بات بھی حقیقت پر مبنی ہو مثلاً جواب میں احمق اور بے وقوف کہنا چونکہ کوئی آدمی آج کل حماقت سے معرا نہیں ہوسکتا اس لئے جواب درست ہوگا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جواب میں گالی دینے والے کے الفاظ پر اکتفاء کرے ایسے میں اس برائی کا سارا گناہ اس آدمی پر آئے گا جس نے پہل کی ہے لیکن اگر دوسرے نے غصے میں یا جواب میں تجاوز کیا تو یہ بھی گناہ میں برابر کا شریک ہوگا۔ ابن العربیؒ لکھتے ہیں: "المعنی انه اذا سبّه فردّ علیه کان کفافاً فان زاد بالغضب والتعصب لنفسه کان ظالماً و کان کل واحد منهما فاسقاً"۔

دوسری حدیث:۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مردوں کو برا بھلا مت کہو کیونکہ اس سے تم زندوں کو تکلیف پہنچاؤ گے۔ [۳]

---

[۲] مسند احمد ص: ۱۶۶ ج:۵ حدیث: ۱۷۰۲۹ عن عیاض قال قلت یارسول اللّٰه رجل من قومی یشتمنی وهو دنی علی باس ان انتصر منه؟ قال: المستبان شیطانان یتهاذیان ویتکاذبان، ایضاً رواه ابن حبان فی صحیحه بحواله الترغیب والترهیب ص: ۳۱۱ ج:۳. حفیظ الرحمن الحنفی

[۳] الحدیث اخرجه احمد فی مسنده ص: ۳۰۸ ج:۵ حدیث: ۱۷۷۴۴، ۱۷۷۴۵ وابن عدی فی الکامل ۱۵۶۸/۴، والزبیدی فی اتحاف السادة المتقین ۴۹/۷، والعراقی فی المغنی عن حمل الاسفار ۱۲۲،۷۷/۳، مجمع الزوائد ص: ۹۳ ج:۵ حدیث: ۱۳۰۳۱.

تشریح:۔ چونکہ مُردوں کوگالی دینے کارخ ان کے پس ماندگان کی جانب ہوتا ہے اس لئے مُردوں کو گالی گلوچ دینا ممنوع قرار دیا کہ اس سے درحقیقت زندوں کی ایذا رسانی ہوتی ہے پس اگروہ نیک وصالح لوگ ہوں گے تو ان کے مردے جیسے بھی ہوں ان کو گالیاں نہیں دینی چاہئے گو وہ کافر کیوں نہ ہوں، نیز ان کے گناہوں کی سزا ان کو مل چکی ہے اور اگر وہ قابل عفو ہوں جیسے مسلمان مُردے تو پھر ایسے لوگوں کو جو عنداللہ مقبول ٹھہرے ہیں بُرا نہیں کہنا چاہئے۔

تیسری حدیث:۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔(حسن صحیح [1])

لغات:۔ قولہ "سباب" بکسر السین گالی اور بُرا بھلا کہنا۔ قولہ "فسق" کے معنی خروج کے ہیں اصطلاح میں شرع کی اطاعت سے خروج یعنی گناہ کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ خوارج اس حدیث کے ظاہر کے مطابق کہتے ہیں کہ مسلمان کو قتل کرنا کفر ہے اور قاتل کافر ہے۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ پھر فاسق بھی کافر ہونا چاہئے کیونکہ کسی کو بحیثیت مسلمان قتل کرنا جیسے کفر ہے اسی طرح گالی دینا بھی کفر ہے، لہٰذا حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ گالم گلوچ اور قتال اگرچہ دونوں کبائر ہیں تاہم گالیوں کا درجہ اخف ہے کہ بعض لوگ اس کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے بخلاف قتال کے کہ یہ تو صرف اختلاف دین کی وجہ سے ہونا چاہئے، لہٰذا جو آدمی کسی مسلمان کو قتل کرتا ہے وہ گویا اپنا دین الگ سمجھتا ہے۔ غرض گالی گناہ ہے مگر عمل کفر نہیں جبکہ قتال گناہ کے ساتھ عمل کفر بھی ہے اور عمل کفر سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا یعنی نفس فعل سے اور حدیث میں یہی فرق ظاہر کرنا مراد ہے۔ تدبر ولا تعجل

باب ماجاء فی قول المعروف

"عن علی قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :ان فی الجنۃ غُرَفاً تُرَی ظھورھامن بطونھا وبطونھامن ظھورھا،فقام اعرابی فقال:لِمن ھِی یارسول اللّٰہ؟فقال:لمن اَطابَ الکلام واطعم الطعام واَدَامَ الصیام وصلی باللیل والناس نیام"۔(حدیث غریب واخرجہ احمدوابن حبان

---

[1] الحدیث اخرجہ البخاری فی الایمان باب:۳٦ والادب باب:۴۴ والفتن باب:۸، ومسلم فی الایمان حدیث:۱۱٦، والنسائی فی التحریم باب:۲۷ وابن ماجہ فی المقدمۃ باب:۷، ۹ الترغیب والترھیب ص:۳۱۱ ج:۳.

فی صحیحہ وغیرہ [۱])

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک جنت میں ایسے بالا خانے ہیں جن کا بیرونی منظر اندر سے دکھائی دیتا ہے اور اندر کا باہر سے نظر آتا ہے، پس ایک اعرابی نے کھڑے ہوکر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ کس کے لئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کے لئے ہیں جو میٹھی میٹھی گفتگو کرے اور کھانا کھلائے اور کثرت سے روزے رکھے اور رات کو نماز پڑھے جب لوگ سورہے ہوں۔

لغات:۔ قولہ "غُرَفاً" بضم الاول وفتح الثانی غُرفۃ کی جمع ہے وہ کمرہ اور عمارت جو بلندی پر بنی ہو خواہ زمین پر ہی ہو جیسے ٹیلہ نما جگہ پر جہاں سے چاروں اطراف دور تک نظر آتے ہیں۔

تشریح:۔ جو آدمی صاف گو اور حق گو ہو تو چونکہ اس کا ظاہر باطن کا آئینہ ہوتا ہے اور باطن بھی ظاہر کے مطابق ہوتا ہے اسی طرح دوسری نیکیوں کا حامل جن کا تذکرہ اس حدیث میں ہوا ہے دوسری جانب یہ طے ہے کہ جزاء مثلِ عمل ہوتی ہے لہٰذا اس کے اس شفاف روئی اور صاف ستھرے طرزِ کلام اور بے غبار عمل کی وجہ سے اللہ نے ایسے محلات عطا فرمائے جو شیشے کی طرح بالکل صاف اور شفاف ہیں۔ آج کل جیسے بڑے بڑے شیشے لگائے جاتے ہیں جس سے اس حدیث کے سمجھنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔

چونکہ ایسے گھر ایک عمدہ نعمتیں ہیں اس لئے ایک اعرابی نے یہ سن کر بوجہ اشتیاق پوچھا کہ یہ کس کے لئے ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لمن اطاب الکلام" "طیّب کے معنی عمدہ کے آتے ہیں بعض طرق میں اَطَــابَ کے بجائے "اَلاَنَ" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی نرم کے ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ جس کے اخلاق اچھے ہوں کیونکہ عمدہ اخلاق کا مالک جب بات کرتا ہے تو جی سننے سے نہیں تھکتا بلکہ دل ودماغ مسرور ہوتے ہیں۔

قــولــہ "وادام الـصـیـام" ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد معروف روزے ہیں یعنی

باب ماجاء فی قول المعروف

[۱] رواہ احمد فی مسندہ ۵/۳۴۳ واوردہ المصنف فی زوائد المسند حدیث: ۵۱۱۲، والخطیب البغدادی فی تاریخ بغداد ۸/۲۰۳، والسیوطی فی الدر المنثور ۱/۱۸۲، ۵/۸۱ مجمع الزوائد صب ۵۲۰ ج: ۱۰، ایضاً رواہ ابن حبان فی صحیحہ، بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۳۹ ج: ۱

رمضان اور باقی فضیلت والے ایام کے جس کی تفصیل ابواب الصوم میں گذری ہے، لہٰذا اس سے مراد صوم الدہر اور تسلسل سے روزے رکھنا نہیں ہے۔ بعض صوفیا فرماتے ہیں کہ یہاں صیام سے مراد ہر مکروہ سے پرہیز وامساک ہے چنانچہ دل خراب اعتقادات اور تصورات سے اور زبان غلط باتوں اور جسم بے ہودہ کاموں سے محفوظ رکھنا مراد ہے۔

قولہ "وصلی باللیل الخ" عارضہ میں ہے کہ تہجد کی فضیلت کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ اللہ نے اس کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا وسیلہ بنایا چنانچہ ارشاد ہے "ومن اللیل فتھجد بہ نافلة لك عسیٰ ان یبعثك ربك مقاماً محموداً" الایة [۲] ۔ دیگر فضائل ابواب الصلوٰة میں گذرے ہیں۔

باب ماجاء فی فضل المملوک الصالح

"عن ابی ھریرة ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: نعم مَالِاَحَدِھم اَن یطیع ربہ ویُؤدِّی حقَّ سیدہ یعنی المملوك وقال کعب: صدق اللّٰہ ورسولہ"۔ (ھذاحدیث حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہت اچھی بات ہے ان میں سے ایک کے لئے کہ وہ اپنے رب کی بھی اطاعت کرے اور اپنے آقا کا حق بھی ادا کرتا رہے (راوی کہتا ہے) "یعنی غلام"۔ حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے سچ ہی کہا ہے۔

لغات:۔ "نعم ما" لفظ "ما" نکرہ ہے بمعنی شیئاً اس کا پہلے میم میں ادغام بھی جائز ہے چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں "نِعِمَّاالمملوك" [۱] کے الفاظ ہیں ادغام کی صورت میں عین پر کسرہ پڑھا جائے گا جبکہ نون پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں جبکہ بغیر ادغام کے جیسے ترمذی کی روایت میں ہے نون مکسور اور عین کو ساکن پڑھا جائے گا۔

تشریح:۔ چونکہ غلام کے لئے بیک وقت مالک حقیقی اور مالک مجازی دونوں کو خوش رکھنا بایں صورت کہ دونوں کی پوری اطاعت کی جائے ایک مشکل کام ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مدح فرمائی

---

[۲] سورة بنی اسرائیل آیت: ۷۹۔

باب ماجاء فی فضل المملوک الصالح

[۱] کذا فی مسند احمد ص: ۹۷ ج: ۳ حدیث: ۸۸۲۶، ایضاً رواہ مسلم فی الایمان حدیث: ۴۶۔

بلکہ بعض روایات میں اس کوڈبل ثواب کی خوشخبری دی ہے کہ عمل بھی دُہرا ہے۔ [۲]

قولہ "وقال كعب صدق الله ورسوله" چونکہ حضرت کعب الاحبار کُتب سماویہ کے ماہر تھے اس لئے انہوں نے سابقہ کتب میں بھی یہی پڑھا ہوگا اس لئے اس کی تصدیق فرمائی کیونکہ کتب سماویہ سب ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔

حضرت کعب الاحبار سے کافی ساری روایات مروی ہیں اگرچہ بخاری شریف میں ان سے روایت نہیں ہے مگر مسلم شریف میں ان سے روایت ہے۔

حافظؒ نے تقریب وغیرہ میں لکھا ہے کہ ان کا نام کعب بن ماتع الحمیری تھا، کنیت ابواسحاق اور المعروف بہ کعب الاحبار تھے، ثقہ راوی ہیں، مخضرمین میں سے ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات موجود تھے مگر ملاقات نہ ہوسکی تھی کیونکہ یہ یمن میں ہوتے تھے بعد میں شام منتقل ہوگئے تھے اور عمر سو برس سے متجاوز تھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انتقال فرماگئے۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین اشخاص مُشک کے ٹیلوں پر ہوں گے (راوی کہتا ہے) میں سمجھتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن وہ غلام جس نے اللہ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقاؤں کا بھی۔ اور وہ شخص جس نے کسی قوم کی امامت کی (خواہ صغریٰ ہو یا کبریٰ) اور وہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ اور وہ شخص جو پانچوں نمازوں کے لئے ہر دن رات اذان دیتا رہا ہو۔

لغات:۔ قولہ "كثبان المسك" کثبان، بروزن عثمان بضم الکاف کثیب کی جمع ہے اونچے ٹیلے کو کہتے ہیں اور مسک بکسر المیم مشک کو کہا جاتا ہے۔ قولہ "اُراہ" ای اظنہ، اس لفظ میں ضابطہ یہ ہے کہ جب بضم الہمزہ آتا ہے تو بمعنی ظن کے آتا ہے جیسے یہاں ہے اور جب بفتح الہمزہ آتا ہے تو رؤیت بصری اور یقین کے معنی میں آتا ہے۔

تشریح:۔ چونکہ مشقت والے اعمال اور پاکیزہ کاموں سے آدمی ترقی کرتا ہے اور اسے نیک شہرت ملتی ہے بشرطیکہ اُن میں ریاء اور دکھاوا نہ ہو اس لئے اللہ نے ان تینوں کو قیامت کے دن ان اعمال کے مطابق شہرت کے اونچے مقام تک پہنچایا، بخلاف ریاکار کے کہ وہ اپنے جن اعمال کی وجہ سے حُبِّ جاہ میں مبتلا ہے تو دنیا میں

[۲] كما في رواية البخاري ص: ۲۰ ج: ۱ "باب تعليم الرجل امته واهله" كتاب العلم.

اگرچہ وہ شہرت حاصل کر لیتا ہے لیکن قیامت میں بدنام وگمنام بنادیا جاتا ہے یا شہرت تو ہوگی مگر بدنامی والی۔

رہا یہ مسئلہ کہ اگر امام سے لوگ راضی نہ ہوں اور وہ زبردستی کرسی پر یا مسجد کے منبر ومحراب پر قابض رہے تو اس کا حکم ابواب الصلوٰۃ میں گذرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی، باب ماجاء من امّ قوماً وھم لہ کارھون ص:۲۰۲ ج:۲) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر امام میں خامی ہو اور لوگ اس کی وجہ سے اسے ناپسند کرتے ہوں تو امام کو لازم ہے کہ یا اس خامی کا ازالہ کرے یا پھر مستعفی ہوجائے بصورت دیگر حوالہ بالا کی حدیث کے مطابق یہ ان تین آدمیوں میں سے ہوگا جن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ والعیاذ باللہ

باب ماجاء فی معاشرة الناس

"عن ابی ذر قال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :اِتقِ اللہ حیثُ ماکُنتَ واَتبِعِ السیئۃَ الحسنۃَ تَمحُھاو خَالِقِ الناسَ بخُلق حسن"۔(ھذاحدیث حسن صحیح)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اللہ سے ڈرتے رہنا خواہ جہاں بھی ہو، اور نیکی کو برائی کے درپے کرلیا کرو تا کہ اسے مٹادے اور لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے ملو۔

لغات:۔قولہ "معاشرۃ" عشرت سے ہے باب مفاعلہ کی خاصیت کے مطابق باہم رہن سہن اور مل جُل کر رہنے کو کہتے ہیں۔قولہ "اتق اللہ" تقوی کے معنی پرہیز اور بچنے کے ہیں، جس کے متعدد درجے ہیں جیسا کہ تفسیر بیضاوی وغیرہ میں ہے "وھوفی عرف الشرع اسم لمن یقی نفسہ عمایضرہ فی الآخرۃ ولہ ثلث مراتب": (۱) شرک اور عذاب دائم سے بچنا۔ (۲) ہر گناہ سے بچنا حتی کہ صغائر سے بچنا بھی بعض کے نزدیک تقوی کے اس درجے میں شامل ہے۔ (۳) اپنے دل ودماغ کو ہر اس چیز سے محفوظ رکھنا جو راہ حق میں رکاوٹ بنے "وھو التقوی الحقیقی المطلوب بقولہ تعالی: اتقوااللہ حق تقاتہ۔[1] (بیضاوی)

قولہ "حیث ماکنت" یعنی خلوت اور جلوت دونوں میں۔قولہ "تمحھا" اسناد مجازی ہے کیونکہ مٹانے والا اللہ ہی ہے یعنی اللہ اس کے ذریعے گناہ کو مٹادیتا ہے۔

باب ماجاء فی معاشرۃ الناس

[1] سورۃ آل عمران آیت: ۱۰۲.

تشریح:۔ تقوی کا حکم تو سب مسلمانوں کے لئے ہے مگر اس حدیث میں چونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو خصوصی طور سے نصیحت کی جا رہی ہے، گو باقی لوگوں کو بھی اس کی پیروی کرنی چاہئے اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہاں تقوی کا آخری تیسرا درجہ لیا جائے علی ہذا گناہ اگر چہ توبہ سے معاف ہوتا ہے مگر یہاں چونکہ بات تقوی کی ہو رہی ہے، اور وہ بھی اعلی درجے کے تقوی کی جو دل کی روحانی کیفیات کو ہمہ وقت برقرار رکھنے اور سِر یعنی قلب کو ماسوا اللہ سے پاک رکھنے کا نام ہے تو جب بھی گناہ صادر ہو جائے تو وہاں دل میں سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے خواہ وہ گناہ صغیرہ کیوں نہ ہو اس لئے فوراً نیکی کا کام کرنا چاہئے تاکہ دل کی جلا بحال ہو اور دھبہ مٹ جائے یعنی نامہ اعمال کے مٹنے کے ساتھ ساتھ لوح قلب سے بھی اس کا موذی اور منحوس اثر ختم ہو جائے۔

چونکہ تقوی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ راضی نہ ہو لہٰذا حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو بھی ذکر فرمایا کہ لوگوں کے ساتھ میل جول میں وہ برتاؤ کرو جس سے اللہ راضی ہو یعنی اخلاق حسنہ، حُسنِ ظن اور حسن معاملہ۔

باب ماجاء فی ظن السُوء

"عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اياكم والظن، فان الظن اكذَبُ الحديث"۔ (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ کیونکہ بدگمانی جھوٹ سے زیادہ غلیظ ہے۔

لغات:۔ قوله "ظن السوء" ظن کے معنی گمان کے ہیں یہ وہی معنی ہیں جو مناطقہ کے یہاں معتبر ہے جو تصدیق کا ادنی درجہ ہے یعنی اعتقادِ جازم، جبکہ السوء کے معنی برائی و بدکاری وغیرہ کے آتے ہیں مجموعی ترجمہ بدگمانی ہے۔

تشریح:۔ سابقہ باب میں آخری جملے سے اخلاقِ حسنہ پر عمل کرنے کا حکم تھا جس میں حسن ظن بھی داخل ہے اس لئے اصل یہ ہے کہ مسلمانوں اور خاص کر نیک صالح لوگوں کے بارے میں حسن ظن رکھنا چاہئے جبکہ بدگمانی اس کی ضد ہے اس لئے اس باب میں بدگمانی کی نفی اور نہی فرمادی، اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں حُسن ظن مطلوب اور سوء ظن مردود و مذموم ہے ہاں البتہ عقائد میں ظن قطعاً قابل قبول نہیں، قال

اللّٰه تعالیٰ: "وَمَا یَتَّبِعُ اکثرهم الاظنًّااِنّ الظنّ لایُغنی من الحقِ شیئاً" [۱] یہ مسئلہ متفق علیہا ہے سوائے ابن ہمام رحمہ اللہ کے جو بعض عقائد کو ظن سے ثابت مانتے ہیں مگر یہ ان کا تفرد ہے جیسا کہ (تشریحات ترمذی جلد چہارم "باب ماجاء فی عذاب القبر" ص ۴۰۱) پر گذرا ہے۔ ہاں اعمال واحکام فرعیہ میں خبر واحد قابل قبول ہے جو کثرت وسائط کی وجہ سے مفید للظن ہے اسی طرح دیگر معاملات ومعاشرت میں بھی، مگر یہ الگ مسئلہ ہے اور باب کا مسئلہ بدگمانی سے متعلق ہے، لہٰذا یہاں اسی سے متعلق بحث مناسب ہے، پس اس حدیث کا مطلب کیا ہے؟

(۱) تو امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس بارے میں امام سفیان بن عیینہؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ بدگمانی اکذب الحدیث کی وعید میں آتی ہے جس کے بارے میں زبان سے اظہار کیا جائے بغیر اظہار کے گناہ میں نہیں آتی لیکن ابن العربیؒ نے عارضہ میں اس توجیہ کو رد کیا ہے کیونکہ ایک دفعہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کے دنوں میں رات کے وقت مسجد کے دروازے کے پاس حضرت صفیہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کو گھر جانے کے لئے رخصت کررہے تھے ابھی ان کے ساتھ کھڑے ہی تھے کہ وہاں سے دو آدمی گذرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انها صفية" قالا یارسول اللّٰه سبحان اللّٰه قال: ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم وانی خشیت ان یقذف فی قلوبکما شیئاً أفتهلکا"۔ [۲]

چنانچہ یہاں بغیر نطق کے ظن کو بھی مہلک قرار دیا ہے اگرچہ غیر نبی کے بارے میں بدگمانی ہلاکت خیز تو نہیں مگر معصیت تو ہے۔

(۲) امام نوویؒ نے شرح مسلم میں امام خطابیؒ سے نقل کیا ہے کہ مراد وہ ظن ہے جو نفس میں قرار پکڑے یعنی پختگی پائے۔ رہا وہ ظن جو آئے اور ختم ہو جائے وہ معاف ہے کہ غیر اختیاری وسوسے انسانی بس سے باہر ہے۔

(۳) ابن العربیؒ نے جس کو صحیح کہا ہے وہ یہ ہے "وقیل: ذالك یختلف بحال المظنون وهو الصحیح عندی" یعنی اگر ایک آدمی مشتبہ کام کرتا ہے مثلاً جب اس کا پڑوسی گھر میں نہیں ہوتا ہے تو وہ چھپکے

باب ماجاء فی ظن السوء

[۱] سورة یونس آیت: ۳٦.

[۲] رواه البخاری ص: ۲۷۳ ج: ۱ "باب زیارة المرأة زوجها فی اعتکافه" کتاب الصوم.

سے اس کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ اس کا معمول ہے اور پڑوسی کی بیوی بھی کوئی نیک سیرت خاتون نہیں ہے تو ایسے میں حسن ظن کہاں سے آئے گا؟ یا ایک راوی متہم بالکذب ہے وغیرہ وغیرہ تو ایسی بدگمانی گناہ میں نہیں آتی بلکہ اس کا ذمہ دار مظنون خود ہے لیکن جو شخص نیک صالح کردار کا حامل ہے تو اس پر بلاوجہ بدگمانی کرنا غلیظ جھوٹ اور تہمت ہے۔

" لان من الناس من تتطرق اليه التهمة ،ومنهم من لاتتطرق ،فكل من تعرض التُهَمَ فلايلومنَّ مَن أساء به الظن والصيانةُ ترفع ذالك عن الصائن فان ظن به احدذالك اثم"۔عارضه

المسترشد عرض کرتا ہے کہ اس آخری اور تیسرے مطلب سے بہت سے اشکالات بھی ختم ہو جاتے ہیں اور روایات میں کوئی تعارض بھی نہیں رہتا۔تدبر

قولہ"فان الظن اكذب الحديث" یعنی پاک لوگوں کے بارے میں بدگمانی غلیظ قسم کا شیطانی وسوسہ ہے۔یا مطلب یہ ہے کہ ظن السوء جھوٹ بولنے کا سبب بنتا ہے۔کیا ایسی بدگمانیاں کرنے اور پھیلانے کی یہ بُرائی اور قباحت،خرابی کے لئے کافی نہیں جو آج کل اہل تجدد نے اسلاف کے بارے میں اپنا شیوہ اور مشغلہ بنایا ہے سالہا سالوں سے کئی گروپ منظم سازش کے تحت فقہاء ومحدثین جیسے نیک سیرت لوگوں کے بارے میں یہ تأثر دے رہے ہیں اور تحریک چلا رہے ہیں کہ ان فقہاء ومحدثین نے فلاں جگہ غلط بیانی کی ہے اور فلاں جگہ غلط استنباط کیا ہے اور مقصد ان پر سے اعتماد اٹھانا اور انکار حدیث وانکار فقہ کی راہ ہموار کرنا ہے جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کیا اس سے بڑی غلیظ بات ہو سکتی ہے؟

باب ماجاء فی المِزاح

"عن انس قال اِن كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لَيُخالِطُناحتى اِن كان لَيقول لِاَخٍ لى صغيرٍ :ياابا عُمير مافعل النُغير"؟(هذاحديث حسن صحيح [1])

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے

باب ماجاء فی المزاح

[1] راجع للاحاديث حول المزاح مجمع الزوائد ص:١١٠ ج:٨۔

میل جول فرماتے حتی کہ بلاشبہ میرے چھوٹے بھائی سے کہتے، اے ابوعمیر نُغیر کا کیا بنا؟۔

لغات:۔قولہ "المِزاح" بکسر المیم اور ضمہ بھی صحیح ہے خوش طبعی کی گفتگو کو کہتے ہیں۔قولہ "اِن کان وحتی اِن کان" دونوں جگہوں میں ''اِن'' مخفف من المثقلہ ہے، اس کا اسم ضمیر شان ہے یعنی ''انہ''۔قولہ "لیخالطنا" مخالطت عُزلت وتنہائی کی ضد ہے گھل مل کر رہنے کو کہتے ہیں جو کنایہ ہے عدم تکلف اور عدم تکبر سے۔ قولہ "نغیر" بصیغۂ تصغیر یعنی بضم الاول وفتح الثانی سرخ چونچ والا چھوٹا سا پرندہ ہے جس کو اہل مدینہ بُلبُل کہتے تھے۔

تشریح:۔دنیاداروں اور بالخصوص ملوک وسلاطین کے اخلاق کچھ اس طرح ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ابنائے جنس اور ابنائے نوع سے ممتاز وبہتر سمجھتے ہیں وہ ہر وقت اپنے رعب جمانے کی کوشش میں ہوتے ہیں اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی برتری ظاہر کرتے رہتے ہیں جس کے کئی طریقے ہیں: وہ نہ تو اپنے سے کمتر لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہیں بلکہ اس کو اپنی شان کے منافی کہتے ہیں۔وہ عام لوگوں سے مل جل کر رہنے کو عیب سمجھتے ہیں کہ عام لوگ ان کی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ایک ہی مجلس میں بیٹھنا، کھانا کھانا، باتیں کرنا اور چھوٹے بچوں کے ساتھ سڑکوں اور گلیوں میں کھڑے ہوکر خوش مزاجی کی باتیں معیوب سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بغیر ان کا رعب قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے ملوک فارس جب بیٹھتے تو دربار والے ان کے گرد کھڑے رہتے۔وغیرہ وغیرہ

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالی نے جن کمالات اور اخلاق سے نوازا تھا ان میں ان تکلفات کی نہ گنجائش تھی اور نہ ہی ان کو ضرورت تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب بقدر ایک ماہ کی مسافت کے دنیا بھر میں پھیلا ہوا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تکمیل اور عروج پر پہنچانا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے بادشاہوں سے بالکل منفرد وممتاز عالیشان بادشاہ تھے۔اس حدیث میں ان کے کریمانہ اخلاق کی ایک جھلک بیان ہوئی ہے چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ مخالطت فرماتے، اس مخالطت اور بے تکلفی کا عالم یہ تھا کہ میرے چھوٹے بھائی سے یہ کہہ کر مزاح فرماتے کہ تیری بلبل کہاں ہے؟ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہ چھوٹا بھائی ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا صاحب زادہ ہے لہٰذا یہ ان کا ماں شریک بھائی ہے یعنی دونوں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہیں۔ابوعمیر کے نام میں دو قول ہیں: ابن جوزی رحمہ اللہ نے الکُنیٰ میں ''حفص'' ذکر کیا ہے جبکہ امام حاکم رحمہ اللہ

نے ''عبداللہ'' نام کو ترجیح دی ہے۔ان کی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات ہوئی تھی۔

بعض نے اس حدیث کے حوالے سے محدثین عظام پر ایک اعتراض کیا ہے کہ یہ لوگ اپنی کتابوں میں فضول قسم کی بے فائدہ احادیث بھی ذکر کرتے ہیں۔اس کے جواب میں ابن القاضی الشافعیؒ نے فرمایا کہ ان کو پتہ نہیں حالانکہ اس حدیث میں ساٹھ فوائد ہیں۔ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کچھ اور مزید فوائد کا ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث ''باب ماجاء فی الصلوٰۃ علی البُسط'' میں بھی گذری ہے وہاں بھی ہم نے چار فوائد کا ذکر کیا تھا کہ اس سے معلوم ہوا کہ حرم مدنی کا حکم حرم مکی سے مختلف ہے کہ مدینہ میں شکار کھیلنا جائز ہے۔بچہ اگر پرندے سے کھیلے اور اسے تکلیف نہ دیتا ہو تو یہ بھی جائز ہے،اور یہ کہ بے اولاد شخص کو کنیت سے پکارنا جائز ہے اور یہ کہ بچوں کے ساتھ ایسی بے تکلفی جس میں خلاف واقع بات کا ارتکاب نہ ہوتا ہو جائز ہے۔

لیکن یہاں یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معالی اخلاق کی مناسبت سے ذکر کی گئی ہے،اس کے علاوہ بھی امام ترمذیؒ نے اس باب میں تین ایسی احادیث ذکر فرمائی ہیں جو اس بات پر ناطق ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے خوش طبعی اور بے تکلفی کی باتیں فرماتے،جس کا مقصد ان کو خوش کرنا،اپنے رعب کو کم کرنا تھا تا کہ اگر وہ کوئی مسئلہ پوچھنا چاہیں تو غیر معمولی رعب رُکاوٹ نہ بنے اور ان کو باہم رہن سہن کے اطوار وطریقے بتلانا تھا کہ وہ آپس میں بھی ہشاش بشاش رہیں،گھٹن کا ماحول پیدا نہ کریں وغیرہ وغیرہ،تاہم اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی شریعت کے ادنیٰ آداب کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور نہ ہی یہ مزاح دین کے بارے میں یا کثرت سے ہوتا کیونکہ یہ دونوں سخت ممنوع ہیں چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا:''ان اللّٰہ یأمرکم ان تذبحوا بقرۃ قالوا أتتخذنا ھزوا قال اعوذ باللّٰہ ان اکون من الجاھلین''[۲] یعنی میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ دین کے معاملے میں مذاق کروں۔تفسیر مدارک میں ہے کہ ایسے موقعے پر مذاق جہالت میں سے ہے''لان الھزء فی مثل ھذا من باب الجھل والسفہ''۔اسی طرح کثرت مذاق بھی ممنوع ہے کہ آدمی لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے ہر وقت مذاق کرتا رہے اور خود کو مسخرہ بنائے کیونکہ اس کی ممانعت صحیح نصوص سے ثابت ہے اور یہ کہ اس سے کثرت ضحک اور قساوت قلب بلکہ غفلت عن الآخرۃ لازم آتی ہے جس کی قباحت وہلاکت بدیہی ہے،ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں:

---

[۲] سورۃ البقرۃ آیت:٦٧.

"ولـكـن لاينبغي ان يكون الرجل مزّاحاًو لاتِلعابةً،و لا يستعمل ذالك في احكام الدين فانه جهل"۔(عارضه)

ایسی ہی بات امام نوویؒ وغیرہ نے بھی لکھی ہے لہٰذا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اس صورت میں ہرگز نہ تھا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں کوئی خلاف واقعہ بات بھی نہیں ہوتی جیسا کہ باب کی اگلی روایت میں اس کی تصریح ہے، نیز کسی کے اوپر طنز یا کسی کی تحقیر یا لوگوں کی تضحیک اور خود زور سے ہنسے کے مزاح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزاح میں دوسروں کی حوصلہ افزائی قدر وعزت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبسم و مسکراہٹ فرماتے۔

الحمد للہ راقم نے ''نقش قدم'' میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور خوش طبعی کے کچھ واقعات ذکر کئے ہیں۔(دیکھئے نقش قدم فصل ۳ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ'' باب اول) گیارہ صفحوں سے زائد اس مضمون کا آخری حصہ آپ بھی پڑھ لیں ''ایک دفعہ ایک عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ میرا شوہر بیمار ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اپنے پاس) تشریف لانے کی درخواست کرتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید تیرا خاوند وہی ہے جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے؟ وہ (خاموشی سے) واپس آئی اور اپنے خاوند کی آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی، اس نے پوچھا تو کیا کر رہی ہے؟ کہنے لگی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیری آنکھوں میں سفیدی ہے اس نے (ہنس کر) کہا کہ کون سا انسان ہے جس کی آنکھوں میں سفیدی نہیں ہے؟۔

اسی طرح ایک عورت حاضر خدمت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (میرے لئے) اللہ سے دعا فرمائے کہ وہ مجھے جنت میں داخل فرمائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے فلاں کی ماں کوئی بوڑھی جنت میں داخل نہیں ہوگی وہ عورت روتی ہوئی واپس چلی آئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے پاس بیٹھنے والوں سے) فرمایا کہ اس کو جا کے بتا دو کہ جب یہ جنت میں داخل ہوگی تو بوڑھی نہیں ہوگی (بلکہ بالکل نوعمر ہوگی) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی ''انـا انشـأنـاهـن انشاءً فـجـعـلـنـاهن ابكاراً عُرُباً اتراباً''[۳] غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی بلند اخلاق اور محاسن افعال کا مجموعہ بنا کر مبعوث فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر عیب سے پاک ہو کر پیدا ہوئے گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ

---

۳ سورة الواقعة آيت: ۳۵،۳۶.

وسلم جیسا چاہتے ایسا ہی پیدا ہوئے۔

خُلقتَ مُبرأً من کل عیب
کانك قد خُلقتَ کما تشاءُ

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار لوگوں سے مزاح بھی فرما لیتے مگر کبھی بھی سچ کے علاوہ کوئی لفظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا نہیں ہوا۔[۴]

دوسری حدیث:۔"عن ابی هريرة قال قالوا يارسول الله انك تداعبنا قال: انی لااقول الا حقاً"۔ (ومعنى قوله انك تداعبنا انما يعنون انك تمازحنا)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے ساتھ مزاح فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں صحیح بات کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہتا ہوں۔

لغات:۔ دَعَبَہ، دَعباً و دَعَابَۃً دونوں مصدر ہیں تاہم دُعابۃ میں دال کا فتحہ وضمہ دونوں جائز ہیں خوش طبعی کرنے اور ہنسی مذاق کو کہتے ہیں۔قولہ "تداعبنا" مداعبہ سے ہے مطلب یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے مذاق میں حصہ لیتے ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی وجہ تعجب وہی رسم تھی جس کا تذکرہ شروع باب میں کیا جا چکا ہے کہ عموماً بڑے لوگ اور خصوصاً سلاطین ایسا نہیں کرتے کہ ہر شخص سے بے تکلفی کریں، جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ میرا مذاق کرنا حد اعتدال کے اندر رہتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق تمسخر اور لوگوں کو ہنسنے پر آمادہ کرنا نہیں ہوتا تھا جس کے لئے جھوٹ بولنا یا طنز کرنا پڑتا ہے بلکہ صحابہ کرامؓ کے ذہن سے اپنے غیر معمولی رعب کو کم کرنا وغیرہ محمود مقاصد ہوا کرتے تھے اور یہ کام صحیح باتوں سے بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ مثالوں سے واضح ہے اس لئے بعض شارحین نے "الا حقا" بمعنی مفید اً لیا ہے یعنی میرا مزاح آپ کے فائدے کے لئے ہے۔

تیسری حدیث:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (انس) سے فرمایا "اے دو کانوں والے" اس کا مقصد بھی راوی کے مطابق مزاح کرنا تھا، گو کہ بعض شارحین نے

---

[۴] کما ورد فی الحدیث عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ انی لامزح ولا اقول الا حقاً اخرجه الطبرانی فی الصغير ۷/۲.

اس کو تنبیہ علی الاستماع پر بھی حمل کیا ہے کہ جب کان دو ہیں تو بات کو اچھی طرح سننا اور سمجھ لینا چاہئے مگر ترمذی نے اپنے شیخ سے جو مطلب نقل کیا ہے وہ زیادہ ظاہر ہے۔

اس حدیث میں بھی مزاح کے رنگ میں ایک سچی اور درست بات کی گئی ہے۔

چوتھی حدیث:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تجھے اونٹنی کے بچے پر سوار کروں گا، تو اس شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں اونٹنی کے بچے سے کیا کروں گا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اونٹ کو تو اونٹنی ہی جنتی ہے۔

لغات:۔ قولہ "استحمل" باب استفعال طلب کے لئے ہے یعنی سواری طلب کر لی خواہ بطور ہدیہ وصدقہ کے ہو یا عاریۃً ہو۔ قولہ "وھل تلد الابل الا النوق" اس میں ''نوق'' فاعل اور ''الابل'' مفعول بہ ہے۔ نوق بضم النون ناقۃ کی جمع ہے اونٹنی کو کہتے ہیں جبکہ ''الابل'' میں الف لام جنس کے لئے ہے یعنی جنس اونٹ خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب کو اونٹنی جنتی ہے۔ چونکہ سائل نے ولد الناقہ سے متبادر معنی لئے اس لئے تعجب کا اظہار کیا کہ بچہ تو سواری کے قابل نہیں ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ اس کلام میں غور کرتے تو مطلب سمجھ میں آجاتا، دیکھئے یہاں مزاح بھی ہوا اور سائل کے سوال کو قبول کرنے اور اونٹ دینے کی بات بھی ہوئی۔

تشریح:۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے مراتب متفاوت تھے بعض کلام کے رموز کو بہت جلد سمجھ جاتے جبکہ بعض حضرات کو اس میں تأمل اور زیادہ تدبر کی ضرورت پیش آتی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مذاق سب کے ساتھ یکساں نہیں ہوتا بلکہ مخاطب کے فہم کے مطابق ہونا چاہئے، ذکی کے ساتھ بلیغانہ انداز میں اور دوسرے درجوں والوں کے ساتھ حسبِ صلاحیت۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی المِراء

"عن انس بن مالك قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :من تَرَكَ الكذب وهو باطل بُنِيَ له في رَبَضِ الجنة ومن ترك المراء وهو مُحِقٌّ بُنِيَ له في وسطها،ومن حَسَّنَ خُلقَه بُنِيَ له في اعلاها"۔(حسن) [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے جھوٹ کو چھوڑا دراں حالیکہ وہ غلط ہوتو اس کے لئے جنت کے نشیبی حصے میں گھر بنایا جائے گا اور جس نے جھگڑا کرنے کو چھوڑا حالانکہ وہ حق بجانب ہوتو اس کے لئے جنت کے درمیانی حصے میں گھر بنا دیا جاتا ہے اور جس شخص نے اپنے اخلاق کو عمدہ بنایا تو اس کے لئے جنت کے بلند مقام پر گھر بنایا جائے گا۔

لغات:۔ ''مِراء'' بکسر المیم جنگ وجدال اور بحث وتکرار کو کہتے ہیں۔قولہ"وھو باطل" یہ جملہ معترضہ ہے جو شرط اور جزاء کے درمیان آیا ہے جو یا تو تاکید کے لئے ہے یا پھر اس کذب سے احتراز کے لئے ہے، جس کی گنجائش بصورت شدید ضرورت یا بطور تعریض وتوریہ کے ہے جیسا کہ پہلے گذرا ہے اور یہ احتراز کی صحت اس پر مبنی ہے کہ یہ جملہ حال ہے اور حال قید ہوتا ہے پھر حال ہونے میں دو احتمال ہیں یا مفعول یعنی ''کذب'' سے حال ہے اسی کو ترجمہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔یا پھر فاعل سے حال ہے یعنی وہ شخص جو جھوٹ سے اجتناب کرتا ہے باطل اور غلطی پر ہو تو جب ایسے شخص کو جھوٹ چھوڑنے پر اتنا ثواب ملتا ہے تو جو حق پر ہو اور جھوٹ سے اجتناب کرے اس کے لئے تو بطریق اولی بڑا مرتبہ ہوگا۔قولہ"بنی له" بصیغہ مجہول ہے۔قولہ"فی ربض الجنة" ربض بفتح الباء گھر کے آس پاس کی جگہ اور ماحول کو کہتے ہیں، مگر ہم نے ترجمہ میں نشیب کا ترجمہ اس لئے کیا ہے کہ ایک تو اس حدیث میں تشبیہ دی گئی ہے، دوم ربض کا تقابل وسط اور اعلی سے کیا گیا ہے جس سے یہی مطلب نکلتا ہے، نیز جنت سے خارج اور باہر کا ترجمہ مناسب بھی نہیں ہے کما ھو الظاہر۔لہٰذا حاشیہ میں جو خارجاً عنھا کہا گیا ہے اس سے غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے، پس یوں سمجھنا چاہئے کہ جیسے ایک ٹیلا نما جگہ پر قلعہ ہوتا ہے اور اس کے دامن میں کچھ چوکیاں اور مکانات ہوتے ہیں چونکہ ایسی جگہ میں سب سے زیادہ خوب

باب ماجاء فی المراء

[1] الحديث روى بمعناه ابوداؤد ص:۳۱۳ ج:۲ "باب فی حسن الخلق" كتاب الادب، ایضاً رواه النسائی فی الجهاد.

صورتی اوراہمیت کا حامل گھر وہی ہوتا ہے جو سب سے اوپر چوٹی پر بنا ہوا ہو پھر وہ جو دامنِ کوہ اور قلّہ کوہ کے درمیان میں ہوتا ہے اور سب سے ادنی وہ ہوتا ہے جو نیچے دامن یا نشیب میں واقع ہوا ایسا ہی حال جنت کے مکانات اور مقامات کا ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث شریف میں حسبِ تفاوتِ حسنات متفاوت مقامات میں گھروں کا وعدہ کیا گیا ہے بایں طور کہ پہلی نیکی کا درجہ نسبتاً کم ہے کہ یہ آسان ہے تو اس پر ادنی گھر کا وعدہ کیا گیا جبکہ تیسرے نمبر کی نیکی بڑی مشکل اور عظیم ہے اس لئے اس کی جزاء بلند فضاء اور پُر کشش بناء مقرر کی گئی اور دوم درمیانہ ہونے کی وجہ سے درمیانہ درجے کے گھر کی بنیاد بنادی گئی۔

اس حدیث کے پہلے جملے میں جھوٹ چھوڑنے سے مراد جنگ ولڑائی کے وقت ترک ہے کیونکہ ایسے میں جبکہ جھوٹ بولنا مفید اور حجت میں کامیابی کا ذریعہ ممکنہ طور پر بن سکتا ہے مگر صرف گناہ سے بچنے کی غرض سے چھوڑنا نفس کو قابو میں رکھنے کی واضح دلیل اور بہترین موقع ہے اس لئے اس کے عوض جنت میں گھر دیا جاتا ہے تاہم نفس لڑائی کی نحوست سے نہ بچنے کی وجہ سے وہ گھر زیادہ اعلیٰ مقام پر نہ ہوگا۔ جبکہ دوسرے جملہ میں جس نیکی کا ذکر ہے یہ پہلی سے اعلی ہے کہ اس میں نفس جھگڑے سے اجتناب کیا گیا اور وہ بھی حق بجانب ہوتے ہوئے تو بمقتضائے حدیث ''من تواضع لله رفعه الله'' [۲] اس کا گھر نشیبی مقام سے بلندی پر چلا گیا اگر چہ سب سے اعلی گھر اس کا ہوگا جس کے تمام اخلاق تواضع سمیت اعلی ہوں۔

دوسری حدیث:۔ "عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كفىٰ بكَ اِثماًان لاتزال مخاصماً"۔ (حديث غريب) قال المناوى اسناده ضعيف۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تیرے گناہ گار ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ تو ہمیشہ جھگڑالو رہے۔

تشریح:۔ اس حدیث کا مطلب بالکل واضح ہے (گو کہ حدیث ضعیف ہے) کیونکہ جھگڑا ایک منحوس عمل ہے اس کا آدمی کے دین پر انتہائی بُرا اثر پڑتا ہے، اس سے اخلاق بھی تباہ ہو جاتے ہیں بلکہ جھگڑا کرنا ہی

---

[۲] رواه البيهقى فى شعب الايمان بحواله مشكوٰة ص: ۴۳۴ "باب الغضب والكبر" ايضاً رواه احمد ص: ۷۹ ج:۳ حديث: ۸۷۸۲ ولفظه: وماتواضع احد لله الا رفعه الله عزوجل، ايضاً ص: ۳۹۱ ج:۳ ولفظه: من تواضع لله درجة رفعه الله درجة، ايضاً رواه ابن ماجه وابن حبان بحواله الترغيب والترهيب ص: ۳۵۱ ج:۳.

بداخلاقی کی دلیل ہے پھر جو آدمی بار بار لڑتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باطن درندگی کی صفات سے لبریز ہے تو جس طرح اچھے اخلاق کا مالک مسلسل روزہ رکھنے اور نمازیں پڑھنے والوں کا جتنا ثواب کماتا رہتا ہے ٹھیک اس کے برعکس جھگڑالو آدمی مسلسل گناہوں کا بار بڑھاتا رہتا ہے۔

تیسری حدیث:۔ "لاتمار اخاك ولا تمازحه ولا تعده موعداً فتخلفه "(حديث غريب)

اپنے بھائی سے جدال وتکرار مت کرو اور نہ اس سے نازیبا مذاق کرو اور نہ ہی ایسا وعدہ کرو جس کی تم خلاف ورزی کرو۔

لغات:۔ قوله "لاتمار" مراء سے ہے اور "لا تمازحه" مزاح سے ہے دونوں کے معنی گذرے ہیں۔ قوله "ولا تعده" وَعَدَ يَعِدُ بمعنی وعدہ کرنے کے اور موعداً مصدر میمی بمعنی وعداً کے ہے۔ قوله "فتخلفه" اخلاف سے ہے اخلف وعده وبوعده، وعدہ خلافی کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث میں تین باتوں سے منع کیا گیا ہے۔

(۱) مراء جس کا حکم گذر گیا تاہم مراء یعنی بحث وتکرار اگر قرآن میں کسی شک وشبہ ڈالنے کی غرض سے ہو تو یہ کفر ہے اور اگر ازالۂ شک کے لئے ہو تو یہ جائز ہے۔

(۲) مزاح کی ایک صورت وہ ہے جو سابقہ باب میں گذر گئی وہ ہرگز مذموم نہیں۔ دوسری صورت وہ ہے جس میں وہ شرائط نہ ہوں جو سابقہ باب میں بیان ہوئی ہیں بلکہ کسی کی تحقیر اور طنز کے طور پر ہو تو یہ ناجائز ہے اور یہاں یہی قسم مراد ہے اور امام ترمذیؒ کا مقصد بھی یہی ہے کہ مزاح کی دونوں صورتوں کو اُجاگر فرمائے چنانچہ سابقہ باب میں جائز حالت بتلادی اور اس باب میں ناجائز کو ذکر کیا۔

(۳) وعدہ خلافی: اس بارے میں تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے جیسا کہ محشی نے طیبی سے نقل کیا ہے کہ جس چیز کا وعدہ کیا جائے اور وہ خلاف شرع نہ ہو تو اسے پورا کرنا پڑے گا، مگر اس کی حیثیت میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک ایفا مستحب ہے اور بعض کے نزدیک جن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی ہیں واجب ہے بعض نے تفصیل بیان کی ہے، لہٰذا پہلے فریق کے نزدیک وعدہ خلافی مکروہ ہے جبکہ فریق ثانی کے نزدیک موجب گناہ ہے یہ اس وقت ہے جب وعدہ کرتے وقت ارادہ پورا کرنے کا ہو لیکن اگر شروع ہی سے خلاف ورزی کی نیت ہو تو یہ منافقت کی شاخ ہے:

"قال النبی صلی الله عليه وسلم: آية المنافق ثلاث: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وإذا وعد

اخلف واذااؤتمن خان"۔ [۳]

البتہ شروع سے ارادہ ایفاء کا تھا مگر پھر کچھ عذر پیش آیا تو ایفاء لازمی نہیں، اس لئے وعدہ کرتے وقت ان شاء اللہ کہنا چاہئے تاکہ دوسرا فریق مکمل اعتماد کر کے نہ بیٹھے۔

یہ تو نفس مسئلہ ہوا مگر یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اخلاقی طور سے ایفائے عہد حتی الامکان لازمی ہے خاص کر جب وعدہ خلافی سے دوسرے کو نقصان ہوتا ہو بلکہ بسا اوقات وہ نقصان ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدرسہ کسی مدرس کے ساتھ رابطہ کر کے اس کو ترغیب دے کر اپنے مدرسہ میں استاذ مقرر کرنے کا وعدہ کر کے اسے لالچ بھی دلاتا ہے چنانچہ وہ بے چارہ اپنے مدرسہ سے استعفاء دیتا ہے اور جب یہاں آتا ہے تو مہتمم صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری کچھ مجبوریاں ہیں آپ ناراض نہ ہوں، بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک صاحب نے سرکاری نوکری سے استعفاء دے دیا اور پھر مدرسے نے بھی نہیں رکھا، یہ بد اخلاقی کی بدترین مثال ہوسکتی ہے عام علماء یہ سمجھتے ہیں کہ عذر پیش آنے سے وعدہ خلافی جائز ہوجاتی ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ عذر کس درجے کا ہو تو مبیح ہے اور یہ کہ دوسرے کا جو غیر معمولی نقصان اور علمی قتل ہوا اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟

ایسے لوگوں سے ہماری درخواست ہے کہ ایسے معاملات میں وعدہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے نہ کہ بعد میں، اگر کسی مدرس کے بارے میں تحقیق کرنی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تسلی کر کے پھر اس سے رابطہ کرلیا جائے یہ طریقہ غلط ہے کہ پہلے وعدہ کرلیا اس سے استعفاء دلوایا اور اب تحقیقات کرنے لگ گئے۔ آخر اخلاقی فرائض بھی تو اسلام کا حصہ ہیں مدرسہ چلانا زیادہ سے زیادہ ایک مستحب امر ہے اگر اس میں ایسے قبائح اور اخلاقی خامیاں سرایت کرلیں تو استحباب کہاں رہے گا؟ یہ تو کاروبار بن جائے گا۔

ٹھیک ہے کاروبار بھی ایک مباح امر ہے مگر صدقات وخیرات اور دین کے نام پر نہیں بلکہ اپنے بازوؤں کی طاقت پر، یہ نہیں ہونا چاہئے کہ دین کے نام پر پیسے جمع کریں اور دین کے تقاضوں کو پامال کیا جائے اس سلسلہ میں اخلاقِ نبوی کی ایک جھلک آپ بھی پڑھ لیں: قاضی عیاض رحمہ اللہ نے "الشفاء بتعریف حقوق المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" میں ابوالحمساء سے نقل کیا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

[۳] رواہ البخاری ص:۱۰ ج:۱ "باب علامۃ المنافق" کتاب الایمان، ایضاً رواہ فی الاستقراض باب:۱۰ ومظالم باب:۱۷ وفی الوصایا باب:۸، وفی الجزیۃ باب:۱۷ وفی الشہادات باب:۲۸ وفی الادب باب:۶۹ وصحیح مسلم ص:۵۶ ج:۱ "باب خصال المنافق" کتاب الایمان، ایضاً رواہ ابوداؤد فی کتاب الصلاۃ باب:۱۴۹، والنسائی کتاب الایمان باب:۲۰، ایضاً مسند احمد ص:۴۰ ج:۳ حدیث:۸۴۷۰ وص:۳۵۵ ج:۲ حدیث:۱۰۵۴۲.

وعدہ کیا کہ میں آپ کا بقیہ حق لے کر اسی جگہ آتا ہوں پھر میں بھول گیا پھر تین دن کے بعد مجھے یاد آیا تو جب وہاں آیا تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں پر تھے یہ قبل البعثت کا واقعہ ہے:

"عن ابی الحمساء قال بایعت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ببیع قبل ان یبعث وبقیت لہ بقیۃ فوعدتُہ ان آتِیَہُ بھافی مکانہ فنسیتُ ثم ذکرتُ بعدثلاث فجئتُ فاذا ھوفی مکانہ فقال یافتیٰ لقدشَقَقتَ عَلَیَّ اناھٰھُنامنذثلاث اَنتظِرُکَ"۔

(ص:۴۷ حصہ اول فصل واماخلقہ صلی اللہ علیہ وسلم)

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت "واذکر فی الکتٰب اسمٰعیل انہ کان صادق الوعد" (سورۃ مریم آیت:۵۴) کے تحت امام طبریؒ کی روایت نقل کی ہے:

"ان اسماعیل النبی علیہ السلام وعدرجلاً مکاناًان یأتیہ فیہ فجاء ونسی الرجل فظل بہ اسماعیل وبات حتی جاء الرجل من الغدفقال:مابرحتَ من ھٰھُنا؟ قال"لا"قال انی نسیتُ قال:لم اکن لِابرح حتی تأتینی فلذالک (کان صادق الوعد) وقال سفیان الثوریؒ بلغنی انہ قام فی ذالک المکان ینتظرہ حولاً حتی جاء ہ وقال ابن الشوذب بلغنی انہ اتخذذالک الموضع مسکنا وقد رواہ ابوداؤدفی سننہ "الخ۔

اللہ تبارک وتعالی فرماتے ہیں:"ان اللّٰہ لایخلف المیعاد "(ال عمران آیت ۹) اللہ تبارک وتعالی ہمیں اخلاق ربانی اوراخلاق نبوی سے متخلق ہونے کی قدر وتوفیق عطاء فرمائے۔ آمین

باب ماجاء فی المداراة

"عن عائشۃ قالت استأذن رجل علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم واناعندہ فقال بِئس ابن العشیرۃ اواخوالعشیرۃ ثم اذن لہ فَاَلَانَ لہ القول فلماخرج قلتُ لہ یارسول اللّٰہ اقلتَ لہ ماقلتَ ثم اَلَنتَ لہ القول؟قال یاعائشۃ اِنَّ مِن شرالناس مَن ترکہ الناس اووَدَعَہ الناس اِتقاء فحشہ"۔(حسن صحیح)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر

آنے کی اجازت چاہی جبکہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص اپنے خاندان کا بُرا آدمی ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دیدی (چنانچہ جب وہ آیا) تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نرم گفتگو فرمائی، جب وہ نکلا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے اللہ کے رسول! آپ نے تو اس کے بارے میں وہ بات کی تھی جو آپ کر چکے ہیں اور پھر بھی آپ نے اس سے نرم انداز میں بات فرمائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ بے شک لوگوں میں بدترین شخص وہ ہے جس کو لوگ بدگوئی سے بچنے کی خاطر چھوڑ دے۔

لغات:۔ ''مدارات'' بذل الدنیا للدین یعنی دینی غرض کے پیش نظر لوگوں کے ساتھ دنیوی معاملات اور رہن سہن میں نرمی کرنا اور بول چال میں ملائمت اختیار کرنا۔ قولہ "بئس ابن العشیرة او اخو العشیرة" بئس افعال ذم میں سے ہے اور لفظ ''او'' شک من الراوی کے لئے ہے، تنویع کے لئے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ بخاری شریف کی ایک روایت میں لفظ ''او'' کے بغیر آیا ہے۔ ابن اور اخ کی نسبت جب عشیر بمعنی قبیلہ کی طرف ہو جائے تو مراد فرد من القبیلہ ہوتا ہے جیسے فلان ابن الستین یعنی فلاں آدمی ساٹھ سال کا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص اس قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ قولہ "فالان له القول" لین سے ہے بمعنی نرم وملائم کے۔

تشریح:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس آدمی کی بابت یہ ارشاد فرمایا اس کا نام ''عُیینہ بن حصین'' تھا جو بظاہر تو ایمان لایا تھا مگر اس میں مخلص نہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلیت پر تنبیہ کی غرض سے فرمایا کہ یہ اس خاندان کا بُرا آدمی ہے یعنی منافق ہے تا کہ اس کے ظاہری اسلام سے کسی کو دھوکہ نہ ہو اور کسی آدمی کے متعلق اس قسم کا انتباہ جائز بلکہ بعض دفعہ لازم ہو جاتا ہے، چنانچہ فقہاء نے اس پر کئی تفریعات کی ہیں مثلاً ایک آدمی کسی سے رشتہ کرنا چاہتا ہے اور آپ سے مشورہ لے لے تو اس میں اگر ایسی خامی ہو جو دین یا دنیا کے اعتبار سے مضر ہو تو آپ کو بتلا دینا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب وہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندہ پیشانی اور خندہ روئی سے کلام فرمایا جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکمت پوچھنی پڑی، جس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''ان من شر الناس الخ'' یعنی میں نہیں چاہتا ہوں کہ میں اُن لوگوں میں شمار ہو جاؤں جن کو لوگ ان کی سخت مزاجی اور سخت کلامی کی وجہ سے چھوڑ لیتے ہیں، تو چونکہ ان دونوں ارشادات اور رویئوں کے مقتضیات الگ الگ ہیں اس لئے یہاں یہ اعتراض وارد نہ ہوا کہ اس طرح تو گویا ایک گونہ تضاد سا پیدا ہوا، جواب واضح ہے کہ دونوں صورتیں بطور تشریع کے ہیں۔ تدبر

ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں:

”ولم یکن ذالك من قسم النفاق و حاشاه ،ثم حاشاه،ثم حاشاه ،ولکن امره الله تعالیٰ ان یَسُنَّ لِاُمته سنّةً فی التعریف بحال الفاسق لِمَن جهله ،وَآلان القول مخافة شره من غیران یکون فی القول معه کذب ولامِراء“۔

مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ہر صورت میں خوش خلقی سے ملنا چاہئے تاہم اس میں مداہنت نہیں ہونی چاہئے ،مداہنت ،مداراۃ کے مقابل کا نام ہے یعنی ایسا قول یا عمل جائز نہیں جس سے دین کی توہین یا مسلمان کی اہانت ہو جاتی ہو،اسی نکتے کے پیش نظر تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اپنے سے کم حیثیت والے کافر سے مدد لینا جائز ہے جیسے غلام سے اور کتابیہ کے ساتھ نکاح کر کے۔جبکہ بڑی حیثیت والے سے مدد نہیں طلب کرنی چاہئے کہ اول میں ذلت نہیں جبکہ دوم میں تذلل ہے۔

کفار سے تعلقات کی نوعیت:۔ کافروں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات جائز اور کون سے ناجائز ہیں؟ تو باب کی حدیث سے مدارات کا جواز معلوم ہوتا ہے،قرآن کریم کی آیتوں سے اگر چہ بعض تعلقات جیسے دوستی اور راز کی باتیں بتانے کی ممانعت آئی ہے تاہم ان سے ہر قسم کے تعلقات پر پابندی نہیں لگائی گئی ہے چنانچہ سورۂ ال عمران میں ارشاد ہے:

”لایتخذالمؤمنون الکفرین اولیآء من دون المؤمنین ومن یفعل ذالك فلیس من الله فی شئی اِلاان تتّقُوامنهم تُقٰةً“۔ (ال عمران آیت:۲۸)

اور سورۂ نساء آیت:۹۰ میں ہے:

”اِلاالذین یصلون الی قوم بینکم وبینهم میثاق اوجاء وکم حصرت صدورهم ان یقاتلوکم اویقاتلواقومهم ...الی...فماجعل الله لکم علیهم سبیلاً“۔

جبکہ سورۂ مائدہ آیت:۵ میں ہے:

”الیوم احل لکم الطیبٰتُ وطعام الذین اوتواالکتاب حل لکم وطعامکم حل لهم، والمحصنٰتُ من المؤمنٰتِ والمحصنٰتُ من الذین اوتواالکتاب من قبلکم“الخ۔

وغیرذالک من الآیات والاحادیث،ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو سارے کفار سے ہر قسم کے تعلقات

جائز ہیں، اور نہ ہی سب ناجائز ہیں۔ اس لئے علماء نے مجموعی اعتبار سے لین دین کے علاوہ تین اقسام کا ذکر کیا ہے: (۱) موالات یعنی دوستانہ تعلقات (۲) مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی (۳) مواسات یعنی احسان اور نفع رسانی۔

اوپر آل عمران کی جو آیت ذکر کی گئی اس میں پہلی دونوں قسموں کا حکم معلوم ہوا کہ دوستانہ تعلقات ناجائز ہیں اور مدارات جائز ہیں یعنی ان کے ضرر سے بچنے کی غرض سے یا ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی غرض سے ظاہری خوش خلقی میں کوئی حرج نہیں، چنانچہ تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"وفی الآیة دلیل علی مشروعیة التقیة وَعَرَّفوها بمحافظة النفس او العِرض او المال من شر الاعداء... وَعَدَّ قوم من باب التقیة مداراة الکفار والفسقة والظلمة وإِلَانَةِ الکلام لهم والتبسم فی وجوههم والانبساط معهم وإعطائهم لِکفِّ اذاهم وقطع لسانهم (یعنی منفی پروپیگنڈے سے بچنے کے لئے) وصیانة العِرض منهم ولا یعد ذالك من باب الموالاة المنهی عنها بل هی سنة وامرٌ مشروع"۔

پھر آگے مدارات کے ثبوت کے لئے متعدد احادیث کی تخریج فرمائی ہے تاہم یہ مدارات اہل ذمہ کے ساتھ مخصوص ہے، البتہ ان کے لئے مجلس میں اٹھنا جائز ہے یا نہیں تو ابن حجر رحمہ اللہ نے جائز کہا ہے جبکہ علامہ آلوسیؒ اس کو موالات میں شمار کر کے ناجائز قرار دیتے ہیں، اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ عرف میں لوگ جس چیز کو تعظیم اور موالات سمجھتے ہیں وہ ناجائز ہے۔ (کذا فی تفسیر روح المعانی) خلاصہ یہ ہے کہ مدارات تین صورتوں میں جائز ہے (۱) ضرر سے بچنے کے لئے (۲) دینی اصلاح کی غرض سے (۳) اکرام ضیف کے طور پر۔

تیسری قسم مواسات ہے اس کا حکم یہ ہے کہ حربی کے ساتھ ناجائز ہے اور باقی کفار کے ساتھ جائز ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: "لاینهاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروهم وتقسطوا الیهم ان اللہ یحب المقسطین"۔

(سورۃ ممتحنہ آیت: ۸)

رہا تجارتی معاملہ تو اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ ہر اس چیز کی تجارت جس سے مسلمانوں کو نقصان

ہوسکتا ہوتو وہ جائز نہیں، جیسے جنگ کے دنوں میں ان کو اسلحہ فروخت کرنا یا مسلمانوں سے لڑنے کی غرض سے خرید کر اسٹور کرنے والے کو فروخت کرنا جائز نہیں۔ باقی معاملات اجارہ یعنی نوکری وغیرہ دنیوی معاملات میں کوئی حرج نہیں ان کو ملازم رکھنا بھی جائز ہے بشرطیکہ کوئی دوسری وجہ نہ ہواوران کی نوکری کرنا بھی جائز ہے گواس سے بچنا چاہئے، خصوصاً ان کے گھروں میں نوکری کرنے سے مسلمان کی تذلیل ہوتی ہے جبکہ کمپنی وغیرہ میں یہ علت نہیں۔

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

باب ماجاء فی الاقتصاد فی الحُب والبغض

"عن ابی هریرة أُراه رفعه قال اَحبِب حَبِیبَكَ هوناًمّاعسیٰ ان یکون بغیضك یومًامّا، واَبغِض بغیضك هوناًمّاعسیٰ ان یکون حَبِیبَكَ یومًامّا"۔(حدیث غریب و الصحیح هذاعن علیؓ موقوف) [۱]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مرفوع روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے دوست سے محبت کرو سنجیدہ طریقے سے ممکن ہے کہ وہ ایک دن تجھ سے نفرت کرنے والا بن جائے اور نفرت کرو اپنے دشمن سے سنجیدہ طریقے سے ممکن ہے کہ ایک دن وہ تیرا دوست بن جائے۔

لغات:۔ "الاقتصاد" اس کے متعدد معانی ہیں، میانہ روی، اعتدال، کفایت اور بچت کو کہتے ہیں، یہاں اعتدال و میانہ روی مراد ہے۔"احبب اور ابغض" دونوں باب افعال سے امر کے صیغے ہیں لہٰذا ان کو "اَکرِم" کے وزن پر پڑھا جائے گا بمعنی محبت کرو اور بغض کرو۔قولہ "ھونا" عارضہ میں ہے "الھون السکینة والوقار" دونوں جگہوں میں مراد میانہ روی ہے یعنی محبت ہو تو بھی افراط سے خالی ہونی چاہئے اور بغض بھی۔ حبیب اور بغیض دونوں بمعنی مفعول یعنی محبوب و مبغوض کے ہیں جیسے قتیل بمعنی مقتول کے۔

باب ماجاء فی الاقتصاد فی الحب والبغض

[۱] الحدیث اخرجه ایضاً الطبرانی فی الکبیر والاوسط، مجمع الزوائد ص:۱۱۰ ج:۸.

تشریح:۔ ترجمۃ الباب اور حدیث میں محبت اور نفرت ہر دو حالتوں میں اعتدال ومیانہ روی پر زور دیا گیا ہے اور اس کی وجہ بھی آسان لفظوں میں بتلادی گئی ہے کہ محبت میں اتنا غلو نہیں ہونا چاہئے کہ دوست کے بغیر رہنا مشکل ہوجائے، یا اسے اپنے سارے راز بتلادئے جائیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اچانک تعلقات خراب ہوجائیں تو کل پچھتاوا ہوگا، اسی طرح دشمنی اور مخالفت میں بھی اس حد تک نہیں جانا چاہئے کہ اگر کل تعلقات خوشگوار ہوجائیں تو آنکھیں ملانا مشکل ہو، جس کا عام مشاہدہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے ہیں وہ کل پچھتاتے رہتے ہیں۔

باب ماجاء فی الکِبر

"عن عبداللّٰہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :لایدخل الجنة من کان فی قلبه مِثقال حبة من خردل من کبر ولایدخل النار من کان فی قلبه مثقال حبة من ایمان"۔(حسن صحیح)[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں بوزن رائی کے دانے جتنا کبر ہو اور وہ شخص دوزخ میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں (رائی کے) دانے کے برابر ایمان ہو۔

لغات:۔ قوله "مِثقال" ثقل سے ماخوذ ہے مراد یہاں رائی کے دانے کے برابر وزن ہے جو قلت سے کنایہ ہے۔ قوله "حبة" دانہ۔ قوله "خردل" رائی جو ایک قسم کی سرسوں ہے بعض نے حبۃ السوداء یعنی کلونجی پر بھی اطلاق کیا ہے۔ قوله "من کبر" بکسر الکاف وسکون الباء جبکہ باء کا فتحہ بھی جائز ہے بڑھائی کے معنی میں آتا ہے اصطلاح میں دوسروں پر اپنی برتری و بڑھائی جاننے کو کہتے ہیں عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"بناء کبر للکثرة والعظم، یقال کبِر الرجل بکسر العین اذاتکاثرت سِنُوه، و کبُر بضم العین اذاتکاثرت خِصاله والاسم من الاوّل الکِبَر بکسر الفاء وفتح العین، والکِبر بکسر الفاء واسکان العین معظم الشیٔ وهو العظمة" الخ۔

باب ماجاء فی الکبر

[1] الحدیث اخرجه مسلم ص: ۶۵ ج: ۱ "باب تحریم الکبر وبیانه" کتاب الایمان.

تشریح:۔ کبر امراض قلب اور رذائل اخلاق میں سب سے بڑی مہلک بیماری ہے کہ اس سے بہت سی بیماریاں حتی کہ کفر ونفاق جیسے مہلکات جنم لیتے ہیں اس کے ساتھ فضائل اخلاق کا اجتماع نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے کبر میں مبتلاء شخص گویا تمام خوبیوں سے محروم رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کو سخت ناپسند کیا ہے یہاں تک کہ حدیث الباب کے مطابق اس کو جنت سے محرومی کا سببِ قوی قرار دیا ہے کیونکہ متکبر آدمی اللہ کے ساتھ اس کے وصف خاصہ ''تکبر'' میں منازعہ کرتا ہے حدیث شریف میں ہے ''قال اللہ الکبریاء ردائی والعظمة ازاری من نازعنی واحداً منهما قصمته''[۲] یعنی کبریاء میری چادر اور عظمت میرا ازار ہے جو بھی ان میں سے کسی ایک میں مجھ سے جھگڑتا ہے میں اسے نامراد لوٹا دوں گا۔ ابن العربیؒ عارضہ میں فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے مطلب کے بارے میں علماء سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آدمی جو لباس زیب تن کرتا ہے تو اس کا استعمال یا بطورِ خرچ وابتذال کے ہوتا ہے اور یا بطور جمال کے ہوتا ہے، اول کی مثال جیسے جوتے اور دوم کی مثال جیسے چادر، چونکہ کبریاء اللہ کے لئے مخصوص ہیں اس لئے کسی بھی مخلوق کو اس کا دعویٰ جائز نہیں جو آدمی اس کو اپنانے کی کوشش کرے گا وہ نقصان ہی نقصان اٹھائے گا ہاں علم میں چونکہ فائدہ ہے اس لئے وہ حاصل کرنا ممنوع نہیں کہ تکبر ترقی سے مانع اور شانِ عبدیت کے منافی ہے جبکہ علم سے آدمی اپنا صحیح مقام پہچانتا ہے اس لئے ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔

کبر وتکبر اور اسباب:۔ جاننا چاہئے کہ کبر خُلق باطنی کا نام ہے یعنی صفت قلب ہے اور جب اس کا اثر ظاہری اعضاء پر رونما ہونے لگے تو وہ تکبر کہلاتا ہے، کبر کے معنی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنے کے ہیں محض اپنے مقام جاننے کا نام کبر نہیں ہے مثلاً ایک آدمی یہ جانتا ہے کہ میں فلاں مدرسے کا شیخ الحدیث ہوں تو یہ کبر نہیں ہے مگر اس کے ساتھ اگر وہ دوسرے اساتذہ کو کمتر اور حقیر سمجھنے لگے تو بلاشبہ یہ کبر ہے اور جب وہ خود ان سے آگے چلنے اور امتیازی نشست پر بیٹھنے کو اپنا حق سمجھے تو یہ تکبر ہے۔ ہاں اگر اس کی جگہ متعین ہو یا اس لئے اعلیٰ سیٹ پر بیٹھتا ہے کہ دوسرے اساتذہ اس کو پھر وہاں بیٹھنے پر مجبور کریں گے تو یہ نہ کبر ہے اور نہ ہی تکبر۔

کبر وتکبر کا سبب عُجب ہے، عُجب کے معنی خود پسندی کے ہیں یعنی اپنی کسی خوبی پر نازاں ہونا اور اسے اللہ کی طرف سے محض نعمت کے بجائے اپنا کمال سمجھنا عُجب کہلاتا ہے جس کے کئی اسباب ہیں کہ کبھی اپنے علم وعمل یا حسب ونسب اور کبھی جمال وکمال یا نوال وغیرہ کی وجہ سے آدمی متعجب بنتا ہے لہٰذا کہا جائے گا کہ کبر کا سببِ

[۲] رواہ ابوداؤد فی اللباس باب:۲۵، وابن ماجه ابواب الزهد باب:۱۶ بحواله الترغیب والترهیب ص:۳۵۳ ج:۳.

قریب عجب ہے جبکہ اسباب بعیدہ زیادہ ہیں۔

عجب اور کبرانتہائی موذی بیماریاں ہیں اس لئے ہر مؤمن کوان کا علاج کرانا لازمی ہے۔اختصار کے پیش نظر یہاں طریقۂ علاج اور عجب وتکبر کے موذی اثرات کونقل نہیں کیاجاسکتا جس کوتفصیل اوراصلاح درکار ہوتووہ راقم کی کتاب ''نقش قدم کامل'' فصل نمبر۱۲، عجب خود پسندی اور فصل نمبر۱۳ کبروتکبرص ۱۲۳ تاص ۱۳۷یا اخلاقیات کی دوسری کتب جیسے احیاء العلوم للامام غزالیؒ وغیرہ ضرورمطالعہ کریں۔اور چونکہ آج کل یہ امراض بہت عام ہوگئے ہیں اس لئے راقم کا مشورہ ہے کہ ان کے علاج میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ خلاصۂ بہترین علاج خودکودوسروں کی خدمت میں لگانا اور حب وکبر کی بُرائی کوملحوظ رکھنا ہے۔

حدیث باب کا مطلب:۔ بظاہر یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حدیث کے پہلے جزء سے معلوم ہوتا ہے کہ متکبر جنت میں نہیں جائے گا جبکہ آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن دوزخ میں نہیں جائے گا پس اگرکسی مؤمن میں تکبر ہوتواس کا کیا ہوگا؟

اس کا ایک جواب تو پہلے بار ہا گذرا ہے کہ یہ خاصیات المفردات ہیں یعنی تکبر کا اپنا تقاضایہ ہے کہ وہ جنت میں داخلے سے مانع ہے اور ایمان کا ذاتی تقاضایہ ہے کہ وہ دوزخ میں داخلے سے مانع ہے۔تاہم قیامت کے دن فیصلہ مفرداتِ اعمال پرنہیں ہوگا بلکہ مرکب اور مجموعی اعمال پر ہوگا۔

دوسرا جواب:۔ یہ ہے کہ متکبر جنت میں دخول اولی کا مستحق نہیں وہ سابقین کے ساتھ نہیں جائے گا تاوقتیکہ اسے دوزخ کی آگ سے پاک نہ کردیا جائے اور مؤمن دوزخ میں خلود وتحقیر کے لئے داخل نہ ہوگا۔

تیسرا جواب:۔ یہ ہے کہ اس حدیث میں ضابطے کی بات کی گئی ہے مگر جس پر اللہ کا فضل اور خصوصی رحم ہو وہ بلاعذاب پاک کردیا جائے گا، اور صاف ستھرا بنا کر پاکیزہ جنت میں داخل کردیا جائے گا جہاں اس کے ساتھ گناہ کی کسی قسم کی گندگی کا واسطہ نہیں رہے گا اس طرح وہ صاف ستھری جگہ کا اہل بنادیا جائے گا۔''وماذالك على الله بعزيز''[۳] اس طرح وہ ''الطيبات للطيبين''[۴] کا مصداق بن جائے گا۔

دوسری حدیث:۔ باب کی دوسری حدیث پر یہ اضافہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشادفرمایا: توحاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرے کپڑے اچھے ہوں اور میرے جوتے اچھے ہوں (توکیا یہ بھی تکبر میں آتا ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ بھلائی

---

[۳] سورة ابراهيم آيت: ۲۰. [۴] سورة النور آيت: ۲۶.

کو پسند فرماتا ہے مگر متکبر وہ ہے جس نے حق کو ٹھکرادیا اور لوگوں کو حقیر سمجھا۔

لغات:۔قولہ "ذرۃ" خاک کا ذرہ وریزہ، ایٹم وجوہرِ فرد جونا قابل تقسیم ہو، چھوٹی چیونٹیاں، سورج کی شعاع میں نظر آنے والے ذرات۔

قولہ "الجمال" ایک روایت میں ہے" ان اللّٰہ جمیل یحب الجمال "[۵] جمال کا اطلاق ظاہری خوبصورتی پر بھی ہوتا ہے اور خوش خلقی یعنی باطنی حسن سیرت کو بھی کہتے ہیں، اس لئے اوپر ترجمہ بھلائی سے کیا گیا یعنی اللہ اچھے افعال اور کامل صفات سے خود بھی موصوف ہے اور دوسروں میں بھی اچھائی وخوبی کو پسند فرماتا ہے۔

قولہ "لکن الکبر" عبارت بحذف المضاف ہے "ای لکن ذا الکبر" اس لئے ترجمہ متکبر سے کیا گیا ہے۔

قولہ "بطر الحق" رد اور دفع یعنی بدمستی کی وجہ سے ٹھکرانے کو کہتے ہیں۔قولہ "وغمص الناس" ایک روایت میں ہے "الکبر بَطرُ الحق وغمطُ الناس "[۶] غمص اور غمط کے معنی حقیر اور معمولی سمجھنے کے ہیں۔

تشریح:۔امام نوویؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے والے صحابی کا نام مالک بن مرارہ الرہاوی ہے،[۷] سوال کا مقصد واضح ہے کہ اگر دوسروں پر اپنی برتری کے اظہار کے بغیر عمدہ لباس زیب تن کرنا کسی کو پسند ہوتو کیا یہ بھی ممنوع ہے، اور جواب کا مقصد بھی ظاہر ہے کہ فی نفسہ عمدہ لباس پہننا جس میں دوسروں پر فخر کرنا ملحوظ نہ ہو ہرگز تکبر کے زمرے میں شامل نہیں کیونکہ تکبر اس وقت متحقق ہوگا جب دوسروں کو اپنے آپ سے کمتر جانا جائے، اگر یہ ارادہ نہ ہوتو عمدہ لباس یا سواری اسی طرح گھر تعمیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہاں جب آدمی ناز ونعمت اور خرمستیوں میں اس حد تک پہنچ جائے کہ اس کے سامنے نہ دوسرے لوگوں کی کوئی حیثیت باقی رہے یا کم ہوجائے اور نہ حق قابل اتباع سمجھے تو وہ یقیناً متکبر ہے۔اس لئے شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں نقل کیا ہے: "وفی صیام فتح القدیر ان الجمال من الاخلاق الحسنۃ والزینۃ من اخلاق الشیطان"۔اس لئے آدمی کو متوسط حالت اختیار کرلینی چاہئے تاکہ ذلت سے بھی بچے اور تکبر سے بچتا رہے۔

---

[۵] رواہ مسلم فی الایمان ص:۶۵ ج:۱ وابن ماجہ فی ابواب الدعاء بحوالہ المعجم المفہرس ص:۳۷۳ ج:۱، ایضاً مسنداحمد ص:۱۲۰ ج:۵ حدیث: ۱۶۷۵۵، ص:۱۴۹ ج:۵ حدیث:۱۶۹۱۸، ایضاً رواہ الطبرانی فی الاوسط مجمع الزوائد ص:۲۴۵ ج:۸ حدیث:۱۳۶۸۶. حفیظ الرحمن الحنفی

[۶] کذا فی روایۃ مسلم صب۶۵ ج:۱ کتاب الایمان، الترغیب والترہیب ص:۳۵۶ ج:۳.

[۷] النووی علی مسلم حوالہ بالا.

غرض لباس ہو یا اپنا کوئی عمل اس میں اپنی صلاحیت کے مطابق چلنا منع نہیں، ممنوع فقط یہ ہے کہ آدمی اپنی خوبی اس طرح اُجاگر کرنے کی کوشش کرے کہ گویا وہ دوسروں سے برتر ہے اور دوسرے لوگ اس کی نظر میں حقیر لگیں اور اس رویئے کی وجہ سے حق کی اہمیت بھی اس کی نظر سے گر جائے۔

تیسری حدیث:۔ "لایزال الرجل یذھب بنفسه حتی یکتب فی الجبارین فیصیبه مااصابھم"۔ (حسن غریب)

آدمی اپنے آپ کو بڑھاتا چڑھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ مغرور اور سرکش لوگوں میں شامل کردیا جاتا ہے پھر اس کو وہی سزا ملتی ہے جو ان متکبر لوگوں کو پہنچتی ہے۔

لغات وتشریح:۔ قوله "یذھب بنفسه" کلمۂ باء تعدیت کے لئے ہے یعنی خود کو بلندی کی جانب لے جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے زعم میں اپنا مقام عام لوگوں سے بالاتر سمجھتا ہے اور یہی چیز تکبر ہے، پس وہ اپنے زعم کے مطابق اعلیٰ درجے کا مستحق ہے اس لئے کمتر لوگوں کے ساتھ اس کی نشست و برخاست اس کی شانِ عظیم کے منافی ہے۔ بعض حضرات نے باء کو مصاحبت کے لئے لیا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے نفس کا ساتھ دیتا رہتا ہے اور چونکہ نفس تو سرکشی کی جانب میلان رکھتا ہے اس لئے یہ شخص اس راستے پر اس کا ہم سفر بن جاتا ہے اور چلتے چلتے جبارین جیسے فرعون، قارون اور ہامان وغیرہ کا تکبر میں مصاحب بن جاتا ہے پھر نہ نماز پڑھتا ہے اور نہ روزہ رکھتا ہے، بلکہ استکبار عن الحق اس کا مزاج بن جاتا ہے تو دنیا میں بھی حق سے دور ہوجاتا ہے اور آخرت میں بھی اہلِ ایمان کے بجائے قارون اور فرعون وغیرہ کے ساتھ اس کا حشر ہوتا ہے۔ والعیاذ باللہ

چوتھی حدیث:۔ "عن ابیه قال یقولون لی: "فِیَّ التِیهُ" وقدرکبتُ الحمارولبستُ الشملة وقد حلبتُ الشاة وقدقال لی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم :من فعل ھذافلیس فیه من الکبر شئی"۔ (ھذاحدیث حسن غریب)

حضرت جُبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ لوگ میری بابت کہتے ہیں کہ میرے اندر تکبر ہے حالانکہ میں گدھے پر سواری کرتا ہوں اور معمولی شال اوڑھتا ہوں اور بکری خود دوہ لیتا ہوں اور بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جو شخص یہ کام کرے تو اس میں کچھ بھی تکبر نہیں۔

لغات:۔ قوله "التیه" بکسر التاء بمعنی تکبر کے "ای یقولون فی نفسی الکبر"۔ قوله "الشملة" موٹی چادر کو کہتے ہیں۔ یہ کبھی ریشم کی ہوتی ہے اور کبھی اُون کی۔ یہاں اُونی چادر مراد ہے کیونکہ یہ معمولی نوعیت

کی چادر ہوتی ہے۔

تشریح:۔اس تعلیل کا مطلب واضح ہے کہ متکبرین ان امور سے دور رہتے ہیں کہ وہ ان میں عار محسوس کرتے ہیں اس لئے وہ ان کے قریب بھی نہیں جاتے جبکہ ایسا شخص جو ان امور کو اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتا ہو اوران میں عار محسوس نہ کرتا ہو وہ تکبر سے کوسوں دور ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی حسن الخلق

”عن ابی الدرداء ان النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم قال:ماشئیٌ اثقل فی میزان المؤمن یوم القیٰمة من خلق حسن فان اللّٰہ تعالیٰ یبغض الفاحش البَذیَّ“۔(حسن صحیح)[1]

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن مؤمن کی ترازو میں اخلاق حسنہ سے بڑھ کرکوئی چیز زیادہ وزنی نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالی بے ہودہ اورلغوکلام کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے۔

نوٹ:۔”فاحش اور بذی“ کے معنی ”باب ماجاءفی اللعنۃ“ میں گذرے ہیں۔

تشریح:۔باب کی اگلی حدیث میں اس پر یہ بھی اضافہ ہے کہ اچھے اخلاق والا اپنے اخلاق کی وجہ سے پابند صوم وصلوٰۃ کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ابن العربیؒ عارضہ میں اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں”هو معنی صحیح جداًوان لم یصححه تعضده الاحادیث والاصول“یعنی باب کی دوسری حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے قوی نہیں لیکن مضمون کے لحاظ سے قوی ہے۔پھراس حدیث کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص فحش گوئی اور بکواس سے اجتناب کرتا رہتا ہے تو یہ اس شخص کے برابر ہے جو نماز پڑھتا اورروزہ رکھتا ہے مگر بے ہودہ باتوں میں مشغول رہتا ہے۔

اخلاق کیا ہے؟اوراس کا مقام کیا ہے؟ان دونوں سوالوں کا قدرے اجمالی جواب گذشتہ ابواب میں گذرچکا ہے۔الحمدللہ راقم نے”نقش قدم اورنقش اخلاق“میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق حسنہ اللہ کو بہت پسند ہیں اور فحش گوئی اس کو ناپسند ہے

باب ماجاء فی حسن الخلق

[1] الحدیث اخرجه ایضاً ابن حبان، والبزار ورواه ابوداؤد مختصراً بحواله الترغیب والترهیب ص: ۲۷۱ ج:۳۔

اس لئے ترازوئے اعمال میں صاحبِ اخلاق حسنہ کے اخلاق ودیگر اعمال کا بہت زیادہ وزن ہوگا جبکہ بداخلاق اس نعمت سے کلیۃً یا جزوی طور پر محروم ہوگا۔ پھر دوسری حدیث کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھے اخلاق کی وجہ سے آدمی نفلی روزوں اور نمازوں کے پابند شخص جتنا ثواب حاصل کرلیتا ہے یعنی ایک شخص کے اخلاق اچھے نہیں مگروہ قیام وصیام کا بطور نفل زیادہ اہتمام بلکہ التزام کرتا ہے جبکہ یہ صاحب جو اچھے اخلاق کا مالک ہے بغیر اہتمام کے اس کے درجے کے برابر ہے۔

دوسری حدیث:۔ "عن ابی هريرة قال سُئِلَ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن اكثر ما يُدخِلُ الناسَ الجنة قال تقوى الله وحسن الخلق وسئل عن اكثر مايُدخل الناسَ النار قال الفم والفرج"۔ [۲] (حديث صحيح غريب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اسباب کے بارے میں پوچھا گیا جو کثرت سے لوگوں کو جنت میں داخل کرادیتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اللہ کا خوف اور حسن اخلاق ہیں پھر اُن اسباب کے حوالے سے پوچھا گیا جو بکثرت لوگوں کو جہنم میں داخل کرادیتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مُنہ اور شرم گاہ ہیں۔

تشریح:۔ تقوی کے تین درجوں کا تذکرہ ''باب ماجاء فی معاشرۃ الناس'' میں گذرا ہے۔ حدیث پاک میں دخول جنت کو دو چیزوں پر مرتب بلکہ موقوف فرمایا ہے ایک تقوی اور دوم حسن اخلاق۔ کیونکہ تقوی سے آدمی اور اس کے مولیٰ کے مابین تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں، اور اخلاق حسنہ سے لوگوں سے اس کا رویہ کریمانہ وشریفانہ رہتا ہے تو جب حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں کوئی کوتاہی نہیں رہے گی تو آدمی بآسانی جنت میں داخل ہوجائے گا جبکہ اس کے برعکس اگر ان دونوں پہلوؤں سے آدمی کمزور وناقص ہوگا اور منہ وشرم گاہ کی وجہ سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرتا رہے گا تو اس کی نحوست سے جنت سے محروم اور دوزخ کا مستحق ٹھہرے گا۔

"منہ" سے زبان اور حرام خوری دونوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ بدگوئی اور حرام خوری دونوں مہلکات میں سے ہیں اسی طرح شرم گاہ کے غلط استعمال سے آدمی حدِ آدمیت سے نکل کر حدِ بہیمیت بلکہ بسااوقات حدِ شیطانیت میں داخل ہوجاتا ہے۔

یہ بحث کافی لمبی اور موضوع بہت طویل ہے اشارۃً اتنا ہی کافی ہے اگر مزید تفصیل درکار ہو تو دیکھئے راقم

---

[۲] ايضاً رواه ابن حبان فی صحيحه والبيهقی فی الزهد وغيره ،حواله بالا.

کی کتاب ''نقش اخلاق یا نقش قدم کامل'' حصہ دوم ''فصلِ اول زبان کی تباہ کاریوں میں'' اور فصلِ سوم ''ناجائز اور حرام شہوات رانی''۔

تیسری حدیث:۔ ''عن عبداللّٰہ بن المبارك انه وَصَفَ حسن الخلق فقال:هو بسط الوجه وبذل المعروف و كف الاذى''۔

حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ نے خوش اخلاقی کے بارے میں بتایا یعنی اخلاق حسنہ کیا ہیں؟ تو فرمایا چہرے کا کھل جانا اور نیکی و بھلائی کرنا اور تکلیف سے بچانا ہے۔

تشریح:۔ اخلاق کے متعلق روایات میں متعدد الفاظ منقول ہیں: کبھی غصہ نہ کرنے کو اخلاق کہا گیا ہے، کبھی سخاوت کو اور کبھی خندہ روئی وغیرہ کو۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اصل اخلاق نفسانی ملکات کا نام ہے جو کبھی ذاتی ہوتے ہیں جیسے شجاعت، عفت اور حکمت، اور کبھی کسبی ہوتے ہیں جن کو ملکاتِ فاضلہ بھی کہہ سکتے ہیں، یہ جو اعمالِ جوارح ہیں جیسے خرچ کرنا اور خندہ پیشانی سے پیش آنا وغیرہ یہ ان ملکات کے آثار ہیں مگر عوام الناس چونکہ باریکیوں کو نہیں جانتے اس لئے ان کی سہولت کے لئے تعریفات بالرسوم کی گئی ہیں۔

باب ماجاء فی الاحسان والعفو

''عن ابی الاحوص عن ابيه قال قلتُ:يارسول اللّٰه الرجل اَمُرُّ به فلايَقرِينى ولايُضَيِّفُنى فيمربى اَفَاَجزِيه ؟قال:''لا، أَقرِهِ'' قال:ورانى رَثَّ الثياب فقال هل لك من مال؟قال قلتُ :من كل المال قداعطانى اللّٰه من الابل والغنم قال فليُرَ عليك''۔

ابوالاحوص اپنے والد مالک بن عوف بن نضلہؓ سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! میرا گذر ایک آدمی پر ہوتا ہے جو میری مہمان نوازی نہیں کرتا، پھر وہ میرے یہاں سے گذرتا ہے تو کیا میں اس کا بدلہ لے سکتا ہوں (یعنی میزبانی نہ کرکے) فرمایا نہیں تو اس کی مہمانی کرلیا کرو، حضرت مالک بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا کہ میرے کپڑے بوسیدہ اور پرانے ہیں تو فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی مال ہے؟ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اللہ نے مجھے ہر قسم کا مال اونٹ اور بکریاں دی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کا اثر تجھ پر نظر آنا چاہئے۔

لغات:۔ قوله ''الاحسان'' لغوی اعتبار سے خوب صورت بنانے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں جب اس

کے صلہ میں ''الیٰ'' آجائے تو بمعنی سلوک کے اور بغیر ''الیٰ'' کے بمعنی نیکی وخلوص کے آتا ہے۔قولہ "العفو" مٹانے اور درگذر کرنے اور معاف کرنے کو کہتے ہیں۔قولہ "فلا یقرینی و لایضیفنی" دوسرا جملہ پہلے کی تفسیر ہے۔قولہ "أفاجزیه" بفتح الہمزۃ وسکون الیاء ، اجزاء سے ہے بمعنی بدلہ کے۔ قولہ "أقره" بفتح الہمزۃ امر بمعنی اضفه کے یعنی تم اس سے بے مروتی کا بدلہ مت لو بلکہ اس کی مہمان داری کرو۔قولہ "رثّ الثیاب" رَثّ بمعنی بوسیدہ اور پرانے کے۔قولہ "من الابل و الغنم" مال کا بیان ہے۔

تشریح:۔ چونکہ انسانی طبعیت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ کسی بھی کام کا ردعمل دوسرے کے رویئے اور سلوک پر مبنی کر دیتی ہے اچھائی کا جواب اچھائی سے اور برائی کا برائی سے، لیکن اسلام کا اصول یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی اصلاح کرے اور برائی کا بدلہ بھی بھلائی سے دیدے، گو انتقام جائز ہے مگر عفو و درگذر کی بات ہی اور ہے اللہ نے صبر اور معافی پر جو انعامات مقرر کئے ہیں ان کا حصول بدلے کی صورت میں ممکن نہیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مالک بن عوفؓ سے فرمایا کہ اگر کوئی شخص آپ کی مہمان داری نہیں کرتا لیکن جب وہ آپ کے یہاں سے گذر رہا ہو تو آپ ایسا نہ کریں بلکہ اس کا اکرام کرلیا کریں، غرض اگر کوئی شخص آپ کا حق ادا نہیں کرتا تو آپ اس کے حق ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں، ''فان المظلوم لایظلم''۔

اس ارشاد پاک میں ان لوگوں کے لئے بھی بڑا سبق ہے جو عیادت، تعزیت اور ولیمہ وغیرہ تقریبات میں صرف ان لوگوں کا خیال رکھتے ہیں جو ان کو یاد کرتے ہیں اس طرزِ عمل کی اصلاح ضروری ہے۔

اس حدیث میں دوسری بات یہ قابل ذکر ہے کہ آدمی کو اپنے لباس و پوشاک وخوراک میں میانہ روی اختیار کرلینی چاہئے جیسا کہ اسلام کی تعلیمات میں ہر چیز میں اعتدال کو پسند کیا گیا ہے۔لباس کے متعلق قدرے تفصیل تو ''ابواب اللباس'' میں گذری ہے مگر یہاں اتنی بات عرض ہے کہ آدمی کو شہرت کے لباس سے اجتناب کرنا چاہئے جس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ آدمی بہت معمولی لباس پہنے۔ دوسری یہ کہ بہت اعلیٰ لباس زیب تن کردے چونکہ دونوں میں آدمی ایک امتیازی رنگ اختیار کرلیتا ہے اس لئے شہرت اور ریا کا اندیشہ ہے اعلیٰ میں تو ظاہر ہے جبکہ ادنیٰ میں دکھاوے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کو زاہد اور پارسا سمجھتے ہیں اس لئے محققین فرماتے ہیں کہ اپنے ہم نشینوں اور دوستوں کے مساوی لباس اختیار کرلینا چاہئے ہاں جمعہ وعیدین اور خوشیوں کے مواقع اور وفود سے ملتے وقت اعلی کی بھی اجازت ہے۔

حدیث باب سے ادنی کی ناپسندیدگی معلوم ہوئی جبکہ اعلی کی کراہیت دوسری روایات سے معلوم ہوتی

ہے۔مزید تفصیل ان شاء اللہ ''ابواب الزہد'' میں آئے گی اور ''نقش قدم کامل'' میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

دوسری حدیث:۔"عن حذيفة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاتكونوا اِمَّعَةً، تقولون اِن اَحسَنَ الناسُ اَحسَنّا وان ظلموا ظَلَمْنا، ولكن وَطِّنُوا انفسكم اِن احسن الناس اَن تحسنُوا وإن اساؤا افلاتظلموا"۔(حديث حسن غريب)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم ضعیف الرائے (ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملانے والے) مت بنو یعنی یوں مت بولو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ بُرا سلوک کریں گے تو ہم بھی ایسا کریں گے، بلکہ تم اپنے آپ کو اس بات کا خوگر بناؤ کہ اگر لوگ نیک سلوک کریں تو بھی تم اچھا سلوک کرو گے اور اگر وہ بدسلوکی کریں تو بھی تم ان پر ظلم نہ کرو گے۔

لغات:۔قولہ "اِمَّعة" بکسر الہمزۃ وتشدید المیم الِامَّع اخیر میں تاء مبالغہ کے لئے ہے نہ کہ تانیث کے لئے اس لئے اس کا اطلاق مؤنث پر نہیں ہوتا چنانچہ" رحل امعة " کہنا صحیح ہے مگر" امرأة اِمَّعَة "نہیں کہا جاتا۔ اِمَّع وہ آدمی ہے جو ہر ایک سے کہتا ہو کہ میں تیرے ساتھ ہوں اور ظاہر ہے کہ ایسا وہ شخص کرتا ہے جو ضعیف الرائے ہو، اس لئے یہ جس کی بات اور دلیل بھی سنتا ہے تو اس سے متاثر ہو جاتا ہے اس لئے وہ کسی رائے پر قائم نہیں رہ سکتا۔قولہ "تقولون" الخ یہ اس اِمّعۃ کی تفسیر ہے۔قولہ "وَطِّنُوا" توطین یعنی باب تفعیل سے امر کا صیغہ ہے بمعنی مانوس کرنے اور آمادہ کرنے کے ہے۔باب افعال سے بھی یہی معنی آتے ہیں، "یقال اوطن نفسه على كذا" یا "وَطَّن نفسه على كذا" یعنی اپنے آپ کو کسی کام کا عادی وخوگر بنانا۔

تشریح:۔اس حدیث کا مطلب تقریباً وہی ہے جو باب کی پہلی حدیث کا ہے کہ نیکی کو کسی آدمی کے عمل سے منسلک نہیں کرنا چاہئے کیونکہ نیکی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے والے عمل کو کہتے ہیں لہٰذا اس میں لوگوں سے طمع وامید نہیں رکھنی چاہئے گو اس کے ثمرات دنیا میں بھی مل سکتے ہیں کہ ہر نیکی پر برکات کا ترتب ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اس میں لوگوں سے معاوضہ کی توقع رکھے کہ اگر کچھ ملنے کی امید ہو یا کچھ ملا ہو تو بطور طمع یا بطور عوض نیکی کرے گا اور جو جگہ دنیوی فائدے سے خالی ہو تو وہاں نیکی واچھائی نہیں کرے گا خاص کر جبکہ دوسری طرف سے بُرائی کا سلوک ہو جائے۔غرض آدمی کو نیکی واحسان کا دامن ہرگز نہیں چھوڑنا چاہئے خواہ کوئی کیسا بھی ہو، نیکی ہر جگہ مطلوب ہے چاہے وہ اچھی جگہ ہو یا بُری جگہ۔تدبر

باب ماجاء فی زیارة الاِخوان

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :من عادمریضاًاوزاراَخاًله فی الله ناداه مُنادٍ اَن طِبْتَ وطاب ممشاكَ وَتبَوَّأتَ من الجنة منزلاً"۔[۱] هذاحدیث غریب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جس شخص نے کسی بیمار کی عیادت کی یا اپنے اسلامی بھائی کی زیارت کی تو ایک فرشتہ (منادی) اسے آواز دیتا ہے کہ خوش رہو اور تیرا چلنا بھی بہت خوب ہے اور تو نے (اس عمل سے) جنت میں گھر بنالیا۔

لغات:۔قوله "الاخوان" اَخٌ کی جمع ہے اگر بھائی بندی نسبی وخونی ہو تو اس کی جمع اِخوۃٌ آتی ہے اور اگر دوستانہ تعلق کی بناء پر ہو تو اس کی جمع اخوان آتی ہے چنانچہ کہاوت مشہور ہے"اِخوان الوِداد اقرب من اِخوة الوِلاد" دوستی کے بھائی، نسبی بھائیوں سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

قوله "اخاله فی الله" اگر "فی الله" کاتعلق اَخاً کے ساتھ ہو جیسا کہ اوپر ترجمہ اسی پر مبنی ہے تو اس کے ساتھ یہ قید ملحوظ رہے گی کہ یہ عیادت اور زیارت دونوں ثواب کی نیت سے ہوں کہ "انماالاعمال بالنیات"[۲] تاہم اس پر یہ اشکال نہیں ہونا چاہئے کہ اَخاً تو فعل یا شبہ فعل نہیں تو اس کے ساتھ جار کا تعلق کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ کیونکہ جار کے تعلق کے لئے فعل کی خوشبو اور شائبہ بھی کافی ہے جیسے"وهم یدعلی من سواهم"اس میں ید بمعنی قوة کے ہے لہٰذا یہاں بھی "اَخ" کے اندر اُخوة کے معنی پائے جاتے ہیں جو تعلق کے لئے کافی ہیں اور اگر "فی الله" کاتعلق "زار" فعل کے ساتھ ہو تو پھر کوئی اشکال نہیں ہے۔قوله "منادِ" اس منادی اور پکارنے والے سے مراد فرشتہ ہے۔قوله "ممشاك" مصدر میمی کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے اور ظرف زمان یا مکان کا بھی۔یعنی تیرے

باب ماجاء فی زیارة الاخوان

[۱] ایضاً رواه ابن ماجه ص: ۱۰۴ "باب ماجاء فی ثواب من عاد مریضاً" ابواب الجنائز، ایضاً رواه ابن حبان فی صحیحه الترغیب والترهیب ص:۲۴۷ ج:۳۔ [۲] رواه البخاری ص:۲ ج:۱ "باب کیف کان بدؤ الوحی الخ"، ایضاً کتاب الایمان باب: ۴۱، نکاح باب :۵، طلاق باب: ۱۱، مناقب الانصار باب:۴۵، عتق باب:۶، ایمان باب:۲۳، حیل باب: ۱،ومسلم ص: ۱۴۰ ج:۲ باب قوله ﷺ انما الاعمال بالنیة الخ کتاب الامارة، وابوداؤدص:۳۰۷ ج:۲ کتاب الطلاق، ایضاً رواه النسائی فی الطهارة، وابن ماجه ص: ۳۱۱ "باب النیة" ابواب الزهد، مسنداحمد ص:۴۳ ج:۱ حدیث: ۱۶۹ . حفیظ الرحمن الحنفی غفرله ولوالدیه ولاساتذته

چلنے کا یہ وقت اور یہ راستہ بہت مبارک ہے کیونکہ یہ جنت کی طرف جاتا ہے۔قولہ "وَتَبَوَّأْتَ من الجنة منزلاً" تبوّ أ بالمکان کے معنی جگہ بنانے اور لینے کے ہیں۔ من الجنۃ ای من منازل الجنۃ جبکہ منزلاً میں تنوین تعظیم کے لئے ہے یعنی تم نے اپنے اس عمل کی وجہ سے جنت کی منازل میں سے ایک عظیم گھر بنالیا۔

تشریح:۔اس حدیث مبارکہ سے ان دونوں عملوں یعنی مریض کی عیادت اور دوستوں کی زیارت کی بڑی فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ ایسے اعمال ہیں کہ ان کی بدولت آدمی فرشتوں کی دعاء کا مستحق ہوجاتا ہے۔اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ اس شخص کی دنیاوی واخروی فلاح ونجات اور کامیابی کے لئے دعاگو رہتا ہے اور اس یقین سے کہتا ہے کہ بجائے انشاء کے اخبار کا صیغہ استعمال کرتا ہے کہ گویا یہ آدمی کامیاب ہو ہی گیا۔

تاہم ''فی اللہ'' کی قید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت ان دوستانہ تعلقات والوں کو ملتی ہے جن کا تعلق اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہو اور ظاہر ہے کہ ایسا تعلق نیک لوگوں سے ہی ہوسکتا ہے، چور اور ڈاکوؤں کے ناجائز تعلقات کو یہ فضیلت بظاہر حاصل نہیں ہے کیونکہ اگر چور اپنے چور ساتھی کی عیادت اس لئے کرتا ہے کہ معلوم ہو کہ وہ میرے ساتھ چوری کرنے کی غرض سے جانے کے لئے کب تیار ہوسکے گا تو یہ کوئی ثواب کی نیت یا کام نہیں ہے۔واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

باب ماجاء فی الحیاء

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :الحيآء من الايمان والايمان فى الجنة والبذآء من الجفاء والجفاء فى النار"۔(حسن صحيح)[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا ہے کہ: حیاء ایمان کا جزء ہے اور ایمان جنت میں لے جانے والا ہے اور بے ہودگی سنگ دلی میں سے ہے اور بے رحمی (سنگ دلی) جہنم میں لے جانے والی (خصلت) ہے۔

لغات:۔قولہ "الحیآء" بالمد لغت میں وقار اور سنجیدگی کو کہتے ہیں جبکہ اصطلاح میں ایک ایسی کیفیت اور ملکہ کا نام ہے جس کی بدولت انسان خیر اور بھلائی کی طرف اقدام کرتا ہے اور مذمت کے خوف سے شر وقبیح سے

باب ماجاء فی الحیاء

[1] الحديث اخرجه احمد ورجاله الصحيح، وابن حبان فی صحيحه الترغيب ص:٣٦٨ ج:٣.

اجتناب کرتا ہے یہ وقاحت (لاپرواہی اور غلط کام کی جرأت) اور تخجل (ہر کام کرتے ہوئے شرمندہ ہونے) کے درمیان درجۂ اوسط سے عبارت ہے۔ قولہ "الجفاء" ستم اور بے مروتی کو کہتے ہیں جو وفاداری اور رحم کے مقابل آتا ہے۔

تشریح:۔ اس ارشاد پاک میں حیاء کو جزء ایمان قرار دیا گیا ہے اس طرح بعض دوسری احادیث بھی اس مضمون پر ناطق ہیں۔ جن حضرات کے نزدیک ایمان مرکب ہے ان کے یہاں تو اس کی کسی تاویل کی ضرورت نہیں، مگر حنفیہ اور جمہور متکلمین کے ہاں چونکہ ایمان بسیط ہے اس کے اجزاء نہیں ہیں اس لئے وہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ حیاء ایمان کے ایسے مقتضیات میں سے ہے جیسے لازم اپنے ملزوم کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ دونوں میں نسبت تلازم کی ہے جو ایک دوسرے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے۔

باب کی حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدمی حیاء کی بناء پر جنتی بن جاتا ہے اس کی وجہ بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتی ہے کہ "الحیاء لایأتی اِلّا بخیر" [۲] یعنی حیاء خیر کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں دیتی تو ظاہر ہے کہ جب یہ خیر ہی خیر ہے تو اس کا انجام بھی جنت تک رسائی ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس بذاء یعنی بے حیائی کے کام اور باتیں حیاء کی نقیض ہیں تو ان کا انجام دوزخ میں دھکیلنا ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ جو حیاء مشروع وممدوح ہے اس سے مراد وہ خُلق ہے جو ان امور سے روکے جو شرعاً معیوب ہیں جیسے زنا، غنا اور دیگر اعمالِ بد۔ جہاں تک امور شرعیہ میں شرم کرنے کا تعلق ہے تو وہ شرعی حیاء نہیں بلکہ شرعاً وہ عیب ہے اگرچہ عرفاً وہ حیاء ہی کہلاتا ہے۔

باب ماجاءَ فی التَّأَنِّی والعَجَلَة

"عن عبداللّٰہ بن سرجِس المُزنی ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: السمتُ الحَسَنُ والتُّؤَدَةُ والاقتصادجزء من اربعة وعشرین جزءً من النبوة"۔

حضرت عبداللہ بن سرجس مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھی عادت اور وقار اور میانہ روی نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

---

[۲] صحیح بخاری ص:۹۰۳ ج:۲ "باب فی الحیاء" کتاب الادب، صحیح مسلم ص:۴۸ ج:۱ "باب بیان عدد شعب الایمان وفضلها الخ" کتاب الایمان.

لغات:۔قولہ "التَّأَنِّی" بفتح الہمزۃ وتشدید النون جلدی کرنے کے مدمقابل آتا ہے۔قولہ "العَجَلَۃُ" عین، جیم اور لام تینوں مفتوح ہیں بمعنی جلدی وسُرعت کے ہے گویا ترجمۃ الباب کے دونوں الفاظ ایک دوسرے کی نقیضین ہیں۔قولہ "السمتُ" اس کے معنی خصلت اور عادت کے ہیں لہٰذا سمت حسن کا مطلب اچھی عادت وخوبی ہے۔قولہ "والتُّؤدَۃُ" بضم التاء وفتح الہمزۃ وفتح الدال المخففۃ یہ اسی تأنی کے معنی میں ہے یعنی عجلت کے مقابلے میں آتا ہے جس کا مطلب وقار وسکون اور سلیقے سے کام کرنا ہے۔قولہ "الاقتصاد" بمعنی اعتدال کے یعنی افراط وتفریط کے درمیان درجۂ اوسط کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔اس ارشادِ پاک میں اچھی عادت، آرام وسکون اور میانہ روی کو نبوت کا چوبیسواں حصہ قرار دیا گیا جس سے ان امور کا عمدہ ہونا نمایاں طور پر ظاہر ہوجاتا ہے۔مگر سوال یہ ہے کہ اسے نبوت کا چوبیسواں حصہ کس اعتبار سے کہا گیا ہے؟ جبکہ بعض روایات میں پچیسویں جزء ہونے کا بھی ذکر ہے۔[1]

اس کا جواب یہ ہے کہ نبوت ایک وہبی نعمت ہے اس کے حصول میں کسی طرح انسانی کسب واکتساب دخیل نہیں، تاہم نبوت ہر شخص کو بھی نہیں ملتی، یہ نعمتِ عظمیٰ اس انسان ہی کو مل سکتی ہے جو انسانی اعلیٰ کمالات اور خوبیوں کا مالک ہو۔یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی بعثت عموماً ان اقالیم واراضی وخطوں میں بکثرت ہوئی ہے جہاں کی آب وہوا معتدل ہے۔وہ چوتھی اقلیم کا درمیانی حصہ ہے جو شام کے آس پاس ممالک پر مشتمل ہے۔چونکہ آب وہوا اور اعتدالِ مواسم کا انسانی اخلاق پر ایک اچھا اثر ہوتا ہے اس لئے وہاں کے لوگوں میں اعتدال پایا جاتا ہے اور اسی کی بدولت وہاں اولیاء وعلماء اور اتقیاء بکثرت پیدا ہوتے ہیں جیسے وہاں کا زیتون لاثانی ہے ایسا ہی وہاں کے لوگوں کا مزاج بھی انتہائی معتدل ہے، جب ان پر وحی نازل ہوجاتی ہے تو نور علی نور کا مصداق بن جاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ دینِ فطرت ان علاقوں میں زیادہ جلد نافذ اور مقبول عام بن جاتا ہے جہاں اعتدالِ مواسم پایا جاتا ہو جس کی تفصیل مقدمۂ ابن خلدون میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بہر حال انبیاء کمالات اور انسانی خوبیوں اور ملکات کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں ان ملکات میں سے تین وہ بھی ہیں جن کا ذکر حدیث بالا میں آیا ہے۔اگر کسی میں یہ اوصاف اعلیٰ پیمانے پر ہوں تو اس میں گویا

باب ماجاء فی التانی والعجلۃ

[1] ایک روایت میں پچیسویں جز ہونے کا ذکر ہے کمافی ابی داؤد ص: ۳۱۱ ج: ۲ "باب فی الحلم واخلاق النبی ﷺ" اول کتاب الادب، ایک روایت میں ۴۷ویں اور ایک رویت میں ۷۰ویں جزء ہونے کا ذکر ہے، کذا فی مجمع الزوائد ص: ۱۱۳ ج: ۸، حدیث: ۱۳۱۱۷۔

چوبیسواں حصہ آ گیا اور جس میں نسبۃً کم درجے کے ہوں تو اس میں گویا نبوت کا پچیسواں حصہ پایا جاتا ہے، لیکن جزء کے تحقق سے کل کا تحقق لازم نہیں آتا، اس لئے ایسا شخص انبیاء کے راستہ پر گامزن تو ہے مگر وحی کا مستحق نہیں کیونکہ وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ تدبر، اس کی مزید تحقیق ابواب الرؤیا میں آئے گی۔

دوسری حدیث:۔ "عن ابن عباس ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: لِاَشجِّ عبدالقیس اِنَّ فیك خصلتین یحبھما اللّٰہ الحِلمُ والاِ ناءۃُ"۔ [۲]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبدالقیس سے فرمایا کہ بے شک تیرے اندر دو ایسی خوبیاں ہیں جن کو اللہ پسند فرماتا ہے، وہ بردباری اور اطمینان ہیں۔

لغات:۔ قولہ "الحلم" بردباری اور عقلمندی کو کہتے ہیں۔ قولہ "الإناءۃ" بکسر الھمزۃ یہ وہی تأنّی اور تودۃ کے معنی میں ہے یعنی اطمینان وسکون سے کام سرانجام دینا۔ پھر الحلم والاناءۃ کے اعراب میں دو احتمال ہیں۔ دونوں بنا بر بدلیت از خصلتین منصوب بھی ہو سکتے ہیں۔ اور خبر المبتدأ المحذوف بھی ہو سکتے ہیں۔ "ای ھما الحِلمُ والاناءۃُ۔

تشریح:۔ اشج عبدالقیس عبارت اضافت کے ساتھ ہے۔ حاشیہ میں ایک احتمال بدلیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس صورت میں مضاف مقدر ہوگا "ای وافد عبدالقیس"۔ ان کا نام منذر بن عائذ بن المنذر العصری تھا۔ ان کا بڑا قبیلہ ربیعہ تھا مگر عبدالقیس شاید ربیعہ کی شاخ ہے۔ اشج کے معنی سر کے زخم کے ہیں۔ اور عَصَری قبیلے کی طرف نسبت ہے۔

اس وفد کی آمد کا مختصر پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ:۔ ان کا ایک آدمی منقذ بن حیان تجارت کے لئے مدینہ طیبہ آتا رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد حسبِ معمول مدینہ طیبہ میں آیا ہوا تھا اور اپنا سامان فروخت کر رہا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف تشریف لائے تو یہ آپ کو ملا۔ آپ نے اس کا حال پوچھا اور اس قبیلے کے بڑے بڑے اشراف کا نام لے کر احوال پوچھا تو اس سے منقذ کو بہت تعجب ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۂ فاتحہ اور سورۂ علق کا سبق لیا۔ اور وطن واپس آ گیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرفاءِ قبیلہ کی طرف ایک خط بھی لکھوا دیا تھا۔ منقذ نے اپنے قبیلے میں آ کر ابتداءً اپنے اسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو مخفی رکھا۔ اور گھر میں نمازیں پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی قبیلے کے

---

[۲] الحدیث اخرجہ مسلم ص: ۳۵ ج: ۱ "باب الامر بالایمان باللّٰہ تعالٰی" کتاب الایمان.

سردار منذر بن عائذ کی بیٹی تھی۔ بیٹی نے اپنے شوہر کی نماز کا تذکرہ اپنے والد منذر کے سامنے کیا کہ وہ جب سے مدینہ سے واپس آیا ہے۔ اس طرح مُنہ دھوتا ہے۔ اور کبھی کھڑا ہو جاتا ہے اور کبھی بیٹھ جاتا ہے۔ اور کبھی ماتھا زمین پر ٹیک دیتا ہے۔ غرض یہ کہ ہیئتِ صلوٰۃ کو نقل کیا۔ منذر نے اپنے داماد منقذ سے پوچھا کہ تم یہ کیا کرتے ہو؟ اس نے اپنے اسلام لانے کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ منذر کے دل میں اسلام کی محبت آ گئی۔ اور خط بھی اس کو دکھلایا گیا۔ اس نے قبیلے کے لوگوں کو حالات سنائے۔ اور خط پڑھ کر سُنایا۔ سب اسلام لانے کے لئے تیار ہو گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد مدینہ طیبہ بھیجنا چاہئے۔ چنانچہ رئیس قبیلہ منذر (عبدالقیس) کی قیادت میں ایک وفد تشکیل دے دیا گیا۔ چنانچہ وہ وفد مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی تعلیمات حاصل کیں۔

ابن ماجہ (باب الحلم ص ۳۰۸) پر ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد سے پہلے ہی اس کی پیشینگوئی فرما دی تھی۔ چنانچہ جب یہ لوگ آ گئے تو بے تابانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فوراً حاضر ہوئے۔ جبکہ اشج عَصَری (عبدالقیس) پہلے اپنی منزل پر گئے۔ سواری بٹھا دی۔ اور کپڑے تبدیل کر کے تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یا اشج! ان فیك لخصلتین یحبهما الله الحلم والتودة، قال یارسول الله! اَشئ جُبِلتُ علیه ام شئ حَدَثَ لی؟ قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: بل شئی جُبلتَ علیه"۔

ایک روایت میں "تؤدۃ" کے بجائے "حیاء" کا لفظ ہے۔ (ابن ماجہ ص ۳۰۹)

چونکہ حیاء اناءۃ پر آمادہ کرتی ہے اس لئے یہ تعبیر بھی صحیح ہے۔

تیسری حدیث:۔ "الاَناءۃ من الله والعجلة من الشیطان"۔ (حدیث غریب) [۳]

تأمل اور سنجیدگی اللہ کی طرف سے ہے اور جلدی کرنا شیطان کی جانب سے ہے۔

تشریح:۔ جب آدمی کسی کام کو سوچ سمجھ کر تأمل کے ساتھ انجام دیتا ہے تو اسے اس کے گرد و پیش اور عواقب میں غور کرنے کا موقعہ ملتا ہے جبکہ بلا تأمل اور بلا سوچے سمجھے کام کرنا بدانجامی کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

---

[۳] وفی روایة: التانی من الله والعجلة من الشیطان الخ، رواہ ابویعلیٰ ورواته رواة الصحیح، الترغیب والترهیب ص: ۲۸۰ ج: ۳، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۱۱ ج: ۸ حدیث: ۱۲۶۵۲۔

اس لئے اول مستحسن ہوا۔ اور دوم مذموم۔ اور ضابطہ ہے کہ اچھے کاموں کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے اور بُرے اور غلط کاموں کی نسبت شیطان کی جانب۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس حدیث سے وہ امور مستثنیٰ ہیں جن کا انجام بہر حال اچھا ہی ہو جیسے نماز اور دیگر امور شرعیہ جن کے کرنے کا حکم ہے لہٰذا ان میں جلدی کرنا معیوب نہیں کیونکہ اللہ نے خیر و بھلائی کی طرف مسارعت کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور ایسے لوگوں کو پسند بھی فرمایا ہے۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ عجلت اور سرعت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں عجلت قبل از وقت کام کرنے کو کہتے ہیں جبکہ سرعت اپنے وقت پر کام جلدی نمٹانے کو کہتے ہیں۔ اللہ نے سرعت کی مدح تو فرمائی ہے مگر عجلت کی نہیں لہٰذا استثنیٰ کی ضرورت باقی نہ رہی۔

باب ماجاء فی الرفق

"عن ابی الدرداء عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: من اُعطِیَ حَظَّہ من الرفق فقد اُعطِی حظّہ من الخیر ومن حُرم حظہ من الرفق فقد حُرم حظّہ من الخیر"۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو نرمی میں سے اس کا نصیب ملا تو اسے خیر میں سے اس کا حصہ ملا۔ اور جس شخص کو نرمی میں سے اس کے نصیب سے محروم کر دیا گیا تو خیر میں سے اس کا حصہ ختم کر دیا گیا۔

لغات:۔ قولہ "من اُعطی اور من حُرم" مجہول کے صیغے ہیں ان میں ضمیر مستتر "من موصولہ" کی طرف عائد نائب فاعل ہیں اور "حظہ" منصوب مفعول ثانی ہیں۔

تشریح:۔ ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ نرمی خیر کا حصہ ہے جس نیک بخت کو جتنی نرمی نصیب ہوگی اسی تناسب سے خیر و بھلائی اس کی متاع ہوگی۔ اور جس قدر نرم خوئی میں کمی ہوگی اسی تناسب سے خیر سے محرومی ہوگی۔ لہٰذا خیر و بھلائی کا دار و مدار نرم خوئی پر ہوا۔ اب جو شخص جتنا چاہے اپنے لئے خیر بڑھا سکتا ہے۔

اس مضمون کی متعدد احادیث اور بھی وارد ہوئی ہیں جس سے نرم خوئی کی قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے کہ عند الشارع اس کا کتنا بڑا مقام ہے۔ [1]

باب ماجاء فی الرفق

[1] راجع للاحادیث مجمع الزوائد ص: ۱۲ تا ۱۲ ج: ۸، ایضاً الترغیب والترهیب ص: ۲۷۸ تا ۲۸۲ ج: ۳۔

تاہم یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہاں سختی مطلوب ہو وہاں نرمی کرنا ممدوح ومحمود نہیں ہے مثلاً جہاں حکومت کو قوت تنفیذ کی ضرورت ہو اور وہاں ایک اہل کار کسی مجرم کے ساتھ نرمی کرتا ہے تو اس سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔اسی طرح ایک طالب علم پڑھتا نہیں تو مدرسے کی انتظامیہ کے لئے اس کے ساتھ سختی کرنا ہی اس کے لئے مفید ہے۔ایک اچھا باپ وہی ہوتا ہے جو اپنے بچوں کی پرورش میں موقع ومحل کا بھرپور خیال رکھے کہ کس جگہ نرمی اچھی ہے اور کس وقت سختی۔شوہر، واعظ، مفتی اور قاضی کے لئے بھی یہی ضابطہ ہے۔البتہ سختی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے ڈھنگی سختی کرے بلکہ جہاں سختی کا اظہار ضروری ہو تو اس میں نرمی ومہربانی کا عنصر ضرور شامل ہونا چاہئے اور وہ کام اس خوبی سے سرانجام دینا لازمی ہے کہ اس سختی کا فائدہ جلدی نمایاں ہوجائے، تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ سختی درحقیقت مہربانی اور نرمی ہی تھی مگر صورتاً یہ سختی لگ رہی تھی۔تدبر

باب ماجاء فی دعوة المظلوم

"عن ابن عباس ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بَعَثَ معاذاً الی الیمن فقال: اِتَّقِ دعوة المظلوم فانہ لیس بینھا وبین اللّٰہ حجاب"۔(حسن صحیح)[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ ستم زدہ کی بددعا سے بچنا کیونکہ اس کی دعا اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ (مانع) نہیں ہوتا ہے۔

تشریح:۔مظلوم کی بددعاء سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرنا چاہئے کیونکہ ظلم کرکے آدمی بددعاء سے نہیں بچ سکتا۔اس لئے یہاں لازم کی نفی سے ملزوم کی نفی مراد ہے۔یہ حدیث ابواب الزکاۃ کے شروع میں بھی گذری ہے جو ایک طویل حدیث کا حصہ ہے۔(دیکھئے تشریحات ترمذی، ج ۳ من ص ۴۰ الی ص ۴۷) یہاں حجاب سے مراد مانع ہے، یعنی اس بددعا کے اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے سے کوئی رُکاوٹ نہیں بلکہ وہ

باب ماجاء فی دعوة المظلوم

[1] اخرجہ البخاری فی الجھاد باب: ۱۸۰، وفی الزکاۃ باب: ۶۳، وفی مظالم باب: ۹، ومغازی باب: ۶۰، ومسلم فی الایمان حدیث: ۲۹، ابوداؤد زکاۃ باب: ۵، ابن ماجہ ابواب الزکوٰۃ باب: ۱، سنن دارمی زکاۃ باب: ۱ ومسنداحمد ص: ۳ ج: ۱ حدیث: ۲۰۷۲۔

ضرور پیش ہوتی ہے۔ حافظ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ مظلوم خواہ ایسا کیوں نہ ہو جس کی دعا قبول نہیں کی جاتی، مثلاً اس کا کھانا حرام ہو لیکن مظلومیت کی صورت میں اس کی بددعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ پھر مسند احمد [۲] میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اگرچہ یہ مظلوم کافر کیوں نہ ہو۔ تاہم حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کافر اور فاسق کی دعا قبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا وقتی مطلوب حاصل ہوگا، اصلی مقصود کا حصول مراد نہیں جو خالق کی طرف سے داعی کا اکرام اور رضا ہے۔

بہرحال حجاب سے مراد مانع ہے۔ اور یہ کنایہ ہے سرعتِ قبولیت سے۔ اس حجاب سے مراد پوشیدہ ہونا نہیں اور نہ ہی اس کا مفہومِ مخالف معتبر ہے، کیونکہ اللہ عزّ وجل سے کوئی شے محجوب نہیں۔

ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب کسی شے کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان حجاب ہے تو مطلب منع اور حرمان ہوتا ہے کہ وہ محروم ہے۔

باب ماجاء فی خُلق النبی صلی اللہ علیہ وسلم

"عن انس قال خدمت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عشر سنین فما قال لی "اُفٍ" قطُّ وما قال لشیءٍ صنعتُه لِمَ صنعتَه؟ ولا لشیءٍ ترکتُه لِمَ ترکتَه؟ وکان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من احسن الناس خُلُقاً وما مَسِستُ خزاً قطُّ ولا حریراً ولا شیئاً کان اَلیَنَ من کف رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، ولا شَمَمتُ مِسکاً قطُّ ولا عِطراً کان اطیب من عَرَق رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم"۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی مجھے اُف کا لفظ نہیں بولا ہے، اور نہ کسی کام کے بارے میں جو میں نے کیا ہو (اور وہ کرنا نہیں چاہئے تھا) فرمایا ہے ایسا کیوں کیا؟ اور نہ ہی فرمایا ہے کسی ایسے کام کے متعلق جو میں نے نہیں کیا ہو (اور وہ کرنا چاہئے تھا) ایسا کیوں نہیں کیا؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ میں نے کسی نرم کپڑے کو ہرگز نہیں چھوا اور نہ ریشم کو اور نہ ہی کسی اور چیز کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک سے زیادہ نرم ہو۔ اور میں نے نہیں سونگھا مُشک کو کبھی۔ اور نہ ہی عطر کو

---

[۲] مسند احمد ص: ۲۲۳ ج: ۳ حدیث: ۱۲۱۴۰۔ الحنفی عفی عنه.

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے سے زیادہ خوشبودار ہو۔

لغات: ۔قولہ "اُفٍّ" بضم الھمزۃ و کسر الفاء المشددۃ المنونۃ، اس میں دیگر لغات بھی ہیں۔اصل میں ناخن کی میل کو کہتے ہیں، پھر ہر قابل نفرت چیز کے لئے استعمال ہونے لگا، اور اسی میں اب مشہور ہے۔قولہ "خزاً" اُون اور ریشم ملا کر اس سے بنایا جاتا ہے جو بہت نرم کپڑا ہوتا ہے۔

تشریح: ۔حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ تشریف لائے تو کچھ عرصہ کے بعد جس کی مدت زیادہ سے زیادہ چند ماہ ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ان کو لے کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور کہنے لگیں اے اللہ کے رسول! انس سنجیدہ بچہ ہے یہ آپ کی خدمت کیا کرے گا گویا ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا، اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مسلسل پوری حیات نبوی یعنی تقریباً دس سال تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حضر اور سفر میں سرانجام دی۔

باب کی حدیث میں جن امور کا ذکر ہے کہ جو کام کئے جانے کے تھے ان میں سے اگر کوئی کام رہ جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں کیا۔اور جو امور ایسے ہوتے ہیں جن کو نہیں کرنا چاہئے اگر ایسا کوئی کام مجھ سے سرزد ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ کیوں کیا؟ تو ان سے آداب اور معاشرت کے وہ امور مراد ہیں جن کا تعلق ذاتی ضروریات یا گھریلو معاملات سے ہو امور شرعیہ مراد نہیں کیونکہ ان میں کمی بیشی اور کوتاہی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً تنبیہ فرماتے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت [1] میں ہے کہ حرمات اللہ کی بے حرمتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غضب ناک کر دیتی۔(چونکہ یہ غصہ بھی خالصتاً لوجہ اللہ ہوتا تھا اس لئے) اس غصہ کی کوئی بھی تاب نہ لاسکتا تھا۔

بہر حال حدیث باب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معالی اخلاق کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ کس قدر درگذر اور عفو کے مالک تھے، ورنہ دس سال کے عرصے میں خادم سے اور خصوصاً کم عمر والے سے کوئی نہ کوئی کوتاہی ضرور ہو جاتی ہے۔اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذاتی سہولیات اور دنیوی امور میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ورنہ دلچسپی کے امور کے بگڑ جانے کی صورت میں یقیناً غصہ آتا ہے، اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لئے کسی طرح دباؤ کسی پر نہ ڈالتے اور نہ ذاتی معاملات میں کسی سے انتقام

باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ

[1] کذا فی صحیح مسلم ص: ۲۵٦ ج: ۲ کتاب الفضائل.

لیتے۔ چنانچہ مسلم شریف [۲] کی ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا بجز جہاد فی سبیل اللہ کے، اس میں کفار کو مارنا اور قتل کرنا ثابت ہے ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خادم یا کسی عورت (امہات المؤمنین میں سے کسی) کو نہیں مارا۔ ان میں سے کسی سے خطا ولغزش بھی ہوتی تو اس کا انتقام نہیں لیا، بجز اس کے کہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کی ہو تو اس پر شرعی سزا جاری فرمائی۔

باب کی حدیث سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بھی بڑی منقبت معلوم ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی ان پر ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ دوسری روایات سے ان کے لئے مال واولاد اور عمر کی دعا ثابت ہے جو قبول بھی ہوئی۔ [۳]

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ مبارک ہر خوشبو سے زیادہ خوشبودار تھا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عطر اور مشک وغیرہ کی خوشبو کیوں استعمال فرماتے؟ اس کے جواب میں حضرت گنگوہی صاحب رحمہ اللہ نے الکوکب میں متعدد توجیہات پیش فرمائی ہیں: مثلاً خوشبو اللہ کی نعمت ہے اسے استعمال کی غرض سے لگانا یا سنن انبیاء ہونے کی وجہ سے ان کی متابعت وموافقت کرنا یا ان اوقات میں لگانا جن میں پسینہ نہیں آتا جیسے سردی کے موسم میں۔ مگر زیادہ مناسب توجیہ یہ ہے کہ آدمی کو جس بُو سے مسلسل واسطہ رہے تو وہ آدمی کو محسوس نہیں ہوتی ہے جیسا کہ مشاہدہ وتجربہ ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خوشبو استعمال کرنا کوئی تحصیل حاصل یا تحصیل ادنیٰ کے زمرے میں نہیں آتا۔ تدبر

دوسری حدیث:۔ "عن ابی اسحٰق قال سمعت اباعبداللّٰه الجدلی یقول سألتُ عائشة عن خلق رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، فقالت: لم یکن فاحشاً ولا متفحشاً ولا صخّاباً فی الاسواق ولا یجزی بالسیئة السیئة ولکن یعفو ویصفح"۔ (حدیث حسن صحیح)

ابواسحٰق فرماتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ جدلی سے یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ غیر ارادی طور پر بدگوئی کرتے اور نہ ہی ارادۃً فرماتے، اور نہ بازاروں میں چیخنے والے تھے اور آپ صلی

---

[۲] صحیح مسلم حوالہ بالا۔

[۳] کذا فی صحیح مسلم ص: ۲۹۸ ج: ۲ "باب من فضائل انس بن مالک" کتاب الفضائل۔

اللہ علیہ وسلم بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہ دیتے بلکہ معاف فرماتے اور درگذر فرماتے تھے۔

لغات:۔ ''فاحش اور متفحش'' کے معنی ''باب ماجاء فی الفحش'' میں گذرے ہیں۔ جبکہ ''صخاب'' خاء کی تشدید کے ساتھ صیاخ اور چیخنے چلانے والے کو کہتے ہیں۔ بظاہر یہ صیغہ مبالغے کا معلوم ہوتا ہے اس طرح پھر زیادہ چیخنے کی نفی ہوگی، نہ کہ نفس چلانے کی۔ لیکن یاد رہے کہ ایسے بہت سے صیغے ہیں جن کا وزن بظاہر مبالغے پر دلالت کرتا ہے مگر وہاں مبالغہ مقصود یا مراد نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ فعّال وزن کبھی نفس نسبت کے لئے بھی آتا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے بھی مرقات میں ایسی ہی بات کہی ہے ''قال: وقیل المقصود من هذا الکلام مبالغة النفی لانفی المبالغة کمافی قوله تعالیٰ: وماانابظلّام للعبید''۔[۱] اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بازاروں میں شور نہیں فرماتے تھے، حالانکہ وہاں عموماً شور کی ضرورت پیش آتی ہے تو دوسری جگہوں میں بطریق اولیٰ شور نہیں فرماتے تھے۔ قولہ ''یعفو'' اس کا تعلق باطن سے ہے۔ اور ''یصفح'' کا ظاہری درگذر سے ہے۔

تشریح:۔ ان دونوں حدیثوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ اخلاق جیسے ظاہری عبارت سے معلوم ہوئے اسی طرح بطور التزام بھی معلوم ہوئے، کیونکہ پہلی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک کا نرم ہونا اور پسینے کا خوشبودار ہونا۔ اور دوسری حدیث میں زور سے نہ بولنا، یہ سب علامات بلکہ دلالات ہیں اعلیٰ نفاست پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی نفیس الطبع، پاکیزہ طبیعت اور نرم خو تھے۔ کیونکہ جب مزاج نرم اور نفیس و پاکیزہ ہوتا ہے تو اعضاء بھی نرم اور آثار بھی قابلِ رشک ہوتے ہیں۔ جبکہ بدمزاج شخص کا پسینہ انتہائی بدبودار، آواز غلیظ و بلند اور ہاتھ پاؤں سخت ہوتے ہیں۔ بال بھی سخت اور کھال بھی موٹی اور سخت ہوتی ہے۔

راقم نے ''نقش قدم'' لکھتے وقت ابوعلی سینا کی ''شفاء'' منگوائی تھی تاکہ وہ قیافے بھی کتاب میں شامل کردیئے جائیں جن سے اخلاق پر استدلال ہوسکتا ہے، مگر بعد میں مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس طرح بعض لوگ ایک دوسرے کے عیوب پر استدلال کرنا شروع کردیں گے اس لئے ایسی علامات کو کتاب میں شامل نہیں کیا گیا۔

---

[۱] سورۃ ق آیت: ۲۹۔

باب ماجاء فی حُسن العهد

"عن عائشة قالت ماغِرتُ علی احدمن ازواج النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ماغِرتُ علی خدیجة وما بی ان اکون ادرکتها وماذاك اِلّا لِکثرة ذکررسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لَهَاوان کان لیذبح الشاة فَیَتَتَبَّعُ بهاصدائق خدیجة فیُهدیهالهن"۔(حسن صحیح غریب)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی پر اتنی غیرت نہیں آئی جتنی خدیجہ پر آئی اور نہ معلوم میرا کیا حال ہوتا اگر میں ان کو پالیتی، اور یہ غیرت صرف اس بناء پر تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بکثرت یاد فرماتے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکری ذبح فرمالیتے تو خدیجہ کی سہیلیوں کو ڈھونڈ ھ ڈھونڈ ھ کر ان کو بکری (کا گوشت) ہدیہ فرماتے۔

لغات:۔قولہ" حسن العهد" عہد کے متعدد معانی آتے ہیں نگہداشت اور دَور وزمانہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔علی ہذا حسن عہد کا مطلب یہ ہوا کہ اچھے دور کی یاد۔قولہ "ماغِرت" بکسر الغین غَارَ یَغَارُ، خَافَ یَخَافُ کی طرح ہے تاہم غَار یَغَار یائی ہے اور خَاف یَخَاف واوی ہے، غیرت کسی مرد کی بیوی کے دوسرے مرد کی طرف میلان یا کسی عورت کے شوہر کے دوسری عورت کی طرف جُھکاؤ پر جوش، ناگواری اور غصے کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں کسی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق پر کبھی اتنا رشک نہیں آیا جتنا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آتا، چونکہ ایک عورت میں یہ چیز فطری ہوتی ہے کہ جب شوہر ایک بیوی سے قرب حاصل کرتا ہے تو دوسری سوکن کو اس پر غصہ آتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا اتنا خیال رکھنا کہ ان کو بکثرت یاد فرماتے اور جب کوئی بکری ذبح فرماتے تو اس کے گوشت میں سے ان کی سہیلیوں کے لئے بطور خاص حصہ مقرر فرماتے۔یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کتنا پسند فرماتے اس لئے اگرچہ میں نے ان کو دیکھا تو نہیں تھا مگر اس یادداشت پر جب مجھے اتنا رشک آتا تو نہ معلوم کہ اگر وہ بقید حیات ہوتیں اور میری موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس قدر محبت فرماتے تو میرا کیا حال ہوتا؟ یعنی میں ضرور رشک کرتی، مگر اللہ نے مجھے بچایا کہ میں ان کے زمانے میں موجود نہ تھی۔

عام شارحین نے ''مابی الخ ''میں ''ما'' کو نافیہ بنایا ہے یعنی یہ رشک اس وجہ سے نہ تھا کہ میں نے خدیجہ کا زمانہ پایا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کثرت سے ذکر کرنے کی وجہ سے تھا، مگر اوپر ترجمہ اور مطلب میں راقم نے اپنے شیخ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ کے ترجمہ کو لیا ہے، کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے اسی طرح ترجمہ و مطلب بتایا تھا۔ واللہ اعلم۔ اگر یہ مطلب صحیح ہو تو حضرت شیخ کی فقاہت کا نتیجہ ہے اور اگر غلط ہو تو پھر میری طرف سے ہے، اور میں یہی کہوں گا کہ میں نے سننے اور سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

مگر عبارت پر غور کرنے سے یہی لگتا ہے کہ ہمارا بیان کردہ مطلب زیادہ صحیح ہے کیونکہ اگر شارحین کا مطلب ہوتا تو پھر عبارت یوں ہونی چاہئے تھی ''ومابی ان اکون ادرکتها الالکثرة ذکر ''الخ یعنی ''وماذاك'' درمیان میں نہیں ہونا چاہئے تھا، تاکہ تعلیل صحیح ہو جبکہ ہمارے مطلب پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ ''ومابی ان اکون ادرکتها ''جملہ معترضہ ہے اور ''وماذاك الا لکثرة ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لها'' ''غیرت'' کی علت ہے۔ تدبر۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

رہا یہ مسئلہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ کہنا کہ اگر میں حضرت خدیجہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں بیک وقت مجتمع ہوتی تو میرا کیا حال ہوتا یعنی غیرت سے کیسے بچتی؟ بلکہ اندیشہ اس میں واقع ہونے کا تھا، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو امہات المؤمنین کی شان کے منافی ہو، کیونکہ غیرت طبعی شے ہے اور امور طبعیہ پر گرفت یا پابندی نہیں ہوتی، ہاں البتہ امور طبعیہ جب بے قابو ہو جائیں تب وہ شرعاً مذموم ہوتے ہیں، قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ اور قوت عقلیہ تینوں کے لئے یہی ضابطہ ہے کہ وہ حد اعتدال میں فضائل ہیں جبکہ افراط و تفریط کی صورت میں رذائل بن جاتے ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ ہر فضیلت دو رذیلتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ مزید تفصیل درکار ہو تو راقم کی کتاب ''نقش قدم'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

باب ماجاء فی معالی الاخلاق

"عن جابر ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: ان من احبکم الیّ واقربکم منّی مجلساً یوم القیٰمة احاسنکم اخلاقاً وان من ابغضکم الیّ وابعدکم منّی یوم القیٰمة الثرثارون والمتشدِّقون والمتفیهقون، قالوا یارسول اللّٰه قد علمنا الثرثارین والمتشدقین، فما المتفیهقون؟

قال: "المتکبرون"[۱] قال الامام ابو عیسیٰ الترمذی رحمہ اللہ ھذاحدیث حسن غریب من ھذا الوجہ، الثرثارھو کثیرالکلام ،والمتشدق ھوالذی یتطاول علی الناس فی الکلام ویبذو علیھم"۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ اورسب سے زیادہ میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جو اچھے اخلاق والے ہیں۔اور مجھے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اورسب سے زیادہ مجھ سے دور ہوں گے وہ جوزیادہ باتونی، پُرزور انداز سے بولنے اورطنز کرنے والے اور تصنع کرنے والے متکبر ہوں گے۔

لغات:۔قولہ" معالی" ''معلاۃ'' کی جمع ہےقدرومنزلت اور بلندی اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔

قولہ "ان من احبکم الیّ" اس جملے کاتعلق اسی طرح''وان من ابغضکم الیّ ''کاتعلق بعض شارحین نے دنیا کے ساتھ جوڑا ہے،جس کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ اچھے اخلاق کے دوثمرے ہیں:ایک دنیامیں محبوبیت اور دوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاقرب قیامت میں، اسی طرح بُرے اخلاق کے بھی دوتلخ نتائج ہیں:ایک دنیامیں مبغوضیت اوردوم آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوری۔جبکہ ترجمہ میں ہم نے یوم القیٰمۃ کاتعلق دونوں سے جوڑا ہے جس کے مطابق یہ دونوں نتائج آخرت میں ملیں گے گوکہ مآلاً دونوں توجیہوں میں فرق نہیں ہے۔

قولہ"الثرثارون" ثرثار کی جمع ہے جس کا مطلب امام ترمذیؒ نے بتلایاہےیعنی بہت زیادہ بولنے والا۔قولہ"المتشدقون" متشدق کی جمع ہےاس کے معنی بھی مصنفؒ نے بتلائے ہیں یعنی جو باتوں میں لوگوں پرفخر کرےاوران کے ساتھ بےہودہ باتیں کرے،ثرثارون اورمتشدقون کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ثرثارہ ہے جو بتکلف باتیں بنائے اوردائرہ حق سے نکل کر بہت زیادہ بولے۔اورمتشدق وہ ہے جوتولے بغیر بولتارہے اور بولنے میں احتیاط نہ کرے۔بعض نے کہا کہ تشدق شِدق سے مشتق ہے،شدقین باچھوں کو کہتے ہیں لہٰذا متشدق وہ ہے جو باتیں کرتے وقت باچھیں ہلائے تا کہ اپنے کلام کوحاضرین پرزیادہ مؤثر بنائے اور باچھوں کے اشاروں سےلوگوں پرطنز کرے۔غرض زبان کو منہ میں پرتکلف انداز سے گُھما گُھما کر بولنے والا۔

قولہ "المتفیھقون" ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ لفظ فھق الوادی سے ماخوذ ہے جب وادی

باب ماجاء فی معالی الاخلاق

[۱] رواہ ایضاً احمد فی مسندہ ص:۲۱۵ ج:۵ حدیث:۱۷۲۷۸ رواہ الطبرانی فی الکبیر ۱۵۸/۲ مجمع الزوائد ص:۱۴ ج:۸ حدیث:۱۲۶۶۵ رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ الترغیب والترھیب ص:۲۷۷ ج:۳۔

بھر جائے تو اس وقت وہ بہنے لگتی ہے لہٰذا متفیہق وہ شخص ہوا جو اپنی باتوں میں روانی، فصاحت اور لوگوں پر بڑھائی ظاہر کرنے والا ہو، چونکہ یہ کام تو کوئی کبر سے بھرا ہوا متکبر ہی کرسکتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''المتکبرون''۔

تشریح:۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کے لئے جس چیز پر بہت زور دے کر اپنانے کی ترغیب دی ہے بلکہ حکم بھی دیا ہے وہ ہے اچھے اخلاق۔ باب کی حدیث کے علاوہ بہت ساری احادیث میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ اخلاق اچھے ہوں تو آدمی کامیاب ہے ورنہ اخلاق کی خرابی کی صورت میں آدمی تباہی کا شکار ہو جاتا ہے، بالفاظ دیگر اچھے اخلاق آدمی کو مسلسل بلندی پر لے جاتے ہیں جبکہ بُرے اخلاق سے آدمی مسلسل پستی کی طرف گرتا رہتا ہے یہاں تک کہ پست ترین نقطے تک پہنچ جائے۔ والعیاذ باللہ

اخلاق اگرچہ ملکات کا نام ہے مگر ان ملکات کے اثرات آدمی کے ظاہر پر نمودار ہوتے ہیں، اس کی بول چال پر بھی اخلاق کا گہرا اثر ہوتا ہے چنانچہ جس آدمی کے اندر تکبر اور تعلّی کا شوق ہوتا ہے وہ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے، وہ مجلس میں کوشش کرتا ہے کہ اپنے ہم نشینوں کو زیر کردے اور بناوٹ سے بولتا ہے، زبان کو منہ میں گھماتا ہے، الفاظ کا انتخاب کرتا ہے، ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں اور منہ کی حرکات سے دوسروں کو مرعوب بنانے کی کوشش کرتا ہے، چونکہ یہ سب حرکتیں کبر کے آثار اور تکبر کے زمرے میں آتی ہیں، اس لئے ایسا شخص نہ تو دنیا میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب بن سکتا ہے، اور نہ ہی آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل کرتا ہے، کیونکہ وہ اللہ سے دور ہے تو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کیسے ہوسکتا ہے۔

اسی بناء پر عاقل کو چاہئے کہ اللہ کی دی ہوئی استطاعت کے مطابق بولے اس سے زیادہ زور نہ لگائے اور نہ ہی لوگوں پر اپنی فوقیت و برتری ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

تاہم جس آدمی کو اللہ نے بولنے کا ملکہ دیا ہے یا زور قلم سے اس کو نوازا ہے اور وہ بلا تکلف مقفّیٰ و مسجع عبارات بناتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں وہ کبر کی علامت نہیں بلکہ فصاحت کا نتیجہ ہے، اور چونکہ یہ ممانعت تکبر کی بناء پر ہے لہٰذا اگر ایک خطیب یا مصنف خیر خواہی کی بناء پر کلام کو مؤثر بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لوگ سُن کر یا پڑھ کر عمل کریں تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ گو آج کل یہ نیت مشکل ہی لگتی ہے کہ آج کل عام کاموں میں حُبّ جاہ زیادہ ملحوظ رہتی ہے''، وانما الاعمال بالنیات وانما الامرئی

مانوی"۔[۲]

باب ماجاء فی اللعن و الطعن

"عن ابن عمر قال قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم :لایکون المؤمن لعّاناً"۔ ....وَرَوَی بعضھم ...قال لاینبغی للمؤمن ان یکون لعّاناً"۔(حسن غریب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔ دوسری روایت میں ''لاینبغی'' کا لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ لعنت کرنا کامل ایمان کے منافی ہے نہ کہ نفس ایمان کے۔

تشریح: ۔لعن اور طعن کی تشریح اور حکم تفصیل سے ''باب ماجاء فی اللعنۃ'' میں گذرا ہے وہیں ملاحظہ ہو۔ تاہم ابن العربیؒ نے اس باب کے ضمن میں لکھا ہے کہ جس صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ''لعنُ المؤمن کقتلہ''[۱] تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قتل کرنے سے وہ مقتول کو دنیا سے محروم کر دیتا ہے اور لعنت سے ملعون کو جنت سے قولاً دور کر دیتا ہے اس لئے تشبیہ صحیح ہوئی۔ پھر یہ ممانعت اس وقت ہے جب کوئی شخص بلاوجہ کسی پر لعنت کرے۔ اگر کوئی وجہ ہو تو پھر اس کی عادت مکروہ ہوگی جیسے کسی نے راستہ میں گندگی پھیلائی ہے تو اگرچہ وہ لعنت کا مستحق ہو جاتا ہے مگر لعنت کرنے والے کو بار بار لعنت کرنا مکروہ ہوگا۔

باب ماجاء فی کثرۃ الغضب

"عن ابی ھریرۃ قال جاء رجل الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال:عَلِّمنی شیئاً ولاتُکثر عَلَیَّ لَعَلِّیْ اَعِیہ ،قال :"لاتغضَب" فَرَدَّدذالک مراراً، کل ذالک یقول: لاتغضب"۔[۱] (ھذاحدیث

---

[۲] قد مر تخریجہ فی "باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان". حفیظ الرحمن عفی عنہ

باب ماجاء فی اللعن والطعن

[۱] رواہ البخاری ص:۸۹۳ ج:۲ "باب ماینھی من السباب واللعن" کتاب الادب، ایضاً ص:۹۸۴ ج:۲ "باب من حلف بملۃ سوی الاسلام" کتاب الایمان ورواہ مسلم فی الایمان حدیث:۱۷۶ الترغیب والترھیب ص:۳۱۳.

باب ماجاء فی کثرۃ الغضب

[۱] الحدیث اخرجہ البخاری ص:۹۰۳ ج:۲ "باب الحذر من الغضب" کتاب الادب.

حسن صحیح غریب)

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ مجھے کوئی مختصر ہدایت دیں اور مجھے ارشاد کی زیادہ باتیں نہ کیجئے شاید کہ (وہ مختصر نصیحت) میں یاد رکھ سکوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غصہ نہ کرو، اس شخص نے بار بار (تین بار) اپنا سوال دہرایا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مرتبہ یہی فرماتے کہ غُصَّہ نہ کر۔

لغات: ـ قولہ "عَلّمنی شیئاً" شیٔ سے مراد مختصر اور قلیل نصیحت ہے۔ اور کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میرے لئے بطور خاص کوئی مفید ترین بات ارشاد فرمائیے۔ قولہ "ولا تکثر" اکثار سے ہے یعنی زیادہ اشیاء نہ بتلائیں کیونکہ "لعلی اعیہ" "ای احفظہ" تاکہ وہ مختصر بات میں یاد رکھ سکوں جبکہ زیادہ باتیں یاد رکھنا مشکل ہوتی ہیں۔ قولہ "فردد ذالك مِراراً" اس آدمی نے اپنا سوال دوبارہ وسہ بارہ دہرایا۔ شاید وہ اتنا مختصر بھی نہیں چاہتا تھا۔ یا مطلب یہ تھا کہ اس کے لئے غصہ سے بچنا مشکل تھا اس لئے متبادل کا مطالبہ کر رہا تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ مفید تر کا مطالبہ کر رہا ہو۔

تشریح: ـ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حکیم تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے مناسب حال علاج کرتے اور سائلین کو ان کی ضرورت وحالت کے مطابق جواب عنایت فرماتے۔ تو جس طرح ایک طبیب مریض کی حالت دیکھ کر مناسبِ مرض دوا دیتا ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف سائلین کے ایک ہی سوال کے مختلف جوابات مروی ہیں۔

حدیث بالا میں سائل نے جو سوال پوچھا شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوال سے یا بات کرنے کے انداز سے یا دیگر قرائن سے معلوم کیا ہو کہ اس کو غصہ جلد یا زیادہ آتا ہے۔ مثلاً "ولا تکثر عليّ" سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ لگا لیا ہو وغیرہ۔ چونکہ ہر فضیلت کی بنیاد میں ایک قوت ودیعت کی گئی ہے جن کی تعداد اصول کے اعتبار سے تین ہے: قوت غضبیہ، قوت شہوانیہ اور قوت عاقلہ۔ تاہم ان قوتوں میں افراط وتفریط عیوب ہیں جبکہ درجۂ اوسط عین کمال ہے اس لئے کہا جائے گا کہ ہر فضیلت دو رذیلتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس لئے حدیث کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اسے غضب اور غصہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ یہ نہ تو ممکن ہے کیونکہ یہ امر طبعی وجبلی ہے اور نہ ہی مطلوب شرعی ہے جبکہ شریعت تکلیف بما لا یطاق یا تکلیف لا یعنی نہیں دیتی، اس لئے مطلب یہ ہے کہ غصہ زیادہ مت کرو یعنی غصہ کو قابو کرنے کی کوشش کرو! کیونکہ غصہ جب تک

عقل اور شریعت کے دائرے کے اندر رہتا ہے تو یہ ممدوح ومحمود ہے مگر اس دائرے سے نکلنے کے بعد اس کی بُرائی میں کوئی شک نہیں۔ زیادہ غصہ عموماً آدمی کو دائرۂ عقل ونقل سے باہر کر دیتا ہے۔ پھر قبائح کا ارتکاب تقریباً یقینی ہو جاتا ہے۔

غصے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے نقصانات کیا ہیں؟ اور اس کا علاج کیا ہے؟ اگر ان سوالات کے جوابات درکار ہوں تو (دیکھئے راقم کی کتاب "نقش قدم فصل ۸ غضب وغصہ، باب دوم رذائل کے بیان میں) یہاں زیادہ تفصیل مُمل ثابت ہوسکتی ہے۔

باب ماجاء فی کظم الغیظ

ہندی نسخوں میں یہاں باب کا عنوان نہیں ہے بلکہ یہ حدیث گذشتہ باب کے ضمن میں ذکر کی گئی ہے۔

"عن سَهْل بن معاذبن انس الجُهني عن ابيه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من كظم غيظاً وهو يستطيع ان يُنَفِّذَه دعاه الله يوم القيٰمة على رؤس الخلائق حتى يخيّره في ايّ الحور شاء"۔ (حسن غريب) [۱]

حضرت معاذ بن انس جہنی انصاری صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے غصہ ضبط کرلیا دراں حالیکہ وہ اس کی تنفیذ پر قادر تھا تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے بُلا کر (اعزاز سے اتنا نوازیں گے کہ) اسے اختیار دیں گے کہ وہ جس حور کو چاہے لے لے۔

لغات: قوله "كظم الغيظ" کظم اصل میں بھرے ہوئے مشکیزے کے مُنہ کے باندھنے کو کہتے ہیں جبکہ غیظ غصہ کو کہتے ہیں۔ تو کظم الغیظ کا مطلب غصے کو ضبط کرنا اور قابو کرنا ہوا۔ چونکہ آدمی غصے سے بھر جاتا ہے پھر جب خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو گویا اس نے بھرے ہوئے مشکیزے کی طرح سب کچھ اندر ہی اندر بند کر دیا۔

قوله "ان ينفذه" بتشدید الفاء باب تفعیل سے ہے۔ جبکہ باب افعال سے یعنی فاء کی تخفیف کے ساتھ بھی پڑھنا جائز ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں "وهو يقدر على انفاذه" آیا ہے (کما رواه

باب ماجاء في كظم الغيظ

[۱] رواه ابوداؤد ايضاً ص: ۳۱۱ ج: ۲ "باب من كظم غيظاً" كتاب الادب وسنن ابن ماجه ص: ۳۰۸ "باب الحلم" ابواب الزهد.

ابن ابی الدنیا، کذا فی التحفۃ [۲]) یہ جملہ حالیہ ہے یعنی وہ اس حال میں غصے کو ضبط کرلے جبکہ وہ اس کے مطابق عمل کرنے پر قدرت رکھتا ہو مثلاً کسی کمزور نے غصہ دلایا ہو اور وہ اس سے انتقام لے سکتا ہو مگر نہ لے۔ قولہ "دعاہ اللہ" الخ یہ جواب شرط ہے یعنی جس نے غصہ باوجود قدرت کے پی لیا تو اللہ عزوجل قیامت کے روز اسے سب لوگوں کے سامنے بلائیں گے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں غصے کو ضبط کرنے اور پی جانے کی بہت بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ تاہم چونکہ غصہ آنے کی صورت میں آدمی کی دو حالتیں ہوتی ہے ایک یہ کہ غصہ کسی طاقت ور پر آجائے ایسے میں تو غصہ نافذ نہیں ہوسکتا اور عموماً لوگ غصہ پی جاتے ہیں یعنی انتقام نہیں لیتے، مگر یہ کوئی شرعی کمال کی بات اور اتنی فضیلت نہیں کیونکہ یہ ایک مجبوری ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جو حدیث بالا میں بیان ہوئی کہ انتقام کی قدرت ہو مگر آدمی صبر کرے اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب غصہ اپنے سے کمزور پر آجائے۔ چونکہ عموماً لوگ ایسے میں مغضوب علیہ کی خوب خبر لیتے ہیں اور دل کی بھڑاس کو نکالتے ہیں لیکن ان ہی لوگوں میں سے اگر کوئی بندۂ خدا اپنے نفس کی خواہش کے برعکس اللہ کے لئے انتقام کا جذبہ ترک کردے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کا کام اور للہیت کی دلیل ہے، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب لوگوں جہاں انسانوں، فرشتوں اور جنات کا ناقابل تصوررش ہوگا سامنے لاکر اس کے کردار کو سراہا جائے گا پھر اسے حورعین میں انتخاب کرنے کا اختیار دیا جائے گا کہ وہ اپنی پسند کی حورعین لے کر جنت میں داخل ہو۔

ملاعلی قاریؒ مرقات میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ فضیلت تو صرف غصہ ضبط کرنے پر ہے تو اگر وہ اس کے ساتھ معاف بھی کردے اور مزید انعام بھی دے دے تو ایسے شخص کا کیا حال ہوگا؟

اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے: "والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللّٰہ یحب المحسنین"۔ (ال عمران [۳])

لیکن یہاں پر بھی یہ بات ذہن میں رہے کہ ہر فضیلت دو رذیلتوں کے درمیان ہوتی ہے لہٰذا یہاں بھی درجۂ اوسط محمود ہے یہ نہیں ہونا چاہئے کہ غصے کے مقتضیٰ پر چلنے کا جہاں حکم ہے اور عقل جس کو مقتضی ہے وہاں بھی غصہ نہ آئے کیونکہ یہ کوئی فضیلت نہیں بلکہ رذیلت اور بے غیرتی ہے جو شرعاً معیوب اور مذموم ہے۔ مزید تفصیل

---

[۲] وفی روایۃ ابی داؤد وابن ماجہ وھو قادر علی ان ینفذہ الخ حوالہ بالا۔

[۳] سورۃ آل عمران آیت: ۱۳۴۔

کے لئے (دیکھئے نقش قدم فصل: ۹ کظم غیظ، باب سوم فضائل کے بیان میں)

ابن العربیؒ نے بھی عارضۃ الاحوذی میں یہی بات کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"فاذا كان الغضب لِلّٰهِ فهومن الدين وقوة النفس فى الحق فبالغضب قوبل الكفار واقيمت الحدود وذهبت الرحمة على اهل ذالك فى القلوب وهذا يوجب ان يكون القلب عاقلاً والبدن عاملاً بمقتضى الشرع يسترسلان اذا ارسلهما ويمسكان اذاامسكهما" الخ۔

باب ماجاء فی اِجلال الکبیر

"عن انس بن مالك قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :ماأكرم شَابٌّ شيخاًلِسِنِّه اِلاقَيَّضَ الله له مَن يكرمه عندسِنِّه "۔(هذاحديث غريب)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی جوان کسی بوڑھے کی قدر اس کے بڑھاپے کی وجہ سے کرتا ہے تو اللہ اس کے لئے ایسے شخص کو مقرر کردیتے ہیں جو بڑھاپے میں اس کی قدر کرے گا۔

لغات:۔قولہ "اِجلال الکبیر" بزرگ وعمر رسیدہ کی قدر کرنا۔قولہ "شاب" بتشدید الباء جوان۔ قولہ "لِسنه" "ای لاجل سنه" ۔قولہ "قَيَّضَ "بتشدید الیاء بمعنی سَلَّطَ مسلط اور مقرر کرنا۔قولہ "عندسِنه" "ای عند کِبرسِنه "یعنی بڑھاپے میں۔

تشریح:۔اس روایت میں ابوالرجال نامی راوی کے متعلق لکھاہے کہ یہ بتشدید الحاء صحیح ہے اگرچہ بتخفیف الجیم جیسا کہ اس سند میں ایک راوی ہے جو کہ ثقہ ہے مگر یہاں بالحاء ہی ہے جوضعیف ہے۔واللہ اعلم

محشی نے نقل کیا ہے کہ کسی بوڑھے کا اکرام جو اس فضیلت کا باعث ہے یہ محض بڑی عمر کی وجہ سے مراد ہے حتی کہ اگر کافر معمر شخص کی قدر محض اس کے بڑھاپے کی وجہ سے کی تو بھی یہ فضیلت حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ جب نفس بُوھاپے کی قدردانی پر اتنا بڑا انعام ملتا ہے تو جب کسی مسلمان بزرگ کا اکرام کیا جائے تو اس کا ثواب اور انعام تو بطریق اولی ملے گا بھی اور زیادہ بھی ہوگا۔

اس کا مشاہدہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ بعض اہل علم گو کہ علمی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں مگر ان کو دیکھا گیا

ہے کہ ان کی خدمت پر اپنے شاگرد نمبر مقرر کردیتے ہیں اور یہ کام بڑی خوشی سے کرتے ہیں کیونکہ اس مخدوم استاذ نے بھی اپنی طالب علمی کی عمر میں اپنے اساتذہ کی خدمت وقدر کی تھی۔

نیز اس حدیث میں یہ بھی خوشخبری ہے کہ بوڑھوں کا اکرام کرنے والا جوان بڑی عمر پائے گا کیونکہ بڑھاپے میں مخدوم ہونا بڑی عمر پر موقوف ہے۔

باب ماجاء فی المتهاجِرَین

"عـن ابـی هـريرة ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: تُفتَحُ ابواب الجنة يوم الاثنين والـخـمـيـس فَيُغفر فيهما لمن لايشرك بالله اِلاالمتهاجِرَين يقول: رُدّوا هذين حتى يصطلحا"۔ (هذا حديث حسن صحيح) [1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھول دیئے جاتے ہیں، پس ان دونوں دنوں میں ہر اس شخص کی مغفرت کی جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ شرک نہ کرتا ہو مگر قطع تعلق کرنے والے دونوں کی نہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں (کے اعمال) کو لوٹا دو یہاں تک کہ صلح کرلیں۔

لغات: ۔قـولـه "الـمـتـهـاجـرين" اس کی شرح امام ترمذیؒ نے خود فرمائی ہے، یعنی "المتصارمین" صرم بمعنی قطع کے ہے محشی لکھتے ہیں کہ اس تفسیر کا مطلب شاید یہ بتانا ہے کہ سفر وغیرہ کی وجہ سے جو جدائی ہوتی ہے وہ مذموم نہیں بلکہ تعلق ختم کرنا اور بات چیت اور ملاقات نہ کرنا مذموم ہے جو یہاں مراد ہے۔

تشریح: ۔کسی مسلمان بھائی سے قطع تعلق اور بات چیت بند کرنے کے متعلق ضروری تشریح "باب ماجاء فی کراھیۃ الھجر للمسلم" میں گذر چکی ہے وہیں پر ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں صرف اس حدیث باب سے متعلق شرح اور وضاحت پیش ہے۔ پیر اور جمعرات کے دنوں میں جنت کے دروازوں کے کھولے جانے کا مطلب کیا ہے؟ تو اس میں شارحین حدیث کے متعدد اقوال ہیں

باب ماجاء فی المتهاجرين

[1] الـحـديـث اخرجه مسلم فی البر حديث: ۳۴ و ۳۶ ومالک فی حسن الخلق حديث: ۱۷، ۱۸، ايضاً روى ابوداؤد وابن مـاجـه بـنـحـوه، الترغيب والترهيب ص: ۳۰۶ ج: ۳، ايضاً راجع للتفصيل مجمع الزوائد ص: ۷۹ تا ۸۱ ج: ۸ كتاب الادب. حفيظ الرحمن الحنفی ندوة العلم

جن کو مجموعی طور پر دوقولوں کی طرف راجع کیا جاسکتا ہے۔اول یہ کہ حدیث ظاہر پر محمول ہے اور جنت سے معنی حقیقی مراد ہے، چونکہ آدمی کے اعمال جنت میں جا کر جسم مثالی کے ساتھ متشکل ہو جاتے ہیں کوئی نہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کوئی محل کی، اور کوئی حور عین کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کوئی درخت کی وغیرہ وغیرہ۔اس لئے اعمال آدمی سے پہلے ہی جنت میں پہنچ جاتے ہیں گو کہ نامۂ اعمال میں بھی اس کا ریکارڈ رہتا ہے۔تدبر

دوم یہ کہ اسے مجاز پر محمول کیا جائے یعنی مطلب یہ ہے کہ ان دو (۲) ایام میں مسلمانوں کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں قبولیت کے لئے پیش ہوتے ہیں، چونکہ وہاں قبول ہونے کے بعد ان پر جنت ملتا ہے اس لئے گویا ذکر لازم والمراد منہ الملزوم کے طور پر جنت کا اطلاق اس پر کیا گیا گو کہ اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں۔بہرحال یہاں دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ اعمال پیر اور جمعرات کو پیش ہوتے ہیں یعنی ہر تین دنوں کے بعد گو کہ یومیہ اعمال بھی پیش ہوتے رہتے ہیں مگر یہ خصوصی پیشی ہوتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یومیہ اعمال عالم بالا کی ایک مخصوص حد تک جاتے ہوں وہاں سے آگے پھر پیر اور جمعرات کو جاتے ہوں، بنا بر ہر تقدیر حدیث سے پیر اور جمعرات کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور یہ کہ قطع کلامی کی رخصت تین دن تک ہے زیادہ کی نہیں ہے جیسا کہ پہلے گذرا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ بد باطنی یعنی رذائل اخلاق اور خصوصاً حسد کی منحوس تاثیر اتنی قوی ہے کہ اس سے اعمال مسترد کر دیئے جاتے ہیں گویا یہ اعمال کو جلاتا رہتا ہے۔لہٰذا اگر کسی سے اختلافات آبھی جائیں تو نہ ان کو طول دینا جائز ہے اور نہ ہی دل کو ان کے لئے مستقل ٹھکانہ بنانا جائز ہے بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اولاً تو دل شیشے کی طرح صاف ہو، تا کہ ایمان کے انوارات منجلی ہوں۔مگر بصورت مجبوری ان امراض کا جلد علاج کرنا اور کرانا از حد ضروری ہے کہ جب دل بگڑ جاتا ہے تو انسان ہلاک ہی ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی الصبر

"عن ابی سعیدان ناساًمن الانصارسألواالنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاعطاھم ثم سألوا فاعطاھم ثم قال مایکون عندی من خیرفلن اَدَّخرہ عنکم ،ومن یستغن یُغنہ اللّٰہ، ومن یَّستَعِفَّ یُعَفِّہُ اللّٰہ ،ومن یَتَصَبَّرْیُصَبِّرہ اللّٰہ ،وماأُعطِی احدٌشیئاًھو خیر واَوْسَع من الصبر"۔[1]

حضرت ابوسعید (خدری) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار کے کچھ لوگوں (صحابہ) نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے (مال کا) سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دے دیا انہوں نے پھر مانگا آپ نے مزید عطا کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس کوئی بھلی چیز ہوگی تو وہ میں تم سے نہیں روکتا (مگر بات یہ ہے کہ) جو شخص اپنے آپ کو (لوگوں کے مال سے) بے نیاز بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کو بے نیاز بناتا ہے، اور جو شخص خود کو پاک بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کو پاک بناتا ہے، اور جو شخص خود کو صبر پر آمادہ کرتا ہے تو اللہ اس کو صبر نصیب کرتا ہے، اور کسی کو صبر سے زیادہ بہتر اور زیادہ وسیع چیز نہیں دی گئی ہے۔

یہاں روایات میں دو قسم کے الفاظ آئے تھے ایک "فلن ادخرہ" اور دوسرا "فلم ادخرہ" امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں کا مطلب و معنی ایک ہی ہے۔ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں، کہ کہنے کا مقصد نفی اذخار مطلقاً ہے یعنی جیسے ماضی میں کوئی چیز میں نے ذخیرہ کر کے نہیں رکھی ہے اسی طرح مستقبل میں بھی نہیں کروں گا۔ لہٰذا "فلم اور فلن" دونوں اس مطلب میں برابر ہیں۔ (کذافی الکوکب الدری)

لغات:۔ قولہ "الصبر" اگر صلہ میں "علیٰ" آجائے جیسے "صبر علی الامر" تو معنی "برداشت کرنے، ہمت سے کام لینے کے ہوتے ہیں"۔ اور اگر صلہ میں "عن" آجائے تو معنی "روکنے اور باز رکھنے کے آتا ہے"۔ اور اگر "بغیر صلہ" کے آجائے جیسے "صبر نفسہ" تو اس کے معنی "دل تھامنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے آتے

باب ماجاء فی الصبر

[1] الحدیث اخرجہ البخاری ص:۹۵۸ ج:۲ "باب الصبر عن محارم اللّٰہ الخ" کتاب الرقاق، ایضاً رواہ فی الزکاۃ باب:۵۰، ورواہ مسلم فی الزکاۃ ص:۳۳۷ ج:۱ کتاب الزکوٰۃ، ابوداؤد ص:۲۳۹ ج:۱ "باب فی الاستعفاف" کتاب الزکوٰۃ، سنن دارمی ص:۲۷۴ ج:۱ کتاب الزکوۃ باب:۱۸، ومؤطا مالک ص:۷۳۴ صدقہ باب:۷، مسنداحمد ص:۳۸۵ ج:۳ حدیث:۱۰۷۰۷، ایضاً ص:۵۲۰ ج:۳ حدیث:۱۱۴۸۰ والنسائی ص:۳۶۲ ج:۱ الاستعفاف عن المسألۃ، کتاب الزکوٰۃ.

ہیں"۔

قولہ "من خیر" کوکب میں ہے کہ یہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کی خیر کو شامل ہے لہٰذا علم اور مال دونوں مراد ہوئے۔ قولہ "ومن یستغن" الخ ان صیغوں میں تکلف کے معنی پائے جاتے ہیں جیسا کہ اوپر ترجمہ میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی جو آدمی خود کو لوگوں سے مستغنی کرنے کی کوشش کرے گا، کہ ضرورت کے باوجود سوال نہ کرے اور خود کو سوال سے پاک بنانے کی کوشش کرے کہ باوجود ضرورت۔ کے سوال کی گندگی سے دور رہے اور خود کو صبر پر مجبور اور آمادہ کرے یعنی باوجود رخصتِ سوال کے صبر کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں یہ صفات پیدا کر ہی دے گا بایں طور کہ وہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائیں گی۔

تشریح:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت استاذ اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مسلسل تربیت فرماتے، کوئی موقعہ تعلیم دین اور تہذیب اخلاق سے خالی نہ گذرتا۔ چنانچہ اس موقعہ پر بھی جب انہوں نے کوئی چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرما دی تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توجہ رخصت سے عزیمت کی طرف مبذول کرادی کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو غیر اللہ کی طمع اور لالچ سے بالکل خالی کردے، اگر اس کے اندر یہ صفت ذاتی نہیں تو بتکلف فضائل اپنانے کی کوشش کی جائے، ایک وقت ایسا آجائے گا کہ جب یہ فضائل اس کے اخلاق بن جائیں گے۔ چنانچہ اگر ایک آدمی لوگوں کے مال اور دولت وعزت سے بے نیاز و مستغنی ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس کی مشق کرے، اسی طرح پاک بازی اور صبر کو اپنانے کا طریقہ ہے۔

یاد رہے کہ انسان میں دو طرح کے ملکات ہوتے ہیں: (۱) ذاتیہ۔ (۲) فاضلہ۔ ذاتی ملکات: تو وہ ہیں جو انسان کی جِبلّت اور فطرت میں ودیعت کئے گئے ہوں۔ جبکہ ملکاتِ فاضلہ کسب اور تحصیل سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر ایک آدمی میں کوئی فضیلت واخلاق بطور ودیعت کے نہیں پایا جاتا تو وہ اسے بتکلف اپنانے کی کوشش کرتا رہے تو وہ صفت اس کی طبیعت بن جائے گی۔ اخلاق اگرچہ اصلاً وہ ہیں جو فطری ہوں مگر مجاہدوں سے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ مزید تفصیل راقم کی کتاب "نقش قدم" میں دیکھی جاسکتی ہے، (فصل نمبر۱) اخلاق فطری چیز ہے، اور کیا اخلاق میں ذاتی سعی کا دخل ہے، اور اخلاق حسنہ اپنانے کا عملی طریقہ، عنوانات کے تحت ملاحظہ ہو۔ (باب اول)

امام ترمذیؒ نے یہ باب صبر کی فضیلت کے بیان میں قائم کیا ہے جس کے فضائل قرآن وسنت میں اتنے

زیادہ بیان ہوئے ہیں کہ اگر ان کا احاطہ ممکن بھی ہو تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

اجمالاً اتنی سی بات عرض ہے کہ صبر وہ بہترین خداداد نعمت ہے۔ کہ اس کا ثمرہ نہ صرف آخرت میں ملنے کا قوی امکان ہے بلکہ دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل کیے جا سکتے ہیں، تجربہ شاہد ہے کہ جس آدمی نے بھی کسی مسئلہ میں صبر سے کام لیا ہے اس کو ناقابل تصور خوشی نصیب ہوئی ہے۔ جتنی برداشت زیادہ ہوگی اسی تناسب سے ثمرات بھی زیادہ ہوں گے۔ راقم کو اس کا بارہا تجربہ رہا ہے اور جب بھی صبر کے ثمرات آنا شروع ہوئے تو ایک حسرت سی بھی دل میں رہی کہ کاش برداشت میں تھوڑی بہت جو کوتاہی ہوئی ہے وہ بھی نہ ہو جاتی تو آج بھرپور ثمرات ملتے۔

صبر کے تین درجے ہیں: (۱) ''صبر علی الطاعۃ'' یعنی نیکیوں کی ادائیگی۔ (۲) ''صبر عن المعصیۃ'' گناہوں سے بچنا اور (۳) ''صبر علی الاذی'' یعنی تکلیف کو برداشت کرنا۔ چونکہ ان تینوں حالتوں میں نفس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لئے گویا ان میں نفس کو روکنا پڑا اس لئے ان کو صبر کہا جاتا ہے، طاعت میں نفس سُست اور کاہل ہو جاتا ہے جسے تیز کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ گناہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے جسے لوٹانا پڑتا ہے اور تکلیف کے وقت حواس باختہ ہو جاتا ہے جس کی اصلاح کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر آسودہ حالی کے مقابلہ میں بدحالی پر صبر کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ خوش حالی اور مال داری میں بالآخر آدمی مال اور خواہشات کا غلام بن ہی جاتا ہے الا ماشاء اللہ۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے:

''قال الصحابة فی الحدیث الصحیح: أُبتُلینا بالضراء فصبرنا، وأُبتُلینا بالسراء فلم نصبر، وقد قال العلماء یصبر علی البلاء کل مؤمن ولا یصبر علی العافیة الا صِدّیق''۔

غرض مال آجائے تو آزمائش سخت ہو جاتی ہے اس لئے عاقل کو چاہئے کہ اس کی طرف زیادہ نہ جُھکے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: کہ دنیا سانپ کی مانند ہے اس سے وہی کھیل سکتا ہے جو اس کے زہر سے بچ سکتا ہو، آدمی سپیرا نہ ہو اور مال سے کھیلے گا تو ہلاک ہوگا۔

باب ماجاء فی ذی الوجهین

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :ان من شر الناس عندالله یوم القیٰمة ذاالوجهین "۔(حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے بُراشخص اللہ کے نزدیک وہ ہوگا جودورُخ والا ہو۔(یعنی دورُخا اور منافق)

لغات:۔قولہ"ذاالوجهین"لغوی اعتبار سے تو ذوالوجہین کے معنی دوچہروں والاشخص ہے مگر عرف میں اس شخص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے دوروپ ہوں، جب سامنے آتا ہے تو دوستی کاروپ دھار لیتا ہے اور جب رخصت ہوکر چلا جاتا ہے تو روپ بدلتا ہے، اور یہی طریقہ اس کے مخالف کے ساتھ کرتا ہے گویا وہ دومخالف آدمیوں کے درمیان مسلسل بھیس بدلتا رہتا ہے سامنے آئے تو دوست لگے جب پیٹھ پھیرے تو دشمن بنے۔(کماعندالبخاری"الذی یأتی هؤلآء بوجه وهؤلآء بوجه"[۱])

تشریح:۔دورُخی ایسی بیماری ہے جوکئی امراض کا مجموعہ ہے اس لئے اس پر مندرجہ بالاسخت وعید آئی ہے۔ دورُخی میں چونکہ ظاہر اور باطن میں تضاد ہوتا ہے اس لئے اس پہلو سے یہ منافقت ہے، جبکہ ایسا شخص ہر دو فریقین سے وہ بات کرتا ہے جس سے نفرت میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ اس کا چغلی والا پہلو ہے۔پھر منافرت کے اضافے کی صورت میں نوبت عملی جھگڑوں تک جاپہنچتی ہے تو اس اعتبار سے یہ فسادفی الارض ہے اور خیرخواہی کا تأثر دے کر وہ دوسروں کے اسرار اور راز تک پہنچنا چاہتا ہے تو یہ خیانت بھی ہے،اس لئے ایسا شخص بدترین سلوک کا سزاوار ہوگا۔

چنانچہ ابوداؤد وغیرہ میں ہے:"من کان له وجهان فی الدنیا کان له یوم القیٰمة لسانان من نار"۔(ابوداؤدص:۳۱۲ج:۲،الادب المفردص:۶۳۴[۲])

عارضہ میں ہے کہ دین صرف ایک ہی حالت پر ہوتا ہے یعنی حق ،جبکہ یہ شخص دین کے مزاج اور اصول

باب ماجاء فی ذی الوجهین

[۱] رواه البخاری ص:۴۹۶ ج:۱ "باب المناقب" کتاب المناقب، ایضاً اخرجه فی الادب باب:۵۲، وفی الاحکام باب:۲۷، وصحیح مسلم ص:۳۲۵ ج:۲ "باب ذم ذی الوجهین الخ" ابواب البر والصلة ومؤطا مالک ص:۷۳۳ "باب ماجاء فی اضاعة المال وذی الوجهین" کتاب الجامع.

[۲] ایضاً رواه ابن حبان فی صحیحه بحواله الترغیب والترهیب ص:۳۷۱ ج:۳.

کے خلاف چلتا ہے، ہاں اگر بطور تقیہ کے سخت مجبوری میں آدمی اپنے دل کا راز چھپا کر دوسری بات ظاہر کردے جس سے مراد اپنی حفاظت ہو یا کسی دوسرے مسلمان کی حفاظت ملحوظ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح اصلاح ذات البین کا بھی حکم ہے جس کی تفصیل پہلے "باب ماجاء فی اصلاح ذات البین" میں گذری ہے۔

دورخی اور اصلاح ذات البین میں فرق واضح ہے کہ دورخا شخص کی کوشش اختلافات کو ہوا دینا ہوتی ہے اس لئے وہ ہر فریق کے موقف کو درست کہہ کر اس کو بھڑکاتا ہے، جبکہ اصلاح ذات البین کرنے والے کی نیت اس کے برعکس اختلافات کو کم کرنے یا ختم کرنے کی ہوتی ہے اس لئے وہ ہر فریق کو اپنی باتوں سے ٹھنڈا کرتا ہے، لہٰذا دونوں بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ "وانماالاعمال بالنیات

جہاں تک تقیہ کا تعلق ہے تو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے تفسیر روح المعانی میں (سورۂ ال عمران کی آیت نمبر ۲۸) "اِلاان تتقوا منهم تقاة" کی تفسیر میں لکھا ہے: "وفي الاية دليل على مشروعية التقية وعرفوها بمحافظة النفس او العرض او المال من شرالاعداء"۔ پھر دشمن کی بھی دو قسمیں بنائی ہیں اور تقیہ کی بھی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اگر آدمی کے دین کو خطرہ ہو تو وہاں سے ہجرت کر کے اپنا دین بچانا لازمی ہے۔ مگر ہجرت پر عدم قدرت کی صورت میں مخالفین کی ظاہری موافقت بقدر ضرورت جائز ہے بشرطیکہ وہ ہجرت کی کوششوں میں مصروف ہو، ہاں اظہارِ مذہب عزیمت ہے اگر وہ اس پر مارا جاتا ہے تو شہید ہوگا۔ تقیہ کے بارے میں خوارج اور شیعہ افراط وتفریط کا شکار ہوئے ہیں، خوارج اس کے جواز کے منکر ہیں جبکہ شیعہ نے اس میں بہت تساہل سے کام لیا ہے جس کی تفصیل روح المعانی میں ہے۔

باب ماجاء فی النمّام

"عن همام بن الحارث قال مرَّ رجل على حذيفة بن اليمان فقيل له: ان هذا يُبَلِّغُ الامراء الحديث عن الناس، فقال حذيفةُ: سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "لايدخل الجنة قتّات" [1] قال سفيان: والقتّات النمّام"۔ (هذاحديث حسن صحيح)

باب ماجاء فی النمام

[1] الحديث اخرجه البخاري ص: ۸۹۵ ج: ۲ "باب مايكره من النميمة" كتاب الادب، صحيح مسلم ص: ۷۰ ج: ۱ كتاب الايمان، سنن ابي داؤد ص: ۳۲۰ ج: ۲ "باب في القتات" كتاب الادب.

ہمام بن الحارثؒ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کے پاس سے ایک شخص گذرا، تو ان (حذیفہؓ) سے کہا گیا کہ یہ شخص لوگوں کی باتیں حکام تک پہنچاتا ہے تو حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ قتات جنت میں داخل نہیں ہوگا، راوی حدیث امام سفیانؒ فرماتے ہیں کہ قتات کے معنی نمام یعنی چغلخور کے ہیں۔

لغات:۔قولہ "النمام" نمیمہ سے ہے جس کے معنی "نقل کلام الغیر للا ضرار والافساد" کے ہیں، یعنی جو شخص کسی کی بات سن کر اسے دوسروں تک پہنچائے اور مقصد نقصان پہنچانا اور فساد برپا کرنا ہو۔ اور اگر مقصد نیک ہو جیسے اصلاح ذات البین تو وہ جائز ہے کیونکہ ایسی صورت میں وہ بات کو اچھی صورت ہی دے گا جبکہ چغلی میں وہ لگائی بجھائی کرے گا۔ قولہ "قتات" اس کے معنی وہی ہیں جو راوی حدیث نے بیان کئے ہیں۔ تاہم قتات اور نمام میں لغوی اعتبار سے یہ فرق ہے کہ نمام لوگوں میں بیٹھ کر رُوبرُو سن کر بات کو نقل کرتا ہے جبکہ قتات چوری چھپے سُنتا ہے اور پھر نقل کرتا ہے گویا تجسس کرتا ہے۔ مگر بعض حضرات اس فرق کے قائل نہیں ہیں۔ [۲]

تشریح:۔ چغلخوری گناہ کبیرہ ہے اور اصلاح ذات البین کے مقابل رذائل اخلاق میں سے ہے اس کی مذمت قرآن وسنت دونوں میں کی گئی ہے اس سلسلے میں ایک حدیث ترمذی جلد اول، ابواب الطہارت میں گذری ہے۔ اور بخاری شریف وغیرہ میں بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قبروں کے بارے میں فرمایا کہ ان کو عذاب ہو رہا ہے... ان میں سے ایک پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغلی لئے پھرتا تھا۔ [۳] (دیکھئے باب التشدید فی البول، تشریحات ص:۲۳۷ ج:۱)

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ زمین میں فساد کو ہرگز پسند نہیں فرماتا اس لئے جو شخص لوگوں کو باہم لڑاتا ہے وہ سخت ترین عذاب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ چغلی سے دو خاندان بلکہ کبھی دو قبیلے فساد کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اس لئے شریعت نے اس پر سخت پابندی عائد کی ہے۔

حدیث بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ چغلخور جنت میں داخل نہیں ہوگا یہ ایسا ہی ہے جیسے تکبر کے بارے میں

---

۲ قال الحافظ: القتات والنمام بمعنی واحد وقیل النمام الذی یکون مع جماعة یتحدثون حدیثاً فینم علیهم والقتات الذی یتسمع علیهم وهم لایعلمون ثم ینم، الترغیب والترهیب ص:۳۲۳ ج:۳.

۳ الحدیث اخرجه البخاری باب:۵۵و۵۶ کتاب الوضوء، وفی الجنائز باب:۸۹ وفی الادب باب:۴۹، ورواه مسلم فی الطهارة حدیث:۱۱۱، وابوداؤد فی الطهارة باب:۱۱، والنسائی فی الطهارة باب:۲۶، وابن ماجه فی الطهارة باب:۲۶ بحواله الترغیب والترهیب ص:۳۲۳ ج:۳.

''باب ماجاء فی الکبر''میں گذرا ہے۔فلیراجع۔چغلخوری کی مزید تفصیل ''نقش قدم کامل یانقش اخلاق''میں چغلخوری کے عنوان کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔فصل اول، زبان کی تباہ کاریوں میں۔

مخبری اور جاسوسی:۔حدیث باب میں جاسوسی کو چغلخوری کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے، اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ شخص حکومت وقت کی طرف سے اس کام پر مقرر نہ ہو بلکہ اپنی ذاتی شرارت کی وجہ سے لوگوں کے عیوب یا حکومت مخالف نظریات سے حکام کو آگاہ کرتا رہتا ہو، اگر یہ صورت تھی تو پھر تو بلاشبہ یہ چغلخوری اور مذموم ہے۔لیکن اگر حکومت وقت کی طرف سے مقرر ہو تو اس میں دوصورتیں ہیں: ایک یہ کہ حکومت ظالمانہ سرگرمیوں میں مصروف ہو اور مخالفین کو کچلنے کے لئے جاسوس مقرر کرتی ہو اور پھر پتہ چلنے پر لوگوں کو ظلم کا نشانہ بناتی ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا اور ظلم کے مخالفین جو عدل کا مطالبہ کرتے ہوں، ان کی مخبری کرنا ظلم اور عدوان میں تعاون ہے اس لئے یہ صریح حرام ہے چونکہ بنوامیہ کے بعض حکمران اپنے مخالفین کو ادنیٰ شبہ ہو جانے پر قتل کرتے تھے اس لئے یہ وہی صورت بن گئی کہ ان کے لئے جاسوسی کرنا ظلم میں مدد کرنا تھا۔

اگر حکومت اسلامی اصولوں پر کاربند ہو اور عدل وانصاف کی راہ پر گامزن ہو مگر وہاں بعض لوگ حکومت کو گرانے کے لئے غیر اسلامی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے مخالفت کرنے اور اس کے لئے لوگوں کی ذہن سازی کرنے میں مصروف ہوں یا غیر مسلم کے ساتھ ان کے روابط ہوں تو ایسے میں ان کے مذموم عزائم روکنے کے لئے تجسس کرنا اور ان کی سرگرمیوں سے حکومت کو آگاہ کرنا مذموم نہیں بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے۔

اسی طرح کافروں کے لشکر میں جاکر یا ان کے ملک میں جاکر اسلامی حکومت کو غیر مسلم سرگرمیوں سے آگاہ رکھنا بھی جائز ہے بلکہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کی فضلیت کے لئے باب قائم کیا ہے:

"باب فضیلة الطلیعة ،عن جابر قال قال النبی صلی الله علیه وسلم :من یأتینی بخبر القوم یوم الاحزاب فقال الزبیرانا"۔الحدیث،(بخاری ص:۳۹۹ ج:۱)

البتہ اگر جاسوس کفار کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی کرے اور پکڑا جائے تو اسے قتل بھی کیا جاسکتا ہے چنانچہ امام بخاری (ص۴۲۱ج۱) پر ایک باب قائم کرتے ہیں:''باب الجاسوس والتجسس التبحث وقول الله تعالیٰ:لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء''۔[۳] اس پر محشی نے فتح الباری سے نقل کیا ہے کہ

---

[۳] سورة ممتحنة آیت: ۱.

اگر ایسے جاسوس کے بارے میں بعض مسلمانوں کو پتہ چل جائے تو اس پر خاموشی اختیار نہ کریں بلکہ حکومت کو آگاہ کریں تا کہ وہ اس کا فیصلہ کرے۔ تاہم اس کو قتل کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے (بخاری ص ۴۲۲ ج ۱، حاشیہ نمبر ۱) پھر آگے اسی جلد کے ص ۴۲۸ پر امام بخاریؒ نے ایک اور باب قائم کیا ہے: "باب الحربی اذا دخل دار الاسلام بغیر امان"۔ اس میں حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرکین کا ایک جاسوس آ گیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے، وہ شخص صحابہ کرام کے پاس بیٹھا اور بات چیت کرتا رہا، پھر اٹھ کر چلا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے تلاش کر کے قتل کر دو۔

آج کل یہ صورت پیش آتی ہے کہ مسلمانوں میں سے ایسے لوگ ہیں جو کافروں کے لئے جاسوسی کرتے ہیں، ان کا مقصد صرف پیسے کمانا ہے، ان کی جاسوسی سے مسلمانوں اور مسلم حکومتوں کو غیر معمولی نقصان اٹھانا پڑتا ہے، ایسے لوگ چونکہ کلمہ گو ہوتے ہیں اس لئے ان کے قتل میں علمائے وقت کی دو رائے ہیں: ایک رائے عدم قتل کی ہے، جو ان کے اسلام کو دیکھتے ہوئے قائم کی گئی ہے۔ دوسری ان کو قتل کرنے کی ہے، یہ ان کے کردار کو دیکھتے ہوئے قائم کی گئی ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ بہت مشکل ہے اور کوئی حتمی فیصلہ کرنا آسان نہیں، تاہم بعض لوگ محض شبہ کی بناء پر جاسوسی کا الزام لگا کر لوگوں کو قتل کرتے ہیں جبکہ وہ کلمہ اسلام پڑھتے رہتے ہیں یہ کام اتنا ہی خطرناک ہے جتنا ان جاسوسوں کا کام تباہ کن ہے۔ یہ وہی صورت بن جاتی ہے جس میں کسی مفتی کے لئے فیصلہ کرنا اور فتویٰ دینا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

راقم کی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ آج کل اس بارے میں دونوں فریقین کی طرف سے بے اعتدالی اور زیادتی دیکھنے میں آتی ہے، اس لئے کرنے والے تو اپنا کام کر ہی لیتے ہیں مگر اس بارے میں قتل کے جواز کے فتویٰ سے بے گناہوں کے قتل کا راستہ بھی کھل جاتا ہے کہ لوگ اپنی ذاتی دشمنی کی بناء پر بھی الزام لگا دیتے ہیں اور ملزم پر غیر معمولی تشدد کر کے اس سے اپنے حق میں اقرار اُگلوا لیا جاتا ہے، اس لئے میں اس میں توقف ہی اولیٰ سمجھتا ہوں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی العِیِّ

"عن ابی امامة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال:الحیآء والعِیُّ شعبتان من الایمان، والبذاء والبیان شعبتان من النفاق "۔(هذاحدیث حسن غریب)...قال والعِیّ قلة الکلام ،والبذآء هوالفحش فی الکلام ،والبیان هو کثرة الکلام مثل هؤلآء الخطبآء الذین یخطبون فیتوسعون فی الکلام ویتفصحون فیه من مدح الناس فیمالایرضی اللّٰه"۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: حیاءاور کم گوئی دونوں ایمان کے شعبے ہیں۔اور بے ہودہ گوئی اور کثرت گوئی دونوں نفاق کے شعبے ہیں۔

لغات:۔قولہ"العِیّ" بکسرالعین وتشدیدالیاءاصل میں عدم قدرت علی الکلام کی وجہ سے عدم کلام کو کہتے ہیں۔عارضہ میں ہے کہ"وهوترك القول اوالفعل بالعجزعنهما"۔تاہم یہاں عِیّ بیان کے مدمقابل ہے یعنی کلام کے وبال سے بچنے کے لئے زیادہ بولنے سے پرہیز کرنا جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس کی طرف اشارہ اورملاعلی قاریؒ نے مرقات میں تصریح فرمائی ہے۔(کذافی حواشی الترمذی،قوت ومجمع)قولہ "والبیان" "هو کما قال الترمذی کثرة الکلام"،یعنی بوجہ کبرزیادہ بولنامراد ہے۔[1]

تشریح:۔ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ کسی بات کو چھوڑنا یعنی نہ بولنااورفعل کوترک کرنا کبھی محمود ہوتے ہیں اور کبھی مذموم،وہ اس طرح کہ جس بات یافعل کوترک کیاجاتا ہے اگروہ مذموم ہوں تو یہ ترک یعنی عِیّ محمود ہے اوراگروہ بات اورکام اچھے ہوں توان کاترک کرنااچھانہیں،اسی طرح بیان کی بھی دوقسمیں ہیں اگروہ اظہارِحق میں مفیداورسچائی پرمبنی ہوتو یہ محمودسحرہے اوراگروہ ایسانہ ہوبلکہ غلط ہوتووہ سحرِمذموم ہے۔غرض خاموشی اورگویائی دونوں کی اچھائی اوربُرائی کادارومدارا پنے اپنے متعلقات اورنتائج پرہے۔

اس تفصیل وتقسیم کے بعدہم کہہ سکتے ہیں کہ حدیث بالامیں عِیّ کامحمود پہلواوربیان کامذموم پہلومراد ہے اوریہی تفصیل حیاء میں بھی ہے کہ اگروہ اچھے کام سے مانع ہوتووہ حیاءشرعاًمحمودنہیں بلکہ

باب ماجاء فی العِیّ

[1] وفی الترغیب والترهیب: والعی قلة الکلام والبذاء هو الفحش فی الکلام، والبیان هو کثرة الکلام مثل هؤلاء الخطباء الذین یخطبون فیتوسعون فی الکلام ویتضحون فیه من مدح الناس فیما لایرضی اللّٰه ص:۲۶۸ ج:۳.

مشروع ہی نہیں ہے جیسا کہ پہلے گذرا ہے جبکہ بذاء یعنی فحش گوئی بہر حال مذموم ہے اس میں کوئی خیر کا پہلو نہیں ہے۔

عی اور حیاء کو ایمان کے شعبے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان مؤمن کے قلب میں ایک ایسے جوہر اور ملکہ کا نام ہے جو بُرائی سے روکتا اور اچھائی پر آمادہ کر دیتا ہے گویا یہ اچھائی و بُرائی کی پہچان کا ایک معیار اور پیمانہ ہے۔ اچھی بات اور ارادے کو قبول کرتا ہے اور بُرے خیال اور عمل کو رد اور ناپسند کرتا ہے پس حیاء اور عی اس کے دو شعبے یعنی دونوں ایمان کے اثرات ہیں بالفاظ دیگر ایمان حیاء اور عی کا منشاء اور مصدر ہے کہ مؤمن ہر اس کام سے دور رہتا ہے جو مذموم ہے، جسے حیاء کہنا چاہئے اور ہر اس بات سے گھبراتا اور خاموش رہتا ہے جو معیوب ہو جسے عی کہتے ہیں۔

اس کے برعکس بذاء یعنی بے ہودہ بکواس اور بیان یعنی باتوں میں تعمق اور مصنوعی فصاحت اختیار کرنا جس سے مقصد حاضرین اور سامعین و قارئین پر اپنے اعلیٰ مقام اور برتری کا اظہار ہو تکبر و لاپرواہی کا اثر ہے جبکہ تکبر و لاپرواہی منافقت کی شاخیں ہیں کیونکہ مؤمن پر عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے وہ تکبر کہاں کر سکتا ہے، مؤمن اپنی باتوں کے انجام پر نظر رکھتا ہے کہ بات کس انداز سے کہنی چاہئے اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اس لئے وہ بولتے وقت سادگی اختیار کرتا ہے اور جو بات کہتا ہے اس کی بدانجامی سے ڈرتا ہے اس لئے یا تو بھلی بات منہ سے نکالتا ہے یا پھر خاموش رہتا ہے۔ پس جو آدمی ان دونوں باتوں کا خیال نہ رکھے وہ گویا منافق ہے کہ اثر بغیر مؤثر کے نہیں پایا جاتا، لہٰذا جب منافقت کی یہ دونوں علامتیں پائی جائیں گی تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ آدمی منافق (فی العمل) ہے یا اس کے اندر منافقت کے دو شعبے آگئے، لہٰذا اسے ڈرنا چاہئے کہ اگر ان شعبوں کی تعداد بڑھ گئی تو عین ممکن ہے کہ وہ عین منافق بن جائے۔ والعیاذ باللہ

واضح رہے کہ فطری ملکۂ فصاحت یا کثرت مواعظ و تدریس و تالیف سے حاصل ہونے والے ملکہ یا نیک نیتی پر مبنی اور خود بینی سے پاک فصیح کلام کرنا شرعاً معیوب نہیں، اس حدیث میں بیان کی مذموم قسم مراد ہے۔ کمامر

باب ماجاء ان من البیان سحراً

"عن ابن عمران رجلین قدمافی زمان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فخطبافعجب الناس من کلامھما فالتفت الینارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال:ان من البیان سِحراًاوان بعض البیان سحر"۔(حدیث حسن صحیح)[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو آدمی آئے اور دونوں نے خطبے دیئے (یعنی تقریریں کیں) تو لوگ ان کے خطبوں پر حیران رہ گئے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ بعض تقریر جادو سی ہوتی ہے۔

لغات:۔قولہ "سحر" تفسیر روح المعانی میں ہے کہ یہ لفظ مصادر شاذہ میں سے ہے اس کا ماضی اور مضارع دونوں مفتوح العین ہیں گویا باب فتح سے ہے۔سحر وہ کرتب اور عمل کہلاتا ہے جس کا سبب انتہائی مخفی اور باریک ہو۔(انتہی) بعض لوگوں نے سحر کو خوارق میں شمار کیا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں جیسا کہ علامہ خیالی نے تصریح فرمائی ہے کیونکہ امر خارق سبب پر مبنی نہیں ہوتا اس لئے اسے خارق للعادۃ کہتے ہیں جبکہ سحر تو سبب پر مبنی ہوتا ہے اگرچہ وہ سبب باریک اور دقیق ہو۔یہاں لفظ "او" شکِ راوی کے لئے ہے۔

تشریح:۔یہ دونوں آدمی کون تھے جنہوں نے حضو اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے اپنے خطبے پیش کئے تھے؟ اس بارے میں کوئی حتمی بات کہنا تو مشکل ہے تاہم جن دو خطیبوں کے نام معلوم ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ یہ دو شخص وہی ہوں تو ان میں سے ایک کا نام حصین بن بدر بن اِمرءِ القیس ہے جس کا لقب زِبرِقان بکسر الزاء والراء والباء الساکنہ ہے جو چاند کے ناموں میں سے ایک ہے یہ لقب اسے خوب صورتی کی وجہ سے ملا تھا۔

دوسرے کا نام عمرو بن الاھتم تھا، یہ دونوں تمیمی ہیں ان کی آمد ۹ ھ میں ہوئی تھی۔(کذافی التحفہ عن

باب ماجاء ان من البیان سحراً

[1] الحدیث اخرجہ البخاری ص:۸۵۸ ج:۲ "باب من البیان السحر" کتاب الطب، صحیح مسلم ص:۲۸٦ ج:۱ "صلاۃ الجمعۃ" سنن ابی داؤد ص:۳۳۵ ج:۲ "باب ماجاء فی التشدق فی الکلام" کتاب الادب، سنن دارمی ص:۴۴۰ ج:۱ "باب فی قصر الخطبۃ" حدیث:۱۵۵٦، ایضاً مؤطا لمالک فی الکلام باب:۷، مسنداحمد ص:۴۹۸ ج:۱ حدیث:۲۷۵٦ و ۲۸۱ و ۲۸۵٦ و ۳۰۱۸.

الفتح [۲])

حاشیہ میں ہے کہ زبرقان نے اپنی مدح میں کلام پیش کیا جو فصیح کلمات پر مشتمل تھا جبکہ دوسرے نے اس کی مذمت میں بلیغانہ کلام پیش کیا۔ پہلے نے دوسرے پر حسد کا الزام لگایا۔ دوسرے نے اور زیادہ بلیغ کلام سے جواب دیا۔

احیاء العلوم للغزالی [۳] میں ہے کہ عمرو نے ایک دن زبرقان کی مدح کی اور دوسرے دن ذم، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ دریافت فرمائی تو عمرو نے کہا کہ میں نے پہلے میں بھی سچ ہی بولا تھا اور دوسرے میں بھی جھوٹ نہیں بولا ہے کل اس نے مجھے خوش کرلیا تھا تو میں نے اس کی ان خوبیوں سے مدح کی جو مجھے معلوم تھیں اور آج اس نے مجھے ناراض کرلیا تھا تو مجھے اس میں جو عیوب معلوم تھے ان کو بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان من البیان لسحراً''۔ اس میں ''من'' تبعیض کے لئے ہے یعنی بعض بیانات سحر اور جادو سا اثر رکھتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح سحر سے دوسروں پر اثر ہوتا ہے اسی طرح بعض بیانات سے بھی سامعین کے دل متغیر اور اپنی حالت سے محوّل ہوجاتے ہیں اگرچہ جادو کی طرح وہ بیان صحیح نہ ہو یا بعض بیانات سے جادو کی طرح گناہ ملتا ہے۔ دونوں توجیہوں کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان خطبوں کا عیب بیان کرتا ہے اور یہی مطلب حدیث کا ظاہر لگتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مدح ہو کہ بعض بیانات جادو کی طرح اثر رکھتے ہیں یعنی ان سے ناراض دلوں کو راضی اور سخت کو نرم و آسان بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (کذا فی الحاشیہ عن النہایۃ)

باب ماجاء فی التواضع

"عن ابی هريرة ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: مانَقَصَت صدقةٌ من مال، ولا زاد اللّٰه رجلاً بعفوٍ اِلا عِزّاً، وما تواضع احدٌ لِلّٰه اِلا رفعه اللّٰه"۔ [۱] (حسن صحيح)

[۲] فتح البارى ص: ۲۹۰ ج: ۱۰، قديمى كتب خانه كراچى.

[۳] اخرجه البيهقى فى الدلائل والطبرانى فى معجمه بحواله فتح البارى ص: ۲۹۱ ج: ۱۰.

باب ماجاء فى التواضع

[۱] الحديث اخرجه مسلم ص: ۳۲۱ ج: ۲ "باب استحباب العفو والتواضع" كتاب البر والصلة.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی صدقہ نہیں گھٹاتا مال کو، اور کسی کے معاف کرنے سے اللہ نے اس کی عزت ہی بڑھائی ہے اور کسی نے اللہ کے لئے تواضع نہیں کی مگر اللہ نے اسے اونچا فرمایا۔

لغات:۔ قولہ "من مال" اس 'مِن' میں تین احتمالات ہیں: (۱) زائد ہونا۔ (۲) تبعیض کا ہونا اور (۳) بیانیہ ہونا اور ترجمہ میں بیانیہ کوملحوظ رکھا ہے۔ قولہ "تواضع" جو شخص اللہ کی معرفت کی بناء پر اللہ کی رضا کی خاطر یا مخلوق پر رحم کی خاطر اپنے اصل درجہ سے کم پر راضی ہو جائے یا خود کو پست کردے تو اس فضیلت کا نام تواضع ہے اس سے نیچے درجہ کا نام ذلت ہے جو رذیلت ہے یعنی اپنے حظ النفس اور ذاتی مفادات کے لئے اپنی رسوائی واہانت پر راضی ہونا ذلت ہے، تواضع فضیلت ہے جبکہ ذلت عیب اور رذیلت ہے۔

تشریح:۔ صدقہ دینے سے مال کم نہ ہونے کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ دنیا میں مال بڑھ جاتا ہے یا کم از کم بقدر صدقہ کے اس میں واپس آ جاتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اگرچہ کمی محسوس ہوگی مگر آخرت میں وہ مال محفوظ بلکہ مضاعف ہو جاتا ہے اور یہ دونوں مطلب بیک وقت صحیح ہیں کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ مال خرچ کرتے ہیں ان کے ذرائع آمدن بڑھ جاتے ہیں اور آخرت میں ایک کھجور احد پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے۔

اسی طرح مطلب دوسرے جملے کا یہ ہے کہ معاف کرنے سے، جبکہ انتقام کی قدرت حاصل ہو، آدمی لوگوں میں معالی اخلاق سے مشہور اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات سے معمور ہو جاتا ہے اور اس کے عیوب مستور ہو جاتے ہیں کیونکہ معافی محبت پیدا کرتی ہے اور انتقام نفرت۔

جہاں تک تواضع کا تعلق ہے جس کے لئے امام ترمذیؒ نے باب باندھا ہے تو اس کی فضیلت تو بہت ہی زیادہ ہے، تواضع کی وجہ سے آدمی بلند و بالا ہو جاتا ہے جیسا کہ حدیث باب میں اس کی تصریح کی گئی ہے، اس کی بناء پر آدمی ان تمام وعیدات ومہلکات سے محفوظ ہو جاتا ہے جو تکبر کی وجہ سے یقینی ہیں، اور یہ کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے اخلاق میں سے ہے، اس کی وجہ سے آدمی اللہ کا شکر گذار بندہ بن جاتا ہے اور یہ کہ یہ انسان کی اصل فطرت مٹی سے ہم آہنگ ہے جبکہ تکبر شیطان کی فطرت آگ سے ملتا ہے، اور یہ کہ تواضع میں کسی کو حسد نہیں ہوتا، اور یہ کہ تواضع عقلمندی کا اثر ہے جبکہ تکبر حماقت کا نتیجہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تاہم تواضع کا جاننا ایک باریک امر ہے بعض لوگ تواضع کا دعوی کرنے اور تواضع کا عمل کرنے کے

باوجود متکبر ہوتے ہیں جبکہ بعض ذلت ورسوائی کو تواضع سمجھتے ہیں یہ بڑی غلطی ہے۔مزید تفصیل مطلوب ہوتو راقم کی کتاب ''نقش قدم'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

باب ماجاء فی الظُلم

''عن ابن عمرعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:الظلم ظلمات یوم القیٰمة''۔[1] (حسن غریب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ظلم قیامت کے دن بہت سے اندھیروں پر مشتمل ہوگا۔

لغات:۔قولہ''الظلم''کسی چیز کو اپنے محل وموقع سے ہٹانے کو ظلم کہتے ہیں یعنی مکمل طور پر کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹانا ہو یا کمی بیشی کی صورت میں تجاوز عن الحد ہو پھر یہ تجاوز وقت سے ہو یا مکان سے،اسی مناسبت سے اس کا اطلاق ناانصافی،غلط روش اور ستم پر بھی ہوتا ہے۔حدیث میں اس سے ناانصافی اور حق تلفی مراد ہے جو عدل کے مقابل ہے۔پھر یہ حق تلفی خواہ حقوق اللہ میں ہو یا حقوق العباد میں۔

تشریح:۔چونکہ عدل اور دیگر نیک اعمال سے قیامت کے روز انوار پیدا ہوں گے جو آدمی کے ساتھ محشر میں اور پل صراط پر جنت کے داخلے تک رہیں گے،اور ظلم تو عدل کی ضد ہے لہٰذا اس سے اندھیرا جنم لیتا ہے جو قیامت میں آدمی پر چھایا رہے گا۔والعیاذ باللہ،اس کی وجہ یہ ہے کہ عدل اور نیکیاں قلبی ہدایت اور نورِ ایمانی کے ثمرات ہیں جبکہ ظلم اور گناہ دل کا نورِ ہدایت سے خالی ہونے کے اثرات ہیں اور عالَم آخرت میں اعمال کے اثرات اپنے دنیاوی بنیادوں پر مبنی اور ان کے مشابہ ہوتے ہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ دنیا کے ایک ظلم سے آخرت میں کئی ظلمات کیسے بنیں گے تو اس کے دو جواب ہیں:ایک یہ کہ ظلم سے مراد جنس ہے جو کثرت کے منافی نہیں،لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے مظالم آخرت میں اندھیرے ہوں گے۔دوسرا جواب:یہ ہوسکتا ہے کہ جس طرح نیکی کا صلہ بہت بڑا ہوتا ہے اور ایک کھجور بطور صدقہ خرچ کرنے

باب ماجاء فی الظلم

[1] الحدیث اخرجه البخاری ۳۳۱ ج:۱ ''باب الظلم ظلمات یوم القیامة'' کتاب المظالم، ومسلم ص:۳۲۰ ج:۲ ''باب تحریم الظلم'' کتاب البر والصلة.

سے وہ احد پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے تو اس طرح ایک ظلم بھی اتنا بڑھے گا کہ ہر طرف پھیلنے سے وہ کثیر محسوس ہوگا کیونکہ جب نور ہر طرف ہوگا تو اندھیرا بھی اس پر چاروں طرف سے محیط ہوگا۔

ابن جوزیؒ فرماتے ہیں ظلم دو گناہوں پر مشتمل ہوتا ہے ایک ناانصافی جیسے کسی کمزور کا مال لیا۔ اور دوم قلبی اندھیرا کیونکہ اگر ظالم کے دل میں نورِ ہدایت ہوتا تو وہ ظلم نہ کرتا، اس لئے ظلم کا متعدد بن جانا کوئی نامعقول بات نہیں اور نہ ہی اصول کے خلاف ہے۔ بعض شارحین نے ظلمات سے تکلیفات اور عقوبات کے معنی لئے ہیں یعنی ظالم جس کو تکلیف پہنچاتا ہے اس کے انتقام میں ظالم پر قیامت کے روز کئی سختیاں مسلط کی جائیں گی۔

باب ماجاء فی ترک العیب لِلنعمة

"عن ابی ھریرۃ قال ماعاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم طعاماًقط کان اذااشتھاہ اکلہ وإلّا ترکہ"۔(حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کھانے میں عیب نہیں نکالا (یعنی عیب بیان نہیں فرمایا) اگر خواہش ہوتی تو کھالیتے ورنہ اسے چھوڑ دیتے۔

تشریح:۔ یہاں طعام سے مراد پکا ہوا کھانا ہے اور عیب سے مراد وہ خامی ہے جو پکانے والے سے رہ جاتی ہے جیسے نمک کا کم یا زیادہ ہونا، کھانا کچا یا جلا ہوا ہونا وغیرہ۔

اگرچہ گھر والوں کو تنبیہ کرنے کی غرض سے اور تادیب کی نیت سے کھانے کے نقصان کے بارے میں بتانا جائز ہے تاکہ اس خامی کا ازالہ آئندہ کے لئے ہوسکے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معالی اخلاق کا اصول یہ تھا کہ کسی کے دل کو ذرہ بھی تکلیف پہنچانا گوارا نہیں فرماتے اور ہر اس راستے سے بچتے جہاں کسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہوسکتا ہو، چونکہ عیب جوئی میں پکانے والے کا دل پریشان ہوجاتا ہے خاص کر عورتیں اس بارے میں بہت حساس ہوتی ہیں اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں عیب ظاہر نہیں فرمایا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک کھانا مجلس میں کسی کو پسند ہوتا ہے اور کسی کو نہیں، تو عیب نکالنے سے دوسرے حاضر مجلس والوں پر جو ممکن ہے شوق سے کھاتے ہوں منفی اثر پڑتا ہے۔ نیز کھانے مین لذت تلاش کرنا دنیا کی چیزوں کی طرف جھکاؤ سا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانے کے بارے میں ناممکن ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانے کی زیادہ تعریفیں بھی ثابت نہیں، ہم لوگ جب کسی

مہنگے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں تو پھر عرصہ تک اسے یاد رکھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان نہ تھی۔

باب ماجاء فی تعظیم المؤمن

"عن ابن عمر قال صعد رسول الله صلى الله عليه وسلم المنبر فنادى بصوتٍ رفيع قال يامعشر من قد اسلم بلسانه ولَم يفض الايمان الى قبله ،لاتؤذوا المسلمين ولا تُعيّروهم ولا تتبِعوا عوراتهم فانه من تتبّع عورة اخيه المسلم تتبّع الله عورته ومن يتبع الله عورته يُفضِحه ولو فى جوف رحله،قال ونظر ابن عمر يوماً الى البيت او الى الكعبة فقال:ماعظمك واعظم حرمتك والمؤمن اعظم حرمةً عندالله منك"۔[1] (هذاحديث حسن غريب ،واخرجه ابن حبان فى صحيحه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے تو بلند آواز سے پکار کر فرمانے لگے: اے ان لوگوں کے گروہ! جو زبانی اسلام لائیں ہیں اور ان کے دلوں تک ایمان نہیں پہنچا ہے، مسلمانوں کو ایذاء مت پہنچاؤ اور نہ ہی ان کو شرمندہ کرو اور ان کے رازوں کے درپے مت ہونا، کیونکہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے خُفیہ رازوں کے پیچھے پڑتا ہے (یعنی اس کے عیوب ظاہر کرتا ہے) تو اللہ اس کے مخفی عیوب کو ظاہر فرماتا ہے اور اللہ جس کی چھپی ہوئی بات کو ظاہر فرما دیتا ہے تو اس کو فضیحت یعنی رسوا کر دیتا ہے گو وہ اپنے گھر کے اندر کیوں نہ ہو۔ راوی کہتا ہے کہ ابن عمرؓ نے ایک دن بیت اللہ کی طرف دیکھا، یا (راوی کو شک ہے) کعبے کی طرف دیکھا تو فرمایا کہ تو کس قدر عظیم ہے اور کس قدر بڑی حرمت والا ہے، تاہم مؤمن کی حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے بڑھ کر ہے۔

لغات: قولہ "صَعِدَ" بکسر العین صعود کے معنی چڑھنے کے ہیں جبکہ اصعاد کے معنی ہموار زمین میں چلنے کے آتے ہیں۔ قولہ "ولم یفض" افضاء سے بمعنی پہنچنے اور اُترنے کے آتے ہیں۔ قولہ "لاتعیّروا" تعییر سے بمعنی عار دلانے اور شرمندہ کرنے کے ہے۔ قولہ "ولا تتبعوا" تتبع باب افتعال بمعنی تجسس اور تلاش کے آتا ہے۔ قولہ "عوراتهم" عورت کی جمع ہے خفیہ حالت جس کا اظہار باعث شرم سمجھا جاتا ہے۔ قولہ "تتبع

باب ماجاء فى تعظيم المؤمن

[1] وفى سنن ابن ماجه: والذى نفس محمد بيده لحرمة المؤمن اعظم عندالله حرمة منك ماله ودمه الخ ص: ۲۸۲ ابواب الفتن، ايضاً رواه الدارمى فى المناسك.

اللّٰہ" یہ اطلاق مشاکلۃً ہے یہاں مراد کشف اور اظہار ہے۔ قولہ "یفضحہ" فضیحت شرمندگی اور بدنامی کو کہتے ہیں۔ قولہ "او الی الکعبة" راوی کو شک ہے کہ اصل لفظ بیت کا ہے یا کعبے کا، اس لئے دونوں احتیاطاً لایا تاکہ لفظ رہ نہ جائے جیسا کہ عام قاعدہ ہے۔ قولہ "ماأعظمك واعظم حرمتك" دونوں فعل تعجب کے صیغے ہیں۔ قولہ "حرمة" بضم الحاء اس کے کئی معنی ہیں: مثلاً بیوی جسے حریم بھی کہتے ہیں اور عزت، عظمت، ممانعت وغیرہ پر اطلاق ہوتا ہے مگر یہاں معنی مراد وہ حق ہے، جس کی رعایت واجب ہو اور پامال کرنا ممنوع ہو۔

تشریح:۔ آنحضرت کا یہ خطبہ اُونچی آواز میں دینا عام عادتِ شریفہ کے مطابق بھی ہوسکتا ہے کہ خطبے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں سرخ اور آواز بلند ہوجاتی جیسے کوئی دشمن کے لشکر کی آمد سے ڈرانے والا ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کے متعلق سُنا ہو یا بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی ہو کہ وہ مسلمانوں اور کامل مخلصین کے خلاف زبان درازی کرتے اور ان کے عیوب تلاش کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ پہلی صورت میں یہ عام ارشاد معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب منافقین اور ضعیف الایمان سب لوگ ہوں جبکہ دوسری صورت میں بظاہر زبانی مسلمانوں سے منافقین مراد ہیں کیونکہ وہ کاملین کے خلاف منفی پروپیگنڈا کرتے رہتے تھے۔

بہر حال اس ارشاد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دوسروں کے عیوب کی پردہ کشائی کرتا ہے تو اللہ اس کے عیوب کو لوگوں پر ظاہر فرماتے ہیں جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ غیبت کرنے والا شخص لوگوں کی نظروں میں ذلیل وحقیر ہوتا ہے۔

ترمذی کے ابواب "صفة القیٰمة" میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے "من عیّر اخاہ بذنب لم یمت حتی یعمله"۔ اسی صفحہ پر ایک اور روایت ہے "لاتظهر الشماتة لاخيك فيرحمه الله ويبتليك"۔ اس کے اگلے باب میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما اُحب انی حکیتُ احداً وان لی کذا و کذا"۔ (انظر ص ۷۷ ج ۲، ایچ ایم سعید کراچی) اس صفحے پر اور بھی احادیث ہیں۔

ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسروں کے عیوب کے درپے ہونے سے نہ صرف آدمی کے اپنے عیوب کھل جاتے ہیں بلکہ وہ جس کو عار دلاتا ہے وہ عیب بھی اس کے اندر آجاتا ہے اور جو آدمی دوسروں کی تکلیف پر خوش ہوتا ہے یا خوشی کا اظہار کرتا ہے تو اللہ اس مصیبت زدہ پر رحم فرماتا ہے اور خوشی کرنے والے کو پکڑ لیتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کسی کا عیب نقل کرنا پسند نہیں کرتا اگرچہ مجھے ساری دنیا دی جائے۔

چونکہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے ہونا تو یہ چاہئے کہ جو عیب دوسرے میں نظر آجائے آدمی اپنے گریبان میں جھانکے اگر وہ اس کے اندر بھی ہے تو خود سے اور اپنے بھائی سے اس کا ازالہ کرے۔ اور اگر اس کے اندر نہیں تو اللہ کا شکر کرے اور بھائی کی فکر کرے اور کیا معلوم کہ جو عیب نظر آرہا ہے وہ ظاہری ہی ہو اور اس کا باطن طاعن سے اچھا ہو اور کرامت کا دارومدار تو تقوی پر ہے نہ کہ ظاہری شکل وہیئت پر، پس جو آدمی ایسا نہیں کرتا وہ کامل مؤمن نہیں یا پھر خالص منافق ہے۔

اس سلسلے میں حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول اس باب میں نقل کرنا بہت ہی معنی خیز استدلال ہے کہ لوگ کعبہ شریف کی تو قدر وعزت کرتے ہیں لیکن بعض لوگ مؤمن کی قدر نہیں کرتے حالانکہ مؤمن کی حرمت عند اللہ کعبے سے زیادہ ہے۔

اس کی وجہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ''المسک الذکی'' میں یہ فرمائی ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کی تجلی کا محل ہے، کعبہ مکرمہ میں ایک دو تجلی کا ظہور ہے جبکہ مؤمن تمام تجلیات ربانیہ کا مظہر ہے۔ تدبر۔ عیب اگر گناہ کا ہو تو اس سے توبہ کرنے کے بعد عار دلانا مطلقاً ممنوع ہے اگر وہ شخص اس میں مبتلا ہو تو ستر علی المسلم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے بچاؤ کا ایسا راستہ نکالنا جائز ہے جس سے شرمندہ کرنا مراد نہ ہو بلکہ روکنا ہو خواہ تعزیر سے ہو یا تعبیر سے۔

باب ماجاء فی التجارب

"عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاحلیم الاذوعثرۃ ولاحکیم الاذو تجربۃ"۔[1] (حدیث حسن غریب)

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بُردبار کوئی نہیں مگر لغزش (پھسلن) کرنے والا اور حکیم کوئی نہیں ہوتا مگر تجربے والا۔

لغات: قولہ "عثرۃ" بفتح العین پھسلنے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد غلطی کرنا ہے کیونکہ غلطی سے بھی آدمی صحیح راستے سے ہٹ جاتا اور پھسل جاتا ہے۔ قولہ "تجربۃ" آزمائش کے معنی میں آتا ہے۔ اردو میں اس کی

باب ماجاء فی التجارب

[1] الحدیث اخرجہ احمد فی مسندہ ص: ۱۸۱ ج: ۳ حدیث: ۱۱۲۶۴۔

جمع تجربات آتی ہے، مگر عربی میں تجارب، جیسے ترجمۃ الباب میں ہے۔

تشریح:۔ جیسا کہ پہلے گذرا ہے کہ ''لا'' کبھی نفی جنس کے لئے آتا ہے اور کبھی نفی کمال کے لئے۔ بظاہر یہاں نفی کمال کے لئے ہے کیونکہ کچھ نہ کچھ تحمل و برداشت اور حکمت تو بطور ملکاتِ ذاتیہ اکثر لوگوں میں ہوتی ہیں۔ لیکن بطور ملکات فاضلہ کے جو درجۂ کمال تک پہنچے ہوں وہ بردبار کے لئے لغزش پر مبنی ہے اور دانا وعقلمند کے لئے تجربہ وآزمائش پر موقوف ہے۔ جب آدمی خود غلطی کرتا ہے تو اس کے انجام سے ڈرنے لگتا ہے پھر وہ معافی کا طلب گار ہوتا ہے جس سے معافی کی قدر معلوم کر لیتا ہے کہ یہ کتنی عزیز اور محبوب چیز ہے، اس لئے وہ دوسروں کی غلطیوں سے درگذر کو پسند کرتا ہے کیونکہ مؤمن دوسروں کے لئے وہی پسند کرتا ہے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

اسی طرح جو آدمی تجربہ کار ہو تو اس کی دانائی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ تجربہ سے اشیاء کے احوال سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جہاں دیدہ آدمی زیادہ ہوشیار ہوتا ہے، عورتیں چونکہ گھروں تک محدود ہوتی ہیں اس لئے ان کی عقل کم ہوتی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اصلی عقل کی بات ہو رہی ہے، بلکہ یہ عقل تجربی کا ذکر ہے جہاں تک جبلّی عقل ہے تو وہ انسانوں میں متفاوت ہوتی ہے گو تجربہ سے وہ بڑھتی بھی ہے، ''میبذی'' اور ''المستطرف فی کل فنٍ مستظرف'' میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

حاشیہ قوت میں ہے کہ یہ حدیث ان میں سے ایک ہے جس کی بناء پر سراج الدین القزوینیؒ نے صاحب مصابیح پر تنقید کی ہے۔ اور موقف اختیار کیا ہے کہ یہ موضوع ہے کیونکہ اس میں درّاج عن ابی الھیثم کی روایت ہے جو صحیح نہیں۔ دوسری طرف بعض حضرات جیسے ابن حبان، امام حاکم کا میلان اس کی صحت کی طرف ہے، بلکہ مناوی نے تو شرح الجامع الصغیر میں اس کی صحت کی تصریح کی ہے۔ قوت میں ہے:

''فحاصل الامر ان هذا الحديث باول درجات الحسن او هو ضعيف ضعفاً يحتمل واما الحكم بوضعه فلا''۔

باب ماجاء فی المتشبّع بمالم یُعْطَه

عن جابر عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: من اُعطی عطاءً فوجد فلیجزبه ومن لم یجد فلیثن فان من اثنی فقد شکر ومن کتم فقد کفر ومن تحلّیٰ بمالم یعطه کان کلابس ثوبی زور"۔[1] (حدیث حسن غریب، ومعنی قوله: ومن کتم فقد کفر یقول کفر تلك النعمة)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو کوئی عطیہ دیا گیا اور اس کی (بدلہ دینے کی) گنجائش ہو تو اسے بدلہ دینا چاہئے، اور اگر گنجائش نہ ہو تو تعریف کرنی چاہئے (جیسے شکریہ یا دعاء وغیرہ) کیونکہ جس نے (دینے والے کی) تعریف کی تو اس نے شکریہ ادا کرلیا، اور جس نے نظر انداز کیا تو اس نے ناشکری کی، اور جس نے ایسی چیز سے خود کو مزین کیا جو اس کو دی نہیں گئی ہو تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی مانند ہے۔

لغات: قولہ "المتشبّع" شَبِعَ سے باب تفعل کا صیغہ ہے شبعان بھرے ہوئے پیٹ کو کہتے ہیں، چونکہ باب تفعل کی ایک خاصیت تکلف بھی ہے اس لئے متشبع سے مراد وہ شخص ہے جو شکم سیری کا اظہار کرے دراں حالیکہ وہ بھوکا ہو۔ پھر یہ لفظ بناوٹی ومصنوعی دکھاوے کے لئے استعمال میں مشہور ومستعار ہوا ہے جو یہاں مراد ہے۔ قولہ "من اعطی" مجہول کا صیغہ ہے۔ قولہ "عطاءً" بمعنی عطیہ کے ہے یا مفعول مطلق ہے، مفعول مطلق بنانے کی صورت میں مفعول بہ مقدر ماننا پڑے گا یعنی من اعطی عطیۃً اور حذف میں تعمیم کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بھی چیز دی گئی ہو جبکہ بعض روایات میں عطاءً کے بعد شیئاً مذکور ہے پھر تقدیر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ قولہ "فوجد" یعنی مالی گنجائش موجود ہو۔

قولہ "فلیجزِ" جزاء سے امر کا صیغہ ہے، اس میں جیم ساکن ہے یعنی بدلہ دیدے۔ قولہ "فلیثن" بضم الیاء اس کی ثناء یعنی تعریف کرے۔ قولہ "ومن کتم" کتمان کے معنی چھپانے کے ہیں یعنی اگر اس نے عطیہ کا بدلہ بھی نہیں دیا اور شکریہ وغیرہ بھی ادا نہیں کیا تو اس نے گویا وہ نعمت چھپالی اور کفران وناشکری کے پردے میں

باب ماجاء فی المتشبع بمالم یعطه

[1] الحدیث اخرجه بمعناه البیهقی فی السنن الکبری ۱۹۹/۴ والحاکم فی المستدرک ۶۳/۲ واحمد فی مسنده ۹۰/۲، واورده المصنف فی زوائد المسند برقم: ۲۸۸۲ والمتقی الهندی فی کنز العمال برقم: ۱۶۵۲۲، بحواله مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸ حدیث: ۱۳۶۴۱۔

لپیٹ لی۔ قولہ "کفر" کفران سے ہے بمعنی ناشکری کے۔ قولہ "تَحَلّی" حلی سجاوٹ اور زینت کے سامان کو کہتے ہیں۔ یہ بھی تشبع کی طرح باب تفعل کی خصوصیت کی بناء پر بمعنی بناوٹی اظہار زینت کے ہے۔ قولہ "کلابس ثوبی زور" لابس اسم فاعل کا صیغہ ہے اور کاف تشبیہ کے لئے ہے۔ ثوبین کا نون اضافت کی وجہ سے ساقط ہوا ہے اور زور جھوٹ کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ بعض روایات کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں ایک عورت حاضر ہو کر کہنے لگی اے اللہ کے رسول! میری ایک سوکن ہے تو کیا مجھ پر کوئی گناہ ہوگا کہ میں شکم سیری کا تأثر دوں جبکہ شوہر نے مجھے دیا نہ ہو (یعنی سوکن کو دکھانے کے لئے کہ میرا شوہر مجھ سے زیادہ محبت کرتا ہے اور بہت کھلاتا پلاتا ہے) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔ (کذا فی التحفۃ)

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی چیز سے محروم ہے اور وہ اس چیز کی موجودگی کا دعوی کر رہا ہے اور تأثر دیتا ہے کہ میں اس چیز سے مالا مال ہوں اور یہ تأثر دینے کے لئے وہ غلط راستہ اختیار کرتا ہے، اور مقصد بھی بُرا ہو مثلاً سوکن کو چھیڑنا مقصود ہو جس سے شوہر اور سوکن کے درمیان نفرت جنم لے گی یا کوئی شخص زاہدوں اور علماء کا روپ اختیار کرتا ہے تا کہ لوگ اسے پارسا اور علامہ سمجھے جبکہ وہ اس نعمت سے عاری ہو تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے فریب و مکاری کا روپ دھار لیا ہو، اس معنی کے اظہار کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا حوالہ دیا ہے جو بقول امام خطابیؒ کے عربوں میں گذرا ہے وہ درحقیقت جھوٹا آدمی تھا مگر اس نے اپنے جھوٹ کو بشکل سچ ظاہر کرنے کی غرض سے بااعتماد لوگوں کا لباس اختیار کر لیا تھا چنانچہ لوگ اس کی ہیئت کو دیکھ کر اسے سچا مانتے تھے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ بعض شارحین نے یہاں پر مشبہ بہ میں تثنیہ کے صیغہ کو مشکل جانا ہے کہ اس عورت کی تشبیہ دو کپڑے پہننے والے کے ساتھ کیوں دی گئی، پھر عورت یعنی مشبہ کی جانب میں دو جھوٹ بنانے کی کوشش کی ہے، ایک یہ کہ شوہر اس سے زیادہ محبت کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس کو زیادہ دیتا ہے، لیکن میرے خیال میں اس کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ اصل بات یہ ہیئت کی تشبیہ ہے ہیئت کے ساتھ چونکہ اپنی شکل وصورت بااعتماد لوگوں کی مانند بنانے کے لئے دو کپڑے پہننا پڑتے ہیں جیسے آج کل قمیص شلوار ہیں تو اس زمانے میں ازار اور چادر تھی کیونکہ یہ مقصد صرف ایک کپڑے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اور تین کی ضرورت نہیں اس لئے کوئی

اشکال نہ رہا۔

غرض جو شخص اپنی اصلیت کو چھپا کر کسی غلط مقصد کے حصول کے لئے جو راستہ اختیار کرتا ہے خواہ وہ لباس کا ہو یا اقوال کا یا اور کوئی حیلہ ہو جیسے کسی کی تحریر اپنی طرف منسوب کرنا اور کسی کارنامے کو اپنے نام کرنا وغیرہ یہ سب فراڈ اور دھوکہ میں آتا ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

ہاں اگر مقصد نیک ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسے مسلمانوں کا جاسوس بھیس بدل کر کافروں میں بظاہر شامل ہو جاتا ہے تاہم اس بات کا تعین کرنا بھی ایک مشکل کام ہے کہ کون سا مقصد نیک ہے اور کون سا مذموم ہے، کیونکہ بعض اشیاء میں اشتباہ ہو جاتا ہے مثلاً ایک شخص جو مدرسہ چلانے کا اہل نہیں ہوتا ہے مگر وہ بڑے بڑے کرتے زیب تن کر کے وسیع علم اور تقوی کا اظہار کرتا ہے اور اس پر لوگوں سے چندہ وصول کرتا ہے جبکہ وہ بجائے صحیح علماء تیار کرنے کے یا تو سرے سے مدرسہ میں طلبہ رکھتا ہی نہیں یا پھر ان کی تعلیم و تربیت کا ڈھنگ نہیں جانتا، بلکہ اس کی کوئی خواہش نہیں ہوتی کہ اس کے مدرسہ میں خدام دین تیار ہوں وہ زیادہ توجہ اپنے باورچی خانے اور آسائش وزیبائش کے سامان پر دیتا ہے، ان کو اپنی اصلیت چھپانا اس حدیث کی رو سے منع ہے۔

باب ماجاء فی الثناء بالمعروف

"عن اسامة بن زيد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صُنِعَ اليه معروف فقال لِفاعله: جزاك اللّٰهُ خيراً فقد ابلغ في الثناء". (حديث حسن جيد غريب)[1]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے ساتھ نیک سلوک کیا گیا پس اس نے ایسا کرنے والے سے کہا: جزاک اللہ خیراً تو اس نے شاندار انداز سے تعریف کی۔

تشریح:۔ معروف عام ہے خواہ کوئی ہدیہ ہو یا خدمت، مدد یا نیک مشورہ، تعلیم و تربیت اور دیگر اچھے

باب ماجاء فی الثناء بالمعروف

[1] الحديث رواه بمعناه الطبراني في الكبير ۱۴۹/۲ بحواله مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸ حديث: ۱۳۶۴۴، ايضاً مصنفه ابن ابي شيبه ص: ۲۴۰ ج: ۶ كتاب الادب.

اچھے کام ہوں۔ سابقہ باب میں گذرا ہے کہ اگر بدلہ دینے کی گنجائش ہو تو اولاً بدلہ دے مگر گنجائش نہ ہونے کی صورت میں تعریف کرے، اس باب کی حدیث گویا ثنا کی تفسیر ہے کہ اگر وہ جزاک اللہ خیراً کہہ دے تو یہ سب سے اُونچی تعریف ہے کیونکہ اس نے اپنی کوتاہی کا اقرار کیا کہ تیرا یہ سلوک اتنا زیادہ ہے کہ میں اس کا بدلہ نہیں دے سکتا پس تجھے اللہ ہی اس کا بدلہ دے اور ظاہر ہے کہ جب اس نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تو یقیناً اللہ کا بدلہ اس سلوک سے بدرجہا بہتر و افضل ہوگا۔

یہ ایسا ہے جیسے اللہ نے ہم کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے کہ ''یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلّموا تسلیماً''۔ [۲] تو ہم نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی کہ ''اللّٰھم صل علی محمد'' یعنی ہم تو قاصر ہیں، اللہ تو ہی ان پر رحمتوں کا نزول مزید بڑھا دے چنانچہ اسی بناء پر درود پڑھنے کا ثواب بھی بڑھ جاتا ہے۔ تدبر

آخر ابواب البرِّ والصلة

---

[۲] سورۃ الاحزاب آیت: ۵۶۔

ابواب الطب

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

طِب بکسر الطاء جسمانی وذہنی علاج ومعالجے کو کہتے ہیں ویسے ''ط، ب'' مادہ میں مہارت کے معنی پائے جاتے ہیں لہٰذا کہا جائے گا کہ حسن تدبیر اور مہارت سے علاج کرنے کا نام طب ہے گویا بغیر عمدگی ومہارت کے علاج کرنے والے کو طبیب نہیں کہا جائے گا۔

آج کل لوگ طبیب پر حکیم کا اطلاق کرتے ہیں یہ اطلاق گویا ذکر عام والمراد منہ الخاص کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ حکمت کا مفہوم بہت وسیع ہے جیسا کہ میبذی وغیرہ کتب کے اوائل میں بیان ہوا ہے جبکہ طب حکمت کا ایک چھوٹا سا شعبہ ہے، اور جہاں تک ڈاکٹر کا اطلاق ہے تو یہ بھی اگر چہ عام لفظ ہے ہر P.H.D کرنے والے کو ڈاکٹر کہا جاتا ہے خواہ وہ کسی بھی فن وشعبے میں ہو، تاہم اس سے بھی حکیم کی طرح عوام میں معالج ہی مراد ہوتا ہے۔

علم طب کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس کی تدوین کب ہوئی؟ اس سوال کا جواب کافی مشکل ہے بلکہ کوئی حتمی بات کہنا ناممکن ہے کیونکہ قدیم زمانے کی کوئی مستند تاریخ قرآن وسنت کے علاوہ محفوظ نہیں ہے حتی کہ یہود ونصاریٰ نے سماوی کتب کے تاریخی واقعات کو بھی اپنی تلبیسات کا نشانہ بنایا ہے اور قرآن وسنت میں علم طب کی ابتداء وتدوین کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔

طب کا ثبوت:۔ جو بات یقین سے کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانوں میں طب کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے بلکہ جانداروں کی بہت سی اقسام بھی اس علم سے وابستہ رہی ہیں اور بنی جنس حیوانی اپنی اپنی استعداد کے مطابق علاج سے مستفید رہے ہیں، اس لئے یہ علم متفقہ طور پر مسلمات میں سے ہے۔ تاہم طب اور علاج کو اسباب کے درجہ میں ماننا چاہئے اس سے زیادہ مؤثر ماننے میں ایمان کا خطرہ ہے بلکہ ضیاع ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ علاج روٹی اور پانی کی طرح ظاہری اسباب میں بھی شامل نہیں بلکہ اسباب مخفی میں سے ہے لہٰذا اس کو ظنی اسباب کا درجہ دینا چاہئے، ہاں جہاں سببیت بہت زیادہ نمایاں ہو تو اسی تناسب سے حسن ظن میں

یا یقین میں کوئی حرج نہیں، جیسے گردوں کی پتھری کے لئے جراحی سے مرض کا ازالہ یقینی ہے بشرطیکہ زخم بگڑ نہ جائے، اسی طرح ٹائیفائڈ اور ملیریا کی صحیح تشخیص سے بھی ماہر ڈاکٹر کا علاج نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے، باقی عام علاج ظنی ہے۔

دوسری جانب جو لوگ طب، علاج اور اسباب کا انکار کرتے ہیں تو ان کی بات محض بے معنی ہے وہ اس قابل نہیں کہ اس کی تردید میں وقت ضائع کیا جائے۔

امام ترمذیؒ نے ابواب میں صحیح احادیث سے ثابت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پرہیز اور علاج کی رخصت عطا فرمائی ہے بلکہ بعض روایات میں امر کے صیغے بھی آتے ہیں۔

ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث فرمائی ہے جو الگ کتابی شکل میں ''طب نبوی'' کے نام سے چھپ گئی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں: ''موجودہ معالجین کا سرمایۂ علم طب یا تو قیاس ہے، بعض نے تجربہ، بعض نے الہام ربانی، کسی نے سچا خواب اور کسی نے ایک زیرک و دانا دماغ کی پیداوار کہا ہے''۔

بہتوں نے اس فن کو حیوانات و بہائم کا درس بتلایا ہے پھر اس کی کچھ مثالیں دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ بات بھی کچھ بعید از عقل نہیں کہ وحی الٰہی کے ذریعہ مضرتوں اور منافع کا علم ہم تک پہنچا ہو۔ بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ علاج کے عمدہ ہونے کے تمام باکمال اَطبہ اور اساطین فن نے اقرار کیا ہے۔

بہر حال ان ابواب میں جسمانی، قلبی اور روحانی علاج کے بہت سارے طریقے مروی ہیں جیسا کہ باقی کتبِ احادیث میں بھی طب پر مستقل ابواب قائم کئے گئے ہیں۔

باب ماجاء فی الحِمْيَةِ

''عن ام المنذر قالت: دخل عَلَيَّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ومعه عَلِيٌّ ولنا دوال معلقة قالت فجعل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یأکل ومعه عَلِيٌّ یأکل فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لِعَلِيّ: مَه، مَه یاعلی فانك ناقِةٌ قال فجلس عَلِيٌّ والنبی صلی اللّٰه علیه وسلم یأکل قالت فجعلتُ لهم سِلقاً وشعیراً فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: یاعليّ امِن هذا فَاَصِب فانه اوفق لَكَ''۔ (هذا حدیث حسن غریب)

حضرت ام المنذر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں

تشریف لائے، حضرت علیؓ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اور ہمارے یہاں کچی کھجوروں کے خوشے لٹکے ہوئے تھے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کھانے لگے اور ان کے ساتھ حضرت علیؓ بھی کھانے لگے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا بس کرو، بس کرو اے علی! کیونکہ تم ابھی (بیماری کی وجہ سے) کمزور ہو۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت علیؓ بیٹھ گئے جبکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بدستور کھاتے رہے، ام المنذرؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ان کے لئے چقندر اور جو کا کھانا تیار کیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی اس میں سے لو کیونکہ یہ تیرے موافق (مفید) ہے۔

لغات:۔ قوله "الحِمية" بکسر الحاء، بچاؤ اور حفاظت کے معنی میں ہے اور بالخصوص مریض کے نقصان دِہ چیزوں سے پرہیز کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

قوله "دوال" دالیۃ کی جمع ہے ناپختہ کھجوروں کی شاخ۔ قوله "معلقة" لٹکی ہوئی، ممکن ہے کہ یہ درخت گھر کے صحن میں ہو اور اس کی شاخیں جھکی ہوئی ہوں مگر ظاہر یہ ہے کہ اس خوشے کو توڑ کر لایا گیا ہو اور گھر میں چھت وغیرہ کے ساتھ لٹکایا گیا ہو جیسا کہ عام معمول ہے کیونکہ یہیں کھجوریں پختہ ہو کر کھائی جاتی ہیں۔ قوله "مه مه" اسم فعل ہے بمعنی اکفف یعنی رُک جاؤ اور کھانے سے بس کرو!۔ قوله "ناقِه" بروزن صاحب اس آدمی کو کہتے ہیں جو بیماری سے ٹھیک ہو جائے مگر ابھی تک کمزوری باقی ہو۔ قوله "سِلق" بکسر السین چُقندر کو کہتے ہیں۔ یہ شلجم کی طرح ایک ترکاری ہے اس سے چینی بھی بنائی جاتی ہے جو غیر معیاری ہوتی ہے۔ قوله "فاصب" امر کا صیغہ ہے بمعنی اَدرِك یعنی كُل وخُذ۔ قوله "اوفق لك" بمعنی موافق تر اور مناسب تر کے ہے۔ یہ اسم تفضیل مبالغے کے لئے ہے تفضیلی معنی میں نہیں کیونکہ پھر تو مطلب یہ ہو جائے گا کہ کھجور بھی موافق ہے مگر چقندر زیادہ موافق ہے حالانکہ یہ معنی صحیح نہیں، لہٰذا یہ کہا جائے کہ چقندر بذات خود تیرے لئے مفید ہے کہ نرم غذا ہے لہٰذا خطرے کا اندیشہ نہیں ہے۔

تشریح:۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بالکل شروع میں کھانے سے نہیں روکا کیونکہ دو تین کھجور کھانے سے پیٹ کے سخت ہونے یا دوسرے ضرر کا اندیشہ نہیں ہوتا ہے البتہ زیادہ کھانا نازک پیٹ کے لئے نقصان دِہ ہوتا ہے کہ کھجور بھاری غذا ہے اور مرض کی وجہ سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے اس لئے جب تک مکمل صحت یابی نہ ہو تو ثقیل غذا سے پرہیز کرنا چاہئے۔ (كذافي البذل وفيه: وفي الحديث دليل على فضل علم الطب وان الطبيب يقبل قوله ويرجع اليه)

اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے امام ترمذیؒ نے پرہیز کے ثبوت پر باب باندھا ہے، اور یہی باقی علماء کی بھی رائے ہے چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے بھی اس حدیث پر ایسا ہی باب باندھا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی اس آیت سے بھی پرہیز کا ثبوت ہوتا ہے ''وان کنتم مرضی اوعلی سفر... الی قولہ .. فتیمّموا صعیداً طیباً'' الآیۃ[1]۔ اس آیت میں مریض کے لئے مرض بڑھنے سے بچنے کے لئے تیمّم کی رخصت دی گئی ہے۔

مرض لاحق ہونے سے قبل پرہیز اور دوا کا حکم:۔ باب کی حدیث سے تو یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ مرض کے دوران یا جب تک کہ اس کے اثرات باقی ہوں تو نقصان دِہ چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صورت ایسی ہو جس کو بطور حفظ ماتقدم کے اختیار کرنے سے بیماری سے بچا جا سکے تو کیا حالتِ صحت میں اس پر عمل کرنا جائز ہے؟ مثلاً زیادہ ٹھنڈے پانی سے پرہیز یا آج کل جیسے بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو ابن العربیؒ کے کلام سے اس کی کراہیت معلوم ہوتی ہے:

''فنقول ان من الطب استرسال المرء علی شھواتہ فی صحتہ، و کفّہ عمّا یضرّہ فی مرضہ من الاطعمۃ والاشربۃ فاذا احتمی فی صحتہ مخافۃ ان یمرض فھو من باب استعمال الادویۃ مخافۃ ان یمرض وھو مکروہ''۔ (عارضۃ الاحوذی)

یعنی حالت صحت میں جو دل کرے وہ آزاد ہے (یعنی امور مباحہ میں) جبکہ مرض میں نقصان دِہ کھانے پینے سے پرہیز کرے، اگر وہ صحت میں پرہیز کرے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے صحت میں مرض سے بچنے کے لئے دوا کا استعمال اور یہ مکروہ ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ اس بارے میں جستجو کے باوجود فقہ حنفیہ میں کوئی صریح جزئیہ نہ مل سکا لیکن اصول کی رُو سے ایسا لگ رہا ہے کہ جس ضرر کے لاحق ہونے کا اندیشہ قوی ہو تو اس سے بچاؤ کی صورت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں خواہ وہ تحفظ پرہیز کی صورت میں ہو یا دوا کے استعمال سے ہو، ہاں توہمات کے درپے نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح اگر کوئی چیز کسی جہت سے مفید ثابت ہوتی ہے تو اس کا استعمال بھی جائز ہے۔

چنانچہ منیۃ المصلی اور اس کی شرح للحلبی المسمی بشرح الکبیر (کبیری) میں ہے:

ابواب الطب عن رسول اللہ ﷺ

باب ماجاء فی الحمیۃ

[1] سورۃ المائدۃ آیت: ۶.

"والجنب الصحيح فى المصراذاخاف بغلبة ظنه عن التجربة الصحيحةان اغتسل ان يقتله البرداويمرضه يتيمم عندابى حنيفة رحمه الله...وان كان خارج المصريتيمم بالاتفاق"۔(کبیری ص:٦٦)

اس عبارت میں ظن غالب اور صحیح تجربے کے الفاظ یہ بتارہے ہیں کہ کسی مرض کا قوی اندیشہ جبکہ وہ مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہو اور محض خیال اور وہم نہ ہو مرخص اور مبیح ہے اس کے ضرر سے بچنے کی تدبیر کے لئے۔(تدبر) چونکہ آج کل خسرہ، پولیو اور بعض دیگر امراض کا لاحق ہونا خصوصاً بچوں کے حق میں عام مشاہدہ ہے جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے چیچک سے بچاؤ کے لئے ٹیکوں کی مہم جوئی مفید ثابت ہوئی ہے اور آج کل مذکور الصدر بیماریاں بھی کافی حد تک کنٹرول ہو چکی ہیں اس لئے میرے نزدیک ان سے حفاظت کے پیش نظر ٹیکے لگانا اور لگوانا دونوں جائز ہیں۔واللہ اعلم

ابوداؤد کے ابواب الطب میں "باب فی تمر العجوۃ" میں مرفوع حدیث ہے "مَن تَصَبَّحَ بسبع تمرات عجوة لم يضره ذالك اليوم سم ولا سحر"۔[۲] اس کے بعد دونوں بابوں میں عود ہندی اور سرمے کے فوائد مروی ہیں۔(ابوداؤد ص:۵۴۱ ج:۲، میر محمد کتب خانہ)

اس قسم کی احادیث اور مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں اگر ان کو جمع کیا جائے تو اچھا خاصا ضخیم مجموعہ بن جائے گا جس سے کم از کم جواز معلوم ہوتا ہے۔اس بارے میں طاعون زدہ علاقے میں جانے کی ممانعت والی روایت اور یہ آیت "ولاتلقوا بايديكم الى التهلكة"[۳] کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔

حدیث آخر:۔حضرت قتادۃ بن النعمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کو دنیا سے اس طرح بچاتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے مریض کو پانی سے بچاتا ہے۔

تشریح:۔اس روایت میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ بدری صحابی ہیں اور ان سے روایت کرنے والے

---

[۲] الحديث اخرجه ايضاً بخارى فى صحيحه ص:۸۱۹ ج:۲ "باب العجوة" كتاب الاطعمة، ايضاً كتاب الطب باب:۵۲و۵٦، صحيح مسلم ص:۱۸۱ ج:۲ كتاب الاشربة، ايضاً مسنداحمد ص:۲۹٦ ج:۱ حديث:۱۵۷۵، ايضاً سنن كبرى للبيهقى ۳۴۵/۹، وابونعيم فى الحلية ۳٦۲/۵، والبغوى فى شرح السنة ۳۲۴/۱۱، واورده المصنف فى زوائد المسند برقم: ۴۰۴٦، والمتقى الهندى فى كنزالعمال: ۲۸۲۰۵، ۳۴۸۵۰، بحواله مجمع الزوائد ص:۳٦ ج:۵ كتاب الاطعمة. [۳] سورة البقرة آيت:۱۹۵.

حضرت محمود بن لبید بھی صحابی ہیں جیسا کہ امام ترمذیؒ نے تصریح کی ہے تاہم ان کی عمر چھوٹی تھی اس لئے یہ روایت بغیر واسطہ قتادہ کے مرسل ہوگی جیسا کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے۔ مگر اس سے روایت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑیگا کہ ''الصحابة کلهم عُدول''۔ لہٰذا مراسیل صحابہ بالاتفاق حجت ہیں۔

اس روایت میں ''حماه الدنیا'' میں لفظ ''من'' مقدر ہے ''ای حماه من الدنیا''۔ اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ دنیا انسان کے لئے رغبت کی چیز ہے مگر وہ سخت نقصان دِہ ہے، جب آدمی کے پاس زیادہ مقدار میں جمع ہوجائے تو آدمی حدِ آدمیت سے عموماً خارج ہوجاتا ہے اور اپنے فرائض سرانجام دینے کے بجائے خواہشات نفسانیہ کی تکمیل میں لگ جاتا ہے، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب بندوں کو دنیا کے مناصب اور مال ومتاع سے دور رکھتے ہیں تاکہ وہ بد دماغی کا شکار نہ ہوں۔ اس مضمون کو سمجھانے کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض کی مثال دی ہے مگر یہاں یہ قید ملحوظ رہے کہ یہاں تمام بیماروں کی بات نہیں ہورہی ہے بلکہ وہ مریض مراد ہے جس کے لئے پانی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے جیسے استسقاء، دل کا مریض جب مرض شدت اختیار کرلے اور پھیپھڑے کام کرنا چھوڑ دیں یا گردے فیل ہوجائیں وغیرہ، تو ایسا مریض شدتِ پیاس کی وجہ سے پانی کو ترستا ہے مگر نقصان کے پیش نظر اس کے ہمدرد پانی نہیں دیتے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دنیاوی مال ومتاع یا منصب سب لوگوں کے لئے بُرا نہیں جیسے پانی تمام مریضوں کے لئے یکساں نہیں، لہٰذا جن نیک لوگوں کو دنیا ملتی ہے وہ مزید صالح بن جاتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے مثال دی ہے کہ سپیرا اگر سانپ سے کھیلتا ہے تو وہ اس کے لئے مضر نہیں مگر عام آدمی اگر سانپ ہاتھ میں پکڑے گا تو ہلاک ہوجائے گا۔ تدبر

باب ماجاء فی الدواء والحث علیه

"عن اسامة بن شريك قال قالت الاعراب: يارسول الله! آلا نتداوىٰ؟ قال نعم ياعباد الله تَدَاوَوْا فان اللّٰه لم يَضَعْ دَاءً الاوضع له شفاءً اوقال دواءً اِلاداءً واحداً فقالوا يارسول الله وَمَاهو؟ قال الهَرَمُ"۔[1] (هذاحديث حسن صحيح)

باب ماجاء فی الدواء والحث علیه

[1] الحديث اخرجه ايضاً الطبراني في الكبير، مجمع الزوائد ص:۹۸ ج:۵ كتاب الطب.

یہ باب دوا کی اہمیت اوراس کی ترغیب کے بارے میں ہے۔

حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اعراب نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا ہم علاج کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاہاں اے اللہ کے بندوں دوااستعمال کرو کیونکہ اللہ نے کوئی بیماری پیدانہیں کی مگراس کے لئے شفاء بھی پیدافرمائی ہے یافرمایا(راوی کوشک ہے) کہ دواء (ضرور پیدا کی ہے) سوائے ایک بیماری کے توانہوں نے پوچھااے اللہ کے رسول! وہ کیا(بیماری) ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایابڑھاپا۔(یعنی بڑھاپاایسامرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں)

لغات:۔قولہ "لم یضع" ای لم یخلق۔قولہ "شفاءً او دواءً االخ" لفظ"او"راوی کےشک کے لئے ہے۔قولہ "الھرم" بروزن قمر یعنی بفتحتین بڑھاپا۔پھرالھرم مرفوع بنابرخبریت ہے"ای ھو الھرم"۔

تشریح:۔اس حدیث مبارکہ سے علاج کی رخصت معلوم ہوئی جوان صوفیہ کے خلاف حجت ہے جوترکِ علاج اورتوکل پرزوردیتے ہیں گویاوہ علاج کوتوکل کے منافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ تأثر غلط ہے کیونکہ توکل ترک اسباب کونہیں کہتے بلکہ اسباب پریقین نہ کرنے کو کہتے ہیں، دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں فرمائی ہیں، ہتھیارجمع کئے اوراستعمال فرمائے ہیں جنگوں میں صحابۂ کرام کومورچوں پربٹھایاہے اوران جیسے اسباب اختیارکرنے کاحکم بھی دیاہے جبکہ حدیث الباب میں "تـــداوَوْا"[۲] امر کا صیغہ ہے جس کاادنی تقاضہ اباحت کاہے پس اگراسباب اختیارکرنامنافی توکل ہوتاتوسیدالتوکلین اس کاحکم کیسے کرسکتے ہیں معلوم ہواکہ اسباب اختیارکرناالگ چیزہے اوران پراعتمادکرنادوسری شے ہے ایک مسلمان اورکافرمیں یہی فرق ہوتاہے کہ کافراپنے حاصل کردہ اسباب پربھروسہ اورفخروناز کرتاہے جبکہ مسلمان کااعتماداسباب کے بجائے اللہ پرہوناچاہئے۔

پھرالعرف الشذی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے امام غزالیؒ سے نقل کیاہے کہ اگرمریض کوکسی دواسے شفاء کایقین ہو(جیسے گردے کاآپریشن کرکے پتھری نکالنا)اوروہ علاج نہ کرے اورمرجائے توگناہ گارہوگاجبکہ گمان کی صورت میں اسے اختیارہےاوروہم کی صورت میں ترک علاج اولیٰ ہے۔

---

۲ وعن انس ان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ عزوجل حیث خلق الداء خلق الدواء فتداووا، رواہ مصنفہ ابن ابی شیبۃ ۳۵۹/۷، ابن عبد البر فی التمہید ۲۸۵/۵، ومسند احمد ص:۶۳۰ ج:۳ حدیث:۱۲۱۸۶، مجمع الزوائد ص:۹۶ ج:۵ کتاب الطب.

گویا جہاں اسباب میں قوت اور مرض میں شدت ہوگی تو علاج کی تاکید زیادہ ہوگی جبکہ مرض کے نسبتاً کم نقصان اور علاج کے پیشِ نظر حکم میں تخفیف آتی ہے حتی کہ توہم کی صورت میں ترک ہی افضل ہے اور متوکل کے لئے اس آخری درجے پر عمل کرنا یعنی علاج نہ کروانا کافی ہے۔

ادویات وغیرہ کے اسباب کی تاثیرات کا اصولی حکم واختلاف ''باب کراھیۃ البول فی المغتسل'' میں گذرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص:۱۳۸، ۱۳۹ ج:۱)

غرض ادویات استعمال کرتے وقت اعتماد دواء پر نہیں بلکہ اللہ جل جلالہ پر ہی ہونا چاہئے مگر اس نیت سے استعمال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نظام ایسا بنایا ہے کہ ہر چیز دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے چنانچہ اگلے درجے تک جانے کے لئے سیڑھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ تدبر

پھر بڑھاپے کو مرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مرض کی وجہ سے بدن کمزور ہو کر ختم ہوسکتا ہے اسی طرح بڑھاپے سے بھی بالآخر موت آہی جاتی ہے یعنی کلام میں بڑھاپے کو مرض سے تشبیہ دی گئی ہے یا پھر ہرم سے مراد موت ہے [۳] مگر بڑھاپا چونکہ موت کا قریبی اور قوی سبب ہے اس لئے موت پر بڑھاپے کا اطلاق کیا گیا گویا کہ مجازاً۔

ابن العربیؒ نے عارضہ میں اس کی چار وجوہات بیان کی ہیں مگر اول کو پسند کیا ہے۔ فمن شاء الاطلاع فلیراجع۔

باب ماجاء مَایُطعَمُ المریض

''عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذااخذاهلَهُ الوَعكُ امربالحساء فصُنِعَ ثم امرهم فَحَسَوامنه وكان يقول:انه ليرتوفؤادالحزين وَيَسرُو عن فؤادالسقيم كما تَسرُواِحداكن الوَسَخَ بالماء عن وجهها''۔ (هذاحديث حسن صحيح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب ان کے گھر والوں (میں سے کسی) کو بخار ہو جاتا تو حریرہ پکانے کا حکم دیتے چنانچہ وہ تیار کیا جاتا پھر ان کو حکم فرماتے تو چلّو لے

---

[۳] اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، عن ابی سعید الخدری عن رسول الله ﷺ قال: ماانزل الله من داء الا انزل له دواء علم ذالک من علمه اوجهل ذالک من جهله الا السام قالوا یانبی الله وما السام؟ قال: الموت، مجمع الزوائد ص:۹۷ ج:۵ حدیث:۸۲۷۸.

لے کروہ تناول فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ یہ غم زدہ شخص کے دل کو قوت (اور تسکین) دیتا ہے اور بیمار کے دل سے بیماری کا اَلم دور کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی پانی سے اپنے چہرے سے میل کچیل کو زائل کرتی ہے۔

لغات: قولہ "الوَعك" بروزن عبد بخار کو کہتے ہیں، یہ اخذ کا فاعل جبکہ " اھلہ " مفعول مقدم ہے۔

قولہ "الحساء" بروزن سحاب ہر نرم غذا کو کہتے ہیں جس کو چبانا نہ پڑتا ہو مگر عام طور پر جو آٹا پانی میں پکا کر اور پھر اس پر تیل یا گھی ڈال کر تیار کیا جاتا ہے اُسے کہا جاتا ہے، اہل مکہ اسے حریرہ کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں پہلے اس کا استعمال کافی زیادہ ہوتا تھا اور طریقہ یہ ہوتا تھا کہ اسے بڑے تھال میں ڈال کر درمیان سے خالی جگہ بنائی جاتی، اس میں دودھ، گھی اور چینی یا گڑ ڈالتے پھر چلو سے نوالہ سا بنا کر اُسے دودھ میں ڈبو کر کھاتے۔ تحفہ میں ہے: "وھو طبیخ یتخذ من دقیق وماء ودھن وقد یُحلّٰی ویکون رقیقاً یُحسی"۔ تاہم دودھ اور شہد کے ساتھ تیار ہونے والے حریرہ کو تلبینہ کہتے ہیں جیسا کہ نام سے واضح ہے کیونکہ لبن دودھ کو کہتے ہیں چنانچہ صحیحین [1] میں تلبینہ ہی کے الفاظ آئے ہیں، یہ تلبینہ حریرہ کی ایک قسم ہے، اسی طرح ثابت "جَو" پانی میں اُبال کر بھی حریرہ بناتے ہیں جسے ماء الشعیر کہا جاتا ہے جبکہ تلبینہ میں جو (وغیرہ) کا آٹا ہوتا ہے اور یہ قسم زیادہ مفید ہوتی ہے۔ (صرح بہ ابن القیم فی الطب النبوی)

قولہ "لیرتُو" ای یَشُدُّ ویقوی یعنی دل کو فرحت وطاقت بخشتا ہے۔ قولہ "یسرو" ای یکشف ویزیل یعنی دل کی تکلیف اور درد کو زائل کرتا ہے۔

تشریح: چونکہ بیماری سے قوت شہوانیہ اور قوت ہاضمہ دونوں کمزور ہو جاتی ہیں اس لئے معدہ سخت اور ثقیل غذا ہضم نہیں کر سکتا بنابریں حالت مرض اور افاقہ کی صورت میں مریض کو نرم غذا دینا ہی مناسب ہے جیسا کہ آج کل ڈاکٹرز دودھ اور ڈبل روٹی دینے کو کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ڈبل روٹی کا وجود نہ تھا اس لئے نرم غذا کی صورت تلبینہ اور حریرہ ہی کی ہو سکتی تھی، نیز کبھی مریض اتنا لاغر اور کمزور ہو جاتا ہے کہ سخت غذا کو چبا بھی نہیں سکتا چنانچہ ابن العربیؒ نے عارضہ کے اسی باب میں اپنا واقعہ نقل کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ دشمن سے ساری رات

باب ماجاء مایطعم المریض

[1] صحیح بخاری ص:۸۱۵ ج:۲ "باب التلبینة" کتاب الاطعمة، ایضاً رواہ فی الاشربة، صحیح مسلم ص:۲۲۷ ج:۲ کتاب السلام، سنن ابن ماجہ ص:۲۴۶ "باب التلبینة" ابواب الطب، ایضاً مسند احمد ص:۱۱۸ ج:۷ حدیث:۲۳۹۹۱، ایضاً راجع جمع الفوائد ص:۲۵۲ ج:۲ کتاب الطب، دار الکتب العلمیة بیروت.

بھاگتا رہا اور سخت کوفت میں مبتلا تھا دوسرے دن ایک قلعہ میں پہنچا انہوں نے میرے سامنے روٹی اور گوشت رکھا باوجود یکہ میں ایک شب و روز سے بھوکا تھا مگر اس روٹی کے نگلنے پر قادر نہ تھا، کھانے کو حلق سے اتارنے کی غرض سے پانی پیا مگر وہ روٹی پانی میں گر گئی اور میں کھانہ سکا اگر یہ بجائے روٹی کے حریرہ ہوتا تو میں کھالیتا۔

غرض حریرہ میں بھرپور غذائیت بھی ہے اور نرم ہونے کی بناء پر اس کا کھانا بھی آسان ہے اس لئے مریض کے لئے مفید ہے خاص کر جب گرم ہو کیونکہ مرض کی وجہ سے حرارت غریزہ کم ہو جاتی ہے اس لئے دل متاثر اور معدہ کمزور ہو جاتا ہے، جب گرم گرم کھالیا جائے تو اس سے حرارت غریزہ بحال ہونے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے جیسا کہ ابن القیمؒ نے طب النبوی میں اس کی تفصیل میں بیان کیا ہے، اور یہی ایک وجہ دل کے غم دور کرنے کی ہے۔ دوسری وجہ دل کو راحت پہنچانے کی یہ ہے کہ تلبینہ میں فرحت بخش ادویات کی طرح کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے دل کو سرور اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بیماری کی وجہ سے معدہ وغیرہ اعضاء میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اور چونکہ خشکی سے بے چینی جنم لیتی ہے اس لئے خشک مزاج آدمی اور بوڑھے شخص کو غصہ زیادہ آتا ہے۔ حریرہ سے نمی اور تری پیدا ہوتی ہے جس سے خشکی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ کذافی الطب النبوی لابن القیم الجوزیہ فصل ۴۸)

باب ماجاء لاتکرھوا مرضاکم علی الطعام والشراب

"عن عقبة بن عامر الجُهنی قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم :لاتکرهوا مرضاکم علی الطعام فان اللّٰه تبارك وتعالیٰ یطعمهم ویسقیهم"۔(حسن غریب)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے مریضوں کو کھانے پر مجبور مت کرو کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو کھلاتا پلاتا ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں بکر بن یونس بن بکیر ضعیف راوی ہیں۔ تاہم امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ابن ماجہ[1] اور حاکم نے بھی اس کی تخریج کی ہے اس لئے اس مضمون کو قبول کرنا پڑے گا۔

باب ماجاء لاتکرھوا مرضاکم علی الطعام والشراب

[1] سنن ابن ماجه ص: ۲۴۶ "باب لاتکرهوا المریض علی الطعام" ابواب الطب، مستدرك حاكم ص: ۳۲۶ ج:۵ حدیث: ۸۴۳۰ كتاب الطب، ایضاً اورده المصنف فی كشف الاستار برقم: ۳۰۱۸ مجمع الزوائد ص: ۹۹ ج:۵، ایضاً جمع الفوائد ص: ۲۴۶ ج:۲ حدیث: ۷۴۳۔

پس اس حدیث میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ مریض کو خلافِ خواہش کھانے پر مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ دوم یہ کہ اس کو من جانب اللہ کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔

پہلی بات تو بدیہی ہے کیونکہ جب کھانے کا اشتیاق نہ ہو اور اسے زبردستی کھلایا جائے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پیٹ بھر کر کھانے کے بعد دوبارہ کھالے اور ظاہر ہے کہ یہ کھانا کوئی مفید نہیں ہوسکتا بلکہ مضر ہی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے تو اسی طرح مریض کی حرارت غریزہ کم ہونے کی صورت میں وہ کھانے کو ہضم نہیں کرسکتا۔ اگر اسے زبردستی کھلایا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بدن مزید بھاری پن اور ثقل محسوس کرے گا اور عین ممکن ہے کہ بگڑا ہوا نظامِ ہضم مزید بگاڑ کا شکار بن جائے۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو بعض شارحین نے اسے مجاز پر محمول کیا ہے یعنی جس طرح کھانے پینے سے آدمی روٹی اور پانی سے بے فکر ہو جاتا ہے اسی طرح مریض بھی اس صبر کی وجہ سے جو اسے اللہ تبارک وتعالیٰ عطا فرماتا ہے کھانے پینے سے بے فکر ہو جاتا ہے اور یہی کھانے کا مقصد ہوتا ہے، لہٰذا تحصیل حاصل کی ضرورت نہیں۔

مگر ابن القیمؒ طب نبوی میں لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ بہت لطیف ہے اطباء کی عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہوسکتی، اس کی وجہ وہی سمجھے گا جو روح اور قلب کے معاملات سے پوری طرح واقف ہو، پھر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب نفس کسی امر کی طرف متوجہ ہو کر مشغول رہتا ہے تو کھانے پینے کی مانگ اور طلب ختم ہو جاتی ہے پس جب نفس کو غیر معمولی شغل اور خصوصاً نشاط پیش آئے تو وہ غذا کے قائم مقام ہو جاتی ہے اس سے طبیعت آسودہ ہو جاتی ہے اور ساری قوتوں میں جان آجاتی ہے۔ (مزید تفصیل طب نبوی فصل ۲۴ میں دیکھی جاسکتی ہے)

المسترشد عرض کرتا ہے کہ یہ وجہ مشاہدے کے عین مطابق ہے کہ اس کا مشاہدہ ہر دور کے آدمیوں میں کیا جاسکتا ہے، بچے سارا دن اگر کھیلتے رہیں تو ان کو اپنی بھوک اور پیاس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور اس کا ہم بچپن میں بارہا تجربہ کر چکے ہیں۔ راقم کو کئی سالوں کا تجربہ ہے کہ جب لکھنے کا کام زیادہ ہوتا ہے تو ان دنوں میں بھوک بالکل مٹ جاتی ہے اس لئے بھوک لگانے کی خاطر کبھی کبھار اس تسلسل کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ مجھے یہ بھی تجربہ ہے کہ روزہ رکھنے سے بھوک کی تکلیف تو ہرگز نہیں ہوتی البتہ کبھی کبھی پیاس کا احساس ہوتا ہے، کبھی کم اور کبھی زیادہ، گو کہ میں اس کو بیماری سمجھتا ہوں لیکن اس بھوک نہ لگنے سے بحمد اللہ میرا کام کبھی نہیں رُکا ہے۔ عرصے سے لکھنے پڑھنے

کا کام بدستور جاری ہے۔

دنیا کے بے شمار واقعات ایسے ہیں کہ بہت سے لوگ کھانے پینے کا کام بہت کم کرتے ہیں مگر وہ اپنا روحانی کام شدومد کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو جس طرف متوجہ کیا جائے یہ وہی کام کرتا رہتا ہے۔عورتوں کے تصور سے عورتوں کی طلب بڑھتی ہے۔کھانے کے تخیل سے بھوک لگتی ہے۔اور آخرت کے تفکر سے نعمت ہائے جنت اور رضائے باری تعالیٰ کی غیر معمولی تمنالاحق ہوتی ہے اور مادی کھانے پینے کی طلب مٹ جاتی ہے یا کم ہوجاتی ہے۔

باب ماجاء فی الحبّة السودآء

"عن ابی هريرة ان النبی صلی اللّٰه عليه وسلم قال: عليكم بهٰذه الحبة السودآء فان فيها شفاء من كل داء الاالسام ،والسام الموت"۔[1] (هذاحديث حسن صحيح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کلونجی کا استعمال ضرور کیا کرو کہ اس میں ہر بیماری سے شفاء ہے سوائے سام کے اور سام موت ہے۔

لغات:۔قولہ"الحبة السوداء"کلونجی کو کہتے ہیں جو عموماً اچار میں استعمال ہوتی ہے۔ابن العربیؒ عارضہ[2] میں لکھتے ہیں:"والحبة السوداء الشونيز"۔شونیز فارسی لفظ ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے"العرف الشذی"میں فرمایا ہے کہ فارسی میں اس کو سیاہ دانہ بھی کہتے ہیں مگر ہندی زبان میں سیاہ دانہ ایک زہریلے بیج کو کہتے ہیں۔قولہ"عليكم بهٰذه الحبة السوداء"ای باستعمال الحبة السوداء۔قولہ"السام" موت کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔اس حدیث سے کلونجی کا فائدہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے یعنی اللہ نے اس میں ہر بیماری سے شفاء کا اثر ودیعت فرمایا ہے البتہ اگر کوئی بیماری ایسی ہو جس سے موت مقدر ہو تو اس میں مفید ثابت نہ ہوگی کیونکہ

باب ماجاء فی الحبة السوداء

[1] الحديث اخرجه البخاری ص:۸۴۸ ج:۲ "باب الحبة السوداء" كتاب الطب، صحيح مسلم ص:۲۲۷ ج:۲ كتاب السلام ، سنن ابن ماجه ص:۲۴۶ ابواب الطب، مسنداحمد ص:۴۷۸ ج:۲ حديث:۷۲۴۵،۷۵۰۴،۷۵۸۲، ايضاً جمع الفوائد ص:۲۸۹ :۲ حديث:۷۵۱۸،ايضاً رواه الطبرانی فی الاوسط بحواله مجمع الزوائد ص:۱۰۱ ج:۵ حديث:۸۲۹۷.

[2] روی الطبرانی فی الاوسط عن انس بن مالک ان النبی ﷺ كان اذا اشتكى تقمح كفا من شونيز ويشرب عليه ماء وعسلاً، مجمع الزوائد ص:۱۰۰ ج:۵ حديث:۸۲۹۵.

اسباب تقدیر کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں۔ تمام اسباب میں اللہ عزوجل کی یہی سنتِ جاریہ ہے کہ اس عالم میں اسباب کو مؤثر بنایا ہے مگر جہاں اسباب میں تضاد و تصادم آجائے تو پھر کبھی ترجیح قوتِ سبب کی بناء پر ہوتی ہے اور کبھی کسی مصلحت کی بنا پر مگر یہ سب کشمکش اس وقت ہوتی ہے جب مقررہ وقت نہیں آجاتا۔ اجل آنے پر اسباب فیل ہو جاتے ہیں۔ (مزید تفصیل حجۃ اللہ البالغہ میں دیکھی جاسکتی ہے)

اس حدیث کے مضمون میں تو کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کلونجی ایک مفید دوا ہے اور العرف الشذی میں حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ابوعلی سینا نے اس کے چالیس سے زیادہ فائدے ذکر کئے ہیں۔ تاہم قابل غور صرف یہ پہلو ہے کہ یہ حدیث شریف اپنے عموم پر محمول ہے جیسا کہ الفاظ سے عموم معلوم ہوتا ہے یا مرادِ متکلم یہاں خاص ہے؟ تو اس بارے میں شارحین حدیث کے دونوں قول ہیں۔ عام شارحین کی رائے یہ ہے کہ کلونجی چونکہ مزاج کے اعتبار سے خشک اور گرم ہے اس لئے یہ فقط ان امراض میں مفید ہے جو رطوبت اور برودت کی وجہ سے لاحق ہو جائیں اور مدینہ منورہ زادہا اللہ نوراً وشرفاً کے لوگوں کو اکثر اسی قسم کی بیماریاں لاحق ہوتی تھیں۔

جبکہ شارحین کا دوسرا فریق اسے عموم پر محمول کرتا ہے، لہٰذا اب مطلب یہ ہوگا کہ کلونجی مفید تو تمام امراض میں ہے تاہم اس کے استعمال کے طریقے مختلف ہیں، کبھی مفرد مفید ہوتی ہے اور کبھی دوسری اشیاء کے ساتھ ملانے سے فائدہ دیتی ہے لہٰذا اگر اس کا استعمال صحیح طریقے سے کیا جائے جو ماہر طبیب ہی بتا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں شفاء نہ ہو، اس کے فوائد اور طرقِ استعمال طب نبوی لابن القیمؒ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج کل کلونجی کا تیل ملتا ہے تجربے سے وہ بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

باب ماجاء فی شرب ابوال الابل

"عن انس ان ناساً من عرینة قدموا المدینة فاجتووها فبعثهم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ابل الصدقة وقالوا اشربوا من البانها وابوالها"۔[1] (حدیث حسن صحیح)

باب ماجاء فی شرب ابواب الابل

[1] الحدیث اخرجه البخاری ص:۲۶۳ ج:۲ کتاب التفسیر، ایضاً اخرجه فی الجهاد باب:۱۵۳، وفی الدیات باب:۲۲، صحیح مسلم ص:۵۷ ج:۲ کتاب القسامة، سنن ابن ماجه ص:۱۸۵ کتاب الحدود، والنسائی ص:۱۶۶ و۱۶۷ ج:۲ کتاب المحاربة، ایضاً مسند احمد ص:۶۳۷ ج:۳ حدیث:۱۲۲۲۸، ۱۲۲۵۷ وغیره۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ عُرینہ قبیلے کے مدینہ آئے تو وہ پیٹ کی بیماری میں مبتلاء ہوگئے (یعنی آب و ہوا موافق نہ آئی) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کے اونٹوں کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ ان کا دودھ پیا کرو اور ان کا پیشاب بھی۔

ملحوظ:۔ اس حدیث کی شرح ''باب ماجاء فی بول مایوکل لحمہ'' میں تفصیلاً گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص ۲۴۵ تا ۲۵۲ ج ۱)

باب من قتل نفسه بِسمٍّ اوغيره

"عن ابی هريرةأُراه رفعه قال: من قتل نفسه بحديدجاء يوم القيٰمة وحديدته فی يده يتوجأ بها بطنه فی نار جهنم خالداً مُخلّداً ابداً، ومن قتل نفسه بسم فسمه فی يده يتحساه فی نارجهنم خالداً مُخلّداً ابداً"۔ اگلی حدیث جو کہ صراحتاً مرفوع ہے اس میں یہ اضافہ ہے **"ومن تردّی من جبل فقتل نفسه فهويتردّی فی نارجهنم خالداًمخلداًفيهاابداً"** [1] **(حديث صحيح)**

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے راوی کہتا ہے کہ میرا گمان یہ ہے کہ ابوہریرہؓ اس کو مرفوعاً یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، فرمایا کہ جو شخص لوہے سے خودکشی کرلے تو وہ قیامت کے دن آئے گا دراں حالیکہ اس کا لوہا (آلۂ قتل) اس کے ہاتھ میں ہوگا وہ دوزخ میں اس کو اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا ہمیشہ ہمیش کے لئے (یعنی جب تک جہنم میں رہے گا یہی عمل کرتا رہے گا) اور جس نے زہر سے خودکشی کرلی تو اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا جسے وہ بمشکل پیتا ہی رہے گا دراں حالیکہ وہ جہنم میں ہوگا (اور جب تک دوزخ میں ہوگا) یہ کام ہمیشہ کرتا رہے گا۔ اس کے بعد امام ترمذیؒ نے دوسری سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے وہ مرفوع ہی ہے اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جس نے کسی پہاڑ سے چھلانگ لگا کر خود کو ہلاک کیا تو وہ دوزخ میں ہمیشہ کے لئے (پہاڑ سے) چھلانگیں مارتا رہے گا۔

لغات:۔ قولہ "اُراہ" بضم الہمزہ بمعنی ظن و گمان کے آتا ہے۔ قولہ "یَتَوَجَّأُ" مہموز اللام ہے وَجَأَ

باب من قتل نفسه بسم او غيره

[1] الحديث اخرجه البخاری ص: ۸۶۰ "باب شرب السم والدواء به" كتاب الطب، ومسلم فی الايمان حديث: ۱۷۵، وابوداؤد فی الطب باب: ۱۱، والنسائی فی الجنائز باب: ۶۸، الترغيب والترهيب ص: ۲۰۵ ج: ۳.

سے بمعنی مارنے کے جیسے چھرا مارنا یا نیزہ وغیرہ جیسا کہ حاشیۂ قوت میں ہے۔قولہ "بھا" ضمیر حدیدۃ کی طرف راجع ہے مگر مراد آلۂ قتل ہے خواہ چھری یا نیزہ وغیرہ ہو یا بندوق کی گولی۔قولہ "فی نار جھنم" یہ حال ہے ای حال کونہ فی نار جہنم یعنی ایک مصیبت آگ کی ہوگی اور دوسری مسلسل خودکشی کرتے رہنے کی۔ والعیاذ باللہ۔ قولہ "بسم" اس میں سین پر تینوں حرکات یعنی فتحہ، ضمہ اور کسرہ جائز ہیں۔تاہم فتحہ زیادہ فصیح ہے، اس میں میم مشدد ہے۔

قولہ "یتحساہ" حَسَا یحسُو مجرد سے بمعنی تھوڑا تھوڑا پینے کو کہتے ہیں جبکہ باب کی حدیث میں تاء کے اضافے سے اس میں تکلف کا معنی ادا کرنا مقصود ہے یعنی نہ چاہتے ہوئے بھی اور نگلنے پر قدرت کم ہونے کے باوجود وہ مجبوراً پیتا رہے گا۔قولہ "یَتَرَدّی" رَدیٰ ہلاکت کو کہتے ہیں جبکہ رَدَاۃ چٹان کو کہا جاتا ہے۔پس یتردی کے معنی چٹان یا کسی اونچی جگہ سے خود کو گرانے اور چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کے ہوئے۔تاہم چونکہ یہاں جبل کا ذکر بھی آیا ہے اس لئے یہاں "یتردی" میں تجرید ہوگی۔

تشریح:۔ اس حدیث کے ظاہر سے معتزلہ استدلال کرتے ہیں جو مرتکب کبیرہ کے مخلد فی النار یعنی جہنم میں ہمیشہ پڑے رہنے کے قائل ہیں گو وہ خوارج کی طرح گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر نہیں کہتے۔

اہل السنۃ والجماعۃ چونکہ ہر مؤمن وموحد کی نجات کے قائل ہیں، جس کے بے شمار دلائل ہیں، اور اپنے محل میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں: مثلاً شرح عقائد، شرح مواقف وغیرہما میں، اس لئے وہ اس حدیث کو ظاہری معنی پر محمول کرنے کے بجائے اس کی ایسی تشریح وتاویل کرتے ہیں جس سے باقی نصوص جو نجاتِ مؤمن پر دال وصریح ہیں کا باب کی احادیث سے کسی طرح کا تعارض نہیں آتا، چنانچہ ایک مطلب تو امام ترمذیؒ نے بتلایا ہے کہ "وروی محمد بن عجلان... ولم یذکر فیه خالداً مخلداً فیها ابداً" الخ یعنی اس روایت کے بعض طرق میں اگرچہ "خالداً الخ" کا اضافہ ہے مگر محمد بن عجلان اور ابوالزناد وغیرہما کے طریق میں یہ اضافہ نہیں ہے۔[1] اور اگرچہ یہ اضافہ ماننا چاہیئے کہ ثقہ کی زیادتی قابل قبول ہوتی ہے مگر یہاں یہ اصول نہیں چلتا کیونکہ پھر دوسری نصوص سے روایت باب کا تعارض آتا ہے لہٰذا جن حضرات نے یہ اضافہ نقل نہیں کیا ہے ان کی روایت زیادہ اصح ہے، "وھذا اصح" الخ۔

اس کا دوسرا جواب بصورتِ تسلیم اضافہ وہی ہے جس کی طرف اوپر ترجمہ کے ضمن میں اشارہ کیا گیا ہے

[1] راجع للتفصیل حواله بالا

یعنی وہ شخص جب تک جہنم میں ہوگا تو یہ عمل جس کے ذریعہ اس نے خودکو قتل کیا ہے دُہراتا رہے گا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہے گا علیٰ ھذا ''خالداً مخلداً کا تعلق فی نار جھنم'' کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ''یتوجأبھا اور یتحساہ اور یتردی'' کے ساتھ ہے۔ تدبر۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں اور مولانا محمد چراغ علی صاحب نے عرف میں بحوالہ شاہ صاحبؒ کے فرمایا ہے کہ ہر محل کا اپنا خلود ہوتا ہے لہٰذا دنیا کا خلود موت پر ختم ہوجاتا ہے اور عالم برزخ کا حشر پر، تو اسی طرح عُصاۃ مؤمنین کے خلود سے مراد ان کے طبقۂ جہنم کے خاتمے تک ہوگا۔ تدبر ثانیاً

راقم کے نزدیک یہ جواب پہلے سے بھی زیادہ صحیح ہے کہ اس سے بہت ساری نصوص کا مطلب سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے اور کسی طرح کا اشکال بھی وارد نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بھی جوابات دیئے گئے ہیں: مثلاً یہ حکم حلال سمجھنے والے کا ہے یا تہدید پر محمول ہے یا خاصیت المفرد ہے وغیرہ وغیرہ۔

تنبیہ:۔ صاحب تحفۃ الاحوذی نے امام ترمذیؒ کے جواب کا مطلب یہ لیا ہے کہ گویا امام ترمذیؒ اس زیادتی کو راوی کے وہم پر محمول کرتے ہیں اور پھر امام ترمذیؒ پر ''زیادۃ الثقۃ مقبولۃ'' سے اعتراض کر کے ان کے جواب کو رد کر دیا ہے۔

لیکن راقم کے نزدیک امام ترمذیؒ کے قول کا صحیح مطلب وہی ہے جو اوپر پہلے نمبر پر بیان ہوا فلا اشکال۔

خودکشی حرام ہے:۔ اس حدیث اور اسی طرح کی دیگر نصوص [۳] کے بموجب خودکشی کی حرمت پر اتفاق ہے اور یہ کہ خودکشی گناہ کبیرہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح دوسرے کی جان لینا جائز نہیں، اسی طرح اپنی جان کی حفاظت بھی فرض ہے، کسی کو اپنے نفس کا کلی اختیار حاصل نہیں، نہ کوئی عورت زنا میں آزاد ہے، اور نہ ہی کوئی شخص اپنی جان کا مالک ہے۔ اور اگر مالک بھی ہے تو مجازاً محدود پیمانے پر، پس جتنی اجازت شریعت کی طرف سے ہے اس سے آگے کوئی اختیار نہیں، لہٰذا جہاں کسی کو غلام بنانا اور بیچنا جائز ہے تو وہ اس میں آزاد ہے اور جس کو فروخت کرنا ممنوع ہے جیسے حُر تو وہ ناجائز ہے، خودکشی کرنے والا اپنے اختیار سے غیر معمولی تجاوز کرتا ہے جو سنگین جرم ہے۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ خودکشی کرنے والا گویا تقدیر سے بھاگتا ہے کہ وہ دنیوی تکالیف پر صبر نہیں

---

[۳] کما ورد فی ابی داؤد: من حسا سماً فی یدہ یتحساہ فی نار جنھم خالداً مخلداً فیھا ابداً ص:۱۸۵ ج:۲ "باب فی الادویۃ المکروھۃ" کتاب الطب، ایضاً سنن نسائی ص:۲۷۹ ج:۱ ابواب الجنائز.

کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ خودکشی سے جان چھوٹ جائے گی تو جس طرح دنیاوی تکلیفات سے تنگ آ کر دعائے موت جائز نہیں اسی طرح خودکشی بھی جائز نہیں۔

تیسری وجہ: یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں خداتعالیٰ کے فیصلے پر مطمئن نہیں، اس لئے گویا اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے جبکہ رضا بر قضا واجب ہے تاہم شدید ذہنی دباؤ اور ٹینشن کی وجہ سے اگرچہ وہ اس عمل سے کافر نہ کہلائے گا جب تک کہ حلال نہ سمجھنے لگے مگر قلبی تصدیق کے باوجود یہ عمل انتہائی قبیح ہے۔

چوتھی وجہ: یہ ہے کہ وہ اپنے پسماندگان کو غم اور صدمے سے دوچار کرتا ہے جبکہ ایذائے مؤمن اور خصوصاً والدین واقارب کی حرام ہے۔ وغیرہ ذالک من الوجوہ

تاہم اگر ایک آدمی کسی نیک غرض سے خودکشی کرے جیسے آج کل کے خودکش حملے تو کیا وہ بھی عین خودکشی محرم کے حکم میں ہے؟ تو اس بارے میں علمائے وقت کی آراء مختلف ہیں۔ راقم کے نزدیک یہ مسئلہ بہت مشکل ہے کہ اگر اس کی اجازت دی جائے تو ایک تو اس کی کوئی واضح دلیل نہیں۔ دوم اس کا غلط استعمال بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے۔ اور آج کل کوئی ہفتہ خودکش حملے سے خالی نہیں گذرتا ان میں ننانوے (۹۹) فیصد بلکہ تمام تر حملوں میں بڑی تعداد میں شہری ضرور ہلاک کردیئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف کفار کے پاس ہر قسم کے وسائل ہیں ان کے آگے نہتے مسلمانوں اور مجاہدین کا جمنا تقریباً ناممکن ہے، اگر اس عمل کی اجازت نہ دی جائے تو ان کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟؟؟

حدیث آخر: "عن ابی ھریرۃ قال نھیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الدواء الخبیث یعنی السم"۔ [۴]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبیث دواء سے منع فرمایا ہے یعنی زہر سے۔

لغات: قولہ "الدواء الخبیث" یہ لفظ عام ہے مطلق گندی اور حرام ادویات پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے مگر راوی نے اس کی تفسیر زہر سے کی ہے، لہٰذا اس پر حمل کرنا اولیٰ ہے۔ پھر یہ کس راوی کی تفسیر ہے؟ تو ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہو یا کسی اور کی ہو۔

تشریح: پھر ادویات کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ نجس، حرام اور مستقذر چیزیں یعنی جن سے

---

[۴] ایضاً رواہ ابوداؤد ولفظہ: نھی رسول اللّٰہ ﷺ من الدواء الخبیث ص:۱۸۵ ج:۲ کتاب الطب، جمع الفوائد ص:۲۵۲ حدیث:۷۵۵۱۔

طبیعت گھن کرتی ہے بلاضرورت استعمال نہیں کی جانی چاہئے خصوصاً کھانے میں تو ہرگز استعمال نہ کی جائیں جبکہ بعض دیگر صورتوں میں مباح اور جائز الاستعمال ہیں جیسا کہ اگلے باب میں آئے گا۔ زہر میں بھی اگر شفاء اغلب ہو تو جائز ورنہ نہیں۔

باب ماجاء فی کراهية التداوی بالمسكر

”عن سماك انه سمع علقمة بن وائل عن ابيه انه شهدالنبی صلی اللّٰه عليه وسلم وسأله سويدبن طارق اوطارق بن سويدعن الخمرفنهاه عنه فقال اِنالَنَتَدَاوَی بها،فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم :انهاليست بدواء ولكنهاداء“۔[1] (حسن صحیح)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئے تو (اسی اثناء میں) سوید بن طارق نے یا طارق بن سوید نے (راوی کو شک ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خمر (شراب) کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع فرمایا، انہوں (طارق) نے کہا کہ ہم اس کو بطور علاج معالجہ کے استعمال کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دواء نہیں بلکہ داء یعنی بیماری ہے۔

تشریح:۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کرنے والے صحابی کا نام کیا ہے؟ تو اس بارے میں اختلاف ہے جیسا کہ اس روایت میں راوی کے شک کے اظہار سے معلوم ہوتا ہے۔ ابوداؤد[2] کی روایت بھی شک کے ساتھ ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی تردد کا اظہار کیا ہے[3] مگر راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح طارق بن سوید ہے۔ اور ابوداؤد میں اسی کو مقدم ذکر کیا ہے۔ ابن ماجہ[4] نے بھی طارق بن سوید ہی ذکر کیا ہے یعنی بلاشک وتردد کے۔ (کذافی البذل ص:۵ ج:۶)

چونکہ عربوں کی اکثریت کے نزدیک شراب کو شفاء کا سبب مانا جاتا تھا اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نظریے کی تردید فرمائی کہ ”انهاليست بدواء ولكنهاداء“۔

باب ماجاء فی کراهية التداوی بالمسكر

[1] روی بمعناه ابوداؤد ص:۱۸۵ ج:۲ کتاب الطب، ایضاً رواه مسلم بحواله جمع الفوائد ص:۲۵۲ ج:۲ حديث:۷۵۵۰۔ [2] سنن ابی داؤد ص:۱۸۵ ج:۲ کتاب الطب۔ [3] ایضاً صحیح مسلم ص:۱۶۳ ج:۲ کتاب الاشربة۔ [4] کذا فی سنن دارمی حاشیه:۱ ص:۱۵۴ ج:۲ حديث:۲۰۹۵ کتاب الاشربة۔

شراب ہو یا کوئی اور نجس چیز حالت اضطرار میں اس کا استعمال بغرض جان بچانے کے بالاتفاق جائز ہے مثلاً کسی کا لقمہ گلے میں پھنس جائے اور کوئی پانی وغیرہ مائع چیز اس کو اتارنے اور نگلنے کی نہ ملے ہو اور جان کو خطرہ ہو تو اسے اتارنے کے لئے شراب کا گھونٹ بقدر ضرورت پینا جائز ہے۔ اس میں ابن قاسم کے علاوہ کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے بلکہ جمہور کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے کہ جان بچانا ضروری ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے: ''وقد فصّلَ لکم ماحرّم علیکم الاما اضطررتم الیه''۔ (انعام آیت ۱۱۹) اس میں ''ما'' کا کلمہ عام ہے تمام انجاس ومحرمات کو شامل ہے۔ (کذا فصّله النووی فی "المجموع" وشرح مسلم، وابن العربی فی العارضة الاحوذی وغیرهما)

پھر ابن العربیؒ نے اس بارے میں سخت موقف اپناتے ہوئے لکھا ہے: ''لامنفعة فیها'' یعنی شراب میں کسی طرح کا فائدہ نہیں ہے، گویا وہ اس حدیث کے الفاظ ''انها لیست بدواء'' سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ نکرہ فی سیاق النفی عموم کے لئے آتا ہے، مگر قرآن کا ظاہر اس موقف کی نفی کرتا ہے ''قل فیهما اثم کبیر ومنافع للناس واثمهما اکبر من نفعهما''۔ (البقرۃ آیت: ۲۱۹) اس لئے کہا جائے گا کہ خمر میں کچھ جسمانی اور وقتی فائدے ہو سکتے ہیں مگر اس کے نقصانات اور خصوصاً دینی وروحانی مضرتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے فوائد ہیچ ہو جاتے ہیں کیونکہ جہاں فوائد ونقصانات جمع ہو جائیں تو اکثر حکم اغلب پر مبنی ہوتا ہے۔ اور جہاں تک حدیث الباب کا تعلق ہے تو اس نفی کی وجہ سدِ ذرائع اور حسمِ باب ہے، کیونکہ عرب اس کو شفاء کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

اس مسئلے کی کچھ وضاحت ''باب ماجاء فی بول مایوکل لحمہ'' میں بھی گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی از ص: ۲۴۷ تا ص: ۲۵۱ ج: ۱)

پھر بذل المجہود میں ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اس قسم کی احادیث سے استدلال کر کے فرمایا ہے کہ حرام اشیاء سے کسی طرح کی تداوی جائز نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ حکم عدم حاجت کی صورت پر محمول ہے یعنی جب ضرورت نہ ہو حرام ونجس کی، یا ضرورت تو ہو مگر متبادل کا انتظام ہو سکتا ہو، جب کوئی چارہ نہ رہے تو پھر نشہ آور اشیاء کے علاوہ دیگر نجاستوں کا بطور علاج استعمال جائز ہے، نیز تداوی بالمحرم کی نہی اس جہت سے مقید ہے جس جہت سے اس کی حرمت معتبر ہو مثلاً کسی چیز کا کھانا حرام ہو تو اس کو کھانے کے طور پر استعمال کرنا جائز نہ ہوگا (یعنی حالت اختیار میں اور بغیر ضرورت کے جبکہ جسم کے ظاہری حصہ پر لگانا ممنوع نہ ہوگا) اور جن اشیاء سے مطلقاً منع آیا ہو جیسے خمر، خنزیر اور میتة تو ان کا استعمال بہر صورت ممنوع ہے۔ الخ (بذل المجہود ص: ۴۰ ج: ۶)

درمختار میں ہے:

"وَجَوَّز ابوالليث بيع الحيّات ان انتفع بهافى الادوية وإلالا وردّه فى البدائع بانه غيرسديدلِاَن المحرم شرعاًلايجوزالانتفاع به لِلتداوى كالخمر"الخ۔

اس پرعلامہ شامی رحمہ اللہ نے اپنے حاشیہ ردالمحتار میں تداوی بالمحرم کاعنوان قائم کرکے لکھاہے:

"قال فى النهاية وفى التهذيب يجوزللعليل شرب البول وَالدم والميتة للتداوى اذااَخبره طبيب مسلم انه فيه شفاء ولم يجدمن المباح مايقوم مقامة وان قال الطبيب يتعجل شفاءكَ به فيه وجهان وهل يجوزشرب العليل من الخمر لِلتداوى ؟فيه وجهان ،كذاذكره الامام التمرتاشى ،وكذافى الذخيرة۔ وماقيل ان الاستشفاء بالحرام حرام غيرمجرى على اطلاقه ،وان الاستشفاء بالحرام انمالايجوزاذالم يعلم ان فيه شفاء ،امااان علم وليس له دواء غيره يجوز"الخ۔

(ص:۲۲۸ج:۵،باب المتفرقات من البیوع،ایچ ایم سعید کراچی)

خلاصہ یہ ہے کہ اضطراری حالت میں ہرمحرم جائز ہے،جبکہ نارمل حالت میں کسی محرم کااستعمال جائز نہیں جبکہ ضرورت کی صورت میں خمر،خنزیریادیگرمسکرات کے علاوہ باقی محرمات ونجاسات جائز ہیں جبکہ خمر میں دوقول ہیں:راجح عدم جواز ہے،باقی مسکرات میں تخفیف ہے۔

باب ماجاء فى السعوط وغيره

"عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم :ان خير ماتداويتم به السعوط واللدود والحجامة والمشىُّ فلمااشتكى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لَدَّه اصحابه فلما فرغوا قال لُدُّوهم قال فَلُدُّوا كلهم غيرالعباس"۔[1]

باب ماجاء فى السعوط وغيره

[1] الحديث اخرجه ايضاً بخارى ص: ۸۵۱ ج: ۲ "باب اللدود" كتاب الطب، ايضاً اخرجه فى المغازى ص:۸۳ وفى الديات باب: ۱۴، ۲۱ وصحيح مسلم ص:۲۲۷ ج:۲ كتاب السلام، مسنداحمد ص:۷۹ ج:۷ حديث: ۲۳۷۴۲، ۲۴۳۴۹، ۲۶۹۳۲ جمع الفوائد ص:۲۴۶ ج:۲.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ تم جو دوائیں لیتے ہو ان میں سعوط ولدود وحجامت اور مشی بہت اچھی ہیں، پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس بیمار ہوئے تو صحابہ کرامؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (بلا اجازت) دوا پلادی، چنانچہ جب وہ فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سب کو دوا پلادو، ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ان تمام شرکاء کو دوا پلادی گئی سوائے عباسؓ کے۔

لغات: قولہ "السعوط" بروزن رسول، ناک میں ڈالنے والی دوا جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مریض کو چت لٹا کر اس کے دونوں شانوں کے درمیان کوئی چیز رکھتے ہیں تا کہ سر نیچے رہے پھر اس کی ناک میں دوا آلود پانی یا تیل ڈالتے ہیں تا کہ اسے چھینک آئے، اور اس سے دماغ کھل جائے۔ قولہ "لدود" یہ بھی رسول کے وزن پر ہے، وہ دوا جو منہ میں ایک جانب ڈالی جائے اور اگر گلے میں یا منہ کے درمیان میں ٹپکا دے تو اسے وجور کہتے ہیں۔ قولہ "حِجامة" بکسر الحاء پچھنے اور سینگی لگوانے کو کہتے ہیں جسے احتجام بھی کہا جاتا ہے۔ قولہ "المشی" بفتح المیم وکسر الشین وتشدید الیاء، مشی سے ماخوذ ہے ہر مسہل ودست آور دوا کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بار بار قضائے حاجت کے لئے جانے پر مجبور کرتی ہے۔ قولہ "اشتکی" ای مرض۔

تشریح: سعوط اور لدود کرنا دونوں قدیم زمانے کے علاج معالجے کے اہم طریقے تھے گو کہ آج بھی ناک اور منہ میں ڈالنے کے قطرے رائج ہیں لیکن ان میں کسی مخصوص جانب سے ڈالنے کو اہمیت نہیں دی جاتی، جبکہ پچھنے لگوانے اور دست آور ادویات کا استعمال آج بھی مروج ومعروف ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے لدود کا مندرجہ بالا فائدہ ملحوظ رکھتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرضِ وصال میں دوا پلادی۔ بعض روایات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے سے ان کو منع فرمایا مگر وہ یہ سمجھے کہ یہ نہی تشریعی نہیں بلکہ طبعی ہے کیونکہ تقریباً ہر مریض طبعاً دوا کو ناپسند کرتا ہے جبکہ یہ نہی تشریعی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ بمنزلہ نص کے تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نہی یا تو اس بناء پر تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعۂ وحی معلوم ہو چکا تھا کہ اس مرض میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہونے والا ہے، ایسے میں علاج کا کوئی فائدہ نہیں رہتا بلکہ بعض علماء نے کراہیت علاج کی تصریح کی ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اسے ذات الجنب کی بیماری سمجھ کر لدود کو تجویز کر رہے تھے حالانکہ یہ وہ بیماری نہ تھی، بناء بر ہر تقدیر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو افاقہ ہوا تو فرمایا کہ ان سب کو لدود کیا جائے سوائے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے۔ چنانچہ جتنے بھی صحابہ اس وقت گھر میں موجود تھے سب کو لدود کیا گیا

حتی کہ بعض امہات المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو بھی دوا پلا دی گئی۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ قیامت کے دن ان کی گرفت نہ ہو جائے اور یہ کہ اللہ کی ناراضگی سے محفوظ ہوں۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے: "لئلا یأتون یوم القیمۃ وعلیھم حق للنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فیدرکھم خطب عظیم"۔ اس لئے جب ماں باپ کو اپنے بچوں پر غصہ آجائے تو ان کو کچھ نہ کچھ عملی سزا دینا مناسب ہے تا کہ وہ اللہ کی ناراضگی سے بچیں، اگر کوئی یہ کہے کہ معافی بھی تو ہو سکتی تھی، تو اس کا جواب ابن العربیؒ نے دیا ہے کہ معافی میں ایک فائدہ ہوتا یعنی اللہ کی ناراضگی سے حفاظت جبکہ لدود کرنے میں دو فائدے ہوئے، ایک غلطی کا ازالہ، اور دوم تادیب: "فان قیل فھلّا عفاعنھم؟ قلنا اراداَن یؤدبھم لئلا یعودوا الی مثلھا فیکون لھم اَدَباً وقصاصاً فتکون فائدتین وذالک خیر من واحدۃ"۔ (عارضۃ الاحوذی)

یہاں یہ اشکال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو اجتہادی غلطی تھی جس پر مؤاخذہ نہیں ہوتا ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ شارع کی موجودگی میں اجتہاد معتبر نہیں، ہاں البتہ صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات ان کی غیر موجودگی میں اجتہاد کرتے تھے۔ حضرت عباسؓ کو اس تعزیر میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ اگرچہ بعض روایات کے مطابق انہوں نے اس عمل کا حکم دیا تھا مگر لدود کرنے کے وقت موجود نہ تھے تو وہ متسبب تھے مگر مباشر نہیں تھے اور جب مباشر موجود ہو تو متسبب کا مؤاخذہ نہیں ہوتا ہے۔

بعض نے جواب دیا ہے کہ ان کو تأدباً چھوڑا یا وہ روزے سے تھے لیکن حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں ان دونوں کو رد کیا ہے۔ واللہ اعلم

باب کی دوسری حدیث:۔ "عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ان خیر ماتداویتم بہ اللدود والسعوط والحجامۃ والمشیّ وخیر ما اکتحلتم بہ الاثمد فانہ یجلو البصر وینبتُ الشعر قال وکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لہ مکحلۃ یکتحل بھا عند النوم ثلاثاً فی کل عین"۔ [۲] (حسن غریب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جو دوائیں استعمال کرتے ہو ان میں لدود و سعوط و حجامت اور مشی بہتر ہیں، اور جو سرمہ تم استعمال کرتے ہو اس میں سب سے اچھا "اثمد" ہے کیونکہ وہ نگاہ کو تیز کرتا ہے اور پلکوں کے بال اُگاتا ہے (ابن عباس) فرماتے

۲ ایضاً راجع جمع الفوائد ص: ۲۵۱ ج: ۲.

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک سرمہ دانی تھی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت ہر آنکھ میں تین تین بار سرمہ لگاتے۔

لغات:۔قولہ "اثمد" بکسر الھمزۃ والمیم وبینھما ثاء ساکنۃ، کالے سرمے کو کہتے ہیں خواہ اصفہان کا ہو یا حجاز مقدس کا، تاہم حجاز میں جو پتھر اس کا ہوتا ہے وہ سرخی مائل ہوتا ہے مگر اصفہان کا پتھر زیادہ عمدہ ہوتا ہے کہ کالا ہے۔قولہ "مکحلۃ" بضم المیم والحاء وبینھما کاف ساکنۃ، اصل میں آلہ کا صیغہ ہے جو سلائی کو کہتے ہیں مگر خلاف القیاس یہ سرمہ دانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور یہاں یہی مراد ہے۔قولہ "یکتحل بھا" ای منھا، لہٰذا باء بمعنی من کے ہے جیسا کہ شمائل کی روایت میں ''منھا'' ہی ہے۔

تشریح:۔اس مسئلے کی وضاحت ابواب اللباس میں گذری ہے۔(دیکھئے تشریحات ترمذی ج: ۵ ص:۵٦۵ ''باب ماجاء فی الاکتحال'')

یہاں اس بحث کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔سرمہ سفید بھی ہوتا ہے اور کالا بھی جبکہ بعض کالا سرخی مائل بھی ہوتا ہے گو کہ استعمال ان سب کا جائز ہے مگر کالا زیادہ مفید ہے جیسا کہ حدیث الباب میں ہے۔جدید تحقیق کے مطابق سرمے میں چاندی کی آمیزش ہوتی ہے جو جراثیم کش ہے اس لئے سرمے کے استعمال سے آنکھوں کا فاسد مادہ باہر نکل آتا ہے، پھر سیاہ رنگ روشنی کے تمام رنگوں کا انجذاب کرتا ہے جو بصارت میں کلیدی کردار کا حامل ہے کہ دیکھنا روشنی جذب کرنے سے عبارت ہے۔راقم نے ''شعاعی تصویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت'' نامی کتاب میں اس کی پوری وضاحت پیش کی ہے۔

سرمہ زینت کے لئے استعمال کرنا بھی جائز ہے اور بطور دوا کے بھی، تاہم بطور نفع رات کو استعمال مفید تر ہے کہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سرمہ سرایت کر کے پورا اثر دکھاتا ہے مگر مردوں کو زینت سے پرہیز کرنا چاہئے، جبکہ عورتوں نے آج کل جو رواج بنایا ہے کہ سرمہ لگا کر بازار میں چلتی ہیں باقی چہرہ ڈھانپ لیتی ہیں اور آنکھیں دکھاتی ہیں یہ عمل شیطانی حرکت سے کم نہیں کہ ایسی حالت میں پلکیں دلوں کو ایسے چبھتی ہیں جیسے تیر نشانہ کو چیرتے ہیں، اس لئے اس سے پرہیز کرنا لازمی ہے، اگر عورتیں اس سے اجتناب نہ کریں تو مرد اپنی نگاہیں پست رکھیں تا کہ وہ کسی فتنے کا شکار نہ ہوں ورنہ وہ خود اپنے ذمہ دار ہوں گے۔

پھر سرمہ لگانے کی کوئی خاص ترتیب نہیں مگر بہتر و مستحب یہ ہے کہ طاق عدد اور داہنی آنکھ سے شروع کا اہتمام کیا جائے کہ پہلے دائی میں تین پھر بائی میں تین سلائی پھیر دے یا پہلے داہنی میں ایک پھر بائی میں

کے جنت میں داخل ہوں گے، "ھم الذین لایسترقون ولایتطیرون ولایکتوون وعلی ربھم یتوکلون"۔[۳] جبکہ اگلے باب میں اور بعض دیگر روایات میں اس کی اباحت معلوم ہوتی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے۔

"عن جابر قال بعث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الی ابی بن کعب طبیباً فقطع منہ عِرقاً ثم کواہ"۔ (رواہ ابن ماجہ واحمد ومسلم[۴])

ان روایات کو متعدد طریقوں سے جمع کیا گیا ہے: ایک یہ کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عمل ثابت ہے جیسا کہ اگلے باب میں ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے ثابت ہے تو وہ رگ کے خون روکنے کی غرض سے تھا جبکہ نہی کی روایات تداوی کی صورت پر محمول ہیں کہ جب عرب اس عمل کو مؤثر سمجھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا، گویا نہی تنزیہ کے لئے ہے، یا مطلب یہ ہے کہ اس کو ہر بیماری کے لئے مفید نہ سمجھا جائے بلکہ یہ مخصوص امراض میں مفید ہوسکتا ہے عام نہیں ہے۔ یا بطور حفظ ماتقدم کے اوپر محمول ہے، یہ تینوں توجیہات ابن العربی نے عارضہ میں بیان کی ہیں، حاشیہ ترمذی میں بھی یہی بات کی گئی ہے۔

اس بارے میں دوسری تطبیق یہ ہے کہ جواز کی روایات ضرورت پر محمول ہیں جبکہ نہی کی روایات عدم ضرورت پر، الکوکب الدری میں اسی کو لیا ہے۔ علی ھذا حضرت عمران بن حصینؓ کے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ضرورت کے موقع ومحل کو سمجھ نہ سکے، اس لئے ہم کامیاب نہ ہوئے یعنی ایسے موقع پر داغ لگوالئے جس کی اجازت نہ تھی جس کا علم پہلے سے نہ تھا بعد میں ہوا۔

بعض روایات کے مطابق اس عمل سے ان کی بیماری میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اس لئے انہوں نے کامیابی کی دومرتبہ نفی کی یعنی پہلی میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بیماری ٹھیک نہیں ہوئی، اور دوسری میں یہ کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے جبکہ حدیث کا صحیح مطلب اور محل وموقع سمجھنا بڑی کامیابی ہے، ترجمہ میں اسی توجیہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے، تاہم حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت تھانوی صاحبؒ نے ایک اور حدیث کی روشنی میں یہ مطلب لیا ہے کہ حضرت عمرانؓ سے فرشتے ملتے اور سلام کرتے تھے جب انہوں نے داغ

---

[۳] رواہ احمد فی مسندہ ص:۲۱۲ ج:۵ حدیث:۱۹۴۶۴، ایضاً ص:۴۴۸ ج:۱ حدیث:۴۴۴۴و ۳۷۹۶.

[۴] رواہ مسلم ص:۲۲۵ ج:۲ کتاب السلام، سنن ابن ماجہ ص:۲۴۹ ابواب الطب، مسنداحمد ص:۲۵۵ ج:۴ حدیث:۱۳۹۷۰.

دو یا تین پھر اخیراً داہنی میں ایک تا کہ اس سے ابتداء بھی ہو اور اسی پر انتہاء بھی ہو۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم[۳]

قولہ "وھو حدیث عبادبن منصور" یعنی باب کی دونوں حدیثیں ایک ہی درجے کی ہیں یعنی حسن غریب، کیونکہ دونوں میں مدار سند عباد بن منصور ہیں۔

باب ماجاء فی کراھیة الکیّ

"عن عمران بن الحُصین ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم :نھیٰ عن الکیّ فابتُلینا فاکتوینا فماافلحناو لاانجحنا"۔[۱] (حدیث حسن صحیح)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے داغ دینے سے ممانعت فرمائی ہے مگر جب ہم (بیماری میں) مبتلا ہوئے تو ہم نے داغ لگوا لئے پس نہ تو ہم (علاج میں) کامیاب ہوئے اور نہ ہی (اس سے بچنے میں) مقصد کو پہنچے۔

لغات:۔قولہ "الکیّ" اکتوی مطاوِع کَوَی اور کواہ الکیّة و کیّا، گرم لوہے یا پتھر وغیرہ سے جسم کے کسی حصے کو داغ دینے کو کہتے ہیں، تاہم یہ عمل کپڑے یا مخصوص قسم کی گھاس سے بھی کیا جاتا ہے۔

قولہ "فماافلحناو لاانجحنا" لغوی اعتبار سے دونوں کے معنی کامیابی کے آتے ہیں، تاہم "افلح" کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں عموماً اخروی نعمتوں کے حصول میں کامیابی کے لئے استعمال ہوا ہے، لیکن یہاں حدیث میں معنی لغوی مراد ہے۔ کماسیأتی شرحہ

تشریح:۔ آگ سے داغ دینے سے نہی کے بارے میں متعدد روایات ثابت ہیں ازاں جملہ ایک روایت باب کی بھی ہے، ایک اور روایت میں ہے: "نُھینا عن الکی "۔ ایک حدیث میں ہے: "من اکتوی او استرقی فقدبرئی من التوکل "۔ (رواہ الترمذی[۲]) ایک اور روایت میں ہے کہ ستر ہزار آدمی بغیر حساب

---

[۳] وعن ابن عمران رسول اللّٰہ ﷺ کان اذا اکتحل جعل فی العین الیمنیٰ ثلاثاً وفی العین الیسریٰ مرودین وجعلھا وتراً، رواہ الطبرانی فی الکبیر برقم: ۲/۳۶۴ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۱۳ ج:۵ حدیث: ۸۳۵۶۔

باب ماجاء فی کراھیة الکی

[۱] روی بمعناہ صحیح بخاری ص: ۸۴۸ ج:۲ کتاب الطب، سنن ابی داؤد ص: ۱۸۴ ج:۲ "باب فی الکی" کتاب الطب، سنن ابی ماجه ص: ۲۴۹ ابواب الطب، مسنداحمد ص: ۵۸۹ ج:۵ حدیث: ۱۹۳۳۰۔

[۲] ایضاً رواہ ابن ماجه ص: ۲۴۹ "باب الکی" ابواب الطب، مسنداحمد ص: ۳۰۳ ج:۵ حدیث: ۱۷۷۱۵۔

لگوادیئے تو وہ سلسلہ رک گیا پھر جب انہوں نے اس سے توبہ کر لی تو بفضلہ تعالیٰ وہ مبارک سلسلہ پھر شروع ہوا جیسا کہ مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، علی ھذا ''ولا انجحنا'' میں اسی حسرت کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاج میں بہت زیادہ غُلُو کی ضرورت نہیں ہے جہاں تک ممکن ہو الاسہل فالاسہل پر اکتفاء کر لینا چاہئے، ہاں جہاں ضرورت پڑے گی تو حسب ضرورت مہنگا اور مشکل علاج مباح ہوتا جائے گا حتی کہ بعض صورتوں میں مکروہات پھر محرمات اور حالت اضطراری میں تمام ممنوعات خواہ مسکرات ہی کیوں نہ ہوں حلال ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

"عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم: کَوَیٰ سعدبن زرارة من الشوکة"۔(ھذاحدیث حسن غریب وقداخرجہ الطحاوی فی معانی الآثار[1])

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن زرارہ کو سُرخ پھنسی کی وجہ سے داغ لگایا...(یا لگوایا)۔

لغات:۔قولہ "من الشوکة" بفتح الشین طاقت اور دبدبے کو بھی کہتے ہیں اور نوکیلی چیز جیسے کانٹے اور ہتھیار وغیرہ کو بھی کہتے ہیں چونکہ ان چیزوں میں تکلیف ہوتی ہے اس لئے جسم پر سرخ پھنسیوں کو بھی کہتے ہیں کہ یہ سخت دِہ تکلیف ہوتی ہیں۔

تشریح:۔ سعد بن زُرارہ یہ لفظ ہمزۂ مفتوحہ کے ساتھ بھی مروی ہے یعنی اَسعد جبکہ زرارہ میں زاء مضموم ہے، امام ترمذیؒ کا مقصد بیانِ جواز ہے جس کی وضاحت سابقہ باب میں گذری ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

[1] ایضاً اخرجہ الطبرانی فی الکبیر برقم: ۵۵۸۳ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۱۶ ج: ۵ کتاب الطب، مسنداحمد ص: ۱۳ ج: ۵ حدیث: ۱۶۱۸۲۔

باب ماجاء فی الحِجامة

"عن انس قال کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یحتجم فی الاخدعین والکاھل وکان یحتجم لسبع عشرۃ وتسع عشرۃ واحدیٰ وعشرین".[1] (ھذاحدیث حسن غریب)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم گردن کی دونوں جانب کی رگوں میں پچھنے لگواتے اور کندھے (کی رگ کاہل) پر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سینگی لگواتے سترہ تاریخ کو، اور انیس اور اکیس کو۔

لغات:۔قولہ "الحجامۃ" بکسر الحاء سینگی اور پچھنے لگانا، سینگی دراصل سوراخ کیا ہوا سینگ ہوتا ہے جسے بدن کے کسی حصے پر رکھ کر منہ سے خون چوسا جاتا ہے جس سے جسم کی گرمی اور فاسد خون باہر نکل جاتا ہے، آج کل سرنج کی طرح ایک آلہ دستیاب ہے جس کے ذریعہ یہ عمل بآسانی ہوتا ہے۔قولہ "الاخدعین" گردن کی دونوں جانبوں کی دو رگوں کو کہتے ہیں۔قولہ "الکاھل" دونوں شانوں کے مابین کمر کے اوپر والے حصہ کی رگ کو کہا جاتا ہے۔

تشریح:۔اچھی صحت وہ ہوتی ہے جو اعتدالِ اخلاط کے ساتھ ہو، جب چار اخلاط یعنی سوداء خون، بلغم اور صفراء میں کسی ایک کا اعتدال ختم ہو جائے تو بندہ مریض بن جاتا ہے پس اگر کوئی عنصر ان میں سے اپنی مقدار سے کم ہو جائے تو اس کا تدارک مناسب کھانے پینے یا ادویات سے ہوتا ہے جبکہ زیادتی کی صورت میں اس کے اخراج کی ضرورت پڑتی ہے، جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خون کے اخراج کے لئے پچھنے لگوائے جائے اور باقی کے اخراج کے لئے اسہال کرانا ہے۔(طب نبوی فصل:۴)

پچھنے لگوانے کے فوائد کافی زیادہ ہیں، تاہم وقت اور مقام کا لحاظ رکھنا اس کے لئے بہت اہم ہے، گرم علاقوں کے لوگوں کے لئے گرمیوں کے موسم میں یہ زیادہ مفید ثابت ہوتا ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عام سائنسی اصول کے مطابق کہ حرارت سے شئی پھیل جاتی ہے جبکہ برودت سے سکڑ جاتی ہے، گرم علاقے میں خون میں شدت آتی ہے خصوصاً گرم موسم میں اس لئے خون کا اخراج مفید رہتا ہے، آج کل بلڈ پریشر وغیرہ جیسے امراض کی

باب ماجاء فی الحجامۃ

[1] راجع للاحادیث حول عنوان الحجامۃ سنن ابی داؤد ص:۱۸۴ ج:۱ کتاب الطب، مجمع الزوائد ص:۱۰۴ ج:۱۰۹، جمع الفوائد ص:۲۴۷،۲۴۸ ج:۲ کتاب الطب، سنن ابن ماجہ ص:۲۴۸، ۲۴۹ ابواب الطب.

شکایت عام ہے، یہ خون کی بے اعتدالی ہی کی وجہ سے تو ہے۔

تاہم مذکورہ قاعدے کی بناء پر ٹھنڈے علاقوں کے لوگوں کے لئے اور خصوصاً جسم کے اندرونی امراض کے ازالے کے لئے فصد یعنی رگ کا خون نکالنا زیادہ مفید ہے کہ گرمی سے خون جلد کی طرف آجاتا ہے مگر ٹھنڈ کی وجہ سے وہ رگوں میں ہوتا ہے اور جلد سخت اور مسامات بند رہتے ہیں۔(تدبر) سر کی بیماریوں کے لئے گردن کی رگ میں مفید ہے جیسا کہ حدیث باب میں گردن کی رگ کا ذکر ہے۔

پھر چونکہ خون کا مدّ وجزر سے تعلق ہے روشنی تیز ہونے کی صورت میں اس میں زیادتی آتی ہے اس لئے سب سے اچھا وقت قمری مہینے کا نصف آخر خصوصاً تیسری چوتھائی نہایت مفید ہے۔

بعض حضرات نے بروز ہفتہ، بدھ اور جمعہ کو پچھنے لگوانا مضر قرار دیا ہے۔

دوسری حدیث:۔"عبادبن منصورقال سمعت عكرمة يقول كان لابن عباس غِلمة ثلاثة حجامون فكان اثنان يغلّان وواحديحجُمُه ويحجُم اهلَه قال وقال ابن عباس قال نبي الله نعم العبدالحجّام يذهب بالدم ويُخِفُّ الصلب ويحلوعن البصروقال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين عرج به"مامرّعليّ مَلَأٌ من الملائكة اِلاقالواعليك بالحجامة وقال:ان خير ماتحتجمون فيه يوم سبع عشرة ويوم تسع عشرة ويوم احدیٰ وعشرين ،وقال: ان خير ماتداويتم به السعوط واللّدودوالحجامة والمشيُّ وان رسول الله صلى الله عليه وسلم لدّه العباس واصحابه فقال رسول اللّه صلى الله عليه وسلم:من لَدَّني ؟فكلّهُم امسكوافقال لايبقى احدممن في البيت اِلالُدَّ غيرعمه العباس ،قال النضراللدودالوُجُور"۔(حديث حسن غريب)

حضرت عبادہ بن منصور فرماتے ہیں کہ میں نے عکرمہ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابن عباس کے تین غلام تھے جو حجامت کا کام جانتے تھے (یا حجامت ان کا پیشہ تھا) پس ان میں سے دو تو کما کر لاتے جبکہ ایک ان کو اور ان کے گھر والوں (یعنی متعلقین) کو سینگی لگاتا تھا، عکرمہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ کے نبی نے ارشاد فرمایا ہے: کہ اچھا غلام سینگی لگانے والا ہوتا ہے جو (زائد وفاسد) خون کو نکالتا ہے اور پیٹھ (کی گرانی) کو ہلکا کر دیتا ہے اور نگاہ کو تیز کرتا ہے اور فرمایا (ابن عباسؓ نے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج میں اوپر جاتے ہوئے فرشتوں کی کسی جماعت سے نہیں گذرے مگر انہوں نے کہا کہ آپ پچھنے کو رواج دیں اور یہ کہ تمہارے پچھنے لگانے کے ایام میں بہترین تاریخیں سترہ، انیس اور اکیس ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا کہ معالجہ کا بہترین طریقہ ناک سے دوا چڑھانا، منہ سے کھلانا، پچھنے لگانا اور جلاب ہے، اور یہ کہ (جب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منہ میں دوا پلائی حضرت عباس اور صحابہ کرامؓ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (افاقہ ہونے کے بعد) فرمایا کہ کس نے میرے منہ میں دوا ڈالی؟ تو سب خاموش ہوئے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھر میں جتنے بھی لوگ ہیں ان میں کوئی نہ بچے مگر سب کو دوا پلائی جائے سوائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ کے۔

نضر راوی کہتے ہیں کہ لدود ہی وجور ہے۔ (پہلے گذرا ہے کہ لدود جانب سے دی جاتی ہے اور وجور منہ کے درمیان یا حلق میں ٹپکائی جاتی ہے)

لغات:۔ قولہ "غِلمة" غلام کی جمع ہے۔ قولہ "يُغِلّان" بضم الیاء وکسر الغین، اَغَلَّ يُغِل کے صلہ میں جب "علیٰ" آجائے تو بمعنی آمدنی لانے کے آتا ہے، پھر غَلَّة اگرچہ مطلق آمدنی کو کہتے ہیں حتی کہ زمین کی پیداوار کو بھی غلّہ کہا جاتا ہے، مگر یہاں پچھنے لگانے کی اُجرت مراد ہے۔ قولہ "يُخِفُّ" اِخفاف سے ہے بمعنی ہلکا کرنے کے۔ باقی الفاظ کی شرح پہلے گذری ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ پچھنے لگانا اور لگوانا دنوں جائز ہیں اور یہ کہ اس پر اُجرت لینا بھی جائز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس کی اُجرت حضرت ابوطیبہ رضی اللہ عنہ کو دی ہے جیسا کہ صحیحین [۲] کی روایت میں ہے، ہاں یہ بات ہے کہ یہ پیشہ اختیار کر لینا پسندیدہ نہیں ہے، اسی طرح ہر وہ کام شرعاً ناپسند کیا جاتا ہے جس میں کسی طرح گندگی کے لگنے کا قوی احتمال ہو۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ج:۵ ص:۲۰۸ وص:۲۰۹، باب ماجاء فی کسب الحجام، ابواب البیوع)

باقی روایت کی تشریح پہلے گذری ہے، البتہ اس روایت کے اخیر میں یہاں یہ اضافہ ہے کہ گھر کے تمام افراد کو دوا پلائی گئی چنانچہ حافظ ابن حجر اور حافظ عینی رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو بھی پلائی گئی، [۳] ممکن ہے کہ وہ بھی اس مشورے میں شریک ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے "من فی البیت" کے عموم کو دیکھ کر ان کو دوا دی ہو۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

---

[۲] صحیح بخاری ص:۸۴۹ ج:۲ "باب الحجامة من الداء" کتاب الطب، صحیح مسلم ص:۲۲۵ ج:۲ عن ابن عباس ان النبی ﷺ احتجم واعطی للحجام اجرہ واسقط، کتاب السلام۔

[۳] کما رواہ احمد فی مسندہ ص:۱۷۱ ج:۷ حدیث:۲۴۳۴۹، ص:۵۹۱ ج:۷ حدیث:۲۶۹۳۲.

باب ماجاء فی التداوی بالحِناء

”عن علی بن عبیداللّٰہ عن جدته وکانت تخدم النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قالت:ماکان یکون برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قَرحَة ولانکبة الاامَرَنی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ان اضع علیهاالحِناء“۔[1] (هذاحدیث غریب واخرجه ابن ماجه)

علی بن عبیداللہ اپنی دادی (سلمٰی ام رافع زوجہ ابی رافع) سے نقل کرتے ہیں جوآپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتی تھی، انہوں نے فرمایا کہ کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی زخم تلوار وغیرہ کا یا پتھر اور کانٹے کا نہیں لگتا تھا مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس پر مہندی لگانے کا حکم دیتے۔

لغات:۔قوله”ماکان یکون“اس میں یکون زائد برائے تاکید بھی ہوسکتا ہےاور تاویل کرکے اسے غیرزائد بھی ماناجاسکتا ہے ای ماکان قرحة ولانکبة تکون برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم“الخ۔ قوله”قرحة“ بفتح القاف اورضمہ بھی جائز ہے، وہ زخم جوتلوار یا چھری وغیرہ کا ہو۔قوله”نکبة“بفتح النون بروزن رحمة جیسا کہ قرحہ بھی اسی وزن پر ہے، پتھر یا کانٹے کے زخم کو کہتے ہیں، ولانکبۃ میں لازائد برائے تاکید ہے۔ قوله”الحِناء“ بکسرالحاءوتشدیدالنون،مہندی کے پتے اورمہندی۔

تشریح:۔یہ روایت ابن ماجہ میں اس طرح ہے:”قالت کان لایصیب النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قرحة ولاشوکة الاوضع علیه الحناء“[2] اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ترمذی کی روایت میں کان کی ضمیر برائے شان ہے۔دوم یہ کہ یکون زائد ہے الا بتاویل کمامرّ۔

چونکہ مہندی میں قوت قابضہ پائی جاتی ہے اسی طرح یہ مزاج کے اعتبار سے ٹھنڈی بھی ہے جبکہ دوسرے درجے میں یہ خشک ہے اس لئے زخم پر لیپ کرنے سے خون بھی بند ہوجاتا ہےاورزخم کی گرمی بھی ختم ہوکر درد میں کمی آجاتی ہے، اسی بناء پر یہ اس دردِ سر کے لئے بھی مفید ہے جوشدتِ حرارت کی وجہ سے ہو، اپنی کثیرالمنفعت خصوصیات کی وجہ سے یہ ہرقسم کی پھنسیوں، گلے ہوئے اعضاء، مرطوب دانوں اورخارش کے ازالے کے لئے مفید ہے،لوگوں کا تجربہ ہے کہ پاؤں کے تلوؤں کی جلن دورکرنے کی غرض سے اس کالیپ کرنا

باب ماجاء فی التداوی بالحناء

[1] سنن ابن ماجه ص:۲۵۰ باب الحناء ابواب الطب، جمع الفوائد صب۲۵۰ ج:۲ کتاب الطب.

[2] سن ابن ماجه حواله بالا.

بھی مفید ہے، تاہم ابن العربیؒ نے عارضہ میں حنا سے متعلق تمام احادیث کی صحت سے انکار کیا ہے۔ شاید حدیث الباب حسن ہو۔

باب ماجاء فی کراهیة الرّقیة

"عن عقّار بن المغیرة بن شعبة عن ابیه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: من اکتوی او استرقی فهو بریئ من التوکل"۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص داغ لگوائے یا دم کرالے تو وہ توکل سے خالی ہے۔

لغات:۔ قولہ "الرُّقیة" بضم الراء وسکون القاف، جھاڑ پھونک کو کہتے ہیں۔

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

"عن انس ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: رَخَّصَ فی الرقیة من الحُمَةِ والعین والنملة"۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچھو کے ڈنگ اور نظر بد اور پہلو کی پھنسیوں کے لئے جھاڑ پھونک کی اجازت فرمائی ہے۔

لغات:۔ قولہ "الحمة" بضم الحاء وتخفیف المیم، بچھو کے ڈنگ مارنے کو کہتے ہیں۔ قولہ "العین" نظر لگنا مراد ہے خواہ انسان کی ہو یا جنات کی۔ قولہ "النملة" بروزن رحمة، وہ پُھنسیاں جو پہلو پر نکلتی ہیں۔

دونوں بابوں کی تشریح:۔ چونکہ جھاڑ پھونک اور داغ دینے سے علاج میں کامیابی کی صورت میں آدمی کا عقیدہ کچھ نہ کچھ متزلزل ہونے کا قوی اندیشہ رہتا ہے اگرچہ خواص اس سے محفوظ رہتے ہیں مگر عوام بیچارے تو فائدے کو دیکھتے ہیں اور ظاہری فائدہ جس چیز سے حاصل ہوتا ہے عوام اسی کو مفید بلکہ مؤثر سمجھنے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہ ظن غلبہ اختیار کرتا رہتا ہے اس لئے پہلے باب کی حدیث میں ان دونوں سے روکا گیا، پس

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

[1] روی بمعناه ابوداؤد ص:۱۸۷ ج:۲ کتاب الطب، ایضاً رواه مسلم فی الایمان، جمع الفوائد ص:۲۵۴ ج:۲ کتاب الطب.

مطلب یہ ہوا کہ جوشخص ایسا کرتا ہے وہ کامل توکل سے محروم ہو جاتا ہے، یا مطلب یہ ہے کہ جوشخص بغیر اضطراب اور ضرورت کے ایسا کرے گا تو وہ توکل میں نقصان اٹھائے گا، یا پھر یہ روایت اس وقت سے متعلق ہے جب لوگ نئے نئے مسلمان ہو رہے تھے اور قرآنی تعلیمات ابھی ابتدائی حالت میں تھیں جب لوگوں نے عقائد کی تفصیل معلوم کر لی تو پھر یہ حکم منسوخ ہوا علی ھذا اس ممانعت کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن دوسرے باب میں اس کی رخصت بیان ہوئی ہے پس اس رخصت کو پہلے باب کی وجہ ممانعت کے تناظر میں دیکھنا ہوگا، یعنی پہلے باب کی حدیث میں نہی کی جو وجہ ہوگی جواز کی حدیث میں اس وجہ کی نفی رخصت کی علت ہوگی۔

بہرحال اس بارے میں دونوں جانب بہت ساری صحیح احادیث مروی ہیں، نہی کے بارے میں بھی اور اباحت کے متعلق بھی،[۲] جن میں تطبیق کی صورتیں وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ جھاڑ پھونک کرنے اور کروانے میں فرق ہونا چاہئے کیونکہ حدیث بالا میں لفظ ''استرقی'' کا استعمال ہوا ہے اور یہ معلوم ہے کہ باب استفعال کی ایک خاصیت طلبِ فعل (یعنی مأخذ الاشتقاق) بھی ہے، لہٰذا اسی خاصیت کے تناظر میں کہا جائے گا کہ جھاڑ پھونک کروانے کی غرض سے کسی کے پاس جانا نہیں چاہئے اور نہ ہی اسے طلب کرنا چاہئے البتہ اگر کوئی آدمی از خود چل کر مریض کے پاس جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ رقیہ کے کلمات والفاظ مشروع ہوں کیونکہ اس سے توکل پر اثر نہیں پڑتا، اسی طرح استرقی یعنی طلب رقیہ میں بھی کوئی حرج نہیں ہے جبکہ اسے اسباب کے درجہ میں مان کر اعتماد صرف اللہ پر ہو مگر یہ قدرت عوام کو شاید حاصل ہونا مشکل ہو، لہٰذا جھاڑ پھونک کے وقت ان کو بتانا چاہئے کہ شفا دینے والا صرف اللہ ہے اُسی نے اپنے کلام میں شفا رکھی ہے۔ مزید تفصیل درکار ہو تو دیکھئے (تشریحات ترمذی ص: ۲۲۸ تا ص: ۲۳۲ ج: ۴، باب ماجاء فی التعوذ للمریض، ابواب الجنائز)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث ''لارقیة الامن عین او حمة''[۳] میں حصر مقصود نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جن بیماریوں میں رقیہ زیادہ مفید ہے ان میں سے یہ دو بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں گو رقیہ باقی امراض میں بھی مفید ہے۔

---

۲ راجع للروایات جمع الفوائد ص: ۲۵۳ تا ۲۵۷ ج: ۲.

۳ رواه البخاری ص: ۸۵۰ ج: ۲ کتاب الطب، ایضاً رواه مسلم فی الایمان وابوداؤد فی الطب باب: ۱۷، مسنداحمد ص: ۴۴۷ ج: ۱ حدیث: ۲۴۴۴. حفیظ الرحمن الحنفی عفی عنه

بہرحال جب دوا یا رقیہ سے فائدہ محسوس ہو تو شفاء کی نسبت اللہ کی طرف کرنی چاہئے کہ درحقیقت وہی شفاء دینے والا ہے۔

باب ماجاء فی الرقیة بالمعوّذتین

"عن ابی سعید قال کان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم :یتعوّذ من الجانّ وعین الانسان حتی نزلت المعوّذتان فلمانزلتا أخذبهماوترک ماسواھما"۔[1] (حدیث حسن غریب)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنات اور انسانی بدنظری سے پناہ مانگتے تا آنکہ معوّذتین نازل ہوئیں، پس جب یہ دونوں (سورتیں) نازل ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی دونوں کو معمول بنایا اور باقی کا پڑھنا ترک کیا۔

لغات:۔ عوذ اور عیاذ پناہ اور پناہ میں آنے کو کہتے ہیں جبکہ تعوّذ پناہ میں آنے اور پناہ لینے کو کہا جاتا ہے۔قولہ "المعوّذتان" اصطلاح میں سورۂ فلق اور سورۃ الناس دونوں کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ چونکہ نظر بد ایک حقیقت ہے اور ہر ایک کو لگ سکتی ہے اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جنات کے شر اور نظر بد کے ضرر سے بچنے کے لئے دعائیں مانگتے مثلاً "اعوذ باللّٰہ من الجان وعین الانسان"[2] پھر جب لبید بن اعصم یہودی اور اس کی بیٹیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تو اس سے شفاء کے لئے یہ دونوں سورتیں نازل ہوگئیں جس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سورتوں کا پڑھنا معمول بنایا اور باقی معوّذات کا پڑھنا کم کردیا، کیونکہ ان سورتوں میں جو جامعیت اور برکت ہے وہ دوسری ادعیۂ تعوذ میں نہیں ہے لہٰذا باقی تعوّذاتِ ماثورہ کا پڑھنا بدستور جائز ہے منسوخ نہیں۔

قال ابن العربیؒ فی العارضة:"اذاکان الافضل الرقیة بکتاب اللّٰہ فالفاتحة اصل... وبالمعوّذتین ...اوبکلمات المرویة عنه فی تعویذالحَسَن وفی تعویذجبریل وثابت"۔

باب ماجاء فی الرقیة بالمعوذتین

[1] الحدیث اخرجه النسائی ص:۳۱۷ ج:۲ کتاب الاستعاذة، سنن ابن ماجه ص:۲۵۱ "باب من استرقی من العین" ابواب الطب. [2] جمع الفوائد ص:۲۵۵ ج:۲.

معوذتین کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ دونوں سورتیں مکی ہیں مگر یاد رہے کہ کسی سورت یا آیت کا مکرر نازل ہونا ممنوع نہیں، یہ مسئلہ اوراسی طرح ان دونوں سورتوں کے بارے میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے مع الاجوبہ راقم کی کتاب ''زادیسیر فی علوم التفسیر'' میں ملاحظہ ہو کہ یہ مسئلہ تفسیر کا ہے۔

باب ماجاء فی الرقية من العين

''عن عبيدبن رفاعة الزرقی ان اسماء بنت عميس قالت: يارسول الله! ان ولدجعفر تُسرع اليهم العين أفاسترقی لهم؟ قال "نعم" فانه لو كان شئیٌ سابق القدر لسبقه العين"۔ (حديث حسن صحيح)[1]

حضرت عبید بن رفاعہ سے روایت ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے دریافت کیا اے اللہ کے رسول! جعفر کی اولاد کو نظر بد لگ جاتی ہے تو کیا میں ان کے لئے جھاڑ پھونک کرسکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہاں'' کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت حاصل کرسکتی تو آنکھ سبقت لے جاتی۔ (یعنی بدنظری)

تشریح:۔ حضرت اسماء بنت عمیس بصیغۂ تصغیر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی بیوی ہیں، یہاں سوال اپنے ہی بچوں کے بارے میں مراد ہے مگر حضرت جعفرؓ کی خوب صورتی کو سوال میں اُجاگر کرنا مقصود ہے تاکہ نظر بد لگنے کی وجہ بھی ساتھ ساتھ ذکر کردیں کیونکہ ''الولد سر لابيه'' یعنی میرے بچوں کو خوب صورتی کی وجہ سے نظر بد لگتی ہے کیونکہ آخر وہ جعفر ہی کے بچے ہیں نظر کیوں نہ لگے گی، پھر وَلَد بفتحتین مفرد اور جمع ایک تا دس مذکر اور مؤنث سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اس کا بہترین ترجمہ اردو میں ''اولاد'' ہے۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجازت دینا ان کی خصوصیت نہیں بلکہ عام اذن ہے بشرطیکہ وہ کلمات ماثور یا کم از کم معنی صحیح پر مشتمل ہوں اور جہاں تک جواب میں اضافے کا تعلق ہے تو یہ مبالغے کے لئے ہے تاکہ لوگ نظر بد سے بچنے کی تدبیر کریں جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو تدبیر بتلائی تھی اور اگر نظر بد لگ جائے تو اس کے لئے جھاڑ پھونک کریں کیونکہ نظر بد کی مستعار تاثیر اتنی قوی ہے کہ اگر کوئی

باب ماجاء فی الرقية من العين

[1] جمع الفوائد ص:۲۵۴ ج:۲ کتاب الطب، ایضاً راجع للروايات مجمع الزوائد ص:۱۲۸ تا ۱۳۱ ج:۵ کتاب الطب.

چیز تقدیر پر غالب آسکتی تو نظر وہ چیز ہے جو غالب آجاتی مگر اللہ کا فضل ہے کہ کوئی چیز تقدیر کو مغلوب نہیں کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ سب تقدیر کا حصہ ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ نظر بد کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ نقل اور عقل دونوں کے خلاف چلتے ہیں اور یہ کہ یہ تاثیر دراصل روح کی ہوتی ہے اسی بناء پر نابینا شخص کی بھی نظر بد لگتی ہے۔ (راجع للتفصیل زاد المعاد و تشریحات ترمذی ص: ۲۳۰ ج:۴، باب ماجاء فی التعوذ للمریض) اس کی کچھ وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

حدیث آخر:۔"عن ابن عباس قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :یعوّذ الحسن والحسین یقول:أُعِیذُ کُمابکلمات اللّٰہ التامّة من کل شیطان وھامة ومن کل عین لامّة ویقول :ھکذا کان ابراھیم یعوِّذ اسحٰق واسمٰعیل"۔[۲] (ھذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے تعوذ فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے میں تمہارے لئے اللہ کے کلام کے ذریعہ پناہ مانگتا ہو جو پورا ہے ہر شیطان سے اور ہر زہریلی چیز سے اور جنون میں ڈالنی والی آنکھ سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی طرح تعوذ فرماتے حضرت اسحٰق اور اسمٰعیل (علیہما السلام) کے لئے۔

لغات مع التشریح:۔قولہ "التامّة" اس سے کلمات کی توصیف اس لئے کی گئی کہ اللہ کا کلام پورا اور مکمل ہے اس میں کسی طرح کا نقصان نہیں یا اس لئے کہ وہ تعوذ کے لئے کافی ہے، پھر کلمات سے مراد کلام بھی ہوسکتا ہے جو کہ قرآن ہے اور اسماء وصفات بھی ہوسکتی ہیں۔قولہ "ھامّة" ہر وہ زہریلا جانور جس کے کاٹنے سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے جبکہ اس سے کم درجے کا جانور سام کہلاتا ہے یعنی اس کا زہر قاتل نہیں۔ھامة،ھم بمعنی فکر سے بھی ہوسکتا ہے یعنی ہر اس چیز سے پناہ مانگتا ہوں جو پریشان کرنے والی ہو۔

قولہ "لامّة" لامہ، جنون کی ایک قسم یا درجہ ہے، جب آدمی کو نظر بد لگتی ہے تو وہ معیون پاگل اور مجنون جیسا حواس باختہ محسوس ہوتا ہے وہ خود بھی اپنی حالت صحیح طور پر نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہوا ہے؟

---

[۲] الحدیث اخرجه ایضاً سنن ابن ماجه ص: ۲۵۱ ابواب الطب، صحیح بخاری ص:۴۷۷ ج:۱ کتاب الانبیاء، ایضاً رواه ابوداؤد فی کتاب السنة باب: ۲۰، واحمد بن حنبل ۱/۲۳۶.

باب ماجاء أن العين حق والغسل لها

"عن یحی بن ابی کثیرقال ثنی حیّة بن حابس التمیمی ثنی ابی انه سمع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول:لاشئی فی الهام، والعینُ حق"۔(حدیث غریب واخرجه احمد[1]، وکذااخرجه البخاری فی الادب المفرد)

حضرت حابس تمیمی رضی اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ ہام کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نظر لگنا سچ ہے۔

لغات:۔ہام جمع ہے ہامۃ کی بروزن ساعۃ یعنی میم کی تخفیف کے ساتھ۔بعض نے تشدید کو بھی جائز کہا ہے۔ہام یا ہامہ سر اور کھوپڑی کو بھی کہتے ہیں اور ''بومہ'' یعنی اُلو کو بھی کہا جاتا ہے اور ایک چھوٹے سے پرندے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو رات کو قبرستان میں رہتا ہے۔قاموس الوحید وغیرہ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا اعتقاد تھا کہ مقتول کی کھوپڑی سے ایک پرندہ نکل کر گھر آتا ہے اور ''اسقونی،اسقونی'' پکارتا ہے یعنی مجھے سیراب کرو،اور مراد بدلہ لینا ہوتا ہے چنانچہ وہ مسلسل انتقام لینے تک یہ پکارتا رہتا ہے،اسلام نے اس عقیدہ کو باطل قرار دیا جیسا کہ حدیث باب میں مصرح ہے۔(کذافی الحاشیتین)

ابن العربیؒ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں ''وحدیث ابی عیسی هذاصحیح''۔

تشریح:۔ہام کے بارے میں کچھ کہانی زمانۂ جاہلیت کے اہل عرب میں مشہور ومزعوم تھی،اس حدیث میں اس کی صریح نفی کی گئی،اس کے بعد اس قسم کی واہیات کا زعم کسی طرح جائز نہیں،اسی طرح بعض مسلمانوں میں ارواح کے متعلق جو قصے مشہور ہیں کہ روح کبھی طوطے کی شکل میں کسی پنجرے میں بند ہوتی تھی اور کبھی موتی بن کر سانپ کے منہ میں محفوظ کردی جاتی وغیرہ وغیرہ یہ ہندوں کے عقائد کا حصہ ہیں جو کہ تناسخ کے قائل ہیں لہٰذا پریوں،دیو اور شہزادوں کے اس قسم کے مفروضی بلکہ منگھرٹ قصہ خوانیوں سے پرہیز لازمی ہے کہ اس سے عقیدہ خراب ہوجاتا ہے کیونکہ اسلام میں تناسخ کے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جہاں تک نظر بد کا تعلق ہے تو بلاشبہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے مگر اس کے ساتھ یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ

باب ماجاء أن العين حق والغسل لها

[1] مسنداحمد ص:۶۵ ج:۶ حدیث:۲۰۱۵۶، ۲۰۱۵۷، ۲۰۱۵۸۔

اشیاء کی تاثیرات تولیدی نہیں اور نہ ہی تاثیرات کا دارومدار اعداد پر ہے بلکہ عادی ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اشیاء میں بعض اثرات پیدا فرمائے ہیں، یہ اشیاء بمنزلہ اسباب ہوتے ہیں، ان کے استعمال یا رونما ہونے سے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی سنتِ جاریہ کے مطابق کچھ اثرات پیدا فرماتے ہیں، اس مسئلہ کی تفصیل ''باب ماجاء فی کراھیۃ البول فی المغتسل'' میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج:۱ص:۱۳۸)

نظر بد آنکھ کا اثر ہے یا روح کا؟ اس کے بارے میں ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے:

''ولیست العین ھی الفاعلۃ وانما التاثیر للروح ولشدۃ ارتباطھا بالعین نُسب الفعل الیھا وروح الحاسد مؤذیۃ لِلمحسود اَذیً بیّناً ولھذا امر اللّٰہ رسولہ ان یستعیذ بہ من شرّہ'' الخ۔ (مختصر زاد المعاد ص:۲۳۷ فصل فی حجۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ)

یعنی نظر بد آنکھ کی تاثیر نہیں بلکہ دراصل روح کی تاثیر ہوتی ہے مگر آنکھ سے گہرے تعلق کی بناء پر نسبت آنکھ کی طرف کی جاتی ہے چنانچہ حسد کرنے والا شخص محسود کو سخت تکلیف پہنچاتا ہے یعنی نظر بد لگاتا ہے۔

بہر حال نظر ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم اس کی ماہیت کیا ہے تو یہ جاننا خاصا مشکل ہے ممکن ہے کہ جس طرح آج کل لیزر شعاعیں غیر مرئی حقیقت اور مؤثر قوت ہیں، اسی طرح یہاں بھی کوئی غیر مرئی طاقت خفیہ طریقہ سے وار کرتی ہو اور اس قسم کے حقائق کا کارخانۂ قدرت میں وجود کوئی ناممکن نہیں، دیکھئے کبھی ایک بات سے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث:۔ ''عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :لو کان شئی سابق القدر لسبقتہ العین واذا استُغسِلتم فاغسلوا''۔[۲] (ھذا حدیث حسن صحیح)

یعنی جب تم (عائن) سے غسل کرنے کو کہا جائے تو غسل کر لیا کرو۔

لغات:۔ قولہ ''استُغسلتم'' بصیغۂ مجہول طلب غسل مراد ہے یعنی جب کسی کی نظر لگ جائے اور معین یا اس کے گھر والے عائن سے کہیں کہ تم اپنے اعضاء دھو کر وہ مستعمل پانی ہمیں دے دو تو ایسا کرنا چاہئے۔

محشی نے مجمع البحار کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اگر عائن غسل سے انکار کر دے تو اسے مجبور کیا جائے گا کیونکہ اس حدیث میں امر کا صیغہ ''فاغسلوا'' لزوم پر دلالت کرتا ہے۔

تشریح:۔ پھر غسل کا طریقہ حاشیہ میں تفصیل سے بتلایا ہے کہ عائن کے پاس جب پانی لایا جائے تو وہ

---

[۲] الحدیث رواہ مسلم کذافی جمع الفوائد ص:۲۵۶ ج:۲.

پہلے چلو میں پانی لے کر مضمضہ کر کے کلی کا پانی اسی برتن میں ڈالے، پھر چہرہ دھولے، پھر بائیں ہاتھ سے پانی لے کر دائیں پر ڈالے، وبالعکس، پھر بائیں ہاتھ سے پانی داہنی کہنی پر ڈالے، وبالعکس، پھر بائیں ہاتھ سے پانی لے کر سیدھے پاؤں پر ڈالے، وبالعکس یعنی پھر سیدھے ہاتھ سے پانی لے کر بائیں پیر پر ڈالے، پھر اسی طرح گھٹنے دھوئے اور پھر داخل الازار یعنی شرم گاہ اور ازار باندھنے کی جگہ کے درمیانی حصے کو دھوئے، یہ سارا مستعمل پانی اس برتن میں جمع ہونا چاہئے، فراغت کے بعد یہ سب پانی یک بارگی معین کے اوپر پشت کی جانب سے ڈالے وہ اللہ کے حکم سے ٹھیک ہو جائے گا۔ تاہم ابن العربیؒ نے عارضہ میں دھونے کی اس تفصیل سے اتفاق نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"ومن قال :لایجعل الانـاء فی الارض ویغسل کذابکذاو کذابکذا،فهو کله تحکم وزیادة"۔(العارضة)

یعنی مندرجہ بالا طریقہ کار کی ضرورت نہیں اور نہ ہی برتن کو ہاتھوں میں معلق پکڑنے کی ضرورت ہے بلکہ صرف ہاتھ پاؤں اور داخل الازار دھونا جیسے بھی ہو کافی ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس وضو کے پانی کا نظر کے ازالہ سے کیا تعلق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے بعض اسباب انتہائی مخفی ہوتے ہیں تو پھر ان کے اثر کے ازالے کا طریقہ بھی باریک ہوتا ہے جس کا عام مشاہدہ کیا جا سکتا ہے دیکھئے جادو وغیرہ اور ریاضی کے اصول وغیرہ کو وہ کتنی باریکی پر مبنی ہوتے ہیں چنانچہ کچھ اجسام کو مخصوص زاویہ پر رکھنے سے ان میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک آدمی باقاعدہ ایک گھنٹے کے بعد آ کر گھنٹی بجاتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے حالانکہ وہ کوئی انسان نہیں ہوتا ہے، آپ نظام شمسی پر غور کریں کہ مخصوص زاویہ پر واقع ہونے پر یہ اجرام فلکیہ کس طرح رواں دواں ہیں؟ جب آدمی اللہ عز اسمہ کے کارخانۂ قدرت میں معلومات کی روشنی میں غور کرتا ہے تو اس قسم کے عجائبات کا مشاہدہ روزمرہ کا معمول بن جاتا ہے۔

علاج کے اسباب کیا ہیں؟ اس بارے میں کئی آراء ہیں: ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد تجربے پر ہے ممکن ہے کہ یہ تمام اسباب بیک وقت مفید ہوں، علی ھذا نظر بد سے شفاء اس تجربے کے تناظر میں نامعقول نہیں کہ اس قسم کے تجربات قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں، مذکورہ تجربہ بھی زمانۂ قدیم کا نسخہ تھا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رکھا، علاوہ ازیں روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جب کوئی چیز دیکھنے سے پسند آ جائے تو آدمی

برکت کی دعا کرے، یا "ماشاء اللّٰہ ولاقوۃ الاباللّٰہ" [۳] کہے تو نظر کے ضرر سے تحفظ ہوسکتا ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظر کے حوالے سے جو طریقے مختلف اقوام میں معمول بہا ہیں اور وہ مفید بھی ثابت ہوئے ہیں تو اگر ان میں کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب نہ آتا ہو یا وہ اصول سے متصادم نہ ہوں تو وہ بھی قابل عمل ہیں مثلاً ہمارے ہاں یہ طریقہ ہے کہ عائن اپنے بدن پر سوتی کپڑ املتا ہے پھر اس کی بتی بنا کر آگ لگا دی جاتی ہے اور معین اس دھوئیں کے اوپر کھڑا ہو جاتا ہے اور دھواں سونگھتا ہے، اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ شفاء بھی عنایت فرماتے ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، سبحانك لاعلم لناالاماعلّمتنا [۴]۔

باب ماجاء فی اخذ الاجر علی التعویذ

"عن ابی سعیدقال :بَعَثَنَارسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی سریّة فنزلنابقوم فسئلناهم القری فلم یقرونافلُدِغ سیدهم فأتونافقالوااهل فیکم من یرقی من العقرب؟قلت نعم آناولکن لاارقیه حتی تعطوناغنماًقالوافانانعطیکم ثلاثین شاةً فقبلنافقرأت علیه الحمدسبع مرات فبرأ وقبضناالغنم ،قال فعرض فی انفسنامنهاشئی فقلنالاتعجلواحتی تأتوارسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال فلماقدمناعلیه ذکرتُ له الذی صنعتُ قال:وماعلمتَ انهارقیة ؟اقبضواالغنم واضربوا لی معکم بسهم"۔(هذاحدیث حسن صحیح واخرجه الشیخان وغیرهما [۱])

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سریہ کی شکل میں بھیجا تو ہم ایک قبیلے والوں کے یہاں اتر گئے ہم نے ان سے ضیافت طلب کی مگر انہوں نے ضیافت نہیں کی (یعنی کھانا نہیں کھلایا) اتنے میں ان کا سردار ڈسا گیا (یعنی سانپ یا بچھو نے ڈس لیا) تو وہ ہمارے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ تم میں کوئی بچھو کے ڈسے ہوئے کو دم کرسکتا ہے؟ میں نے کہا ہاں میں جانتا ہوں لیکن جب تک تم ہمیں بکریاں نہیں دوگے تب تک میں رقیہ نہیں کروں گا تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو تیس (۳۰) بکریاں دیں گے (کیونکہ سریہ والے بھی کل تیس صحابہ تھے) پس ہم نے قبول کرلیا پس میں نے اس پر سات مرتبہ الحمد شریف

---

[۳] کذا فی مجمع الزوائد ص: ۱۳۱ ج:۵ حدیث: ۸۴۳۲۔ [۴] سورۃ البقرۃ آیت: ۳۲۔

باب ماجاء فی أخذ الاجر علی التعویذ

[۱] صحیح بخاری ص: ۸۵۴ ج:۲ "باب الرقی بالقرآن والمعوذات" کتاب الطب، صحیح مسلم ص: ۲۲۴ ج:۲ کتاب السلام، ایضاً رواہ ابوداؤد کذا فی جمع الفوائد ص: ۲۵۵ ج:۲۔

پڑھ کر دم کیا چنانچہ وہ ٹھیک ہو گیا اور ہم نے وہ بکریاں لے لیں، فرماتے ہیں کہ اس سے ہمارے دلوں میں کھٹکا سا پیدا ہوا، تو ہم نے باہمی مشاورت سے طے کیا کہ جلدی نہ کریں یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا جائے، فرمایا کہ جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس عمل کے بارے میں آگاہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ یہ (فاتحہ) رقیہ ہے؟ بکریوں کو اپنے پاس رکھو اور میرا بھی ان میں حصہ کرلو۔

لغات:۔ "تعویذ" باب تفعیل کا مصدر ہے، تحفظ کے پیش نظر یا شفاء کی غرض سے اسماء حسنیٰ وغیرہ کلمات خیر لکھنا یا پڑھنا۔ قولہ "فی سریة" بکسر الراء وتشدید الیاء المفتوحہ، لشکر کا وہ دستہ جس کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار سو افراد پر مشتمل ہو، یہاں جس سریہ کا ذکر ہے روایات کے مطابق یہ تیس نفوس پر مشتمل تھا۔ اصحاب السیر کی اصطلاح میں وہ لشکر جس کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شامل نہ ہوں سریہ کہلاتا ہے۔

قولہ "القِریٰ" بکسر القاف والف المقصورة، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ قری اور ضیافت دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں البتہ "ق، ر، ی" مادہ میں جمع کے معنی پائے جاتے ہیں جبکہ "ض، ی، ف" میں میلان کے معنی ہیں، "تقول قریتُ الماء فی الحوض اذاجمعت فیه متفرقة" گویا میزبان اپنے مہمان کی خاطر محبت، خدمت، ٹھکانہ اور کھانا جمع کرتا ہے، اسی طرح وہ مہمان کی جانب مائل بھی ہوتا ہے۔

قولہ "فلدغ" بصیغۂ مجہول، لدغ بچھو کے ڈنگ مارنے اور سانپ کے ڈسنے کو کہتے ہیں۔ قولہ "من یرقی" "رقا، یرقی، رقیاً، جھاڑ پھونک کو کہتے ہیں۔ قولہ "وماعلمتَ انهارقیة؟" اگلی روایت میں ہے "ومایدریك انها رقیة ؟ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں "بہ" مقدر ہے "ای ماعلمت به انهارقیة؟ قوله وفی الحدیث الثانی۔ قوله "جُعلاً" بالضم، اُجرت۔ قوله "قطعیاً" گلّہ، ریوڑ۔

تشریح:۔ واضح رہے کہ اس قسم کا ایک واقعہ نسائی [۲] میں بھی مروی ہے جس سے تعارض کا شبہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس میں ہے کہ وہ آدمی مجنون اور پاگل تھا جبکہ یہاں لدیغ کا ذکر ہے لیکن وہ الگ واقعہ ہے کہ یہاں راقی ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں اور اس میں حضرت علاقة بن صحار رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس لدیغ کو فاتحہ سے شفاء ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب ابن العربیؒ نے عارضہ میں دیا ہے کہ انہوں نے "ام الکتاب" کے نام اور جامعیتِ مضمون سے معلوم کیا تھا یعنی قرآن

---

[۲] كذا فی رواية ابی داؤد ص:۱۸۸ ج:۲ "باب كيف الرقی" كتاب الطب.

میں شفاء تو ہے اور فاتحہ ام الکتاب ہے، لہٰذا اس میں بھی شفاء کی خاصیت ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اجتہاد کی تردید نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ ان کا اجتہاد صحیح تھا اور یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں اجتہاد واستنباط فرماتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مسافر کے پاس کھانے پینے کا انتظام نہ ہو تو وہ اس کا مطالبہ کرسکتا ہے جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام نے انطاکیہ والوں سے کیا تھا، عارضہ میں ہے کہ رقیہ کی اقل مقدار تین بار پڑھنا ہے اور اکثر سات مرتبہ، ابوسعید خدریؓ نے اکثر پر عمل کیا "رغبةً فی تحصیل البر والاخذ بالاوثق"۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی حکم میں شک پڑ جائے تو یقین کے حصول تک توقف کرنا چاہئے اور یہ کہ تحصیل یقین میں کوشش تیز کرنی چاہئے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رقیہ پر اجرت لینا جائز ہے، اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں بحوالہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نقل کیا ہے کہ امر دنیاوی کی غرض سے ختم القرآن یا بخاری پر بھی عوض لینا جائز ہے جبکہ علامہ شامیؒ نے "شفاء العلیل" میں لکھا ہے کہ ایصال ثواب کے لئے تلاوۃ پر اجرت لینا حرام ہے، علامہ شامیؒ نے اس مسئلہ پر شرح عقود رسم المفتی میں بھی بحث کی ہے بلکہ اس مسئلہ کا ذکر ان امثلہ میں کیا ہے جو مصنفین حوالہ جات میں اصل کتاب کے مراجعت کے بغیر نقل کرتے ہیں جن کی تعداد علامہ شامی نے تلاش اور تتبع کے بعد (۲۰) بیس ذکر کی ہے، چنانچہ متعدد کتابوں میں تلاوۃ مجردہ یعنی بغیر تعلیم کی غرض سے تلاوت پر اجرت لینے کو جائز لکھا ہے حالانکہ یہ خطاء ہے۔ (دیکھئے شرح عقود رسم المفتی ص: ۶، ۷ یا شفاء العلیل وبل الغلیل فی بطلان الوصیة بالختمات والتھالیل)

البتہ تعلیم القرآن پر اُجرت لینا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تو جائز ہے ہی مگر متأخرین فقہائے حنفیہ نے بھی ضرورتاً جائز لکھا ہے گو اصل مذہب میں جائز نہیں ہے، یہ مسئلہ اجرت علی الطاعات کے اوپر مبنی ہے۔

جمہور کا استدلال باب کی حدیث سے ہے جو بطور قیاس تعلیم پر اجرت کو جائز مانتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ رقیہ امر مباح ہے جبکہ تعلیم فرض ہے گو کفایہ ہے، نیز رقیہ کا نفع دنیوی وجسمانی ہے جبکہ تعلیم کا نفع اخروی اور دینی ہے، تعلیم عبادت ہے جو حق اللہ ہے اس پر مخلوق سے اجرت لینے کا کیا مطلب؟

چونکہ مال محبوب ترین عندالاکثرین ہے اس لئے اجرت لینے میں اہل علم، لوگوں میں مبغوض شمار ہوتے

ہیں کہ محبوب کی طمع رکھنے والے سے تو حسد وعداوت یقینی چیز ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام آتے ہی اعلان فرماتے "لااسئلکم علیه اجراً" [۳] الایہ۔

بہر حال اب مسئلہ پر اتفاق ہو چکا ہے اس لئے فریقین کے دلائل ذکر کرنے میں کوئی معتد بہ فائدہ نہیں، نیز اس کی وضاحت کسی حد تک پہلے گذری ہے۔ (فلیراجع تشریحات ترمذی ج:اص: ۴۸۳، باب ماجاء فی کراهیة ان یأخذ المؤذن علی اذانه اجراً) تاہم وہاں حنابلہ کا مذہب مثل حنفیہ کے مذکور ہے جبکہ ان کا مذہب مثل الجمہور ہے۔ فلیتنبہ۔

اس حدیث سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ رقیہ سے تقدیر میں تبدیلی آجاتی ہے کیونکہ رقیہ، دعا اور دوا یہ سب تقدیر کا حصہ ہیں کہ اللہ عزوجل نے جو بھی بیماری مقدر فرمائی ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی متعین فرمایا کہ یہ شخص فلاں ذریعہ اختیار کرے گا تو ٹھیک ہو جائے گا جبکہ بعض کے بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ وہ باوجودیکہ اسباب اختیار کریں گے مگر ان کو فائدہ نہ ہوگا جیسا کہ اگلے باب میں آئے گا۔

باب ماجاء فی الرُّقیٰ والادویة

"عن ابی خِزامة عن ابیه قال: سألتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم قلت: یارسول الله اَرأیتَ رُقیً نسترقیها ودواءً نتداویٰ به وتُقاةً نتقیها هل تَرُدُّ من قدر الله شیئاً؟ قال "هی من قدر الله"۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابوخزامہ اپنے والد حضرت یعمر سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، میں نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ بتا دیجئے کہ جو جھاڑ پھونک ہم کرواتے ہیں اور دوا استعمال کرتے ہیں اور ہتھیار سے اپنا تحفظ کرتے ہیں کیا یہ اللہ کی قدر وقضا میں سے کسی چیز کو روک سکتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ (اسباب) بھی اللہ کی قدر وقضا میں سے ہیں۔

لغات: قوله "ابو خِزامة" بکسر الخاء وتخفیف الزاء۔ قوله "اَرأیتَ" ای اَخبِرنی۔ قوله "رُقیً" جمع رقیة۔ قوله "نسترقیها" سین وتا طلب کے لئے ہیں "ای نقرؤها لطلب الرقیة۔ قوله "دواءً" رقیٰ پر عطف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ قوله "نتداویٰ به" ای نستعمله۔ قوله "تُقاةً" بضم التاء وقی اور وقایہ سے ہے

---

[۳] سورة الانعام آیت: ۹۰۔

بمعنی سامانِ حفاظت جیسے ڈھال اور باقی ہتھیار وغیرہ۔ قولہ "تتقیھا" ای نحذر بسببھا یعنی ان سے اپنی حفاظت کرتے ہیں اور بطور احتیاط رکھتے ہیں۔ قولہ "ھی من قدر اللّٰہ" یعنی یہ تینوں اسباب بھی تقدیر میں سے ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث میں سوال کا مطلب تو واضح ہے کہ جب کوئی چیز تقدیر میں مقدر و مقرر ہو جیسے موت اور قتل وغیرہ تو پھر اس کے روکنے کی تدبیر سے کیا وہ فیصلہ تبدیل ہو جاتا ہے؟ اور جواب کا مطلب یہ ہے کہ نہیں ہرگز نہیں قضاء میں کسی طرح تبدیلی ممکن نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اسباب اور دفاع کا سامان بھی تقدیر ہی میں سے ہے کہ اللہ نے جس طرح کسی مرض وغیرہ کی تقدیر فرمائی ہے تو ساتھ ساتھ یہ بھی مقدر فرمایا ہے کہ فلاں کی بیماری فلاں ڈاکٹر کے علاج سے ٹھیک ہوگی یا فلاں کے جھاڑ پھونک سے شفاء نصیب ہوگی اور فلاں دشمن کا حملہ فلاں ہتھیار سے پسپا ہوگا، لہٰذا ان میں تعارض نہ سمجھا جائے۔

تاہم یہ اسباب بہرحال مؤثر نہیں ہیں کیونکہ بعض اسباب وذرائع کے بارے میں اگرچہ یہ مقدر ہوتا ہے کہ ان کے استعمال سے فائدہ ہوگا مگر بعض کے متعلق یہ بھی فیصلہ ہوتا ہے کہ ان سے کوئی فائدہ نہ ملے گا جبکہ بعض امراض وغیرہ کے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ یہ بغیر دوا ودعا کے ختم ہوں گے۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"وذالك لان اللّٰہ خلق الاشياء ورتبها وساقها في الوجود على تقدير معلوم ونظام متسق فمنه مايوجده ابتداءً ومنه مايوجده بعدغيره بحكمة هو اعلم بها لانذركها فقديكون شفاء من غير دواء وقديكون سقم بعددواء وقديكون شفاء بعد دواء وقديكون كفاية بغير تقية"۔

یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوا سے مرض مزید شدید ہو جائے جیسا کہ بعض مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، لہٰذا تقدیر میں یہ تمام صورتیں مندرج ہوتی ہیں، کسی بھی امر موجود کو تقدیر کے منافی قرار دینا درست نہیں۔

قولہ "وقدروی عن ابن عیینۃ" الخ یعنی اس حدیث کے بعض طرق میں "عن ابن ابی خزامۃ" آیا ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے ابواب القدر کے "باب ماجاء لاترد الرُّقی والدواء من قدر اللّٰہ شیئاً" میں اسی سند سے ذکر کیا ہے۔

مگر صحیح یہ ہے کہ یہ "عن ابی خزامۃ" ہی ہے جیسا کہ زیر بحث باب کی سند میں ہے۔ عارضہ میں ہے کہ حدیث کا معنی بالاجماع صحیح ہے۔

باب ماجاء فی الکمأۃ والعجوۃ

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :العجوۃ من الجنۃ وفیھاشفاء من السم والکمأۃُ من المن وماء ھاشفاء للعین"۔[1] (حدیث حسن غریب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عجوہ جنت (کے پھلوں) میں سے ہے اور اس میں زہر سے شفاء ہے اور کھنبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے۔ (حدیث حسن غریب ہے، تاہم باب کی اگلی حدیث پر حسن صحیح کا حکم لگایا ہے)

"عن ابی ھریرۃ ان ناساًمن اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قالوا:الکمأۃ جُدریّ الارض ، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :الکمأۃ من المن وماء ھاشفاء للعین والعجوۃ من الجنۃ وھی شفاء من السمّ"۔(حدیث حسن)

کھنبی (کھمبی) من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے۔

لغات: قولہ "الکمأۃ" بفتح الکاف وسکون المیم اس کے بعد ہمزہ مفتوحہ ہے، تاہم عام طور پر ہمزہ کے بجائے الف پڑھا جاتا ہے جیسا کہ حاشیہ پر ہے، اس کی جمع کمأٌ یا برعکس یا اَکموء آتی ہے، یہ ایک قسم کی نبات ہے جسے کُکُرمتا اور کھنبی کہتے ہیں، اس کی شکل ہو بہو چھتری کی مانند ہوتی ہے، محدب سطح انتہائی نرم وملائم ہوتی ہے جبکہ مقعر اوجھڑی کی طرح ہوتی ہے اس کو سانپ کی چھتری بھی کہا جاتا ہے، برسات میں بغیر بوئے نکلتی ہے، اس کو ساگ کے طور پر سالن بنا کر بھی کھایا جاتا ہے، راقم نے بھی کھائی ہے۔ قولہ "العجوۃ" بفتح العین وسکون الجیم، مدینہ منورہ کی وہ عمدہ کھجور جو سیاہی مائل ہوتی ہے، آج کل بہت مہنگی ملتی ہے، یہ لذیذ بھی ہے، اور امراض قلب، زہر اور سحر سے شفاء کے لئے بھی مفید ہے، مجمع البحار کے حوالے سے محشی نے نقل کیا ہے کہ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے لگایا ہے۔

قولہ "جُدَرِیُّ الارض" بضم الجیم وفتح الدال وکسر الراء وتشدید الیاء چیچک کو کہتے ہیں، یہ ایک وبائی بیماری تھی جو انتہائی مہلک تھی، بقول سائنس دانوں کے چیچک زدہ مریض کے ساتھ کمرے میں صرف پانچ

باب ماجاء فی الکمأۃ والعجوۃ

[1] ایضاً روی بمعناہ احمد فی مسندہ ص:۴۷۵ حدیث:۲۲۴۲۹، ص:۴۸۲ ج:۶ حدیث:۲۲۴۶۳، جمع الفوائد ص:۲۵۰ ج:۲، وفی روایۃ احمد والطبرانی فی الکبیر :الکمأۃ من السلوی الخ، مجمع الزوائد ص:۴۰.

سیکنڈ رہنے سے اس کا وائرس منتقل ہو جاتا ہے اور پھر مریض میں انتہائی سرعت سے پھیل جاتا ہے، اس سے کبھی کبھار اتنی اموات ہو جاتیں کہ پوری کی پوری بستی خاموش ہو جاتی۔ اقوام متحدہ نے اس بیماری کے وائرس کو ختم کرنے کے لئے شدید محنت کی اور بالآخر ۱۹۷۷ء تک اسے قابو میں لاکر صومالیہ کے آخری مریض پر بفضلہ تعالیٰ اس کا خاتمہ ہوا ہے، اب یہ وائرس محض تجربات کی غرض سے صرف تین لیبارٹریوں جارجیا، روس اور اٹلانٹا (امریکہ) میں محفوظ و محصور کیا گیا ہے۔ تاہم ۱۹۷۸ء میں حادثاتی طور پر لیبارٹری کے اندر اس کے وائرس کے بوتل سے باہر آنے سے ایک آدمی کی موت واقع ہوئی تھی۔

قولہ "المن" لفظ من کا اطلاق احسان وانعام پر بھی ہوتا ہے، یہ معنی اسمی ہیں۔ اور بمعنی پیمانہ کے بھی آتا ہے، یہ معنی ظرفی ہیں جس میں دو رطل آتے ہیں۔ اور تیسرے معنی ترنجبین کے آتے ہیں جو ایک میٹھا سفید گوند پاؤڈر ہوتا ہے جو کھایا جاتا ہے اللہ نے بطور غذا بنی اسرائیل پر نازل کیا تھا۔ یہاں یہی تیسرا معنی مراد ہے۔ یہ زیتون نما درخت میں بکثرت ہوتا ہے، ہم بچپن میں اس کو شوق سے کھاتے تھے۔

تشریح:۔ عجوہ کھجور کے جنتی ہونے کا مطلب کیا ہے؟ تو اس بارے میں محشی نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ ایک تشبیہ ہے جس سے مراد اس کی عمدگی بیان کرنا ہے۔ المسترشد عرض کرتا ہے کہ اس تفسیر کے مطابق کہا جائے گا کہ جس طرح عربوں میں یہ عرف قائم تھا کہ عمدہ اور نفیس چیز کی تشبیہ اس چیز سے دیتے جو "عبقر" جنات کے شہر سے درآمد کی گئی ہو اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ بہت نفیس ہے چنانچہ تفسیر ابی سعود میں آیت سورۂ رحمٰن "عبقری حسان" [۲] کے تحت لکھا ہے کہ: "تزعم العرب انه اسم بلد الجن فينسبون اليه كل شئ عجيب"۔ (كذا في تفسير روح المعاني وغیرہ) اس کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی کی اصطلاح قائم فرمائی ہے، اس بارے میں دوسری رائے یہ ہے کہ یہ حقیقی اطلاق ہے، اور محشی کوکب نے "جمع الفوائد" سے بحوالہ بزار و کبیر روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اترے تھے تو اپنے ہمراہ کچھ جنتی پھل لے آئے تھے پھر ان کی گٹھلیوں سے موجودہ عجوہ وغیرہ معرض وجود میں آئی ہے، تاہم دنیا میں آنے کے بعد جنت کے اثرات دنیاوی ماحول کی وجہ سے کم یا ختم ہو گئے ہیں، دنیا کا ماحول بعض اشیاء پر زیادہ اثر انداز ہوا ہے جبکہ بعض دیگر پر کم۔ عجوہ کافی حد تک محفوظ ہے۔ واللہ اعلم

عجوہ میں زہر اور سحر سے شفاء بعض کے نزدیک اس کی خاصیت وتاثیر ہے مگر بذل المجہود میں ہے کہ امام

[۲] سورۃ رحمن آیت: ۷۶۔

خطابیؒ نے اس کی ذاتی خاصیت کی نفی کر کے فرمایا ہے کہ یہ اثر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت ہے، علاوہ ازیں عجوہ دل کی بیماری کے لئے بھی مفید ہے، چنانچہ ابوداؤد[۳] میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ میں بیمار ہو گیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کی غرض سے تشریف لائے پھر اپنا دستِ مبارک میری دونوں چھاتیوں کے درمیان (یعنی دل پر) رکھا یہاں تک کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے دل میں محسوس کی، پھر فرمایا "انك رجل مفؤد" یعنی تجھے دل کی بیماری ہے۔ جاؤ حارث بن کلدہ کے پاس وہ طب کا کام کرنے والا آدمی ہے، تو وہ عجوہ کی سات کھجوریں مدینہ کی لے کر گٹھلیوں سمیت کوٹ لے اور تمہیں کھلا دے۔ نیز سحر اور زہر کے لئے بھی سات کھائے۔ (جیسا کہ ابوداؤد میں ہے، باب فی تمرۃ العجوۃ من کتاب الطب)

فائدہ:۔ بذل المجہود میں ہے کہ حافظؒ نے "الاصابہ" اور ابن ابی حاتمؒ دونوں نے فرمایا ہے کہ حارث بن کلدہ (طبیب) کا مسلمان ہونا صحیح روایت سے ثابت نہیں، لہٰذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل ذمہ میں سے ڈاکٹر وطبیب سے علاج کروانا درست ہے۔ نیز اس حدیث میں طبیب کو کیفیت بھی بتلادی۔

قولہ "والكمأة من المن" جیسا کہ باب کی تیسری حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، میں یہ تأثر بیان ہوا جو عربوں کا زعم تھا کہ کھنبی زمین کا چیچک ہے یعنی فاسد مادہ سے پیدا ہوتی ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زعم کو رد فرمایا اور کھنبی کی مدح فرمائی، اور جدید تحقیق سے بھی یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ چیچک خراب خون یا مادہ کی وجہ سے نہیں نکلتا بلکہ ایک وائرس کے حملے سے ہوتا ہے۔ اور اگر عربوں کی اس اصطلاح کا مقصد محض تشبیہ ہو کہ جس طرح چیچک جسم کے ظاہری حصے پر ہوتے ہیں اسی طرح کھنبی دانوں کی شکل میں روئے زمین پر نکلتی ہے تو پھر حدیث میں اس تشبیہ کی نفی مراد ہوگی، کیونکہ اچھی چیزوں کے لئے بُری مثال بیان نہیں کرنی چاہئے۔ باقی رہی یہ بات کہ اس کا استعمال کس طرح ہے تو اس کے لئے مابعد والی حدیث میں کہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تین یا پانچ یا سات کھنبیاں لیں اور ان کو نچوڑا اور ان کا پانی ایک بوتل (شیشی) میں ڈالا پھر اس سے اپنی باندی کو بطور سرمہ لگاتا رہا یعنی ڈالتا رہا تو وہ ٹھیک ہوگئی۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ کھنبی کے پانی کی شفاء میں اس اعتبار سے اختلاف ہے کہ اسے کیسے استعمال کیا جائے؟ تو حضرت ابوہریرہؓ اس کے خالص پانی کے استعمال کے قائل تھے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اسے سرمہ میں ملا کر لگایا جائے۔ جبکہ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں طریقے ٹھیک ہیں، کبھی ایک طریقے سے فائدہ ہوتا

---

[۳] سنن ابی داؤد ص:۱۸۵ ج:۲ کتاب الطب، ایضاً رواه البخاری ومسلم كذا فی جمع الفوائد ص:۲۵۰ ج:۲.

ہے، اور کبھی دوسرے سے، دونوں کا تجربہ کیا گیا ہے اور دونوں کے مثبت نتیجے نکلے ہیں۔

حضرت تھانوی صاحبؒ نے "المسک الذکی" میں اگلے سے پیوستہ "باب ماجاء فی تبرید الحمی بالماء"، میں فرمایا ہے: "پختگی عقیدے سے حق تعالیٰ شفاء دے ہی دیتے ہیں، عقیدے کا، انجاحِ حوائج میں بڑا دخل ہے"۔

باب کی آخری حدیث:۔ "عن قتادة قال حُدِّثْتُ ان اباھریرة قال: الشونیز دواء من کل داء اِلاالسام قال قتادة یأخذ کل یوم احدی وعشرین حَبَّةً فیجعلھن فی خرقة فینقعه فیستعط به کل یوم فی منخره الایمن قطرتین وفی الایسر قطرة، والثانی فی الایسر قطرتین وفی الایمن قطرة، والثالث فی الایمن قطرتین وفی الایسر قطرة"۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ شونیز (کلونجی) ہر مرض کی دوا ہے سوائے موت کے۔ قتادہ فرماتے ہیں کہ روزانہ اکیس دانے لے کر کپڑے میں لپیٹ دے اور پانی میں بھگودے پھر اس (کے پانی) سے ناک کے دائیں نتھنے میں دو قطرے اور بائیں میں ایک قطرہ ڈالے، اور دوسرے دن بائیں میں دو قطرے اور دائیں میں ایک قطرہ ٹپکا دے، اور تیسرے دن دائیں میں دو قطرے اور بائیں میں ایک قطرہ ڈالے۔

یہ روایت ابو نعیم نے طب میں مرفوعاً نقل کی ہے، اس بارے میں پیچھے مستقل باب "الحبة السوداء" کے عنوان سے گذرا ہے۔ فلیراجع۔

لغات:۔ قولہ "الشونیز" بضم الشین وسکون الواؤ وکسر النون کلونجی کو کہتے ہیں، اور اسے حبۃ السوداء بھی کہتے ہیں۔ قولہ "السام" بروزن عام موت کو کہتے ہیں، وقد مر۔ قولہ "فینقعه" بفتح الیاء مُنقع پانی میں بھگوئی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، پس مطلب یہ ہوا کہ پھر ان کو پانی میں اچھی طرح بھگوئے۔ قولہ "فیستعط" سعوط سے ہے، ناک میں ڈالنے والی دوا، وقد مر۔ قولہ "مِنخر" اس میں میم پر تینوں حرکات جائز ہیں مگر کسرہ مشہور ہے۔ کلونجی کے بہت سے فوائد مطولات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

باب ماجاء فی اجر الکاھن

"عن ابی مسعود قال نهی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: عن ثمن الکلب ومهر البغی وحُلوان الکاهن"۔[1] (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت، زانیہ کے مہر (یعنی اجرت) اور کاہن کی شیرینی (یعنی اجرت) سے منع فرمایا ہے۔

لغات: ۔قولہ "مهر البغی" بغی بروزن قوی، فاحشہ اور زنا کار عورت کو کہتے ہیں، یہاں مہر سے مراد اجرت ہے۔قولہ "حُلوان" بروزن غُفران، میٹھی چیز کو کہتے ہیں، اس سے مراد اجرت ہے، چونکہ یہ بغیر تعب ومشقت کے ملتی ہے اس لئے اس کو شیرینی سے تعبیر کیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بلاعوض مفت میں ملتی ہے۔ قولہ "الکاھن" جو آدمی غیب کی خبر دینے کا دعوی کرتا ہے یا تأثر دیتا ہو جیسے آج کل کے اکثر عامل کرتے ہیں۔

تشریح: ۔اس حدیث سے ان تینوں اجرتوں کی ممانعت معلوم ہوگئی البتہ ثمن الکلب ہمارے نزدیک مقید ومشروط بشرط ہے جبکہ باقی دونوں کی تحریم پر اجماع ہے، یہ تینوں مسائل تشریحات ترمذی میں اپنے اپنے متعلقہ ابواب میں گذری ہے۔(ثمن الکلب کے لئے دیکھئے تشریحات ج:۵، باب ماجاء فی ثمن الکلب ص:۲۰۶، مهر البغی کے لئے دیکھئے ج:۴، باب ماجاء فی کراھیۃ مهر البغی ص:۵۰۵، اور حلوان الکاھن کے لئے دیکھئے مذکورہ باب کے علاوہ، باب ماجاء فی کراھیۃ اتیان الحائض ج:۱ص:۳۶۲)

اس باب میں کاھن کی تین قسمیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں:

(۱) جو دعوی کرے کہ مجھے جنات اخبار غیب بتلاتے ہیں۔

(۲) جو مقدمات سے نتائج اخذ کرنے کا دعوی کرے چاہے سائل کی باتوں، کپڑوں، ناخن وغیرہ سے کرے یا کسی اور ذریعہ سے۔

(۳) جو نجوم کی حرکات سے معلوم کرنے کا دعوی کرے جس کو عرف میں نجومی کہتے ہیں۔حضرت تھانوی صاحبؒ نے عرّافہ کو بھی کہانت کی ایک قسم کہا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

باب ماجاء فی احد الکاهن

[1] الحدیث اخرجه البخاری ص:۲۹۸ ج:۱ "باب ثمن الکلب" کتاب البیوع، ابوداؤد کتاب البیوع باب:۶۳، جامع الترمذی باب:۴۶ کتاب البیوع.

''یہ عمل عرافہ ہے جو کہانت کی ایک قسم ہے اور محض حرام ہے نیز فی نفسہ حرمت کے ساتھ عوام کے فتنہ میں پڑنے اور گمراہی کا موجب بھی ہے اور دل میں آجانا القاء شیطانی ہے، یہ جواب انہوں نے ایک فتوی میں دیا ہے، سائل کہتا ہے کہ دو خصمین کے نام اور عمر اگر مجھے معلوم ہو جائے تو میں جان لیتا ہوں کہ کون غالب ہوگا۔ (تحفۃ العلماء ص ۵۳۰، ناشر البرکۃ)

اسی طرح علم رمل کے متعلق لکھتے ہیں:

''کہ متعارف رمل کی تعلیم وتعلم حرام ہے''۔ (ایضاً ص: ۵۳۲)

جبکہ مسمریزم اور علم الارواح والحاضرات کو قوت خیالیہ کا تصرف قرار دیا۔

آج کل کے اکثر عامل بھی اسی قوت فکریہ کے زور پر بعض لوگوں کے نفوس میں تصرف کرتے ہیں، واضح رہے کہ جس آدمی پر دوسرے کا تصرف چل سکتا ہے تو وہ اس کی عقل کی کمی کی نشانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر عاملوں کا شکار عورتیں ہوتی ہیں۔

بہر حال علم غیب اللہ کا خاصہ ہے تاہم جو خاصہ ہے وہ حقیقی علم غیب ہے اس تک کسی بھی مخلوق کی رسائی ممکن نہیں اس کا دعوی کرنے والا کافر ہے خواہ اپنے لئے اثبات کا دعویٰ کرے یا کسی مقرب فرشتے یا بشر کے لئے جبکہ اس کی دوسری قسم مجازی اور اضافی علم غیب کہلاتا ہے اس کا دعوی حرام ہے اور کاہن اسی زمرے میں آتا ہے۔

حضرت تھانوی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: غیب کے دو معنی ہیں: حقیقی اور اضافی۔ حقیقی: وہ ہے جس کے علم کا کوئی ذریعہ نہ ہو، یہ خاص ہے حق تعالیٰ کے ساتھ بندہ کے لئے اس کا حصول محال عقلی وشرعی ہے۔ غیب اضافی: وہ ہے جو کسی ذریعہ سے بعض کو معلوم کرا دیا جائے، کسی (عمل) سحر یا کسی جن کے واسطے سے یا کسی نجومی یا کسی پنڈت کے واسطے سے کسی خبر کا یقین کر لینا خصوصاً جب کہ اس خبر سے کسی بَرِی شخص کو متہم کر دیا جائے ایسا شدید حرام ہے کہ کفر کے قریب ہے۔ جب ان ذرائع کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں اور جو ذرائع شریعت کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے، ان پر حکم لگانا کس درجہ سخت گناہ ہوگا جیسے حاضرات کرنا، چور کا نام نکالنے کے لئے لوٹا گھمانا، یا آج کل جو عمل مسمریزم شائع ہوا ہے یہ تو بالکل مہمل اور خرافات ہیں جن میں اکثر جگہ تو عامل کا دھوکہ ہی ہوتا ہے، اور بعض عامل تو دھوکہ باز نہیں ہوتا مگر وہ خود دھوکہ میں ہوتا ہے، اس کو ان اعمال کی حقیقت معلوم نہیں، اول تو چور کا نام نکلنا اس عمل سے اس کا کچھ تعلق نہیں، یہ عامل کے یا کسی صاحب مجلس کے خیال کا تصرف ہے، اس کا سمجھنا مسمریزم کے جاننے پر موقوف ہے، اور حاضرات وغیرہ جو عامل لوگ کرتے ہیں، وہ اگر سب

نہیں تو اکثر اسی قبیل سے ہیں۔

پھر یہ جو نام نکلتا ہے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں اکثر ایسا ہوتا ہے جب چاہے آزمالیا جائے کہ ایک عامل کے عمل سے ایک شخص کا نام نکل آیا دوسرے کے عمل سے دوسرے شخص کا (بشرطیکہ دوسرے عامل کو اس نامزد چور کا علم نہ ہو) خوب سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سب تصرفات قوت خیالیہ کے ہیں، تو جیسے کوئی شخص کسی واقعہ میں فکر وخیال کو صرف کر کے کوئی رائے قائم کرے، بس اس سے زیادہ ان اعمال کی کوئی حقیقت نہیں اور اس سے دھوکہ نہ ہو کہ بعض اعمال میں آیات قرآنیہ پڑھی جاتی ہیں، بات یہ ہے کہ ان آیات کی تلاوت قوت خیالیہ کے یکسو کرنے کا محض حیلہ ہے ورنہ اصل فعل قوت خیالیہ کا ہے گو آیات نہ پڑھی جائیں جب بھی وہ تصرفات ظاہر ہوتے ہیں، اور اگر صرف آیات پڑھی جائیں اور خیال کو دوسری طرف متصرف کر دیا جائے تو ہرگز یہ تصرفات ظاہر نہ ہوں، اور اس سے دھوکہ نہ ہو کہ فلاں دفعہ (عمل) اس کے مطابق نکلا، یوں تو آدمی کچھ بھی نہ کرے یوں ہی بکنا شروع کردے کوئی نہ کوئی بات ٹھیک ہو ہی جاتی ہے، اسی طرح ان خرافات میں اگر ایک دفعہ کوئی بات سچ نکلتی ہے تو سو دفعہ جھوٹ نکلتی ہے الخ۔ (ایضاً ص ۵۳۳)

اگر طول کا خوف مانع تفصیل نہ بنتا تو اس کی کلیات اور جزئیات اور واقعات کو بسط کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا۔

تنبیہ:۔ (۱) امور غیبیہ دو طرح کے ہیں: ایک کا تعلق احکام سے ہے اور دوسرے کا اکوان سے، علم احکام کلی طور پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطاء ہوا ہے جبکہ امور تکوینیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فخیم حصہ ملا ہے، تاہم علم غیب تکوینی کلی طور پر یا کہنا چاہیے کہ اس کے اصول اور کلیات کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاصہ ہے، جزئیات منتشرہ پر بہت سے لوگوں کو حسب استعداد اطلاع دی گئی ہے، لیکن یہ تمام جزئیات اللہ کے علم کے مقابلے میں قطرہ بمقابلہٗ سات سمندر سے بھی کم ہیں چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام جس کشتی پر سوار ہوئے تو ایک چڑیا نے آکر اپنی چونچ سمندر میں ڈبو کر نکالی جس پر حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: ''یاموسیٰ مانقص علمی وعلمك من علم اللّٰہ تعالیٰ الا کنقرۃ ھذہ العصفور فی البحر''۔ (بخاری جلد اول ص:۲۳، کتاب العلم)

قابل غور ہے کہ ان دو انبیاء علیہم السلام کے پاس انتہائی وسیع علم تھا مگر پھر بھی انہوں نے یہ تشبیہ تقریب الی الفہم کے لئے دی ہے ورنہ اللہ کا علم تو لامتناہی ہے جبکہ سمندر متناہی ہے لہٰذا یہ نظیر ہے مثال نہیں ہے۔

ہر ہر ذرّے اور پتے کا علم صرف اللہ کو ہے، البتہ انبیاء علیہم السلام کو جتنا حصہ ملا ہے اس میں شک کی کوئی

گنجائش نہیں کیونکہ ان کے پاس علم بذریعہ وحی آتا ہے اور وحی ذرائع معرفت اور اسباب علم میں سب سے زیادہ مضبوط اور سو فیصد یقینی سبب ہے جبکہ کاہنوں اور نجومیوں کا دعوی محض خیال یا فراڈ اور دھوکہ پر مبنی ہوتا ہے، اس کے پاس کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہوتا پس جو چیز اندازوں اور اٹکلوں پر مبنی ہو اس کا دعوی کرنا یا اثبات کرنا غیر حقیقی غیر شرعی اور غیر عقلی ہی کہلانے کا مستحق ہے، یہ کوئی علم نہیں بلکہ تخمین اور دھوکہ دہی ہے۔ لہٰذا اس پر اجرت لینا بلا عوض لینے کی وجہ سے حرام ہے اگرچہ کوئی خوشی سے دے کیونکہ دھوکہ اسی کو تو کہتے ہیں کہ کسی کو ایسا چکر دے جس سے اس کے اوسان خطا ہو جائیں۔

تنبیہ ۲:۔ آلات کے ذریعہ جو چیز معلوم کی جاتی ہے جیسے الٹرا ساؤن میں مرض یا رحم کے احوال معلوم کرنا، ہوا میں نمی کا تناسب معلوم کرنا، یا نبض سے بیماری یا دیگر آلات سے دل کی حرکات وغیرہ معلوم کرنا یہ علم غیب کے زمرے میں نہیں آتے، لہٰذا ان آلات کے ذریعہ کسی چیز کو معلوم کرنے کا دعوی علم غیب کے دعوی میں نہیں آتا کیونکہ یہ آلات انسانی دماغ اور عقل کے نتائج ہیں، لہٰذا ان کا حکم وہی ہے جو انسانی اعضاء کا ہے کہ فرع تابع اصل ہوتی ہے تو جس طرح کسی شے کا علم آنکھوں سے حاصل ہونا علم غیب نہیں تو اسی طرح عینک دوربین اور ایکسرے وغیرہ سے حاصل کردہ علم بھی علم غیب نہیں۔

سوال:۔ سورۂ لقمٰن (آیت نمبر ۳۴) میں ہے "ان اللّٰہ عندہ علم الساعۃ ، وینزل الغیث ، ویعلم مافی الارحام"۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رحم کے اندر کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

جواب:۔ اس میں لفظ "ما" عام ہے اس سے فقط لڑکے یا لڑکی "مَن" ہونے کا علم نہیں بلکہ نُطفے کی ابتدائی احوال سے لے کر بچے کی ولادت تک تمام حالیہ حالات، اور مستقبل کے احوال حسین وجمیل ہونا، فصیح وبلیغ ہونا اور باقی تمام انسانی کردار کی استعدادات کا علم حتی کہ اس کے علوم اور موت وحیات کی صلاحیت نطفے کے اندر معلوم ہونا سب مراد ہیں جبکہ انسانی ساخت کے آلات یہ جاننے سے قاصر ہیں اگر فی الجملہ کچھ ظاہری شکل نظر آجائے یا نطفے کے جین کی کچھ صلاحیتیں معلوم ہو جائیں تو اس سے تمام تکوینی امور کا علم کہاں لازم آتا ہے۔ آگے چل کر بھی ایسا ممکن نہیں کہ نطفے کو کسی کسوٹی پر پرکھا جائے اور اس کی تمام صلاحیتیں بالفعل فوراً معلوم کی جا سکیں۔

اگر بالفرض کوئی آلہ ایسا بنالیا جائے کہ جس سے انسانی ہمہ خوبیاں وخامیاں معلوم کرنے کا کام لیا جاسکے تو پھر بھی کوئی اشکال وارد نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آیت کریمہ میں علم کی بات کی گئی جو یقین کا درجہ ہے جبکہ

آلات کے ذریعہ یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ جزوی یقین یا ظن ،اور ظن غالب ہوتا ہے، ایسا بسا اوقات ہوتا ہے کہ ایک لیبارٹری کی رپورٹ ایک طرح آتی ہے اور دوسری کی دوسری طرح ۔راقم نے خود جگر کے دو اعلیٰ لیبارٹریوں سے ٹیسٹ کروائے تو ایک نے رپوٹ دی کہ جگر میں ورم ہے جبکہ دوسری نے کہا کہ صحیح ہے ،ڈاکٹر نے کہا کہ یہ دونوں اچھی لیبارٹریاں ہیں اب ممکن ہے کہ کسی تیسری سے رجوع کیا جائے۔ایسے واقعات بے شمار رونما ہوتے ہیں۔اور یہ اگر شک نہیں تو زیادہ سے زیادہ ظن ہے جبکہ علم کی تعریف شرح العقائد میں یوں کی گئی ہے:هو صفة يتحلى بها المذكور لمن قامت هي به''۔دوسری تعریف ہے:صفة توجب تمیزاً لایحتمل النقیض ''۔اور پہلی تعریف کو دوسری کی طرف راجع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:ولکن ینبغی ان یحمل التحلی علی الانکشاف التام الذی لایشمل الظن لان العلم عندهم مقابل للظن ''۔(شرح العقائد ص:۱۰) کون کہہ سکتا ہے کہ لیبارٹری رپوٹ میں نقیض کا احتمال نہیں ہے۔

باب ماجاء فی کراهية التعليق

”عن عيسى وهو ابن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ قال دخلتُ علی عبدالله بن عُکیم ابی معبد الجُهنی اعوده وبه حُمرة فقلتُ اَلا تُعَلِّقُ شیئاً؟قال:الموت اقرب من ذالك ،قال النبی صلی الله علیه وسلم :من تعلق شیئاً وُکِلَ الیه“۔[1]

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کے صاحبزادے عیسیٰ سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن عکیمؓ کے پاس گیا تا کہ ان کی عیادت کروں جبکہ ان کے جسم پر سُرخ دانے (یا ورم کے اثرات) ظاہر ہو گئے تھے تو میں نے ان سے عرض کیا،آپ کوئی چیز (تعویذ) آویزاں نہیں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا موت اس سے قریب تر ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی تعویذ (وغیرہ) کو لٹکائے تو وہ اسی کے سپرد کیا جاتا ہے۔

لغات:۔قوله”اعوده“عیادت بیمار پرسی کو کہتے ہیں۔قوله”حُمرة“ایک قسم کے سرخ دانے ہیں جو چہرے اور بدن پر نکلتے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ یہ طاعون کی طرح جلد میں پھوڑے کی مانند ورم ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی کراهية التعليق

[1] رواه ایضاً النسائی ص:۱۷۱ ج:۲ کتاب المحاربه، ایضاً مسنداحمد ص:۳۰۴ ج:۵ حدیث:۱۸۳۰۴، جمع الفوائد ص:۲۵۳ ج:۲۔

قولہ "الاتعلق شیئاً" تعلیق کے معنی لٹکانے کے ہیں یعنی آپ گلے میں تعویذ وغیرہ نہیں باندھتے ہیں؟۔

قولہ "وکل الیہ" بصیغۂ مجہول، بضم الواو وتخفیف الکاف المکسورۃ یعنی وہ اپنے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اللہ کی غیبی مدد اس سے اُٹھ جاتی ہے یا مطلب یہ ہے کہ اس سے اعلیٰ توکل کی نعمت مرتفع ہو جاتی ہے۔

تشریح:۔ یہ روایت محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اپنے بھائی عیسیٰ سے نقل کرتے ہیں، عبداللہ بن عکیم (بالتصغیر) مخضرمین میں سے ہیں یعنی انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے مگر ملاقات نہیں ہوئی ہے، [۲] عارضۃ الاحوذی اور تحفۃ الاحوذی دونوں کے متن پر یہاں یہ اضافہ موجود ہے:

"وعبداللّٰہ بن عُکیم لم یسمع من النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وکان فی زمن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول کتب الینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم"۔

ہوسکتا ہے کہ ہمارے پاس موجود ترمذی کے نُسخ سے یہ عبارت ساقط ہوئی ہو۔

اس روایت کے مطابق تعویذ باندھنا ناپسندیدہ عمل ہے اور یہی بعض صحابہ کرامؓ وعلماء کا مذہب ہے جیسے ابن مسعود، ابن عباس، حذیفہ، اور عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ، ان حضرات کا استدلال حدیث الباب کے علاوہ ابوداؤد وغیرہ کی حدیث سے بھی ہے جو عبداللہ بن مسعودؓ سے مرفوعاً مروی ہے: "ان الرُّقیٰ والتمائم والتولۃ شرک"۔ (ابوداؤد باب فی تعلیق التمائم من کتاب الطب، ص:۵۴۲، میر محمد کتب خانہ [۳])

اس کے برعکس صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت اور دیگر بعض اہل علم اس کے جواز کے قائل ہیں بشرطیکہ وہ تعویذ آیات قرآنیہ یا اسماء الحسنیٰ وغیرہ پاکیزہ کلمات پر مشتمل ہو، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت عائشہؓ کا مذہب اسی کے مطابق ہے، ان حضرات کے نزدیک جیسا حکم گویا پڑھنے کا ہے اسی طرح تعویذ کا ہے، جھاڑ پھونک کا مسئلہ پہلے گذرا ہے، تاہم تعویذ نہ باندھنا افضل ہے۔

ان کا استدلال ابوداؤد باب کیف الرُّقیٰ من کتاب الطب میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت سے ہے:

"ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: کان یعلمھم من الفزع کلماتٍ "اعوذ

---

[۲] وقال الحافظ فی تقریب التھذیب، عبداللّٰہ بن عکیم: بالتصغیر الجھنی، ابومعبد الکوفی مخضرم من الثانیۃ، وقد سمع کتاب النبی ﷺ الی جھینۃ، مات فی امرۃ الحجاج ص:۵۱۵ ج:۲۔ قدیمی کتب خانہ کراچی

[۳] ایضاً رواہ ابن ماجہ ص:۲۵۲ "باب تعلیق التمائم" ابواب الطب، مسنداحمد ص:۹ ۶۲ ج:۱ حدیث:۳۶۰۴۔

بکلمات اللّٰہ التامة من غضبه ومن شرعباده ومن همزات الشیٰطین وان یحضرون" وکان عبداللّٰہ بن عمرو یعلمهن من یعقل من بنیه ومن لم یعقل کتبه فاعلقه علیه"۔

اس پر صاحب بذل المجہود لکھتے ہیں: "فیه دلیل علی جواز کتابة التعاویذ والرّقیٰ وتعالیقها"۔ (بذل ص:۱۰ ج:۶، کتاب الطب)

جبکہ حضرت شاہ صاحبؒ عرف میں اسی باب کے تحت فرماتے ہیں: "یجوز التعلیق باعوذ بکلمات اللّٰہ التامة الخ... ولعل تعلیق ماھو مجرب بالطب جائز"۔

عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند پر بحث پہلے تفصیلاً گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج:۲ ص:۱۵۰، باب ماجاء فی کراھیۃ البیع والشراء وانشاد الضالۃ فی المسجد) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سند درجہ حسن تک پہنچتی ہے، لہٰذا یہ قابل حجت ہے، دوسری بات یہ ہے کہ تعویذ ڈالنے سے ایک گونہ تسلی ہوجاتی ہے، جو علاج کا ایک مستقل مفید طریقہ ہے، کیونکہ بہت ساری بیماریوں کا زور نفسیاتی طور سے بھی ٹوٹ جاتا ہے، چنانچہ ابن قیمؒ زاد المعاد کے حصہ طب میں لکھتے ہیں: "کہ مسلّمات میں سے ہے کہ جب روح میں قوت آجاتی ہے تو نفس اور طبیعت دونوں قوی ہوجاتے ہیں اور بیماری دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ (دیکھئے طب نبوی فصل:۳ طریقۂ علاج ص:۲۹)

جواب:۔ جن حضرات نے تعویذ کو ناجائز کہا ہے ان کی مستدل روایات کا جواب یہ ہے کہ ان میں مشرکانہ الفاظ یا مشتبہ کلمات والے تعویذات کی نہی مراد ہے، یا یہ کہ اگر ان کے مؤثر حقیقی ہونے کا عقیدہ ہو تو یہ عملِ شرک ہے یا شرک کی طرف لے جاتے ہیں، چنانچہ صاحب بذل المجہود لکھتے ہیں: "قوله: شرك ای من افعال المشرکین اولانه یفضی الی الشرك اذااعتقدان له تاثیراً حقیقةً"۔ (بذل ص:۷ ج:۶)۔

ترمذی کی حدیث کا جواب حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں یہ دیا ہے کہ یہ عمل توکل کے اعلیٰ درجات یا توکل مطلق کے منافی ہے، یہ مطلب نہیں کہ اس میں گناہ ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ ابوداؤد کی مندرجہ بالا روایت سے کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ پڑھنے پر قادر ہوں وہ بجائے تعویذ کے ان کلمات کو حفظ کرکے پڑھ لیا کریں جبکہ چھوٹے بچوں کے لئے اس کے باندھنے میں کوئی حرج نہیں، نیز بچوں کا ذہن تعویذ کی تاثیر کی طرف نہیں جاتا ہے جبکہ بڑوں کے ذہن کا جلدی

بگڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے، نیز اس عمل کو فروغ دینا اور پیشہ بنانا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ آدمی اس عمل سے پردے میں رہنے کی کوشش کرے، اگر کوئی زیادہ اصرار کرے تو اسے یہ کہہ کر دیا جائے کہ درحقیقت شفاء دینے والا صرف اللہ ہے، اللہ نے اپنے کلام پاک کو شفاء کا ذریعہ بنایا ہے لہٰذا اسباب کے درجے میں اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں تو جیسے اس درجہ میں دوا جائز ہے تو تعویذ بھی جائز ہے۔

تنبیہ:۔ آج کل کے غیر مقلدین اور عربوں میں سے حنابلہ حضرات اس کو شرک کہتے ہیں حالانکہ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت تعویذ کے جواز کی ہے۔ دیکھئے تحفۃ الاحوذی:

اختلف العلماء... فی جواز تعلیق التمائم التی من القرآن و اسماء اللّٰہ تعالیٰ وصفاته فقالت طائفة یجوز ذالك وھو قول ابن عمرو بن العاص وھو ظاھر ماروی عن عائشة وبه قال ابو جعفر الباقر واحمد فی روایة" الخ۔

غیر مقلدین کی مستدل حدیث کا جواب اوپر گذر چکا ہے۔ فلیتذکر

باب ماجاء فی تبرید الحُمّٰی بالماء

"عن عبایة بن رفاعة عن جده رافع بن خدیج عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: الحُمّٰی فور من النار فابردوھا بالماء"۔ [1]

"وعن عائشة ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: ان الحُمّٰی من فیح جھنم فابردوھا بالماء"۔ (وکلا الحدیثین صحیح)

عبایہ بن رفاعہ اپنے دادا حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بخار (جہنم کی) آگ کا (اثر) جوش ہے، پس اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ بخار دوزخ کی تپش ہے پس اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔

باب ماجاء فی تبرید الحمی بالماء

[1] روی بمعناہ بخاری ص: ۴۶۲ ج: ۱ کتاب بدء الخلق، رواہ مسلم فی کتاب السلام، سنن ابن ماجه فی ابواب الطب باب: ۱۸، دارمی فی الرقاق باب: ۵۵، مؤطا مالک عین باب: ۱۵، ۱۶، مسند احمد ص: ۸۰ ج: ۱ حدیث: ۲۶۴۴.

[2] الحدیث اخرجه ایضاً ابن ماجه ص: ۲۵۱ ابواب الطب.

لغات:۔قولہ "الحمیٰ" بضم الحاء وتشدید المیم والف المقصورہ، حاء اور میم کے مادہ میں حرارت کا معنی پایا جاتا ہے، یہاں مراد بخار ہے کیونکہ اس سے بھی درجہ حرارت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔قولہ "فور وفیح" دونوں میں فائین مفتوح اور عین کلمتین ساکن ہیں، اور دونوں کے معنی ایک ہیں یعنی حرارت کی شدت اور جوش۔

تشریح:۔ بخار کو آگ یا دوزخ کی آگ کا اثر اور بھڑاس قرار دینے کا مطلب اس کی شدتِ حرارت بیان کرنا ہے جو تشبیہ کی ایک قسم ہے جیسے محاورہ میں کسی تنگ جگہ کو قبر اور محبوس جگہ کو جیل کہا جاتا ہے۔

اس موقع پر زمانۂ قدیم کے اطباء نے حدیث شریف پر اعتراض کیا تھا کہ غسل کرنے سے اور بخار والے مریض پر پانی ڈالنے سے تو بخار اور بھی بڑھ جاتا ہے پھر یہ کیسی صحیح ہو سکتی ہے؟؟؟ اس کے جواب میں علماء کرام اور شارحین عظام نے مختلف اور متعدد توجیہات کی ہیں مثلاً یہ زم زم کے پانی کے بارے میں ہے، یا حجاز کے بخار کے متعلق ہے جیسے ''شرقوا اوغربوا'' الحدیث سب کے لئے نہیں یا گرمی سے لگنے والے بخار کے بارے میں ہے وغیرہ وغیرہ جن کا نقل کرنا تطویل بلا طائل ہے۔

بخار کے لئے غسل، جدید تحقیق کی روشنی میں:۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ آج کل سائنسی دور ہے اور نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں، ان تحقیقات سے ایک طرف قدیم نام نہاد حکماء کے بہت سارے نظریات غلط ثابت ہوئے تو دوسری جانب پیغمبر اسلام کے ارشادات کی تائید در تائید ہوئی، اگر ایسے مسائل کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد بن جائے گی۔ راقم کا اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ ہے اللہ قبول فرما کر اس کی توفیق عطاء فرمائیں۔

من جملہ ان امور میں سے موضوع بحث مسئلہ ہے، اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک سائنسی ضابطے کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ حرارت سے شئی پھیل جاتی ہے اور ٹھنڈک سے سکڑ جاتی ہے، اس کی بے شمار فرعیات ہیں مثلاً اگر سائیکل کی ٹائر میں ہوا بالکل پوری ہو مگر جب وہ گرم سڑک پر چلتی ہے تو وہ ہوا پھیل جانے سے ٹائر پھٹ جانے کا سبب بنتی ہے جبکہ گرم پانی برف خانہ میں منجمد ہو کر برف بن جاتا ہے، پس جب کسی چیز کے اندر حرارت جمع ہو جائے اور اس کے مسامات کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ حرارت باہر نکل جاتی ہے اس کے برعکس جب مسامات بند رہیں تو وہ حرارت باہر نہیں نکل سکتی پھر وہ اپنا ردعمل کسی نہ کسی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔

اگر تھوڑا تدبر کیا جائے اور غور سے کام لیا جائے تو بآسانی معلوم ہوگا کہ سردیوں میں نظام ہضم تیز ہوتا ہے، پرانے مٹکے کا پانی گرم ہوتا ہے اور سردیوں میں زلزلوں کی شرح زیادہ ہوتی ہے، اس کے برعکس گرمیوں میں

ہاضمہ کمزور رہتا ہے، نئے مٹکے کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمیوں میں زلزلے کم ہوتے ہیں، کیونکہ پہلی صورتوں میں مسامات بند ہوتے ہیں اس لئے حرارت اندر رہتی ہے باہر نہیں نکلتی سکتی ہے کیونکہ سردیوں میں جسم کے مسامات بند ہوتے ہیں تو معدے کی حرارت تیز ہوتی ہے پرانے مٹکے کے مسامات بند ہوتے ہیں تو پانی، اندرونی گرمی کی وجہ سے ٹھنڈا نہیں رہ سکتا، یہی سردیوں کے چشموں کا راز ہے کہ اندر زمین گرم ہوتی ہے اس لئے پانی گرم نکلتا ہے اور گیس محبوس ہونے کی وجہ سے زلزلے کا سبب بنتی ہے، جبکہ گرمی میں مسامات کھل جاتے ہیں تو زمین کا پیٹ ٹھنڈا رہتا ہے اس لئے پانی ٹھنڈا ہو جاتا ہے، ہاضمہ کمزور ہو جاتا ہے اور زلزلے کم ہو جاتے ہیں، تازہ مٹکے میں بھی مسامات کھلے رہنے کی وجہ سے پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔

آج سے چند سال قبل تک ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ جب بخار تیز ہو جائے تو مریض کے جسم پر برف کے ٹکڑے رکھے جائیں یا ٹھنڈے پانی کی پٹی کی جائے مگر اب حال ہی میں انہوں نے مندرجہ بالا ضابطہ کی طرف لوٹ کر تسلیم کیا ہے کہ برف کا تجربہ غلط تھا، ہونا یہ چاہئے کہ نارمل پانی سے تیز بخار کا ازالہ کیا جائے یعنی اگر موسم گرم ہو تو نل کا پانی تیز بخار والے مریض پر ڈالا جائے اس سے جسم کے مسامات کھل جائیں گے تو اندر کی حرارت مسامات کے ذریعے نکل کر بھاپ اور بخارات بن جائیں گی، اس طرح اندرون درجہ حرارت کم ہو جانے سے جو عبارت ہے بخار سے خود بخود مریض کو افاقہ نصیب ہوگا اور یہ طریقہ کار ہر بخار اور ہر مریض کے لئے مفید ہے بشرطیکہ بخار تیز ہو جس کی طرف حدیث الباب میں اشارہ واضحہ موجود ہے، لہٰذا نہ تو یہاں کسی مکان کی قید کی ضرورت ہے اور نہ زمان کی، اور نہ ہی بخار کی تقسیم کی ضرورت ہے، اس بارے میں غلط فہمی کی بنیاد کم بخار یا ٹھنڈے پانی کے استعمال پر تھی۔ فہذا الک فلیفر حوا

اس کی مزید وضاحت ''باب التداوی بالرماد'' سے پہلے والے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ زلزلوں کے اور بھی اسباب ہیں یہ بھی یاد رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک ضابطے کے مطابق ارشاد فرماتے ان میں بہت سے ضابطے عرفی ہوتے ہیں جو صحابہ کرام ؓ کو معلوم ہوتے اس لئے وہ سمجھ پاتے مثلاً کوئی شخص نحوی کے سامنے یہ کہے کہ ''زید قائم'' میں دونوں مرفوع ہیں تو اسے سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں جو ضابطے طبی اور سائنسی ہوتے تو صحابہ کرامؓ اپنے بے مثال یقین کی بناء پر اس پر عمل کرتے اور ان کو فائدہ بھی ہوتا اور کوئی شک و اشکال بھی پیش نہیں آتا۔ مگر آج کل ہر آدمی اور خصوصاً پڑھے لکھے جاہل دعوے بہت کرتے ہیں مگر سمجھنے کی کوشش کم کرتے ہیں کہ سمجھنے کے لئے وسیع علم کی ضرورت ہے جو آج کل عنقاء سے کم نہیں۔

حدیث آخر:۔"عن ابن عباس ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم :کان یعلِّمُھُم من الحمیٰ ومن الاوجاع کلھا ان یقول:بسم اللّٰہ الکبیر اعوذ باللّٰہ العظیم من شر کل عِرقٍ نعّار ومن شرِّ حرِّ النار"۔[۲] (حدیث غریب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بخار اور ہر دُکھ درد سے شفاء کے لئے یہ دعاء پڑھنا سکھاتے تھے "بسم اللّٰہ الکبیر اعوذ باللّٰہ العظیم "الخ یعنی میں پناہ مانگتا ہوں اللہ عظیم کی ہر بھڑکتی رگ کے شر سے اور آگ (بخار) کی حرارت (وشدت) کے شر سے۔

لغات:۔قولہ "الاوجاع" وَجَع بفتحتین کی جمع ہے ہر قسم کی تکلیف اور دکھ درد کو کہتے ہیں۔ قولہ "عِرق" بکسر العین وسکون الراء، ہر شے کی اصل اور جڑ کو کہتے ہیں، رگ کو بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اصل ہے اور یہاں یہی رگ والا معنی مراد ہے۔قولہ "نعار" بفتح النون وتشدید العین، یہ لفظ "یاء" کے ساتھ بھی منقول ہے، وہ رگ جس میں خون جوش مارنے لگے جیسے ہائی بلڈ پریشر میں ہوتا ہے۔ بعض نے اضطراب اور بے چینی کا ترجمہ بھی کیا ہے، یہ بھی بلڈ پریشر کے لوازمات میں سے ہے، گویا عرق، نعار بمعنی ہائی بلڈ پریشر کی بے چینی اور شر کے ہے جس سے کبھی کبھار دماغ کی رگ پھٹ بھی جاتی ہے، تاہم اصل لغت میں "نعار" بکری کی آواز کو کہتے ہیں، پس مراد نعرہ لگانے اور آواز دینے والی رگ بھی ہو سکتی ہے۔

تشریح اور جدید تحقیق:۔آج کل یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جو رگیں دل سے تمام بدن کو خون سپلائی کرتی ہیں جن کو شریان کہتے ہیں، وہ ہائی بلڈ پریشر اور سخت بخار میں آواز نکالتی ہیں جو آلات سے بہر کیف اور خالی کان سے بھی سنی جا سکتی ہے۔(فسبحان اللہ)

باب ماجاء فی الغیلة

"عن عائشة عن بنت وھب وھی جُدامة قالت سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: اردتُ ان انھیٰ عن الغِیال فاذا فارس والروم یفعلون ولا یقتلون اولادھم"۔[۱] (حدیث صحیح)

باب ماجاء فی الغیلة

[۱] الحدیث اخرجه ایضاً ابن ماجه ص:۱۴۵ "باب الغیل" ابواب النکاح.

حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت جُدامہ بنت وہب سے روایت کرتی ہیں فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سُنا ہے کہ، میں دودھ پلانے والی کے ساتھ مجامعت سے روکنا چاہ رہا تھا مگر جب دیکھا کہ فارسی اور رومی لوگ ایسا کرتے ہیں اور (اس سے) اپنی اولاد کو قتل نہیں کرتے۔ (اس لئے میں نے منع نہیں کیا)

لغات:۔ قولہ "غِیلة" بکسر الغین اس کی تفسیر امام ترمذیؒ نے اسی باب میں امام مالکؒ سے نقل کی ہے: "والغِیال، والغِیلة ان یطأ الرجل امرأته وهی ترضع" یعنی جب عورت بچے کو دودھ پلاتی ہو تو ان دنوں میں اس سے ہم بستری کرنا غیلہ اور غیال ہے۔ علی ھذا اغِیال بھی بکسر الغین ہے۔

تشریح:۔ عربوں میں یہ بات مشہور تھی کہ جب عورت کے ساتھ دورانِ رضاعت مجامعت کی جائے تو چونکہ اس سے حمل ٹھہرنے کا امکان رہتا ہے پھر دودھ خراب یعنی نرم اور فاسد ہو جاتا ہے جس سے دودھ پیتے بچے کو صحیح غذا نہ ملنے کی وجہ سے نقصان اور ضعف لاحق ہو جاتا ہے، پھر کل وہ گھوڑے پر شہسواری میں کمزور ہوتا ہے اور یہ بات فی الجملہ کسی حد تک صحیح تھی کہ جن لوگوں کے بچے جلدی جلدی پیدا ہوتے ہیں وہ ماں کا دودھ پوری مدت تک نہیں پی سکتے ہیں، اگر پیتے بھی ہیں تو دونوں صورتوں میں ان کی ہڈیاں اور پٹھے مضبوط و طاقت ور نہیں ہوتے ہیں اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا جیسا کہ نسائی وابوداود[۲] میں ہے: "لا تقتلوا اولادکم سرّا فان الغیل یدرك الفارس فیدعثره عن فرسه"۔ (لفظہ لابی داود، باب فی الغیل، کتاب الطب) یعنی اپنی اولاد کو خفیہ طریقے سے قتل مت کرو کہ زمانۂ رضاعت میں جماع کا اثر گھڑسوار پر ظاہر ہو کر اسے گھوڑے سے پچھاڑتا ہے، تاہم ضروری نہیں ہے کہ زمانۂ رضاعت میں جماع سے حمل ٹھہر جائے کیونکہ دودھ پلانے کی مدت میں عموماً ماہواری نہیں آتی ہے، دوسرے حمل ٹھہرنے کا امکان ویسے بھی ان دنوں میں کم ہوتا ہے اور اسی نکتے کو آج کل خاندانی منصوبہ بندی والے ملحوظ رکھے ہوئے ہیں، پہلے وہ کہتے تھے کہ بچے کو بوتل کا دودھ پلاؤ مگر جب شرح پیداوار بڑھ گئی تو پریشان ہو کر اب کہتے ہیں کہ بچے کی صحت کے لئے سب سے اچھی غذا ماں کا دودھ ہے، نمبر تین حمل کی ابتدائی دنوں میں دودھ ٹھیک ہی رہتا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل فارس اور رومیوں پر قیاس کرتے ہوئے اس نہی کو جزوی طور پر منسوخ فرمایا کہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے ورنہ

---

[۲] سنن ابی داؤد ص:۱۸۶ ج:۲ "باب فی الغیل" کتاب الطب، سنن ابن ماجه ص:۱۴۵ ابواب النکاح، مسند احمد ص:۶۰۷ ج:۷ حدیث:۲۷۰۱۵، ۲۷۰۳۸، ۲۷۰۴۳۔

تو رومی اور فارسی لوگ گھوڑے پر تھمنے سے قاصر ہوتے، نیز ان لوگوں کی طب پر نظر ہے اور آبادی بھی بڑی تعداد میں ہے جس سے معلوم ہوا کہ نقصان کا اندیشہ بہت کم ہے اس لئے اجازت عنایت فرمائی، ہاں عربوں کے مقابلے میں وہ کمزور تھے اس لئے پہلے منع فرمایا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیاس اور اجتہاد فرماتے اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔ (کذا فی البذل) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ کبھی نہی کی حکمت دفع مفسدہ ہوتا: ''وبین فی مواضع ان الحکمة فیهادفع مفسدة کالنهی عن الغیلة انماهو مخافة ضرر الولد''۔ (قالہ فی مقدمۃ کتابہ)

باب ماجاء فی دواء ذات الجنب

"عن زید بن ارقم ان النبی صلی الله علیه وسلم :کان ینعتُ الزیتَ وَالوَرْسَ من ذات الجنب قال قتادة وَیُلَدُّ من الجانب الذی یشتکیه"۔[1] (حسن صحیح)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذات الجنب سے شفاء کے لئے زیتون کے تیل اور ورس کی تعریف فرماتے، قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ دوا اسی جانب سے منہ میں ڈالی جائے جس جانب تکلیف ہو۔

لغات مع تشریح: قولہ "الزیت" روغن زیتون۔ قولہ "الورس" بروزن شمس ایک قسم کا پودا جو رنگائی کے کام میں لایا جاتا ہے، ہندوستان، عرب اور ملک حبشہ (ایتھوپیا) میں پیدا ہوتا ہے، خصوصاً یمن میں۔ قولہ "ذات الجنب" یہ تسمیۃ الحال باسم المحل ہے، وہ درد جو پسلیوں کے نیچے محسوس ہوتا ہے، اس کو ذات الرئۃ بھی کہتے ہیں یعنی پھیپھڑوں کی سوزش، بعض حضرات نمونیا پر بھی اس کا اطلاق کرتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں: ایک حقیقی جو ورم اور سوزش کی وجہ سے ہو، دوسری جو ریح کی بناء پر ہو، حاشیہ پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہاں یہی عرفی یعنی وجع ریحی مراد ہے، جبکہ حقیقی درد سینے کی جھلی میں سوزش، یا پھیپھڑوں کے متاثر ہونے یا دل کی دائیں جانب کے بڑا ہونے سے ہوتا ہے، اس کے ساتھ اکثر بخار بھی ہوتا ہے اور سانس لینے میں

باب ماجاء فی دواء الجنب

[1] الحدیث روی بمعناه مسلم ص:۲۲۷ ج:۲ کتاب السلام.

دشواری بھی ہوتی ہے۔

امام ترمذیؒ نے باب کے آخر میں یہی معنی مرادلیا ہے،''و ذات الجنب یعنی السِّل'' سل پھیپھڑوں کی بیماری کو کہتے ہیں جس میں یہ بیماری زخم کی وجہ سے ہوتی ہے گویا نمونیا طرز کی بیماری ہوتی ہے لیکن حضرت شاہ ولی اللہ ؒ کا مطلب زیادہ قرین قیاس ہے ہاں البتہ کھانسی (ٹی بی) کے لئے قُسط بحری مفید ہے کہ گرم بھی ہے اور خشک بھی۔

باب کی اگلی حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم ذات الجنب کا علاج کُٹ اور زیتون سے کریں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قُسط بحری سے مراد کُٹ ہے اس کو''کوٹ''اور''کوٹھ'' بھی لکھتے ہیں، اسے بحری اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ہندوستان سے براستہ سمندر لائی جاتی تھی، مسلم [۲] کی روایت میں عود ہندی کا لفظ آیا ہے اسے کُست بھی کہتے ہیں، یہ ایک جڑی ہے جو کشمیر کے اونچے پہاڑوں میں پائی جاتی ہے عموماً چرواہیں اس کو لا کر بازار میں بیچتے ہیں۔ راقم کو بچپن میں طاقت کی غرض سے اور سایہ سے شفاء کے لئے دی گئی تھی جس کا بڑا مثبت نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ عود ہندی کی دو قسمیں اور بھی ہیں مگر وہ خوشبو میں استعمال ہوتی ہیں، یہاں وہ دونوں مراد نہیں، ایک عود ہندی عطری کہلاتی ہے جسے''اگر'' کہا جاتا ہے اور جس سے اگر بتیاں بھی بنائی جاتی ہیں، اور دوسری''قسطِ اظفار'' اس کو کُست بھی کہتے ہیں اور اظفار الطیب بھی، یہ بھی ایک قسم کی خوشبو ہے، یہ آخری دونوں قسمیں یہاں مراد نہیں۔

تکملۃ فتح الملہم میں ہے کہ اظفار الطیب کو اردو میں''نخ'' کہتے ہیں۔ (تکملہ فتح الملہم ص:۳۴۹۔ ج:۴)

بعض اطباء نے یہاں یہ اعتراض کیا ہے کہ ذات الجنب گرمی سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا اس کا علاج کسی سرد دوا سے ہونا چاہئے کیونکہ علاج بالضد ہوتا ہے لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں کیونکہ علاج بالمثل بھی ہوتا ہے اور علاج بالضد کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، علاوہ ازیں حاشیہ میں امام نوویؒ نے بحوالہ طیبی نقل کیا ہے کہ حکیم جالینوس وغیرہ نے بھی قسط بحری کو ذات الجنب کے لئے مفید قرار دیا ہے۔

---

۲ صحیح مسلم حوالہ بالا.

باب

”عن عثمان بن ابی العاص انه قال اتانی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وبی وجع قد کادیُهلکُنی فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم :امسح بیمینك سبع مرات وقل اعوذ بعزة اللّٰہ وقدرته وسلطانه من شرمااجد قال ففعلتُ فاذهب اللّٰہ ماکان بی فلم اَزَل آمُرُه به اهلی وغیرهم“۔ (حسن صحیح) [1]

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے جبکہ مجھے درد کا ایسا عارضہ لاحق ہو گیا تھا جو قریب تھا کہ مجھے مار دیتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنا داہنا ہاتھ درد والی جگہ پر سات مرتبہ پھیر دو اور یہ دعاء پڑھو: اعوذ بعزۃ اللہ الخ حضرت عثمان فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ نے وہ درد دور فرما دیا پس میں تو ہمیشہ اپنے گھر والوں اور دوسروں کو اس کی تجویز دیتا ہوں۔

تشریح:۔ یہ ایک روحانی علاج ہے جس کے متعلق...ابن قیمؒ زادالمعاد ”طب نبوی“ میں لکھتے ہیں کہ یہ مسلمات میں سے ہے کہ جب روح میں قوت آتی ہے تو نفس اور طبیعت دونوں قوی ہو جاتے ہیں اور بیماری کے دور کرنے میں اسے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے میں پوری مدد دیتی ہے، اس سے چند سطور پہلے لکھتے ہیں: ادویہ قلبیہ ادویہ روحانی قوتِ قلب، اعتماد علی اللہ، اسی سے سب کچھ مانگنا، اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اقرار، اپنی بے کسی کا اظہار، بے چارگی کا بیان، صدقہ، دعا، توبہ استغفار، مخلوق کے ساتھ بھلائی، دردمندوں کی فریادرسی، مصیبت زدگان کی یاوری، یہ سارے طریقے علاج کے جو خود مذہب اسلام نے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے متبعین نے بار بار آزمائے ہیں، ان میں شفا کا وہ انداز، تاثیر کی وہ تیزی انہیں نظر آئی کہ دنیا کے بڑے سے بڑے تجربہ کار اور حاذق طبیب بھی اس تک نہ پہنچ سکے۔ (طب نبوی ص:۱۳۱ فصل:۳۰)

راقم نے خود اس کا تجربہ کچھ یوں کیا ہے کہ کلفٹن اور ڈیفنس کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے جو امریکہ سے پڑھ کر آیا تھا اس نے سو فیصد یقین سے میرے گلے میں کینسر کی تشخیص کی تھی اور آپریشن کرنے میں اتنی جلدی کر رہا تھا کہ عید کے دن سے بھی تاخیر کو جان لیوا قرار دیتا تھا اور کہتا کہ اگر کچھ ہوا تو ذمہ داری آپ کی اپنی

باب

[1] الحدیث اخرجه ایضاً مسلم وابوداؤد بحواله جمع الفوائد ص:۲۵۵ ج:۲.

ہوگی، اللہ کے فضل سے میں آج اس کے بعد سات سال تک زندہ ہوں گو کہ میں نے پھر آغا خان ہسپتال سے آپریشن کروایا مگر وہ دانہ ختم نہیں ہوا، پھر میں نے سورۂ مجادلہ چالیس روز تک پڑھنے کا التزام کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ 2003ء سے 2010ء تک زندہ ہوں۔ والحمد للہ علی ذالک

حال ہی میں جاپان کے ایک سائنس دان پروفیسر مساروا یموتو کی تحقیق آئی ہے کہ جب پانی پر بسم اللہ یا قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں تو خوردبین میں وہ پانی پھولوں کی طرح دکھائی دیتا ہے جبکہ شیطانی الفاظ پڑھ کر دم کرنے سے پانی کے قطرے ڈراؤنی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

باب ماجاء فی السنا

"عن اسماء بنت عُمیس ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :سألھا بما تَسْتَمْشِیْن ؟قالت بالشُبرم اقال :حارٌ حارٌ قالت ثم استمشیتُ بالسنّا فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم :لو ان شیئاً کان فیہ شفاء من الموت لکان فی السنا"۔(حدیث غریب)[1]

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم کونسی مُسہل (جُلاب) استعمال کرتی ہو؟ کہنے لگیں "شبرم" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تو بہت گرم کھینچنے والی چیز ہے فرماتی ہیں کہ پھر میں سنا سے اسہال لینے لگی تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اگر کسی چیز میں موت سے شفاء ہوتی تو سنا میں ہوتی۔

لغات مع التشریح:۔قولہ "تَسْتَمْشِیْن" واحد مؤنث مخاطبہ کا صیغہ ہے اس میں سین طلب کے لئے ہے اور مشی کے بارے میں پہلے گذرا ہے کہ دست آور دوا کو کہتے ہیں یعنی مسہل اور جلاب۔قولہ "الشبرم" بضم الشین وسکون الباء وضم الراء یہ چنے کے دانوں کے برابر بیج ہوتے ہیں جن کو اُبال کر پانی پیا جاتا ہے۔بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ کسی درخت کی جڑ کا چھلکا ہوتا ہے۔قولہ "حار حار" پہلا لفظ حاء بغیر نقطے کے ساتھ ہے جس کے معنی گرم کے ہے مگر دوسرے لفظ میں متعدد روایات ہیں،بعض نے اس کو حاء کے ساتھ پڑھا ہے، علی ہذا یہ اول کی تاکید ہے۔بعض نے اس کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، پھر یہ تکیہ کلام ہے۔تیسرا قول وہی ہے جو ہمارے

باب ماجاء فی السنا

[1] ایضاً روی بمعناہ الطبرانی فی الکبیر ۲۴/۳۹۸ مجمع الزوائد ص: ۱۰۴ ج: ۵ جمع الفوائد ص: ۲۵۱ ج: ۲.

نسخوں کے مطابق یعنی جیم کے ساتھ ہے، اس کو بھی اکثر شارحین نے تاکید اور تکیہ کلام پر محمول کیا ہے مگر حضرت گنگوہیؒ الکوکب میں فرماتے ہیں کہ اس کو اول کا تابع یعنی تاکید بنانا صحیح نہیں بلکہ یہ تاسیس کے لئے ہے اور جر سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے کہ ضرورت سے زیادہ دست آور ہے اور معدے کے تقریباً تمام مواد کو کھینچ کر ضرر اور ضعف کا موجب بنتا ہے۔ اوپر ترجمہ میں اسی کو لیا ہے۔ قولہ "بالسنا" ایک پودا ہے جس کی پتیاں دست آور اور مسہل ہیں۔ راقم اس کو کافی عرصہ سے استعمال کر رہا ہے، بہت مفید ہے، قبض کشا بھی ہے، اور دیگر امراض کے ازالہ میں بھی معاون ہے خصوصاً سنائے مکی گو کہ اس کا نام پنساریوں نے سنائے مکی ہی مشہور کیا ہے، اس کے فوائد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی چیز موت سے شفاء بخش ہوتی تو وہ سنا ہوتی، آخر یہ تعبیر ترغیب ہی کے لئے تو ہے کہ اسے استعمال میں رکھا جائے، اس لئے بعض اطباء تو اسے ہر نسخہ میں یا اکثر ادویات میں شامل کرتے ہیں البتہ اس کا استعمال اپنے طور پر نہیں بلکہ ماہر نباتات یا ماہر طبیب کے مشورے سے ہونا چاہئے۔

باب ماجاء فی العسل

"عن ابی سعید قال جاء رجل الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال: اِنَّ اَخِی استطلق بطنُہ فقال اِسقِہِ عسلاً فسقاہ، ثم جاء فقال یارسول اللّٰہ اِنِی قدسَقَیتُہ فلم یزدہ الا استطلاقاً قال فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: صدق اللّٰہ و کذب بطن اَخیکَ اِسقِہ عسلاً فسقاہ فَبَرَأَ"۔ (حدیث حسن صحیح) [1]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میرے بھائی کا پیٹ چالو ہو گیا ہے (یعنی کثرت سے دست آ رہے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُسے شہد پلاؤ چنانچہ اس نے پلا دیا، وہ شخص پھر آیا اور کہا اے اللہ کے رسول! میں نے اس کو پلا ہی دیا مگر اس نے تو پیٹ کی روانی میں اور اضافہ کر دیا، ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

باب ماجاء فی العسل

[1] الحدیث اخرجہ البخاری ص: ۸۳۸ ج: ۲ "باب الدواء بالعسل" کتاب الطب، ایضاً ص: ۸۵۱ ج: ۲ کتاب الطب، صحیح مسلم ص: ۲۲۷ ج: ۲ کتاب السلام، مسنداحمد ص: ۳۹۷ ج: ۳ حدیث: ۱۰۷۲۲، ۱۰۷۲۲، ۱۱۴۲۱ جمع الفوائد ص: ۲۴۹ ج: ۲. الحنفی عفی عنہ

وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے سچ فرمایا ہے (کہ ''فیہ شفاء للناس'') مگر تیرے بھائی کا پیٹ غلط کرتا ہے، اس کو (پھر) شہد پلاؤ تو اس نے پھر پلایا چنانچہ وہ ٹھیک ہوگیا۔

لغات: ۔قولہ "استطلق" اس کو مجہول ومعروف دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے یعنی پے در پے دست آرہے ہیں، بخاری کی روایت (ص:۸۵۱ ج:۲) میں اسی طرح ہے جبکہ دوسری (۸۴۸ ج:۲) میں ''یشتکی بطنہ'' ہے۔قولہ "وکذب طبن اخیک" یہاں کذب کی نسبت بطن کی طرف مجازاً ہے کیونکہ صدق وکذب اقوال کے اوصاف ہیں مگر عرب خطا اور غلطی پر بھی کذب کا اطلاق کرکے قائل کے بجائے فاعل وعامل کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں یعنی تیرے بھائی کے پیٹ نے شفاء والی چیز کو قبول نہیں کیا۔

تشریح: ۔بخاری [۲] کی روایت میں ہے کہ وہ شخص تین مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست روکنے کے لئے اسے شہد پلانے کا مشورہ دیا، اس پر بظاہر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ شہد تو گرم اور مسہل یعنی دست آور ہے پھر اس حکم کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ طریقہ کار کوئی قاعدہ کلیہ کے طور پر نہیں بتایا کہ گویا ہر اسہال کے مریض کو شہد پلایا جائے حتی کی مذکورہ اعتراض وارد ہوجائے (گو کہ بعض صحابہ کرامؓ نے اس سے حکم کلی سمجھا تھا اور وہ ہر بیماری میں شہد پیتے تھے) بلکہ کچھ مواد فاسد ہوکر پیٹ سے نکلنے والے تھے جس کے اخراج کے لئے شہد مفید ومعاون ثابت ہوا، یہ نکتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ جب پیٹ فاسد مواد سے فارغ ہوگا تو خود بخود ٹھیک ہوجائے گا، وہ آدمی اس حکمت کو نہیں جانتا تھا، یہ طریقہ علاج بالمثل کہلاتا ہے جو بعض مواقع میں مفید ثابت ہوتا ہے لہٰذا یہ اس شخص کے لئے خصوصی طریقہ علاج تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یا طبی اصول سے معلوم ہوا تھا، یا پھر یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہارِ معجزہ کے لئے تھا جو خرق عادت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ (کذافی العارضۃ)

پس نہ تو اس حدیث کو ضابطہ سمجھنا چاہئے اور نہ ہی اس آیت ''فیہ شفاء للناس'' [۳] کو عام لینا چاہئے کیونکہ بعض امراض شہد کے استعمال سے مزید بگڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں:

"ولم یذکرہ علی العموم ...وقد کان جماعۃ من الصحابۃ یتناولونہ علی ظاھرہ ویشربون فی اَدوائھم العسل ممزوجاً بالماء والزیت...ولا یخفیٰ ان من

[۲] صحیح بخاری حوالہ بالا۔　[۳] سورۃ النحل آیت: ۶۹۔

الامراض مااذاشرب صاحبه العسل خلق اللّٰه الآلمَ بعده وان قوله (تعالیٰ) فی العسل "فیه شفاء للناس" انماھوفی الاغلب"۔الی آخرماحررناه

بابٌ

"عن ابن عباس عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم انه قال:مامن عبدمسلم یعودمریضاًلم یحضراجله فیقول سبع مرات :اسأل اللّٰه العظیم بالعرش العظیم ان یشفیك اِلاعوفی"۔(حسن غریب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: کہ جوشخص کسی ایسے مریض کی عیادت کرے جس کی اجل پوری نہ ہوئی ہواوروہ یہ دعا''اسئل اللّٰه العظیم ''الخ سات مرتبہ پڑھےتواس کوضرورشفاءہوگی۔

بابٌ

"ثوبان عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال اذااصاب احدکم الحمّٰی فان الحمیٰ قطعة من النارفلیطفھاعنه بالماء فلیستنقع فی نهرجارفلیستقبل جِریته ،فیقول:بسم اللّٰه اللّٰھم اشفِ عبدك وصدّق رسولك ،بعدصلوٰة الصبح وقبل طلوع الشمش ولیغمس فیه ثلاث غَمْسَات ،ثلاثة ایام فان لم یبرأ فی ثلاث فخمس فان لم یبرأ فی خمس فسبع فان لم یبرأ فی سبع فتسع فانھا لاتکادتجاوز تسعاًباذن اللّٰه"۔(ھذاحدیث غریب)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:اگرتم میں سے کسی کو بخار ہوجائے توچونکہ بخارآگ کاایک ٹکڑاہےاس لئے اس کو پانی سے بُجھاکردورکرے یعنی جاری نہرمیں داخل ہوجائے اوراس کی بہاؤ کی جانب منہ کرکے یہ دعاپڑھے:''بسم اللّٰه اللّٰھم اشفِ ''الخ یہ کام صبح کی نماز کے بعداورسورج نکلنے سے پہلے کرےاورچاہیئے کہ (نہاتے وقت) تین غوطے لگائے ،تین دن تک ایسا کرے، پس اگرتین میں ٹھیک نہ ہوتوپانچ دنوں تک کرے،اگرپانچ میں اچھانہ ہوجائے توسات دن تک ایسا کرے، اوراگرسات میں بھی ٹھیک نہ ہوجائے تونودن تک یہ عمل کرے کیونکہ اللہ کے حکم سے وہ نودنوں سے زیادہ نہیں

بڑھ سکے گا۔

لغات:۔ "فلیطفها" اطفاء سے ہے بمعنی بُجھانے، روایت اگرچہ بغیر ہمزہ کے ہے مگر قیاس کا تقاضایہ ہے کہ فاء کے بعد ہمزہ ہو"فلیطفئها"۔

قولہ "فلیستنقع" استنقاع کے معنی پانی کے تالاب وغیرہ میں غسل کے لئے اترنے کے ہیں، یہ فلیطفها کا بیان ہے اور خود مبیّن ہے، اس کا بیان "فلیستقبل" نے کیا ہے۔قولہ "جِریته" بکسرالجیم پانی کی رَو اور بہاؤ کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ بخار کا علاج پانی کے ذریعہ کرنے کی بحث اور جدید تحقیق کی روشنی میں تفصیل "باب ماجاء فی تبرید الحمیٰ بالماء" میں گذری ہے وہیں دیکھ لی جائے، مزید یہ ہے کہ جوضابطہ وہاں بتلایا گیا تھا اس کے مطابق اصل بات جسم کی اندرونی گرمی کو خارج کرنا اور درجۂ حرارت کو کسی نہ کسی طرح کم کرنا ہے۔

اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے انسان کے جسم میں ایک خودکار لیول ودیعت فرمایا ہے، اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جسم کے اندر ۹۸.۶ فارن ہیٹ درجہ حرارت کو محفوظ رکھتا ہے خواہ باہر کا موسم کیسا ہی ہو یعنی شدید گرمی ہو یا سخت سردی ہو مگر اندر کا درجہ حرارت اسی طرح ۳۶ سینٹی گریڈ رہتا ہے مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جسم کے اندر اس قسم کے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں جو اس لیول کو متاثر کرتے ہیں نتیجۂ جسم کی اندرونی گرمی کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور کھال کی سطح پر ٹھنڈک کی وجہ سے مسامات بند ہو جاتے ہیں اس طرح گرمی کے اخراج کا عمل فیل ہو جاتا ہے، چونکہ قوت حاسہ کھال میں ہے اس لئے بخار میں مریض کو سردی لگتی ہے اگرچہ اندر شدید گرمی ہوتی ہے، بخار کے اتارنے کے لئے جو ادویات دی جاتی ہیں ان میں دوطرح کے اثرات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے (۱) جو ان جراثیم کو ختم کردیں۔ (۲) جو اس لیول کے عمل کو بحال کر کے گرمی کا بیرون جسم منتقل کرنے کا عمل بحال کر کے گرمی کا اخراج کریں۔

صاف پانی میں اللہ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ ان جراثیم کو چُن چُن کر ہلاک کردیتا ہے، دوسرے اس سے مسامات کھل جانے سے اندر کی گرمی بھاپ بن کر خارج ہو جاتی ہے، لہٰذا حدیث باب میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ کئی فوائد پر مشتمل ہے مثلاً صبح کے وقت پانی صاف ستھرا بھی ہوتا ہے اور صبح کے وقت غسل سے آدمی ہشاش بشاش اور خوش وخرم ہو جاتا ہے جس کا اپنا اثر بھی ہے، اور نفسیاتی اعتبار سے بھی مفید ہے، نیز دعاء اور سنت کے مطابق روحانی علاج کے ثمرات بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

باب التداوي بالرماد

"عن ابی حازم قال سئل سهل بن سعدؓ وانا أسمعُ :بِأيِّ شيءٍ دُووِيَ جُرح رسول الله صلى الله عليه وسلم ؟فقال:مابقی احداعلم به منی کان علیٌّ يأتی بالماء فی تُرسه وفاطمة تغسل عنه الدم وأُحرِق له حصيرفحُشِيَ به جُرحُه"۔(حديث حسن صحيح) [1]

حضرت ابوحازم فرماتے ہیں کہ سہل بن سعدؓ سے دریافت کیا گیا جبکہ میں (یہ گفتگو) سن رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کا علاج کس چیز سے کیا گیا تھا؟ تو حضرت سہل نے فرمایا کہ اس بارے میں مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں بچا ہے، علیؓ اپنی ڈھال میں پانی بھر بھر کر لاتے اور فاطمہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون دھوتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک چٹائی (بوریا) جلادی گئی اور اسی (راکھ) سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کو بھر دیا گیا۔

لغات: قوله "الرماد" بالکسر راکھ کو کہتے ہیں۔قوله "دُووی" مجہول کا صیغہ ہے جیسے نُودی۔ قوله "جرح" بضم الجیم، چوٹ اور زخم کو کہتے ہیں، جمع جروح آتی ہے۔قوله "ترسه" بضم التاء ترس، سپر اور ڈھال کو کہتے ہیں۔قوله "حصیر" کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چٹائی اور بوریا، ٹاٹ۔قوله "فحشی" بصیغۂ مجہول، حشو بھرتی کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جس سے کسی چیز کو بھرا جائے جیسے تکیہ میں روئی وغیرہ۔

تشریح: ۔یہ روایت بخاری کی کتاب المغازی (ص:۵۸۴ ج:۲) پر بھی آئی ہے، اس میں یہ اضافہ ہے کہ جب اس زخم پر راکھ لگادی گئی تو "فاستمسك الدم و كسرت رَباعيته يومئذ وجرح وجهه وكسرت البيضة على رأسه" مگر واضح رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رباعی دانت پورا شہید نہیں ہوا تھا بلکہ صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا الگ ہو گیا تھا اور ساتھ نچلا ہونٹ مبارک بھی زخمی ہوا تھا، یہ عتبہ بن ابی وقاص کے تیر لگنے کی وجہ سے ہوا تھا، اس خون دھونے کی وجہ بخاری کی روایت کے مطابق اسے روکنا تھا جبکہ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں: "اماغسل الدم فلازالة النجاسة اِن قلنااِن دمه نجس، اولازالة التلويث اِن قلنااِنَّ دمه

باب التداوی بالرماد

[1] الحديث رواه البخاری ص:۵۸۴ ج:۲ كتاب المغازی، ايضاً بخاری ص:۸۵۲ ج:۲ "باب حرق الحصير لسيد به الدم" كتاب الطب، ايضاً رواه مسلم كذا فی جمع الفوائد ص:۲۴۷ ج:۲.

طاھر''۔

جہاں تک حصیر یعنی چٹائی یا بوریا اور ٹاٹ جلا کر اس کی راکھ زخم پر ڈالنے کا تعلق ہے تو یہ بھی بخاری کی روایت کے مطابق خون روکنے کے لئے تھا''فلما رأت فاطمة ان الماء لایزید الدم الا کثرة اخذت قطعة من حصیر فاحرقتها فالصقتها فاستمسك الدم''۔[۲]

جدید تحقیق:۔ انسانی جسم میں کسی عضو کے زخمی ہونے کی صورت میں اور بالخصوص زنگ آلود لوہے یا آلودہ چیز سے چوٹ آنے سے زخم میں ایسے جراثیم داخل ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جن سے تشنج (ٹیٹنس) کا خطرہ ہوتا ہے جس کے لئے آج کل ٹیکے لگائے جاتے ہیں مگر آگ میں اللہ عزوجل نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ اگر کوئی جگہ یا چیز آگ سے جلادی جائے تو وہ جراثیم مکمل طور سے ختم ہوجاتے ہیں گویا پھر ٹیکہ لگوانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لئے کوئی سوتی کپڑے کو جلا کر گرم راکھ اگر زخم پر رکھ دی جائے یا گرم پانی سے دھویا جائے تو وہ جگہ جراثیم سے صاف ہوجاتی ہے۔

غرض یہ ایک روایتی علاج تھا اور ہمارے یہاں آج بھی مروج ہے اس کا مقصد صرف خون بند کرنا ہوتا تھا مگر آج ثابت ہوا کہ یہ جراثیم کش بھی ہے۔

اس حدیث میں حضرت سہل بن سعدؓ کا یہ فرمانا کہ''مابقی احد اعلم به منی''اس بات کی دلیل ہے کہ کسی نیک غرض مثلاً ترغیب کے لئے یا مسئلہ کو مؤثر بنانے کے لئے ایسا دعویٰ واظہار کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس سے عجب وغیرہ خرابی کا اندیشہ اپنے حق میں یا دوسرے کے حق میں پیدا نہ ہو اور اسی طرح دعوی بھی حقیقت پر مبنی ہو۔

حاشیہ بخاری پر بحوالۂ کرمانی اس حدیث سے کچھ اور مسائل بھی مستنبط کئے گئے ہیں: (۱) اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام پر آزمائشیں اور بیماریاں آتی تھیں تا کہ وہ اس کا اجر بھی حاصل کریں۔ (۲) اور تا کہ امت کو اس پر چلنا یعنی صبر کرنا آسان ہو۔ (۳) اور یہ کہ معلوم ہو کہ انبیاء بھی بشر ہیں ان کو وہ تمام عوارض لاحق ہوسکتے ہیں جو عام انسانی جسموں کو لاحق ہوتے ہیں۔ (۴) اور یہ کہ یقین ہوجائے کہ انبیاء علیہم السلام مخلوق ہیں اس طرح وہ معجزات دیکھنے سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ (جیسا کہ بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بعض نے نبی علیہ السلام کی بشریت سے انکار کردیا ہے) (۵) اس میں خود وغیرہ ہتھیار پہننے کا استحباب معلوم

---

[۲] صحیح بخاری حوالہ بالا.

ہوا اور یہ کہ یہ توکل کے منافی نہیں۔ (بخاری ص: ۸۴۵ ج: ۲، حاشیہ نمبر: ۲)

باب

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم: اذا دخلتم علی المریض فَنَفِّسُوا له فی اَجله فان ذالك لایَرُدُّ شیئاً و یُطَیِّبُ نفسه"۔ (ھذا حدیث غریب)[1]

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ تو اس کے لئے درازئ عمر کی بات (دعا) کرو کیونکہ تمہاری بات کوئی چیز (موت) دور تو کر نہیں سکتی مگر اس کے دل کو خوش کر لے گی۔

لغات: قولہ "فنفسوا له" تنفیس سے ہے، اس کے صلہ میں "عن" بھی آتا ہے، اس کے معنی خوش کرنے، تسلی دینے اور سکون بخشنے کے ہیں۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب کسی کی عیادت کرو تو اس مریض کے سامنے ہمت بڑھانے اور صحت وشفاء کی امید بیدار کرنے کی باتیں کرو مثلاً یہ تو معمولی بیماری ہے، آج کل تو اس سے زیادہ سخت بیماریوں کا علاج ایسا آسان ہے جیسے چیونٹی کا دم وغیرہ، کیونکہ ان باتوں سے اگرچہ اسے تشفی تو نہیں ہوگی اور نہ ہی تقدیر وقضاء میں ردو وبدل ممکن ہے مگر اس بیچارے کا دل تو خوش ہوگا اس کو تسلی تو ضرور ہوگی۔

اس سے ایک طرف یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اور خصوصاً پریشان حال کا دل خوش کرنا چاہئے۔ دوسری طرف عیادت کا طریقہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے سامنے خوش افزا باتیں کی جائیں، اس کے لئے درازی عمر اور شفاء کی دعاء کی جائے اور اس کو مرض کے فضائل یعنی اس کا رفع درجات کا ذریعہ ہونا اور گناہ کا کفارہ ہونا بیان کرے، اور یہ کہ موقعہ کی مناسبت سے بیٹھنے میں یہ خیال رکھے کہ کہیں مریض کو یا گھر والوں کو زیادہ بیٹھنے سے تکلیف تو نہ ہوگی، اس لئے عام آدمی کو چاہئے کہ مقدار فواقِ ناقہ سے زیادہ نہ بیٹھے الا یہ کہ زیادہ بیٹھنے میں کوئی فائدہ بیّنہ ملحوظ ہو۔

آخر ابواب الطب و اول "ابواب الفرائض"

باب

[1] الحدیث اخرجه ایضاً ابن ماجه ص: ۱۰۴ "باب ماجاء فی عیادة المریض" ابواب الجنائز. حفیظ الرحمٰن الحقی

ابواب الفرائض

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

باب ماجاء فی من ترک مالاً فَلِوَرَثَتِهِ

”عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :من ترك مالاًفَلِاَهله ومن ترك ضیاعاًفَاِلیَّ“۔ (حدیث حسن صحیح)[1]

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے (موت کے بعد) مال چھوڑا تو وہ اس کے گھر والوں (ورثہ) کا ہے، اور جو شخص محتاج اولاد چھوڑے تو وہ میرے ذمہ ہے۔

لغات: قولہ ”الفرائض“ فریضة کی جمع ہے جیسے شرائط جمع ہے شریطة کی، فرض لغت میں کاٹنے کو کہتے ہیں خصوصاً جب اس کا مفعول بہ قابل قطع چیز ہو جیسے فرض العود والثوب وغیرہما، فرض بواسطۂ حرف جر کے بھی متعدی ہوتا ہے جیسے فَرَضَ علیہ اس کے معنی لازم کردینے کے ہیں اور جب صلہ میں ”لہ“ آجائے تو بمعنی عطیہ یا حصہ مقرر کرنے کے آتا ہے جیسے ”ماکان علی النبی من حرج فیمافرض الله له“۔ (الآیۃ[2]) جبکہ اصطلاح میں فریضہ بندوں پر شارع کی طرف سے فرض ولازم کیا ہوا حق، عمل اور قانون کہلاتا ہے اور میراث کی تقسیم کو بھی کہتے ہیں کیونکہ احکام کی بھی حد بندی ہوتی ہے اور میراث کی بھی۔ اس لئے لغوی معنی قطع ان دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ علم میراث کے ماہر کو فارض اور فرضی کہتے ہیں۔ قولہ ”ضیاعاً“ اس میں ضاد کا فتحہ وکسرہ دونوں جائز ہیں، یہ دراصل مصدر ہے مگر اس کا اطلاق میت کے ان ورثہ اور اولاد پر کیا گیا ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں، چونکہ ان کے ضائع ہونے کا خطرہ رہتا ہے اس لئے ان کو ضیاع سے تعبیر کیا، پس مطلب یہ ہوا ”من ترك اولاداً وعيالاً ذوی ضیاع“۔ عارضہ میں ہے: ”اماالضیاع فهو كل من لامال له ولاقوة“۔

ابواب الفرائض عن رسول الله ﷺ

باب ماجاء من ترک مالاً الخ

[1] الحديث اخرجه ايضاً احمد فی مسنده ص: ۵۵۹ ج: ۲ حدیث: ۷۸۰۱۔ [2] سورة الاحزاب آیت: ۳۸۔

تشریح:۔ یہاں فرائض سے مراد علم میراث اور اس کے مطابق عمل درآمد کرنا ہے، اس علم کی اہمیت اگلے باب میں بیان کی گئی ہے، یہ مستقل فن کے طور پر مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس کے اصول متعلقہ کتب سراجی وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہاں نہایت اختصار کے پیش نظر اتنی سی بات کرنا مناسب ہے کہ میت کے ترکہ کے ساتھ چار قسم کے حقوق متعلق ہوتے ہیں، وہ حقوق بالترتیب یہ ہیں: (۱) سب سے پہلے تکفین وتجہیز اور تدفین کے اخراجات ہیں جو میانہ روی سے ادا کئے جائیں گے گو ان سے ساری میراث ختم ہوجائے۔ (۲) پھر جتنا مال بچا ہے اس سے سارے دیون اور قرضے وغیرہ حقوق ادا کئے جائیں۔ (۳) باقی کے ثلث میں سے وصیت کے مطابق خرچ کیا جائے اگر وصیت کی ہو اور جائز مصرف میں خرچ کرنے کے لئے کی ہو۔ (۴) چوتھے نمبر پر جو کچھ بچ جائے وہ قرآن وسنت اور اجماع امت کی ہدایات کے مطابق مستحق وارثوں میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ (کذافی السراجی)

ان تقسیمات کا ایک بڑا حصہ یہاں ترمذی کے ابواب الفرائض میں بیان ہوگا۔

حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے کوئی مال چھوڑا، تو وہ مال اس کے ورثہ کا ہے یعنی ترتیب بالا کے مطابق مگر جو شخص اپنے پیچھے ایسے بچے وغیرہ چھوڑے جو غریب ہوں اور ان کا کوئی مالی یا جانی سہارا نہ ہو تو ان کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری میری ہے، امام ترمذیؒ نے "فَإِلَيَّ" کا مطلب یہی بیان کیا ہے "ومعنی قوله: من ترك ضياعاً يعني ضائعاً ليس له شئ فالیّ يقول انا اعوله وانفق عليه"۔

اس ذمہ داری میں دیون کی ادائیگی بھی شامل ہے مگر امام نوویؒ فرماتے ہیں جیسا کہ حاشیہ پر ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے، آج کسی حکومت کی ذمہ داری نہیں کہ وہ (بغیر کفالت کے) لوگوں کے دیون ادا کرتی رہے۔

شروع میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنازہ لایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے کہ اس پر دین ہے؟ اگر اثبات میں جواب ملتا اور اس کی ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ سے فرماتے "صلوا علی صاحبکم فان علیه دینا"۔ [۳] یعنی تم نماز جنازہ پڑھو میں نہیں پڑھتا کہ اس پر دین

---

[۳] رواہ ابوداؤد ص: ۱۱۹ ج: ۲ "باب فی التشدید فی الدین" کتاب البیوع، ایضاً سنن نسائی کتاب الجنائز باب: ۶۷، سنن دارمی کتاب البیوع باب: ۵۳.

ہے، مگر جب اللہ نے مسلمانوں کو فتوحات سے نوازا اور بیت المال قائم ہوا[۴] تو غریب مدیون میت کے دیون اور اولاد کی پرورش کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اٹھالی، عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"قال ابن شهاب :فلمافتح الله عليه الفتوح قال:من توفی من المؤمنين فعلیّ قضاء ه ومن ترك مالاًفلورثته"وانفردابن شهاب بلفظ القضاء...وفيها...قال ابن شهاب هذاناسخ لتركهِ الصلوٰة عليه " (على الميت)

گوکہ ابن العربیؒ اس کو مرسل ہونے کی بناء پر مسند کے لئے ناسخ ماننے کو تیار نہیں، مدیون میت کی طرف سے کفالہ کی صحت اور عدم صحت کے حوالے سے اختلاف ودلائل اور قدرے تفصیل "باب ماجاء فی المدیون" میں گذری ہے۔(دیکھئے تشریحات ترمذی ص:۳۹۵ ج:۴، من ابواب الجنائز)

باب ماجاء فی تعلیم الفرائض

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :تَعَلَّمُوا الفرائض والقرآن وعَلِّمُوا الناس فانی مقبوض "۔ (هذاحديث فيه اضطراب الخ)[۱]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فرائض اور قرآن سیکھئے اور لوگوں کو سکھایئے کیونکہ میں لیا جانے والا ہوں۔(یعنی وفات پانے والا ہوں)

لغات وتشریح: قولہ "الفرائض" فریضہ کی جمع ہے، کمامر۔اس سے مراد یا تو علم میراث ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کی تخریج میراث کے باب میں کی ہے، اور ابواب الفرائض کے عنوان میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہ علماء کی ایک جماعت کی بھی تفسیر ہے۔اور یا مراد ہر وہ حکم ہے جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے، محشی نے اسی احتمال کو ظاہر کیا ہے۔اور لفظ قرآن بھی اس معنی کی تعیین کا قرینہ ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمام طریقے وسنن مراد ہوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (بحیثیت تشریع) صادر ہیں، علی ھذا مطلب یہ ہوا کہ قرآن وسنت سیکھو کیونکہ میں دنیا سے چلا جاؤں گا

---

[۴] كذافی حاشية صحيح البخاری ص:۳۲۳ ج:۱.

باب ماجاء فی تعليم الفرائض

[۱] الحديث روی بمعناه ابن ماجه ص:۱۹۴ ابواب الفرائض، سنن دارمی مقدمه باب:۲۴، مستدرك حاكم ص:۲۵۱ ج:۵ حديث:۸۱۱۶، ۸۱۱۷.

پھران دونوں پر اطلاع کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔(کذافی الحاشیۃ بحوالہ مجمع البحار) قولہ "وعلموا الناس" اس کا مفعول بہ مقدر ہے ای المذکور۔ قولہ "فانی مقبوض" ای سَیَقبِضُنی اللّٰہ تعالیٰ یعنی اللہ عنقریب مجھ پر موت کا پردہ ڈالنے والے ہیں، پھر یہ علم منقطع ہو جائے گا۔

اگر فرائض سے مراد میراث ہو تو اس علم کی اہمیت یہاں سے معلوم ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس کے سیکھنے کی تاکید فرمائی بلکہ اس کے سکھانے پر بھی زور دیا ہے اور جلد حصول کی ترغیب دی۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث میں اضطراب بیان کیا ہے، وجہ اضطراب یہ ہے کہ عوف سے یہ روایت مسندات ابی ہریرہؓ میں بھی مروی ہے جیسا کہ یہاں ہے اور مسندات ابن مسعودؓ میں بھی ہے، علاوہ ازیں محمد بن قاسم اور شہر بن حوشب کمزور بھی ہیں، البتہ اس مضمون کی حدیث مسند احمد، نسائی اور مستدرک حاکم میں قابل اعتبار سند سے آئی ہے۔

باب ماجاء فی میراث البنات

"عن جابربن عبداللہؓ قال جاء ت امرأۃ سعدبن الرَّبیع بابنتیھامن سعد الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقالت:یارسول اللّٰہ اھاتان ابنتاسعدبن الربیع قُتِلَ ابوھمامعك یوم احد شھیداًوان عمھمااخذمالھمافلم یَدَع لھمامالاًولاتنکحان اِلّاولھمامال،قال یقضی اللّٰہ فی ذالك فنزلت ایۃ المیراث فبعث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الی عمھمافقال:اَعطِ ابنتی سعدٍ الثُّلثین واَعْطِ امھماالثمن ومابقی فھولَكَ"۔ (ھذاحدیث حسن صحیح)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سعد بن الربیع کی بیوی سعد سے اپنی دونوں بیٹیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئی اور کہنے لگی اے اللہ کے رسول! یہ دونوں سعد کی بیٹیاں ہیں ان کا باپ آپ کے ساتھ معرکۂ احد کے دن شرکت کی بناء پر قتل کر کے شہید کیا گیا ہے اور ان کے چچا نے ان کا (سارا) مال لے لیا ہے اور ان کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے، حالانکہ ان کی شادی بغیر مال کے نہیں ہو سکے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس بارے میں اللہ فیصلہ فرمادیں گے چنانچہ میراث کی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چچا کے پاس حکم بھیجا اور فرمایا کہ سعد کی بیٹیوں کو دو تہائی حصے دے دو اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دو اور باقی (پانچ بٹا چوبیس، ۵/۲۴) آپ کا ہے۔

ترکیب:۔ قولہ "قتل ابوھمامعك الخ" اس میں معک ظرف مستقر ہے یعنی کائناً مقدر کے ساتھ

متعلق ہے ظرف لغو یعنی قتل کے ساتھ متعلق کرنا مفسدِ معنی ہے کیونکہ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ شہید ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احد میں شہید نہیں ہوئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کے ساتھ احد کے میدان میں شریک تھے اور اسی لڑائی میں شہید ہوئے۔ تدبر

تشریح:۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جس روایت میں ہے کہ ''ھاتان ابنتاثابت بن قیس بن شماس'' تو وہ غلطی اور سہو پر محمول ہے کیونکہ ثابت جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔

زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ عورتوں کو میراث میں سے حصہ نہیں دیا جاتا بلکہ مردوں اور عصبہ میں سے بھی عموماً اسی کو ملتا جو طاقت ور ہوتا، گویا زیادہ تر دارومدار بازو کی طاقت پر تھی، ذوی الفروض اور عصبہ کی تقسیم اور تمیز اس وقت نہیں تھی۔

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کے لئے زرین اصول اور ضابطوں کے مطابق عادلانہ نظام بنام اسلام نازل فرمایا تو اس میں باقی مظلوم جماعات، انواع اور افراد کی طرح عورتوں کو بھی میراث میں متعین حق دینے کا حکم فرمایا۔

باب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا ہے ''یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظِّ الانثیین فان کن نساءً فوق الاثنتین فلھن ثلثاماترک وان کانت واحدۃ فلھاالنصف''۔ (نساء آیت نمبر:۱۱، الخ)

اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ پہلے ذوی الفروض کے حصے دیئے جائیں، ذوی الفروض سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لئے قرآن میں حصے مقرر کئے گئے ایسے لوگ کل ملا کر بارہ ہیں، چار مرد اور آٹھ عورتیں، مرد یہ ہیں: (۱) باپ۔ (۲) جد صحیح یعنی دادا۔ (۳) ماں شریک بھائی اور (۴) شوہر۔ عورتیں یہ ہیں: (۱) بیوی۔ (۲) بیٹی۔ (۳) پوتی اگر چہ دور والی ہو۔ (۴) سگی بہن۔ (۵) سوتیلی بہن۔ (۶) ماں شریک بہن۔ (۷) ماں۔ (۸) جدہ صحیحہ (دادی اور نانی)۔ اگر ان سے مال بچ جائے یا ذوالفروض نہ ہوں تو پھر ما بقی پہلی صورت میں اور سارا ترکہ دوسری صورت میں عصبہ کو ملتا ہے، عصبہ کی متعدد صورتیں ہیں مگر اولین ترجیح عصبہ نسبیہ کو حاصل ہے ان میں الاقرب فالاقرب کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ (راجع للتفصیل باب معرفۃ الفروض الخ وباب العصبات، من سراجی)

چونکہ دو بیٹیوں کو ثلثان ملتے ہیں اور اولاد کی صورت میں بیوی کو ثمن ملتا ہے اس لئے حدیث الباب میں

مسئلہ ۲۴ (چوبیس) سے بنا، سولہ حصے بیٹیوں کو، تین بیوی کو، باقی پانچ رہ گئے، وہ عصوبت کی بناء پر چچا کو دے دیئے۔

یہاں یہ ضابطہ قابل لحاظ ہے کہ میراث میں تمام نسبتیں میت کی طرف ہوتی ہیں اور یہ کہ دو بنات اور دو سے زیادہ کا حکم ایک ہوتا ہے یعنی ایک کو نصف اور زیادہ کو ثلثان یہ اس وقت ہے کہ ان کے ساتھ مرد نہ ہو یعنی بلا تعصیب ورنہ تو پھر عورت کا حصہ مرد کے آدھے کے برابر ہوگا سوائے ماں شریک بہن کے کہ جب آدمی کلالہ ہو یعنی اس کے اصول وفروغ نہ ہوں، اور ایک بہن اور بھائی ماں شریک ہوں تو ہر ایک کا حصہ سُدس ہوگا اور اگر زیادہ ہوں تو سب ثلثِ مال میں برابر کے شریک ہوں گے جیسا کہ نساء آیت نمبر: ۱۲ میں ہے۔

باب ماجاء فی میراث بنت الابن مع بنت الصُلب

"عن هُزيل بن شُرَحبِيل قال جاء رجل الى ابى موسىٰ و سليمان بن ربيعة فَسَألَهُما عن ابنة وابنة ابن واختٍ لابٍ وامٍ فقالا: لِلابنة النصف ولِلاخت من الاب والام مابقىَ وقالاله انطلق اِلىٰ عبدالله فَاسأله فانه سيُتابعنا فَاَتَى عبدالله فذكرله ذالك واخبره بماقالا، قال عبدالله :قدضللتُ اِذاً ومـاانـامـن الـمهتـدين ولكنى اَقضى فيهاكماقضى رسول الله لِلابنة النصف ولابنة الابن السدس تكملة الثُلثين ولِلاختِ مابقى"۔ (هذاحديث حسن صحيح)[1]

ہزیل بن شرحبیل سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص ابوموسیٰ (اشعری) اور سلیمان بن ربیعہ کے پاس آیا اور ان سے ایک بیٹی، ایک پوتی اور سگی بہن کی (میراث کی) بابت پوچھا، تو ان دونوں نے کہا کہ آدھا ترکہ بیٹی کا ہے اور باقی (آدھا) بہن کو ملے گا (یعنی پوتی کو نظرانداز کردیا) پھر دونوں نے اس شخص سے کہا جاؤ عبداللہ (ابن مسعود) کے پاس اور ان سے پوچھو وہ بھی ہماری پیروی کریں گے (یعنی ایسا ہی جواب دیں گے) چنانچہ وہ آدمی عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس گیا اور ان سے اس فیصلے کا تذکرہ کیا اور ان دونوں کی بات سے بھی آگاہ کیا، تو عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا اگر میں ایسا فیصلہ کروں تو غلطی کروں گا اور صحیح جواب دینے والوں میں سے نہ ہوں گا لیکن میں تو (ان کے مطابق نہیں بلکہ) اس بارے میں وہی فیصلہ کروں گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا ہے بیٹی کے لئے آدھا ہے اور پوتی کو چھٹا ملے گا تا کہ ثلثین کو پورا کیا جائے اور باقی

باب ماجاء فی میراث بنت الابن مع بنت الصلب

[1] الحديث اخرجه البخارى وابوداؤد والنسائى واحمد والبيهقى بحواله سنن دارمى ص:۴۴۷ ج:۲ حديث: ۲۸۹۰، ايضاً سنن ابن ماجه ص: ۱۹۵ ابواب الفرائض.

(دوسدس ۲/۶) بہن کے ہیں۔

تشریح:۔قولہ "شرحبیل" بضم الشین وفتح الراء وسکون الحاء وکسر الباء۔ یہ واقعہ کوفہ میں اس وقت پیش آیا تھا جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بعد از ابن مسعودؓ گورنر بنالیا گیا تھا، سلیمان بن ربیعہ کوفہ کے قاضی تھے۔ (قالہ الحافظ کذا فی التحفۃ)

ان دونوں حضرات کا فیصلہ سورۂ نساء کی دو آیتوں سے ماخوذ ہے چنانچہ انہوں نے بیٹی کو آدھا دینے کو کہا کیونکہ اس آیت میں ہے: "وَاِن کَانَت واحدۃً فلھا النصف" (نساء آیت ۱۱) اور بہن کو آدھا دینے کا حکم اس آیت سے لیا: "اِن اِمرُؤٌ اھلك لیس له ولد وله اخت فلھا نصف ماترك"۔ (نساء آیت نمبر: ۱۷۶)

پہلی آیت میں ہے کہ اگر بیٹی ایک ہے تو اس کو آدھا ملے گا، اور دوسری میں ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کی سگی بہن کو تمام ترکہ کا آدھا دیا جائے گا، اب جب دونوں کو آدھا آدھا مل گیا تو پوتی کے لئے کچھ بھی نہ بچا، یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے دوسری آیت سے مسئلہ اخذ کیا ہو اور غلط فہمی "ولد" کے لفظ سے ہوئی کہ انہوں نے اس سے مراد بیٹا یعنی نرینہ اولاد لے لی جبکہ علم میراث میں ولد بمعنی مولود یا بمعنی مطلق اولاد ہوتا ہے پھر ولد، پوتے اور پوتی کو بھی شامل ہے جبکہ ان حضرات نے صرف صلبی اولاد تک محدود سمجھا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ پوتی کا حصہ قرآن میں نہیں ہے، جبکہ ابن مسعودؓ سمجھ رہے تھے کہ ولد بمعنی اولاد ہے اور پوتے، پوتیاں بھی اولاد ہوتی ہیں، اس لئے انہوں نے سابقہ فیصلہ کی موافقت سے انکار فرمایا، پھر دارقطنی کی روایت میں ہے کہ: "وقد سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول الخ" چونکہ بیٹی بمقابلہ پوتی کے اقرب ہے لہٰذا قوت قرابت کی وجہ سے اس کو نصف ملا، چونکہ بنات کا حصہ ثلثان سے زیادہ نہیں ہوسکتا، اس لئے پوتی کو سُدس دیا تاکہ ثلثان کو پورا کیا جائے، باقی دوسدس بچ گئے وہ حقیقی بہن کے ہوئے، پس مسئلہ کی تصحیح چھ (۶) سے ہوئی۔

مسئلہ ۶

بنت	بنت الابن	اُخت	
۳	۱	۲	=۶

باب ماجاء فی میراث الاخوۃ من الاب والام

"عن علی انه قال انکم تقرؤون هذه الآیة "من بعد وصیّة توصون بها او دین" وان رسول الله صلی الله علیه وسلم قضیٰ بالدین قبل الوصیة وان اعیان بنی الأمّ یرثون دون بنی العلّات الرجلُ یرث اخاه لابیه وامه دون اخیه لابیه"۔ (وکذا رواه احمد والحمیدی وابن ماجه)[1]

حضرت علیؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ تم لوگ اس آیت کو پڑھتے ہو"من بعد وصیة الخ" (یعنی اس میں بظاہر وصیت مقدم ہے دین پر) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت سے پہلے دین کی ادائیگی کا حکم کیا ہے اور یہ کہ حقیقی (سگے) بہن بھائی وارث ہوں گے نہ کہ علاتی (یعنی سوتیلے) آدمی اپنے حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے علاتی (سوتیلے) کا نہیں۔

لغات:۔قولہ "اعیان بنی الام" عین کی طرف منسوب ہے جو بمعنی نفس اور ذات کے آتا ہے، مراد حقیقی بھائی ہے کہ وہ گویا اس کی جڑ کی دوسری شاخ ہے۔قولہ "دون بنی العلات" علة سوکن کو کہتے ہیں تو بنو العلات سے مراد باپ شریک یعنی سوتیلے بھائی ہیں، "عَلٌ" لغت میں دوسری بار پینے کو کہتے ہیں، وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

تشریح:۔علم بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کبھی کسی چیز کو اہمیت اور مقتضائے حال کی بناء پر مقدر کیا جاتا ہے چونکہ انسان طبعاً بخیل ہوتا ہے اور وصیت میں مطالبہ کرنے والے لوگ بھی عموماً نہیں ہوتے ہیں بخلاف دین کے کہ دائنین خود اس کو وصول کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں، اور ورثہ کے لئے روکنا ممکن یا آسان نہیں ہوتا، اس لئے وصیُت کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لئے اور تاکید کرنے کے لئے آیت میں اس کا ذکر دین پر مقدم کیا، غرض تقدیم ذکری سے یہ نہ سمجھا جائے، کہ یہ حکماً بھی مقدم ہے، حضرت علی رضی اللہ اسی قاعدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صریح منقول پیش کر رہے ہیں تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

پھر اس آیت میں "من بعد وصیة توصون بها او دین"[2] لفظ "او" بمعنی واو کے ہے، کیونکہ کبھی دونوں بھی ہوتے ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ "او" مانعۃ الجمع کے لئے نہیں ہے۔

باب ماجاء فی میراث الاخوۃ من الاب والام

[1] سنن ابن ماجه ص:۱۹۷ "باب میراث العصبة" ابواب الفرائض، مسند احمد ص:۱۲۸ ج:۱ حدیث:۱۲۲۶، ایضاً ص:۱۰۲ و ۱۳۲۔ [2] سورة النساء آیت:۱۲۔

"الرجل یرث اخاہ لابیه وامه دون اخیه لابیه" یہ جملہ ماقبل کی تفسیر ہے یعنی اگر کسی کے ماں باپ شریک بھائی موجود ہوں تو وہ صرف باپ شریک بھائی پر مقدم ہوں گے، یعنی عینی وحقیقی بھائی علاتی وسوتیلے پر مقدم ہے حق میراث میں، چونکہ عربوں میں قرابت کا اصل دارومدار باپ کے رشتے پر ہوتا تھا، عورت کی رشتہ داری کی نسب وحسب میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی، دوسری طرف قرآن میں لفظ''اخوۃ'' مطلق آیا تھا جس سے یہ تو ہم ہوسکتا تھا کہ سگے بھائی اور سوتیلے میراث کے استحقاق میں برابر ومساوی ہوں گے تو اس شبہے کے ازالہ کے لئے فرمایا:''وان اعیان بنی الام یرثون دون بنی العلات ''اس میں''ام'' کا ذکر بطور خاص کر کے واضح کردیا کہ میراث میں کوئی بھی قرابت خواہ باپ کی وجہ سے ہو یا ماں کی طرف سے مرجحات میں سے ہے تو چونکہ اعیانی بھائیوں کے ساتھ دو قرابتیں ہوئیں اور سوتیلے کے ساتھ فقط ایک، اس لئے قوت قرابت کی وجہ سے اعیانی مقدم ہوں گے، سراجی میں ہے:

"ثم یرجحون بقوۃ القرابة اعنی ذاالقرابتین اولی من ذی قرابة واحدة ذکراً کان اواُنثیٰ لقول علیه السلام ان اعیان بنی الام یتوارثون دون بنی العلات"۔

(سراجی ص:۱۴، باب العصبات)

پس مطلب یہ نکلا کہ سگے بھائی نہ ہونے کی صورت میں سوتیلے مستحق ہوں گے، اس روایت میں اگرچہ حارث متکلم فیہ ہے مگر پھر بھی روایت پر عمل متفقہ ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ روایت کی قوت اور ضعف کا دارومدار صرف راویوں کی حالت پر نہیں ہے بلکہ امت اور مجتہدین کا تعامل بھی قابل لحاظ ہے:

"قال السخاوی فی فتح المغیث بشرح الفیة الحدیث، وکذااذاتلقت الامة الضعیف بالقبول یعمل به علی الصحیح حتی انه ینزل منزلة المتواترفی انه ینسخ المقطوع به ولهذاقال الشافعی رحمه اللّٰه فی حدیث: لاوصیة لوارث انه لایثبته اهل الحدیث ولکن العامة تلقته بالقبول وعملوابه حتی جعلوه ناسخاً لِآیة الوصیة"۔ (ماتمس الیه الحاجة لمن یطالع سنن ابن ماجة ص:۲۴)

باب میراث البنین مع البنات

"عن جابر بن عبداللّٰہ قال جاء نی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :یعودنی وانامریض فی بنی سَلِمة فقلتُ یانبی اللّٰہ! کیف اقسم مالی بین ولدی؟فلم یَرُدَّ عَلَیَّ شیئاًفنزلت: "یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم للذکرمثل حظ الانثیین "الایة۔ (حسن صحیح)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس میری عیادت کے لئے تشریف لائے جبکہ میں بنی سلمہ میں بیمار پڑا تھا، میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی! میں اپنا مال اپنے بچوں میں کس طرح تقسیم کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا، پس یہ آیت نازل ہوئی ''یوصیکم اللّٰہ الخ''۔[1]

تشریح:۔ بنوسَلِمہ بفتح السین وکسر اللام، خزرج کی شاخ اور حضرت جابرؓ کا قبیلہ ہے۔

پہلا اشکال:۔ یہاں یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ اس وقت تو حضرت جابرؓ کی کوئی اولاد نہ تھی بلکہ نو (۹) بہنیں تھیں جیسا کہ اگلے باب کی روایت میں ہے، اور صحیحین[2] کی روایت میں ہے: ''فقلتُ یارسول اللّٰہ!انمایرثنی کلالة''۔ اور بخاری کی ایک اور روایت میں بھی بہنوں کی تصریح ہے: ''انمالی اخوات''[3] تو اس طرح ان روایات میں تعارض آ گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو ''ولدی'' کا لفظ حدیث باب میں راوی کے ''وہم'' پر مبنی ہے یا پھر چونکہ وہ بہنیں عمر میں ان سے چھوٹی تھیں اور چھوٹوں پر اولاد اور بچوں کا اطلاق ہوتا ہے گو مجازاً ہوتا ہے۔ (قالہ الکنکوھی فی الکوکب)

دوسرا اشکال:۔ یہ ہے کہ ''یوصیکم اللّٰہ الخ'' یہ آیت تو حضرت سعد بن ربیعؓ کی بیوی کے استفسار کے جواب میں نازل ہوئی تھی اور خود حضرت جابرؓ کی حدیث بھی سابقہ ''باب ماجاء فی میراث البنات'' میں اس کی تصریح کرتی ہے، جبکہ حضرت جابرؓ کے قصہ میں تو سورۂ نساء کی آخری آیت نازل ہوئی تھی تو یہ بھی تعارض ہے، ابوداؤد میں بھی اس کی تصریح ہے: "قال فنزلت ایة المیراث "یستفتونک قل اللّٰہ یفتیکم فی

باب میراث البنین مع البنات

[1] سورة النساء آیت: ۱۱۔ [2] صحیح بخاری ص: ۳۲ ج: ۱ "باب صب النبی ﷺ وضوءہ الخ" کتاب الوضوء، صحیح مسلم ص: ۳۴ ج: ۲ کتاب الفرائض [3] صحیح بخاری ص: ۹۹۸ ج: ۲ "باب میراث الاخوة والاخوات" کتاب الفرائض۔

الـكلالة" ۔[۲] (باب فی الکلالۃ، اول کتاب الفرائض وایضاً باب من کان لیس لہ الخ ص:۳۹۹) اور ترمذی کے اگلے باب میں بھی ایسا ہی ہے۔

پہلا جواب:۔ اس کا ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ ترمذی کی اس باب والی حدیث میں راوی سے وہم ہوگیا ہے، پس کہا جائے گا کہ اس حدیث میں دو موقعوں پر وہم پایا جاتا ہے۔

دوسرا جواب:۔ یہ ہے کہ اس روایت میں "یوصیکم اللّٰہ" الایۃ سے مراد میراث کا حکم ہے جو سب کو شامل ہے۔ فلا اشکال

تیسرا جواب:۔ یہ ہے کہ کبھی ایک حکم کے نزول کے متعدد اسباب ہوسکتے ہیں لہٰذا کبھی راوی ایک سبب ذکر کرتا ہے اور کبھی دوسرا۔ (قالہ السیوطی فی الاتقان)

راقم نے اسباب نزول کی روایات میں تطبیق اور ترجیح کے اصول "زاد یسیر فی علوم التفسیر" اور پرانے نام کے مطابق "الزاد الیسیر فی مقدمۃ التفسیر" میں ذکر کئے ہیں جن کو اس میں یا "الاتقان" میں دیکھا جاسکتا ہے۔

باب میراث الاخوات

"عن جابر بن عبداللّٰہ قال مرضتُ فاتانی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یعودنی فوجدنی قد اُغمِیَ عَلَیَّ فاتانی ومعہ ابوبکر وھما ماشیان فتوضأ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فَصَبَّ عَلَیَّ من وضوءِہ فَاَفَقْتُ فقلتُ یارسول اللّٰہ! کیف اَقضِی فی مالی او کیف اصنع فی مالی؟ فلم یُجِبْنی شیئاً وکان لہ تسع اخوات حتی نزلت اٰیۃ المیراث "یستفتونک قل اللّٰہ یفتیکم فی الکلالۃ" الاٰیۃ قال جابر: فیَّ نزلت۔ (حسن صحیح)[۱]

حضرت جابرؓ سے محمد بن المنکدرؒ نے یہ فرماتے سنا ہے کہ میں بیمار ہوگیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے وہ میری عیادت کرنا چاہتے تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پایا جبکہ میں بے ہوش ہو چکا تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور ان کے ہمراہ ابوبکرؓ بھی تھے، دونوں پیدل تھے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور وضو کے پانی میں سے کچھ میرے اوپر ڈالا تو مجھے افاقہ ہوا، میں نے

---

[۲] سورۃ النساء آیت:۱۷۶۔

باب میراث الاخوات

[۱] ایضاً اخرجہ مسلم ص:۳۴ ج:۲ کتاب الفرائض۔

فوراً پوچھا اے اللہ کے رسول! میں اپنے مال کے بارے میں کیسے فیصلہ کروں؟ یا فرمایا (راوی کو شک ہے) میں اپنے مال میں کیا طریقہ اختیار کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، اس وقت ان کی نو (۹) بہنیں تھیں یہاں تک کہ یہ آیت میراث نازل ہوئی: ''یستفتونك الخ ''الایۃ۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ یہ میرے ہی بارے میں نازل ہوئی۔

تشریح:۔ کلالہ وہ ہے جس کے اصول وفروع یعنی والد اور ولد کوئی نہ ہو اور دیگر ورثہ ہوں، حضرت تھانوی صاحبؒ ''المسک الذکی'' میں فرماتے ہیں کہ: اس میں تین صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ فقط ہمشیرہ ہی ہو۔ اور دوسری یہ ہے کہ فقط بھائی ہوں اور بہن کوئی نہ ہو۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ بھائی بہن دونوں ہوں۔ پہلی صورت میں سب کو سُدس، سُدس ملے گا۔ اور دوسری صورت میں سب کو برابر ملے گا۔ اور تیسری صورت میں لڑکے کو دوہرا اور بہن کو اکہرا، لیکن عینی بھائی سے علاتی بھائی بہن سب ساقط ہو جاتے ہیں۔

اس حدیث سے ایک طرف عیادت کی سُنیّت معلوم ہوئی اور دوسری طرف پیدل چلنے کی فضیلت یعنی ہو سکے تو پیدل چلنا افضل ہے جیسا کہ جمعے کے بارے میں ''ولم یرکب ''کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، اور یہ کہ وضوء کا مستعمل پانی پاک ہے گو کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت الگ ہے کہ ان کے مستعمل پانی میں اللہ نے شفاء رکھی تھی، تاہم عام لوگوں کے مستعمل پانی سے بچنا افضل ہے چنانچہ ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے: ''الاولیٰ اَن لایصلی علی مندیل الوضوء الذی یمسح به ''۔ (الاشباہ ص ۱۶۶، کتاب الصلوٰۃ) اسی طرح داڑھی وغیرہ کا پانی بھی مسجد میں نہ جھاڑے، اس حدیث سے حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت معلوم ہوئی، اور یہ کہ بڑے بھی چھوٹوں کی عیادت کریں۔

باب ماجاء فی میراث العصبة

''عن ابن عباس عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: اَلحِقُوا الفرائض بِاهلِها فما بقی فهو لِاَولیٰ رَجُل ذَکَرٍ ''۔ (حدیث حسن)[1]

باب ماجاء فی میراث العصبة

[1] الحدیث اخرجه البخاری فی کتاب الفرائض ''باب میراث الولد من ابیه وامه'' ومسلم فی کتاب الفرائض ''باب الحقوا الفرائض باهلها'' ابوداؤد کتاب الفرائض ''باب فی میراث العصبة'' والنسائی وابن ماجه واحمد فی مسنده بحواله سنن دارمی ص: ۳۶۴ ج: ۲، ایضاً رواه الحاکم فی المستدرک ص: ۲۵۷ ج: ۵ حدیث: ۸۱۶۳.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ (پہلے) صحاب فروض کو ان کے حصے دو اور جو مال رہ جائے تو وہ قریب تر آدمی کے لئے ہے۔

لغات: ۔قولہ "العصبة" لغت میں عصب پٹھے کو کہتے ہیں جو ایک مضبوط واصل کو کہتے ہیں، مراد وہ ورثہ ہیں جو ذوی الفروض کے بعد باقی اور ان کی عدم موجودگی میں سارا مال لیتے ہیں۔قولہ "الحقوا" بفتح الھمزہ وکسر الحاء" ای اوصلو "یعنی پہنچاؤ اور ولا دو ادا کرو وغیرہ۔قولہ "لِاولی" "ای لِاقرب" یعنی میت کے سب سے قریب تر۔قولہ "ذکر" یہ تقیید اس لئے ہے کہ مرد عصوبت میں اصل ہے اور عورت مرد کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے گویا یہ رجل کی تاکید ہے تاکہ ذکورت کو اُجاگر کیا جائے۔

تشریح: ۔حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اصحاب فروض جب اپنے اپنے مقررہ حصے لے لیں اور پھر بھی کچھ بچ جائے تو اگر عصبہ موجود ہوں تو وہ بچا ہوا مال دوبارہ ذوی الفروض پر تقسیم نہ ہوگا بلکہ وہ عصبہ کو دیا جائے گا، پھر عصبہ میں سے اولاً اس کا حق بنتا ہے جو میت سے اقرب ہو ثم الاقرب فالاقرب مثلاً اگر میت کا بیٹا ہو تو وہ پوتے پر اور باقی بھائیوں اور چچا وغیرہ سب پر مقدم ہے، پھر پوتا ہے پھر باپ ہے۔

اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ عصبہ نسبیہ جو اصل ہے عصوبت میں، تین طرح کے ہیں: (۱) عصبہ بنفسہ (۲) بغیرہ (۳) مع غیرہ۔

عصبہ بنفسہ: ۔کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اور میت کے درمیان کسی عورت کا واسطہ نہ ہو لہٰذا کہا جائے گا کہ یہ قسم اول وہ مرد ہے جس کا نسب میت سے، بغیر واسطہ عورت کے ہو جبکہ دوسری اور تیسری قسمیں دونوں عورتوں پر مشتمل ہیں، پھر عصبہ بغیرہ جیسے بہن اپنے بھائیوں کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے اور عصبہ مع غیرہ جیسے بہن، بیٹی کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے، پھر عصبہ بنفسہ کی آپس میں چار قسمیں ہیں، سراجی میں ہے:

"اما العصبة بنفسه فكل ذكر لاتدخل فی نسبة الی المیت أنثیٰ وهم اربعة اصناف: (۱) جزء المیت (۲) واصله (۳) وجزء ابیه وجزء جده الاقرب فالاقرب"۔

یعنی میت کی اولاد، اس کے اصول باپ دادا، میت کے باپ کے اجزاء یعنی بھائی اور اس کے دادا کے اجزاء یعنی چچا، اور اس کے ساتھ ان سب کے اصول وفروع۔

"وان علاوان سفلوا".. قال: یرجحون بقرب الدرجة اعنی أولٰهم بالمیراث جزء

المیت ای البنون ثم بنوھم وان سفلواثم اصلہ ای الاب ثم الجد، ای اب الاب وان علا ثم جزء ابیہ ای الاخوۃ ثم بنوھم وان سفلواثم جزء جدہ ای الاعمام ثم بنوھم وان سفلواثم یرجحون بقوۃ القرابۃ اعنی بہ ان ذاالقرابتین اولی من ذی قرابۃ واحدۃ ذکراًکان اوانثیٰ "الخ۔ (سراجی ص:۱۴، باب العصبات)

باب کی روایت اگر چہ مرسل ہے مگر کثرت طرق کی وجہ سے اور بعض اسانید میں موصول ہونے کی بنا پر قابل عمل وقابل حجت ہے۔

باب ماجاء فی میراث الجد

"عن عمران بن حُصین قال جاء رجل الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال:اِنَّ ابنَ اِبنی مات فمالی من میراثہ؟فقال لک السُدس،فلماوَلّیٰ دعاہ فقال:لَکَ سدس آخر،فلمّاوَلّیٰ دعاہ قال:ان السدس الآخرلَکَ طُعمۃ"۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگا کہ میرا پوتا فوت ہوگیا ہے تو مجھے اس کی میراث میں سے کیا ملے گا؟ (یعنی کتنا ملے گا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے لئے چھٹا حصہ ہے جب وہ شخص جانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا اور فرمایا تجھے ایک سُدس (چھٹا) اور ملے گا، چنانچہ جب وہ جانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھر بُلایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوسرا سُدس (چھٹا) تیرے لئے کھانے کو زائد دیا ہے۔

تشریح:۔اس مسئلہ کی تصویر یہ ہے جیسا کہ حاشیہ پر ہے کہ میت کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک دادا، جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ لڑکیوں کو ثلثان سے زیادہ نہیں ملتا دوسری طرف دادا بمنزلہ باپ کے ہے اس لئے اولاد کی صورت میں اس کا حصہ سُدس یعنی چھٹا بنتا ہے،قال اللّٰہ تعالیٰ:وَلِاَبَوَیہِ لِکل واحد منھماالسُدُسُ مما ترک ان کان لہ ولد "۔(نساء آیت نمبر:۱۱) اس لئے مسئلہ کی تصحیح چھ سے ہوئی، بیٹیوں کو ثلثین یعنی چار حصے ملے اور سُدس یعنی چھٹا دادا کو بطور فرض دیا، ایک بچ گیا وہ دادا کو بطور تعصیب دیا کیونکہ دادا ذوی الفروض اور عصبہ دونوں میں سے ہے۔

مسئلہ ۶

بنتان	جد	ع
۴	۱	۱ = ۶

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دونوں حصے ایک ساتھ اس لئے نہیں دیئے کہ ایسا کرنے سے سابقہ حکم کی تنسیخ کا شبہ پیدا ہو سکتا تھا، اس لئے دونوں حکموں کو اُجاگر کرنے کے لئے الگ الگ کر کے دیئے تا کہ صاف طور سے معلوم ہو کہ جد کا حصہ ثلث نہیں بلکہ سُدس ہے اور دوسرا سدس بطور تعصیب کے ہے، پھر اس کو طمعۃ سے تعبیر کیا تا کہ مزید تصریح ہو کہ اس سے پہلا فرض متغیر نہ ہو گا وہ بدستور سدس ہی ہے اور رہے گا۔

اس کی مثال ذخیرۂ احادیث میں اور بھی ملتی ہیں مثلاً عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے اپنی نابینا پن کا عذر پیش کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر پر نماز نماز پڑھنے کی اجازت چاہی کہ مثلاً اندھیرے میں لانے والا کوئی نہ ہو تو میں گھر پر نماز پڑھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی مگر جب وہ جانے لگے تو پھر بُلا کر پوچھا کہ اذان سنتے ہو انہوں نے فرمایا ''ہاں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آیا کرو، اس میں پہلے اجازت، عام حکم ہے کہ معذورین گھر پر نماز پڑھ سکتے ہیں اور دوسرا ابن ام مکتومؓ کی خصوصیت ہے، اگر یہی حکم پہلی بار ارشاد فرماتے تو یہی حکم معلوم ہوتا کہ دیگر معذورین بھی نماز کے لئے مسجد میں آیا کریں۔ تدبر

ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جد کا مسئلہ انتہائی مشکلات میں سے ہے اور اس سے اصول شرع میں نظر اور قیاس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ دین میں قیاس ایک زرین اصول ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر مسئلہ منصوص نہیں ہوتا ہے، یعنی بعض مسائل مستنبط بھی ہوتے ہیں، غیر مقلدین کو یہ نکتہ نوٹ کر لینا چاہئے کہ قیاس کتنا اہم ہے، نیز اہل قرآن کے نام سے جو لوگ انتشار پھیلاتے ہیں وہ بھی بتائیں کہ قرآن میں جد کا حصہ کیا ہے؟

''العرف الشذی'' میں ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک دادا باپ کی طرح بھائیوں کے لئے حاجب بنتا ہے جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک دادا بھائیوں کے ساتھ شریک ہو گا یعنی ان کا حصہ ساقط نہیں کر سکتا۔ امام صاحب کی طرح قول، ابو بکر صدیق، ابن عباس، حضرت عائشہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اور ابو داؤد اور بہت سے تابعین کا قول بھی یہی ہے کہ: ''ان الجد یسقط الاخوۃ والاخوات کالاب''۔ جبکہ جمہور کا مذہب وہی ہے جو صاحبینؒ کا ہے۔ (کذا فی التحفۃ) تحفہ میں یہ بھی ہے کہ صحابہ کرامؓ میں یہ مسئلہ اختلافی رہا اور بہت سے صحابہ کرامؓ حتی کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل المنقبت صحابی بھی اس میں بحث سے بچتے تھے۔

"قال وھذاالتحذیرو الوعیدوماقیل فی شانه فی ذالك الوقت انماھوقبل تدوین المذاھب الاربعة واستقرارالامرعلیھاعندکل مجتھدمن الائمة الاربعة ومقلدیھم ولاصعوبة حینئذٍ فی الافتاء" الخ۔

تفصیل کے لئے دیکھئے تحفۃ الاحوذی اسی باب کی شرح میں۔

غیر مقلدین کو ائمہ مجتہدین کے کام کی اہمیت کو تسلیم کر لینا چاہئے۔

باب ماجاء فی میراث الجدة

"عن قبیصة بن ذویب قال جاء ت الجدة اُمُّ الامِّ،اواُمُّ الاب الی ابی بکرفقالت:ان ابن ابنی او (قالت)ان ابن ابنتی مات وقداُخبِرتُ ان لی فی الکتاب حقاً،فقال ابوبکر:مااَجِدُ لَكِ فی الکتاب من حق وماسمعتُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قَضیٰ لَكِ بشیٔ وَسَأَسْئَلُ الناس،قال فسأَلَ الناس فشھد المغیرة بن شعبة ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اَعطاھاالسدس،قال :ومن سمع ذالك معك؟قال محمدبن مسلمة قال:فاعطاھاالسدس ثم جاء ت التی تخالفھاالی عمرقال سُفیٰن وزادنی فیه معمرعن الزھری ولم احفظه عن الزھری ولکن حفظته من معمراَنَّ عمرقال:اِن اجتمعتمافھولکماوَاَیَّتُکُمااِنفردت به فھولھا"۔[1]

حضرت قبیصہ بن ذویب (بالتصغیر) سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک جدہ ماں کی ماں (نانی) یا باپ کی ماں (دادی) ابوبکرؓ کے پاس آکر کہنے لگی کہ میرا پوتا یا نواسا (یعنی اگر دادی تھی تو کہا میرا پوتا اور اگر نانی تھی تو کہا کہ نواسا) فوت ہو گیا ہے، اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اللہ کی کتاب میں میرا حق بیان کیا گیا ہے، تو ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تو تیرا کوئی حق نہیں پا رہا اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے تیرے (جدہ کے) حق میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے کچھ سُنا ہے البتہ میں جلد لوگوں سے پوچھتا ہوں، راوی نے فرمایا کہ انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہ بن شعبہ نے گواہی دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جدہ کو سدس دیا تھا، ابوبکرؓ نے فرمایا تیرے ساتھ اور کس نے سنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ محمد بن مسلمہ نے (باب کی اگلی روایت

باب ماجاء فی میراث الجدة

[1] روی بمعناه ابوداؤد وابن ماجه، وابن حبان والبیهقی، قال ابن حجر: واسناده صحیح لثقة رجاله الا ان صورته مرسل بحواله سنن دارمی ص: ۴۵٦ ج: ۲ حدیث: ۲۹۳۹، ایضاً مستدرک حاکم ص: ۲۵۷ ج: ۵ حدیث: ۸۱۴۴.

میں ہے کہ محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر مغیرہ بن شعبہ کی طرح بات کی) چنانچہ ابوبکرؓ نے جدہ کو سدس دے دیا پھر دوسری جانب والی جدہ حضرت عمرؓ کے پاس آئی (یعنی اگر حضرت ابوبکرؓ کے پاس دادی آئی تھی تو عمرؓ کے پاس نانی آئی و بالعکس) سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ معمر نے زہری کے حوالے سے مجھے یہ اضافہ بھی بیان کیا ہے، جو میں نے خود زہری سے یاد نہیں کیا ہے بلکہ مجھے معمر کی زبان سے سُن کر یاد ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم دونوں یعنی دادی و نانی جمع ہوں تو یہ سدس آپ کا مشترک ہوگا اور جو بھی اکیلی ہوگی تو سُدس پورا اس کو ملے گا۔

تشریح:۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ جدہ ایک ہو یا زیادہ، دادی ہو یا نانی اس کا حصہ سدس ہے، ایک ہونے کی صورت میں پورا اور زیادہ ہونے کی حالت میں برابر تقسیم کیا جائے گا، صحابہ کرامؓ کے سامنے ہوا اور کسی نے اعتراض نہیں کیا، لہٰذا یہ اجماع تصور کیا جائے گا۔

البتہ یہاں کچھ شرائط ہیں جو قابل ذکر ہیں جیسا کہ سراجی میں ہے:

"وللجدة السدس لِام كانت اولاب واحدة كانت او اكثراذاكن ثابتات متحاذيات فى الدرجة وَيَسقُطنَ كلهن بالام والابوياتُ ايضاًبالاب وكذالك بالجد اِلّام الاب وان علت فانهاترثُ مع الجد لانهاليست من قِبَلِه والقُربىٰ من اَيِّ جهةٍ كانت تحجبُ البُعدىٰ من اَيِّ جهةٍ كانت وَارِثَةً كانت القُربىٰ اومحجوبة الخ"۔

یعنی جدہ کا حصہ چھٹا ہے خواہ نانی ہو یا دادی، ایک ہو یا زیادہ بشرطیکہ صحیحات ہوں (یعنی درمیان میں جدِّ فاسد حائل نہ ہو، جدِ فاسد وہ ہے جس کے اور میت کے درمیان عورت کا واسطہ ہو جیسے نانا) اسی طرح درجہ میں یعنی واسطوں میں مساوی ہوں، اگر ماں موجود ہو تو جدات ساری ساقط ہو جاتی ہیں جبکہ دادیاں باپ کی وجہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہیں، اسی طرح دادیاں، دادا کے ہوتے ہوئے بھی محروم ہوتی ہیں سوائے باپ کی ماں کے کہ وہ دادا کے ساتھ بھی وارث بنتی ہے کیونکہ اس کا قرب میت سے (یعنی اپنے پوتے سے) دادا کے واسطے سے نہیں (بلکہ اپنے بیٹے کے واسطے سے ہے) اور قریب والی جدہ کوئی بھی ہو دور والی کے لئے حاجب بنتی ہے خواہ کسی جہت سے بھی ہو، اسی طرح حاجبہ خود وارث ہو یا نہ ہو مگر دور والی کو محروم کرتی ہے۔ (راجع للتفصیل ان شئتَ السراجی ص۱۲ و ص۱۳ من فصل فی النساء)

اس روایت پر اگرچہ انقطاع کا اعتراض ہے کہ قبیصہ کا سماع حضرت ابوبکرؓ سے ثابت نہیں مگر باب کی

اگلی روایت بلاشبہ صحیح ہے چونکہ مضمون دونوں کا ایک ہی ہے اس لئے یہ بھی صحیح ہوئی۔ ولذا قال الترمذی بعده وهو اصح من حديث ابن عيينة۔

باب ماجاء في ميراث الجدة مع ابنها

"عن عبدالله بن مسعود قال في الجدة مع ابنها: انها اول جدة اطعمها رسول الله صلى الله عليه وسلم سدساً مع ابنها وابنها حيٌّ"۔ (هذا حديث لانعرفه مرفوعاً الا من هذا الوجه الخ)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے جو دادی کے بارے میں جس کا اپنا بیٹا بھی موجود ہو فرماتے ہیں کہ وہ پہلی جدہ ہے جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کے ہوتے ہوئے سدس دیا ہے جبکہ بیٹا بھی زندہ تھا۔

تشریح:۔ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ علم میراث میں تمام نسبتیں میت کی طرف ہوتی ہیں، لہٰذا اس حدیث میں ابن کی نسبت میت کی طرف نہ سمجھی جائے بلکہ جدہ کی طرف جیسا کہ ضمیر "ها" سے واضح ہے پس جدہ کے بیٹے سے مراد میت کا باپ ہے

اس بارے میں جمہور کا مذہب اور مُفتیٰ بہ قول وہی ہے جو سابقہ باب میں گذرا کہ باپ کے ہوتے ہوئے دادی میراث نہیں لے سکتی "والابويات ايضاً (يسقطن) بالاب"۔ (سراجی) اور محشی نے بھی نقل کیا ہے اگرچہ اس بارے میں بعض صحابہ کرامؓ جیسے حضرت عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم باپ کے ساتھ دادی کے حق وراثت کے قائل ہیں۔ حدیث الباب ان کی دلیل ہے، امام ترمذیؒ نے بھی اس بارے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف نقل کیا ہے۔

جمہور کا اصولی استدلال یہ ہے کہ باپ موجود ہو تو وہ دادی کے لئے حاجب بنتا ہے اور حاجب کے ہوتے ہوئے محجوب وارث نہیں بن سکتا، چونکہ یہ استدلال بنیادی اور صحیح اصول وقواعد پر مبنی ہے اس لئے باب کی حدیث میں تاویل ناگزیر ہے جیسا کہ ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں: "ومراعات القواعد اولیٰ من مراعاة الالفاظ"۔ اسی قاعدے کی بناء پر وہ صوم عن المیت کے جواز والوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "فراعیٰ لفظاً وهدم اصلاً"۔ (دیکھئے عارضۃ الاحوذی ص۱۹۱ ج۳، باب ماجاء فی الصوم عن المیت یا تشریحات ترمذی ص۲۶۰ ج۳، باب ماجاء فی الصوم عن المیت)

باب کی حدیث کا جواب:۔ایک تو یہ ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اشارہ کیا ہے، اسی باب کے تحت عارضہ میں: ''ولم یثبت ''یعنی یہ حدیث ثابت نہیں ہے، لہٰذا جمہور کے اصولی استدلال پر اثر نہیں پڑتا، کہ محمد بن سالم ضعیف ہے۔ یا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وارث یعنی باپ کی خوشی اور رضامندی سے دادی کو بطور نفل دے دیا تھا نہ کہ بطور فرض، لفظ ''اَطْعَمَهَا'' اس کا قرینہ ہے۔

باب ماجاء فی میراث الخال

"عن ابی اُمامة بن سهیل بن حُنیف قال کتب معی عمربن الخطاب الی ابی عُبیدة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال:اللّٰهُ ورسولُه مولیٰ من لامولیٰ له والخالُ وارث من لاوارث له"۔ (حدیث حسن صحیح)[۱]

ابوامامہ بن سُہیل سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ عمر بن الخطاب نے میرے ہاتھ پر ابوعبیدہ کو لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے مددگار ہیں جس کا کوئی مددگار نہ ہو اور یہ کہ ماموں اس شخص (بھانجے) کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔

تشریح:۔یعنی عالم اسباب میں جس کا کوئی معاون نہیں تو اللہ اس کا بطور خاص مددگار ہے۔ یہ خط دراصل ابوعبیدۃ بن جراح کے خط کا جواب تھا جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مقتول کی میراث کے بارے میں پوچھا تھا، جس کا سوائے ماموں کے کوئی دوسرا وارث نہیں تھا، حضرت عمرؓ کے جواب اور باحوالہ مرفوع حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ دیگر ورثہ نہ ہونے کی صورت میں ماموں وغیرہ ذوی الارحام میراث کے مستحق ہیں۔ امام ترمذیؒ نے اس کو جمہور کا مذہب قرار دیا ہے، فرماتے ہیں: ''والی هذاالحدیث ذهب اکثراهل العلم فی توریث ذوی الارحام ''اس کے برعکس حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مالکیہ وشافعیہ کے نزدیک ذوی الارحام کی موجودگی کے باوجود میراث بیت المال میں جمع ہوگی ماموں وغیرہ کو نہیں دی جائے گی، حنفیہ کا مذہب وہی ہے جو جمہور اور اکثر اہل علم کا ہے یعنی ذوی الارحام کو میراث ملنے کا۔

باب ماجاء فی میراث الخال

[۱] رواه النسائی والدارقطنی وابن ماجه، قال الالبانی فی صحیح الجامع ۱/۳۹۶ "حسن" سنن دارمی ص:۴۳ ج:۲ حدیث:۲۹۷۷، ایضاً رواه مستدرک حاکم ص:۲۶۲ ج:۵ حدیث:۸۱۷۰.

ذوی الارحام کون ہیں؟؟؟ تو سراجی میں ہے:''ذوی الرحم ھو کل قریب لیس بذی سھم ولا عصبة''۔(باب ذوی الارحام، ص:۳۴)

یعنی ہر وہ عزیز و رشتہ دار جو نہ تو ذوی الفروض میں سے ہو اور نہ ہی عصبہ ہو جیسے نانی کے علاوہ ماں کے توسط سے تمام رشتہ دار (ننھیال) اور نواسے ونواسیاں، بھانجے وبھانجیاں اور پھوپھیاں وغیرہ۔

جمہور کا استدلال باب کی حدیث سے ہے جو صحیح بھی ہے اور صریح بھی، اسی طرح امام ترمذیؒ نے وفی الباب میں جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سب بھی جمہور کی مستدل ہیں علاوہ ازیں ''واولوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض'' [۲] الاية اور ''للرجال نصيب مماترك الوالدان والاقربون وللنساء نصيب مماترك الوالدان والاقربون''۔(النساء آیت نمبر ۷) سے بھی جمہور کا استدلال ہے۔

اس کے برعکس مانعین کے پاس کوئی صریح اور صحیح نص نہیں ہے خصوصاً جب آج کل بیت المال بھی نہیں ہے اگر ہے تو برائے نام بلکہ ناکام ہے، تو ایسے میں وہ اگر ذوی الارحام کو نہ دیں تو کہاں پھینکیں گے؟ اس لئے جمہور کا مذہب اور خصوصاً موجودہ حالات میں بہت مضبوط ہے، صاحب تحفہ فرماتے ہیں:''وھو قول الراجح''۔ قاضی شوکانیؒ نے بھی ''نیل'' میں اس کی بھرپور تائید کی ہے، ابن العربیؒ نے عارضہ میں باب کی حدیث میں لفظ ''خال'' کو عصبہ اور سلطان پر حمل کر کے جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر صاحب تحفہ نے اس کو تعسّف کہا ہے جیسا کہ ظاہر ہے، کیونکہ خال اور سلطان میں کوئی علاقہ نہیں۔

باب ماجاء فی الذی یموت ولیس له وارث

"عن عائشة ان مولیٰ للنبی صلی اللّٰه علیه وسلم وقع من عَذق نخلة فمات فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم :أنظروا ھل له من وارث؟قالوا: "لا"قال:فادفعوه الی بعض اھل القریة"۔ (حسن)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آزاد کردہ غلام کھجور کے درخت (یا شاخ) سے گرا اور فوت ہوگیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تلاش کرو اس کا کوئی وارث ہے؟ صحابہ کرامؓ نے فرمایا نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر (میراث) اس کے گاؤں کے بعض

---

[۲] سورۃ الاحزاب آیت:۶.

(غریبوں) کو دے دو۔

لغات: ۔قولہ "مولی" لغت میں اس کے تقریباً سترہ (۱۷) معانی ہیں مثلاً مالک، مددگار، دوست، حلیف، غلام، آزاد کردہ غلام اور آزاد کرنے والا آقا وغیرہا۔ یہاں آزاد کردہ غلام مراد ہے، اس کو مولی اسفل بھی کہتے ہیں، جیسا کہ اگلے باب کے ترجمۃ الباب میں ہے۔قولہ "عذق" اگر عین کو مفتوح پڑھ لیا جائے تو نفس کھجور کے پھل دار درخت کو کہتے ہیں، اور بکسر العین گچھوں اور خوشوں والی شاخ کو کہتے ہیں، دونوں صورتوں میں عین کلمہ یعنی ذال ساکن ہے۔

تشریح: ۔ اصولی طور پر اس غلام کی میراث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنی چاہئے تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مُعتِق (بکسر التاء) تھے مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام مادی اشیاء کی میراث نہ لیتے ہیں اور نہ ہی دیتے ہیں تا کہ لوگ ان کو دنیادار نہ سمجھیں، اور ان کو دنیاوی اشیاء سے طویل واسطے کی ضرورت بھی نہیں، اس لئے یہ مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بیت المال میں جمع ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بیت المال میں تصرف کے مالک تھے، دوسری طرف گاؤں والوں کو ایک گونہ تعلق تو تھا کہ جس کا بچپن جہاں گذرے وہاں سے اور وہاں والوں سے قلبی تعلق ہوتا ہے اسی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث گاؤں کے غریبوں کو دینے کا حکم دیا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ میراث کی ملکیت غیر اختیاری سبب ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مالک تو بن گئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشیاء کو ذخیرہ نہیں فرماتے اس لئے گاؤں والوں کو دینے کا حکم دیا تو یہ بھی صحیح وجہ بن سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔ بہر حال اگر کوئی آدمی ایسا ہو کہ اس کا کوئی بھی وارث نہ ہو تو اس حدیث سے گاؤں والوں کو وارث نہ سمجھا جائے بلکہ وہ مال بیت المال میں جمع ہوگا۔

مگر جیسا کہ سابقہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ آج کل تو بیت المال نہیں ہے تو پھر کیا کرنا چاہئے؟ اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحبؒ عرف شذی میں فرماتے ہیں کہ اس کو دینی مدارس میں جمع کرا دیا جائے۔

"افتی ارباب الفتاویٰ بان بیوت الاموال انعدمت فیدفع الوراثة الیٰ مَن یدلی الی المیت رضاعاً وافتی صاحب مجمع الانھر بوضعھا فی المدارس الاسلامیة وھذا یوافق اھل العصر ویفید ارباب الفتوی "الخ۔ (العرف الشذی تحت ہذا الباب)

پھر اس ترکے کا مصرف مستحقین زکوٰۃ ہوں گے اس لئے ذمہ دار و محتاط مدارس میں دینا چاہئے۔

باب ماجاء فی میراث المولیٰ الاسفل

"عن ابن عباس ان رجلاً مات علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ولم یدع وارثاً اِلاعبداً هواعتقه فاعطاه النبی صلی الله علیه وسلم میراثه"۔ (حدیث حسن) [1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فوت ہوگیا اور پیچھے کوئی وارث نہ چھوڑا مگر ایک غلام جس کو اس نے آزاد کیا تھا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی غلام کو اس کی میراث دے دی۔

تشریح:۔ اس حدیث کی شرح میں وہی اصول ہے جو سابقہ باب میں بیان ہوا کہ ایسے آدمی کی میراث بیت المال میں جمع ہوگی، اور آج کل دینی مدارس میں، مولیٰ اسفل یعنی آزاد کردہ غلام کی میراث تو مولیٰ اعلی یعنی آزاد کرنے والے کو ملتی ہے نہ کہ مولیٰ اعلی کی مولیٰ اسفل کو مگر یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کو بیت المال کے مال کا مصرف سمجھ کر اور ایک گونہ تعلق کی بناء پر دیا۔ تدبر

باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والکافر

"عن اسامة بن زید ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: لایرث المسلم الکافر وَلاالکافرُ المسلمَ"۔ (حدیث حسن صحیح) [1]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان کافر کی میراث نہیں لے سکتا اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث بن سکتا ہے۔

تشریح:۔ امام ترمذیؒ نے اس بارے میں کوئی اختلاف نقل نہیں کیا ہے بلکہ فرمایا: "والعمل علی

باب فی میراث المولیٰ الاسفل

[1] الحدیث اخرجه ایضاً الحاکم فی المستدرک ص: ۲۶۵ ج: ۵ حدیث: ۸۱۸۱۔

باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والکافر

[1] رواه البخاری ص: ۱۰۰۱ ج: ۲ "باب لایرث المسلم الکافر الخ" کتاب الفرائض، صحیح مسلم ص: ۳۳ ج: ۲ کتاب الفرائض وابوداؤد فی کتاب الفرائض "باب هل یرث المسلم الکافر" ومالک فی المؤطا فی کتاب الفرائض باب میراث اهل الملل، ایضاً رواه احمد والبیهقی بحواله سنن دارمی ص: ۴۶۶ ج: ۲ حدیث: ۳۰۰۰، مستدرک حاکم ص: ۲۶۳ ج: ۵ حدیث: ۸۱۷۳۔

هذاالحدیث عنداهل العلم ''البتہ مرتد کے بارے میں اختلاف نقل کیا ہے، لہٰذا اس باب میں دو مسئلے قابل ذکر ہیں: (۱) اصلی کافر کی توریث کا۔ (۲) مرتد کی وراثت کا مسئلہ۔

پہلے مسئلے کی وضاحت یہ ہے کہ کافر تو بالاجماع مسلمان کا وارث نہیں بنتا، جبکہ اس کے برعکس مسلمان کے کافر کا وارث بننے میں اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں بنتا جبکہ بعض صحابہ کرامؓ جیسے معاذ بن جبل، معاویہ اور سعید بن المسیب وغیرہ رضی اللہ عنہم اس کے جواز کے قائل ہیں، جیسا کہ حاشیہ میں ہے اور امام نوویؒ نے شرح مسلم میں بھی ذکر کیا ہے۔ [۲]

جمہور کا استدلال:۔ اس بارے میں باب کی حدیث سے ہے جس میں دونوں جانبوں سے میراث کے استحقاق کی نفی کی گئی ہے اسی طرح اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث آنے والی ہے جس میں صاف کہا ہے: ''لایتوارث اهل ملیتن'' [۳] نیز توارث موالات ونصرت پر مبنی ہے اور وہ مسلمان وکافر کے درمیان مفقود ہے۔

دوسرے فریق کا استدلال:۔ اس حدیث سے ہے: ''الاسلام یعلوو لایُعلی علیه''۔ [۴] لہٰذا مسلمان عالی ہونے کی وجہ سے وارث بننا چاہئے کافر کا۔

جواب:۔ مگر اس حدیث سے اس کا استدلال درست نہیں کیونکہ یہاں علو سے مراد حجت وافضلیت ہے یعنی اسلام تمام پہلو کے اعتبار سے تمام ملل وادیان سے افضل ہے کوئی مذہب اس کے مساوی یا فائق نہیں ہوسکتا، اس کے مقابلے میں جمہور کی مستدل حدیث نفی توارث پر صریح ہے۔ بہرحال اب اس مسئلہ میں کوئی اختلاف باقی نہیں ہے اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ مسلمان اور کافر کے درمیان توارث نہیں ہے۔

دوسرے مسئلے میں کافی اختلاف ہے اور کل ملا کر اس میں چھ مذاہب ہیں لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اختلاف جانبین سے توارث کے بارے میں ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ مرتد مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا، پس یہ صرف مرتد کے بارے میں، اس حالت سے متعلق ہے جب وہ حالت ارتداد میں مرجائے یا مارا جائے یا دارحرب چلا جائے یعنی بغیر توبہ کے مرے۔

---

۲ النووی علی مسلم ص:۳۳ ج:۲.

۳ ایضاً رواه الدارمی فی سننه عن عمرؓ ص:۴۶۵ ج:۲ حدیث:۲۹۹۲.

۴ رواه البخاری ص:۱۸۰ ج:۱ "باب اذا اسلم الصبی فمات الخ" کتاب الجنائز.

مذاہب کی تفصیل حاشیہ کوکب پر بحوالہ ماوردی منقول ہے۔ سراجی میں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مرتد نے جو مال حالتِ رِدّت میں کمایا ہو وہ بیت المال (دینی مدارس) میں جمع کرادیا جائے گا، اور جو ارتداد سے پہلے کا ہے وہ مسلمان ورثہ کو بطور میراث ملے گا۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ دونوں حالتوں کا مال مسلمان وارثوں کا ہے، اس کے برعکس امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں قسم کا مال بیت المال میں جمع ہوگا جبکہ مرتدہ عورت کا سارا ترکہ مسلمان وارثوں کا ہے بالاجماع۔ (فصل فی المرتد ص:۵۸)

امام ترمذیؒ نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ امام احمدؒ، امام مالکؒ کا مذہب بھی امام شافعیؒ کے مذہب کی طرح ہے البتہ امام مالکؒ کے نزدیک اگر ایک آدمی اپنے ورثہ کو محروم کرنے کی غرض سے مرتد ہو جاتا ہے تو پھر اس کی میراث مسلمان وارثوں کو ملے گی۔

امام شافعیؒ کی دلیل:۔ حدیث الباب ہے کما نقلہ الترمذی عنہ۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جو مال اس نے حالت رِدّت میں کمایا ہے اس کے متعلق تو یہ بات صحیح ہے مگر جو حالت اسلام کا ہے تو اس میں توریث کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ مرتد ہو گیا والعیاذ باللہ تو وہ حکماً میت قرار پایا کیونکہ اسی وقت اس کا قتل واجب ہو گیا تھا، جو تاخیر تین دنوں تک ہوئی وہ اس کے شبہ کے ازالے کے لئے ہوئی، مگر جب وہ واپس مسلمان نہ ہوا اور قتل کیا گیا تو یہ قتل وقت ردت کی طرف منسوب ہوگا لہٰذا یوں سمجھا جائے کہ وہ ارتداد سے مرگیا تو یہ توریث المسلم من المسلم ہوئی۔ (تدبر) کچھ آثار بھی امام صاحبؒ کے مستدل ہیں جو حاشیہ تحفہ پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

حدیث آخر:۔ "عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "لایتوارث اھل ملتین"۔ (حدیث غریب)[5]

دوملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے۔

تشریح:۔ ایک نسخہ میں یہاں مستقل باب مع العنوان موجود ہے جیسا کہ بین السطور دیا ہے: "باب لایتوارث اھل ملتین"۔ اس مسئلہ کی نوعیت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی مگر وہاں مسلمان اور کافر کے درمیان توارث زیر بحث تھا یہاں اس میں توسیع ہوئی اور کہا کہ دوملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

یہ حدیث بظاہر امام احمدؒ کے مذہب پر زیادہ صریح ہے کیونکہ ان کے نزدیک تمام ادیان خواہ سماوی ہوں یا خود ساختہ سب مختلف ہیں لہٰذا کسی بھی ایک ملت والا دوسرے ملت والے کا وارث نہیں بن سکتا جبکہ حنفیہ وشافعیہ

---

[5] ایضاً رواہ الدارمی ص:۴۶۵ ج:۲.

کے نزدیک یہود ونصاریٰ ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں، مالکیہ کے نزدیک ملل سماویہ سارے آپس میں مختلف ہیں اور باقی خودساختہ تمام ملل ایک ہیں، بظاہر یہ حدیث ان تینوں مذاہب کے خلاف ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایک ملت ہے اور کفر خواہ وہ کسی بھی مذہب والوں کا ہو دوسری ملت ہے علیٰ ہذا یہ حدیث سابقہ حدیث کی طرح ہوئی اور مطلب وہی ہوا جو سابقہ باب میں بیان ہوا یعنی اس میں مسلمان اور کافر کے ایک دوسرے سے توارث کی نفی کی گئی ہے باقی ملل کی بات اس میں نہیں کی گئی ہے لہٰذا وہ ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں۔ (کذا فی الکوکب وحاشیتہ)

آج کل کے اہل بدعت کی وراثت ومناکحت کا حکم:۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ بدعت کی اصطلاح قدماء کے نزدیک فکری اختراع اور اہل السنّت والجماعت سے مختلف نظریات کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جبکہ متأخرین کے نزدیک اس کا اطلاق خلافِ سنت کسی عمل کو ثواب کی غرض سے کئے جانے پر ہونے لگا، اور آج کل یہی متعارف ہے، اس لئے پھر بعض علماء کو تفصیل بتانے کی ضرورت پیش آئی کہ بدعت ایک مکفرہ ہے اور دوسری سیۂ ہے۔ تفصیل فتاویٰ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں صرف یہ بات پیشِ نظر ہے کہ اگر کسی خاندان میں دیوبندی، بریلوی اور شیعہ تینوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے موجود ہوں تو ان کی توریث کا حکم کیا ہونا چاہئے؟

اس کا جواب خاصا مشکل ہے اور مفصل بھی، مگر اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے یوں کہنا چاہئے کہ ایمان واسلام یا توارث کا دارومدار صرف ظاہری انتساب پر مبنی نہیں ہے کہ اگر کوئی شیعہ یا بریلوی ہے تو وہ کافر اور کوئی دیوبندی ہے تو وہ مسلمان ہے اصل چیز اعتقاد واعمال ہیں گو کہ یہ نسبتیں شِعار کا کام دیتی ہیں، کسی کی تکفیر کا اصول یہ ہے کہ جو شخص ضروریاتِ دین کو نہیں مانتا یا ان میں تاویل کرتا ہے تو وہ اہلِ قبلہ یعنی مسلمان نہیں ہے، ضروریات سے مراد وہ احکام ہیں جو اتنے تواتر سے مروی وثابت ہوں جو گویا بدیہی بن چکے ہوں اور بحیثیت مسلمان وہ موٹی موٹی باتیں کسی پر مخفی نہ ہوں جیسے توحید، رسالت، قیامت وغیرہ عقائد میں سے اور نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج وغیرہ اعمال میں سے، جن میں تاویل واحتمالِ دیگر کی گنجائش نہیں۔ اور جو شخص ضروریات کو مانتا ہے اور ان میں تاویل نہیں کرتا، بالفاظ دیگر قطعی الثبوت نصوص جو قطعی المعنیٰ ہوں جیسے محکم ومفسر، ان کو بلا تاویل ماننے والے کی تکفیر نہیں کی جائے گی، شرح عقائد مع المتن میں ہے:

"وردُّ النصوص بان ینکر الاحکام التی دلت علیها النصوص القطعیة من الکتاب

والسنة کحشر الاجساد مثلاً کفر لکونه تکذیباً صریحاللّٰه تعالیٰ ورسوله (صلی اللّٰه علیه وسلم) فمن قذف عائشةؓ بالزنا کَفَرَ واستحلال المعصیة صغیرة کانت او کبیرة کفر اذاثبت کونهامعصیة بدلیل قطعی"۔ (شرح عقائد ص:۱۲۰)

پھر اس اصول پر بہت سی تفریعات کی ہیں جس کی تفصیل شرح عقائد وغیرہ کتب عقائد میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علی ہذا جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو، یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل مانتا ہو، یا ان کی الوہیت کا قائل ہو، یا حضرت جبرئیل علیہ السلام کی بابت یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ وحی نازل کرنے میں ان سے چوک ہوئی اور بجائے حضرت علیؓ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے آئے، یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر ہو، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو زنا سے متہم کرتا ہو، یا کوئی شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم کرتا ہو، یا غیر اللہ کے لئے کلی ومحیط علم غیب مانتا ہوں، یا اس قسم کی قطعیات کا انکار یا تاویل کرتا ہو تو وہ شخص مسلمان نہیں، نہ وہ کسی مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کی میراث مسلمان کو ملے گی، اسی طرح اس کے ساتھ ازدواجی رشتہ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا جائز نہیں بلکہ منعقد ہی نہیں ہوتا، جبکہ ایسے نام کے شیعہ یا بریلوی جن کے عقائد صریح منصوصات سے متصادم نہ ہوں یا اگر متصادم ہوں تو ان نصوص میں قطعیت نہ ہو، اور اگر ثبوت میں قطعیت ہو لیکن معنی میں تاویل کی گنجائش ہو تو ان کی تکفیر نہیں کی جانی چاہئے لیکن پھر بھی ان کی وراثت اور مناکحت سے بچنا چاہئے خصوصاً اپنی لڑکی ان کے مردوں کے نکاح میں ہرگز نہیں دینی چاہئے کہ وہ غلط آدمی کے تسلط میں دینے کے مترادف ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح میں انتہائی احتیاط برتنی چاہئے کیونکہ یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ کس رافضی کا عقیدہ وعمل خراب ہے اور کس کا نسبتاً اچھا ہے تو جیسے بعض ظن گناہ ہے مگر قرآن نے اس قلیل کی وجہ سے ظن کثیر سے ممانعت فرمادی اس لئے ان تمام لوگوں کی وراثت ومناکحت سے بچنا چاہئے۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"فاذا کان الرجل مُجسِّماً او قدریاً او ولده موحد فمات هل یرثه ام لا؟ تبتنی المسئلة علی القول بتکفیر المتأوِّلین فان قلنا اِنهم غیر کفار صلینا علیهم وجری المیراث، وان قلنا انهم کفار لم یصل علیهم ولا جری المیراث فیهم"۔

پھر اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ حارث محاسبی کا باپ میراث میں ستر ہزار دراہم چھوڑ گیا تھا مگر انہوں نے

اس سے کچھ بھی نہیں لیا کہ باپ قدری تھا۔

قال ابن هوازن: "قيل انه ورث من ابيه سبعين الف درهم فلم يأخذمنه شيئاًلان اباه يقول بالقدرفرأیٰ فی الورع ان لایأخذميراثه،فيحتمل احدوجهين اِمالِانه كان يرى اِكفارمن ابتدع واماتنزه وتورّع "۔واللّٰه اعلم۔

حضرت تھانوی صاحبؒ کی تقریر''المسک الذکی علی الترمذی''میں اس باب کے تحت فرمایا ہے:

''روافض وغیرہ جو فرقے ہیں وہ سب اسلام میں داخل ہیں جب تک کہ ان کے عقائد کفر تک نہ پہنچیں اوران سے نکاح وغیرہ بھی جائز ہے،اورفتوی میں چونکہ ہر شخص خود مختار ہے جو چاہے لکھ دے مگراس باب میں بہت بڑی احتیاط کرنی چاہئے کہ تکفیر کے لئے نہایت قوی دلیل کی ضرورت ہے،اور جاننا چاہئے کہ کفر کی دو قسمیں ہیں:ایک تو کفرلزوماً ہوتا ہے،اورایک التزاماً مثلاً کوئی شخص عمل کفار کے کرتا ہےاور جب اس سے دریافت کیا جاتا ہےتو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تواس صورت میں کفرلزوماً ہے یہ شخص کافرنہیں ہے،اوراگر کسی سے دریافت کیا جائے کہ تم مسلمان ہو یا ہندو؟ اوروہ کہے کہ میں ہندو ہوں تو یہ کفرالتزامی ہے کہ وہ اپنے کافر ہونے کاالتزام کرتا ہے،سو یہ شخص واقعی کافر ہے،کیونکہ ملتزمِ کفر ہے اگر چہ وہ عمل مسلمان کے کرے''۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ حضرت تھانوی صاحبؒ کا فتوی''امدادالفتاویٰ''میں اسے سے نسبتاً سخت ہے ممکن ہے کہ جس زمانہ میں ترمذی پڑھارہے ہوں تواس وقت شیعت کے غلو کے بارے میں زیادہ معلومات یامشاہدہ نہ ہوا ہومگر بعد میں رائے تبدیل ہوئی ہو۔آج کل کے شیعہ عموماً بہت غالی ہیں اس لئے عام اہل فتاویٰ نے ان کی تکفیر کی ہے،میرے خیال میں جوان پڑھ اور جاہل قسم کے شیعہ ہیں اورصرف نام کے شیعہ ہیں یاغالی نہیں تو ان کی تکفیر میں احتیاط لازمی ہے اگر چہ آج کل ان میں سے ایسے افراد عملاً نہ ہونے کے برابر ہیں۔واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

تنبیہ:۔جس طرح کسی کی تکفیر ایک خطرناک اورنازک ترین مسئلہ ہے تو اسی طرح تکفیر میں تساہل بھی بہت سے مفاسد کو جنم دیتا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کی جن کے نظریات واعمال ایمان سے خارج کردینے والے ہوں تکفیر نہ کی جائے تو سادہ لوح مسلمان ان کے اعمال کو قبیح نہ سمجھ کر اختیار کریں گے اس طرح وہ بے چارے دائرہ ایمان سے خارج ہوجائیں گے،چنانچہ حضرت تھانویؒ آغاخانیوں کے نظریات وعقائد کے بارے میں

پوچھے گئے ایک سوال کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں: ''خلاصہ یہ ہے کہ جب ان کفریات کے ہوتے ہوئے کسی کو مسلمان کہا جائے گا تو ناواقف مسلمانوں کی نظر میں ان کفریات کا قبح خفیف ہو جائے گا اور وہ آسانی سے ایسے گمراہوں کے شکار ہو سکیں گے، تو کافروں کو اسلام میں داخل کہنے کا انجام یہ ہوگا کہ بہت سے مسلمان اسلام سے خارج ہو جائیں گے کیا کوئی مصلحت اس مفسدہ کی مقاومت کر سکے گی؟'' الخ۔

(بوادر النوادر ص: ۱۴۷ طابع ادارۂ اسلامیات لاہور)

باب ماجاء فی اِبطال میراث القاتل

''عـن ابی هـريـرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: القاتل لایرث''۔ [۱] (هذاحدیث لایصح ...واسحق قدترکه بعض اهل العلم ...والعمل علی هذاعنداهل العلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قاتل (مقتول کی) میراث نہیں لے سکتا ہے۔

تشریح:۔ یہ حدیث اگرچہ بتصریح امام ترمذیؒ صحیح نہیں مگر جیسا کہ پہلے بارہا عرض کیا جا چکا ہے کہ کبھی روایت کی سند ضعیف ہوتی ہے مگر تعامل ائمہ کی وجہ سے وہ صحیح ہوتی ہے، اس لئے امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے، نیز یہ روایت ''عن عمرو ابن شعیب عن ابیه عن جده'' کی سند سے نسائی یا سنن ابی داؤد میں بھی مروی ہے، [۲] اس لئے قابل حجت ہے۔ تاہم امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ قتل خطا میں قاتل کو مقتول مورث کی میراث میں سے مقررہ حصہ ملے گا دیت سے نہیں ملے گا جبکہ عمد میں وہ جمہور کے ساتھ ہیں، عارضہ میں ہے: ''وقال مالکؒ: یرث من الخطأ الّامن الدیة''۔ [۳] حنفیہ وشافعیہ وغیرہ عمد اور خطاء ہر دو میں حرمان کے قائل ہیں۔

ان کا استدلال حدیث باب سے ہے چونکہ روایت مطلق ہے عمد کی قید سے، اس لئے اس کا عموم پر رکھنا اولیٰ بلکہ ضروری ہے، کیونکہ خطاء کے استثناء کی کوئی دلیل نہیں۔ سراجی میں ہے:

باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل

[۱] ایضاً رواه الدارمی ص: ۴۷۹ ج: ۲ حدیث: ۳۰۸۳، ایضاً سنن ابی داؤد ص: ۲۸۰ ج: ۲ کتاب الدیات، مسنداحمد ص: ۸۰ ج: ۱ حدیث: ۳۴۸۔ [۲] لم اجده فی النسائی ولکن رواه ابوداؤد عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ص: ۲۸۰ ج: ۲ ''باب دیات الاصابع'' کتاب الدیات. [۳] وفی الدارمی: اذا قتل الرجل اخاه عمداً لم یورث من میراثه ولامن دیته فاذا قتله خطأً ورث من میراثه ولم یورث من دیته الخ ص: ۴۷۸ ج: ۲.

”المانع من الارث اربعة:الرّق...والقتل الذی یتعلق به وجوب القصاص اَوِ الکفارة،واختلاف الدینین واختلاف الدارین“۔

یعنی ہر وہ قتل حرمان میراث کا سبب ہے جس سے یا قصاص لازم آتا ہو جیسے عمد یا کفارہ لازم آتا ہو جیسے شِبہ عمد اور خطاء۔

قتل کی تعریف یہ ہے کہ قتل کے ارادے سے کسی کو آلۂ قتل سے ہلاک کردے اس سے قصاص لازم آتا ہے، باقی اقسام سے نہیں، اگر قتل کرنے کا ارادہ تو ہو مگر وہ آلۂ قتل اسلحہ یا اس کا قائم مقام نہ ہو جیسے پتھر یا ڈنڈا تو وہ شِبہ عمد ہے، اور اگر مثلاً شکار سمجھ کر گولی چلائی وہ انسان کو لگ گئی تو وہ خطاء ہے جبکہ لیٹے ہوئے شخص کا کسی پر گرنا یا کروٹ کے نیچے سوتے میں دبا کر مارنے کو جاری مجری خطاً کہتے ہیں، آج کل گاڑی کا ڈرائیور بھی اسی حکم میں ہے جیسے جانور کا سوار ہوتا ہے۔ (کمافی الھدایۃ ”باب جنایۃ البھیمۃ والجنایۃ علیھا“ ص:۵۲۴ جلد:۴) اقسام قتل کی تفصیل (تشریحات ج:۵ ص:۳۰۶) پر بھی گذری ہے۔

باب ماجاء فی میراث المرأة من دیة زوجها

”عن سعید بن المسیّب قال قال عمر الدیة علی العاقلة ولاترث المرأة من دِیَةِ زوجها شیئاً فاخبره الضحاک بن سفیان الکلابی ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کتب الیه ان وَرِّث امرأةَ اَشیَم الضبابی من دیة زوجها“۔ (هذاحدیث حسن صحیح)[۱]

حضرت سعید بن میتب رحمہ اللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دیت عاقلہ پر ہے اور عورت اپنے شوہر کی دیت میں سے کچھ بھی وراثت نہیں لے سکتی، تو ضحاک بن سفیان نے ان کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس لکھ کر بھیجا تھا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو ان کے شوہر کی دیت میں سے میراث دے دو۔

لغات:۔قولہ ”دِیة “خون بہا کو کہتے ہیں، یہ اصل میں مصدر ہے ”وَدَی القاتلُ“ اس وقت کہا جاتا ہے جب قاتل والوں کی طرف سے ولی مقتول کو جان کے بدلہ مال دیا جائے، مگر پھر اس کا اطلاق مال پر ہونے

باب ماجاء فی میراث المرأة من دیة زوجها

۱ ایضاً رواه الترمذی فی الدیات باب:۱۸ وراجع للتفصیل سنن دارمی ص:۴۷۲ ج:۲.

لگا۔قولہ "العاقلة" عقل سے ہے عقل کے معنی دیت بھی آتے ہیں، پس عاقلہ وہ لوگ ہوئے جو دیت ادا کرتے ہیں۔اور عقل روکنے کو بھی کہتے ہیں چونکہ آدمی کا قبیلہ اس کو سمجھانے اور قتل وقتال اور فساد سے روکنے کا پابند ہوتا ہے اس لئے ان کو عاقلہ کہتے ہیں لہٰذا اگر وہ آدمی کسی کو قتل کردے تو ذمہ داری دیت کی سب پر عائد ہوگی۔

تشریح:۔حضرت عمرؓ کا مذہب یہ تھا کہ بیوی شوہر کی دیت میں حصہ دار نہیں ہوگی۔اس کی وجہ ایک دقیق نکتے پر مبنی تھی کہ دیت تو شوہر کی موت کے بعد ملتی ہے لہٰذا یہ شوہر کی کمائی نہیں نیز موت سے نکاح بھی ختم ہوجاتا ہے علاوہ ازیں جب عورتیں دیت کی ادائیگی میں شریک نہیں تو توریثِ دیت میں بھی ان کا حصہ نہیں ہونا چاہئے۔

مگر جب یہ حدیث ان کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے اپنے مذہب سے رجوع فرمالیا،اور حدیث کا حکم جس وجہ پر مبنی ہے وہ ان کی وجہ سے زیادہ اَدَق ہے، وہ یہ ہے کہ دیت اس مردے کی اسے زندہ تصور کرکے لگائی جاتی ہے کیونکہ لاش کی قیمت تو اتنی زیادہ نہیں ہوتی پس دیت بھی میراث کے مال میں شامل ہے اور نکاح بھی حکماً باقی ہے کہ عورت عدت گذارتی ہے۔حدیث کی باقی تشریح ''باب ماجاء فی المرأة ترث من دية زوجها'' میں گذری ہے۔(دیکھئے تشریحات ترمذی ص:۳۲۵ ج:۵،ابواب الدیات)

باب ماجاء ان الميراث لِلورثة والعقل للعصبة (على العصبة)

"عن ابی هريرة ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قضیٰ فی جنين اِمرأة من بنی لحيان سقط ميتاًبِغُرّةٍ عبدٍ او اَمةٍ ثم ان المرأة التی قضی عليهابغرّة توفيت فقضی رسول الله صلی الله عليه وسلم ان ميراثهالبنيهاوزوجهاوان عقلهاعلى عصبتها"۔[1]

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنولحیان کی ایک عورت کے حمل کے بارے میں جو مردہ پیدا ہوا تھا فیصلہ فرمایا تھا،ایک غرہ دینے کا جو ایک غلام یا باندی ہے پھر جب وہ عورت مرگئی جس کے لئے غرے کا فیصلہ ہوا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ اس کی میراث اس کے بیٹوں

باب ماجاء ان الميراث للورثة الخ

[1] الحديث اخرجه ايضاً البخاری ص:۹۹۸ ج:۲ "باب ميراث المرأة والزوج الخ" كتاب الفرائض، ومسلم فی القسامة، ابوداؤد فی الديات باب:۱۹، والنسائی فی القسامة باب:۳۹، مسنداحمد ص:۳۶۰ ج:۳ حديث:۱۰۵۷۰.

اور شوہر کی ہے اور اس کی دیت قاتلہ کے عصبہ پر واجب ہے۔

لغات:۔ قولہ "جنین" وہ بچہ جو ابھی تک پیٹ میں ہو پوشیدہ اور مستور ہونے کی وجہ سے اسے جنین کہتے ہیں کیونکہ جیم اور نون مادہ میں تستر عن الاعین کے معنی پائے جاتے ہیں، جمع اَجِنَّۃٌ آتی ہے۔ قولہ "لِحیان" بکسر اللام والفتح۔ قولہ "بغرۃ" بضم الغین وتشدید الراء وتنوین التاء المدوّرۃ، اصل میں گھوڑے کی پیشانی پر سفید نشان کو کہتے ہیں مگر توسعاً ہر عمدہ چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے غلام اور باندی افضل مالیت کی وجہ سے غرہ کہلاتے ہیں۔ قولہ "عبد او امۃ" جر اور رفع دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہیں، جر بنا بر بدلیت اور رفع بنا بر خبریت یعنی ''ھو عبد او امۃ''۔ پھر کلمہ ''او'' شک کے لئے نہیں بلکہ اختیار کے لئے ہے۔

تشریح:۔ آج کل تو غلام نہیں پائے جاتے اس لئے مذکورہ بالا صورت میں پانچ سو درہم بطور دیت لازم ہوں گے جیسا کہ بعض روایات[۲] میں اس کا اضافہ بھی مروی ہے جو ایک سال میں ادا کئے جائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ میں فریقین کی رعایت فرمائی ہے کیونکہ اگر زندہ بچے کی رعایت کر کے سو اونٹ لازم فرماتے تو قاتل کے اہل قرابت کہتے کہ بچہ تو مرا ہوا تھا یعنی خود بخود، پھر ہم پر زندہ کی دیت کیسے؟ اور اگر مردہ فرض کر کے اس کا خون بہا معاف فرماتے تو بچے والے کہتے کہ ہمارا بچہ تو زندہ تھا وہ تو اس عورت کے وار کرنے سے ہلاک ہوا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بین بین فیصلہ فرما دیا۔

قولہ "ثم ان المرأۃ التی قضی علیھا بغرۃ توفیت" الخ اس عبارت میں اشکال ہے، وہ یہ ہے کہ اگر متوفیہ اس عورت کو قرار دیا جائے جو مضروبہ تھی تو سوال یہ ہے کہ فیصلہ تو اس کے خلاف نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے حق میں تھا پھر ''علیھا'' کا کیا مطلب ہے حالانکہ ''علی'' تو الزام کے لئے آتا ہے اور اگر ضاربہ و جانیہ کو متوفیہ کہا جائے تو اول تو اس کی وفات کے تذکرہ کی کوئی وجہ نہیں اور دوم اس کی میراث کی تخصیص کذائی بھی کسی بڑے فائدے پر مبنی نہیں۔ پس عام شارحین نے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے اور فرمایا کہ متوفیہ دراصل مجنیہ یعنی مضروبہ تھی کیونکہ ایک روایت میں ہے ''فقتلھا و ما فی بطنھا''[۳] اور جہاں تک ''علیھا'' کا تعلق ہے تو یہاں علی بمعنی لام کے ہے کما فی قولہ تعالیٰ ''لتکونوا شھداء علی الناس''[۴] اس صورت میں باقی تمام ضمائر کا مرجع بھی یہی مجنیہ

---

[۲] کذا فی روایۃ ابی داؤد ص: ۲۸۲ ج: ۲ "باب دیۃ الجنین" کتاب الدیات. [۳] کذا فی روایۃ البخاری "باب جنین المرأۃ" کتاب الدیات، ومسلم فی القسامۃ "باب دیۃ الجنین" ابو داؤد فی الدیات باب: ۱۹ والنسائی فی کتاب القسامۃ باب دیۃ الجنین المرأۃ، بحوالہ دارمی ص: ۲۵۸ ج: ۲ حدیث: ۲۳۸۰، وفی سنن ابن ماجہ: فضربتْ احدھما الاخری بمسطح فقتلھا وقتلت جنینھا الخ ص: ۱۹۰ "باب دیۃ الجنین" ابواب الدیات. [۴] سورۃ البقرۃ آیت: ۱۴۳.

عورت ہوگی سوائے آخری ضمیر کے جو"علی عَصَبَتِها "میں ہے کہ وہ جانیہ کی طرف راجع ہے، یہ توجیہ اور پر ترجمہ میں بھی اختیار کی گئی ہے، طیبیؒ نے اس کو ظاہر کہا ہے، شیخ نے لمعات میں بھی اس کو اختیار کیا ہے، امام نوویؒ نے شرح مسلم [۵] میں اس پر جزم کیا ہے کیونکہ دوسری حدیث میں اس کی تصریح کی گئی ہے کمامر۔

حضرت گنگوہی صاحبؒ نے الکوکب میں دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے۔ فمن شاء فلیراجع۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر حکم نہیں لگایا ہے مگر یہ صحیح ہے کیونکہ اس کی اصل صحیحین میں موجود ہے۔ یہ حدیث "باب ماجاء فی دیۃ الجنین" میں بھی گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج:۵ ص:۳۲۰، ابواب الدیات)

باب ماجاء فی الرجل یُسلِم علی یدی الرجل

"عن تميم الداری قال سألتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم :ماالسنة فی الرجل من اهل الشرك يُسلِم على يدرجل من المسلمين؟فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :هواَولى الناس بمحياه ومماته"۔ (هذاحديث لانعرفه الامن حديث عبدالله بن وهب)

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مشرکین کے اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو مسلمانوں میں سے کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے؟ (یعنی اس کی میراث کا مستحق کون ہوگا؟) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ مسلمان دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ حق دار ہے (یعنی) زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی۔

تشریح:۔ جس کے ہاتھ پر کوئی شخص مسلمان ہو تو چونکہ مسلمان کرنے والے نے اس کو کفر سے نکالا اور اسلام میں داخل کیا تو گویا مردے کو زندہ کیا اس لئے وہ اس کے ساتھ اس کی حیات اور ممات میں زیادہ قریب سمجھا گیا اور وہ اس کی میراث بھی لے گا اور اس کی طرف سے دیت بھی ادا کرے گا، لیکن یہ حکم اس وقت ہے جبکہ نومسلم نے باہم معاہدہ اس مسلمان کرنے والے کے ساتھ کرلیا ہو کہ تم میرے بعد میرا تمام مال لے لینا کیونکہ میرے ورثہ کافر ہیں اور یہ کہ زندگی میں میرا ساتھ دینا، لہٰذا جب مسلمان اس نومسلم کے نفع کا مالک ہوا تو اس کے نقصان دیت وغیرہ کا بھی ذمہ دار ہوگا، اور اگر یہ معاہدہ نہ ہو تو بالاتفاق اس کا مال بیت المال میں اور آج کل جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ذمہ دار دینی مدرسہ میں جمع ہوگا، کیونکہ بیت المال ودیگر خیراتی ادارے مسلمانوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں اور تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں گویا ایسے لاوارث آدمی کے وارث

[۵] النووی علی صحیح مسلم ص:۶۲ ج:۲ کتاب القسامة.

ضرورت مند مسلمان ہوں گے۔ یہ مذہب حنفیہ کا ہے اور باب کی حدیث ان کی دلیل ہے۔ حنفیہ کے نزدیک مذکورہ معاہدے کو موالات یا مولی الموالات کہتے ہیں پس اگر یہ معاہدہ نہ ہوا ہو یا اس نومسلم کے مسلمان ورثہ بھی ہوں تو پھر مال وارثوں کو ہی ملے گا۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس شخص کا مال بیت المال میں جمع ہوگا، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ حدیث الباب کا حکم یا تو شروع اسلام سے متعلق ہے لہٰذا اب یہ منسوخ ہے یا مطلب اس کا نصرۃ ومدد کرنا اور نماز جنازہ پڑھانے کا حق ہے، نیز باب کی حدیث ضعیف ہے اس سے احتجاج نہیں ہوسکتا اس کے برعکس ان کا استدلال ''الولاء لِمن اعتق'' [۱] سے ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے ان سے نقل کیا ہے۔

صاحب بذل المجہود نے اس حدیث پر کافی بحث نقل کی ہے اس میں ابوزرعہ الدمشقی کا قول نقل کیا ہے:

''نری واللّٰہ اعلم ان عبدالعزیز حدّث یحیی بن حمزۃ من کتابہ وحدثھم بالعراق من حفظہ وھذا حدیث حسن متصل لم ار احداً من اھل العلم یدفعہ...وفیہ ''وقد احتج بعبدالعزیز المذکور البخاری فی صحیحہ واخرج لہ ھو ومسلم وقال یحیی ابن معین عبدالعزیز بن عمر ثقۃ وقال ابن عمار ثقۃ لیس بین الناس فیہ اختلاف''۔ (بذل ص:۱۱۳ ج:۵، کتاب الفرائض)

ہماری طرف سے ان کی مستدل حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ قاعدہ ہر جگہ نہیں یہ تو اس غلام کے لئے ہے جس کے آقا نے اسے آزاد کیا ہو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے علاوہ کوئی وراثت نہیں، غرض یہ حصر جو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بیان ہوا اضافی ہے کہ یہود نے شرط لگائی ولاء لینے کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصر اضافی کے طور پر ان کا دعویٰ استحقاق باطل فرمایا۔

اس کے علاوہ موالاۃ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی مجہول النسب آدمی دوسرے مجہول النسب شخص سے ارش (تاوان) اور ارث (میراث پانے) کا معاہدہ کرے، تو اگرچہ معاہدے پر عمل کرنے سے ہر فریق اس کو منسوخ کرسکتا ہے مگر عدم تنسیخ کی صورت میں بیت المال کے مقابلہ میں ان کا آپس میں توارث افضل ہے

باب ماجاء فی الرجل یسلم علی یدی الرجل

[۱] رواہ الطبرانی فی الاوسط عن علی رضی اللّٰہ عنہ حدیث: ۸۵۹۰ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۹۹ ج: ۴ حدیث: ۷۱۸۳، ایضاً روی بمعناہ الدارمی ص: ۳۸۷ ج: ۲.

خصوصاً آج کل جب بیت المال وزیر خازنہ کی جیب المال بنا ہے، یہ معاہدہ یک طرفہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اگر چہ معروف النسب ہو مگر دوسرا مجہول النسب اپنی ذمہ داری اور وفاداری کا عہد دوسرے سے کرے جو پانچ شرائط سے مشروط ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ص:۷۸۷۵ ج:۱۰)

دوسری حدیث:۔ "عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: ایما رجل عاهر بحرة او امة فالولد ولد الزنا لایرث ولا یورث "۔[۲] (والعمل علی هذا عند اهل العلم ان ولد الزنا لایرث من ابیه)

آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی کسی آزاد عورت یا باندی سے زنا کرے تو وہ بچہ (جو زنا سے پیدا ہوا) زنا کا بچہ کہلائے گا جو نہ تو (باپ یعنی زانی کا) وارث بنے گا اور نہ ہی اس کی میراث زانی کو ملے گی۔

لغات:۔ قولہ "عاهر" عہر سے بمعنی زنا کے، چونکہ زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا اس لئے یہ بچہ زانی کے حوالے سے کالعدم تصور کیا جائے گا لہٰذا اس کا باپ سے اور اس کے اقربہ وغیرہ سے کسی قسم کا توارث نہیں چلتا و بالعکس حتی کی اگر زانی اس بچہ کو اپنے گھر میں رکھ بھی لے اور پرورش بھی کرے تب بھی میراث ثابت نہ ہوگی، تاہم ملاعنہ عورت اپنے بچے کی وارث ہوتی ہے و بالعکس جیسا کہ باب کی آخری حدیث میں مصرح ہے۔

باب مَن یرث الوَلاء

"عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: یرث الوَلاء من یرث المال"۔[۱] (هذا حدیث لیس اسناده بالقوی)

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ولاء کی وراثت اسی کی ہے جو مال کا وارث ہوتا ہے۔

لغات:۔ قولہ "وَلاء" بفتح الواو غلام کا وہ مال جو آزاد ہونے کے بعد اس نے حاصل کیا ہو اور اس کے مرنے کے بعد رہ جائے، نیز اس استحقاق و کفالت کو بھی وَلاء کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث میں لفظ 'مَن' میں عصبہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ولاء کا حق صرف ان لوگوں

---

۲ ایضاً رواہ ابن ماجه ص:۱۹۷ ابواب الدیات.

باب من یرث الولاء

۱ رواہ احمد فی مسنده ص:۷۶ ج:۱ حدیث:۳۲۶ وفی روایة: یرث المال من یرث الولاء، رواہ احمد ص:۳۹ حدیث:۱۴۸.

کو ہے جو مال کے مستحق ہیں مگر بطور عصوبت کے لہٰذا عورتیں ولاء کی مستحق نہیں مثلاً کسی نے غلام آزاد کرلیا پھر دونوں مر گئے اور غلام کا کوئی دوسرا وارث نہ ہو تو ولاء معتق بالکسر کے بیٹے کو ملے گی بیٹی کو نہیں، ہاں اگر کوئی عورت غلام آزاد کردے تو بلاشبہ وہ اپنے مولی اسفل کی ولاء کی مستحق اور وارث ہوگی۔

یہ روایت دیگر طرق سے بھی مروی ہے لہٰذا قابل حجت ہے۔

آخری حدیث:۔ "عن واثلة بن الاسقع قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم :المرأة تحُوز ثلاثة مواریث عتیقها ولقیطها وولدها الذی لاعنت عنه"۔[۲] (هذاحدیث حسن غریب)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ عورت تین قسم کی میراث جمع کرسکتی ہے اپنے آزاد کردہ غلام کی اور لاوارث بچے کی میراث جو وہ کسی جگہ سے اٹھائے ہوئی ہو اور اس بچے کی میراث جس کے حوالے سے وہ لعان کرچکی ہو۔

لغات:۔ قوله "تحوز" بمعنی تجمع وتأخذ یعنی لیتی ہے۔

تشریح:۔ جہاں تک آزاد کردہ غلام کی میراث کا تعلق ہے تو اس کا بیان اوپر بھی ہوا کہ معتقہ بالکسر اپنے معتق بالفتح کی میراث لے گی، بشرطیکہ دوسرے ورثہ غلام کے نہ ہوں، اس پر حضرت عمر، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم کا عمل تھا اور صحیح حدیث میں ہے "الولاء لمن اعتق"[۳] اس میں "مَن" عام ہے عورتوں کو بھی شامل ہے، البتہ لقیط کی میراث اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہے قوی روایات کو ترجیح دینا افضل ہے جن کے مطابق سبب توریث نسب یا موالات ہے جو یہاں نہیں ہے البتہ چونکہ اس عورت نے بچے کی دیکھ بھال کی ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حق دار ہے اگرچہ اصولی طور پر اس کی میراث بیت المال میں جمع ہونا چاہئے۔ کما مرفی "باب ماجاء فی الذی یموت ولیس له وارث"۔ اور آخری حکم تو بدیہی ہے کیونکہ اگر شوہر نے لعان کی وجہ سے نسب سے انکار کیا ہے تو عورت تو منکر نہیں لہٰذا جزئیت کی بناء پر میراث ثابت ہوئی نیز ماں کا حصہ قرآن میں مقرر ہے اس میں لاعنہ کا استثناء نہیں ہے۔ تدبر

آخر الفرائض

---

[۲] ایضاً رواہ ابوداؤد ص:۴۷ ج:۲ "باب میراث ابن الملاعنة" کتاب الفرائض سنن ابن ماجه ص:۱۹۷ ابواب الفرائض، ایضاً رواہ احمد فی مسندہ ص:۵۴۴ ج:۴ حدیث:۱۵۵۷۴، رواہ الحاکم فی المستدرک ص:۲۵۹ ج:۵ حدیث:۸۱۵۲.

[۳] رواہ الطبرانی فی الاوسط، کذا فی مجمع الزوائد ص:۲۹۹ ج:۴.

ابواب الوصایا

عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

باب ماجاء فی الوصیّة بالثلُث

"عن عامر بن سعدبن ابی وقاص عن ابیه قال مرضتُ عام الفتح مرضاًاشفیت منه علی الموت فاتانی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یعودنی فقلتُ یارسول اللّٰه! اِنّ لی مالاً کثیراًولیس یرثنی اِلّاابنتی فاوصانی بمالی کله؟قال: "لا"قلتُ "فثلثی مالی"؟ قال: "لا" قلت فالشطر؟قال: "لا"قلتُ فالثلثُ ؟قال:الثلث والثلث کثیر،اِنك ان تذرورثتك اغنیاء خیرمن ان تذرهم عَالَةً یتکفّفون الناس،انك لن تُنفِق نفقةً الااُجِرتَ فیهاحتی اللقمة ترفعهاالی فی امرأتك،قال قلتُ یارسول اللّٰه اُخلّفُ عن هجرتی؟ قال:انك لن تُخلّفَ بعدی فتعمل عملاًتریدبه وجه اللّٰه اِلاازددتَ به رفعة ودرجة وَلَعَلّكَ ان تُخلّفَ حتی ینتفع بكَ اقوام ویضربكَ آخرون،اللّٰهم امض لاصحابی هجرتهم ولاتردهم علی اعقابهم لکن البائِس سعدبن خوله یرثی له رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان مات بمکة"۔[1] (حسن صحیح)

حضرت عامر بن سعد اپنے والد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں فتح مکہ والے سال بیمار ہوگیا، بیماری ایسی تھی کہ میں موت کے خطرے سے دوچار ہوگیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کرنے میرے پاس تشریف لائے، پس میں نے کہا اے اللہ کے رسول! میرے پاس بہت سارا مال ہے اور سوائے ایک بیٹی کے میرا کوئی دوسرا وارث (ذوی الفروض میں سے)

ابواب الوصایا عن رسول اللّٰه ﷺ

باب ماجاء فی الوصیة بالثلث

[1] الحدیث اخرجه ایضاً البخاری ص:۳۸۳ ج:۱ کتاب الوصایا، ومسلم فی کتاب الوصیة، وابوداؤد فی کتاب الوصایا "باب ماجاء فیمالایجوز للوصی فی ماله" والنسائی فی کتاب الوصایا "باب الوصیة بالثلث" ومالک فی الموطا فی کتاب الوصیة "باب الوصیة بالثلث لاتتعدی" بحواله سنن دارمی ص:۵۰۰ ج:۲ حدیث:۳۱۹۶.

نہیں ہے تو کیا میں پورے مال کی وصیت کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں''۔ میں نے کہا دو تہائی مال کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں'' میں نے کہا آدھے کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں'' میں نے عرض کیا تو ایک تہائی مال کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کہ تہائی دے دو اور تہائی بھی بہت ہے''، بلاشبہ اگر تم اپنے وارثوں کو مال دار چھوڑ دو تو یہ ان کے محتاج چھوڑنے سے جو کہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں افضل ہے، بے شک تم کوئی چیز خرچ نہیں کرتے مگر اس پر ضرور تمہیں ثواب دیا جاتا ہے حتی کہ وہ نوالہ جسے اٹھا کر تم اپنی بیوی کے منہ میں دیتے ہو (اس پر بھی اجر ملتا ہے) حضرت سعد فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنی ہجرت سے پیچھے رہ جاؤں گا؟ یا پیچھے ہٹ گیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک تم اگر میرے بعد زندہ رہے اور کوئی ایسا عمل کیا جس سے تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہو تو اس سے تیری بلندی اور مرتبے میں ضرور اضافہ ہوگا، اور امید رکھو کہ تم زندہ رہو گے اس وقت تک کہ فائدہ اٹھائیں گی تم سے کچھ قومیں اور نقصان پائیں گی دوسری اقوام، (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی) اے اللہ! میرے صحابہ کی ہجرت کو باقی رکھ اور ان کو نہ لوٹا الٹے پاؤں لیکن بے چارے سعد بن خولہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افسوس فرماتے کہ ان کی موت مکہ میں ہوئی تھی۔ (بعد الہجرت ہوئی تھی یا قبل الہجرت؟ اس میں دونوں قول ہیں۔)

لغات: قولہ "الوصایا" وصیۃ کی جمع ہے جیسے عطایا جمع عطیۃ و ھدایا ھدیۃ کی، مجرد اور مزید دونوں سے استعمال ہوتا ہے، مجرد سے ملنے کے معنی میں اور مزید خواہ باب افعال سے ہو یا تفعیل سے ملانے، پہنچانے اور سونپنے کے معنی میں آتا ہے، گویا وصیت کرنے والے نے کسی کے ذمے کچھ حق پہنچانے کا کام لگایا ہے، جبکہ عرفی معنی وہی ہیں جو مشہور ہیں۔

قولہ "اشفیت" یعنی قریب ہو گیا تھا خطرے کے درپیش ہونے کے وقت استعمال ہوتا ہے۔ قولہ "عالۃ" عائل کی جمع ہے بمعنی فقیر محتاج کے۔ قولہ "یتکففون" کف بمعنی ہتھیلی کے، مطلب یہ ہے کہ وہ ہتھیلیاں پھیلا کر مانگیں۔

قولہ "اخلف" ای ابقی خلفا یعنی میں اپنی ہجرت کو جاری نہ رکھ سکوں گا اور پیچھے مکہ ہی میں وفات پا کر رہ جاؤں گا؟ یا مطلب یہ ہے کہ آپ سب لوگ مدینہ منورہ چلے جائیں گے اور میں یہاں مکہ میں رہ جاؤں گا؟

قولہ "البائس" بَئِسَ سے ہے خستہ حال محتاج اور مصیبت زدہ کو کہتے ہیں۔قولہ "یرثی" رثیث المیت مرثیہ نوحہ سرائی کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔اس حدیث کی شرح پہلے گذری ہے۔(دیکھئے تشریحات ج:۴ص:۲۳۴،''باب ماجاء فی الوصیۃ بالثلث والربع'') یہاں ضروری شرح پیش ہے۔ترمذی کی روایت میں سفیان بن عُیینہ سے وہم ہوا ہے کیونکہ امام زہریؒ کے باقی تمام شاگرد اسے حجۃ الوداع کا واقعہ قرار دیتے ہیں جیسا کہ صحیحین میں ہے۔اور حضرت سعدؓ نے جو فرمایا کہ میری صرف ایک بیٹی ہے تو مطلب یہ ہے کہ متعین حصہ صرف بیٹی لے سکتی ہے باقی عصبہ کی نفی مراد نہیں ہے اور چونکہ بیٹی کا نان نفقہ اور سکنیٰ تو شوہر کے ذمہ ہوتا ہے لہٰذا کیوں نہ میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کردوں؟

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ثواب فقط صدقہ سے ملتا ہے بلکہ وہ تو خرچ کرنے سے بھی ملتا ہے خواہ آدمی اپنی زندگی کے بعد ورثہ کے پاس چھوڑے یا اپنی حیات میں بہ نیت ثواب کسی کو کھلائے حتی کہ اپنی بیوی کو کھلانا جہاں خواہش کی تکمیل بھی ملحوظ ہوتی ہے باعث اجر وثواب ہے۔

عام طور پر مریض موت کا تذکرہ کرتے وقت زیادہ خطرہ محسوس نہیں کرتا مگر جب دوسرے لوگ اس کے سامنے موت کا ذکر کریں تو وہ گھبرا جاتا ہے اس لئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وصیت کو منظور فرمالیا تو وہ موت کے بارے میں زیادہ حساس ہوگئے اور ڈر گئے کہ اگر مکہ میں موت آگئی تو سفر کی موت اور وہ بھی حرم مکی میں تو اپنی جگہ مگر ہجرت کا مرتبہ تو کہیں بلند ہے وہ فوت ہوجائے گا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ان کو تسلی دلائی بلکہ خوشخبری بھی سنائی جو سو فیصد درست ثابت ہوئی کہ وہ بعد میں تقریباً ۵۰ھ تک بقید حیات رہے، فاتح قادسیہ کے نام سے مشہور ہوگئے بلکہ فاتح فارس، ایران وعراق بن گئے، ان کی وجہ سے دشمنوں کو نقصان اٹھانا پڑا اور بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور مسلمانوں کو بے شمار غنائم ملے، اس کے بعد ان کا انتقال ہوا اور چار بیٹے چھوڑ کر منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔چنانچہ باب کی روایت بھی ان کے صاحبزادے سے مروی ہے۔

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوگیا تھا کہ کچھ لوگ بعد میں راہِ حق سے کنارہ کشی اختیار کریں گے خواہ کلی ہو یا جزوی جیسا کہ فتنۂ ارتداد میں ہوا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کے لئے دعا فرمائی جو اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوئی اور تمام مخلصین صحابہ کرامؓ اس فتنے سے محفوظ ہوئے۔ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ مرتدین انصار ومہاجرین کے علاوہ تھے:''وذالك فی غیر الرھط الکریم والوسط الصمیم

من المهاجرین والانصار"۔

اس حدیث سے ان صحابہ کرامؓ کی رائے کو تقویت ملی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مابعد والے اعمال پر ثواب ملنے کے قائل تھے جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے اس کے خلاف تھی وہ سمجھتے تھے کہ ہماری نیکیاں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم نے کی ہیں اگر وہ کوتاہیوں کے برابر سرابر ہوں گی تو بھی زہے قسمت۔

رہا وصیت بالثلث کا مسئلہ تو یہ پہلے گذرا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ثُلث کی وصیت بالاتفاق جائز ہے، ابن العربیؒ نے اس کی نفی والے قول کو جہل کہا ہے البتہ اگر ثُلث سے کم کی وصیت کردے تو یہ افضل ہے خاص کر جب ورثہ محتاج ہوں عارضہ میں ہے: "وقال الشافعیؒ :ان کان ورثته فقراء اَحببتُ ان لایستوعب الثلث"۔

جبکہ متنِ ہدایہ میں ہے کہ ثُلث سے کمی بہرحال مستحب ہے:

"قال ای القدوری :ویستحب ان یوصی الانسان بدون الثلث سواء کانت الورثة اغنیاء اوفقراء لان فی التنقیص صلة القریب بترك ماله علیهم "الخ۔

البتہ اگر کسی نے ثُلث سے زیادہ کی وصیت کی یا وارث کے لئے کی اور باقی ورثہ اس پر راضی ہوں ان میں بچہ اور مجنون نہ ہو یا کوئی وارث اپنے حق سے دستبردار ہو کر اجازت دیدے تو وہ بھی نافذ ہو جائے گی، متنِ ہدایہ اور ہدایہ میں ہے:

"ولاتجوزبمازادعلی الثلث اِلاان یجیزهاالورثة بعدموته وهم کبارلان الامتناع لحقهم وهم اسقطوه...ولاتجوزلوارثه ...الاان یجیزهاالورثة ولوجازبعض وَرَدَّ بعض تجوزعلی المجیزبقدرحصته لِولایته علیه وبطل فی حق الرادّ" الخ۔

(ہدایہ، کتاب الوصایا ج:۴ص:۵۶۳)

اشکال:۔ نوحہ سرائی سے تو ممانعت آئی ہے خصوصاً میت کے مرثیہ کے بارے میں تو مسند احمد میں روایت ہے: "نهی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن المراثی"۔[۲]

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ممنوع مرثیہ وہ ہے جو موت کا صدمہ دوبارہ بیدار کرے یا اجتماعی

---

[۲] مسند احمد ص:۴۷۵ ج:۵ حدیث:۱۸۶۵۹، ایضاً ص:۵۱۸ ج:۵ حدیث:۱۸۹۲۵، ایضاً رواه ابن ماجه فی سننه ص:۱۱۴ عن ابن ابی اوفی قال نهی رسول اللّٰه ﷺ عن المراثی "باب ماجاء فی البکاء علی المیت" ابواب الجنائز.

واہتمام کے ساتھ ہو یا کثرت سے ہو، جیسا کہ محرم الحرام میں شیعہ کرتے ہیں یا عام لوگوں میں برسی منانے کا رواج فروغ پاچکا ہے، جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن خولہ پر اظہار افسوس کرر ہے ہیں نوحہ سرائی نہیں فرمار ہے کیونکہ ان کی وفات ہجرت کے بعد مکہ میں ہوئی تھی جیسا کہ عارضہ میں ہے: "لمافاته من الثواب فی موته بمكة التی كان خرج عنهامكرماً"۔ یعنی یہ افسوس ہجرت کے ثواب کے فقدان پر ہے کہ کاش ان کو یہ ثواب بھی پورا مل جاتا۔

باب ماجاء فی الضرار فی الوصية

"عن ابی هريرة انه حَدَّثَه عن رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: اِن الرجل ليعمل والمرأة بطاعة الله ستين سنة ثم يحضرهم الموت فيضارّ ان فی الوصية فيجب لهماالنار ثم قرأ عَلَیَّ ابوهريرة "من بعد وصية يوصیٰ بهااودين غيرمضارٍّ وصية من الله الی قوله.. ذالك الفوز العظيم"۔ (حسن غريب)

شہر بن حوشب فرماتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مرد یا عورت ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں پھر جب ان کو موت آنے لگتی ہے تو وہ وصیت کرنے میں ضرر پہنچاتے ہیں اس طرح ان کے لئے جہنم واجب ہوجاتی ہے، پھر ابوہریرہؓ نے یہ آیت پڑھ کر مجھے سنائی "من بعد وصية" الخ۔

تشریح:۔ ہمارے پاس موجود ترمذی کے نسخوں میں یہاں باب کا عنوان نہیں ہے مگر امام ترمذیؒ کے طرز عمل کے مطابق باب ہونا چاہئے جیسا کہ صاحب عارضہ وتحفہ دونوں نے نقل کیا ہے اس کی وجہ پہلے رفع یدین عندالرکوع کے باب میں گذری ہے، نیز ان دونوں شروح کے متن پر اس حدیث کی تصحیح منقول ہے: "قال ابو عيسیٰ هذاحديث حسن صحيح غريب" الخ۔

یہاں ساٹھ سال سے اوسط عمر مراد ہے اور جہنم کا واجب ہونا از قبیل خاصیت المفرد ہے جس کا تذکرہ بارہا گذرا ہے یعنی اس عمل کی اپنی خاصیت اور تاثیر یہ ہے کہ ایسا کرنے والا لازمی طور پر جہنمی ہو اگرچہ حساب تو تمام اعمال کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جائے گا۔ تدبر

وصیت میں ضرر کا مطلب وارث کو کسی طرح حق تلفی کر کے ناراض کرنا ہے جس کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں مثلاً وارث کو کلی یا جزوی طور پر محروم کرنا کسی کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے جھوٹا اقرار بالمال کرنا وغیرہ۔

باب ماجاء فی الحثّ علی الوصیة

"عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :ماحق اِمرِءٍ مسلم یبیت لیلتین ولہ مایوصی فیہ الاووصیة مکتوبة عندہ"۔ [۱] (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لائق نہیں ہے کسی مسلمان کے لئے کہ وہ دو راتیں گذارے اور اس کے پاس قابل وصیت کوئی چیز موجود ہو مگر اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہئے۔

تشریح:۔ اس متنِ حدیث حدیث کی دوتر کیبیں "باب ماجاء فی الحث علی الوصیۃ"، من ابواب الجنائز میں گذری ہیں۔ (فلیراجع تشریحات ترمذی ج ۴ص ۲۳۲) اس حدیث کی جو تشریح وہاں کی گئی ہے وہ کافی ہے، یہاں اس کا خلاصہ پیش ہے: ظاہر یہ کے نزدیک وصیت کرنا واجب ہے۔ حدیث باب سے ان کا استدلال ہے، علاوہ ازیں یہ آیت بھی بظاہر ان کی مستدل ہے: "کتب علیکم اذاحضر احدکم الموت ان ترک خیرأن الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف"۔ [۲] جمہور کے نزدیک اگر کسی کے ذمہ واجب الاداء حقوق ہوں تو پھر تو اس کے متعلق آگاہی اور وصیت واجب ہے ورنہ ضروری نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر صحابہ کرامؓ نے وصیتیں نہیں کی ہیں، جو عدم وجوب کی بڑی دلیل ہے۔ حدیث الباب کا جواب یہ ہے کہ مسلم کی روایت میں "لہ شیء یرید ان یوصی فیہ" [۳] کے الفاظ ہیں اور ارادہ وجوب کی نفی کرتا ہے، آیت کا حکم منسوخ ہے ناسخ یہ آیت ہے: "یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم" [۴] الخ یا یہ حدیث ہے "لاوصیة لوارث" [۵] جبکہ آیت میں والدین کا ذکر ہے جو کہ ورثہ ہیں۔ پیچھے عرض کیا جاچکا ہے

باب ماجاء فی الحث علی الوصیة

[۱] الحدیث اخرجه البخاری ص:۳۸۲ ج:۱ کتاب الوصایا، صحیح مسلم ص:۳۹ ج:۲ کتاب الوصیة، ابوداؤد کتاب الوصایا "باب ماجاء فیما یؤمر به من الوصیة" سنن نسائی کتاب الوصایا "باب الکراهیة فی تاخیر الوصیة" موطا مالک کتاب الوصیة "باب الامر بالوصیة" سنن دارمی ص:۴۹۵ ج:۲ حدیث:۳۱۷۵. [۲] سورة البقرة آیت:۱۸۰.

[۳] صحیح مسلم ص:۳۹ ج:۱ کتاب الوصیة. [۴] سورة النساء آیت:۱۱. [۵] رواه ابن ماجه ص:۱۹۵ ابواب الوصایا، سنن ابی داؤد ص:۴۰ ج:۲ کتاب الوصیة، سنن نسائی ص:۱۳۱ ج:۲ "باب ابطال الوصیة للوارث" ابواب الوصایا، ایضاً مسند احمد ص:۲۰۴ ج:۵ حدیث:۱۷۲۱۰، اعلاء السنن ص:۳۰۱ ج:۱۸ کتاب الوصایا.

کہ امام شافعیؒ اس حدیث کو باوجود ضعف کے ناسخ مانتے ہیں لتعامل الائمۃ والامۃ بہ۔

امام ترمذیؒ نے بھی جمہور کے موقف کے مطابق دونوں جگہوں میں ایک ہی طرح باب کا ترجمہ مرتب کیا ہے اوراس میں ''حث'' کا لفظ لائے ہیں جوترغیب اورابھارنے کے لئے آتا ہے نہ کہ وجوب کے لئے، نیز آگے باب باندھا ہے۔

باب ماجاء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یوص

''عن طلحۃ بن مصرِّف قال قلت لابن ابی اوفیؓ:اَوصَی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ؟قال ''لا'' قلت وکیف کُتِبتِ الوصیۃُ وکیف اَمَرَالناسَ؟قال اوصی بکتاب اللّٰہ تعالیٰ''۔(حسن صحیح)[1]

طلحہ بن مصرفؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن ابی اوفیؓ سے دریافت کیا کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، میں نے پوچھا پھر (قرآن میں) وصیت کیسے فرض کی گئی؟ اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کواس کا حکم کیسے دیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ پرعمل کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔

تشریح:۔حضرت طلحہ بن مصرف کا سوال یاتو مالی وصیت کے بارے میں تھا جیسا کہ دوسرے سوال کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے جودوحوالے دیئے ہیں ان دونوں میں مالی وصیت مراد ہے یاپھر حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق پوچھنا مقصود تھا کیونکہ شیعہ نے یہ بات مشہور کردی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے بارے میں خلافت کی وصیت فرمائی تھی اورثلث مال کی بھی، چنانچہ یہی سوال حضرت علیؓ اورحضرت عائشہؓ سے بھی ہوا تھا اوردونوں نے نفی میں جواب دیا تھا۔

بہرحال جب حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ نے نفی میں جواب دیا تو اگرچہ یہ نفی والا جواب عام نہیں تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی وصیتیں فرمائی تھیں جیسے یہود ونصاریٰ کا جزیرۃ العرب سے اخراج، وفود سے حسن سلوک، لشکر اسامہ کی روانگی، انصار کے ساتھ نیک برتاؤ وغیرہ وغیرہ مگر بظاہر یہ لفظ یعنی کلمہ

باب ماجاء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یوص

[1] ایضاً رواہ الدارمی ص:۴۹۶ ج:۲ حدیث:۳۱۸۰.

''لا'' عموم نفی پر دلالت کرتا ہے اس لئے انہوں نے پھر سوال کیا کہ قرآن میں جو وصیت کا حکم ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو وصیت کا جو حکم فرمایا تو کیوں نہ انہوں نے خود ایسا کیا؟

جواب ثانی کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں تو یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس خیر یعنی مال ہو تو وہ وصیت کرے، وہ بھی منسوخ ہے۔ کمامرّ۔ اور حدیث کا بھی وہی مطلب ہے جیسا کہ باب سابق میں گذرا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مال تھا ہی نہیں اور جتنا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کیا اور صدقہ کرنے کا حکم دیا، ہاں البتہ نفس وصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جو کتاب اللہ کو تھامنے اور اس پر عمل کرنے کے بارے میں ہے، اور اس حدیث سے باقی وصایا کی نفی مراد نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ کوئی وصیت نہیں فرمائی بلکہ پہلے سوال کے جواب میں لفظ ''لا'' عام والمراد منہ الخاص اور دوسرے میں کتاب اللہ خاص والمراد منہ العام ہے اور بلاغت میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کبھی مراد متکلم مراد کلام سے عام ہوتی ہے اور کبھی خاص۔ والقاعدۃ مشھورۃ ومعروفۃ۔ تو جس طرح ''من قال لاالہ اللہ دخل الجنۃ'' [۲] میں رسالت بھی مراد ہے کیونکہ لا الہ اللہ توحید ورسالت دونوں کے لئے اسم علم بن گیا ہے جیسے الحمد شریف پوری فاتحہ کا نام ہے تو اسی طرح کتاب اللہ بھی قرآن وسنت دونوں کا اسم علم ہے۔ فلیحفظ

باب ماجاء لاوصیّۃ لِوارث

"عن ابی امامة الباهلی قال سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول فی خطبته عام حجة الوداع :ان اللّٰه تبارك وتعالیٰ قداعطی کل ذی حق حقه فلاوصیة لوارث،الولدللفراش وللعاهر الحجروحسابهم علی الله تعالیٰ ومن ادعی الی غیرابیه وانتمیٰ الی غیرموالیه فعلیه لعنة اللّٰه التابعة الی یوم القیٰمة لاتنفق اِمرأة من بیت زوجهااِلّاباذن زوجهاقیل یارسول اللّٰه ولاالطعام؟ قال:ذاك افضل اموالنا،وقال العاریة مؤدّاة والمنحة مردودة والدین مقضیّ والزعیم غارم"۔ (هذاحدیث حسن)

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۲] اخرجه الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۷۱۶۳، والاوسط حدیث: ۲۴۲۶ بحواله مجمع الزوائد ص: ۳۲ ج: ۱ حدیث: ۲۲، ایضاً راجع للاحادیث جمع الفوائد ص: ۷ تا ۱۲ ج: ۱ کتاب الایمان، دارالکتب العلمیة بیروت.

کو حجۃ الوداع کے سال فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا پس اب کسی وارث کے لئے وصیت نہیں، اور بچہ صاحب فراش (خاوند) کا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے اور ان کا حساب اللہ کے پاس ہے اور جو شخص اپنی نسبت غیر باپ کی طرف کرے یا کوئی غلام اپنا انتساب غیر آقاؤں کی جانب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت ہوگی جو قیامت تک اس کے در پے رہے گی، کوئی عورت خرچ نہ کرے اپنے شوہر کے گھر (مال) سے مگر اپنے شوہر کی اجازت سے، دریافت کیا گیا ''اے اللہ کے رسول کھانا بھی نہیں دے سکتی''؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تو ہمارے اموال کا بہتر حصہ ہوتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مانگی ہوئی چیز واپس کی جائے گی (یعنی بلا کمی بیشی کے) اور دودھ والے جانور کو (یا مثلاً درخت وغیرہ) واپس کیا جائے گا اور دین ادا کیا جائے گا اور کفیل ذمہ دار ہے۔

تشریح: قولہ "ان اللّٰہ تبارك وتعالیٰ اعطیٰ کل ذی حق حقہ فلاوصیۃ لوارث'' قدیم عربوں میں وصیت کا دستور تھا اسلام کے اوائل میں یہ حکم فرض تھا مگر جب میراث کے احکام نازل ہوئے تو وارث کے لئے وصیت ختم کردی گئی کیونکہ جب ہر آدمی کو اس کا حصہ مل گیا تو پھر اس کے لئے وصیت کی ضرورت ختم ہوگئی لہٰذا اب ماں باپ وغیرہما کے لئے وصیت کی چنداں ضرورت نہیں، یہ حدیث معنی کے اعتبار سے محکم ومتواتر ہے اگرچہ سنداً اتنی قوی نہیں، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں: ''صحیح اجمعت الامۃ علی صحۃ الخبر وھو ناسخ الآیۃ بالاجماع'' اسی طرح امام شافعیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

"حدیث لاوصیۃ لوارث انہ لایثبتہ اھل الحدیث ولکن العامۃ تلقتہ بالقبول وعملوابہ حتی جعلوہ ناسخاً لآیۃ المیراث "۔ (ماتمس الیہ الحاجۃ ص:۲۴)

قولہ "الولد للفراش" الخ یعنی جس کے فراش پر بچہ پیدا ہو خواہ وہ فراش بیوی ہو یا باندی تو اس کی نسبت شوہر یا آقا کی طرف ہوگی زانی محروم ہوگا۔ قولہ "وحسابھم علی اللّٰہ" یہ دفع توہم ہے کہ اگرچہ اس میں ولد الزنا ہونے کا احتمال ہے مگر وہ تو ایک خفیہ معاملہ ہے، اس کا حساب اللہ کے پاس ہے۔ جہاں تک ضابطے کی بات ہے تو وہ یہ ہے کہ حتی الامکان بچے کا نسب صاحب فراش سے ثابت مانا جائے گا۔ قولہ "ومن ادعی الی غیر ابیہ" الخ یعنی اس واضح اور صاف ضابطے کے باوجود جو شخص اپنا نسب غیر شرعی باپ یا آقا کی طرف منسوب کرے گا تو وہ ملعون ہوگا۔ الولد للفراش کی تفصیل پہلے گذری ہے (دیکھئے تشریحات ج ۵ ص ۳۳، باب ماجاء ان الولد للفراش، من ابواب الرضاع)

قولہ "لاتنفق امرأة من بيت زوجها إلا باذن زوجها" یعنی عورت شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے اور اپنے من پسند لوگوں کو شوہر کے مال میں سے کچھ نہیں دے سکتی کیونکہ ملک زوج کی ہے اور کسی کی ملک میں اس کے اذن کے بغیر تصرف جائز نہیں البتہ اذن، عام ہے خواہ صراحتاً ہو یا دلالۃً دونوں صورتوں میں بقدرِ اذن دے سکتی ہے اس میں پکا ہوا کھانا اور طعام یعنی غیر مطبوخہ چیز جس کے بارے میں سوال پوچھا گیا ہے برابر ہے۔ یہ مسئلہ بھی تفصیلاً پہلے گذرا ہے اگر چاہیں تو دیکھئے (تشریحات ج ۳ ص ۱۵۷، باب ماجاء فی نفقۃ المرأۃ من بیت زوجہا، من ابواب الزکوٰۃ)

قولہ "العارية مؤدّاة" یعنی مستعار اور مانگی ہوئی چیز مالک کو واپس دینا ضروری ہے۔ قولہ "والمنحة مردودة" منحہ اور منیحہ وہ جانور یا درخت اور قرض پیسے وغیرہ ہیں جو کسی کو اپنی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے دیئے جائیں مثلاً دودھ کچھ مدت کے لئے حاصل کرلیا یا پھل دار درخت دے دیا اور جب اس نے دودھ کچھ مدت کے لئے حاصل کرلیا اور درخت کا پھل توڑ لیا تو پھر اصل کو واپس دے دیا یہ جائز ہے اور مستفید کو اس پر قبضہ یا دعوی ملک کی اجازت نہیں ہے۔

قولہ "والدين مقضى" دین واجب الاداء ہے۔ قولہ "والزعيم غارم" کفیل ذمہ دار اور ضامن ہے حدیث کے یہ آخری تینوں احکام اتفاقی ہیں جبکہ "العارية مؤدّاة" میں اختلاف ہے کہ آیا بلا تعدی ہلاک ہونے کی صورت میں تاوان ہے یا نہیں؟ جبکہ تعدی میں بالاتفاق تاوان ہے تو شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک دونوں صورتوں کا حکم یکساں ہے یعنی تاوان بھرنا پڑے گا جبکہ حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک بغیر تعدی کی صورت میں تاوان اس لئے نہیں ہے کہ یہ امانت ہے فحكمها كحكمها، اس مسئلے کی تفصیل بھی پہلے گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج:۵ ص:۱۹۸، باب ماجاء ان العاریۃ مؤدّاۃ، من ابواب البیوع)

حدیث عمرو بن خارجۃ:۔ ان النبي صلى الله عليه وسلم خطب على ناقته وانا تحت جرانها وهي تقصع بجرّتها وان لعابها يسيل بين كتفيّ فسمعته يقول ان الله عزوجل اعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث والولد للفراش وللعاهر الحجر"۔[1]

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر خطبہ

باب ماجاء لاوصية لوارث

[1] رواه ایضاً احمد فی مسنده ص: ۲۰۴ ج: ۵ حدیث: ۱۷۲۱۱، ۱۷۲۱۵، ۱۷۲۱۶۔

ارشاد فرمایا جبکہ میں اس کے گلے کے نیچے تھا اس وقت وہ جُگالی کر رہی تھی اور اس کا لعاب میرے دونوں شانوں کے درمیان ٹپک رہا تھا پس میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سُنا کہ اللہ عز وجل نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے پس وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں اور بچہ صاحب فراش کا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے۔

تشریح:۔قولہ "جران" ہنسلی کی ہڈی سے لے کر گلے کے اس حصے تک ہوتا ہے جس میں اونٹ کو ذبح کیا جاتا ہے یعنی مذبح ومنحر کے مابین۔قولہ "تقصع" بمعنی تبتلع۔قولہ "بجرتها" الجرة بالکسر، وہ محلول جو سفید جھاگ کی مانند ہوتا ہے اسے جگالی کہتے ہیں، یہ وہ جانور کرتے ہیں جن کے اوجھ میں دو خانے ہوتے ہیں اس سے حلال وحرام کے فرق کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

قولہ "وان لعابها یسیل" الخ راوی کا اس طرح بیان کرنا یا تو تلذذ کے لئے ہوتا ہے کہ وہ منظر کتنا حسین ہوگا کہ جہاں رحمۃ للعالمین اور شفیع المذنبین ہوں اور جان نثاران مؤمنین کا جُھرمٹ اور حرم پاک کی سرزمین ہو یہ نظارہ یقیناً ستاروں کے درمیان ماہتاب کے جلوے سے زیادہ پُرنور ہوگا جو اس میں ایک بار حاضر رہا آفتاب دو عالم کے بعد وہ اس منظر کو کیسے بھول سکتا ہے اور اسے یاد کر کے کیوں نہ وہ محظوظ ہوگا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بتلانا مقصود ہو کہ یہ روایت مجھے اچھی طرح یاد ہے حتیٰ کہ وہ وقت اور حالت بھی مجھے یاد ہے تو کیوں ضروری و بنیادی بات یاد نہ ہوگی۔ وغیر ذالک من الوجوہ۔

اونٹنی پر خطبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے ورنہ عام لوگوں کے لئے جانور کی پشت بطور منبر استعمال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے۔

باب ماجاء یبدأ بالدین قبل الوصیة

"عن علی ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قضیٰ بالدین قبل الوصیة وأنتم تقرؤن الوصیة قبل الدین"۔[1]

باب ماجاء یبدأ بالدین قبل الوصیة

[1] وفی الدارمی: حدثنا قبیصة حدثنا سفیان عمن سمع ابراهیم قال یبدأ بالکفن ثم بالدین ثم بالوصیة ص:۵۰۷ ج:۲ حدیث:۳۲۳۹.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی ادائیگی کا فیصلہ وصیت (پرعملدرآمد) سے پہلے فرمایا تھا اور تم تو وصیت دین سے پہلے پڑھتے ہو، یعنی اس آیت "من بعد وصیة یوصین بها او دین" [۲] وغیرہا میں۔

تشریح:۔ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ اخبار بمعنی انشاء ہے یعنی تم لوگ اس آیت میں وصیت جو پہلے پڑھتے، سنتے اور دیکھتے ہو تو اس کا مطلب سمجھا کرو کہ دین مقدم ہے حکماً واداءً گو مؤخر ہے ذکراً، پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ وصیت کی تقدیم اس کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی غرض سے ہے۔ (دیکھئے "باب ماجاء فی میراث الاخوة من الاب والام"۔ نیز وہاں حدیث کی سند کے متعلق بھی کلام دیکھا جاسکتا ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یتصدق اویعتق عندالموت

"عن ابی حبیبة الطائی قال اوصیٰ الیَّ اَخی بطائفة من ماله فَلَقیتُ اباالدرداء فقلتُ ان اخی اوصیٰ اِلیَّ بطائفة من ماله فاین تریٰ لی وَضْعَه فی الفقراء والمساکین والمجاهدین فی سبیل اللّٰه؟ قال: اَمّا اَنا فلو کنتُ لم اَعْدِل بالمجاهدین سمعتُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: مَثَلُ الذی یُعتق عندالموت کَمَثَلِ الذی یهدی اذاشبعَ"۔ (حسن صحیح)

ابوحبیبہ طائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے بھائی نے اپنے مال کے کچھ حصے کی مجھے وصیت کی تھی (یعنی صدقہ کرنے کی) تو میری ملاقات حضرت ابودرداء (رضی اللہ عنہ) سے ہوئی، میں نے ان سے کہا کہ میرے بھائی نے اپنے مال کے ایک حصے کے بارے میں مجھے وصیت کی ہے تو آپ کی رائے میں میرے لئے وہ کس مد میں خرچ کرنا مناسب ہے فقراء ومساکین میں یا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں میں؟ انہوں نے فرمایا جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو میں مجاہدین کے برابر کسی کو نہیں سمجھتا مگر بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کی مثال جو موت کے وقت آزاد کرتا ہے اس شخص کی مانند ہے جو پیٹ بھرنے کے بعد ہدیہ کرتا ہے۔

تشریح:۔ ابوحبیبہ کے بھائی نے ان کو وصی تو بنالیا تھا مگر کسی مد کا تعین نہیں کیا تھا کہ فلاں جگہ خرچ کرلو اس لئے انہوں نے بہتر جگہ اور موزوں ترین مد کی تلاش میں حضرت ابودرداءؓ سے مشورہ کیا بلکہ استفتاء کیا، جواب

---

[۲] سورة النساء آیت: ۱۲.

میں حضرت ابودرداءؓ نے جو تعبیر فرمائی اس سے معلوم ہوا کہ بجائے آخری گھڑی کے حالت صحت میں صدقہ افضل ہے کیونکہ ایسے میں آدمی کے زہد کا پتہ چلتا ہے جبکہ آخری سانسوں میں صدقہ کرنے سے تو اپنے آپ کو وارثوں پر مقدم کرنا ہے جس سے بجائے ایثار کے حقوق سے فرار کا عندیہ ملتا ہے جو مستحسن نہیں۔ گویا یہ بدی بصورت نیکی سی معلوم ہوتی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ جب اشیاء میں رغبت تھی تو ان کو اپنے پاس رکھا اور جب رغبت کم یا ختم ہوگئی تب ان کو اللہ کی راہ میں چلتا کر دیا یہ تو ایسا ہے جیسے آدمی خود کھاتا رہے اور صدقے کی فکر نہ کرے مگر جب بچ جائے تب ہدیہ یا صدقہ کرے، تاہم اگر کوئی شخص ایسا کرے تو پھر بھی بذات خود یہ ایک اچھا قدم ہے مگر پہلی صورت کی طرح نہیں اس لئے اس کے ثواب کو بڑھانے کی تدبیر ہونی چاہئے اس لئے حضرت ابودرداءؓ نے ایک بہترین مد کی نشاندہی فرمائی کہ جب وہ صدقہ جو بذات خود روحانی طاقت میں کمزور ہے اگر اسے جہاد جیسے عمل میں لگایا جائے اور اس سے حیات اسلامی کو تقویت ملے تو اس سے صدقہ کی روح بھی طاقت ور ہو جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ احیاء اسلام اور ابقائے دین کے مساوی کوئی مصرف نہیں اس لئے مجاہدین کے گھوڑے کی لید اور پیشاب بھی ترازوئے اعمال میں تولا جائے گا، طالب علم جب اپنے اوپر خرچ کرتا ہے تو قوی امید ہے کہ وہ اس کا صدقہ شمار ہوگا اور جو لوگ طلبہ پر خرچ کرتے ہیں ان کے لئے اس حدیث میں بڑی خوشخبری ہے ''فبذالك فليفرحوا''۔

بابٌ

"عن عروة عن عائشة اخبرته ان بريرة جاء ت تستعين عائشة فى كتابتهاولم تكن قضت من كتابتهاشيئاًفقالت لهاعائشة اِرجعى الى اهلِكِ فان اَحَبُّوا ان اقضى عنك كتابتكِ ويكون ولاء كِ لِى فعلتُ فذكرت ذالك بريرة لِاهلهافابَوا وقالوا:ان شاء ت ان تحتسب عليكِ ويكون لنا ولائكِ فلتفعل فذكرت ذالك لرسول الله صلى الله عليه وسلم فقالهارسول الله صلى الله عليه وسلم : ابتاعى فاعتقى فانماالولاء لِمَن اعتق ثم قام رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال:مابال اقوام يشترطون شروطاًليست فى كتاب الله؟من اشترط شرطاًليس فى كتاب الله فليس له وان اشترط مائة مرة"۔ (حديث حسن صحيح)

حضرت عروہ اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ

نے ان کو خبر دی ہے کہ بریرہ آئی وہ اپنی کتابت میں حضرت عائشہؓ سے مدد مانگ رہی تھی (یعنی بدل کتابت کی) جبکہ انہوں نے خود بدل کتابت میں سے کچھ بھی ادا نہیں کیا تھا، پس حضرت عائشہؓ نے ان سے فرمایا جاؤ اپنے موالی کے پاس (اور ان سے پوچھو کہ) اگر وہ یہ پسند کریں کہ میں تیرا بدل کتابت ادا کر دوں اور تیری ولاء میری ہو جائے گی تو میں ایسا ہی کرلوں گی چنانچہ بریرہ نے اس کا تذکرہ اپنے موالی سے کیا، تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہنے لگے اگر عائشہؓ تجھ پر ثواب کمانا چاہیں اس شرط پر کہ تیری ولاء ہماری ہی رہے گی تو وہ کرلیں چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا خرید لو اور آزاد کر دو کیونکہ ولاء بے شک اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ارشادِ خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ایسی شرائط لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں نہیں ہوتی ہیں (یعنی روا نہیں) جو شخص ایسی شرط لگائے جو اللہ کی کتاب میں نہ ہو تو وہ شرط اس کے حق میں نہ ہوگی اگرچہ وہ سو (۱۰۰) شرائط عائد کرے۔

تشریح:۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ایک یہودی کی باندی تھیں اس نے ان کو مکاتبہ بنایا مگر ان کے پاس بدل کتابت کا بندوبست نہ تھا وہ اس غرض سے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنا مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ جب مکاتب ادائے کتابت سے قاصر ہو اور عجز کا اظہار کرے تو اس کی خرید و فروخت جائز ہو جاتی ہے اس لئے ام المؤمنین نے خریدنے کی ہامی بھر لی کہ تم جاؤ اور اپنے آقاؤں سے بات کرو مگر ان لوگوں نے یہ شرط لگائی کہ اگر ام المؤمنین خرید کر آزاد کرنا چاہیں تو ٹھیک ہے مگر ولاء پھر بھی ہماری ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو رد فرمایا۔ اس حدیث کی مزید وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔
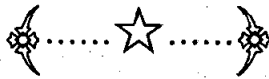
ابواب الوَلاء والھبة

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء ان الولاء لمن اعتق

"عن عائشةؓ انها ارادت ان تشتری بریرة فاشترطوا الوَلاء فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم: الولاء لمن اعطی الثمن اولِمن وَلِیَ النعمة"۔[1] (حسن صحیح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بریرہ کے خریدنے کا ارادہ فرمایا تو ان لوگوں (بریرہ کے موالی) نے ولاء اپنے پاس رکھنے کی شرط لگادی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولاء تو اسی کی ہے جو قیمت ادا کرے یا فرمایا کہ نعمت حاصل کرے۔

تشریح:۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا (بروزن کریمہ) انصار کے ایک قبیلہ والوں کی کنیز تھیں، شیخ نے لمعات میں لکھا ہے کہ ان کے موالی یہود تھے، جمع ممکن ہے کہ انصار میں اولاً یہودی تھے۔ یہ حضرت عائشہؓ کی خدمت کیا کرتی تھیں، صاحب فراست تھیں، اس لئے انہوں نے عبدالملک کو عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی خلافت کی خوشخبری سنادی تھی، موالی نے ان کو مکاتبہ بنایا تھا البتہ اس بارے میں روایات میں تھوڑا سا اختلاف ہے کہ عقد کتنے پیسوں کے عوض ہوا تھا لیکن بہرحال وہ ادائیگی سے قاصر تھیں، اس لئے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آئیں جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث میں گذرا ہے، حضرت عائشہؓ نے خریدنے کا ارادہ فرمایا مگر ان کے موالی نے ولاء کی شرط اپنے لئے لگادی چونکہ یہ ایک باطل شرط تھی کیونکہ بیع مع الشرط جائز نہیں اور سود کے زمرے میں داخل ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سختی سے رد فرمایا۔ باب کی حدیث میں لفظ ''او'' راوی کے شک پر محمول ہے، عام روایات میں لفظ ''واؤ'' یعنی بغیر ہمزہ کے ہے ''الولاء لمن اعطی الثمن وَوَلِیَ النعمة''[2] مطلب

ابواب الولاء والھبة عن رسول اللہ ﷺ

باب ماجاء ان الولاء لمن اعتق

[1] اخرجه ایضاً بخاری ص:۹۹۹ ج:۲ کتاب الفرائض، سنن ابی داؤد ص:۴۸ ج:۲ "باب فی الولاء" کتاب الفرائض، مسنداحمد ص:۲۶۷ ج:۷ حدیث:۲۵۰۰۶۔ [2] کذا فی روایة ابی داؤد حواله بالا۔

یہ ہے کہ ولاء اس مالک کی ہے جو خرید کر آزاد کردے لہٰذا نعمۃ سے مراد اعتاق ہے جو ولاء کی نعمت وحصول کو مستلزم ہے۔ لیکن اس حدیث میں بعض مقامات کو سمجھنے میں کافی الجھن محسوس ہوتی ہے، چنانچہ:

پہلی الجھن:۔ یہ پیش آتی ہے کہ جب حضرت بریرہ مکاتبہ تھیں تو حضرت عائشہؓ نے ان کو کیسے خرید لیا جبکہ حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک یہ جائز نہیں، یہ اعتراض مالکیہ وحنابلہ پر وارد نہیں ہوتا کیونکہ ان کے یہاں بیع المکاتب جائز ہے، اس لئے ہر فریق نے اس کی الگ الگ تشریح کی ہے: مالکیہ وحنابلہ کہتے ہیں کہ مکاتب قابل بیع ہے اور بعد البیع بھی کتابت باقی رہے گی لہٰذا جب وہ مشتری کو اقساط ادا کردیگا تو آزاد ہوجائے گا، جبکہ ہمارے یہاں اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مکاتب ادائے بدل کتابت سے قاصر آجائے اور مولی اسے عاجز قرار دے کر عقد کتابت باہم رضامندی سے ختم کردیں تب ہی وہ قِن بن کر قابل بیع ہوجاتا ہے، اور یہاں حدیث میں یہی صورت پیش آئی تھی جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

دوسری الجھن:۔ دوسری الجھن یہ پیدا ہوئی کہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس شرط کی سختی سے تردید فرمائی جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث میں ہے: ''مـا بـال اقـوام يشـتـرطـون شروطاًليست فى كتاب اللّٰه ''الخ کتاب اللہ سے مراد خدا کا حکم ہے یا قرآن کا اقتضاء ہے یعنی ایسی شرائط کی کوئی حیثیت نہیں جو شریعت میں ممنوع ہوں جبکہ مسلم[۳] کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: ''اشتريهـا واعتقيهاو اشترطى لهم الولاء فان الولاء لمن اعتق ''الخ یعنی ولاء تو بہرحال تیری ہے مگر یہ شرط ان کی مان کر خرید لو اور آزاد کرلو۔ بظاہر اس پر دھوکہ دہی کا شبہ وارد ہوتا ہے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔ اس کا ایک جواب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے دیا ہے کہ یہ از قبیل ارخاء العنان کے ہے۔ دوسرا جواب امام نوویؒ نے شرح مسلم میں دیا ہے کہ اگرچہ اصولی طور پر بیع مع الشرط تو منع ہے مگر یہ قضیہ اس سے مستثنیٰ ہے اور ایسے قضیے کا عموم نہیں ہوتا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع کو ظاہری شرط کے ساتھ بطور خاص جائز فرمادیا تاکہ بعد میں اس کو باطل قرار دیں اور ایسا طرز عمل وطرز تعلیم زیادہ مؤثر ہوتا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حجۃ الوداع میں احرام حج کی اجازت دے دی اور پھر اسے فسخ فرمادیا کہ ان کو عمرہ کی ادائیگی کے بعد حلال ہونے کا حتمی حکم دیا تاکہ ان کی زمانۂ جاہلیت والی عادت پوری طرح ختم ہوجائے۔ تو یہاں بھی مبالغہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط کو جاری رکھا اور پھر اسے ختم فرمادیا گویا خطبہ شراء سے مؤخر

---

[۳] صحيح مسلم ص: ۴۹۴ ج: ۱ كتاب العتق.

ہے۔

دونوں جوابوں کا مآل ومرجع ایک ہی ہے کہ یہ شرط باطل تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نظرانداز یا بظاہر جاری فرمادیا اور پھر اس کی نہی فرمادی: ''وقد تحتمل المفسدة اليسيرة لِتحصيل مصلحة عظيمة''۔ اس سے معلوم ہوا کہ عظیم فائدے کی خاطر معمولی نوعیت کا نقصان اٹھانا جائز ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر عورت ہوشیار ہو تو وہ اپنے مال میں خرید وفروخت وغیرہ کا اختیار رکھتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب معاشرے میں کوئی منکر رونما ہو تو امام اس پر تنبیہ کر کے اس سے منع کردے۔ وعظ ونصیحت میں نرمی برتنے اور عام خطاب کی ترغیب بھی معلوم ہوئی وغیرہ۔ بہت سے فوائد کی حامل اس حدیث پر امام نوویؒ نے تفصیل سے بحث فرمائی ہے، چھ مواضع اور تیس فوائد بیان کئے ہیں۔ (جو چاہے تو وہ دیکھے شرح مسلم للنووی ص: ۴۹۳ وص: ۴۹۴ جلد: ۱، باب بیان الولاء لمن اعتق)

باب النهى عن بيع الولاء وهبته

"عبدالله بن عمران رسول الله صلى الله عليه وسلم :نهى عن بيع الولاء وهبته"۔[1] (حسن صحيح)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاء بیچنے اور ہبہ کرنے سے ممانعت فرمائی ہے۔

تشریح:۔ ایک روایت میں ہے ''الولاء لُحمة كَلُمحة النسب''[2] یعنی جس طرح نسب بیچا اور ہبہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک جڑی ہوئی حقیقت ہے اسی طرح ولاء بھی ہے اور جس طرح بیٹا باپ کی وجہ سے گویا حیات سے سرفراز ہو جاتا ہے اسی طرح آزاد کردہ غلام اپنے آقا کی وجہ سے رقیت جو ایک گونہ موت وعدم حیات ہے سے چھٹکارا پاتا ہے۔

اس حدیث کے مضمون پر اجماع ہے، ابن العربیؒ عارضہ میں فرماتے ہیں کہ بعض صحابہ ولاء کی بیع

باب النهى عن بيع الولاء والهبة

[1] رواه الستة واحمد، سنن دارمی ص: ۴۹۰ ج: ۲ حديث: ۳۱۵۶۔

[2] رواه الدارمی ص: ۴۹۰ ج: ۲ حديث: ۳۱۵۹، ايضاً مجمع الزوائد ص: ۲۹۹ ج: ۴ حديث: ۷۱۸۱۔

اور ہبہ کے جواز کے قائل تھے مگر حدیث الباب ان کے خلاف حجت ہے تاہم آج کل نہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور نہ ہی عملی اختلاف کے لئے کوئی محل ومیدان ہے۔

قولہ "ویُروىٰ عن شعبة قال لوددت ان عبدالله بن دينار" الخ یعنی شعبہ فرماتے ہیں کہ میری خواہش تھی کہ عبداللہ بن دینار یہ حدیث بیان کرتے وقت مجھے اجازت دیتے تو میں اٹھ کر ان کے سر کو چومتا کیونکہ یہ واحد شخص ہے جن پر اس حدیث کی تمام اسانید جن کی تعداد پینتیس (۳۵) تک پہنچتی ہے جا کر ملتی ہیں اور جنہوں نے بغیر ان کی وساطت کے نقل کی ہے وہ ان کے وہم پر مبنی ہے جیسے یحیی بن سلیم کے طریق میں ہے۔ عارضہ میں ہے کہ جب صحابی کہے کہ "امر النبی صلی الله علیه وسلم بکذا او نهی عن کذا" تو وہ روایت بالمعنی ہوتی ہے جو بالاجماع قبول ہے۔

باب ماجاء فی من تولی غیر موالیه او ادعی الی غیر ابیه

"عن ابراهيم التيمى عن ابيه قال خَطَبَنَاعَلِیٌّ فقال:من زعم ان عندناشيئاًنقرؤه الا كتاب اللّٰه وهذه الصحيفة صحيفة فيهااَسْنان الابل واشياء من الجراحات فقد كذب وقال فيهاقال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم :المدينة حرم مابين عَيْرٍ الى ثور فمن اَحدث فيهاحَدَثاًاو اوىٰ مُحْدِثاًفعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين لايقبل الله منه يوم القيٰمة صرفاًولاعدلاًومن ادعىٰ الى غير ابيه او تولى غيرمواليه فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين لايُقْبَلُ منه صرف ولاعدلٌ وذمة المسلمين واحدة يسعىٰ بهاادناهم"۔ (حسن صحیح)

حضرت ابراہیم التیمی اپنے والد حضرت یزید بن شریک التیمی تیم الرباب الکوفی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا حضرت علی نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ جس شخص کا یہ غلط گمان ہو کہ ہمارے (اہل بیت کے) پاس کتابِ اللہ اور اس صحیفے کے علاوہ کوئی دستاویز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں تو وہ جھوٹا ہے۔ اس صحیفے میں تو اونٹوں کی عمروں کی بابت اور زخموں کی دیت کے متعلق کچھ احکام ہیں اور فرمایا کہ اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیر سے ثور تک پارۂ مدینہ حرم ہے پس جو شخص اس میں نئی باتیں گھڑے گا یا ایسا کرنے والے کو جگہ (پناہ) دے گا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور سارے فرشتوں اور لوگوں کی لعنت ہے قیامت کے دن اللہ نہ اس کی فرض عبادت قبول فرمائیں گے اور نہ نفلی، (بعض نے اس کا ترجمہ بالعکس بھی کیا ہے) اور جو

شخص اپنا نسب غیر باپ کی طرف منسوب کرے یا کوئی موالی (آزادشدہ غلام) اپنا انتساب غیر آقا کی جانب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور سب فرشتوں اور لوگوں کی بھی، نہ تو اس کی نفل عبادت قبول ہوگی اور نہ ہی فرض، (والجمہور علی عکسہ کمامر) اور سب مسلمانوں کی امان ایک ہی ہے ایک ادنیٰ مسلمان بھی امان دینے کا حق رکھتا ہے۔

لغات:۔ قولہ "المدینۃ حرم" مدینہ منورہ کا نام تمدن سے نہیں ہے جیسے عام شہروں کے لئے مدینہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے بلکہ تَدَیُّن بمعنی اطاعت سے ہے یعنی وہ شہر جہاں اللہ عزوجل کی اطاعت سب سے زیادہ ہوئی ہے اور ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی حتی کہ اسلام سانپ کی طرح سمٹ کر حرمین میں واپس آجائے گا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ والوں نے کما حقہ مقام نہیں دیا اور اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تنگ کر دیا تو یثرب والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے پیش کر دیا انہوں نے بے مثال ایثار کا ثبوت دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے ان کی اولاد، باغات اور آب وہوا کی اصلاح کی دعائیں فرمائیں جن کی بدولت مدینہ یثرب نہیں رہا بلکہ طیبہ اور مدینہ منورہ بن گیا اور اس کے ساتھ وہ حرم بھی بن گیا، حرم بفتحتین بمعنی حرمت واحترام والی جگہ۔ قولہ "عیر الی ثور" دونوں بفتح الاول وسکون الثانی ہیں، مدینہ منورہ کی دو پہاڑیوں کے نام ہیں، بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ ثور تو مکہ مکرمہ میں ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ (کذاقال صاحب القاموس کمابین السطور وحاشیۃ القوت وصاحب النہایہ کمافی الحاشیۃ علی الترمذی) ثور احد کے شمال مشرق میں ہے۔ قولہ "حَدَثًا" بفتحتین وہ امر جدید جو خیر القرون المشہود لہا بالخیریۃ میں نہ خود موجود ہو اور نہ ہی اس کا کوئی منشأ استنباط موجود ہو، یعنی کسی طرح سنت سے ثابت نہ ہو۔ قولہ "صرفا ولا عدلا" ان کے معنوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک صرف فرض کو اور عدل نفل کو کہتے ہیں جیسا کہ اوپر پہلے ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ حسن بصریؒ نے اس کے برعکس موقف اپنایا ہے جیسا کہ دوسرے ترجمہ میں لیا گیا ہے۔ بعض حضرات نے صرف بمعنی توبہ اور عدل بمعنی فدیہ لیا ہے۔ اس میں مزید اقوال بھی ہیں۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ مراد ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے عذاب دور ہو جائے۔

تشریح:۔ اس ارشاد پاک میں کئی مسائل ہیں، اختصار کے پیش نظر یہاں ان کے چیدہ چیدہ مباحث پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) پہلی بحث:۔ روافض اپنی خصلت کے مطابق یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ حضرت علیؓ کے پاس

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصیت نامہ ہے جس میں علم الاسرار، خلافت بلا فصل کے لئے ان کا انتخاب اور دیگر بہت ساری اشیاء جو اہل بیت کے لئے مخصوص ہیں درج ہیں، یہ محض ایک غلط تاثر تھا مگر اس تشکیک سے بعض حضرات کے ذہن میں شک نے جنم لیا اور بعض نے چہ مہ گوئیاں بھی کیں، اس حوالے سے ''باب ماجاء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یوص'' میں بھی ایک روایت گذری ہے، حضرت عائشہؓ سے بھی سوال ہوا تھا چونکہ یہ ایک بے بنیاد بات تھی اس لئے ہر مجیب کی طرف سے سائل کو نفی میں جواب ملا ہے، حضرت علیؓ کی مذکورہ حدیث بھی صاف بتا رہی ہے کہ اہل بیت کے لئے کوئی مخصوص دستاویز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لکھوائی ہے، یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے، عارضہ میں ہے: ''مروی من طرق مجمع علی صحته ونقله'' امام بخاریؒ نے بھی کتاب العلم میں اس کی تخریج فرمائی ہے:

"عن ابی جحیفة قال قلتُ لِعَلِیٍّؓ: هل عندكم كتاب ؟قال "لا إلّا كتاب الله اوفهم أُعطیَه رجلٌ مسلم اومافی هذه الصحیفة"قال قالت ومافی هذه الصحیفة؟ قال العقل وفكاك الاسیر ولایقتل مسلم بكافر"۔[1]

غرض دو ورق کے اس صحیفے میں کوئی خاص حکم جو اہل بیت نبوت کے لئے مخصوص ہو نہیں تھا، اگر اس کے جواب میں شیعہ یہ کہیں کہ وہ تقیہ کرتے تھے تو جواب یہ ہے کہ پھر ان کی شجاعت پر آپ نے جو بزدلی کا بدنما داغ لگایا اس سے آپ کی عقیدت کہاں گئی؟؟ باب کی روایت میں ''فقد کذب'' صاف تردید ہے۔

(۲) دوسری بحث:۔ اس پر اتفاق ہے کہ مدینہ منورہ مکہ کی طرح حرمت والی جگہ ہے۔ اس کا احترام ہر کلمہ گو پر فرض ہے، مگر اس میں اختلاف ہے کہ آیا جس طرح مکہ کے احکام ہیں کہ وہاں کے درخت کاٹنا اور شکار کھیلنا جائز نہیں ہے تو اسی طرح مدینہ کا حکم بھی ہے؟ تو جمہور یعنی ائمہ ثلاثہ دونوں کا حکم ایک مانتے ہیں البتہ شافعیہ و مالکیہ کے ماہو المشہور مذہب کے مطابق جانی پر تاوان یعنی ضمان و جزاء نہ ہوگی کیونکہ یہاں نسک ادا نہیں ہوتے اس لئے یہ چراگاہ کی مانند صرف ممنوع ہے، جبکہ بعض حضرات جزاء کے بھی قائل ہیں، ان کا استدلال باب کی حدیث سے ہے۔

حنفیہ کے نزدیک اس کی حرمت بمعنی تعظیم و تکریم کے ہے جیسے مسجد کی تعظیم ہوتی ہے۔ ہاں مدینہ کی

باب ماجاء فی من تولیٰ غیر موالیه الخ

[1] صحیح بخاری ص: ۲۱ ج: ۱ "باب كتابة العلم" كتاب العلم.

ہریالی اور رونق کی خاطر درخت اور کنوئیں اور در و دیوار سب چیزیں محفوظ ہونی چاہئیں مگر مع ہذا اگر کسی نے کوئی شاخ کاٹ دی تو اس نامناسب حرکت کی کوئی سزا مقرر نہیں ہے اسی طرح شکار کا حکم ہے۔ان کا استدلال ''یـا اباعمیر مافعل النغیر'' [۲] سے ہے۔اس کے جواب میں جمہور کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ باہر کی بُلبل تھی مگر یہ جواب کارگر نہیں کیونکہ جب باہر کا پرندہ حرم میں آجائے تو اس کا حکم حرم کے جانوروں کی طرح ہوجاتا ہے۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تحریم سے پہلے کا واقعہ ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۳) تیسری بحث:۔ حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے مدینہ منورہ میں بدعت کی یا کوئی جنایت کی یا مبتدع کو جگہ دی یعنی اسے روکا نہیں اور مدینہ سے باہر نکالا نہیں یا کم از کم اپنے مقدور بھر اخراج یا روک تھام کی کوشش نہ کی تو حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص ہمیشہ کے لئے ملعون ہوگا۔والعیاذ باللہ۔

تو یاد رکھنا چاہئے کہ اگرچہ مدینہ میں بدعت گناہ کبیرہ ہے کیونکہ یہ مدینہ کی حرمت کے منافی ہے تاہم اگر وہ بدعت مُکَفِّرہ نہ ہو تو بلحاظ تحریم وہ کفر نہیں ہے اس لئے لعنت سے مراد کافروں والی لعنت نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح قاتل مؤمن کی سزا طویل ہوتی ہے اسی طرح اگر یہ مبتدع توبہ نہ کرے تو قیامت تک یعنی طویل مدت تک مستحق لعن رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے خاتمہ بالخیر کی توفیق نصیب نہ ہو کہ بعض اعمال کی نحوست تباہ کن ہوتی ہے،ابن العربیؒ نے مختلف توجیہات کے بعد لکھا ہے:''اوفی شخص یقترن بفعله سوء الخاتمه لِانتهاك الحرمة''اس صورت میں دوام لعن اپنے حقیقی معنی پر ہوگا۔

پھر اللہ کی لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی رحمت خاصہ یا عامہ سے دور فرمادے۔فرشتوں کی لعنت کا مطلب ترک استغفار یا اس کے لئے بددعا کرنا ہے جیسا کہ لوگوں کی لعنت سے بھی یہی مراد ہے،یا لوگوں کی لعنت سے مراد ہجران یعنی ترکِ تعلق ہے۔

(۴) چوتھی بحث:۔ جو شخص اپنا نسب یا کوئی غلام اپنی موالات کی نسبت تبدیل کردے تو وہ بھی ملعون ہے چونکہ زمانۂ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ ایک آدمی کسی کو متبنّیٰ بنا کر اپنی طرف منسوب کرتا اور وہ متبنّیٰ بھی اس

---

[۲] رواہ البخاری ص:۹۱۵ ج:۲ "باب الکنیة للصبی الخ" کتاب الادب، صحیح مسلم ص:۲۱۰ ج:۲ کتاب الآداب، ایضاً سنن ابی داؤد کتاب الادب باب:۶۹، سنن ابن ماجه کتاب الادب باب:۲۴، مسند احمد ص:۵۵۹ ج:۳ حدیث:۱۱۷۲۷ و ۱۱۷۸۹.

پر راضی ہوتا، پھر سورۂ احزاب میں اس رسم کو باطل قرار دے دیا گیا لہٰذا اب جو ایسا کرے گا وہ اسلام میں جاہلیت کو پروان چڑھائے گا اس لئے وہ کفران نعمت کرتا ہے کہ اپنے باپ کے احسان کو فراموش کرتا ہے اور اپنا نسب غیر جگہ مقرر کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح غلام بھی احسان فراموشی کے ساتھ جھوٹی نسبت ظاہر کرتا ہے، اس لئے وہ دونوں اللہ کو پسند نہیں، اللہ نے ماں باپ کا حق مقرر کیا ہے، فرمایا: ''ان اشکرلی ولوالدیک''[۳] اور مولیٰ کی موالات کو بھی احسان کہا ہے''واذتقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمتَ علیہ''[۴] تو ایسا کرنے والا کفران اور ظلم کرتا ہے کہ ''وضع شیٔ فی غیر محلّہٖ'' کرتا ہے،''وقال اللّٰہ ان لعنۃ اللّٰہ علی الظالمین''[۵] یہ آیت فرشتے بھی پڑھتے ہیں اور مسلمان بھی، اس لئے یہ بھی لعنت کرنے والے بن گئے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی الرجل ینتفی من ولده

''عن ابی ھریرۃ قال جاء رجل من فزارۃ الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال: یارسول اللّٰہ! ان امرأتی ولدت غلاماً اسود فقال لہ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ھل لک من ابل؟ قال ''نعم'' قال فماالوانھا؟ قال ''حمر'' قال فھل فیھا اَوْرَقُ ؟ قال: ''نعم ان فیھا لَوُرقاً'' قال: اَنّٰی اتاھاذالک؟ قال ''لعل عِرقا نزعھا'' قال فھذا لَعَلَّ عِرقا نزعہ''۔[۱] (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص قبیلہ فزارہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میری بیوی نے کالے رنگ کا بچہ جنا ہے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا ''ہاں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ان کے رنگ کیسے ہیں؟ اس نے کہا ''سرخ'' رنگ کے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا ان میں کوئی خاکی رنگ کا بھی ہے؟ اس نے کہا ''ہاں'' ان میں سیاہی مائل بھی ہیں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کالا رنگ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کہا شاید کسی رگ نے اتار لیا ہو۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کو بھی کسی رگ نے اتار لیا ہوگا۔ (یعنی کھینچ لیا ہوگا)

لغات:۔ قولہ ''حمر'' بضم الحاء وسکون المیم احمر کی جمع ہے، سرخ رنگ کا اونٹ یعنی اسمر۔ قولہ ''اَوْرَق''

---

[۳] سورۃ لقمان آیت: ۱۴۔ [۴] سورۃ الاحزاب آیت: ۳۷۔ [۵] سورۃ الاعراف آیت: ۴۴۔

باب ماجاء فی الرجل ینتفی من ولده

[۱] ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۱۴۴ ''باب الرجل یشک فی ولدہ'' کتاب النکاح۔

بروزن افضل اس کی جمع ''ورق'' بضم الواؤ وسکون الراء آتی ہے جیسا کہ اگلے جملے میں جوابا مذکور ہے، گندمی اور خاکی رنگ کو کہتے ہیں، گندمی رنگ کے آدمی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور اس اونٹ کو بھی کہتے ہیں جس کا رنگ سیاہی مائل ہو، یہاں یہی مراد ہے۔ قولہ "عِرقا" بکسر العین رگ کو کہتے ہیں ''نَزَعَه، جَذَبَه''۔

تشریح:۔ بخاری [۲] کی روایت میں ہے کہ یہ آدمی اعرابی تھا اور اس کا نام ضمضم بن قتادہ تھا، یہ اور ان کی بیوی دونوں میں کالا کوئی نہیں تھا مگر بیٹا کالے رنگ کا پیدا ہوا تھا چونکہ عام لوگ ایسے حالات میں بدگمانیاں پھیلاتے ہیں اس لئے انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی وجہ دریافت فرمائی کیونکہ ان کو بذات خود بھی شک لاحق ہوا تھا مگر مع ھذا یہ سوال یا اخبار قذف نہیں، مالکیہ کے نزدیک نہ صراحتاً قذف ہے اور نہ ہی تعریض جیسا کہ ابن العربیؒ نے عارضہ میں لکھا ہے: ''لیس فی سوال الاعرابی قذف لاھلہ لا بتعریض ولا بتصریح'' الخ۔ چونکہ ان کے نزدیک تعریضاً قذف بھی موجب حد ہے اس لئے دونوں کی نفی فرمائی جبکہ جمہور کے نزدیک صرف تصریح سے قذف متحقق ہوتا ہے تعریض سے نہیں اس لئے ان پر کسی طرح کا اشکال اور اس سے بچنے کے لئے تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو اونٹوں پر قیاس کرتے ہوئے اس اعرابی کو مثال سے سمجھایا کہ جس طرح سُرخ اونٹوں سے کالے رنگ کا بچہ جنم لے سکتا ہے تو اسی طرح انسانوں کا حال بھی ہے کیونکہ ''کل شیئ یرجع الی اصلہ''، لہٰذا اگر کسی کے آباء واجداد میں کوئی آدمی کالا گذرا ہوگا تو وہ رنگ اولاد کی کسی پشت میں ظاہر ہونا غیر معمولی یا غیر فطری اور غیر طبعی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ الوان تو علامات ہیں اور علامۃ ذی العلامت سے مختلف بھی ہو سکتی ہے لہٰذا ماں باپ اور اولاد کے الوان مختلف ہونا تو عام مشاہدہ ہے دیکھئے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں کتنی تبدیلی آچکی ہے رنگت کے علاوہ قد وقامت اور شکلوں میں واضح تفرقے موجود ہیں، الحاصل کسی بچے کو باپ کے رنگ سے مختلف ہونے کی وجہ سے منفی نہیں کیا جا سکتا۔

> "قال النوویؒ فی شرح مسلم وفی ھذاالحدیث ان الولدیلحق الزوج وان خالف لونہ' حتی لو کان الاب ابیض والولداسود وعکسہ لحقہ ولایحل لہ نفیہ بمجردالمخالفۃفی اللون وکذالوکان الزوجان ابیضین فجاء الولد اسود

---

[۲] صحیح بخاری ص: ۱۰۱۲ ج: ۲ "باب فی التعریض" کتاب المحاربین.

اوعکسه لاحتمال انه نزعه عرق من اسلا فه "الخ۔ (کتاب اللعان ص:۴۹۱ ج:۱)
کچھ وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

باب ماجاء فی القافة

"عن عائشة ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم دخل علیهامسرورأتبرُقُ اساریروجهه فقال: اَلَم تر اَن مُحَزِّزاًنظرانِفاًالی زیدبن حارثه واسامة بن زیدفقال:هذه الاقدام بعضهامن بعض"۔ (حسن صحیح)[۱]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس اندر (حجرہ) میں تشریف لائے اُس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش تھے (اتنے خوش تھے کہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور (پیشانی) کی لکیریں چمک رہی تھیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے نہیں پتہ کہ مجزز (قیافہ شناس) نے ابھی زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید دونوں کو دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ پاؤں ایک دوسرے سے ہیں۔

اگلی روایت کا مطلب ہے کہ ان دونوں حضرات باپ بیٹے نے چادر اوڑھ رکھی تھی صرف پاؤں نظر آرہے تھے تو قیافہ شناس نے پاؤں کو دیکھ کر یہ تجزیہ کیا۔

لغات:۔قوله "القافة" قائف کی جمع ہے قفا سے ہے، قافیہ یا قیافہ شناس خدوخال سے معلوم کرنے والا کہلاتا ہے۔قوله "تبرق" بضم الراء برق سے باب نصر سے واحد مؤنث کا صیغہ ہے جو جمع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، بجلی اور چمکنے کو کہتے ہیں یعنی خوشی کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک چمک رہا تھا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی۔

قوله "اساریر" جمع الجمع کا صیغہ ہے واحد سر یا سرر آتا ہے اور جمع اسرار واسرۃ ہے، وہ لکیریں جو پیشانی میں بنتے اور ہموار ہوتی رہتی ہیں۔قوله "الم تری" اصل میں ترین واحد مؤنث مخاطبہ کا صیغہ ہے لم جازمہ کی وجہ سے نون کو حذف کردیا ہے ای الم تعلمی ؟۔قوله "محززاً" بضم المیم وکسر الزاء المعجمة المشددة وبعدها زاء

باب ماجاء فی القافة

[۱] الحدیث اخرجه البخاری ص: ۱۰۰۱ ج: ۲ "باب القائف" کتاب الفرائض، ایضاً رواه مسلم فی کتاب الرضاع، سنن ابی داؤد ص: ۳۱۶ ج: ۱ کتاب الطلاق، سنن نسائی کتاب الطلاق باب: ۵۱، مسنداحمد ص: ۱۲۰ ج: ۷ حدیث: ۲۴۰۰۵ و ۲۵۳۶۷.

اخری۔اگلی روایت میں راء مہملہ کے ساتھ ہے مگر صحیح زاء معجمہ کے ساتھ ہے۔

مجزز بن الاعوار المدلجی کا خاندان قیافہ شناسی میں مشہور تھا اس لئے لوگ ان کے قول کو زمانۂ جاہلیت میں حجت مانتے تھے۔

تشریح:۔حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ السابقون الاولون میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت رکھنے والوں میں سے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس وقت متبنیٰ بنالیا جب انہوں نے اپنے والد اور چچا کے ساتھ واپس جانے سے انکار فرمایا، یہ اصلاً غلام نہ تھے مگر رسم جاہلیت کے مطابق ان کو زبردستی غلام بنا کر بیچا گیا تھا، تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔دوسری طرف ان کے صاحب زادہ حضرت اسامہؓ پر لوگ یہ تہمت یا کم از کم یہ شک کرتے تھے کہ ان کے والد زیدؓ ابیض یعنی سرخ وسپید ہیں تو یہ کیسے ان کا بیٹا ہوسکتا ہے کیونکہ اسامہ حِبُّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ کالا ہے البتہ ان کی والدہ ام ایمن کے بارے میں شارحین کی دو رائے ہیں کہ وہ کالے رنگ کی تھیں یا سفید؟ درحقیقت اور اصولی طور پر اسامہ زید ہی کے صاحب زادہ تھے کہ "الولد للفراش" کما مر۔مگر دوسری طرف زمانۂ جاہلیت کی یہ رسم اور علم القیافہ کی گردش ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی، کیونکہ شریعت شریفہ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں آئی تھی تو گویا یہاں دو طرح کے دلائل باہم متعارض ہوگئے تھے، ظاہری رنگ والا قرینہ نفی نسب پر دلالت کرتا تھا اور اصول "الولد للفراش" اثبات کو مقتضی تھا لیکن عام لوگ تو ظاہر کو بآسانی جانتے اور اس پر اعتماد کرتے ہیں دیکھئے اگر ایک آدمی بہت بڑا ولی اللہ ہو مگر جب اس کے مقابلے میں اس سے کئی گنا چھوٹے آدمی سے کرامت ظاہر ہوجائے تو عام لوگ اسی صاحب کرامت پر زیادہ اعتقاد کرنے لگتے ہیں، اس لئے یہ ایک مسئلہ تھا جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان تھے مگر جب قائف مجزز نے یہ بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بہت زیادہ خوشی ہوئی کیونکہ وہ غلط تأثر مکمل طور پر ختم ہوا، واضح رہے کہ یہ شُبہ خواص کو ہرگز نہ تھا۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ قیافہ شناسی حجت ہے؟ اس سے نسب ثابت ہوجاتا ہے یا نہیں؟ تو امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں ہے کہ حنفیہ امام ثوریؒ اور امام اسحٰقؒ قیافہ شناسی کو حجت نہیں مانتے جبکہ باقی ائمہ ثلاثہ اس کی حجیت کے قائل ہیں۔امام مالکؒ سے اس بارے میں مختلف اقوال اور بھی ہیں۔ثمرۂ اختلاف یہ ہوگا کہ اگر کسی باندی سے مختلف لوگ جماع کریں جیسے زمانۂ جاہلیت میں لوگ کرایہ پر باندیاں حاصل کرتے تھے یا بائع ومشتری میں اختلاف ہوجائے تو ان حضرات کے نزدیک فیصلہ قائف کے قول پر ہونا چاہئے۔تاہم امام

شافعیؒ زنا سے نسب کے ثبوت کے قائل نہیں چنانچہ امام نوویؒ نے اسی صفحے پر لکھا ہے کہ نہ تو زنا سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ مُحَرِّم نکاح ہے حتی کہ زانی اپنے نطفے سے پیدا شدہ لڑکی سے خود بھی نکاح کا مجاز ہے:

"وقال مالکؒ والشافعیؒ وابو ثورؒ وغیرهم لااثرلوطی الزنابل للزانی ان یتزوج ام المزنی بهاوبنتهابل زادالشافعی فَجَوَّزَ نکاح البنت المتولدة من مائه بالزنا"۔

بہر حال ان حضرات کا استدلال باب کی حدیث سے ہے کہ مجزز نے کہا "اِن هذه الاقدام بعضهامن بعض" اس کی نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی بلکہ اس پر اظہار مسرت بھی فرمایا۔ (ص:۴۷۱ ج:۱، باب العمل بالحاق القائف الولد)

حنفیہ کہتے ہیں کہ قیافہ شناسی ایک ظنی چیز ہے لہٰذا یہ مدارِ حکم خصوصاً نسب جیسے نازک مسئلے میں ہرگز نہیں بن سکتا۔ دیکھئے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے سے پردہ کرنے کا حکم تو دے دیا جس کے بارے میں حضرت سعدؓ اور عبد بن زمعہ کے درمیان جھگڑا ہوا تھا، سعد بن ابی وقاص کا دعوی یہ تھا کہ یہ میرا بھتیجا ہے کہ اس نے مجھے اس کی وصیت کی ہے اور یہ اس (عتبہ بن ابی وقاص) کے ساتھ مشابہت بھی رکھتا ہے جبکہ عبد بن زمعہ کہہ رہے تھے کہ "هذااخی یارسول اللّٰه اولدعلی فراش ابی من ولیدته"[۲] تو مشابہت کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "واحتجبی منه یاسودة بنت زمعة"۔ مگر اس مشابہت کی بناء پر سعدؓ کے حق میں فیصلہ نہیں فرمایا، اسی طرح اگر قیافہ قابل حجت بات ہوتی تو پھر لعان کا حکم نازل نہ ہوتا بلکہ قیافہ شناس کو بلایا جاتا اور اسی سے معلوم کیا جاتا، نیز یہ کیسے پتہ چلے گا کہ فلاں قیافہ شناس ماہر ہے اور فلاں غیر ماہر ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور جہاں تک حدیث الباب کا تعلق ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ اصول کو حسی تقویت ملی اور تقویت وتائید تو کمزور دلیل سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور مجزز کی بات کو اس لئے رد نہیں فرمایا کہ یہاں تردید نفی نسب کو مستلزم ہوتی جبکہ نفسِ تردید حضرت سعدؓ کے قصے میں ہوئی ہے اور وہ بھی کافی ہے۔ ہاں حضرت سودہؓ کو احتیاطاً پردے کا حکم بھی دے دیا۔

---

[۲] کذا فی سنن ابن ماجه ص:۱۴۴ "باب الولدللفراش واللعاهر الحجر" کتاب النکاح وموطا مالک ص:۶۴۱ "القضاء بالحاق الولد بابیه" کتاب الاقضیة ولفظه: فقال اخی وابن ولیدة ابی ولد علی فراشه الخ.

باب ماجاء فی حَثِّ النبی ﷺ علی الھدیة

”عن ابی ھریرة عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال تھادَوا فان الھدیة تذھب وحر الصدر ولاتحقرنَّ جارة لِجارتھاولو شِقَّ فِرسِنِ شاة“۔ (غریب) [1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دوسرے کو ہدایا دیا کرو کہ ہدیہ سینے کی جلن (کینہ) کو دور کرتا ہے اور کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو کوئی چیز دینا معمولی نہ سمجھے خواہ وہ بکری کے کھر کا ٹکڑا ہی ہو۔

لغات:۔قولہ ”حث“ بفتح الحاء وتشدید الثاء، ترغیب دینا اور اُبھارنا واُکسانا۔قولہ ”تھادوا“ بفتح الدال، امر کا صیغہ تہادی بمعنی المھادات سے ہے، جانبین سے ہدیہ دینے کو کہتے ہیں۔قولہ ”وَحَر“ بفتح الواو والحاء، دل کے میل اور کسی سے نفرت وغیرہ کو کہتے ہیں۔قولہ ”لاتحقرن“ کا مفعول بہ مقدر ہے یعنی ھدیة۔قولہ ”فِرسن“ بکسر الفاء والسین وبینھما راء ساکنۃ، کُھر اور سُم کو کہتے ہیں۔(یعنی کُھر کے دونوں حصوں کے درمیان معمولی گوشت کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو)

تشریح:۔یعنی باہمی خوش گوار تعلقات کو استوار نا جو اسلامی معاشرے کا کلیدی عنصر ہے آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دینے سے مزید مستحکم ہوجاتا ہے چونکہ عورتوں میں طبعی طور پر افتخار کا مزاج پایا جاتا ہے اس لئے اندیشہ تھا کہ عورتیں ایک دوسرے کو معمولی ہدیہ دینا باعث شرم وعار جانیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی دینے والی، اسی طرح لینے والی ہدیہ کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ وہ کُھر کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، ظاہر ہے کہ اس سے نیچے درجے کی کوئی چیز ہو نہیں سکتی اس لئے یہ تمثیل ہوئی کہ اپنے پڑوسیوں کو ضرور دیا کریں۔مزید تفصیل راقم نے ”نقش قدم کامل“ میں لکھی ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ دل میں مال کی محبت ہوتی ہے جب کوئی مال دیتا ہے تو اسی مقدار میں اس کے لئے دل نرم ہوجاتا ہے اور لازمی بات ہے کہ اس سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔

باب ماجاء فی حث النبی ﷺ علی الھدیة

[1] وفی المعجم الاوسط للطبرانی: یانساء المؤمنین تھادوا ولو بفرسن شاةٍ فانه یثبت المودة ویذھب الضغائن، ایضاً فی الاوسط یامعشر الانصار تھادوا فان الھدیة تَسلُّ السخیمة وتورث المودّة الخ بحواله مجمع الزوائد ص: ۱۸۵ ج: ۴ حدیث: ۶۷۱۵.

باب ماجاء فی کراھیة الرجوع فی الھبة

"عن ابن عمران رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: مَثَلُ الذی یعطی العطیة ثم یرجع فیها کالکلب اکل حتی اذاشبع قاء ثم عادفرجع فی قیئه"۔[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس شخص کی مثال جو کوئی ہدیہ دے کر پھر اسے واپس لیتا ہے اس کتے کی مانند ہے جو کھائے یہاں تک کہ جب پیٹ بھر جاتا ہے تو قے کر دیتا ہے اور پھر (بھوک لگتے وقت دوبارہ) رجوع کرتا ہے اپنی قے کی طرف۔

تشریح: ۔جیسا کہ اوپر والے باب میں گذرا ہے کہ ہدیہ کا مقصد اچھے تعلقات اور قرب حاصل کرنا ہے جبکہ رجوع سے اس کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے، اس لئے رجوع کرنے سے آدمی کی مثال اتنی بُری بن جاتی ہے جیسے کتے کی مذموم حالت۔ باقی مسئلہ کی تفصیل پہلے گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج ۵ ص ۲۲۱ "باب ماجاء فی کراھیۃ الرجوع من الھبۃ" من ابواب البیوع)
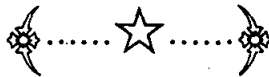
باب ماجاء فی کراھیة الرجوع فی الھبة

[1] رواه ایضاً ابن ماجه عن ابی هریرة ص: ۱۷۲ "باب الرجوع فی الهبة" ابواب الهبات وابوداؤد فی البیوع باب: ۸۱، والنسائی فی الهبة باب: ۲، بحواله الترغیب والترهیب ص: ۲۶۱ ج: ۳ کتاب البر والصلة.

ابواب القدر

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

''قدر'' بفتح القاف والدال اور سکون دال بھی جائز ہے یعنی بروزن قمر بھی جائز ہے اور بروزن شمس بھی، تقدیر اندازے کو بھی کہتے ہیں یعنی ہر چیز کے لئے مقدار مقرر کرنا خواہ کمیت کے لحاظ سے ہو یا کیفیت اور وقت وغیرہ کے لحاظ سے، اور قدرت کے معنی میں بھی آتا ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنی قدرت کاملہ سے عجیب وغریب اور عظیم نظام کو پیدا اور جاری فرمایا ہے۔

جاننا چاہئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ پاک میں وحدت ہی وحدت ہے اس لئے نہ تو اس کا ثانی اور شریک فی الذات ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مظہر ہے نہ اس تک رسائی ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کا تصور بالکنہ وبکنہہ ممکن ہے کہ وہ ذہناً وخارجاً بسیط ہی بسیط ہے البتہ تصور بالوجہ وبوجہ ہو سکتا ہے بایں طور کہ اس کی ذات پر اس کی صفات دال ہیں اور صفات پر اسماء حسنیٰ دال ہیں نیز ان صفات کے مظاہر بھی ہیں لہٰذا ذات تک رسائی علم یا یوں کہنا چاہئے کہ تصور بالوجہ ان اسماء حسنیٰ، صفات اور مظاہر کی وساطت سے ممکن ہے جو لوگوں کی استعدادات کے مطابق متفاوت ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ عزوجل کی صفت ابداع سے عالم بغیر کسی شئ آخر کے معرض وجود میں آیا، پھر صفت تخلیق سے باقی خلقت اور موالید ثلاثہ یعنی حیوانات بشمول انسان کے، نباتات اور معدنیات معرض وجود میں آئے کہ یہ ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں اور صفت تدبیر سے ان امور کا انتظام وانصرام جاری وساری ہے جو آج تک محار العقول بنا ہوا ہے۔

بہر حال کائنات اور مخلوق کی تخلیق سے قبل عالم کا جو علم یا اس کا نقشہ ہے کہ کیا کیا چیزیں پیدا ہوں گی؟ اور کب اور کیسے پیدا ہوں گی؟ پھر ان معلومات کو لوح محفوظ میں لفظ بلفظ درج کیا گیا ہے اس کا نام ہے ازلی فیصلے اور تقدیر ہے۔ لفظ قضاء بھی اس کے ہم معنی ہے جبکہ بعض حضرات نے اجمالی حکم ازلی کو قضاء اور اس کی تفاصیل وجزئیات کو تقدیر سے تعبیر کیا ہے، بعض نے اس کے برعکس تعبیر کو اختیار کیا ہے۔

علم بالمعدوم تو جائز ہے مگر اس کے باوجود اس مسئلہ میں عقول حیران ہیں اور صحیح صورت حال سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے بڑے بڑے ارباب عقل کے قدم یہاں آکر پھسل جاتے ہیں، قاضی محمد مبارک رحمہ اللہ نے اللہ کے علم ازلی کے بارے میں تمام مذاہب نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''تفکر فی هذا المقام فانه من مزلة الاقدام''۔ اس لئے اس مسئلے میں از روئے عقل بحث کرنا ممنوع بھی ہے اور خطرناک بھی، تجربہ شاہد ہے کہ جس نے اس کی تہہ تک جانے کی کوشش کی ہے وہ غرق وہلاک ہوا ہے، کوئی قدری بن گیا یعنی منکر تقدیر اور کوئی جبری بن گیا ہے جو انسان کو پتھر کی طرح ماننے لگا ہے، حالانکہ تحقیق ان دونوں کے درمیان ہے کہ انسان کاسب ہے مگر خالق نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے شرح عقائد اور نبراس وغیرہما۔

حاشیہ کوکب پر مرقات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علیؓ سے تقدیر کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا ''طریق مظلم لا تسلکه'' یعنی تاریک راستہ ہے تم اس پر نہیں جا سکتے ہو، اس نے پھر سوال کیا تو فرمایا: ''بحر عمیق لا تلجه'' یعنی گہرا سمندر ہے تم اس میں غوطہ زن نہیں ہو سکتے ہو، اس نے پھر سوال کیا تو فرمایا ''سرُّ اللّٰه خفی علیك فلا تفتشه''[1] یعنی اللہ کا پوشیدہ راز ہے اس کی تفتیش حال مت کرو''۔ ایک روایت میں ہے کہ جو اللہ کے راز کو افشاء کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ رسوا کر دیا جاتا ہے۔[2]

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اہل سنت والجماعت کی تعریف یہ کی ہے جو ظاہر کتاب وسنت کو تھامے رکھے اگرچہ وہ عقل کے دائرۂ کار سے باہر ہو یعنی ایسی نصوص جن میں عقل حیران رہ جاتی ہو ان پر کسی تاویل کے بغیر ایمان لاتے ہوں۔

''اختار قوم ظاهر الكتاب والسنة وعضوا بنواجذهم على عقائد السلف ولم يبالوا بموافقتها لِلاصول العقلية ولا لِمخالفتها لها.... وهم اهل السنة''۔

(مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ)

یعنی اگرچہ شریعت کی کوئی چیز عقل کے منافی نہیں لیکن ایسا ممکن ہے کہ کوئی مسئلہ کسی کی عقل سے بالاتر ہو ایسے میں صحیح اور صریح نص کے اندر کسی قسم کی تاویل جائز نہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ یہ محال عقل تو نہیں لیکن

ابواب القدر عن رسول الله ﷺ

[1] كذا فی مرقات المفاتيح ص: ۲۵۶ ج: ۱ "باب الايمان بالقدر". [2] ايضاً راجع للروايات مجمع الزوائد ص: ۲۹۲ ج: ۷ كتاب القدر.

محار العقل ہے اور میرا اس پر ایمان ہے۔

تقریب الی الفہم کی غرض سے ایک نظیر پیش کی جاتی ہے، اس سے تقدیر کے مسئلہ کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملے گی۔

جس طرح کوئی فاعل مختار اپنے اختیار سے اور ارادے سے، اور پوری بصیرت اور مہارت کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے تو اس سے پہلے اس کے ذہن میں یعنی علم میں ان کام کا نقشہ ہوتا ہے، اور اس کام کا فائدہ اور وجہ بھی ملحوظ ہوتی ہے جس کو علت غائی کہتے ہیں، پھر اگر وہ کام بہت بڑا ہو تو اس کا نقشہ بھی تیار کرلیا جاتا ہے جیسے بہت بڑی بلڈنگ بن رہی ہو یا کوئی کارخانہ تعمیر ہو رہا ہو تو انجینئر اس کا ماڈل تیار کرتا ہے اور جب کام شروع ہو جاتا ہے تو اس کی تمام کاروائی اور تفصیلات اس نقشے اور ماڈل کے مطابق نظر آتی ہیں، ایسا ہی (بلا تشبیہ) ازل میں جو فیصلے ہوئے اور مستقبل کی تمام تفصیلات جو ازل میں لکھی گئی ہیں ان کا نام تقدیر ہے جس سے ذرا بھی آگے پیچھے ہونے کا کوئی امکان نہیں اگرچہ اللہ کو انجینئر کی طرح ماڈل تیار کرنے کی ضرورت نہیں مگر چونکہ اللہ کا ہر کام ضابطے سے ہوتا ہے اس لئے یہ تفصیلاؔت لوح محفوظ پر اتاری گئی ہیں تا کہ اللہ کے لامتناہی علم اور بے انتہا قدرت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کیا جائے، کہ لامتناہی اوقاؔت کا علم ازل میں رکھتا ہے اور ازل ہی سے ایک نظام مقرر کیا اب اس میں کبھی بھی سرِ مُوگڑ بڑ نہیں ہوتی۔ ''فسبحان اللّٰہ احسن الخالقین''۔ کچھ مزید وضاحت ابواب کے ضمن میں آئے گی۔

باب ماجاء من التشدیدفی الخوض فی القدر

"عن ابی ہریرۃ قال خرج علینارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ونحن نتنازع فی القدر فغضب حتی احمرّوجھُہ حتی کَاَنَّمَافُقِیَٔ فی وجنتیہ الرُّمّان فقال:اَبھذااُمِرتُم ؟ام بھذاارسلتُ الیکم؟ انماھلك من کان قبلکم حین تنازعوافی ھذا الامرعزمت علیکم اَلاتنازعوافیہ"۔ [1]

(حدیث غریب یعنی صالح المرّی کی وجہ سے)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر تشریف

باب ماجاء من التشدید فی الخوض فی القدر

[1] ایضاً روی بمعناہ ابویعلیٰ عن انس مجمع الزوائد ص: ۲۹۵ ج:۷ حدیث: ۱۱۸۵۳

لائے جبکہ ہم تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا یہاں تک کہ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اتنا زیادہ سرخ ہو گیا کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں رخساروں میں انار نچوڑا گیا ہو، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں اس کا حکم دیا گیا ہے؟ یا پھر میں اس کے ساتھ تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں؟ بے شک تم سے پہلے لوگ اس وقت ہلاک (گمراہ) ہوئے جب انہوں نے اس معاملے میں باہمی منازعت اختیار کر لی، میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ اس بارے میں جھگڑے (یعنی مباحثہ) مت کرو!۔

لغات: ۔قولہ "فُقِئَ" بصیغۂ مجہول بمعنی عُصر یعنی نچوڑ دیا گیا ہو یا توڑ دیا گیا ہو۔قولہ "وجنتیہ" ای خدیہ، دونوں رخسار۔قولہ "الرّمان" بضم الراء انار، "حتی احمر" غضب کا غایہ ہے اور "حتی کانما الخ" اِحمرّ کا غایہ ہے۔قولہ "اَبھذا الخ" دو استفہام ہیں، دونوں انکاری ہیں اور انکار بعد الانکار ترقی اور مبالغے کے لئے ہے۔قولہ "عزمت" ای اقسمتُ واوجبتُ، یعنی میں تمہیں قسم دیتا ہوں اور تم پر لازم کر دیتا ہوں۔

تشریح: ۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا یہ تنازعہ تقدیر کے ماننے اور نہ ماننے میں تھا ہرگز نہیں کیونکہ ایمان بالقدر تو فرض اور ایمان کا حصہ ہے بلکہ تقدیر کے اسباب اور حکمتوں کے جاننے اور اس حوالے سے عمل کی اہمیت کے بارے میں تھا مگر یہ مسئلہ اتنا نازک ہے کہ اس میں بحث سے لامحالہ افراط وتفریط جنم لیتی ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا کہ جب پہلے لوگ اس مباحثہ کے نتیجے میں تباہ ہو چکے، تو پھر ایسا تلخ تجربہ کیوں دُہراتے ہو، اس لئے سلامتی اور ایمان کی حفاظت بس اسی میں ہے کہ ہر خیر اور شر کا خالق، اللہ ہی کو مانیں اور جو اس نے حکم دیا ہے اس پر عمل کرنے کا التزام کیا جائے، آگے اللہ کیا کرتا ہے یہ تقدیر سے بحث پر منحصر نہیں بلکہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہ چاہیں تو اپنے فضل سے جنت دے دیں اور چاہیں تو دوزخ میں ڈالیں جو اس کا عدل ہے، کہ مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا اختیار ہے۔

باب

"عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال:احتج ادم وموسیٰ فقال موسیٰ:یاادم انت الذی خلقکَ اللّٰہ بیدہ ونفخ فیك من روحہ اَغویتَ الناس واَخرجتَھم من الجنۃ؟قال فقال ادم انت موسیٰ الذی اصطفاكَ اللّٰہ بکلامہ اَتلومنی علی عمل عملتُہ کتبہ اللّٰہ عَلَیَّ قبل ان یخلق

السمٰوات والارض ؟قال فحجّ اٰدم موسیٰ"۔ [۱] (حسن غریب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدم وموسیٰ علیہما السلام دونوں نے آپس میں مدلل بحث کی پس موسیٰ نے کہا اے ادم! آپ وہی ہیں کہ اللہ نے آپ کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور آپ کے اندر اپنی طرف سے روح ڈالی، آپ نے لوگوں کو بھٹکا دیا اور ان کو جنت سے نکال باہر کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم نے اس کا جواب یوں دیا کہ تو وہی موسیٰ ہے کہ تجھے اللہ نے اپنے کلام کے ساتھ مخصوص کیا ہے، کیا تو مجھے ایسے عمل پر ملامت کرتا ہے جو میں نے کیا ہے! مگر اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق سے پہلے ہی میرے لئے لکھ دیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پس آدم حجت (دلیل) میں موسیٰ پر غالب آگئے۔

لغات:۔قولہ "احتج" احتجاج کے معنی حجت قائم کرنے اور استدلال کے ہیں۔قولہ "بیدہ" متشابہات میں سے ہے جس پر پہلے بحث گذری ہے، متاخرین اس کا ترجمہ قدرت سے کرتے ہیں۔قولہ "من روحہ" ''من'' ابتدائیہ ہے اور روح کی اضافت برائے تشریف وتعظیم ہے جیسے بیت اللہ، یعنی اللہ نے اپنی طرف سے ایک پاک روح آپ کے اندر ڈالی۔قولہ "اغویت" اِغواء سخت گمراہ کرنے کو کہتے ہیں یعنی مراد سے بہت دور لے جانا ہے یعنی جنت سے دنیا تک۔قولہ "اِصطفاك" ای اختارك، تجھے منتخب کیا ہے اور چن لیا ہے۔

تشریح:۔بعض نسخوں میں اس باب کو مترجم بترجمہ ''باب ماجاء فی حجاج ادم وموسیٰ علیھما السلام'' کیا گیا ہے، حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے درمیان یہ مناظرہ کب اور کہاں ہوا ہے؟ تو اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ملتی اس لئے شارحین نے مختلف احتمالات بیان کئے ہیں مثلاً عالم ارواح میں، عالم برزخ میں، ایک کی حیات کے زمانہ میں دوسرے کی روح کے ساتھ، شب معراج میں وغیرہ وغیرہ جبکہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ مناظرہ قیامت کے دن ہوگا مگر یقینی ہونے کی وجہ سے الفاظ ماضی کے استعمال کئے گئے جیسا کہ بلاغت کا اصول ہے، جبکہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ تمثیل ہے۔

بہر حال حدیث کی صحت کے بعد زمان ومکان کے ابہام سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تاہم اس حدیث کے

باب (بلا ترجمة)

[۱] رواہ ایضاً احمد فی مسندہ ص:۲۲۷ ج:۳ حدیث:۹۲۶۴ والطبرانی فی الکبیر حدیث:۱۶۶۳، مجمع الزوائد ص:۲۸۱ ج:۷ حدیث:۱۱۸۰۲، ایضاً روی بمعناہ بخاری ص:۴۸۴ ج:۱ کتاب الانبیاء.

سمجھنے کے لئے چند باتیں ملحوظ رکھنا اہم ہیں:

ایک بات: یہ کہ اللہ عز وجل کی صفات کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں کسی پر جلال کا غلبہ ہوتا ہے اور کسی پر جمال کا، حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر تھے اور باپ اپنی اولاد کے لئے جمال کا مظاہرہ کرے تو خوب ہوتا ہے گو کبھی کبھی جلال بھی ہونا چاہئے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے سرکش سے مباحثے کے لئے مختص کیا جانا تھا جس کا تقاضا تھا کہ جلال کا اظہار ہو پس یوں کہا جائے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام پر جمال کا غلبہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جلال کا، اور خصوصاً امور تشریعی کے حوالے سے۔

دوسری بات: یہ ہے کہ اس کون یعنی اس عالم میں دو طرح کے امور بیک وقت جاری ہیں ایک تکوینیہ اور دوسرے تشریعیہ، اللہ عز وجل نے اپنی کامل حکمت کے تقاضے سے امور تکوینیہ پر پردہ ڈالا ہے ورنہ نظامِ دنیا نہ چلتا، جبکہ امور تشریعیہ کو کھل کر بیان فرمایا ہے، انسان امر تکوینی کے آگے مجبور اور بے بس ہے جبکہ امور تشریعیہ میں بااختیار ہے۔

تیسری بات: یہ ہے کہ انسان جس طرح امور تشریعیہ پر بذات خود عمل کرنے کا پابند ہے اسی طرح دوسرے سے عمل کروانے کا بھی بقدر وسعت واستطاعت مکلف ہے۔

چوتھی بات: یہ ہے کہ ہر امر وجوب کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوامر ارشاد کے لئے اور بعض اوامر کسی اور غرض کے لئے ہوتے ہیں جیسا کہ اصول فقہ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے، اسی طرح نواہی میں بھی درجات ہیں۔

اس حدیث سے پہلے اگر ہم حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ سامنے رکھیں تو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملے گی، بایں صورت کہ حضرت خضر علیہ السلام نے تین کام ایسے کئے جن کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صبر نہ ہو سکا اور فوراً نکیر فرمائی حتیٰ کہ نوبت فراق تک جا پہنچی، حالانکہ ان کے اندر راز کی باتیں تھیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھیں کہ عالم الغیب صرف اللہ ہی ہے۔

پس یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جلالی شان کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ اتنی قدردانی کے باوجود آپ نے لوگوں کو جنت سے نکالا یعنی شجرہ ممنوعہ میں سے کھا کر آپ کو نکالا گیا جس کی وجہ سے آپ کی اولاد دُنیا میں پیدا ہوئی پس کوئی کافر ومشرک بن گیا اور کوئی فاسق، اگر آپ یہ خطا نہ کرتے تو سب لوگ جنت ہی میں ہوتے، جیسے حضرت خضر سے فرمایا تھا ''قوم حملونا بغیر نول عمدتَ الی

سفینتھم فخرقتھا لتغرق اھلھا''؟ [۲] حضرت آدم علیہ السلام نے وہی جواب دیا جو حدیث میں ہے یعنی یہ تو میرے لئے پہلے سے مُقدر تھا میں اس سے کیونکر بچ سکتا تھا؟ اسی بناء پر حضرت آدم علیہ السلام مناظرہ میں غالب رہے، یعنی اول تو ''ولا تقربا ھذہ الشجرۃ'' [۳] دنیا میں آنے سے پہلے کا حکم ہے جبکہ ابھی تک انسان کے اوپر تکلیف کا بوجھ نہیں ڈالا گیا تھا اور جنت تو دار التکلیف نہیں ہے ہاں اس سے پہلے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دنیا میں ہوا تھا، ثانیاً یہ حکم ایک تکوینی امر سے وابستہ کیا گیا تھا لہٰذا اس کی حیثیت اسی امر تکوینی کی ہوگئی تھی یعنی یہ حکم تکوینی اور تشریعی کے بین بین تھا، تشریعی امور کی خلاف ورزی کی سزائیں مختلف ہوتی ہیں اور تکوینی کی جداگانہ ہوتی ہیں اس لئے آدم علیہ السلام کی اولاد کو اگر اس کا بوجھ اٹھانا پڑے تو اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں، اگر ایک آدمی جہنم میں جاتا ہے تو وہ اپنی نااہلی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی وجہ سے نہیں، حضرت آدم علیہ السلام پر الزام اس وقت آتا کہ شجرۂ ممنوعہ میں سے کھانے کے بعد ان کی اولاد سیدھی جہنم میں چلی جاتی حالانکہ ایسا نہیں ہوا بلکہ اللہ نے ان کو جنت میں دوبارہ جانے کے تمام اسباب کا انتظام فرمایا ہے بلکہ پہلے کی جنت میں اور بعد کی جنت میں ایک واضح فرق ہے کہ اگر انسان یوں ہی جنت میں پیدا ہوتا تو اس سے انسانی صلاحیت کا پتہ کیسے چلتا؟ حتی کہ ابن قیمؒ نے اس موضوع پر مستقل کتاب ''مفتاح دار السعادۃ'' لکھ کر موقف اختیار کیا ہے کہ انسان کو جنت کے عوض نعم البدل ''علم وارادہ'' یعنی کسب وعمل دیا گیا ہے:

والمقصود ان اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ لمّا اقتضت حکمتہ ورحمتہ اخراج آدم وذرّیتہ من الجنۃ اَعَاضھم افضل منھا" الخ۔ (ص:۴۸، دار الکتب العلمیہ)

یہ طویل جواب اس لئے اختیار کیا گیا کہ جو جواب اس موقع پر مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا جواب عالم آخر سے متعلق ہے اس لئے وہاں تقدیر کا حوالہ دینا صحیح ہے۔

راقم کو اس سے شرح صدر نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو قبر اور محشر میں فساق یہی استدلال کرتے حالانکہ صریح نصوص کے مطابق ان کا کوئی عذر اور تقدیر کا حوالہ عند اللہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

---

[۲] رواہ البخاری ص:۴۸۲ ج:۱ "باب حدیث الخضر مع موسی علیھما السلام" کتاب الانبیاء۔

[۳] سورۃ البقرۃ آیت:۳۵۔

باب ماجاء فی الشقاء و السعادة

"سالم بن عبداللّٰہ یحدِّث عن ابیہ قال قال عمر: یارسول اللّٰہ اَرَایتَ مانعمل فیہ امر مبتدع او مبتدأ او فیما قدفُرِغَ منه؟ قال فیما قدفُرِغَ منه یابن الخطاب و کل مُیسَّر اما من کان من اهل السعادة فانه یعمل للسعادة و اما من کان اهل الشقاء فانه یعمل لِلشقاء"۔ [۱] (حسن صحیح)

حضرت سالم اپنے والد حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس بارے میں ارشاد فرمادیں کہ جو عمل ہم کرتے ہیں وہ نیا ہوتا ہے یا فرمایا (شک الراوی) کہ ابتدائی ہوتا ہے یا پھر وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے فراغت حاصل کی جاچکی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ایسا ہے جس سے فراغت ہوچکی ہے، اے ابن الخطاب! اور ہر ایک کو آسانی دی گئی ہے پس جو نیک بختوں میں سے ہو تو وہ بلاشبہ خوش نصیبی کا کام کرتا ہے، اور جو شخص بدنصیبوں میں سے ہو تو وہ بلاشبہ بدبختی کا عمل کرتا ہے۔

لغات:۔ قولہ "مبتدع او مبتدأ" لفظ "او" راوی کے شک کے لئے ہے کہ اصل لفظ مبتدع ہے یا مبتدء مطلب دونوں کا ایک ہی ہے یعنی جو کام ہم کرتے ہیں وہ اسی وقت وجود پذیر ہوتا ہے؟ قولہ "قدفرغ منه" یعنی اس کا ریکارڈ اور قبل العمل کوئی دوسرا وجود بھی ہوتا ہے۔ قولہ "میسر" اسم مفعول کا صیغہ ہے، آسانی وسہولت دیا ہوا شخص یعنی ہر آدمی کو تقدیر کے مطابق عمل کی آسانی دی گئی ہے۔

تشریح:۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ علم بالمعدوم جائز ہے جیسے قیامت ابھی قائم نہیں ہوئی ہے مگر ہمیں اس کے متعلق بہت ساری اشیاء سے آگاہ کردیا گیا ہے، اسی طرح ازل میں انسان نہیں تھا مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کو انسان کی رگ رگ اور اول تا مرگ تمام بیرونی واندرونی کیفیات، اعمال اور ارادوں کا علم تھا یہ ایسا ہے جیسے بلاتشبیہ کوئی ڈیم بن رہا ہو اور انجینئر پانی کی سطح پہلے سے معلوم کر کے نشانات لگائے تو جب وہ ڈیم تیار ہو جائے تو پانی اسی سطح تک پہنچ جاتا ہے نہ کم ہوتا ہے اور نہ زیادہ، البتہ یہاں تھوڑی بہت غلطی کا امکان رہتا ہے جبکہ تقدیر میں اور مابعد کے واقعات میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ کما ھو الظاہر

باب ماجاء فی الشقاء و السعادة

[۱] رواه مفصلاً احمد فی مسنده، بحواله مجمع الزوائد ص: ۲۸۵ ج: ۷ حدیث: ۱۱۸۱۶۔

اسی بناء پر انسان اپنی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ پہلے سے اللہ کو معلوم اور لوح محفوظ میں مکتوب وموجود ہوتا ہے اور چونکہ تقدیر انسانی مزاج اور چاہتوں کے مطابق ہے اور ہر شخص اپنے مزاج کا کام شوق سے اور آسانی سے کرتا ہے اس لئے یہ اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے انسان کے لئے آسان ہوتے ہیں مثلاً اگر کوئی ازلاً علم الٰہی میں چور تھا تو اس کے لئے چوری لکھی گئی ہے اور آج اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہ کام بڑی خوشی سے کرتا ہے، اور اس سے کوئی جبر بھی لازم نہیں آتا کیونکہ اگر کسی کو معلوم ہو کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے اور پھر پانی چھوڑ دے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پانی اس لئے نیچے کی طرف جارہا ہے کہ فلاں آدمی نے پہلے معلوم کیا تھا یا پیش گوئی کی تھی۔ تدبر

دوسری حدیث:۔ "عن ابی عبدالرحمٰن السلمی عن علیؓ قال: بینمانحن مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھوینکتُ فی الارض اذرفع رأسہ الی السماء ثم قال مامنکم من احد الاقدعُلِمَ قال وکیع الاقدکُتِبَ مقعدہ من النارومقعدہ من الجنة قالوا: اَفَلانتکل یارسول اللّٰہ؟ قال: لااعملوافکل مُیسّرلماخلق لہ"۔ [۲] (حسن صحیح)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ دریں اثنا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمین کرید رہے تھے اچانک اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر فرمانے لگے تم میں سے کوئی نہیں مگر معلوم کیا گیا ہے، امام وکیعؒ فرماتے ہیں کہ مقرر کیا (یعنی لکھا) گیا ہے اس کا ٹھکانا دوزخ میں سے اور جنت میں سے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! تو کیا ہم اسی پر تکیہ نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں! بلکہ عمل کرتے رہو کہ ہر شخص کو اس عمل کی آسانی دی گئی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

تشریح:۔ قولہ "ینکتُ" وہ کرید رہے تھے، ایک روایت [۳] میں ہے کہ یہ واقعہ جنت البقیع میں جنازہ کے وقت پیش آیا تھا، قبر ابھی تیار نہیں ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صحابہ کرامؓ بیٹھے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لکڑی سے زمین کو کرید رہے تھے چونکہ یہ عمل عموماً سوچ وبچار کے دوران ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اس وقت عالم بالا کے ساتھ تھا اس لئے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر مذکورہ ارشاد فرمایا۔

---

[۲] ایضاً رواہ البخاری ص:۹۷۷ ج:۲ کتاب القدر، ومسلم ص:۳۳۴ ج:۲ کتاب القدر۔ [۳] کذا فی صحیح مسلم: عن علی قال کنا فی جنازة فی بقیع الغرقد فأتانا رسول اللّٰہ ﷺ الخ ص:۳۳۳ ج:۲ کتاب القدر۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے سوال واستیذ ان کا منشا یہ تھا کہ کیوں نہ ہم تقدیر پر بھروسہ کر دیں کیونکہ ہوگا تو وہی جو تقدیر میں ہے ہم خواہ کچھ بھی کریں لیکن تقدیر کو تو تبدیل نہیں کر سکتے ہیں۔ اور جواب کا مطلب یہ ہے کہ تم قانونِ شریعت میں دخل اندازی مت کرو تمہیں عمل کرنے کا مکلّف بنایا گیا لہٰذا تم عمل کرو۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کا مطلب یہ تھا کہ جنت یا دوزخ میں جانے کے لئے دو مؤثر ہیں ایک عمل، یہ ظاہری مؤثر ہے اور دوم اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارادہ یہ اصل اور حقیقی مؤثر ہے تو ہم بجائے ظاہری مؤثر کے حقیقی پر کیوں بھروسہ اور تکیہ نہ کریں؟ اور جواب کا حاصل یہ ہے کہ دنیا دار الاسباب ہے اور ظاہری اسباب حقیقی مؤثر کے ساتھ مربوط ہیں لہٰذا عمل کرتے رہنا کیونکہ اچھے اعمال نیک بختی کی علامات ہیں جبکہ بُرے اعمال بدبختی کی نشانیاں ہیں اس لئے بُرے اعمال سے بچنا چاہئے، اور نیک اعمال چھوڑنا نہیں چاہئے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے عمل کی مشقت کا سہارا لیتے ہوئے عرض کیا کہ ہم تقدیر پر بھروسہ کرلیں گے تو آسانی ہوجائے گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک بختوں کے لئے کیا مشکل ہے ان کے لئے تو اعمال آسان بنادیئے جاتے ہیں جیسا کہ بزرگوں کے احوال سے نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قرة عینی فی الصلوٰة''،[۴] تدبر۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر آدمی کے دو ٹھکانے ہوتے ہیں اگر وہ جنت میں جائے تو دوزخ والی رہائش گاہ خالی رہتی ہے اور دوزخ میں جانے سے جنت والی خالی رہتی ہے۔ حاصل حدیث یہ ہے کہ اگرچہ سب کچھ تقدیر میں تو ہے مگر توکل ترکِ اسباب کا نام نہیں بلکہ تم تقدیر پر تکیہ یوں کرو کہ خلوص نیت کے ساتھ عمل کرکے تقدیر اور قضاء پر راضی رہو۔

باب ماجاء ان الاعمال بالخواتیم

"عن عبداللّٰه بن مسعود قال حدثنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وهو الصادق المصدوق ان احدکم یجمع خلقه فی بطن امه فی اربعین یوماً ثم یکون علقة مثل ذالك ثم یکون مضغة مثل ذالك ثم یرسل اللّٰه الیه الملك فینفخ فیه الروح ویؤمر باربع، یکتب رزقه واجله وعمله

[۴] رواه النسائی ص: ۹۳ ج: ۲ کتاب عشرة النساء، ایضاً مسند احمد ص: ۵۸۱ ج: ۲ حدیث: ۱۱۸۸۴.

وشقی او سعیدفوالذی لا الٰہ غیرہ ان احدکم لیعمل بعمل اھل الجنة حتی مایکون بینه وبینھاالاذراع ثم یسبق علیه الکتاب فیختم له بعمل اھل النارفیدخلھا" الخ۔ (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بات بتائی اور وہ سچے ہیں اوران کی سچائی مانی ہوئی ہے کہ تم میں سے ایک کی خلقت (کے مادہ) کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک جمع کیا جاتا ہے پھر وہ اتنی ہی مدت میں گاڑھا خون بن جاتا ہے پھر اسی طرح وہ لوتھڑا بن جاتا ہے پھر اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے پھر اسے چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے وہ اس کا رزق لکھتا ہے، اس کی اجل، اس کا عمل اور یہ کہ وہ بدبخت ہے یا نیک بخت، پس اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ تم میں سے ایک جنتیوں کا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک گز سے زیادہ فاصلہ نہیں بچتا کہ اتنے میں اس پر (تقدیر کا) لکھا ہوا غالب آجاتا ہے تو اس کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہو جاتا ہے پس وہ اسی میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور بے شک تم میں سے ایک دوزخ والوں کا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ذراع سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا پھر اس پر (تقدیر کا) لکھا ہوا غالب آجاتا ہے تو اس کا خاتمہ جنت والوں کے عمل پر ہوتا ہے اس طرح وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

لغات:۔ "وھو الصادق المصدوق" جملہ معترضہ ہے، صادق کے معنی تو ظاہر ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ان صفات میں سے ایک ہے جن کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبل النبوت بھی مشہور ہو چکے تھے۔ "مصدوق" کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی تسلیم کی گئی ہے حتی کہ ابوسفیان نے ہرقل کے دربار میں اس کا برملا اقرار کیا حالانکہ اس وقت ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت ومخالفت چل رہی تھی اور خود ابوسفیان فرماتے ہیں کہ اگر ساتھیوں کا ڈر نہ ہوتا کہ یہ بعد میں میری طرف غلط نسبت مشہور کردیں گے تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بولتا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچ ہی کہا گیا ہے کیونکہ وہ نبی ہیں اور نبی تو وحی سے بات کرتا ہے جو سراسر درست اور سو فیصد صحیح اور سچ ہی سچ پر مبنی ہوتی ہے۔ قولہ "یجمع خلقه" خلق سے مراد نطفہ ہے جو انسانی تخلیق کا مادہ اور بنیادی عنصر ہے۔ اور جمع سے مراد یہ ہے کہ رحم جسے حیوان مشتاق الی الذکر کہتے ہیں جماع کے وقت منہ کھولتا ہے اور جماع کے بعد بند کرتا ہے۔ قولہ "اربعین یوماً" یہ اوسط اور عام مدت ہے کیونکہ عام انسانوں میں چالیس دنوں میں تغیر اور تبدیلی آتی

ہے۔بعض کی استعداد اچھی ہوتی ہے وہ اس سے پہلے اور بعض اس کے بعد تبدیل ہو جاتے ہیں جیسا کہ زندہ انسانوں میں اس کا مشاہدہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔قولہ "علقة" ای دماغلیظاحامداً یعنی گاڑھا خون جیلی کی طرح۔قولہ "مضغة" گوشت کالوتھڑا اور ٹکڑا، مضغ اصل میں چبانے کو کہتے ہیں چونکہ یہ لوتھڑا ایک بوٹی کی بقدر ہوتا ہے جس کو چبایا جاسکتا ہے اس لئے مضغہ سے تعبیر کیا۔

تشریح:۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس حدیث کے بیان کے وقت ایک منفرد اندازِ کلام اختیار کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی تخلیق تین اندھیروں میں ہوتی ہے، جس کا مشاہدہ خالی آنکھ سے ممکن نہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ نبی ہیں اس لئے وہ ہی ایسے معاملات کی خبر دے سکتے ہیں، لہٰذا اس کے ماننے میں تردد کی گنجائش نہیں۔

احادیث میں اربعینیات کے الفاظ اور تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر اس کو تعارض نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ اختلاف نطفے کی استعداد کے اختلاف پر مبنی ہے جیسا کہ اوپر لغات میں عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ تبدیلی اکثری واغلبی ہے اور شریعت کے احکام چونکہ اغلب حالات پر وارد ہوتے ہیں اس لئے حدیث میں اربعینات ثلاثہ کا ذکر بکثرت آیا ہے اگرچہ اس مدت میں کمی بیشی متوقع ہے، چنانچہ ابن رجب حنبلی نے شرح الخمسین میں یہ عمل دوسرے اربعین کے اول میں ہونے کے بارے میں بھی روایت نقل کی ہے:

> ففی صحیح مسلم.... اذا مر بالنطفة اثنان واربعون لیلة بعث اللّٰه الیها ملکاً فصورها الخ .... وفیه وحدیث مالك بن الحویرث یدل علی ان التصویر یکون للنطفة ایضاًفی الیوم السابع ....۔(راجع للتفصیل شرح الخمسین من ص:۶۲ الی ۷۵)

بہر حال ضابطے کے تحت فقہاء نے چار مہینے جو کہ تین اربعینات ہیں، سانس لینے کی حد مقرر کی ہیں۔ (تفکر ولا تعجل)

اگرچہ کچھ نہ کچھ حیات تو نطفے میں بھی ہوتی ہے مگر یہاں بنے بنائے انسان کی بات ہو رہی ہے اس حوالے سے ایک سو بیس دنوں میں پورا ڈھانچہ تیار ہو کر سانس لیتا ہے، اسی دوران ایک فرشتہ جو ارحام پر مقرر ہے اور اللہ کی جانب سے مامور ہوتا ہے آکر اس میں روح پھونکتا ہے اور اس کی زندگی کا ریکارڈ بنا کر فائل میں درج کرتا ہے، ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہ موقف اختیار فرمایا ہے کہ "ویؤمر باربع" میں حکمت یہ ہے کہ اللہ عزوجل

کے اوامر پر تنسیخ کا پردہ آسکتا ہے جبکہ اخبار میں نسخ ممکن نہیں گویا رحم مادر میں جو تقدیر ہوتی ہے اس میں تبدیلی ممکن ہے البتہ لوح محفوظ میں تغیر کا امکان نہیں، یہ مسئلہ تقدیر معلق و مبرم کی طرف راجع ہو جاتا ہے۔

الرابعة قوله "ویؤمر" هذه الفائدة العظمیٰ :لانه لواخبرفقال :اجله كذاورزقه كذاوهوشقي اوسعيدماتغيرخبره ابداًلان خبرالله لايجوزان يوجدبخلاف مخبره لوجوب الصدق له،ولكنه يأمربذالك كله ولله سبحانه ان ينسخ امره ويقلب ويصرف العبادفيه من وجه الى وجه فافهمواهذفانه نفيس وفيه يقع المحووالتبديل وامافي الخبرفلايكون ذالك ابداًو كذالك يقع المحوفي صحائف الملك ويرفع الى مافي ام الكتاب وهوتأويل قوله "يمحوالله مايشاء ويثبت"۔ [1] (عارضة الاحوذی)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ تقدیر مبرم اور معلق کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اسی طرح امکان کذب کا مسئلہ بھی پہلے سے کم نہیں یہ موقعہ اس کے بیان کا نہیں تاہم عارضہ کی اس عبارت سے بہت ساری روایات میں تطبیق آسان ہو جاتی ہے۔فاغتنم هذا

وہ مزید لکھتے ہیں کہ لوگوں کی چار قسمیں ہیں :ایک وہ جو عمر بھر مؤمن رہے۔دوم اس کے برعکس جو زندگی بھی کافر رہے۔سوم جو پہلے مؤمن ہو اور موت کے قریب کافر ہو جائے۔اور چہارم اس کے برعکس جو پہلے کافر ہو اور موت کے قریب مؤمن بن جائے۔اس حدیث میں آخری دونوں قسموں کا بیان ہے۔

محشی نے ملا علی قاریؒ کی مرقات [2] سے ایک جامع عبارت نقل کی ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنے نیک اعمال کی وجہ سے عجب اور کبر وغیرہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے اور گناہوں کی بناء پر مایوس نہیں ہونا چاہئے، نہ کسی بظاہر نیک آدمی پر جنتی کا حکم لگایا جائے اور نہ ہی کسی گناہ گار کو دوزخی قرار دینا چاہئے کہ اعتبار تو خاتمہ کو ہے نہ معلوم کون آخر میں کیسے رہتا ہے؟ غرض بین الخوف والرجاء رہنے کی پابندی کرے۔

باب ماجاء ان الاعمال بالخواتيم

[1] سورة الرعد آيت: ۳۹۔ [2] قال الملاعلی قاری فی المرقاة: اقول فی الحديث تنبيه علی ان السالک ينبغی ان لايغتر باعماله الحسنة ويجتنب العجب والتكبر والاخلاق السيئة ويكون بين الرجاء والخوف ومسلماً بالرضا تحت حكم القضاء الخ ص:۲۶۷ ج:۱، مكتبه حقانيه ملتان

اشکال:۔ یہ تو بڑا مشکل معاملہ ہے کہ انسان کی ساری زندگی عبادت میں اور اللہ کی اطاعت میں گذر جائے اور جب موت قریب ہو جائے تو سب نیکیاں نیست و نابود ہو جائیں اور آدمی عمل بد (کفر) کی وجہ سے دوزخ میں چلا جائے؟

حل:۔ یہ بدانجامی صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے اعمال میں مخلص نہیں ہوتے ہیں ان کے اعمال اگر چہ ظاہری شکل میں بہت اچھے اور زیادہ محسوس ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ جان سے خالی ہوتے ہیں وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود دھوکے میں ہوتے ہیں: "قال اللّٰہ تعالیٰ "یُخدعون اللّٰہ والذین امنوا ومایخدعون الاانفسھم ومایشعرون فی قلوبھم مرض فزادھم اللّٰہ مرضاًالخ" [۳] گویا موت کے وقت ان کی دو موت آجاتی ہیں ایک جسمانی اور دوسری روحانی۔

اس کے برعکس جو لوگ مخلص اور قضاء پر راضی ہو کر عمل میں مگن رہتے ہیں وہ اللہ کے فضل کرم سے سوء خاتمہ سے محفوظ ہوتے ہیں، تاہم یہاں یہ سوال بھی باقی رہتا ہے کہ خلوص کی حد کیا ہے؟ اس کے جواب میں ابن قیمؒ "مفتاح دارالسعادۃ" میں لکھتے ہیں:

"ان خواص الامة ولبابھالماشھدت عقولھم حسن ھذالدین وجلالته وکماله وشھدت قبح ماخالفه ونقصه ورداء ته خالط الایمان به ومحبته بشاشة قلوبھم فلوخیّربین ان یلقی فی النار وبین ان یختاردِیناًغیره لاختاران یقذف فی النار وتقطع اعضاء ہ ولایختاردِیناًغیره وھذاالضرب من الناس ھم الذین استقرت اقدامھم فی الایمان وھم ابعدالناس عن الارتدادعنه واحقھم بالثبات علیه الی یوم لقاء اللّٰہ "الخ۔ (ص:۳۳۱)

یعنی اگر کسی کا ایمان اس حد تک پختہ ہے کہ وہ ایمان کو جان و مال اور اعضاء وابکار ہر چیز سے عزیز ولذیذ سمجھتا ہے تو وہ خاتمہ بالسوء سے محفوظ ہے اب ہر آدمی خود ہی فیصلہ کرے کہ اس کا ایمان اس کے نزدیک کتنا قیمتی ہے؟

---

[۳] سورۃ البقرۃ آیت:۹،۱۰۔

باب ماجاء کل مولود یولد علی الفطرة

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: کل مولود یولد علی الملة فابواه یُهَوِّدانه ویُنَصِّرانه ویُشَرِّکانه، قیل یارسول الله! فمن هلك قبل ذالك؟ قال: الله اعلم بما کانوا عاملین به"۔[1] (حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بچہ ملتِ (اسلامیہ کی استعداد) پر پیدا ہوتا ہے پس اس کے والدین اس کو یہودی بناتے ہیں اور نصرانی بنادیتے ہیں اور اسے مشرک بنادیتے ہیں، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! جو اس (بلوغت) سے پہلے مرجائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرنے والے تھے۔

لغات:۔ ''ملت''، صحیحین[2] کی روایت میں لفظ ''فطرت'' آیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی کی روایت بالمعنی ہے اور شیخین کی بلفظہ ہے، فطرت سے مراد ملت اسلامیہ ہے یا اس کی استعداد، اس میں اختلاف ہے، تفصیل تشریح میں ملاحظہ ہو۔ البتہ لغت میں فطرت بمعنی انشقاق اور تقطیع یعنی پھٹنے اور پھاڑنے کے بھی آتا ہے۔ اور بمعنی ابتداء کے بھی آتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ قولہ "یہودانه" الخ یہ تینوں صیغے مضارع کے ہیں اور باب تفعیل سے ہیں یعنی وہ بچے ماں باپ کی تعلیم اور اثرِ ماحول کی وجہ سے بے دین کردیئے جاتے ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث شریف میں تین باتیں اہم ہیں: پہلی یہ کہ جیسا کہ فطرت کے لغوی معنی سے معلوم ہوا کہ یہ انسانی تخلیق کی ابتداء کی طرف اشارہ ہے تو وہ کون سی ابتداء ہے۔ دوسری یہ کہ انسانی بچے کی یہ حالت کس نوعیت کی مراد ہے آیا اس سے مراد اسلام ہے یا استعداد وغیرہما۔ تیسری بات یہ ہے کہ کافروں کے نابالغ بچے کہاں ہوں گے؟

(۱)... پہلی بات کے متعلق ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اس کتابت کی طرف اشارہ ہے جب اللہ عزوجل نے قلم پیدا فرمایا تھا، یا پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو ذرّ کی شکل میں

باب ماجاء کل مولود یولد علی الفطرة

[1] راجع ایضاً مجمع الزوائد ص:۲۱۶ ج:۷ حدیث:۱۱۹۴۸۔

[2] صحیح بخاری ص:۹۷۶ ج:۲ کتاب القدر، صحیح مسلم ص:۳۳۶ ج:۲ کتاب القدر۔

پیدا فرمایا تھا اوران کو اللہ کی ربوبیت پر مقر اور گواہ بنایا تھا،'' وقال بعضهم من لم يعلم هو المكتوب عليه وهو فى الرحم '' الخ اس تیسری رائے کو انہوں نے لاعلمی سے تعبیر کیا ہے حالانکہ عام شارحین نے صرف اسی کو لیا ہے کہ جب انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ فطرت اور ملت کے مطابق ہوتا ہے اور حدیث میں لفظِ ''یولد'' بھی اس کی طرف مشیر ہے۔

(۲)...دوسری بات میں اختلاف ہے مگر قابل ذکر اقوال دو ہیں: (۱) امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس فطرت سے مراد دین اسلام ہے پس مطلب یہ ہوگا کہ ہر انسانی بچہ مسلمان یعنی عقائد اسلامیہ پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کے والدین غلط پرورش کر کے اسے گمراہ کر دیتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ فطرت سے مراد اسلام قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ''والاصح ان معناه ان كل مولو ديولدمتهيّئاًللاسلام '' الخ۔ (ص: ۳۳۷ ج: ۲)

عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"ومعنى ولادته على ذالك كله يرجع الى انه يولدسليماًعن عيب غيرمكتسب لشئى كماقال الله : "والله اخرجكم من بطون امهاتكم لاتعلمون شيئاً" (النحل:۷۸) ثم يعودالى ماأمَرَالله به او كتبه من عمله بالتيسيرالى ذالك اماعلى يدى ابوين وهذاالاكثروعنه وقع الخبروامابقرينٍ وقداخبرالله عنه فقال: "وقيّضنالهم قُرناء" والابوين قرين"۔

یعنی انسانی بچہ یہودیت، نصرانیت اور شرک وغیرہ ہر قسم کے عیوب سے پاک پیدا ہوتا ہے جیسا کہ جانور سلیم الاعضاء پیدا ہوتے ہیں مگر جس طرح ان کے مالک ان کے کان وغیرہ کاٹ دیتے ہیں اور ان کو معیوب بنادیتے ہیں اسی طرح انسانی بچے کو ماں باپ معیوب اور گمراہ کر دیتے ہیں جو حدیث بالا میں بیان ہوا یا اس کے ساتھی اور غلط ماحول کے اثرات گمراہ کر دیتے ہیں جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے۔

یہی رائے علامہ تورپشتی، علامہ طیبی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہم اللہ اور اس سے ملتے جلتے معنی کے قائل حضرت شاہ ولی اللہؒ وغیرہم بہت سے حضرات کی ہے۔

فریق اول کا استدلال سورۂ روم کی اس آیت سے ہے: ''فطرت الله التى فطرالناس عليها لاتبديل لِخلق الله ذالك الدين القيم ''(روم آیت ۳۰) اس میں گویا فطرت کی تفسیر دین قیم سے کی گئی ہے۔

ان کا دوسرا استدلال عِیاض بن حمار کی مرفوع حدیث سے ہے، یہ حدیث قدسی ہے: ''انی خلقتُ عبادی حُنفاء کلّهم فاجتالهم الشیطان عن دینهم '' [۳] بعض طرق میں ''حُنفاءَ مسلمین '' کے الفاظ ہیں جو زیادہ صریح ہیں، نیز حدیث الباب میں بھی لفظ ملت آیا ہے، معلوم ہوا کہ فطرت سے مراد ملت اور اسلام ہی ہے۔

فریق ثانی کا استدلال یہ ہے کہ اگر انسانی بچہ مسلمان ہی پیدا ہوتا تو پھر غیر مسلموں کے بچے اپنے ماں باپ کے تابع نہ ہوتے حالانکہ اس بارے میں روایات تواتر کی حد تک پہنچی ہیں کہ ان کے احکام قبل البلوغت وہی ہیں جو ان کے بڑوں کے ہیں لہٰذا ان کا قبرستان الگ ہے، ان کی نماز جنازہ نہیں ہے، کیا کسی بھی ایک روایت سے ثابت ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی یہودی بچے یا مشرک بچے کی نماز پڑھی ہو حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ کا بڑا اہتمام بلکہ التزام فرماتے، نیز مسلمان کی نماز جنازہ تو فرض ہے تو اس عہد پاک میں جو بچے بغیر جنازہ کے دفن ہوئے اور آج تک ہور ہے ہیں؟ کیا سب مسلمان جنازہ نہ پڑھنے کی وجہ سے تارک فرض ہوں گے؟ اسی طرح وہ بچے جب ماں باپ کے ساتھ گرفتار ہوجائے تو وہ غلام تصور کئے جاتے۔ غرض یہ بات انتہائی جلی ہے کہ عملی طور پر کسی بھی غیر مسلم کے بچے کے ساتھ مسلمانوں کے بچوں سا سلوک نہیں کیا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان پیدا نہیں ہوتے۔

فریق اول کے استدلال کا جواب:۔ ان حضرات کی دونوں دلیلوں کا جواب اور حدیث الباب کا مطلب یہ ہے جیسا کہ ابن العربیؒ نے فرمایا کہ ہر انسانی بچہ کفر اور شرک کے عیوب سے پاک اور صاف ستھرا پیدا ہوتا ہے بس وہ ایک خالی لوح کی طرح ہوتا ہے مگر دین اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے انسان فطری طور پر اللہ کی ربوبیت، توحید اور الوہیت کا قائل اور نجاستوں سے متنفر رہتا ہے اس لئے اگر اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہ ہوتا تو وہ صاف ستھرا مؤحد ہی بنتا جیسا کہ پہلے مسلم الثبوت کا حوالہ گذر گیا ہے اور چونکہ یہ صلاحیت انتہائی تیز اور بالفعل مؤثر ہے اس لئے اسے ملت سے تعبیر فرمایا، جیسے ایک گاڑی بالکل زیرو میٹر ہو مگر اس میں دوسو میل فی گھنٹہ رفتار والا میٹر فٹ کیا گیا ہو تو وہ اگرچہ ابھی تک روڈ پر چلی نہ ہو مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ گاڑی دوسو میل کی رفتار سے چلنے والی ہے، ہاں اگر اسے ضائع کر دیا جائے تو وہ الگ بات ہے اسی طرح اس خالی لوح اور سادہ لوح بچے کے دل و دماغ پر کچھ اور کندہ کیا جائے تو وہ قبول کرلے گا۔

---

[۳] رواه مسلم ص: ۳۸۵ ج: ۲ کتاب الجنة، ایضاً رواه احمد فی مسنده ص: ۱۶۲ ج: ۵ حدیث: ۱۷۰۳۰.

خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات میں اسلام بالقوۃ کو قوتِ امکان کی وجہ سے اسلام بالفعل سے تعبیر کیا ہے۔

تدبر و تشکر

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کبھی کبھار ماہیت کے مقتضیٰ سے تخلف بھی ممکن ہے یعنی بعض افراد ماہیت کے اقتضاء سے نکل بھی جاتے ہیں جیسے شہد کی مکھیوں کا ایک نوعی مزاج ہے کہ وہ پھولوں پر بیٹھتی ہیں لیکن ایک دو مکھیاں پیشاپ پر بھی بیٹھتی ہیں اسی طرح کھیرا بعض کڑوا بھی ہوتا ہے چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچے کو قتل کیا تھا وہ ماہیت کے اس ضابطے سے مستثنیٰ تھا یہ اللہ کی قدرت کا اظہار ہے تاکہ مادہ پرست اور دھری لوگ سمجھ جائیں کہ یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر کوئی تصرف کرنے والا موجود ہے جو محض اپنی مرضی سے تصرف کرتا ہے۔

اعتراض:۔ یہاں یہ اشکال پیش آتا ہے کہ فطرت سے خواہ کوئی بھی معنی لئے جائیں لیکن مذکورہ بالا آیت میں تصریح ہے کہ: ''لاتبدیل لخلق اللہ'' [۱] جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچے بھی بگڑ جاتے ہیں بلکہ ان کی غالب اکثریت اسلام سے دور بھاگتی ہے۔

جواب:۔ اس کا حل یہ ہے اور یہ حل ان لوگوں کی طرف سے زیادہ آسان اور بے غبار ہے جو فطرت بمعنی استعداد لیتے ہیں کہ وہ صلاحیت تبدیل نہیں ہوتی ہے بلکہ ماں باپ اور ماحول اس کو دبا لیتے ہیں، یا یوں کہنا چاہئے کہ اس کو دوسری جانب موڑ لیتے ہیں جیسے کسی پودے کو انتہائی ٹھنڈے یا انتہائی گرم کمرے میں رکھ دیا جائے تو وہ بڑھ نہیں سکے گا اور جو شخص اس کو بجائے بلندی کے دائیں بائیں موڑے گا تو وہ اپنا راستہ تبدیل کردے گا اسی طرح جیسے ایک ذہین بچے کو مہمل چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑا آدمی نہیں بن سکتا حالانکہ ان تمام صورتوں میں اصل صلاحیت موجود ہوتی ہے مگر بے اثر ہو جاتی ہے آج بھی اگر سب کفار خواہ صغار ہوں یا کبار اگر تعصب کی عینک اتار دیں تو چند دنوں میں ساری دنیا میں ایک خدا اور دین اسلام۔ کے ماننے والوں کے سوا کوئی بھی نہیں بچے گا۔

(۳) تیسری بات:۔ غیر مسلموں کے نابالغ بچوں کے بارے میں کوئی واضح حکم ثابت نہیں بلکہ مختلف موقعوں میں ایک دوسرے سے جُدا گانہ ارشادات وارد ہوئے ہیں، اس لئے بعض علماء نے اس مسئلہ میں توقف اختیار کیا ہے، ملا علی قاریؒ مرقات میں لکھتے ہیں کہ بعض نے ان کو ماں باپ کی وجہ سے جہنمی قرار دیا ہے۔

---

[۱] سورۃ الروم آیت: ۳۰.

بعض نے کہا ہوں گے تو جنت میں مگر "لا منعمین و لا معذبین"۔ بعض نے کہا کہ اللہ کے علم میں جو بڑا ہو کر ایمان لاتا اور اسی پر مرتا تو وہ جنت میں جائے گا اس کے برعکس اگر وہ کافر بن کر مرتا تو وہ دوزخ میں ہوگا۔ "وقال ابن الحجرؒ هذا قبل ان ينزل فيهم شئي فلاينافي ان الاصح انهم من اهل الجنة"۔ (حاشیہ مشکوٰۃ ص:۲۱ از مرقاۃ[۵])

یعنی اخیر الحکم یہی ٹھہرا ہے کہ وہ جنت میں ہوں گے، امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

"الاصح انه من اهل الجنة والجواب عن حديث :الله اعلم بما كانوا عاملين انه ليس فيه تصريح بانهم في النار الخ"۔ (ص:۳۳۷ ج:۲)

المسترشد عرض کرتا ہے کہ عام اصول وروایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے لہٰذا جو روایات ان کے دوزخی ہونے کی طرف مشیر ہیں یا تو ان میں تاویل کی جائے گی یا وہ دوسرے اصول سے از روئے اجتہاد مستنبط ہیں مگر ترجیح ان روایات[۶] کو ہے جو جنت میں جانے پر ناطق ہیں کہ اللہ عزوجل بغیر عمل کے کسی کو محض اپنے علم کی بناء پر نہیں پکڑتا، اور یہ کہ تکلیف بعد البلوغت ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

باب ما جاء لا يَرُدُّ القدرَ الا الدعاء

"عن سلمان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :لا يَرُدُّ القضاءَ اِلا الدعاء ولا يزيد في العمر اِلا البِرُّ"۔ (حسن غريب)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ قضاء کو نہیں ٹال سکتی مگر دعا اور عمر میں زیادتی نہیں کرتی مگر نیکی۔

تشریح:۔ اس حدیث سے استدلال کر کے بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ اجل میں تقدیم وتاخیر ہو سکتی ہے، جبکہ ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ازل میں معلوم تھا کہ فلاں شخص اگر دعا نہ مانگتا یا فلاں نیکی نہ کرتا تو اس کی عمر مثلاً چالیس سال ہوتی مگر بوجہ دعا یا نیکی کے ساٹھ ہوگی لہٰذا یہ کمی بیشی اس دعا یا طاعت کی طرف منسوب کی گئی اور چونکہ تقدیر میں آگے پیچھے ہونے کا امکان نہیں ہے اس لئے اب جو بھی مرے گا وہ اپنے وقتِ

---

۵ مرقاة المفاتيح ص: ۱۷۲ ج: ۱ قال ابن حجر: ولعل هذا كان قبل ما نزل عليه في ولدان المؤمنين والكفار اذ هم في الجنة اجماعاً في الاول وعلى الاصح في الثاني. ۶ راجع للمؤيدات مجمع الزوائد ص:۲۱۸ ج:۷ كتاب القدر.

مقررہ ہی پر مرے گا چنانچہ عقائد النسفیہ میں ہے: ''والمقتول میت باجله والموت قائم بالمیت مخلوق اللّٰه تعالیٰ والاجل واحد''۔ معتزلہ کو علامہ تفتازانیؒ نے جواب دیا ہے:

''والجواب عن الاول (ای استدلال المعتزلة بان بعض الطاعات یزید فی العمر) ان اللّٰه تعالیٰ کان یعلم انه لولم یفعل هذه الطاعات لکان عمره اربعین سنةً لکنه علم انه یفعلها ویکون عمره سبعین سنةً فنسب هذه الزیادات الی تلك الطاعة بناءً علی علم الله تعالیٰ انه لولاها لما کانت تلك الزیادة''۔ (شرح عقائد ص:۴۷)

جیسے نقد اور ادھار کی دو مختلف قیمتوں میں سے ایک ہی طے ہو جائے تو ثانی برائے نام رہتی ہے۔

تدبر

باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمٰن

''عن انس قال کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یُکثِرُان یقول: یامُقلِّبَ القلوبِ ثَبِّت قلبی علی دینك افقلتُ یانبی اللّٰه! امنابِكَ وبماجئتَ به فهل تخاف علینا؟ قال: نعم ان القلوب بین اصبعین من اصابع اللّٰه یُقلِّبها کیف شاء''۔ [1] (حسن صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ دعا فرماتے: اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔ پس میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم آپ پر اور جو کچھ آپ لائے ہیں سب پر ایمان لائے ہیں تو کیا آپ ہمارے بارے میں خائف ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں کیونکہ سب دل اللہ کے اصابع میں سے دو اصبعین کے درمیان ہیں وہ جس طرف چاہتا ہے ان کو پھیر دیتا ہے، (یعنی کبھی طاعت کی طرف اور کبھی گناہ کی جانب)۔

تشریح:۔ چونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم علی الیقین جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں اس لئے وہ اس قسم کی ادعیہ صرف امت اور خصوصاً صحابہ کرامؓ کے لئے فرماتے ہیں اس لئے حضرت انسؓ نے

باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن

[1] رواه ایضاً ابن ماجه ص: ۲۷۲ ''باب دعاء رسول اللّٰه ﷺ'' ابواب الدعاء، مسنداحمد ص: ۱۹۷ ج: ۵ حدیث: ۱۷۱۷۸، ایضاً روی بمعناه الطبرانی فی الاوسط عن عائشةؓ، مجمع الزوائد ص: ۳۰۶ ج: ۷ حدیث: ۱۱۹۹۱.

پوچھا کہ آپ کو ہمارے بارے میں بے راہ روی کا خطرہ واندیشہ ہے؟ جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں الخ، جواب کا مقصد یہ ہے کہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ اگر ایک آدمی کسی وقت میں ایک کیفیت پر کائن ہے اور کسی حالت سے وقتی طور پر گذر رہا ہے تو وہ ہمیشہ اسی حالت پر قائم رہے گا، کیونکہ یہ دل تو اللہ کے دستِ قدرت میں ہیں وہ لمحہ سے کم آن میں ان کو تبدیل کرسکتا ہے اس لئے ہر وقت اللہ کا خوف دل میں رکھ کر بڑی عاجزی سے ہدایت پر استقامت کی دعائیں مانگنی چاہیئے تاکہ اللہ کی توفیق ہر وقت شاملِ حال رہے۔ اصبعین کا اطلاق متشابہات میں سے ہے جس کے بارے میں عرض کیا جاچکا ہے۔ (دیکھئے تشریحات: ج۲ص ۳۰۷ ''باب ماجاء فی نزول الرب تبارک وتعالیٰ الی السماء الدنیا کل لیلۃ، قُبیلَ ابواب الوتر)

خلاصہ یہ ہے کہ متقدمین ایسی نصوص میں تنزیہ مع التفویض کے قائل ہیں جبکہ متاخرین تنزیہ مع التاویل کے۔ قال ابن العربیؒ فی العارضۃ: ''ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتکلم بالحقیقۃ والمجاز''۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ افضل یہ ہے کہ متشابہات میں وہی منصوص الفاظ نقل کیے جائیں اور کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ نہ کیا جائے کہ اس سے ذہن جوارح کی طرف جاتا ہے اگرچہ عوام کے سامنے متشابہات بیان کرنے سے امام مالکؒ نے منع فرمایا اور امام بخاریؒ نے صحیح میں کتاب العلم کے آخر میں دو باب قائم کر کے اس پر زور دیا ہے کہ لوگوں سے ان کے فہم کے مطابق بات کرنی چاہئے، اور ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: ''ماانت بمحدّث قوماً حدیثاً لاتبلغہ عقولُھم الاکان لبعضھم فتنۃً''۔ (رواہ مسلم فی مقدمتہ ص:۹) مگر بوقت ناگزیر ضرورت اگر نوبت آہی جائے تو ان کے لئے تاویل کی ضرورت ہے جیسا کہ متاخرین نے کیا ہے کیونکہ یہ وقت روشن خیالی کا ہے لوگ ایمان کے بارے میں بہت زیادہ بے تکلف ہو گئے ہیں جس سے علماء کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہوا ہے۔

باب ماجاء ان اللہ کتب کتاباً لِاھل الجنۃِ والنارِ

''عن عبداللہ بن عمروقال خرج علینارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی یدہ کتابان فقال: اَتدرُونَ ماھذان الکتابان؟ قلنا: لایارسول اللہ اِلاان تُخبرنافقال لِلذی فی یدہ الیُمنیٰ: ھذا کتاب من رب العٰلمین فیہ اسماء اھل الجنۃ واسماء آبائھم وقبائلھم ثم اُجمِلَ علی اٰخرھم فلایُزادفیھم ولایُنقص منھم ابداً، ثم قال للذی فی شمالہ ھذاکتاب من رب العٰلمین فیہ اسماء

اهل النار واسماء آبائهم وقبائلهم ثم أُجمِلَ على اخرهم فلايُزاد فيهم ولايُنقص منهم ابداً۔فقال اصحابه فَفِيمَ العملُ ؟يارسول الله!ان كان امرقدفُرِغَ منه فقال سدِّدُوا وقارِبوافان صاحب الجنة يُختَمُ له بعمل اهل الجنة وإن عَمِلَ ایَّ عَمَلٍ،وان صاحب النار يُختَمُ له بعمَلِ اهل النار وان عمِل ایَّ عملٍ ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده فَنبَذَهماثم قال:فَرَغَ ربُّكم من العِبادفريق فى الجنة وفريق فى السعير"۔ (حسن صحيح غريب)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر تشریف لائے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ (اور مشکوۃ میں تثنیہ کا صیغہ ہے یعنی دونوں ہاتھوں) میں دو کتابیں تھیں پس فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تم لوگ جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا نہیں اے اللہ کے رسول! الا یہ کہ آپ ہمیں آگاہ فرمائیں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کے متعلق جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داہنے ہاتھ میں تھی فرمایا کہ یہ رب العٰلمین کی جانب سے ایک کتاب ہے اس میں جنتیوں کے نام ہیں اور ان کے آباو قبائل کے نام ہیں اور پھر آخر میں ٹوٹل (میزان) ذکر کیا گیا ہے پس نہ تو ان میں کبھی زیادتی ہوگی اور نہ ہی کبھی کمی ہوگی۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا یہ (بھی) رب العٰلمین کی جانب سے ایک کتاب ہے اس میں دوزخیوں کے نام اور ان کے آباء اور قبیلوں کے نام ہیں پھر ان کے آخر میں مجموعہ عدد لکھا گیا ہے پس نہ تو کبھی ان میں زیادتی ہوگی اور نہ ہی کوئی کمی ہوگی، تو صحابہ کرامؓ نے فرمایا اے اللہ کے رسول! پھر عمل کس لئے کیا جائے؟ کہ جب صورت حال طے شدہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا استقامت پر رہو اور درمیانی راہ اختیار کرو کہ بلاشبہ جنتی کا خاتمہ جنت والوں کے عمل پر ہوگا خواہ وہ (پہلے) کوئی بھی عمل کرتا رہے اور بلاشبہ جہنمی کا خاتمہ دوزخ والوں کے عمل پر ہوتا ہے خواہ وہ کیسا ہی عمل کرے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ فرما کر وہ کتابیں (عالم بالا کے) حوالہ کردیں پھر فرمایا تمہارے پروردگار بندوں سے فارغ ہوگیا ہے ایک فریق جنت میں ہوگا اور دوسرا جہنم میں رہے گا۔

لغات:۔ قولہ "أُجمِل" بصیغہ مجہول میزان اور ٹوٹل کو کہتے ہیں جس میں کل عدد کا مجموعہ پیش کیا جاتا ہے۔قولہ "سدِّدوا" سَدَادا فراط وتفریط کے درمیانی حالت یعنی اعتدال کو کہتے ہیں۔قولہ "وقاربوا" سداد کے قریب رہو یعنی اگر بالکل سیدھا چلنا اور راستے کے بیچوں بیچ سے گذرنا مشکل لگے تو کم از کم اس کے قریب تو رہو،

یا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کرو جبکہ علامہ طیبیؒ نے اس کو ''سدوا'' کی تاکید قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اعتقادی اعتدال یہ ہے کہ تناقض فی النصوص سے بچے اور اعمال میں افراط وتفریط سے بچے۔

تشریح:۔ آپ علیہ السلام کے ہاتھوں میں جو کتابیں تھیں ان کے بارے میں دو احتمال ہیں: ایک احتمال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تمثیل فرما رہے ہوں کہ یوں سمجھو جیسے میرے ہاتھوں میں دو کتابیں ہیں چونکہ آپ علیہ السلام پر ان کتابوں کے بارے میں اور تفصیلات کے متعلق کشف تام حاصل تھا اس لئے اشارۂ حسیہ صحیح ہوا جیسے ایک ماہر مصنف کتاب کے شروع میں کہتا ہے ''ھذا کتاب یاھذہ رسالۃ '' وغیرہ بلکہ اس سے زیادہ ظاہر مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کتابوں کا تعلق عالم مثال سے ہو جس کا مشاہدہ آپ علیہ السلام فرما رہے تھے اور صحابہ کرامؓ کو نظر نہیں آ رہی تھی عالم مثال کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں مستقل باب قائم کیا ہے فلیراجع۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ کتابیں حسی ہوں اور آج کے دور میں یہ کوئی نا قابل فہم بات نہیں کہ ایک عام کمپیوٹر میں بھی سارے انسانوں کے اعداد وشمار جمع ہو سکتے ہیں تو ان کتابوں کا کیا حال ہوگا، تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو وہ نام نہیں بتلائے کیونکہ پھر عالم تکوین کے بہت سے امور سے پردہ ہٹ جاتا حالانکہ یہ اللہ کی حکمت کے منافی ہے۔

اس حدیث شریف میں صحابہ کرامؓ کے سوال اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے متعلق تشریح ''باب ماجاء فی الشقاء والسعادۃ'' میں عنقریب گذری ہے۔

قولہ "فنبذھما" اگر یہ حسی کتابیں تھیں تو نبذ کے معنی یہاں پھینکنے کے نہیں بلکہ عالم بالا کے حوالے کرنا ہے جس کے لئے ہاتھوں کو کھولنا پڑتا ہے اور دیکھنے والے کو نبذ محسوس ہوتا ہے۔ اور اگر غیر محسوس تھیں تو مطلب ہاتھوں کو جھاڑنا ہے جو عموماً حتمی فیصلہ سناتے وقت خاص اشارہ ہوتا ہے۔

حدیث آخر:۔ "عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ اذااراد بعبد خیراً استعملہ فقیل کیف یستعملہ یارسول اللہ؟ قال: یُوَفِّقُہُ لعمل صالح قبل الموت"۔ [1] (صحیح)

باب ماجاء ان اللہ کتاب کتاباً الخ

[1] رواہ ایضاً احمد فی مسندہ ص: ۵۴۵ ج: ۳ حدیث: ۱۱۶۲۵۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ جب کسی بندے کی خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے (اچھا) کام لے لیتا ہے، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! کیسے کام لیتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو موت سے پہلے نیک عمل کی توفیق دیتا ہے۔

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے "ثم یقبضہ علیہ" [۲] یعنی پھر اسے اسی عمل خیر کے دوران موت دے کر جنت میں داخل کر دیتا ہے۔

باب ماجاء لاعَدوىٰ وَلاهَامَةَ وَلاصَفَرَ

"عن ابن مسعود قال قام فينا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: لايُعدِي شئى شيئاً فقال اعرابى: يارسول اللّٰه! البعير اجرب الحشفة نُدبِنُه فيَجرِب الإبَلَ كلّها، فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: فمن اَجربَ الاوّلَ؟ لاعدوىٰ ولاصفر خلق اللّٰه كل نفس فكتب حياتها ورزقها ومصائبها"۔ [۱]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان (خطبے کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا کوئی شے (بیماری) کسی چیز کی طرف سرایت نہیں کرتی پس ایک اعرابی نے کہا اے اللہ کے رسول! جب ہم ایسے اونٹ کو باڑے میں داخل کرتے ہیں جس کے موضع پیشاب میں خارش ہو تو وہ سب اونٹوں کو خارشی بنا دیتا ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلے اونٹ کو کس نے خارش زدہ بنایا تھا؟ سرایت نہیں، صفر (کی نحوست) نہیں اللہ نے ہر نفس کو پیدا کیا ہے تو اس کی حیات ورزق اور مصیبتوں کو لکھا ہے۔

لغات:۔ قولہ "لایُعدِی" اعدا اور عدوٰی سے ہے، بیماری کی سرایت اور دوسرے کو لگنے کو کہتے ہیں۔ قولہ "اجرب الحشفة" جَرَب بروزن قمر خارش اور کھجلی کے مرض کو کہتے ہیں، جبکہ حشفہ آلہ تناسل کے اگلے حصے کو کہتے ہیں جو ختنہ کے بعد کھلا رہتا ہے، یہاں مراد پورا عضو ہے کیونکہ خارش پھر پورے کو لگتی ہے اگرچہ حشفہ میں

---

[۲] كذا فى مسند احمد ص: ۵۲۹ ج: ۳ حديث: ۱۱۸۰۴۔

باب ماجاء لاعدوى ولاهامة الخ

[۱] رواه ايضاً احمد فى مسنده ص: ۱۴ ج: ۲ حديث: ۴۱۸۶، ايضاً ص: ۲۲۸ ج: ۲ حديث: ۸۱۴۳ عن ابى هريرةؓ.

زیادہ ہوتی ہے۔قولہ "ندبنہ" یہ لفظ مختلف حروف کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے، مذکورہ لفظ ''دبن'' بفتح الدال وسکون الباء سے بمعنی باڑے کے آتا ہے اگر چہ اصل لغت میں یہ لفظ بکریوں کے باڑے کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر یہاں بمعنی معطن ہے یعنی اونٹوں کا باڑا مراد ہے، پس ''نُدبِنُہ'' بصیغۂ جمع متکلم ادبان سے ہے، ترجمہ وہی ہوگا جو اوپر لکھا ہے یعنی ہم اسے باڑے میں داخل کرتے ہیں تو وہ سب کو خارشی بنا دیتا ہے لہٰذا ''فیجرب'' بضم الیاء باب افعال سے معروف کا صیغہ ہوگا اور ''ابل'' مفعول بہ ہے ''کلھا'' منصوب برائے تاکید ہے۔

دوسرا نسخہ:۔ ''بِذنبہ'' ہے اس میں باء سببیت کے لئے ہے اور ''ذنب'' سے مراد دُم یا پھر پھوڑے پھنسیاں ہیں یعنی ایک اونٹ پھنسی کی وجہ سے یا اپنی دم کی بناء پر خارش میں مبتلا ہو جاتا ہے پھر باقی اونٹ بھی خارش کے مریض بن جاتے ہیں اس صورت میں ''فیجرب'' فعل لازمی اور ''الابل کلھا'' فاعل ہوگا۔

تشریح:۔سائل کا سوال یہ ہے کہ آپ تعدی امراض کی نفی فرمارہے ہیں جبکہ مشاہدہ سے اس کا ثبوت معلوم ہوتا ہے، تو کیا یہ ایک سرسری خیال اور جائزہ ہے، یا پھر کیا مطلب ہے؟ اور جواب کا مقصد یہ ہے کہ باقی اونٹوں کی بیماری کو پہلے اونٹ کی ذمہ داری قرار دینا نہیں چاہئے ورنہ پھر پہلے کو کس نے بیمار بنایا؟ بلکہ یہ سب ازخود بیمار ہو جاتے ہیں۔

''لاعدوی'' پر تفصیلی بحث پہلے گذری ہے۔(دیکھئے تشریحات ج:۵ص:۴۶۷ ''باب ماجاء فی الطِیَرۃِ'' من ابواب السیر) اور اسی (جلد نمبر:۶ میں ''باب ماجاء فی الاکل مع المجزوم'') میں۔

قولہ "ولاھامۃ" اس کے متعلق بحث گذری ہے۔(دیکھئے ابواب الطب جلد ۶ میں ''باب ماجاء ان العین حق والغسل لھا تحت قولہ ولاشیٔ فی الھام'') جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عربوں میں جو عقیدہ مشہور تھا کہ مقتول کی روح اُلّو کی شکل میں قبرستان سے آکر واویلا کرتی ہے کہ میرا بدلہ لیا جائے تو یہ غلط اور من گھڑت ہے۔اس بارے میں محشی نے بیان کیا ہے کہ عرب بومہ یعنی الو کو منحوس سمجھتے تھے یہ رات کو جس کے گھر کی چھت پر گرتا یا بیٹھتا تو وہ اس کو بُرا شگون اور موت کا اشارہ سمجھتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی بلکہ ابطال فرمایا۔

قولہ "ولاصفر" صفر کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک ماہ صفر اور دوم سانپ یا پھنسی۔اگر مہینہ مراد ہو تو اس نفی کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ عرب ماہ صفر کو منحوس سمجھتے تھے جیسے آج کل بہت سے عوام کا عقیدہ ہے کہ اس میں شادی بیاہ کو منحوس سمجھتے ہیں، نئے گھر میں منتقل ہونا وغیرہ بُرا شگون ٹھہراتے ہیں وغیرہ وغیرہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بداعتقادی کی تردید فرمائی۔بعض حضرات نے اس کی وجہ تسمیہ میں لکھا ہے کہ صفر کے معنی خالی کے

ہیں چونکہ اشہر الحرم کے بعد لوگ جنگی مہم دوبارہ شروع کرتے اس لئے مرد گھروں سے نکل کر سب گھران سے خالی ہو جاتے۔ واللہ اعلم

بعض کہتے ہیں کہ لوگ نسیا کرتے ہیں یعنی صفر کو محرم میں تبدیل کرتے جس کی نفی آ گئی۔

پھر جس طرح صفر کے مہینہ کو منحوس سمجھنا بے بنیاد ہے بعینہ اسی طرح اس کے آخری بدھ کو خوشی اور سیر و تفریح کی تقریبات بھی بے بنیاد ہیں لوگوں نے جو یہ مشہور کیا ہے کہ آخری بدھ کو آپ علیہ السلام نے غسل صحت فرمایا تھا یہ درست نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آخری بدھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع سے رات کو جب تشریف لا کر گھر پہنچے تو سر درد اور بخار شروع ہوا۔ اور مسلسل تیرہ (۱۳) ایام بیماری میں گذرے تا آنکہ بارہ ربیع الاول پیر کے دن اختتام پر منگل کی رات وصال ہوا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

چونکہ یہود نے اس دن (بدھ) کو خوشی منائی تھی اسی طرح ایران کے مجوس نے بھی جشن سامنایا تھا پھر وہ روایت ہندوستان آ گئی اور سادہ لوح مسلمان نیکی کے نام پر بدی اور خوشی کے نام پر غم کے موقع پر خرافات میں دھنس گئے لہٰذا اس کی حیثیت بھی باقی رسومات کی طرح ایک بے بنیاد روایت پر مبنی ہے اس سے بچنا چاہئے۔

بعض شارحین کہتے ہیں کہ صفر ایک دانہ پیٹ کے اندر تصور کیا جاتا تھا لوگ اسے عدوی گمان کرتے تھے یا ایک کیڑا یا سانپ تصور کیا جاتا جو ان کے بزعم پیٹ کے اندر مفروضے کے تحت بھوک کے وقت کاٹتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب چیزوں سے ممانعت فرمادی۔ (باب کی روایت صحیح ہے)

باب ماجاء في الايمان بالقدر خيره وشرِه

"عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لايؤمن عبد حتى يؤمن بالقدر خيره وشره وحتى يعلم ان ما اصابه لم يكن ليُخطئه وان ما اخطأه لم يكن ليُصيبه" ۔[1]

(غريب)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

باب ماجاء في الايمان بالقدر خيره وشره

[1] وفي مسند احمد ص: ۳۷۸ ج: ۲ حديث: ۶۶۶۴ لايؤمن المرء حتى يؤمن بالقدر خيره وشره، ايضاً رواه الطبراني في الاوسط بحواله مجمع الزوائد ص: ۲۸۹ ج: ۷ كتاب القدر.

فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ تقدیر اور اس کے خیر و شر پر ایمان نہیں لاتا اور یہاں تک کہ وہ یقین نہ کرے کہ جو کچھ اسے لاحق ہوا وہ چوکنے والا نہ تھا اور جو کچھ چوک گیا وہ اسے پہنچنے والا نہ تھا۔

تشریح:۔ یعنی ایمان کے حصول کے لئے یہ بھی ضروری ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ نعمت و راحت یا زحمت و مصیبت خواہ جسمانی ہو یا روحانی ہو، انفسی ہو یا آفاقی جو چیز ان میں سے جس بندے کے لئے مقدر ہو تو وہ ضرور اس کا سامنا کرے گا اور اگر کوئی چیز مقدر نہیں تو کوئی امکان نہیں کہ اسے ممکن بنایا جائے چہ جائے کہ اسے حاصل کیا جائے۔

دوسری حدیث:۔ "عن علیؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :لایؤمن عبدحتی یؤمن باربع یشھد ان لاالٰہ الّٰلہ وانی رسول اللّٰہ بعثنی بالحق،ویؤمن بالموت ویؤمن بالبعث بعدالموت ویؤمن بالقدر"۔ [۲]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک چار باتوں پر ایمان نہ لائے (۱) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اس نے مجھے سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) موت پر ایمان لائے۔ (۳) موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان لائے۔ (۴) اور تقدیر پر ایمان لائے۔

تشریح:۔ باب کی دونوں روایتوں میں "لایؤمن" الخ کا "لا" نفی کمال کے لئے نہیں بلکہ نفی جنس اور نفی ذات کے لئے ہے یعنی جس آدمی کا یہ عقیدہ نہ ہو وہ سرے سے مؤمن اور مسلمان نہیں۔ قالہ القاری۔

ایمان بالموت سے مراد قیامت کا یقین اور تصدیق کرنا ہے۔

باب ماجاء ان النفس تموت حیث ماکتب لھا

"عن مطر بن عُکامِس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :اذاقضیٰ اللّٰہ لعبدان یموت بارض جعل لہ الیھاحاجۃ"۔ [۱] (حسن غریب)

---

[۲] رواہ ایضاً ابن ماجہ ص: ۹ "باب القدر" مقدمہ ومسلم فی کتاب الایمان.

باب ماجاء ان النفس تموت حیث ماکتب لھا

[۱] وفی مسند احمد عن مطر بن عکامس قال قال رسول اللّٰہ ﷺ اذا قضی اللّٰہ میتۃ عبد بار من جعل لہ الیھا حاجۃ ص: ۲۹۹ ج: ۲ حدیث: ۲۱۴۷۷.

حضرت مطر بن عکامس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ کسی بندے کے بارے میں کسی جگہ موت کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس کو وہاں جانے کی ضرورت درپیش فرماتا ہے۔

تشریح:۔اس باب میں انہی الفاظ سے دوسری روایت بھی ہے جو ابو عزۃ سے مروی ہے، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جہاں موت مقدر ہو تو اس جگہ کی مٹی انسان کے خمیر میں اس وقت شامل کردی جاتی ہے جب وہ ابتدائی لوتھڑے کی حالت میں ہو پھر عند الموت وہ وہیں چلا جاتا ہے: قال اللہ: "منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة۔" [۲] الخ تاہم اس آیت کا دوسرا مطلب بھی ہے کہ مراد نفس ارض اور جنس زمین ہو، اس بارے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کا واقعہ بھی مشہور ہے جو اسرائیلی روایات کا حصہ ہے۔

باب ماجاء لاتَرُدُّ الرُّقىٰ والدواء من قدر اللّٰه شيئاً

"عن ابن ابی خزامة عن ابيه ان رجلاً اتى النبی صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: اَرأيتَ رُقىً نسترقيها ودواءً نتداوىٰ به وتُقاةً نتقيها هل تَرُدُّ من قدر اللّٰه شيئاً؟ قال: هي من قدر اللّٰه"۔

ملحوظ:۔اس حدیث کا ترجمہ ومطلب اور ضروری تشریح ابواب الطب میں گذری ہے۔ (دیکھئے ماجاء فی الرقیٰ والادویۃ) البتہ یہاں سائل ایک رجل کو قرار دیا ہے جبکہ وہاں ہے "سألتُ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم" الخ مگر روایات میں ایسا ہونا کوئی اضطراب نہیں کیونکہ راوی کبھی خود کو غائب بھی فرض کرتا ہے، نیز یہاں لفظ ابن کا اضافہ وہم راوی پر مبنی ہے اصل روایت میں "عن ابی خزامة" الخ ہے جیسا کہ وہاں اس پر تنبیہ کی گئی ہے، اور یہ کہ اس حدیث کا مضمون بالاجماع صحیح ہے۔ قالہ ابن العربیؒ فی العارضۃ

---

[۲] سورۃ طٰہٰ آیت: ۵۵.

باب ماجاء فی القدرية

"عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :صِنفان من امتى ليس لهمافى الاسلام نصيب المرُجئة والقدَريّة"۔ (حسن غريب) [1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کی دو قسمیں (گروہ یا جماعتیں) ایسی ہیں کہ جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں وہ مرجیہ اور قدریہ ہیں۔

لغات:۔قولہ "صنفان" صِنف بکسر الصاد کا تثنیہ ہے، نوع اور قسم کو کہتے ہیں۔قولہ "مرجئہ" ارجاء سے ہے بمعنی تاخیر کے اور کبھی ہمزہ کو یا سے بھی تبدیل کیا جاتا ہے جیسے مرجیہ، یہ لوگ کس چیز کی تاخیر کے قائل ہیں؟ تو اس بارے میں متعدد اقوال ہیں، کسی نے کہا کہ یہ عمل کو ایمان سے الگ کرتے ہیں کہ نفس تصدیق کی صورت میں جتنے بھی گناہ کیوں نہ ہوں مگر اس سے عذاب مؤخر یعنی نفی ہوگا، مگر یہاں جو معنی مناسب ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے انسان کو تقدیر کے آگے بالکل جماد کی مانند مجبورِ محض اور بے اختیار قرار دیا ہے لہذا وہ احکام باری تعالیٰ کی تاخیر کے قائل ہیں کہ بقول ان کے انسان کی نہ کوئی مرضی چلتی ہے اور نہ ہی اپنا اختیار چلتا ہے بس وہ تقدیر کے آگے بے بس ہے اس لئے ان لوگوں کا دوسرا نام جبریہ بھی مشہور ہوا ہے۔قولہ "القدرية" یہ لوگ تقدیر میں زیادہ بحث کی وجہ سے گویا انکار کے قریب ہو گئے اگرچہ انہوں نے صریح انکار تو نہیں کیا ہے جسے التزام کفر قرار دے کر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا جائے مگر اس کے قریب جانے کی وجہ سے مجازاً ان کو منکرین قدر کہا جاتا ہے، گویا لزومِ انکار کو مبالغۃً التزام قرار دیا۔

تشریح:۔اس حدیث پر محشی ترمذی نے تفصیل سے بحث فرمائی ہے اور مختلف اقوال وضع، تضعیف اور مخدوش توثیق کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "ولاشك ان تحسينَ "تَ" (ترمذی)له مقدم على

باب ماجاء فی القدرية

[1] وعن ابى سعيد قال قال رسول الله ﷺ: صنفان من امتى ليس لهما فى الاسلام نصيب، المرجئة والقدرية، ايضاً روى مثله عن جابر وعن واثلة بن الاسقع قال قال: رسول الله ﷺ صفنان من هذه الامة لاتنالهما شفاعتى، المرجئة والقدرية، راجع للروايات مجمع الزوائد ص: ۲۰۱ ج:۷ كتاب القدر.

هذه الاشياء مع ما اشار اليه من شواهد عمن ذكر من الصحابة انتهى ''۔ غرض اس بارے میں علی بن نزار باپ بیٹا دونوں، اسی طرح سلام بن ابی عمرہ کے ضعف کے باوجود روایت درجہ حسن پر فائز ہے۔ کما قالہ الترمذی۔

بیانِ مذاہب:۔ انسان کہاں تک با اختیار ہے اور کہاں تک بے بس، اس بارے میں کافی اختلاف ہے، یہ اختلاف جیسے اہل قبلہ کے درمیان ہے اسی طرح اہل قبلہ کا دوسروں سے بھی ہے۔

(۱)...دہریہ اور مادہ پرستوں کا زعم تو اس بارے میں واضح ہے کہ وہ کسی تقدیر یا خالق و مالک کے قائل نہیں ہیں، پھر ان میں بھی بہت سارے نظریات ہیں کوئی ڈارون وغیرہ کے پیروکار ہیں اور عالم کے وجود کی اپنے طور پر تشریح کرتے ہیں اور انسان کے ارتقائی وعمل کے قائل ہیں۔ کوئی اجزائے دیمقراطسیہ کو بنیاد بناتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ راقم کا اس موضوع پر ایک مستقل کتابچہ بنام ''الصیحۃ الاولیٰ'' ہے۔

(۲)...مجوس کہتے ہیں کہ خالق و مالک دو ہیں: ایک خالق خیر جو بھلائی کا خالق ہے جو دوسرا خالق شر جو بُرائی کا، خالق خیر کو یَزدان کہتے ہیں اور خالق شر کو اَہرَ مَن۔ بذل المجہود میں اس کی تعبیر ذرا مختلف ہے: ''فان المجوس قائلون بخالقين وهما النور والظلمة فخالق الخير النورُ وخالق الشر الظلمة ''۔ چنانچہ اسی وجہ سے ایرانی زمانہ قدیم سے آگ کی عبادت کرتے چلے آئے ہیں کہ وہ نور ہے اور نفع رساں ہے، یعنی بقول ان کے۔

(۳)...فرق اسلامیہ میں سے معتزلہ کہتے ہیں انسان اپنے تمام افعال کا خالق ہے، شرح عقائد میں ہے کہ ان کے اوائل انسان پر خالق کے بجائے موجِد اور مخترع کا اطلاق کرتے تھے مگر جبائی اور اس کے اتباع کے بعد والوں نے سوچا کہ یہ سب الفاظ ہم معنی ہیں اس لئے انہوں نے صاف طور سے عبد یعنی انسان کو خالق سے تعبیر کیا۔

(۴)...قدریہ جن کا نظریہ مختصراً اوپر لکھا جا چکا ہے ان کے بارے میں دو رائے ہیں: ایک یہ کہ قدریہ معتزلہ کی قسم اور ذیلی شاخ ہے۔ دوسری رائے ان کے بارے میں یہ ہے کہ یہ خوارج کی ایک جماعت وگروہ کا نام ہے۔ بہر حال ان کا زعم یہ ہے کہ انسانی افعال دو طرح کے ہیں: ایک اچھے اور دوم بُرے، پس اچھے اعمال کا خالق اللہ ہے اور قبیح کا بندہ خود ہے، تاہم ابوداؤد کی روایت میں ہے: ''القدرية مجوس هذه الامة ''[۲]

---

۲ سنن ابی داؤد ص: ۲۹۶ ''باب فی القدر'' كتاب السنة، ایضاً روی بمعناه الطبرانی فی الاوسط، مجمع الزوائد ص: ۲۰۱ ج:۷۔

تاہم قدریہ اوپر کی استثنائی صورت کے علاوہ باقی تمام مخلوقات خواہ وہ شر ہی کیوں نہ ہو سب کا خالق اللہ کو مانتے ہیں، بذل المجہود میں ہے:

"والقدرية كذالك فانهم يقولون ان خالق الخيرهو اللّٰه تعالىٰ وخالق الشر...وجميع المخلوقات من الخيرو الشرو القبائح مخلوق لِلّٰه سبحانه وتعالىٰ لاشريك له غير"۔ (ص:۲۱۰ ج:۶ کتاب السنۃ)

(۵)...جبریہ جو جُہمیہ کے نام سے مشہور ہیں انسان کو مجبور مانتے ہیں ان کا موقف اوپر لغات کے تحت مرجۂ کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔

(۶)...اہل السنۃ والجماعت یہ نہ تو انسان کو خالق مانتے ہیں اور نہ ہی مجبور اور جماد کی طرح تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ حضرات افراط وتفریط کے درمیان درجۂ اعتدال کے قائل ہیں کہ بندہ کاسب تو ہے مگر خالق نہیں ہے۔

دلائل:۔ جو لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں ان کے نظریات کی تشریح، ان کے استدلالات اور پھر ان کے جوابات طویل سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اس لئے ان کو یہاں درج کرنا تطویل مُمل سے خالی نہیں کہ اس پر مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ جہاں تک باقی جماعات کا تعلق ہے تو ان کے آپس میں اختلاف کا دارومدار دوطرح کے دلائل پر ہے: ایک نقلیہ اور دوم عقلیہ، نقلیہ میں دوقسم کی آیات ہیں، بعض میں افعال کی نسبت اللہ عزوجل کی جانب کی گئی ہے: جیسے "یضل من یشاء ویهدی من یشاء"[۳] جبکہ بعض عبد کی طرف منسوب کی گئی ہیں: مثلاً "اعملوا ماشئتم"[۴] پس ایک فریق نے اول کو حقیقت اور دوسری کو مجاز پر محمول کیا ہے یہ اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، جبکہ معتزلہ وقدریہ نے اس کے برعکس موقف اپنایا ہے۔

یہ مسئلہ شرح عقائد میں تفصیل سے بیان ہوا ہے اس لئے جو حضرات تفصیل کے خواہشمند ہوں وہ وہیں دیکھ لیں، یہاں اختصار کے پیش نظر خلاصۂ ادلہ پیش کیا جارہا ہے۔

معتزلہ کی پہلی دلیل:۔ یہ ہے کہ اگر سب افعال اللہ عزوجل کی تخلیق ہیں تو پھر انسان مجبور ہوگیا کہ وہ اللہ کی تکوین وتخلیق کے آگے اپنا اختیار تو استعمال کر نہیں کرسکتا ہے، پھر تکلیف کا فائدہ نہ رہا اور ثواب وعقاب کا استحقاق ختم ہوا۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا استدلال جبریہ کے خلاف تو چل سکتا ہے مگر ہمارے خلاف

---

[۳] سورۂ فاطر آیت: ۸۔ [۴] سورۂ حم سجدہ آیت: ۴۱۔

نہیں کہ ہم باوجود عدم خالقیتِ عبد کے اس کے اختیار کے قائل ہیں جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

دوسری دلیل:۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ افعال عباد کا خالق ہو تو پھر وہ قائم وقاعد، آکل وشارب وغیرہ بھی ہوگا، علامہ تفتازانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تو بڑی جہالت کی بات انہوں نے کی ہے کیونکہ ان افعال سے وہی متصف ہوتا ہے جس کے ساتھ یہ صفات قائم ہوں نہ یہ کہ وہ خالق ہو "اَوَلا یرون ان اللّٰہ تعالیٰ هو الخالق للسوداء والبیاض وسائر الصفات فی الاجسام ولایتصف بذالك "یعنی اگر آپ کی بات صحیح ہوتی تو پھر عبد کے افعال غیر اختیاریہ کے بارے میں کیا کہو گے کیا اللہ کو ان سے موصوف مانو گے؟ والعیاذ باللہ۔

تیسری دلیل:۔ "وربمایتمسك بقوله تعالیٰ:فتبارك اللّٰه احسن الخالقین، [۵] .... واذتخلق من الطین کهیئة الطیر" [۶] والجواب ان الخلق ههنابمعنی التقدیر"۔

یعنی اس قسم کی آیات میں خلق کی نسبت مجازی بمعنی تقدیر واندازے کے ہے۔

قدریہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ بندے کے بُرے افعال کا خالق مان لیا جائے تو ان قبائح کی نسبت اللہ کی جانب ہوگی، اور اس سے ملتا جلتا استدلال مجوس کا بھی ہے۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی قبیح فعل کی نسبت کاسِب کی طرف ہوتی ہے، خالق کی جانب نہیں کیونکہ خلق تو فیضان الوجود کا نام ہے جو بذات خود حسن ہی حسن ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ خلق اور کسب میں کیا فرق ہے؟ تو یہ آگے آرہا ہے۔

جبریہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ نے کوئی چیز تقدیر میں لکھی ہو اور عبد اس کے خلاف پر قادر ہو جائے تو اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا عاجز ہونا لازم آتا ہے نیز یہ اللہ کے علم ازلی کے بھی منافی ہے اور ارادے کے بھی خلاف ہے وغیرہ وغیرہ، بہت سارے استحالے لازم آئیں گے، چونکہ یہ سب توالی محال ہیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ عبد، اللہ کے حکم کے آگے اور تقدیر کے سامنے مجبور ہے۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو آپ کا موقف مشاہدے اور حس کے خلاف ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رعشہ کی حرکت اور پکڑنے کی حرکت میں فرق ہے اول غیر اختیاری ہے جبکہ دوم بداہۃً ارادی واختیاری ہے، ثانیاً پھر تو عبد کی تکلیف بمالایطاق ہوئی جس پر نہ ثواب ملتا ہے اور نہ گناہ۔ نیز یہ موقف لغوی استعمالات اور اصطلاحی محاورات کے بھی خلاف ہے کہ لوگ نماز وغیرہ کی نسبت عبد کی طرف کرتے ہیں اور اسے

---

[۵] سورة المؤمنون آیت:۱۴۔ [۶] سورة المائدة آیت:۱۱۰۔

حقیقی نسبت گردانتے ہیں۔علاوہ ازیں یہ صریح نصوص کے بھی خلاف ہے۔

رہی یہ بات کہ عبد، اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا تو یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے جبر لازم نہیں آتا کیونکہ اللہ نے اپنا ارادہ اور علم بندے کے ارادے کے ساتھ متعلق کیا ہے جب ازل میں اللہ نے دیکھا کہ فلاں فلاں کام بندہ فلاں فلاں وقت پر کرے گا تو اللہ کو واقعہ کے مطابق معلوم ہونا جبر کو مستلزم نہیں ہوا بلکہ اس سے تو انسانی ارادہ اور بھی پختہ ہوا: ''قلنا یعلم ویریدان العبدیفعله اویترکه باختیاره فلااشکال'' الخ۔(راجع للتفصیل ان شئت شرح العقائد النسفیة)

اہل السنة والجماعة یا اشاعرہ وماتریدیہ کے استدلالات درج ذیل ہیں۔

(۱)....پہلا استدلال:۔ یہ ہے کہ اگر بندہ کو خالق مانا جائے جیسا کہ معتزلہ وقدریہ مانتے ہیں تو پھر تو یہ عقیدہ مجوس سے بھی زیادہ جاہلانہ ہوگا کہ وہ دو خداؤں کے قائل ہیں اور اسلامیین زیادہ کے معتقد ہوں گے۔

(۲)....دوسرا استدلال:۔ یہ ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کی تفصیل سے آگاہی لازمی ہے جبکہ مثلاً کراچی سے لاہور تک پیدل چلنے والے کو اپنے قدموں کی تعداد اور عضلات کی حرکات تک کا پتہ نہیں ہوتا پھر یہ کیسی خلقت ہوئی؟

(۳)....تیسرا استدلال:۔ اس بارے میں نصوص صاف بتارہی ہیں کہ بندہ کے افعال کا خالق بھی خدائے ذوالجلال ہے: مثلاً ''واللہ خلقکم وماتعملون'' [۷] وغیرہا۔

اس کے برعکس اگر بندے کو مجبور اور بالکل بے اختیار مانا جائے تو تکلیف بمالایطاق لازم آتی ہے، اس لئے بیچ کا درجہ ماننا پڑے گا کہ عبد کاسب تو ہے مگر خالق نہیں یعنی جب وہ اپنا ارادہ کسی فعل سے متعلق کرتا ہے تو اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے فیضان وجود ہوتا ہے، اور چونکہ ایسے میں عبد اپنے آپ کو قادر سمجھتا ہے اور تکلیف کے لئے اتنی سی قدرت بھی کافی ہے اس لئے کوئی استحالہ خالقیت کا یا جبر کا لازم نہیں آتا، غرض تعلق ارادہ کسب ہے جبکہ وجود دینا خلق۔خلق اور کسب کے درمیان مزید وجوہِ فرق کے لئے شرح عقائد دیکھئے۔

حضرت تھانویؒ بوادر النوادر میں فرماتے ہیں کہ افعال اختیاریہ میں انسان کا یہ اعتقاد کہ اگر چاہوں تو کرلوں گا اور نہ چاہوں تو نہیں ہوگا، ایسا اختیار ہے جو دلیل کا محتاج نہیں بلکہ بدیہی ہے اور یہی فعل کے صدور کی

---

۷ سورة الصافات آیت: ۹۶.

علت قریبہ ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس اختیار کی صفت بھی اور اس صفت کا فعل کے ساتھ تعلق بھی دونوں مخلوق ہیں حق تعالیٰ کے، اس طرح سے کہ تخلیق حق کے بعد ان کا عدمِ وقوع، قدرتِ عبد سے خارج ہے اور یہ تخلیق علت بعیدہ ہے صدورِ افعال اختیاریہ کی، جس شخص نے افعال مذکورہ کی صرف علتِ قریبہ پر نظر کی وہ قدری ہو گیا اور جس نے صرف علت بعیدہ پر نظر کی وہ جبری ہو گیا اور جس نے دونوں پر نظر کی وہ کہہ کر کہ "لا جبر ای محضاً و لا قدر ای محضاً ولکن الامر بین بین" سنی ہو گیا۔ (ص:۹۲، ادارۂ اسلامیات لاہور)

ارادے کے متعلق ماتریدیہ اور اشاعرہ کے درمیان بھی تھوڑا سا اختلاف ہے۔ (راجع للتفصیل کتب العقائد من شرح العقائد وشروحہ وشرح المواقف وغیرھا) شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ارادے کا سبب خیالات ہیں اور خیالات کے کم از کم پانچ اسباب ہیں۔ (راجع للتفصیل حجۃ اللہ البالغۃ، باب فی اسباب الخواطر الباعثۃ علی الاعمال)

اشکال:۔ اگر معتزلہ وقدریہ خالقیت عبد کے قائل ہیں تو پھر تو وہ مشرک ہوئے حالانکہ ان پر اسلاف نے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا ہے ایسا کیوں ہوا؟

جواب:۔ اس کا جواب شرح عقائد میں دیا ہے کہ شرک یہ ہے کہ کسی کو اللہ کے ساتھ الوہیت بمعنی وجوب الوجود یا استحقاق العبادت میں شریک مانا جائے جبکہ معتزلہ وغیرہ اس کے قائل نہیں بلکہ وہ بندے کی خالقیت کو بھی اللہ کی خالقیت کی طرح نہیں مانتے ہیں کیونکہ وہ بندے کو اسباب وآلات کا محتاج تسلیم کرتے ہیں۔ (ص:۶۱)

علیٰ ھذا حدیث الباب میں "لیس لھما فی الاسلام نصیب" تغلیظ پر محمول ہے، یہی جمہور اور محققین کا مذہب ہے۔

باب

"عن مُطَرِّف بن عبداللّٰہ بن الشِّخّیر عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مُثِّلَ ابن ادم والی جنبہ تسعة وتسعون منیة ان اخطأته المنایا وقع فی الھرم حتی یموت"۔[1] (حسن غریب)

باب (بلا ترجمة)

[1] ایضاً رواہ الترمذی فی القیامة باب: ۲۲.

حضرت مطرف اپنے والد عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آدم زاد کو بنایا (یعنی پیدا کیا) جاتا ہے دراں حالیکہ اس کے پہلو میں (اردگرد) ننانوے مہلکات ہوتے ہیں اگر یہ سب چوک جائیں تو بالآخر وہ بڑھاپے میں پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ مرجاتا ہے۔

لغات:۔ قولہ "مُطرف" بضم المیم وتشدید الراء المکسورۃ بصیغۂ اسم فاعل۔ قولہ "الشخیر" بکسر الشین وکسر الخاء المشددۃ وسکون الیاء، حضرت عبداللہ بن الشخیر عامری "یُعَدُّ فی البصریین وفِد الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی بنی عامر"۔ قولہ "مُثّل" بضم المیم وکسر الثاء بصیغۂ مجہول ای صُوِّرَ وخُلِقَ، ابن ادم اس کا نائب فاعل ہے۔ قولہ "منیة" بفتح المیم، ہلاکت خیز مصیبت اور بلا کو کہتے ہیں جو موت کا سبب قوی ہو اس لئے اس کا اطلاق عین موت پر بھی کیا جاتا ہے۔ قولہ "الھرم" بروزن قَمر شدید بڑھاپے کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ ننانوے کا عدد تکثیر کے لئے ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی صورت میں موت سے بچ نہیں سکتا کیونکہ پیدا ہوتے ہی وہ امراض وآفات کی لپیٹ میں آجاتا ہے خواہ وہ بچنے کی جتنی بھی تدابیر کرے مگر وہ بچ نہیں سکتا اس لئے عام لوگ بڑھاپے سے پہلے ہی بیماریوں یا حادثوں کا شکار ہو کر مرجاتے ہیں مگر بالفرض اور شاذ ونادر جو بچ جاتے ہیں تو اسی (۸۰) سو (۱۰۰) سال کے بعد وہ شدید بڑھاپے کی آغوش میں خود بخود خواہی وناخواہی چلے جاتے ہیں اور یہی ان کا آخری مرحلہ ہوتا ہے اس کے بعد کوئی امکان بچنے کا نہیں رہتا کما ھو المشاھد، کسی نے خوب کہا ہے "لِدُوا لِلموت" دنیا میں آنا ہی جانے کا پیغام وپیش خیمہ بلکہ مستلزم للذھاب ہے۔

باب ماجاء فی الرضاء بالقضاء

"عن سعد قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من سعادة ابن ادم رضاہ بماقضی اللہ لہ ومن شقاوة ابن ادم ترکہ استخارة اللہ ومن شقاوة ابن ادم سخطہ بماقضی اللہ لہ"۔[1]

(غریب)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

باب ماجاء فی الرضاء بالقضاء

[1] ایضاً رواہ احمد فی مسندہ ص: ۱۶۸ ج: ۱ حدیث: ۱۴۴۷۔

ارشاد فرمایا: کہ آدمی کی نیک بختی میں سے ہے اس کا راضی ہونا اللہ کے فیصلہ پر جو اس کے حق میں کیا ہے اور آدمی کی بدبختی میں سے ہے اللہ سے خیر نہ مانگنا اور آدمی کی اس کے بارے میں اللہ کے فیصلہ پر ناراضگی، بدبختی میں سے ہے۔

تشریح:۔ حدیث میں دو امرین کا ذکر ہے: ایک اللہ کے فیصلہ پر راضی ہونا اور دوم راضی نہ ہونا ان کے درمیان بطور جملہ معترضہ طلبِ خیر چھوڑنے کو بھی بدبختی کی علامت قرار دیا ہے، اس میں حکمت یہ ہے کہ کوئی راضی ہونے کا مطلب یہ نہ لے کر بیٹھے کہ ہوگا تو ویسے بھی وہی جو میرے رب نے لکھا ہے پھر طلب ومحنت کی کیا ضرورت ہے چونکہ سابقہ ابواب میں بارہا گذرا ہے کہ تقدیر کے ساتھ ساتھ عمل بھی لازمی ہے اس لئے ترکِ عمل کو بدبختی قرار دیا۔ رضاء بالقضاء میں ایک حکمت وفائدہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے غضب سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ راضی ہونے والا اپنی عبدیت کا بزبان قال وحال اقرار کرتا ہے جبکہ ناراض ہونے والا گویا شرکت کا دعویدار ہے کہ میرا حصہ مجھے کیوں نہیں دیا وغیرہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ جب تقدیر پر راضی ہوگا تو اسے ہر حالت میں اطمینان قلبی اور سکون نصیب ہوگا تو وہ اپنی عبادت دلجمعی کے ساتھ کر سکے گا۔

اعتراض:۔ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک طرف رضاء بالقضاء واجب ہے جیسا کہ عقائد کی کتب میں ہے، دوسری طرف کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کفر مقضی ہے جبکہ رضاء قضاء پر واجب ہے مقضی پر نہیں۔

شرح عقائد میں ہے:

"لایقال لو کان الکفر بقضاء اللّٰہ تعالیٰ لوجب الرضاء به لان الرضاء بالقضاء واجب واللازم باطل، لان الرضاء بالکفر کفر، لانا نقول: الکفر مقضی لاقضاء والرضاء انما یجب بالقضاء دون المقضی"۔ (ص:۶۲)

تاہم اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی ملحوظ ہو کہ اگرچہ قضا اللہ کی صفت ہے اور کفر بندے کا وصف اور فعل ہے مگر رضاء بالکفر کی صورت میں اللہ کی صفت پر رضا تو مراد نہیں ہو سکتی اس لئے بعض محققین نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ رضاء بالکفر من حیث انه کفر یعنی من حیث ذات الکفر، کفر ہے اور من حیث انہ مقضی بہ کفر نہیں بلکہ رضا بالقضاء ہے۔ تدبر فانہ دقیق وبالحفظ یلیق

باب

"نافع ان ابن عمر جاءه رجل فقال:ان فلانا يقرأ عليك السلام فقال:انه بلغني انه قداحدث فان كان قداحدث فلاتقرءه مني السلام فاني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول:يكون في هذه الامة اوفي امتي الشك منه خسف اومسخ اوقذف في اهل القدر".[1]

(حسن صحيح)

حضرت نافع نے بیان کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آ کر کہنے لگا کہ فلاں شخص آپ کوسلام کہتا ہے، توانہوں نے فرمایا (یعنی ابن عمرؓ نے) کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ اس نے دین میں بدعت نکالی ہے تو اگر واقعی اس نے کوئی نئی بات نکالی ہوتو میری طرف سے اس کوسلام نہ کہنا (یعنی جوابِ سلام مت پہنچاؤ کہ میں اس کا سلام نہیں لیتا) کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس امت میں یا فرمایا کہ میری امت میں (راوی کوشک ہے) دھنسنا ہوگا یا چہروں کا بگڑنا ہوگا یا سنگ باری ہوگی، یہ اہل قدر میں ہوگی۔

لغات:۔قوله "في هذه الامة اوفي امتي" یہاں پر لفظ "او" شک من الراوی کے لئے ہے جیسا کہ اس کے بعد تصریح ہے شک کی، کہ آیا نبی علیہ السلام نے "في هذه الامة" فرمایا یا "في امتي"۔قوله "خسف اومسخ اوقذف" اس مقام پر "او" میں دونوں احتمال ہیں: شک کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور تنویع کے لئے بھی۔ خسف زمین میں دھنس جانے کو کہتے ہیں اور مسخ شکل بگڑنے کو جیسے بندر یا خنزیر وغیرہ کی شکل اختیار کرنا اور قذف پتھر برسنے کو کہتے ہیں۔قوله "في اهل القدر" فی امتی سے بدل بعض باعادۃ الجار ہے۔

تشریح:۔ یہ آدمی جو تقدیر کے متعلق نئی نئی باتیں کرتا تھا کوئی منکر تقدیر نہ تھا مگر چونکہ اپنی عقل سے بحث کرتا تھا جو ممنوع ہے اس لئے یہ بدعت کا مرتکب ہوا۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بدعتی کوسلام کرنا جائز نہیں ہے اور چونکہ جواب دینا فرض ہے تو باوجود اس کے جب جواب نہ دینا چاہئے تو سلام کرنا بطریق اولی نہ چاہئے کیونکہ ابتداء بالسلام سنت ہے واجب یا فرض نہیں ہے۔ (المسک الذکی)

باب (بلا ترجمة)

[1] روى بمعناه ابوداؤد كذا في مشكوة المصابيح ص:۲۲ "باب الايمان" ايضاً رواه احمد بحواله مجمع الزوائد ص:۲۹۶ ج:۷.

ابن قیم رحمہ اللہ زاد المعاد میں لکھتے ہیں کہ اہل کتاب کے سلام کا جواب علی الاصح واجب ہے جبکہ مبتدع کا ممنوع ہے:

"واختلف فی الردعلیهم (ای علی الیهود والنصاریٰ) والصواب وجوبه والفرق بینهم وبین اهل البدع انامأمورون بهجرهم" (ای المبتدعة)۔

(مختصر زاد المعادص:۱۰۹، فصل فی هدیه علیه الصلوٰة والسلام فی السلام علی اهل الکتاب)

سوال:۔ اس حدیث میں اہل قدر یعنی تقدیر میں بے جا بحث کرنے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان پر خسف وغیرہ کا عذاب آئے گا جبکہ دوسری روایات سے ثابت ہے کہ آنحضور علیہ السلام کی امت پر اس قسم کا عذاب نہیں آئے گا، پس یہ تو بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے؟

جواب:۔ اس کے متعدد جوابات ہیں: ایک یہ کہ ممنوع عام عذاب ہے جبکہ یہاں خاص فرقے کی بات کی گئی ہے۔

دوسرا جواب:۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جب تک امت مرحومہ کے لوگ بحالتِ اتباع شریعت رہیں گے تو وہ بحفاظت ہوں گے مگر جب وہ بگڑ جائیں گے تو پھر ان کے چہرے بھی بگڑ سکتے ہیں کہ باطن کا اثر ظاہر پر رونما ہوتا ہے۔

باب کی دوسری حدیث:۔ حضرت عبدالواحد بن سُلیم فرماتے ہیں کہ میں مکہ آیا تو عطاء بن ابی رباح سے میری ملاقات ہوئی، میں نے ان سے کہا اے ابامحمد! اہل بصرہ تقدیر کے بارے میں بحث کرتے ہیں (یعنی عقلی انداز سے) تو حضرت عطاء نے فرمایا اے میرے بیٹے! کیا تم قرآن پڑھتے ہو (یعنی حافظ ہو یا مطلب تلاوت کرتے ہو؟) میں نے عرض کیا "ہاں" آپ نے فرمایا تو پھر "زخرف" پڑھو، کہتے ہیں میں نے "حم والکتاب المبین اناجعلناه قرآناًعربیاًلعلکم تعقلون وانه فی ام الکتاب لدینالعلی حکیم"[۲] تک پڑھا، عطاء نے فرمایا تم جانتے ہو کہ "ام الکتاب" کیا ہے؟ میں نے عرض کیا "اللہ ورسولہ اعلم"، انہوں نے فرمایا بے شک یہ ایک کتاب ہے جس کو اللہ نے آسمان کے پیدا کرنے سے پہلے اور زمین کے پیدا کرنے سے بھی پہلے لکھا ہے، اس میں ہے: "ان فرعون من اهل النار" اور اس میں ہے: "تبت یدا ابی لهب وتب"[۳] حضرت عطاء نے فرمایا کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے حضرت ولید بن عبادہ سے میری

---

[۲] سورة الزخرف آیت: ۱۔ [۳] سورة لهب آیت: ۱۔

ملاقات ہوئی، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے والد نے وفات کے وقت آپ کو کیا وصیت کی تھی؟ ولید نے کہا کہ انہوں نے مجھے بُلا کر فرمایا اے بیٹے! اللہ سے ڈرتے رہنا اور یقین جانو (حاشیہ کے نسخے کے مطابق) کہ تم اس وقت تک اللہ سے ڈرنے والا نہیں بنو گے جب تک اللہ پر ایمان نہ لائے اور ساری تقدیر پر، اس میں خیر وشر پر ایمان نہیں لاتا، پس اگر تم اس کے علاوہ دوسرے عقیدے پر مروگے تو دوزخ میں جاؤ گے، بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا، پھر اس سے فرمایا: لکھو، قلم نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ اللہ عز وجل نے فرمایا کہ تقدیر لکھو جو ہوا اور جو کچھ ہمیشہ یعنی قیامت تک ہونے والا ہے۔ (حدیث غریب)

تشریح: ۔اس حدیث میں جو آیت سورۂ زخرف کی آئی ہے اس میں ''ام الکتاب'' سے مراد لوح محفوظ ہے اور آخرِ حدیث میں قلم کا ذکر آیا ہے، لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ قلم نے جو کچھ لکھا ہے وہ لوح محفوظ پر منقش اور مکتوب ہے، تاہم لفظ ''ما کان و ماھو کائن اِلی الابد'' سے مراد اگلی پچھلی سب کائنات یا سب معلومات ومقدورات وغیرہ نہیں کیونکہ ما کان بھی لامتناہی ہیں کہ اللہ کی صفات اور معلومات ازل میں بھی لامتناہی تھیں اور ماھو کائن الی الابد بھی غیر متناہی ہیں جبکہ لوح محفوظ متناہی ہے، اس لئے ما کان سے مراد آنحضور علیہ السلام کے اس ارشاد سے پہلے کا زمانہ مراد ہے اور ماھو کائن سے اس کے بعد آنے والا زمانہ تا قیام قیامت، کیونکہ ابد بمعنی مدت طویلہ بھی آتا ہے جو یہاں مراد ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ما کان سے مراد قلم سے پہلے کی مخلوقات ہیں جیسے عرش وکرسی وغیرہ علی ھذا ''اول ما خلق اللہ القلم'' [۴] سے مراد قبلیت اضافی ہوگی یعنی اس محسوس عالم سے قبل۔

چونکہ اس بارے میں بہت سی روایات میں اول کا لفظ وارد ہوا ہے اس لئے کسی چیز کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہی حتماً مقدم ہے۔

باب کی روایت سے قلم کی اولیت ثابت ہوتی ہے جبکہ مسلم [۵] کی روایت سے عرش اور پانی کی تقدیم

---

۴ رواہ رزین کذا فی جمع الفوائد ص:۴۷۷ ج:۲ "کتاب بدء الخلق وعجائبہ" حدیث:۹۱۷۳، ایضاً رواہ ابویعلیٰ ورجالہ ثقات بحوالہ مجمع الزوائد ص:۲۷۹ ج:۷ کتاب القدر.

۵ رواہ البخاری ص:۴۵۳ ج:۱ کتاب بدء الخلق، ایضاً رواہ الترمذی فی کتاب التفسیر، جمع الفوائد ص:۴۷۷ ج:۲، صحیح مسلم ص:۳۳۵ ج:۲.

ثابت ہوتی ہے تاہم پانی میں تو یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ اس سے مراد خَلاء ہے کیونکہ خلاء کو دیکھتے وقت پانی محسوس ہوتا ہے۔ بعض روایات سے آنحضور علیہ السلام کی روح کی اولیت معلوم ہوتی ہے۔ [۶]

ان روایات میں تطبیق اسی طرح ممکن ہے کہ اولیت سے مراد اضافی لی جائے چونکہ ہر چیز بالنسبۃ الی المتأخر اول ومقدم کہلاتی ہے اس لئے سب روایات بیک وقت باہم موافق ہیں کہ بعض سب سے پہلے ہیں اور بعض سمٰوات والارض پر مقدم ہیں۔

ملحوظ:۔ ترمذی کے بعض نسخوں میں یہاں اس حدیث سے پہلے ایک اور حدیث کا اضافہ ہے جیسے متن عارضہ اور متن تحفہ دونوں پر موجود ہے، وہ حدیث یہ ہے:

"عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :سِتةٌ لعنتُهم ولعَنَهم الله وكل نبي يجاب، الزائد في كتاب الله، والمكذب بقدر الله والمتسلط بالجبروت لِيُعِزّ بذالك من اذله الله ويذل من اَعَزّه الله والمستحل لحرم الله والمستحل من عترتي ماحرّم الله والتارك لسنتي"۔ [۷]

تاہم مشکوٰۃ میں اس روایت کے بعد لکھا ہے: ''رواه البيهقي في المدخل ورزين في كتابه''۔ اس میں ترمذی کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔

حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ:۔ "يقول سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول:قدّر الله المقادير قبل ان يخلق السمٰوات والارضين بخمسين الف سنة"۔ [۸] (حسن صحيح غريب)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ نے تقادیر کو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مقدر (متعین) فرمایا۔

---

۶ اور رزین کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے عقل کو بنایا گیا، عن ابن مسعود رفعه اول ماخلق الله العقل الخ جمع الفوائد ص:۴۷ ج:۲.

۷ رواه ايضاً الطبراني في الكبير حديث:۲۸۸۳ وصححه ابن حبان بحواله مجمع الزوائد ص:۲۹۹ ج:۷ حديث:۱۱۸۷۶. ۸ ايضاً رواه احمد في مسنده ص:۳۵۸ ج:۲ حديث:۶۵۴۳.

لغات:۔ قولہ "المقادیر" مقدار کی جمع ہے، پیمانے کو بھی کہتے ہیں خواہ وہ کسی بھی چیز کی پیمائش کا ہو اور قدر کے معنی میں بھی آتا ہے۔

تشریح:۔ پچاس ہزار سال کا عدد تکثیر بلکہ لاتناہی کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور محدود وقت بھی مراد لیا جاسکتا ہے ہاں اگر چہ اس وقت شب و روز کا وجود نہ تھا کیونکہ یہ تو زمین کی سورج کے گرد محوری حرکت سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ بھی صرف اٹھارہ فرسخ یعنی تقریباً چوّن میل کی بلندی تک ہیں، اس سے اوپر کوئی دن رات کا فرق نہیں مگر یقیناً ازل میں اور دنیا کے خاتمے کے بعد بھی کوئی نہ کوئی اندازہ تو ہوگا اگر چہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے مگر اللہ عز وجل کے لئے تو کوئی مشکل نہیں۔

متعدد روایات میں تطبیق:۔ یہاں بظاہر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ بعض روایات سے مذکورہ عدد کے علاوہ بھی تقدیر کا لکھنا ثابت ہے مثلاً حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے جس مناظرے کا ذکر ترمذی میں گذرا ہے اس کے مسلم شریف والے طریق میں ہے: "فبکم وجدت اللّٰہ کتب التوراۃ قبل ان اُخلَقَ قال موسیٰ باربعین عاماً"۔ (مشکوٰۃ ص:۱۹ [9])

حل:۔ اس کا حل یہ ہے کہ اللہ عز وجل کو اگر چہ کسی چیز کے لکھنے کی ہرگز ضرورت نہیں مگر اللہ عز وجل کا ہر کام ضابطے کے مطابق ہوتا ہے، ایسے امور میں کیا کیا حکمتیں ہوسکتی ہیں ہماری عقل ان تک رسائی سے قاصر ہے، تاہم اپنی قدرت قاہرہ اور حکمت باہرہ کے اظہار کے لئے اور فرشتوں کو نظام چلانے میں سہولت دینے کے لئے تقدیر کا نظام مرتب فرمایا جیسے قیامت کے دن وزن اعمال میں لوگوں کے سامنے ان کے اچھے بُرے عمل میں تمیز کی خاطر اور یہ کہ اللہ عادل بادشاہ ہے اظہار کے لئے میزان قائم کردی ہے، علی ھذا کہا جائے گا کہ تقدیر ایک ازلی ہے، پھر آسمانوں اور زمینوں سے پہلے زمینوں اور آسمانوں و مافیہا کے احوال دوبارہ الگ سے لکھ دیئے ہیں، پھر جب بچہ ماں کے پیٹ میں سانس لینے کے قابل ہوجاتا ہے تو اس کی زندگی سے متعلق تقدیر مرتب کی جاتی ہے اور ہر سال کے لئے جو فیصلے ہوتے ہیں وہ بھی تحریر کئے جاتے ہیں، اور انسان کی روزانہ کی کاروائی بھی لکھی جاتی ہے، گویا ایک کلی نظام کی تقدیر کے بعد مختلف فائلیں تیار کی جاتی ہیں جو خاص در عام کے زمرے میں آتی ہیں، جیسے جنس کے اندر انواع اور انواع کے ضمن میں افراد ہوتے ہیں۔ تدبر و تشکر

"عن ابی ھریرۃ قال جاء مشرکو قریش الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یخاصمون

9. صحیح مسلم ص:۳۳۵ ج:۲ "باب حجاج آدم موسی الخ" کتاب القدر.

فی القدرفنزلت هذه الایة : "یوم یُسحبون فی النارعلی وجوهم ذوقوامس سقراناکل شئی خلقناه بقدر"۔ (حسن صحیح)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ قریش کے مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر تقدیر کے بارے میں بحث کرنے لگے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ترجمہ) جس روز یہ لوگ اپنے مونہوں کے بل جہنم میں گھسیٹے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا کہ) دوزخ (کی آگ) کے لگنے کا مزہ چکھو ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا ہے۔ (قمر آیت نمبر: ۴۸، ۴۹)

تشریح:۔ اس آیت کریمہ میں ''بقدر'' سے یہی تقدیر مراد ہے جس کے لئے امام ترمذی نے اتنی ساری احادیث ذکر فرمائی ہیں، اگرچہ علامہ باجی مالکی نے اس تفسیر میں کچھ اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے مگر وہ قابل التفات نہیں لہٰذا کہا جائے گا کہ قرآن وسنت دونوں اثبات تقدیر پر صریح ہیں، اس لئے عقیدۂ تقدیر ایمان کا حصہ ہے، تاہم جو لوگ اس میں بحث کرتے ہیں ان کو احتیاطاً کافر نہیں کہنا چاہئے جیسا کہ سابقہ اوراق میں گذرا ہے۔

ابواب الفتن

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قولہ "الفتن" فتنۃ کی جمع ہے جس کے تقریباً درجن بھر معنی آتے ہیں، اصل لغت میں سونے، چاندی یا دیگر معدنیات کو جانچنے کے لئے آگ پر تپانے اور پگھلانے کو کہتے ہیں، دیگر معانی یہ ہیں: آزمائش، گمراہی، فساد وہنگامہ، فریفتگی وگرویدگی، دیوانگی، جنگ وجدال، پریشانی ومصیبت اور عذاب وغیرہ۔ یہاں مراد وہ امور ہیں جن کی وجہ سے آدمی کے ایمان کا امتحان ہوجاتا ہے کیونکہ نامساعد حالات میں کھرے مؤمن اور کھوٹے کی تمیز ہوجاتی ہے، تاہم توسعاً اس کا اطلاق ہر ناپسندیدہ شے پر بھی ہوتا ہے، لہٰذا یہاں دونوں قسم کے واقعات اور آنے والے حالات کا تذکرہ کیا جائے گا۔

باب ماجاء لایحل دَمُ امرِئ مسلم اِلاباحدی ثلاث

"عن ابی امامة بن سهل بن حُنیف ان عثمان بن عفان اشرف یوم الدارفقال:اَنشُدُکم باللّٰه اَتعلمون ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال:لایحل دم امرئی مسلم اِلاباحدی ثلاث،زِنی بعداحصان اوارتدادبعداسلام اوقتل نفس بغیرحق فَقُتِلَ به؟ فواللّٰه مازنیتُ فی جاهلیة ولافی اسلام،ولاارتددت مُنذبایعتُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ولاقتلتُ النفس التی حرم اللّٰه اَفبِمَ تقتلونّی"؟۔ (حسن)[۱]

حضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے گھر کے محاصرے والے دن اوپر سے جھانک کر فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں

ابواب الفتن

باب ماجاء لایحل دم امرئ مسلم الخ

[۱] رواہ ایضاً نسائی، ابن ماجہ وحاکم بحوالہ سنن دارمی ص:۲۲۵ ج:۲، مسنداحمد ص:۹۹ ج:۱ حدیث:۴۳۹ و۴۵۴ و۴۷۰ و۴۰۵

معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کا خون کرنا سوائے تین صورتوں کے جائز نہیں؟ (۱) احصان کے بعد زنا کرنا۔ (۲) اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہونا۔ (۳) یا ناجائز طریقے سے کسی کو قتل کرنا، جس کے بدلے میں اسے قتل (قصاص) کیا جائے گا، پس بخدا میں نے نہ تو جاہلیت میں کبھی زنا کیا ہے اور نہ ہی اسلام میں اور جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہے تب سے میں کبھی مرتد بھی نہیں ہوا ہوں اور نہ ہی میں نے کسی ایسے شخص کو قتل کیا ہے، جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہو، تو پھر تم لوگ مجھے کس بناء پر قتل کرنا چاہتے ہو؟؟؟

لغات: ۔قولہ "اشرف" شین، راء اور فاء میں بلندی کے معنی پائے جاتے ہیں یعنی وہ گھر کے اوپر دریچہ یا دیوار سے جھانک کر بولے۔قولہ "یوم الدار" گھر کے محاصرے کے دوران جس کا پس منظر تشریح میں آرہا ہے۔قولہ "انشد کم" ای اقسمکم، میں تمہیں قسم دیتا ہوں۔قولہ "اتعلمون" ہمزہ استفہام برائے تقریر ہے یعنی قد تعلمون، تم تو جانتے ہی ہو۔قولہ "احصان" حفاظت کی تدبیر اور مضبوط و مستحکم بنانے کو کہتے ہیں، اصطلاح میں محصن کا اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے، آزاد یعنی حُر پر، پاک دامن اور شادی شدہ پر، یہاں یہی آخری معنی مراد ہے۔قولہ "فبم تقتلونی" بتشدید النون کیونکہ بعض طرق میں دو نونین کے ساتھ آیا ہے "فبم تقتلوننی" جبکہ امر کی راء کی حرکت ہمیشہ مابعد حرف یعنی ہمزہ کی تابع رہتی ہے۔

تشریح: ۔ابوامامہ بن سہل بن حنیف (بالتصغیر) صحابی ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع ثابت نہیں۔

اس واقعے کا مختصر پس منظر جو ابن خلدون نے (جلد اول کے باب اٹھارہ) میں تفصیل سے لکھا ہے:
اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ بن (سودا) سبا یہودی امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بطمع مال و زر (بلکہ بنیت فساد) ایمان ظاہر کر کے اہل بیت کی محبت کی آڑ میں لوگوں کو امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ اور شیخین رضی اللہ عنہما کے خلاف اُکساتا، اور ان کے خلاف بہتان تراشتا، اس نے بصرہ، کوفہ اور بالآخر مصر میں ان خیالات کا بھرپور انداز اور شاطرانہ طریقے سے پرچار کیا، بہت سے لوگ اس کے خیالات کی جانب مائل ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کے خلاف خیالات جنم لینے لگے، ان کے الزامات میں سے منٰی میں چار رکعات نماز پڑھنا، مصاحف کو جلانا، اپنے اُمراء اور عاملوں سے نرمی کا برتاؤ کرنا وغیرہ شامل تھے مگر سب سے زیادہ پروپیگنڈہ اقربہ پروری کا کامیاب ہوا اور بصرہ و کوفہ اور مصر سے ایک ایک ہزار کا لشکر آ کر مدینہ منورہ کا گھیراؤ اور

خصوصاً حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر بیٹھا۔ حضرت علی اور محمد بن مسلمہ نے ان بلوائیان مصر وغیرہ کو نشیب وفراز سمجھا کر واپس لوٹایا مگر راستہ میں مروان کا ایک جعلی خط ان کے ہاتھ لگا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور بلوائیان مصر واپس مدینہ آ کر حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذریعہ بنے۔

حضرت تھانویؒ نے المسک الزکی میں بحوالۂ تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ [۲] لکھا ہے کہ مروان حضرت عثمانؓ کی خدمت میں رہتے تھے، آپؓ کی مہر وغیرہ ان کے پاس رہتی تھی، اس نے حاکم مصر کو ایک خط لکھا اور اس پر حضرت عثمانؓ کی مُہر لگادی، اور یہ خط غلام کو دے کر مصر روانہ کردیا، وہ غلام راستہ میں گرفتار ہوا اور خط برآمد ہوا، چنانچہ تاریخ ابن خلدون میں ہے کہ جب بلوائیان مصر دوبارہ مدینہ کی طرف لوٹے تو محمد بن مسلمہ نے واپسی کا سبب پوچھا، فتنہ پردازوں نے وہ خط دکھایا (جو مروان نے جعلی طریقے سے از طرف امیر المؤمنین لکھا تھا) اس خط میں بعض لوگوں کے نام متعین کر کے لکھا تھا کہ ان کو قید اور سر اور داڑھیاں مونڈنے کی سزا دی جائے اور بعض کو سولی دینے کو لکھا تھا۔

جب خط کا معاملہ حضرت عثمانؓ کے سامنے آیا تو انہوں نے قسم کھا کر اس سے لاعلمی کا اظہار کیا، محمد بن مسلمہ نے تصدیق کرتے ہوئے فرمایا بے شک یہ کام مروان کا ہے، بہرحال اس واقعے پر بلوائیان مصر مشتعل ہو کر واپس مدینہ آئے تھے اور ان کے ساتھ بلوائیان بصرہ وکوفہ بھی آئے تھے۔ باب کی حدیث میں اسی محاصرۂ ثانیہ کا بیان ہے، ان لوگوں کا مطالبہ حضرت عثمانؓ کی معزولی کا تھا اور دلیل یہ پیش کی کہ آپ کا غلام آپ کی مہر شدہ خط لے کر جائے اور آپ کو اس کا پتہ بھی نہیں اس لئے آپ خلافت کے حق دار نہیں، آپ معزول ہو جائیں، ان کو تو بہانہ درکار تھا۔

المسک الذکی میں ہے کہ جس روز حضرت سیّدنا عثمانؓ شہید ہوئے ہیں اس روز آپ کا روزہ تھا اور اس دن کی رات میں آپ نے حضورِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے عثمان! تمہارا کیا حال ہے؟ آپ نے عرض کیا کہ آپ کی امت میری خون ریزی کے درپے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میرے پاس آکر روزہ افطار کرو گے یا دنیا میں؟ عرض کیا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر روزہ افطار کروں گا؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تم آج میرے پاس آجاؤ گے، پھر آپؓ بیدار ہوئے اور فرمایا کہ آج میں شہید ہوں گا، چنانچہ اسی روز آپؓ شہید ہوگئے، جب آپؓ شہید ہو رہے تھے

---

[۲] تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ ص:۱۲۶ قدیمی کتب خانہ کراچی.

تو آپؓ تلاوت فرما رہے تھے اور خون کا قطرہ اس آیت پر آپڑا: "فسیکفیکھم اللّٰہ وھو السمیع العلیم" [۳] اور یہی آیت آپؓ کی زبان پر بھی تھی۔ (بحوالہٗ تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ [۴] وحاشیہ ابن خلدون مترجم) کہتے ہیں کہ زمانۂ جنگ عظیم میں یہ مصحف جسے امام کہتے ہیں لندن کے میوزیم میں پہنچ گیا ہے۔ واللہ اعلم

سوال:۔ حضرت عثمانؓ نے جو مرفوع حدیث بیان فرمائی ہے اس میں صرف تین آدمیوں کے قتل کا جواز معلوم ہوتا ہے جبکہ بعض دیگر روایات سے ان کے علاوہ بھی بعض لوگ مباح الدم قرار دیئے گئے ہیں مثلاً کوئی شخص حملہ آور ہو جائے تو اپنا دفاع جائز ہے اگر چہ اس دفاع میں صائل یعنی حملہ آور کی جان چلی جائے، ہاں دفاع کم از کم حد تک ہونا چاہئے جس سے صرف جان بچانا ملحوظ ہو، اس کے علاوہ بھی بعض صورتیں جواز کی ہیں۔

جواب:۔ جن روایات سے اباحت قتل معلوم ہوتی ہے تو وہ یا ان صورتوں میں ہے جو تعزیر اور قتل سیاسۃً پر محمول ہیں یا تغلیظاً ہیں یا مرتد کے حکم میں ہیں جیسے باغی، یا مدافعتاً ہیں نہ کہ تعمد قتل، اور یا ان میں لفظ قتال آیا ہے جس سے مراد لڑنا ہے نہ کہ مارنا۔ یہ مسئلہ پہلے گذرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۳۱۴ ج: ۵ ابواب الدیات "باب ماجاء لایحل دم امرء مسلم الا باحدیٰ ثلاث")

باب ماجاء فی تحریم الدماء والاموال

عن سلیمان بن عمرو بن الاحوص عن ابیه قال سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: فی حجة الوداع للناس ایّ یوم هذا؟ قالوا: یوم الحج الاکبر، قال فان دماءَ کم واموالکم واعراضکم بینکم حرام کحرمة یومکم هذا فی بلدکم هذا اَلَا لایجنی جان اِلّا علی نفسه اَلَا لایجنی جان علی ولده ولا مولود علی والده اَلَا وان الشیطان قد اَیِسَ ان یعبد فی بلادکم هذه ابداً ولکن ستکون له طاعة فیما تحقرون من اعمالکم فسیرضی به"۔ (حسن صحیح)

حضرت سلیمان بن عمرو اپنے والد حضرت عمرو بن الاحوص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ وہ لوگوں سے فرما رہے تھے: آج کونسا دن ہے؟ لوگوں نے جواب دیا حج اکبر کا دن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک تمہارا خون اور تمہارے اموال اور ناموس ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں (یعنی حرمت والے ہیں) جیسے تمہارے

---

[۳] سورة البقره آیت: ۱۳۷۔ [۴] کذا فی البدایة والنهایة ص: ۱۸۰ ج: ۷، ۸ دار الکتب العلمیه بیروت۔

آج کے دن کی حرمت آپ کے اس شہر میں، تم آگاہ رہو کہ کوئی مجرم جرم نہیں کرتا مگر صرف اپنے اوپر، خبردار! کوئی آدمی جنایت نہیں کرتا اپنی اولاد پر اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ پر، آگاہ ہو کہ شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ تمہارے ان شہروں میں پھر کبھی اس کی عبادت کی جائے گی البتہ اس کی فرمانبرداری آپ کے ان اعمال میں ہوگی جن کو تم معمولی سمجھتے ہوں گے بس وہ اسی پر راضی ہو جائے گا (کیونکہ یہی چھوٹے اعمال سیلاب کی شکل اختیار کر کے امت کو غرق کر دینے کا موجب بنیں گے کما ہو المشاہد)۔

لغات:۔ قولہ "حجة الوداع" بروزن جنۃ یعنی بفتح الحاء بھی جائز ہے جس کے معنی ایک حج کے آتے ہیں جیسے اس وزن کی خاصیت ہے جبکہ بکسر الحاء بھی جائز ہے اس کے معنی بھی ایک حج کے یا مطلق حج کے آتے ہیں۔ قولہ "الوداع" بفتح الواو رخصتی کے معنی میں ہے اس میں واؤ کا کسرہ بھی جائز ہے چونکہ یہ آپ علیہ السلام کا آخری حج تھا اس میں آپ نے جتنے خطبات ارشاد فرمائے تھے عموماً سب یا اکثر میں رخصتی کی طرف اشارہ تھا اور کہیں کہیں صریح الفاظ میں رخصت لے لی تھی۔ قولہ "الحج الاکبر" بعض نے عرفہ کے دن کو حج اکبر کہا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ عمرے کے مقابلے میں حج کو کہتے ہیں گویا عمرہ حج اصغر ہے اور حج، حج اکبر ہے، اور عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ حج اکبر وہ ہے جو جمعہ کے دن آ جائے تو یہ بلا اصل ہے۔ قولہ "واعراضکم" عِرض بکسر العین کی جمع ہے موضع مدح والذم کو کہتے ہیں خواہ آدمی کی ذات سے متعلق ہو یا باپ دادا وغیرہ سے جس کو آبرو کہتے ہیں۔ قولہ "جان" اسم فاعل کا صیغہ ہے رامِ کی طرح، جنایت سے ہے جرم اور قصور کو کہتے ہیں۔ قولہ "اَیِس" بفتح الہمزہ وکسر الیاء اَیْسًا وایاسًا مایوس ہونا یعنی شیطان ناامید ہوا ہے۔

تشریح:۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کے موقعہ پر متعدد خطبات ثابت ہیں مگر غالباً اس حدیث کے خطبے کا تعلق یوم النحر یعنی دس تاریخ سے ہے جو جمرات کے قریب آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تھا، ممکن ہے کہ کسی اور دن کا خطبہ ہو۔

زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا جو آج تک ہمارے قبائلی نظام میں رائج ہے کہ مقتول والے قاتل کے کنبے سے جو بھی ملتا اور خصوصاً سرکردہ آدمی کو انتقام کا نشانہ بناتے تھے اگر چہ قتل اس کے بیٹے یا باپ نے کیا ہو آپ علیہ السلام نے اس سے ممانعت فرمادی کہ ایک آدمی (قاتل ومجرم) کے جرم میں دوسرے کو سزا نہیں دینی چاہئے ہاں اگر اس جرم میں وہ شریک ہو یا اس کی کوئی کوتاہی ہو تو شریعت کی بتائی ہوئی حدود کے اندر اسے سزا بھگتنا پڑے گی جیسے قاتل کے عاقلہ پر دیت کا مسئلہ ہے۔

پھر آپ علیہ السلام نے حرمت میں حج کے دن اور شہر حرام کے ساتھ جو تشبیہ دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سامعین کے ذہنوں میں ان کی حرمت مسلم اور راسخ ہو چکی تھی پہلے عارضہ کے حوالہ سے گذرا ہے کہ ایک آدمی مطاف میں اپنے بھائی کے قاتل کے ساتھ طواف میں شریک ہوتا مگر اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان جزیرۃ العرب میں دوبارہ شرک کے فروغ پانے سے مایوس ہو گیا ہے البتہ باقی گناہ ہوتے رہیں گے بایں طور کہ تم ان گناہوں کو معمولی سمجھ کر کرتے رہو گے اور شیطان اسی میں سے اپنا کام نکالے گا کیونکہ جب گناہ چھوٹے ہوں مگر جب کثرت سے ہوں گے تو وہ طوفانی شکل اختیار کریں گے کہ لاصغیرۃ مع الاستمرار اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہ بڑے گناہوں کے پیش خیمہ ہوتے ہیں پہلے معمولی سمجھ کر کرو گے پھر اس کا خوف دلوں سے نکل کر تم ایک قدم آگے بڑھو گے پھر آہستہ آہستہ کبائر دون الشرک میں منہمک ہو جاؤ گے جس کا آج مشاہدہ عام کیا جا سکتا ہے، اور یہی چیز شیطان کی خوشی کے لئے کافی ہے۔

اس کی قدرے تفصیلی بحث اسی جلد کے ابواب البر والصلۃ میں گذری ہے دیکھئے ''باب ماجاء فی التباغض'' وفیہ: ان الشیطان قد ایس ان یعبدہ المصلون ولکن فی التحریش بینھم۔

باب ماجاء لایحل لمسلم اَن یُّرَوِّعَ مسلماً

عبداللّٰہ بن السائب بن یزید عن ابیہ عن جدہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لایاخذ احدکم عصا اخیہ لاعباً جادًا فمن اخذ عصا اخیہ فلیردھا الیہ۔[1] (حسن غریب)

حضرت یزید بن سعید بن ثمامہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی بھی اپنے بھائی کی لاٹھی بطور مذاق یا سنجیدگی کے (بغیر اجازت کے) نہ لے پس اگر کسی نے اپنے بھائی کی چھڑی لی تو تو اسے (فوراً) واپس کر دے۔

لغات:۔قولہ "یروع" باب تفعیل سے معروف کا صیغہ ہے ڈرانے کو کہتے ہیں۔ قولہ "لاعباً" بصیغۂ اسم فاعل لعب سے بمعنی مذاق (مزاح)۔قولہ "جادا" یہ بھی اسم فاعل کا صیغہ ہے جدٌّ بکسر الجیم وتشدید

باب ماجاء لایحل لمسلم ان یروع مسلماً

[1] رواہ ایضاً ابوداؤد فی الادب باب: ۸۵، مسنداحمد ص: ۲۵۸ ج: ۵ حدیث: ۱۷۴۸۱، ۱۷۴۸۲۔

الدال مقابلِ مذاق کو کہتے ہیں یعنی سنجیدگی اور واقعیت سے کوئی کام کرنا، اس کا اسم فاعل محدٌ بھی آتا ہے۔

ابوداؤد[۲] کی روایت میں "لعباً و لاجداً" کے الفاظ ہیں لہٰذا کہا جائے گا کہ ترمذی کی روایت میں تقدیر ہے یعنی "لاعباً و لاجاداً" پھر یہ دونوں لایأ خذ کے فاعل سے حالین ہیں متداخلہ یا مترادفہ دونوں قول ہیں۔ اگر عطف کو مقدر نہ مانا جائے تو پھر متداخلہ ہیں جبکہ ابوداؤد کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے حالین مترادفین ہوں گے، متداخلہ کا مطلب یہ ہے کہ جاداً کو ضمیر لاعباً سے حال بنایا جائے۔

تشریح:۔ ایک مطلب یہ ہے "جاداً" کا کہ کسی کی چیز بغیر بتلائے لے لے اگرچہ واپس کرنے کا ارادہ ہو مگر اپنا کام کرکے، یا مطلب یہ ہے کہ کسی کی اطلاع اور اجازت کے بغیر کوئی چیز نہیں لینا چاہئے نہ بطور مذاق اور نہ اس نیت سے کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو میں کہوں گا کہ میں تو مذاق کررہا تھا اور نہیں دیکھا تو ہضم کرلوں گا، اگر بالفرض ارادہ مذاق ہی کا ہو پھر بھی ایسا کرنا ممنوع ہے کہ کسی کی چیز لے کر مذاق میں اسے چھپا کر کہیں رکھ دیا اور وہ بے چارہ پریشانِ حال پھر رہا ہو چونکہ اس میں ایذائے مسلم ہے اس لئے یہ جائز نہیں اور اگر بقصد چوری کے ہو تو پھر تو حرام ہے، اور لاٹھی کا ذکر حکم کی تخصیص کے لئے نہیں بلکہ یہ واقعہ چونکہ بعض روایات کے مطابق سفر میں ایک ساتھی کے ساتھ مذاق میں لاٹھی ہی کے متعلق پیش آیا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمادی چونکہ علت ترویع یعنی پریشان اور خوف زدہ کرنا ہے اس لئے یہ حکم ہر شے کو شامل ہے، اور جب لوٹانے کی نیت کے باوجود منع ہے تو چوری کی نیت سے بطریق اولیٰ منع ہے۔

قابل غور ہے کہ جب اپنے مسلمان بھائی کو اتنی دیر کے لئے پریشان کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے تو مذاق سے زیادہ اور طویل مدت کے لئے لاٹھی سے بڑھ کر دوسری اشیاء میں کتنا گناہ ہوگا؟؟؟

باب ماجاء فی اشارة الرجل علی اخیه بِالسّلاح

"عن ابی هریرة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: من اشار علی اخیه بحدیدةٍ لعنه الملائکة"۔[۱] (حسن صحیح)

---

[۲] لایاخذن احدکم متاع اخیه لاعباً جاداً وقال سلیمان لعباً ولاجداً سنن ابی داؤد ص: ۳۳۵ ج: ۲ کتاب الادب۔

باب ماجاء فی اشارة الرجل الی اخیه الخ

[۱] رواه مسلم ص: ۳۲۸ ج: ۲ "کتاب البر والصلة"، ایضاً روی بمعناه مسنداحمد ص: ۵۰۴ ج: ۲ حدیث: ۷۴۲۷۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے بھائی پر لوہا تان لے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔

تشریح:۔ لوہے سے اشارے کا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات میں کسی پر تلوار اٹھادی یا بندوق کا رُخ اس کی طرف کیا اسی طرح دیگر کوئی ہتھیار یا دھار والا لوہا وغیرہ کوئی چیز جس سے چوٹ یا زخم لگنے کا اندیشہ ہو تو یہ ممنوع ہے اور آدمی اس سے فرشتوں کی لعنت کا مستحق بن جاتا ہے اور جب مذاق کا یہ حال ہے تو جب بارادہ ضرر ہو تو اس کا کیا حال ہوگا؟

پھر ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت ہے جب اشارے سے مراد ڈرانا ہو: ''فهذا قد استحق اللعن بالاشارة فماظنك بالاصابة'' الخ۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ ایسے بے شمار واقعے پیش آئے ہیں کہ مذاق میں کسی پر بندوق خالی سمجھ کر چلائی اور گولی نکل کر لگ گئی، ہمارے کے قریب گاؤں ایک گاؤں میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا، ایک لڑکے نے اپنی بہن کو اسی طرح قتل کیا تھا، یہ مذاق جائز نہیں اس لئے اس روایت کے بعض طرق میں یہ اضافہ ہے: ''وان كان اخاه لابيه وامه''۔[۲] علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ملاعبہ کی تتمیم کے لئے فرمایا یعنی اگر چہ وہ اشارہ واقعی مذاق میں ہو کیونکہ اپنے سگے بھائی کو عموماً قتل نہیں کیا جاتا مگر جب اس کے ساتھ یہ مذاق منع ہے جس میں یقیناً پوری احتیاط ملحوظ ہوگی تو اجانب کے ساتھ تو بطریق اولیٰ ممنوع ہوا۔

باب النهي عن تعاطي السيف مسلولاً

''عن جابر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يُتعاطى السيفُ مسلولاً''۔[۱]

(حسن غريب)

حضرت جابر رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی تلوار کے لینے دینے سے ممانعت فرمائی ہے۔

---

۲ كذا في رواية مسلم حواله بالا.

باب النهي عن تعاطي السيف مسلولاً

۱ ايضاً رواه ابوداؤد ص: ۳۵۶ : ۱ ''باب في النهي ان يتعاطى السيف مسلولاً'' كتاب الجهاد مسنداحمد ص: ۳۲۹ ج: ۴ حديث: ۱۳۷۸۹، ۱۴۴۷۰.

تشریح:۔ اگر کھلی ہوئی اور ننگی تلوار کسی کو دے تو ممکن ہے کہ دوسرا آدمی تھامنے نہ پایا ہو اور دینے والا چھوڑ دے تو وہ گر کر پاؤں پر لگ جائے گی، اسی طرح دونوں کو یا ایک کو زخم لگ جائے گا، اس لئے آداب بتلائے، یہی آداب بندوق دینے کے بھی ہے کہ دیتے ہوئے اس کا رُخ آسمان یا زمین کی جانب ہونی چاہئے کہیں خدانخواستہ اگر گولی چل جائے تو کسی کو لگ نہ جائے بے احتیاطی سے بہت سے لوگ لقمۂ اجل بنے ہیں۔

چاقو، چھری وغیرہ اشیاء میں بھی یہی ضابطہ ہے کہ چاقو وغیرہ یا تو بند کر کے دے دیا جائے یا زمین وغیرہ پر رکھ کر دوسرا اٹھالے، اسی طرح کسی کے اوپر چائے، پانی، شربت وغیرہ بھی نہیں دینا چاہئے ازاں جملہ یہ بھی ہے کہ کتاب وغیرہ اہم اشیاء کے اوپر پانی یا چائے وغیرہ مائع چیزیں ہرگز نہیں دینا چاہئے، ممکن ہے کہ ایک قطرہ بھی گر جائے کپڑے خراب ہو جائیں گے، اور اگر کوئی مصنف ہو تو اس کی محنت بھی ضائع ہو جائے گی کہ لکھا ہوا مضمون دوبارہ لکھنا انتہائی مشکل کام ہوتا ہے۔

غرض تکلیف اور ضرر کے جملہ امور سے بچنا چاہئے، حضرت تھانویؒ "بہشتی زیور" میں لکھتے ہیں:

"چاقو یا قینچی یا سوئی یا کسی اور ایسی چیز سے مت کھیلو شاید غفلت سے کہیں لگ جائے، جہاں اور آدمی بھی بیٹھے ہوں وہاں بیٹھ کر مت تھوکو، ناک مت صاف کرو، اگر ضرورت ہو تو ایک کنارے پر جا کر فراغت کر آؤ۔ جب کسی کے ہاتھ میں کوئی چیز دینا ہو تا وقتیکہ وہ دوسرا آدمی اس کو اچھی طرح سنبھال نہ لے اپنے ہاتھ سے مت چھوڑ، بعض دفعہ یوں ہی بیچ میں گر کر نقصان ہو جاتا ہے"۔ (حصہ: ۱۰ بعض باتیں سلیقہ اور آرام کی)

باب من صلى الصبح فهو في ذمة الله عزوجل

"عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: من صلى الصبح فهو فی ذمة الله فلا يَتْبِعَنَّكُمُ الله بشئٍ من ذمّته"۔[1] (حسن غريب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے صبح کی نماز پڑھی وہ اللہ کی ذمہ داری میں داخل ہو گیا، پس اللہ تمہارے درپے نہ ہو جائے اپنی ذمہ داری کے بارے

باب من صلى الصبح فهو فی ذمة الله عز و جل

[1] رواه ايضاً مسلم فی كتاب المساجد، والترمذی فی الصلاة باب: ۵۱، سنن ابن ماجه ۲۸۳ "باب المسلمون فی ذمة الله عز و جل" ابواب الفتن، مسنداحمد ص: ۴۰۸ ج: ۴ حديث: ۱۸۳۳۵.

میں کسی طرح (یعنی پناہ توڑنے کے سبب)

تشریح:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح مسلمان کو کلمہ توحید پڑھنے سے امان حاصل ہوتی ہے اسی طرح جزوی اعمال سے بھی خصوصی حفاظت ملتی ہے ازاں جملہ ایک صبح کی نماز ہے جس سے آدمی کو اللہ کی حفاظت وامان ملتی ہے پس جو شخص اس آدمی سے تعرض کرے گا خواہ اس کی جان ومال کے اعتبار سے ہو یا عزت وآبرو کے حوالے سے، تو اس سے قیامت کے دن انتقام لیا جائے گا، یہاں ایک خفیہ تشبیہ ہے وہ یہ کہ جس طرح ایک شخص کسی سردار کی پناہ حاصل کرتا ہے یا جیسے آج کل لوگ کسی ملک سے سیاسی پناہ لیتے ہیں تو وہ شخص اس سردار اور اس سیاسی پناہ دینے والے ملک کی حفاظت میں ہوتا ہے، وہ اس کے جان ومال وغیرہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں، پھر اگر کوئی دوسرا شخص اسے نقصان پہنچاتا ہے تو اس کی گرفت ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نمازی کو پناہ دیتا ہے، حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اس کو نقصان پہنچانے کی صورت میں اللہ ضرر پہنچانے والے کے درپے آزار ہو جاتا ہے لہٰذا تم اللہ کی امان اور عہد کو مت توڑو۔

تنبیہ:۔ بعض شارحین نے "یتبعنکم" کو مزید سے بناتے ہوئے تاء کو مشدد لکھا ہے مگر حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں تصریح فرمائی ہے کہ یہ مجرد سے ہے لہٰذا تاء کو ساکن پڑھا جائے گا اور تابع ہونے کا مطلب مطالبہ کرنا ہے چنانچہ مسلم[۲] کی روایت میں "فلا یطلبنّکم" کے الفاظ ہیں۔ آیت کریمہ میں ہے: "ثم لاتجدوا لکم علینا به تبیعاً"۔[۳]

باب فی لزوم الجماعة

"عن ابن عمر قال خطبنا عُمر بالجابية فقال: یا ایها الناس انی قمتُ فیکم کمقام رسول الله صلی الله علیه وسلم فینا فقال: اُوصِیکم باصحابی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم یفشُو الکذبُ حتی یحلفَ الرجل ولا یُستحلفُ ویشهدُ الشاهدُ ولا یُستشهدُ الا لایخلُوَنّ رجل بامرأةٍ اِلا کان ثالثُهما الشیطان علیکم بالجماعة وایاکم والفُرقةَ فان الشیطان مع الواحد وهو من الاثنین ابعد، من اراد بُحبُوحَةَ الجنة فلیلزم الجماعة من سَرَّتْهُ حَسَنَتُه وَسَاءَ ته سیئتُه فذالکم

---

[۲] صحیح مسلم کتاب المساجد حدیث: ۲۶۱، ایضاً مجمع۔

[۳] سورة بنی اسرائیل آیت: ۳۲۔

المؤمن"۔[۱] (حسن صحيح غريب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے جابیہ مقام میں ہم کو خطبہ دیا، پس فرمایا اے لوگو! میں تمہارے درمیان اس طرح کھڑا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مابین جلوہ افروز ہوئے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں اپنے صحابہ کی اطاعت کی وصیت کرتا ہوں پھر اُن کی جو اِن سے ملے ہوئے ہوں اور پھر ان کی جو اُن سے ملے ہوئے ہوں، پھر جھوٹ عام ہو جائے گا یہاں تک کہ ایک شخص قسم کھائے گا حالانکہ اس سے حلف اٹھانے کو نہیں کہا گیا ہوگا (یعنی قسم کے مطالبے کے بغیر قسمیں کھائے گا) اور گواہ (از خود) گواہی دے گا حالانکہ اس سے گواہی کا تقاضا نہیں کیا گیا ہوگا خبردار! کوئی آدمی ہرگز کسی عورت کے ساتھ تنہا نہیں رہتا مگر ان کا تیسرا ضرور شیطان ہوتا ہے تم جماعت کے ساتھ ہی رہو اور اختلاف سے خود کو دور رکھو کیونکہ شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دو سے دور ہوتا ہے، جو شخص جنت کے بیچوں رہنا چاہے تو وہ جماعت ہی کے ساتھ رہے، جس شخص کو اس کی نیکی خوش کردے اور برائی غم ناک کردے تو وہ پکا مؤمن ہے۔

لغات:۔قوله "بالجابية" جابیہ شام میں دمشق کی ایک بستی کا نام ہے۔قوله "باصحابی" ای باطاعتهم والمراد اُلو الامر۔قوله "يفشو" ای يظهر وينتشر یعنی پھیل جائے گا اور عام ہو جائے گا۔قوله "يحلف ولا يستحلف ويشهد ولا يُستشهد" ہر دو جملوں میں اولین صیغے معروف کے ہیں اور آخرین مجہول کے۔قوله "بحبوحة" بضم البائين، درمیان کو کہتے ہیں، جنت کے درمیان سے مراد وسعت اور کشادگی ہے یعنی جو جنت میں اچھے اور کشادہ مقام کو پسند کرتا ہو۔

تشریح:۔اس ارشاد پاک میں متعدد احکام بیان ہوئے ہیں تاہم امام ترمذیؒ نے باب صرف ایک حکم یعنی لزوم الجماعت کے لئے باندھا ہے، لہٰذا یہاں پہلے ضمنی احکام کو منضبط کیا جاتا ہے، پھر اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں:

(۱)...اس حدیث سے پہلا حکم یہ ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو امراء اور وُلاۃ مقرر فرمائے تھے ان کی اطاعت باقی صحابہ کرامؓ پر لازمی تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب صحابہ کرامؓ تھے تو جب ان

باب فی لزوم الجماعة

[۱] ایضاً رواہ احمد فی مسندہ ص:۳۵ ج:۱ حدیث:۱۷۸.

سے کیا گیا کہ "اوصیکم باصحابی" تولامحالہ مراد امراء ہیں، اسی طرح تابعین اور پھر تبع تابعین میں سے جو ولاۃ ہوئے ان کی اطاعت بھی لازمی ہوئی۔ ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ مخاطب ہوں مگر یہ حکم ان کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ آئندہ امت کے لئے ایک ضابطہ بیان کرنا مراد ہو کہ میرے صحابہ کی پیروی کرو جو حکم ان سے نہ ملے تو پھر تابعین اور تبع تابعین کی پیروی کرو، اس مطلب کے مطابق ائمہ مجتہدین کی پیروی واطاعت بھی اس حدیث کی مراد میں شامل ہوگی۔

(۲)...دوسرا حکم یہ معلوم ہوا کہ تین زمانے مشہود لہا بالخیریت ہیں ان کے بعد جھوٹ اور فراڈ شائع ہوجائے گا، پھر حدیث جبرئیل کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جائے گا کہ سچ عیب بن جائے گا اور جھوٹ خوبی، کیونکہ حدیث جبرئیل کے متعلق ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے یہی لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو علامات قیامت کی بتلائی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قلب الاموروالحقائق ہوجائے گا چنانچہ آج ایسا ہی ہوا ہے کہ جو آدمی سچ بولتا ہے لوگ اسے سادہ یعنی بے وقوف سمجھتے ہیں اور سب سے زیادہ ہوشیار وہ سمجھا جاتا ہے جو زیادہ مکار ہو اگر آپ اس کی مثال یا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں تو سیاسی لیڈروں کو دیکھ لیجئے، اس مسئلہ کے لئے آگے ابواب الفتن میں مستقل "باب ماجاء فی القرن الثالث" آرہا ہے۔

(۳)...تیسرا حکم یہ ہے کہ کسی غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت نشینی کی صورت میں شیطان ان کو گناہ پر اکساتا ہے بایں صورت کہ شہوت کو اُبھارتا ہے اور حیاء کو اٹھاتا ہے اور جو موانع دیگر ہوتے ہیں ان کے بارے میں تشجیع کرتا ہے کہ کچھ نہیں ہوگا بالآخر آدمی اندھا بن کر ہمت کرتا ہے اور خوف خداوندی کو پس پشت ڈالتا ہے اس لئے سد باب کے لئے فرمایا کہ بس ایسے مواقع میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی خود کو بچالیا جائے یعنی خلوت سے بچے، اس لئے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: "ولاتقربوا الزنا" [۱] قریب جانا اسباب زنا سے گذرنا ہے۔

(تدبر) یہ مسئلہ رضاع میں "کراھیۃ الدخول علی المغیبات" میں گذرا ہے۔ (تشریحات ص:۴۶ ج:۵)

(۴)...چوتھا حکم یہ ہے کہ مؤمن وہ ہے جس کو نیکی سے خوشی ہو اور بدی سے رنج اور دُکھ ہو، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ کلام فصیح وبلیغ اور صحیح ہے کیونکہ جب ایمان ہوگا تو نیکی کی قدر ہوگی اور قابلِ قدر چیز کے حصول سے خوشی ہوتی ہے اور بدی وگناہ سے ڈر ہوگا کیونکہ اس کا انجام بُرا ہوتا ہے مگر ایمان نہ ہونے یا ناقص ہونے کی صورت میں اسے نیکی کا خاطر خواہ فائدہ اور گناہ کا نقصان ملحوظ خاطر نہ ہوگا، اس لئے کوئی فرق نہیں پڑے

---

[۱] سورۃ الاسراء آیت: ۳۲.

گا چنانچہ آگے ترمذی میں آجائے گا کہ مؤمن اپنا گناہ ایسا دیکھتا ہے جیسے وہ پہاڑ کے دامن میں گذر رہا ہو اور وہ اس پر گرنے والا ہو جبکہ منافق وغیرہ کے لئے گناہ کی حیثیت اتنی سی ہے جیسے مکھی ناک پر بیٹھ گئی اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اُڑا دیا۔

(۵)... اس باب کا مقصودی مسئلہ لزوم الجماعت ہے، اگر کوئی جماعت سے الگ ہو جاتا ہے تو وہ شیطان کا اس طرح شکار ہو جاتا ہے جیسے ریوڑ سے علیحدہ بکری بھیڑیا کا۔

جماعت سے مراد کون ہیں؟ اس باب میں امام ترمذیؒ نے جماعت کے لزوم کے حوالے سے تین احادیث کی تخریج کی ہے جس سے لزوم الجماعت کی اہمیت تو معلوم ہوئی مگر سوال یہ ہے کہ جماعت سے کن لوگوں کی جماعت مراد ہے؟؟؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنا آج کل خاصا مشکل ہے مگر جو اقوال قابل ذکر ہیں، وہ یہاں پیش کئے جارہے ہیں:

(۱)... اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے کہ مراد اجماع امت ہے، باب کی اگلی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے یعنی جب امت اِجابت کی غالب اکثریت بشرطیکہ وہ صلحاء پر مشتمل ہو یعنی صلحاء اس کے خلاف نہ ہوں کسی قول یا عمل پر متفق ہو تو اسے چھوڑ کر الگ راستہ اختیار کرنا جائز نہ ہوگا، ظاہر ہے کہ ایسا اجماع خلاف شریعت نہیں ہو سکتا ہے۔

(۲)... دوسرا مطلب یہ ہے کہ مراد صحابہ کرامؓ ہیں یعنی ان کا راستہ اختیار کیا جائے۔

(۳)... تیسرا قول یہ ہے کہ مراد ہر زمانے کے اہل علم وصلحاء ہیں اور قرآن میں "وکونوا مع الصادقین"[۳] کے رمز سے بھی اس کی تائید معلوم ہوتی ہے، عارضہ میں ہے کہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے سوال ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، سائل نے کہا کہ وہ تو انتقال کر چکے ہیں آپ نے فرمایا فلاں وفلاں (یعنی صلحاء کے نام لئے) پھر سوال ہوا کہ وہ بھی زندہ نہیں رہے: "فقال ابو حمزة السكرى جماعة وهو محمد بن ميمون و كان شيخاً صالحاً" یعنی اب ابوحمزہ جماعت ہے اسی کے ساتھ رہنا چاہئے۔

ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارکؒ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اور جس میں ارکانِ دین جمع ہوں گے بس وہی جماعت ہے اور یہ امام عادل ہے یا پھر عالم شخص ہے گو وہ تنہا ہو کیونکہ "بدأ الاسلام غريباً

۳ سورۃ توبہ آیت: ۱۱۹۔

وسیعود غریباً [٣] وجماعته العلم والعدالۃ"۔

امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"۔ (الآیۃ النساء نمبر: ۵۹) اسی پر زور دیا ہے کہ اولی الامر سے مراد علماء ہیں کیونکہ حکام اس وقت مقتدیٰ وقابل اطاعت ہیں جب وہ علماء کے فرامین کے تابع ہوں گے گویا عوام حکام کے تابع ہیں اور حکام علماء کے، نتیجہ یہ نکلا کہ اصل طاعت علماء کی ہوگی۔

(۴)... چوتھا قول اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مراد خلفاء وامراء ہیں چنانچہ ابن العربیؒ عارضہ میں "علیکم بالجماعۃ" کے بعد لکھتے ہیں:

"یحتمل معنیین یعنی ان الامۃ اجمعت علی قول فلایجوزلمن بعدھم ان یحدث قولاً آخر (یہ احتمال وہی ہے جو اوپر پہلے نمبر پر بیان ہوا) الثانی اذااجتمعوا علی امام فلاتحل منازعتہ ولاخلعہ وھذالیس علی العموم بل لوعقدہ بعضھم لجازولم یحل لاحدان یعارض"۔

یعنی جب چندلوگ (قابل بھروسہ) کسی آدمی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسے خلیفہ یا امام منتخب کرلیں تو باقی سب لوگ اس کی اطاعت کے پابند ہوں گے اس کے خلاف خروج یا حکم عدولی ان کے لئے جائز نہ ہوگی۔

یہ حکم اس وقت تو اتفاقی ہے جب امام حکم شرعی کے مطابق اور نیک وصالح شخص ہو لیکن اگر وہ فاسق یا جائر ہو تو اس میں اختلاف ہے کہ آیا پھر بھی اس کی اطاعت ضروری ہے یا نہیں اگر نہیں تو اس کے خلاف خروج بھی ہوگا یا نہیں؟ یہ مسئلہ "باب ماجاء فی بیعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" من ابواب السیر کے تحت گذرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۴۵۴ ج: ۵)

جمہور کے نزدیک پھر بھی خروج جائز نہیں یا کم از کم واجب نہیں، ہاں خلاف شرع حکم کی تعمیل نہیں کی جائے گی۔

آج کل یہ مشکل درپیش ہے کہ مسلمانوں کا کوئی ایک امام یعنی لیڈر متعین نہیں ہوتا، ہر ملک اور ہر پارٹی

---

[٣] رواہ مسلم فی کتاب الایمان "باب بیان ان الدین نصیحۃ" ابوداؤد کتاب الادب "باب فی النصیحۃ سنن نسائی کتاب البیعۃ "باب النصیحۃ للامام" عن تمیم الداری، ورواہ البزار عن ابن عمر ورجالہ رجال الصحیح بحوالہ سنن دارمی ص: ۴۰۲ ج: ۲ حدیث: ۲۷۵۵، مسنداحمد ص: ۶۵۷ ج: ۱ حدیث: ۳۷۷۵.

کا الگ الگ لیڈر ہوتا ہے ایسے میں کیا کرنا چاہئے؟ تو جہاں تک مختلف ممالک کا تعلق ہے اس کی تصویر تو آسان ہے کہ جو مسلمان جس ملک میں ہیں وہ اپنے اپنے ملک کے حکمرانوں کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں بشرطیکہ وہ خلاف شرع نہ ہوں ہاں البتہ حتی الامکان کفار کے ممالک میں جانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ (تشریحات ص:۵۸ ج:۳)

مگر ایک ہی ملک کے مختلف لیڈروں کا حکم بخاری شریف (ج:۱ص:۴۹۱) کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے: ''فوابیعة الاول فالاول ''یعنی جو پہلے منتخب ہوا اسی کی حکمرانی ہوگی اور تعمیل اسی کی بشروط ہوگی اگرچہ فاسق کے مباح احکام میں وہ لزوم نہ ہوگا جو عادل کے احکام میں ہوتا ہے، یہ مسئلہ بھی تفصیل سے گذرا ہے فلانعیدھا۔ (دیکھئے تشریحات ص۵۲۱ ج۵ ''باب ماجاء لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق'' من ابواب الجہاد)

اگر طوائف الملو کی کا دور آجائے جیسے آج کل اس کے آثار نمودار ہو رہے ہیں اور ہر آدمی یا ہر گروپ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالے تو پھر کیا ہونا چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے واللہ اعلم، کہ حتی الامکان جماعت کے ساتھ رہنے کی کوشش جاری رکھے مگر تمام راستے مسدود ہونے کی صورت میں پھر علیحدگی اختیار کر کے یکسو ہو جائے جیسا کہ بخاری شریف کی ایک طویل روایت میں ہے:

"قلتُ فان لم یکن لهم جماعة و لاامام قال فاعتزِل تلك الفرق كلّها ولوان تعضَّ باصل الشجرة حتیٰ یدرك الموت وانت علی ذالك"۔

(بخاری ص:۵۰۹ ج:۱، باب علامات النبوۃ فی الاسلام)

عزلت اور تنہائی اختیار کرنے کے حکم کے لئے دیکھئے تشریحات ص۴۲۱ ج۴ ''باب ماجاء فی النھی عن التبتل''، مگر پھر بھی صحبتِ صالح تلاش کرتا رہے۔

باب کی دوسری حدیث:۔ "عن ابن عمران رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: ان الله لا یَجمَعُ اُمّتِی اوقال امة محمد علی ضلالة ویدُالله علی الجماعة ومن شذَّ شُذَّ الی النار"۔ [۵]

(غریب من هذا الوجه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ میری امت کو یا فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ

---

۵ وفی سنن ابن ماجه: ان امتی لاتجتمع علی ضلالة ص: ۲۸۳ ابواب الفتن.

ہے اور جو شخص تنہا رہا اس کو اکیلا ہی دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

لغات:۔قولہ "ومن شذّشُذَّالی النار" پہلا معروف اور دوسرا مجہول کا صیغہ ہے جبکہ دال دونوں میں مشدد ہے، شذوذ کے معنے الگ تھلگ ہونے کے ہیں۔قولہ "یدالله" متشابہات میں سے ہے، مراد نصرت ومدد ہے یعنی جماعت پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور شیطان ان سے دور رہتا ہے، تاہم ثانی یعنی شُذَّ بعض طرق میں معروف بھی آیا ہے۔

تشریح:۔امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو غریب من ہذا الوجہ کہا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ضعیف ہے جیسا کہ کتاب کے شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ غریب بھی صحیح ہوسکتی ہے چنانچہ یہ روایت بھی صحیح ہے کہ ایک تو اس کے راوی ثقات ہیں دوسرے اس کے کئی متابع وشواہد ہیں، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں: "وان لم یکن لفظہ صحیحاًفان معناہ صحیح جداً"۔

امت کی دو قسمیں ہیں: ایک امت اجابت، دوم امتِ دعوت، جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر کے ان پر ایمان لایا وہ امت اجابت کہلاتے ہیں جبکہ منکرین، امتِ دعوت میں شامل ہیں، اس حدیث میں امت اجابت کے متعلق فرمایا کہ وہ کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی، تاہم قیامت کے قریب اگرچہ سب لوگ کفر پر مجتمع ہوں گے مگر وہ امت اجابت نہیں ہوں گے۔

اس حدیث سے اجماع کی معصومیت عن الضلالت بھی معلوم ہوئی مگر سب امت کی نہیں بلکہ اہل علم کی ورنہ فساق تو بہت سارے گناہوں اور گمراہی کے کاموں پر متفق ہو جاتے ہیں، مرقاۃ میں ہے:

"والمراد اجماع العلماء منھم ولا عبرة باجماع العوام وفی اضافة الامة الی اسمه الشریف اشارة الی ان هذه الامة هی التی امتاز بهذه الفضیلة من بین سائر الامم"۔

اجماع کی اقسام اور ان کے الگ الگ احکام مطولات میں دیکھے جاسکتے ہیں، بہرحال اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ جماعت کو ترک کرنے والا شخص قیامت کے روز اہل جنت کی جماعت سے الگ کر کے جہنم میں پھینکا جائے گا، یہ بھی ممکن ہے کہ جنتیوں سے علیحدہ کئے جانے کے ساتھ وہ جہنم میں بھی تنہا رکھا جائے جیسا کہ حدیث مبارک کے الفاظ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے، اس طرح مصیبت ڈبل ہو جائے گی دوزخی ہونا اور تنہائی کی زندگی بسر کرنا۔والعیاذ باللہ، بنابریں ہر آدمی پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ امت کے سواداعظم کے

ساتھ ہی رہے، اہل حق کے عقائد، اقوال اورافعال پر استقامت کے ساتھ قائم ودائم رہے تا کہ اسی پر موت نصیب ہو۔

باب ماجاء فی نزول العذاب اذالم یُغیّر المنکرُ

"عن ابی بکر الصدیق انه قال: یاایها الناس انکم تقرءون هذه الاٰیة: "یاایها الذین امنواعلیکم انفسکم لایضرکم من ضَلّ اذااهتدیتم" [1] وانی سمعتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: ان الناس اذارَاَوا الظالم فلم یأخذوا علی یدیه اَوشَكَ ان یَعُمّهُمُ اللّٰه بعقاب منه".(حسن صحیح کذاجزم علیه فی تفسیر سورة المائده)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: اے لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو: ''اے ایمان والو! اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا''۔ (مائدہ آیت نمبر ۱۰۵) (مگر اس کو ظاہری مطلب پر حمل کر کے خوش فہمی میں نہ پڑھو کیونکہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں (یعنی ظلم کرتا ہوا) اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں (یعنی اسے ظلم سے نہ روکیں) قریب ہے کہ اللہ ان پر عام عذاب نازل فرمائیں۔

لغات: قوله "اَوشكَ" بفتح الهمزة وسكون الواو وفتح الشين بمعنی قَارَبَ وَاَسرَعَ یعنی قریب ہے اور ایسا بہت جلد ہوگا۔

تشریح: حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے بارے میں یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں لوگ اس آیت کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ نہ بیٹھیں، اس لئے مندرجہ بالا حدیث بیان فرمائی کہ جب لوگ بُرائی کو حسب استطاعت نہیں روکیں گے تو عام عذاب آئے گا۔

عارضہ میں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دین کا بنیادی اصول اور مقصود اعظم ہے اسی کے لئے تو انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی ہے: ''وهو فرض علی الناس مثنیٰ وفرادیٰ بشرط القدرة علیه والامن علی النفس والمال معه'' وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں جو عذاب کی بات کی گئی ہے اس میں عظیم فقہ ہے

باب ماجاء فی نزول العذاب الخ

[1] سورة المائدة آیت: ۱۰۵۔

کیونکہ بعض گناہوں کی عقوبت جلد ملتی ہے، منکر سے نہ روکنا ان گناہوں میں سے ہے جس پر فوری سزا مرتب ہوتی ہے جو مال کی کمی، پھلوں کی قلت، جانوں کے ضیاع اور ذلت وظلم کی صورت میں ہوتی ہے۔ (انتھی مافی العارضۃ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج مسلمان ان تمام تباہیوں کا سامنا کر رہا ہے کوئی دن قتل وقتال کے بغیر نہیں گذرتا، بارشیں یا تو ہوتی نہیں یا پھر تباہی مچاتی ہیں، دریائے سندھ آج کل خشک پڑا ہوا ہے جو دنیا کے بڑے دریاؤں میں بیسیوں نمبر پر ہے، ظلم کا عالم یہ ہے کہ کوئی مظلوم نہ اپنی داستانِ ظلم تھانے میں جا کر پولیس کو سنا سکتا ہے کہ وہ خود پھنس جاتا ہے اور لینے کے دینے پڑتے ہیں اور نہ ہی کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے کہ عدالتیں تو امیروں اور وزیروں جیسے لوگوں کے لئے ہیں، وکلاء کی فیسیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں ایک ہزار کی وصولی کے لئے لاکھوں دینا نہ عقل میں آتا ہے اور نہ غریب کی رینج وقدرت میں ہے۔

اعتراض:۔ اس طرح تو بظاہر اس حدیث اور اس آیت میں تعارض سا ہو گیا کہ آیت سے چھوٹ معلوم ہوتی ہے جبکہ حدیث سے لزوم معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بہر صورت لازمی ہے ورنہ عذاب یقینی ہے۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کے الگ الگ محامل ہیں اس لئے کوئی تعارض نہیں، اس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱)... اس آیت کا تعلق ابتدائے اسلام سے ہے جبکہ حدیث کا تعلق قوت اسلامی کے حصول کے زمانے سے ہے، گویا یہ منسوخ یا از قبیل منسا ہے، منسا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کبھی ایک حکم پر عمل ہو جب حالات اس کے مطابق ہوں اور کبھی دوسرے پر عمل ہو جب حالات سازگار نہ ہوں جیسے جہاد کی آیات اور صبر کی تلقین میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان میں اس طرح کی تطبیق دی ہے۔

(۲)... "مـــن ضـــل" سے مراد ذمی لوگ ہیں یعنی جب مسلمان اپنے دین پر قائم ہوں تو ذمیوں کی لادینیت ان کے لئے نقصان دہ نہیں۔

(۳)... "من ضل" سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

(۴)... امام ترمذیؒ نے سورۂ مائدہ کی تفسیر میں ایک حدیث کی تخریج کی ہے جس کے مطابق یہ اس زمانے سے متعلق ہے جب لوگ خواہشات میں منہمک ہو کر احکام شرع پر کان دھرنا چھوڑ دیں گے ایسے میں

امر بالمعروف کا اثر ختم ہو جائے گا اس لئے اس کا لزوم ختم ہو کر صرف اپنا فکر و عمل کافی ہوگا۔

ولفظه: "عن ابی امية الشعبانی قال أتيتُ اباثعلبة الخشنی فقلتُ له كيف تصنع فی هذه الآية؟ قال اَيَةُ اَيَةٍ؟ قلت قوله تعالیٰ يا ايها الذين امنوا عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم" قال: اَمَا واللّٰه لقد سَألتَ عنها شيئاً سألتُ عنها رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم قال: اِئتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنكر حتی اذا رأيتَ شُحّاً مُطاعاً وهویً مُتَّبعاً وَدُنياً مؤثرة واعجاب كل ذی رأی برأيه فعليك بخاصة نفسك وَدَعِ العوامَ فان مِن وَرَائِكم اَيَاماً الصّبرُ فيهن مثل القبض علی الجمر لِلعامل فيهن مثل اجر خمسين رجُلاً يعملون مثل عملكم" الخ۔ [۲] (ابواب التفسیر ص: ۱۳۶، ایچ ایم سعید)

ایسے میں سابقہ باب میں بخاری شریف کی حدیث پر عمل کا وقت ہوگا کہ: "فاعتزل تلك الفرق كلها" الخ۔ [۳] اس حدیث کی تشریح ان شاء اللہ متعلقہ باب میں آئے گی۔

باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنهی عن المنكر

"عن حذيفة بن اليمان عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم قال: والذی نفسی بيده لَتَأمُرُنَّ بالمعروف وَلَتَنهوُنَّ عن المنكر اوليوشِكَنَّ اللّٰه ان يبعث عليكم عذاباً منه فتدعونه فلا يستجيب لكم"۔ [۱] (حسن)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا تو تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرتے رہو یا پھر اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب نازل کر ہی لے گا پھر تم اس سے دعائیں مانگو گے مگر تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں گی۔

---

[۲] ایضاً رواہ ابوداؤد ص: ۲۴۹ ج: ۲ کتاب الملاحم۔

[۳] صحیح بخاری ص: ۱۰۴۹ ج: ۲ "باب کیف الامر اذا لم تکن جماعة" کتاب الفتن رواہ مسلم فی کتاب الامارة، سنن ابن ماجه ص: ۲۸٦ ابواب الفتن۔

باب ماجاء فی الامر بالمعروف

[۱] ایضاً رواہ احمد فی مسندہ ص: ۵۳۷ ج: ٦ حدیث: ۲۲۷۹۰۔

لغات:۔ قولہ "بالمعروف" امام راغب رحمہ اللہ المفردات القرآن میں لکھتے ہیں: "والمعروف اسم لکل فعل یُعرف بالعقل او الشرع حسنہ والمنکر ماینکر بھما ۔ قولہ "المنکر" مفردات القرآن میں ہے: "والمنکر کل فعل تَحکُمَ العقول الصحیحۃُ بِقُبحِہ او تتوقف فی استقباحہ واستحسانہ العقول فتحکُم بقبحہ الشریعۃ" یعنی عقل سلیم جس چیز کو غور وخوض سے مستحسن قرار دے اور شریعت اس کا حکم کرے یا کم از کم اجازت دیدے تو وہ معروف ہے اور جو چیز ان دونوں کے نزدیک بالکل نئی اور قبیح ہو وہ منکر ہے یعنی عقل ونقل سے ناشناس۔ یہاں یہ نکتہ بھی قارئین کے فائدے کے لئے لکھا جاتا ہے کہ معروف معرفت سے ہے جو علم سے اخص ہے "کما قال الراغب والعِرفان ادراک الشیئ بتفکر وتدبّر وھو اخص من العلم ویضادہ الإنکار ویقال: فلان یعرف اللّٰہ ولا یقال یعلم اللّٰہ ... ویقال: اللّٰہ یعلم ولا یقال یعرف کذا"۔

تشریح:۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے اسلام کی تین حالتیں ہیں: (۱) حالۃ بلاء وکرب وذالک بمکۃ فی الاولیٰ یعنی ایک حالت وہ تھی جس میں مصائب کی بھر مار تھی وہ مکی دور ہے۔ (۲) پھر مدنی دور آیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قادر ہوئے۔ (۳) ثم ضعف ذالک الی الآن حتی صار فی المعاصی والمظالم کما کان فی الجاھلیۃ الاولیٰ الخ یعنی اس قدرت وطاقت میں پھر کمزوری آتی رہی تا آنکہ دور حاضر میں وہ سب یا کم از کم بہت کچھ ایسا ہی ہونے لگا جیسے زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا۔

قارئین یہ تو اس شخص نے اپنے زمانے کی بات کی ہے جو ۵۴۳ھ میں وفات پاچکے ہیں، آج ہمارا دور وہ زمانہ ہے جس میں قیامت کی آمد بہت ہی قریب ہے کہ علامات صغریٰ سب ظاہر ہو چکی ہیں صرف علامات کبریٰ کا آنا باقی ہے، ان منکرات میں سب سے خطرناک چیزیں تین ہیں اور یہی تین امریکہ ویورپ کے اصل اہداف ہیں (۱) موسیقی عام کرنا۔ (۲) بے پردگی وفحاشی کو فروغ دینا اور ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا بلکہ عزت افزائی کرنا جو اس کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ (۳) سود کو ضرورت بنانا، ان تینوں میں سے ایک پر بھی قابو پانا بظاہر ناممکن لگتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب "عرف شذی" میں فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے مگر اس کے اثر نہ ہونے کے یقین ہو جانے سے ترک جائز ہو جاتا ہے مگر ایسے میں بھی عزیمت یہ ہے کہ اس پر عمل

کیا جائے الا یہ کہ اذیت یا مضرت کا اندیشہ ہو تو پھر چھوڑ دے۔ اس کے ساتھ باب سابق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔

بہر حال اس حدیث میں بطور قضیہ شرطیہ منفصلہ حقیقیہ کے احدالامرین پر حکم لگایا گیا ہے کہ یا تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرو گے یا پھر تم پر عذاب آئے گا نہ تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع ہوں گی اور نہ ہی رفع ہوں گی بلکہ اگر ایک نہ ہوگی تو دوسری ہوگی۔ تدبر

دوسری حدیث:۔ عن حذیفة بن الیمان ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: والذی نفسی بیده لاتقوم الساعة حتی تقتلوا امامکم وتجتلدوا باسیافکم ویرث دُنیاکم اشرارکم"۔ (حسن) [۲]

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم قتل کرلو گے اپنا امام اور یہ کہ تم آپس میں تلواروں سے لڑ پڑو گے اور تمہاری دینا (حکومت وغیرہ) پر تمہارے بدترین لوگ قابض ہو جائیں گے۔

لغات:۔ قوله "تجتلدوا" اِجتلدوا بالسیوف، اس وقت کہا جاتا ہے جب لوگ آپس میں پٹا کھیل رہے ہوں یا تلواروں سے لڑ رہے ہوں۔ قوله "شِرارکم" شریر کی جمع ہے جو شر سے مشتق ہے، شر کے معنی فتنہ وفساد اور بداخلاقی وگناہ کے آتے ہیں، غنڈہ گردی کرنے والے کو بھی شریر کہتے ہیں، اشرار اور اَشِرّ بھی جموع آتی ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث کو بعض شارحین نے سابقہ حدیث کے ساتھ جوڑا ہے کہ دونوں کا ماٰ خذ ایک ہی ہے اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں علی ہذا امام سے مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں مگر حدیث میں چونکہ دو امرین کا ذکر ہے قتل امام اور تسلط اشرار تو پہلا امر اُس زمانے میں آچکا تھا جبکہ اب دوسرے کی آمد آمد ہے۔

مگر عام شارحین کہتے ہیں کہ امام سے مراد سلطان ہے اور یہ واقعہ حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد سے قبل پیش آئے گا یہ توجیہ اس لئے بہتر ہے تا کہ دونوں علامتیں قریب قریب ہو جائیں، تاہم اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ قتل اور حضرت مہدی کی آمد کے درمیان کافی وقفہ ہوگا جس میں اشرار شرارتوں کی انتہاء

---

[۲] رواه ایضاً ابن ماجه ص: ۲۹۳ ابواب الفتن، مسنداحمد ص: ۵۳۷ ج: ۶ حدیث: ۲۲۷۹۱ وفیه: یرث دیارکم شرارکم.

کریں گے، یہ بھی ممکن ہے کہ اشرار کا تسلط مابعد نزول عیسیٰ علیہ السلام ووفاتہ مراد ہو یعنی لوگ اپنا سلطان قتل کریں گے، یہ ایک اہم نشانی ہے پھر زمانہ امن آجائے گا پھر جب وہ دور ختم ہو جائے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو جائے گی تو پھر جو حالت اس دنیا کی ہوگی تو اللہ بچائے، الامان والحفیظ، اس میں انسان نما جانور تخت ودولت پر قابض ہوں گے اور ان ہی پر قیامت قائم ہوگی۔ واللہ اعلم، اس حدیث کو اہل حرمین کے ساتھ جوڑنا افضل ہے۔

بہر حال اس حدیث کو باب ہذا میں لانے کی دو وجہ ہیں: ایک یہ کہ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر معطل ہوگا تو انجام یہ نکلے گا کہ اشرار غالب آجائیں گے، یا مطلب یہ ہے کہ آمرون والناہون اچھے لوگ ہیں مگر جو لوگ آخری زمانے میں تخت وسلطنت کے مالک ہوں گے وہ اچھائی وبھلائی سے محروم ہوں گے کہ وہ تو گناہوں کو فروغ دینے والے ہوں گے نہ کہ منع کرنے والے۔

تیسری حدیث:۔ "عن ام سلمة عن النبی صلی الله علیه وسلم: انه ذکر الجیش الذی یُخسَف بهم فقالت ام سلمة: لَعَلَّ فیهم المُکرَه ؟ قال: اِنهم یُبعَثُونَ علیٰ نِیَّاتهم"۔ [۳] (حسن غریب)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر کا ذکر فرمایا جس کو زمین میں دھنسایا جائے گا پس ام سلمہؓ نے پوچھا شاید ان میں سے کوئی ایسا بھی ہو جسے زبردستی شامل کیا گیا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو اپنی اپنی نیتوں کے مطابق (قبروں سے) اٹھایا جائے گا۔

لغات:۔ قولہ "یبعثون" بعث کے معنی بھیجنے، نیند سے بیدار کرنے، پھیلانے، آزاد کرنے، آمادہ کرنے اور موت کے بعد زندہ کرنے وغیرہ کے آتے ہیں، یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔

تشریح:۔ یعنی ایسے لوگ جو شر پسندوں اور مفسدین کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کئے جاتے ہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تخلف نہیں کر سکتے مثلاً نہ جانے کی صورت میں ان کو نا قابل برداشت تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو ایسے میں اگرچہ قیامت کے دن ان کی نیت معتبر ہوگی یعنی اگر وہ واقعی مجبور تھے اور کسی مسلمان یا مجاہد پر گولی چلانا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی اپنی بندوق کا رُخ عمداً مسلمانوں کی طرف رکھتے بلکہ حتی الامکان ہوا میں گولیاں چلاتے رہے تو وہ نفس شرکت جبری پر ماخوذ نہ ہوں گے تاہم جہاں تک دنیوی عذاب کا تعلق ہے تو وہ سب کو شامل ہوگا "قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا فِتنَةً لاتُصِیبَنَّ الذین ظلموا مِنکم خاصة"۔ (الآیۃ نمبر ۲۵، سورۃ

---

۳ رواہ ایضاً مسلم ص: ۳۸۸ کتاب الفتن، سنن ابن ماجه ابوب الفتن باب: ۳۰.

انفال) یعنی جب مجرموں کی وجہ سے دنیا میں عذاب آتا ہے تو اس میں بچوں سمیت غیر مجرم بھی لپیٹ دیئے جاتے ہیں مگر آخرت میں ہر ایک کا حساب کتاب الگ ہوگا۔

باب ماجاء فی تغییر المنکر بالیداو باللسان او بالقلب

”عن طارق بن شهاب قال اوّل من قدّم الخطبةَ قبل الصلوٰة مروان فقام رجل فقال لِمروان خالفتَ السنة فقال:یافلان اُتُرِكَ ماهناك فقال ابو سعید:اماهذافقد قضی ماعلیه سمعتُ رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم یقول:من رأی منکم منکراًفلیغیّره بیده ومن لم یستطع فبلسانه ومن لم یستطع فبقلبه وذالك اضعف الایمان“۔[1] (حسن صحیح)

حضرت طارق بن شہاب سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جس شخص نے نماز (عید) سے پہلے خطبہ دیا وہ مروان تھے چنانچہ ایک شخص نے اٹھ کر مروان سے کہا:تم نے سنت کی خلاف ورزی کی ہے تو مروان نے کہا اے فلان!وہ (سنت مطلوبہ) چھوڑ دی گئی ہے، پس ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا بلاشبہ اس شخص نے وہ حق ادا کردیا جو اس کے ذمے تھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کرڈالے (یعنی روکے) اور جو اس کی طاقت نہ رکھے وہ اپنی زبان سے روکے اور جو اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ اپنے دل سے (روکنے کا ارادہ رکھے کہ عندالقدرت میں اسے روکوں گا اور یہ تب ہوگا جب فی الوقت اسے) بُرا مانے اور یہ درجہ کمزور ایمان کا ہے۔

تشریح:۔ چونکہ حضرت مروان بالاتفاق تابعی ہیں بلکہ بعض نے تو ان کی صحابیت کا بھی دعوی کیا ہے اور امام بخاریؒ نے ان سے روایات بھی لی ہیں اس لئے ان کے اس جواب اور کلام میں یہ تاویل وتوجیہ ضروری ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ اب لوگ عید کی نماز کے بعد خطبہ نہیں سنتے اور اس میں ہم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں جو واجب اور فرض ہے اس لئے اس کو مقدم کیا تا کہ لوگ سن لیں اور ہماری ذمہ داری پوری ہوجائے گویا یہ ایک اطاعت سے اعلی کی طرف انتقال ہے بالکلیہ ترک نہیں ہے، اگر چہ یہ حیلہ ان کے عمل کے جواز کے لئے کافی نہیں لیکن کلام کی توجیہ کے لئے کافی ہے، اور لوگوں کے نہ سُننے کی وجہ سے استکبار عن الحق نہیں

باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید الخ

[1] الحدیث اخرجه ایضاً مسلم فی الایمان :۷۸، نسائی ایمان باب:۱۷، مسنداحمد ص:۳۹۷ ج:۳ حدیث:۱۰۷۶۶، ایضاً ص:۴۴۷ ج:۳ حدیث:۱۱۰۶۸.

بلکہ بعض بنوامیہ اپنے خطبوں میں اہل بیت پر تنقید کرتے اس لئے لوگ اٹھ کر چلے جاتے۔

اس حدیث پر ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے شرح الخمسین (جامع العلوم والحکم فی شرح خمسین حدیث من جوامع الکلم) میں تفصیل سے بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عدم قدرت کی صورت میں وجوب بالاتفاق ساقط ہوجاتا ہے تاہم پھر بھی جو شخص اس پر عمل کرے تو وہ عزیمت اور باعث فضیلت ہے کیونکہ معذورین اگرچہ ترک عمل سے گناہ گار تو نہیں ہوتے ہیں مگر ان کے مقابلے میں عاملین افضل ہوتے ہیں، اصحاب السبت کو ایک جماعت نے روکا اور دوسری نے وعظ میں تاثیر نہ سمجھ کر سکوت اختیار کیا مگر افضل واعظین تھے، عورتیں اگرچہ ماہواری کے ایام میں نماز پڑھنے سے معذور ہوتی ہیں مگر مردوں کے مقابلے میں ان کو بنابریں ناقصات الدین قرار دیا گیا ہے، پھر عدم استطاعت سے مراد کیا ہے تو وہ لکھتے ہیں کہ جیسے قتل کئے جانے یا کوڑے لگنے یا قید کئے جانے یا مال وغیرہ کا خطرہ لاحق ہو جیسے حکام کے متعلق کوئی منکر ہو تو وہ معذور سمجھا جائے گا جبکہ برا بھلا سننے کی پرواہ نہیں کرے گا ہاں البتہ حکام سے قتال نہیں کرے گا (یعنی کفر بواح سے کم درجے میں) البتہ اگر ہو سکے تو ان کے اقدامات غیر شرعیہ کو ہاتھ سے ختم کردے جیسے شراب کے برتن توڑنا یا آلات موسیقی وغیرہ توڑنا۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ آج کل تو یہ کام یعنی توڑنے والا انفرادی طور پر تقریباً ناممکنات میں سے ہے ہاں کوئی جماعتی شکل میں کرسکے جیسے کوئی مضبوط سیاسی پارٹی کے کارکن ہوں تو وہ الگ بات ہے لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ آج کل جمہوریت کا راج ہے اور اس میں فساق کی زیادہ چلتی ہے لہٰذا ہاتھ سے روکنے کی کوشش شاید کسی بھی جگہ زیادہ نقصان کا باعث بنے، زبان کا حکم بھی وہی ہے جو ہاتھ سے روکنے کا ہے یعنی اگر منکر پر اعتراض کی ہمت نہ ہو بوجہ خطرات کے تو یہ دوسرا درجہ بھی اس کے ذمہ سے ساقط ہوجاتا ہے، اس کے بعد قلبی نفرت کا درجہ رہتا ہے جو ہر مسلمان پر فرض ہے، آج کل اگرچہ بعض منکرات پر بعض مقامات میں تنقید تو ہوسکتی ہے مگر سب کے سب منکرات اور تمام مقامات میں روکنا یا ان پر ٹوکنا ناممکن ہے، کیونکہ عام منکرات اب مقامی نہ رہے بلکہ عالمی بن گئے ہیں۔

شرح الخمسین میں ہے:

"وكذالك روى عن طائفة من الصحابة فى قوله تعالى:"عليكم انفسكم لايضركم من ضل اذا اهتديتم" قالوا لم يأت تأويلها، انما تأويلها فى

آخر الزمان" الخ۔

بہر حال یہ بات اچھی طرح ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ نہی عن المنکر میں نرمی اور شفقت کا عنصر غالب ہونا چاہئے:

"وکان اصحاب ابن مسعودؓ اذا مرّوا بقوم یرون منهم مایکرهون، یقولون: مهلًا رحمکم الله مهلًا رحمکم الله"۔

پھر اجماعی یعنی متفقہ منکرات سے روکنا بقدر طاقت واجب ہے جبکہ اختلافی مسائل میں غلو سے بچنا چاہئے۔(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے شرح الخمسین کی حدیث ص:۳۴)

ہاں اگر وہ اختلاف ضعیف ہو جیسے ربا النقد یا نکاح متعہ وغیرہ تو وہ بھی ان منکرات میں شمار ہوگا جس کی نکارت پر اتفاق ہے، شرح الخمسین میں اس کی مثالیں دینے کے بعد لکھا ہے کہ اگر ایک شخص لفظ واحد کے ساتھ تین طلاقیں دیدے اور کوئی قاضی بغیر نکاح زوج آخر کے رجوع کا حکم دیدے تو وہ فیصلہ نامنظور اور ایسا کرنے والا سزا کا مستحق ہوگا۔

دل سے بُرا سمجھنے کا مطلب:۔ اس حدیث پاک میں منکر کو فقط دل سے نفرت کرنے اور بُرا سمجھنے کو اضعف الایمان کہا ہے اور مسلم وغیرہ کی ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے: "وفیہ: ومن جاهدهم بقلبه فهو مؤمن ولیس وراء ذالك من الایمان حبة خردل"۔

لیکن سوال یہ ہے کہ دل سے روکنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا جواب ایک تمہید پر مبنی ہے، وہ یہ ہے کہ ایمان کی مثال ایک کسوٹی کی سی ہے جب اس پر اچھائی وارد ہوتی ہے تو یہ اسے قبول کرتا ہے اور اس پر خوش و مطمئن ہو جاتا ہے جبکہ بُرائی کو رد و نامنظور کرتا ہے، پیچھے گذرا ہے کہ منکر وہ ہے جو بنظر عقل و نقل بُرا ہو یا عقل کو اس میں توقف ہو اور شریعت اسے ناپسند قرار دیدے مثلاً بعض اشیاء ایسی ہیں جو طبعیت کو پسند ہوتی ہیں جبکہ بعض اشیاء کی قباحت معقول ہوتی ہے مگر بعض میں اخفاء ہوتا ہے ایسے میں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ غیر مشروع چیز کو ناپسند کرے گویا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز طبعی اعتبار سے مرغوب ہو لیکن عقلاً و شرعاً ناپسندیدہ ہو یا عقل کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہو اور شریعت نے اسے ممنوع قرار دیا ہو مثال کے طور پر کسی نے موسیقی کے سُر کے ساتھ سُریلی آواز میں گانا سُنا یا کسی انتہائی خوب صورت لڑکی پر نظر پڑ گئی تو اگر چہ کاملین تو اس چیز کو طبعاً بھی بُرا سمجھتے ہیں مگر عوام یقیناً اس سے محظوظ ہوتے ہیں، ایسے میں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کے عواقب پر نظر ڈالے اور نفس پر پاؤں

رکھ کر اس آواز کو بند کر دے یا اس سے دور چلا جائے اور اپنی نگاہ پست کر دے گو اس میں تکلف کرنا پڑے۔

اس تمہید کے بعد سمجھنا چاہئے کہ مؤمن کو اچھے بُرے کی تمیز کرنا لازمی ہے، بُرائی بظاہر کتنی ہی اچھی لگے اور طبعیت کو کتنی ہی پسند ہو لیکن بنظر عقل و شرع اس کو بُرا جاننا ضروری ہے اس کے بعد اس سے خود بچنا چاہئے اور دوسروں کو بچانا چاہئے لیکن اگر وہ دوسروں کو نہیں بچا سکتا تو کم از کم خود تو بچے، اور اگر کوئی مجبوری ایسی ہے کہ وہ عملی طور پر خود بھی نہیں بچ سکتا مثلاً کسی کا پڑوسی اونچی آواز میں گانے سننے کا شوقین ہے اور اس کی آواز دوسرے گھروں تک بھی پہنچ جاتی ہے اور روکنے کی قدرت نہیں اور ہجرت کی استطاعت نہیں تو کم از کم اس عمل کو بُرا ماننا ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے، اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

شرح عقائد مع المتن میں ہے:

"ویجوز العقاب علی الصغیرة والعفو عن الکبیرة اذا لم تکن عن استحلال، والاستحلال کفر لما فیه من التکذیب المنافی للتصدیق" الخ۔ (ص:۸۷، مکتبہ علوم اسلامیہ پشاور)

خلاصہ یہ ہوا کہ دل سے بُرا سمجھنا باعتبار عقل و نقل ہے نہ کہ طبعاً اور یہ کہ اسے ممنوع سمجھے، جائز و حلال نہ سمجھے۔

باب منه

"عن النعمان بن بشیر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: مَثَلُ القائم علی حدود الله والمُدهِن فیها کمثل قوم استهموا علی سفینة فی البحر فاصاب بعضهم اعلاها واصاب بعضهم اسفلها فکان الذین فی اسفلها یصعدون فیستقون الماء فَیَصُبُّونَ علی الذین فی اعلاها فقال الذین فی اعلاها: لانَدَعُکم تصعدون فتؤذوننا فقال الذین فی اسفلها فاننا ننقبها فی اسفلها فنستقی فان اخذوا علی ایدیهم فمنعوهم نجوا جمیعاً وان ترکوهم غرِقوا جمیعاً"۔[1] (حسن صحیح)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی حدود کی پابندی کرنے والے اور ان میں کوتاہی کرنے والے کی مثال ان لوگوں کی حالت کی مانند ہے جنہوں نے ایک سمندری کشتی میں بیٹھنے کے لئے قرعہ اندازی کی پس بعض کو اس کا بالائی حصہ (منزل)

باب منه

[1] روی بمعناه البخاری ص: ۳۳۹ ج: ۱ کتاب الشرکة، وص: ۳۶۹ ج: ۱ کتاب الشهادات، مسند احمد ص: ۳۳۴ ج: ۵ حدیث: ۱۷۸۹۶ و ۱۷۹۰۴، ۱۷۹۴۴۔

ملا اور بعض کو نچلی منزل ملی، پس وہ لوگ جو نچلی منزل میں ہیں بالائی منزل پر چڑھ کر پانی لاتے ہیں تو وہ ان لوگوں پر جو اوپر کی منزل میں ہیں پر پانی گراتے ہیں تو اوپر والوں نے کہا کہ ہم آپ کو اوپر چڑھنے اور ہمیں اذیت دینے نہیں دیں گے تو اس کے تحتانی حصے والوں نے جواب دیا کہ پھر ہم اس کی نچلی منزل میں سوراخ کر دیتے ہیں اور وہیں سے پانی لیں گے، پس اگر انہوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور ان کو روکا تو سب بچ جائیں گے لیکن اگر انہوں نے ان کو چھوڑا تو سب کے سب ڈوب جائیں گے۔

لغات: قولہ "القائم علی حدود اللہ" حد کی جمع ہے، لغت واصطلاح دونوں میں اس کے بہت سے معانی آتے ہیں مثلاً حدِ منطقی، حدِ حکمی اور حدِ عرفی، یہاں حد شرعی مراد ہے یعنی وہ احکام جن کو اللہ نے اوامر ونواہی کے ذریعہ مقرر کیا ہے ان پر قائم کے معنی پابندی کرنے اور تحفظ کرنے کے ہیں۔ قولہ "المدھن" اس کو مداھن بالالف بھی کہتے ہیں، دونوں اسم فاعل کے صیغے ہیں، یہ لفظ گویا دہن بمعنی تیل سے مشتق ہے، مداہنت حق پوشی اور چاپلوسی کو کہتے ہیں یعنی منکر کو دیکھ کر باوجود قدرت کے نہ روکنے والا، گویا اس نے باطل پر خاموشی اختیار کر کے اس پر جواز کا تیل لگا کر اس کو چمکیلا بنانے کی کوشش کی ہے۔ قولہ "استھموا" یعنی قرعہ اندازی کے ذریعے اس میں بیٹھنے کی نشستیں اور منزلیں تقسیم کیں۔ قولہ "یصعدون" بفتح الیاء صعود سے بمعنی چڑھنے کے ہے جبکہ اِصعاد باب افعال سے، ہموار زمین میں چلنے کو کہتے ہیں: ففی الایۃ الکریمۃ "اذ تُصعدون" الخ [۲] بضم التاء ہے، تدبر۔ قولہ "فیستقون" "استقیٰ فلاناً کسی سے پانی یا سیرابی چاہنا۔ قولہ "فیصُبّون" علی کا صلہ میں آنے کی وجہ سے متعدی کا ترجمہ کیا ہے۔

تشریح: اس حدیث مبارک میں ایک مثال کے ذریعہ آگاہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ بُرائی کے مرتکب ہونے والوں کے ہاتھ نہیں پکڑتے اور ان کو اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل سے باز نہیں رکھتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ جانیں اور ان کا کام جانے کیونکہ جب ان پر عذاب آئے گا تو وہ سب کو تباہ کر کے رکھ دے گا جیسے مذکورہ بالا مثال میں اگر بالائی منزل والے تحتانی منزل والوں کو نقب اور سوراخ سے نہیں روکیں گے تو کشتی میں پانی داخل ہو جائے گا اور اس طرح اوپر نیچے جتنے سوار لوگ ہیں سب غرق آب ہو جائیں گے۔

غرض دین اسلام کی مثال ایک کشتی کی طرح ہے اس میں سب لوگ بیٹھے ہوتے ہیں مگر اس کی حفاظت

[۲] سورۃ آل عمران آیت: ۱۵۳.

اس سے مشروط ہے کہ کشتی میں نقب وسوراخ نہ کیا جائے ورنہ سب غرق ہوں گے لہٰذا منکرات سے اہل اسلام کی زندگیوں کو خطرہ ہے عقلمندی کا تقاضا ہے کہ اگر قدرت ہو تو انہیں روکا جائے۔

باب افضل الجهاد كلمة عدل عندسلطان جائر

"عن ابی سعيدالخدری ان النبی صلى الله عليه وسلم قال:ان من اعظم الجهاد كلمة عدل عندسلطان جائر".[1] (حسن غريب)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا بڑا جہاد ہے۔

لغات:۔قولہ "من اعظم" ایک روایت میں "افضل" کا لفظ ہے۔[2] قولہ "كلمة عدل" ایک روایت[3] میں لفظ "كلمة حق" آیا ہے لہٰذا عدل سے مراد حق ہے۔قولہ "جائر" جور سے بمعنی ظلم کے ہے۔

تشریح:۔ظالم بادشاہ کے سامنے حق گوئی کو افضل جہاد اس لئے قرار دیا کہ ایسا کرنے والا میدان جنگ کے مجاہد سے زیادہ نڈر اور دلیر ہوتا ہے کیونکہ مجاہد کے شہید ہونے اور نہ ہونے کے دونوں امکانات ہوتے ہیں جبکہ اس کا بچنا بظاہر مستبعد لگتا ہے، اور اگر اس کی بات پر عمل کرتا ہوا سلطان جائر ظلم سے باز آجائے تو بھی اس کا بڑا فائدہ ہوگا جو مسلمانوں کو نقد ملے گا۔

باب سوال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثاً فی امته

"عن عبدالله بن خَبّابِ بن الاَرَتِّ عن ابيه قال:صلّىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوٰةً فاَطَالَهافقالوا:يارسول اللّٰه اصليتَ صلوٰة لم تكن تُصليهاقال اَجَل انهاصلوٰة رغبةٍ ورهبةٍ انى سئلتُ اللّٰه فيهاثلاثاًفاعطانى اثنتين ومنعنى واحدةسألته ان لايُهلِكَ امتى بسنةٍ فاَعطانيهاو سأَلته ان لايُسَلِّط عليهم عدواً من غيرهم فاعطانيها و سالته ان لايُذِيق بعضهم بأس

باب افضل الجهاد كلمة عدل عندسلطان جائر

[1] رواه ابن ماجه ص: ۲۸۹ ابواب الفتن وفيه: افضل الجهاد كلمة عدل الخ مسنداحمد ص: ۳۴۲ ج: ۲.

[2] كذا فى رواية ابن ماجه حواله بالا.

[3] كذا فى رواية مسنداحمد ص: ۳۳۴ ج: ۲ حديث: ۲۱۲۵۴.

بعض فَمَنَعَنِيها"۔[1] (حسن صحيح)

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز پڑھائی تو اسے طویل فرمایا پس صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ نے ایسی نماز پڑھائی جو پہلے اس طرح آپ نہیں پڑھاتے؟ فرمایا جی ہاں یہ امید وبیم کی نماز تھی کہ میں نے اس میں اللہ سے تین چیزیں مانگی تھیں دوتو مجھ کوعطا کردیں اور تیسری منع کردی، میں نے اللہ سے سوال کیا کہ میری امت کو (عام) قحط (خشک سالی) سے ہلاک نہ فرما تو اللہ نے قبول فرمایا اور میں نے اس سے یہ بھی سوال کیا کہ مسلّط نہ کیجئے ان پر ان کے علاوہ کوئی (بیرونی) دشمن تو اللہ نے اس کو بھی شرف قبولیت بخشا اور میں نے اللہ سے یہ بھی دعا مانگی کہ ان کو ایک دوسرے کے جھگڑے نہ چکھائے تو یہ منظور نہ ہوئی۔

مختصر تشریح:۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے اس مرتبہ اتنی لمبی نماز پڑھائی جو آپ کی سابقہ عادۃ شریفہ سے مختلف لگتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ رغبت ورہبت یعنی امید ورجا اور خوف واندیشے کی نماز تھی، امید دعاء کی قبولیت کی تھی اور خوف عدم قبولیت کا تھا مطلب یہ ہے کہ عام نمازوں میں دعاؤں کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا تھا جبکہ اس نماز میں اللہ عزوجل سے امت کے لئے تین دعائیں مانگیں جن میں دوتو قبول ہوگئیں مگر ایک قبول نہ ہوئی جس کی وجہ اگلی روایت میں آرہی ہے کہ ازل میں یہ مقدر ومقرر ٹھہرا تھا کہ اس امت مرحومہ میں آپس کے جھگڑے اور مصائب ہوں گے، جس میں اللہ عزوجل کی کوئی حکمت ہوگی جو بظاہر واللہ اعلم یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان میں باہمی جھگڑے نہ ہوتے تو پھر اسلام ہمیشہ غالب رہتا حالانکہ اللہ نے قیامت کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا ہے جس سے وہ مؤخر نہیں ہوگی اور اس کی آمد ہر خیر کے فنا ہونے پر موقوف ہے لہٰذا آپس کے جھگڑوں اور منکرات کے فروغ سے خیر میں کمی آتی رہے گی یہاں تک کہ ایمان پر چلنا دشوار ہوجائے گا اور منکرات کا راج قائم ہوگا اس طرح ہر شخص ایمان سے بھاگے گا حتی کہ جب ایک بھی مؤمن نہیں بچے گا تو ان انسان نما جانور صفت لوگوں پر قیامت قائم ہوجائے گی۔

دوسری حدیث:۔ "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:ان اللہ زَوَىٰ لي الارض

باب سوال النبی ﷺ ثلاثاً فی امته

[1] ایضاً روی ابن ماجه ص: ۲۸۳ "باب مایکون من الفتن" ابواب الفتن روی بمعناه احمد فی مسنده ص: ۶۱۳ ج: ۳ حدیث: ۱۲۰۷۷.

فرأیت مشارقها ومغاربها وان امتی سیبلغ ملکها ما زُوِیَ لی منها واُعطیت الکنزین الاحمرَ والابیضَ وانی سألتُ ربی لِاُمتی ان لایهلکها بسنة عامة وان لایسلط علیها عدوّاً من سِوی انفسهم فیستبیح بیضتهم وان ربی قال: یامحمد! انی اذاقضیتُ قضاءً فانه لایُرَدُّ وانی اَعطیتُكَ لِاُمتِكَ ان لااُهلکهم بسنةِ عامة ولااُسَلِّطُ علیهم عدوّاً من سِویٰ انفسهم فیستبیح بیضتَهم ولواجتمع علیهم من باقطارها اوقال: من بین اقطارها حتیٰ یکون بعضُهم یُهلِكُ بعضاً ویسبِی بعضُهم بعضاً"۔ [۲]

(هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ بے شک اللہ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا پس میں نے اس کے مشرقی ومغربی حصوں کو دیکھ لیا اور بلاشبہ میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں تک پھیلے گی جو میرے لئے لپیٹ دیئے گئے تھے، اور یہ کہ مجھے دو خزانے سرخ وسپید کے دیئے گئے اور یہ کہ میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے سوال کیا کہ وہ میری امت کو عام قحط سالی سے ہلاک نہ فرمائیں اور ان کے سوای کوئی (بیرونی) دشمن ان پر مسلط نہ کریں جو ان کی مرکزیت (جماعت) کو تباہ کردیں، اور بے شک میرے رب نے فرمایا اے محمد! میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو وہ رد نہیں کیا جاسکتا تحقیق میں تجھے اطمینان دلاتا ہوں تیری امت کے حق میں کہ نہ تو میں ان کو عام قحط کے ذریعہ ہلاک کروں گا اور نہ ہی ان پر ان کے علاوہ کوئی (بیرونی) ایسا دشمن مسلط کروں گا جو ان کی اجتماعیت کو منتشر کرے اگر چہ وہ سب لوگ ان کے خلاف اکھٹے ہوجائیں جو زمین کے (چاروں طرف) کناروں پر رہتے ہیں یا فرمایا کہ اطراف وکناروں کے اندر جو لوگ رہتے ہیں، تا آنکہ یہ لوگ خود ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قید کریں گے۔

لغات: قولہ "زَوَیٰ" "زویت کے معنی سمیٹنے اور لپیٹنے کے ہیں بظاہر یہاں سکیڑ نا مراد نہیں بلکہ دکھانا مراد ہے، اس کی ایک صورت اگر چہ یہ ہوسکتی ہے کہ زمین کو سکیڑ دیا گیا ہو مگر دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جو یہاں بظاہر مراد ہے کہ نظر میں حدّت وقوت پیدا کردی گئی یہاں تک کہ وہ پوری زمین یا مفتوحہ علاقوں تک پہنچ گئی یا اس زمین کی شبیہ دکھادی گئی ہو جیسے آج کل کے آلات سے نظر آتی ہے، راقم نے "شعاعی تصویر کی حقیقت

---

[۲] ایضاً رواه ابن ماجه حواله بالا، رواه مسلم فی الفتن حدیث: ۱۹، سنن ابی داؤد ص: ۲۳۳ ج: ۲ کتاب الفتن والملاحم.

اور شرعی حیثیت'' میں نظر کے اصول اور آپ علیہ السلام کی نظر کی قوت تحریر کی ہے، فمن شاء الاطلاع فلیراجع۔

قولہ "ما زوی لی منھا" اگر ''من'' کو تبعیض کے لئے مانا جائے تو ترجمہ یہ ہوگا کہ زمین میں سے جتنے حصے اور ممالک مجھے دکھادیئے گئے تھے ان سب پر میری امت کا قبضہ ہوجائے گا جیسے مشاہدہ ہے، اور اگر ''من'' کو تفصیل کے لئے لیا جائے تو پھر ترجمہ یوں ہوگا کہ زمین کے جتنے حصے جو کہ پوری زمین پر مشتمل ہیں مجھے دکھائے گئے ان سب پر میری امت کی حکومت قائم ہوگی تو پھر یہ حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگا۔

قولہ "الکنزین الاحمر والابیض" دونوں کنزین سے بدلین ہیں اس لئے منصوب پڑھے جائیں گے، یہ ذکر خاص بعد العام ہے کیونکہ جب مفتوحہ علاقوں پر قبضہ ہوگیا تو کنزین پر بھی ہوگیا مگر اہمیت کے پیش نظر اور اظہار معجزہ کے لئے ارشاد فرمایا کہ روم اور فارس اور ان کے خزانوں پر بھی ہمارا جھنڈا لہرائے گا، احمر سے مراد سونا ہے جو سرخ رنگ والے رومیوں کا سکہ تھا جبکہ ابیض سے مراد چاندی ہے جو فارسی النسل سفید رنگ کے حامل لوگوں کی کرنسی تھی۔ قولہ "فیستبیح بیضتھم" بیضہ سے لغوی معنی انڈا مراد نہیں بلکہ اجتماعیت ہے کیونکہ جب انڈا ٹوٹ جاتا ہے تو اس کے اندر سب کچھ بے معنی سا ہوجاتا ہے اسی طرح جب کسی قوم وملت کی مرکزیت واجتماعیت منتشر کردی جاتی ہے تو اس کے بعد ان کے اثرات ختم ہوجاتے ہیں، بعض حضرات نے بیضہ کو خود سے کنایہ بنایا ہے جو بمعنی عسکری طاقت کے ہے، جو حکومت کے لوازمات میں سے ہے تو جب فوجی طاقت نہیں رہتی تو حکومت بھی نہیں بچتی۔ قولہ "اقطارھا" قطر کی جمع ہے بمعنی طرف وکنارہ کے۔ قولہ "او قال" او شک من الراوی کے اظہار کے لئے ہے۔

تشریح:۔ یہ حدیث آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک ہے کیونکہ اس میں جو پیش گوئی آج سے تقریباً چودہ سو بیس سال پہلے کی گئی وہ اس پورے عرصہ میں واقعہ کے عین مطابق رہی ہے کہ ہر دور میں کفار نے انفرادی وجماعتی اور بین الاقوامی سطح پر طرح طرح کی بارہا کوششیں کی ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کا استباحہ کریں یعنی ان کو جڑ سے اُکھاڑ دیں مگر تادم تحریر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اگر کسی محاذ پر ان کو اہل اسلام کے گناہوں کی وجہ سے کامیابی مل جاتی ہے تو کسی اور جگہ مسلمانوں کو غلبہ حاصل رہتا ہے جب مسلمانوں میں صلاح اور وحدت تھی تب تو کفار ان کے سامنے ہیچ تھے مگر جب گناہوں کو فروغ ملا تب بھی حالت یہ ہے کہ افغانستان پر اس وقت بیالیس ملکوں کے فوجی جن کی تعداد ہزاروں میں ہے سابقہ اسلامی حکومت کے

خلاف مصروف عمل ہیں اور تقریباً نوسال سے ان کو کوئی کامیابی نہیں مل رہی ہے بلکہ الٹا نقصان غیر ملکی افواج کو اُٹھانا پڑ رہا ہے اگر بالفرض وہ کامیاب بھی ہو جاتی ہیں تو اللہ عزوجل اس کے بدلے مسلمانوں کو کہیں اور غلبہ عطا فرمادیں گے۔ وماذالک علی اللہ بعزیز

باب ماجاء فی الرجل یکون فی الفتنة

عن ام مالك البهزيّة قالت: ذكر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فتنةً فقرّبَهَا قالت: قلت: يارسول اللّٰه! من خيرالناس فيها؟ قال: رجل في ماشيته يُؤدِّي حقها ويَعبُدُ ربَّه ورجل اخذٌ برأس فرسه يخيف العدوّ ويُخوِّفُونه"۔[1] (غريب من هذاالوجه)

حضرت ام مالک بہزیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فتنے کا تذکرہ فرمایا اور اسے (ہمارے خیال میں) بہت قریب کر دیا، فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس میں لوگوں میں سے کون بہتر ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جو اپنے مویشی کے ساتھ (دور افتادہ جنگل میں) ہو وہ ان جانوروں میں سے حق (واجبی) ادا کرتا ہو اور اپنے رب کی عبادت میں مصروف ہو اور وہ شخص (بھی بہتر ہے) جو اپنے گھوڑے کا سر (لگام) پکڑے ہوئے ہو کبھی وہ شخص دشمن کو ڈرائے اور کبھی دشمن اس کو ڈرائیں۔

لغات:۔قولہ "فقرّبها" باب تفعیل سے بتشدید الراء ہے قریب لانے کو کہتے ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر ایسے بلیغانہ انداز سے فرمایا کہ سامعین کو وہ بہت قریب آنے والا محسوس ہوا جیسا کہ قوت واہمہ وخیالی کا تقاضا ہے۔ قولہ "فی ماشیتہ" اگر چہ اس کا اطلاق مطلق مویشیوں پر ہوتا ہے مگر بخاری شریف وغیرہ کی روایات میں غنم کی تصریح ہے لہٰذا یہاں بھی بھیڑ، بکریاں مراد ہیں کیونکہ ان کے پالنے میں مؤنت کم اور منفعت زیادہ ہے ان میں لباس بھی ہے اور طعام بھی اور آدمی جہاں جانا چاہے اپنے ہمراہ لے جا سکتا ہے۔ قولہ "یخیف العدوّ الخ" یعنی وہ جہاد میں مصروف عمل رہے جو کبھی دشمن پر غالب رہتا ہے اور کبھی دشمن اس پر غالب آجاتا ہے، یا نفس سرحدات کی پہرا داری مراد ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یکون فی الفتنة

[1] روى بمعناه احمد فى مسنده ص: ۵۶۹ ج: ۷ حديث: ۲۶۸۰۷۔

تشریح:۔اس فتنے سے کیا مراد ہے؟ تو اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ باہمی جھگڑے مراد ہوں۔ دوم یہ کہ منکرات کا ہنگامہ مراد ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں بیک وقت مراد ہوں کیونکہ جیسے جیسے عہد پاک سے دوری آتی رہتی ہے تو ان برکات میں کمی آتی رہتی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میمون اور بعد کے صلحاء کی وجہ سے تھیں حتی کہ ان اثرات کی کمی کے تناسب سے باہمی لڑائیوں اور منکرات کی رفتار میں اضافہ آتا رہتا ہے جو بالآخر رات کی تاریکی کی طرح چھا جائیں گے یا ایسی صورت حال میں لوگوں کو چھوڑ کر اپنا دین بچانا اہم عمل ہوگا خواہ جنگل میں پناہ گزین بن کر یا محاذ جنگ میں مجاہد بن کر ہو، کیونکہ اس میں لوگوں کی ہمنشینی ایمان کے لئے خطرناک ہوگی اور عزلت نشینی وعلیحدگی دین کی حفاظت کی واحد راہ ہوگی چنانچہ امام بخاریؒ نے کتاب الایمان اور بدأ الخلق میں اس کے لئے مستقل باب قائم کئے ہیں:

"بـاب مِـن الدين الفِرارمن الفتن" وفيه... يوشك ان يكون خيرمال المسلم غنم يتّبع بهاشَعَفَ الجبال و مواضع القَطرِ يفرُّ بدينه من الفتن"۔ [۲] (ص:۷ ج:۱)

رہبانیت اور عزلت نشینی میں فرق:۔بظاہر یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث سے تنہائی کی ترغیب معلوم ہوتی ہے حالانکہ تنہائی جس کا دوسرا نام رہبانیت ہے نصوص کی رُو سے مذموم معلوم ہوتی ہے قال اللّٰہ تعالیٰ: "ورهبانية نِ ابتدعوهاماكتبنٰهاعليهم الّاابتغآء رضوان اللّٰه فمارعوهاحق رعايتها"۔ (الحدید آیت نمبر:۲۷)

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ رہبانیت مذموم ہے لیکن باب کی حدیث میں جس مقصد کی طرف اشارہ ہے اس تنہائی کو اختیار کرنے اور نصاریٰ کی رہبانیت میں فرق ہے۔نصاریٰ نے جو رہبانیت اختیار کرلی تھی وہ مقصد اعلیٰ کو چھوڑ کر بلا کسی مجبوری کے اپنائی گئی تھی جو خلافِ فطرت اور خلافِ شریعت ہے، فطرت کے خلاف تو اس لئے ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے باقی جانداروں کی طرح انسان میں تناسل وتوالد کی نہ صرف صلاحیت ودیعت فرمائی ہے بلکہ اس کے شدید جذبات بھی اس کے اندر رکھے ہیں تو نہ تو آدمی ان جذبات کو ہمیشہ کے لئے دبا سکتا ہے اور نہ ہی رہبانیت کی صورت میں نوع انسانی کی بقاء ہوسکتی ہے پس ایسی رہبانیت بالآخر پلٹ کر فساد معاشرے کا سبب بنتی ہے کیونکہ راہب پر جب قوت شہوانیہ کا غلبہ ہوجاتا ہے تو وہ اندھا بن کر حلال وحرام کی تمیز سے بے نیاز ہوکر وہی کرتا ہے جو نصاریٰ کے راہبوں نے راہباؤں کے ساتھ کیا کہ گرجوں کی جھاڑیوں

---

۲ ايضاً صحيح بخارى ص:۴۶۶ ج:۱ "باب خير مال المسلم غنم الخ" كتاب بداء الخلق.

میں جابجانا جائز نومولود بچے ملا کرتے تھے۔ اور خلاف شریعت اس لئے ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کو لے کر لوگوں میں پھیلانا اور خود بھی ان پر عمل کرنا اور دوسروں سے بھی ان پر عمل کرانا انسانی زندگی کا بنیادی مقصد ہے جو معاشرے میں رہ کر ہی ممکن ہے، نیز جس طرح دوسروں پر عمل کی محنت ضروری ہے تو اسی طرح شادی کر کے بچے جنوانا بھی اس نیک سلسلے کی اہم کڑی ہے تا کہ ان کی صحیح پرورش کر کے دوسروں کے لئے راہنما بنایا جاسکے، یہ کام بھی معاشرتی وتمدنی زندگی میں ممکن ہے علاوہ ازیں نوعی منفعت شخصی فائدے پر مقدم ہے لہٰذا خود کو لوگوں سے دور رکھ کر صرف اپنی ہی خدمت میں لگا رہنا معیوب ہے۔

لیکن اگر یہ مقاصد فوت ہو جائیں اور معاشرہ اتنا بگڑ جائے کہ انسانیت کا نصب العین ہی تباہ ہو جائے اور صورت حال اس طرح بن جائے کہ معاشرہ میں رہتے ہوئے اس کے وجود سے کسی کو کوئی دینی فائدہ نہ ہو بلکہ الٹا اس کے دین کو ضرر پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو تو ایسے میں اگر نوعی فائدہ یکسر ختم ہوا اور انفرادی وشخصی فائدے کو بھی داؤ پر لگایا جائے تو یہ شرع شریف میں کوئی کمال یا محمود وممدوح نہیں بلکہ اس حدیث کے مطابق لوگوں سے بقدر ضرورت علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے یعنی یا محدود وقت کے لئے جیسے آپ علیہ السلام کا غار حراء میں قیام کرنا تھا یا مستقل طور پر جیسے اصحاب کہف نے کیا تھا اور آیت کریمہ میں نصاریٰ کی رہبانیت کی جو مذمت کی گئی ہے تو اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے لئے حالات نامساعد نہ تھے بلکہ یہ لوگ نارمل حالات میں اللہ کی رضا جنگلوں اور رہبانیت میں تلاش کرتے تھے جو سراسر غلط فہمی تھی اور پھر جو طریقہ انہوں نے خود ایجاد کیا تھا اس کا حق بھی ادا نہیں کیا۔

رہا یہ مسئلہ کہ عزلت نشینی فطرت اور حکمت الٰہی کے منافی ہے تو یہ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ محض عبث لوگوں کو جنوانا بایں طور کہ ساری دنیا مہمل لوگوں سے بھر جائے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے کیونکہ فرض یہ کیا گیا ہے کہ معاشرہ اپنی برائی کے آخری کنارے کو چھو رہا ہو تو اس میں اگر بچے پیدا بھی ہوں تو وہ بھی ماحول کے رنگ میں رنگے جائیں گے اس لئے جہنم کا ایندھن بڑھانے کے بجائے بچوں کی پیداوار کے اقدامات سے دور رہنا ہی منشأ الٰہی کے مطابق ہونا چاہئے، اور جہاں تک جذبات کو قابو کرنے کا تعلق ہے تو یہ بھی کوئی ناقابل عمل مسئلہ نہیں ہے کیونکہ جو لوگ شادی کرنے پر قادر نہ ہوں ان کے لئے ریاضتیں اور روزے ہیں، بگڑے ہوئے معاشرے کی عورتوں سے شادی کی اگر چہ بظاہر مالی قدرت ممکن ہے مگر اخلاقی جواز ختم ہو جاتا ہے جس سے قدرتِ حکمی کی نفی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ اس کی کچھ تفصیل "باب النہی عن

التبتل'' میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص:۴۲۱ ج:۴)

باب کی دوسری حدیث:۔ "عن عبداللّٰہ بن عمرو قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:تکون الفتنة تستنظف العربَ قتلاھافی النار اللسان فیھااشدمن السیف"۔ [۳] (غریب)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ایک فتنہ ہوگا جو عربوں کو گھیر لے گا اس میں مارے جانے والے جہنم میں ہوں گے، زبان اس میں تلوار سے زیادہ خطرناک ہوگی۔

قولہ "تستنظف" بمعنی تستوعب گھیر لے گا، استنظاف کے معنی کسی چیز کو پورا لینے کو بھی کہتے ہیں اور صاف ستھری لینے کو بھی کہتے ہیں جو نظافت سے ہے علی ہذا مطلب یہ ہوگا کہ عربوں کو صاف کردے گا یعنی اچھے بُرے کی تمیز کردے گا۔ قولہ "قتلاھا" قتلا جمع قتیل کی بمعنی مقتول ہے۔ قولہ "فی النار" ای ستکون فی النار کیونکہ ان کا یہ عمل دخول نار کا موجب اور سبب ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہیں ہے۔

تشریح:۔ بعض محشین وشارحین کی رائے میں اس فتنے سے مراد جنگ صفین یعنی حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان ہونے والی لڑائی ہے، مگر اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں اکثریت صحابہ کی تھی تو "قتلاھافی النار" کا کیا مطلب ہے پھر اس کی توجیہات پیش کی گئی ہیں کہ یہ حکم زجر وتغلیظ پر محمول ہے یا مذکورہ حکم خاصیۃ العمل کے قبیل سے ہے یا یہ حکم صرف ان کا ہے جو اس لڑائی میں مارا جائے بچ جانے والوں کا نہیں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن راجح قول یہ ہے کہ اس حدیث میں کوئی اشارہ نہیں کہ یہ صحابہ کرامؓ کے مابین کسی لڑائی کے بارے میں پیش گوئی ہے بلکہ یہ غیر متعین زمانے میں پیش آنے والی کسی لڑائی کا ذکر ہے جس میں مسلمان باہم لڑ پڑیں گے چونکہ ان کے قتل وقتال کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ نہیں ہوگا بلکہ مال وجاہ اور عصبیت وقومیت ہوگی اس لئے وہ مذموم مقصد میں مرنے کی وجہ سے دوزخی ہوں گے، تاہم حدیث میں خلود کا کوئی ذکر یا اشارہ نہیں ہے۔

بہرحال اگر یہ صحابہ کرامؓ کے مابین لڑائی پر محمول کی جائے تو پھر اس میں زبان کو تلوار سے زیادہ سخت

---

[۳] ایضاً رواہ ابوداؤد ص:۲۳۶ ج:۲ "باب فی کف اللسان" کتاب الفتن والملاحم، سنن ابن ماجه ص:۲۸۵ "باب کف اللسان فی الفتنة" ابواب الفتن، مسنداحمد ص:۴۲۸ ج:۲ حدیث:۱۹۴۱، جمع الفوائد ص:۵۵۳ ج:۲ کتاب الفتن۔

کہنے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ دورانِ جنگ لڑائی کو ہوا دینا اور جنگ کو بھڑکانا جنگ کرنے سے زیادہ بُرا ہے اور بعد میں صحابہ کرامؓ پر لعن وطعن کرنا ایمان کا صفایا کردینے کے مترادف ہے اس لئے شرح عقائد میں ہے:

"ویکف عن ذکر الصحابةؓ اِلا بخیر لماورد من الاحادیث الصحیحة فی مناقبهم ووجوب الکف عن الطعن فیهم کقوله علیه السلام: لاتسبوا اصحابی فلو ان احدکم ان اَنفق مثل احدذهبا مابلغ مُدَّاَحَدِهم ولانصیفه.... الی ان قال.... وماوقع بینهم من المنازعات والمحاربات فله محامل وتاویلات فسبّهم والطعن فیهم ان کان ممایخالف الادلة القطعیة فکفر کقذف عائشةؓ والافبدعة وفسق" الخ۔ (ص:۱۱۶)

محشی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول نقل کیا ہے: "تلك دماء طَهَّرَاللّٰه منها ایدینا فلانُلَوِّث السنتنا بها"۔

غرض اہل سنت والجماعت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے مشاجرات ومنازعات میں گفت وشنید جائز نہیں۔

اور اگر یہ حدیث کسی اور لڑائی کی طرف مشیر ہو تو پھر کسی تاویل کی ضرورت نہیں اور اس میں زبان کی تاثیر کو اثرِ شمشیر سے زیادہ سخت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے جنگ کو ہوا دینا مسلمانوں کے قتل عام کا موجب بنے گا جبکہ تلوار سے آدمی زیادہ لوگوں کو قتل نہیں کرسکتا ہے۔

باب ماجاء فی رفع الامانة

"عن حذیفة قال ثنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم حدیثین قدرأیتُ احدهما وانا انتظر الآخر، حدثنا الامانة نزلت فی جذرقلوب الرجال ثم نزل القرآن فعلموا من القرآن وعلموا من السنة"۔

ثم حدثنا عن رفع الامانة فقال: ینام الرجل النومة فتُقبَضُ الامانة من قلبه فیَظَلُّ اثرها مثل الوَکت، ثم ینام نومة فتقبض الامانة فیَظَلُّ اثرها مثل اثر المجل کجمر دحرجته علی رِجلكَ فَنَفِطت فتراه مُنتَبِراًولیس فیه شیٔ ثم اخذ حصاة فدَحرَجَها علی رِجله قال فیصبح الناس یتبایعون

لایکاد اَحَدٌ یؤدِّی الامانة حتیٰ یقال ان فی بنی فلان رجلاامیناًوحتی یقال للرجل:ماأجلدَه واَظرَفه واعقله ومافی قلبه مثقال حَبَّةٍ من خردل من ایمان،قال ولقداَتیٰ عَلَیَّ زمان وماابالی اَیُّکم بایعتُ فیه لئن کان مسلماًلَیَرُدَّنّه عَلَیَّ دِینُه وَلَئِن کا ن یهودیاًاو نصرانیاًلَیَرُدَّنّه عَلَیَّ ساعیه فاماالیوم فماکنتُ ابایع منکم اِلافلاناًوفلاناً"۔[1] (هذاحدیث حسن صحیح)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے دوحدیثیں بیان فرمائی ہیں: ان میں سے ایک تو میں نے دیکھ لی ہے (یعنی ایک کا مضمون آچکا ہے) اور دوسری (کے مصداق) کا میں انتظار کررہا ہوں (۱) آپ علیہ السلام نے ہم سے کہا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی تہ میں نازل ہوئی، پھر قرآن نازل ہوا پس لوگوں نے قرآن میں سے سیکھا اور سنت میں سے سیکھا۔ (۲) پھر آپ علیہ السلام نے ہم سے رفع امانت کے بارے میں بیان فرمایا (یہ وہ دوسری حدیث شروع ہوئی) پس آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک آدمی سوئے گا تھوڑا سا تو امانت اس کے دل سے لے لی جائے گی تو اس (امانت کی جگہ خیانت لے لی گی جس) کا اثر ہلکے نشان (دھبے) کی مانند رہ جائے گا، وہ پھر دوسری بار سوئے گا تو امانت لے لی جائے گی پس رہ جائے گا اس کا منفی اثر آبلہ کی طرح (یعنی ایسا ہی) جیسے تم اپنے پاؤں پر چنگاری لڑھکا دے تو اس سے چھالا پڑ جائے، تم اس کو پھولا ہوا دیکھو گے حالانکہ اس میں کچھ نہیں ہوتا، پھر آپ علیہ السلام نے ایک کنکری لی اور اسے پاؤں (کی پشت) پر لڑھکایا آپ علیہ السلام نے فرمایا پھر (حالت یہ ہوجائے گی اور) لوگ ایسے ہوجائیں گے کہ وہ خرید وفروخت کریں گے ایسا نہیں لگتا کہ کوئی ایک امانت ادا کرے گا یہاں تک کہ کہا جانے لگے گا کہ فلاں قبیلے میں ایک امانت دار شخص ہے اور یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ ایک آدمی کے بابت کہا جائے گا کہ: کس قدر چست اور دلیر ہے، کس قدر ہوشیار ہے اور کس قدر عقلمند ہے، دراں حالیکہ اس کے قلب میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بے شک میرے اوپر ایسا زمانہ آچکا کہ اس کے اندر میں تم میں سے خرید وفروخت کی پرواہ نہیں کرتا، اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس کا دین اسے میرے پاس لوٹا دیتا اور اگر وہ یہودی یا نصرانی ہوتا تو اس کا ذمہ دار (ضامن) اس کو میرے پاس لوٹا دیتا، جبکہ آج میں تم

باب ماجاء فی رفع الامانة

[1] رواه البخاری ص: ۱۰۴۹ ج: ۲ "باب اذا بقی فی حثالة من الناس" ابواب الفتن، ایضاً رواه فی الرقاق باب: ۳۵، صحیح مسلم ص: ۸۲ ج: ۱ کتاب الایمان حدیث: ۲۳۰.

سے فلاں فلاں کے علاوہ کسی سے معاملہ نہیں کرتا ہوں۔

ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی صحت پر ائمہ کا اتفاق ہے۔

لغات: ۔قولہ "حدیثین" یعنی امانت کے بارے میں ورنہ ان کی احادیث کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔قولہ "الامانۃ" اس امانت سے کیا مراد ہے؟ تو اس بارے میں بہت سارے اقوال ہیں: قابل ذکر تین ہیں: پہلا قول جو زیادہ مشہور ہے اور عام حواشی وشروح میں مستور ہے یہ ہے کہ مراد وہ قوتِ استعداد ہے جس کی بناء پر انسان بزبان حال بڑی ذمہ داری یعنی مکلف ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: ''اِنّا عَرَضنَا الاَمَانَۃَ عَلَی السمٰوٰتِ و الارضِ و الجِبَالِ فَاَبَینَ اَن یَحملنَھا و اَشفَقنَ منھا وَ حَمَلَھا الانسان ''۔الآیۃ (احزاب ۷۲) کیونکہ صلاحیت جب اپنی اصلیت پر قائم ودائم ہو تو وہ ایمان میں تبدیل ہو کر دونوں یکجان ومتحد ہو جاتے ہیں۔

دوسرا قول: ۔ یہ ہے کہ مرد ایمان ہے، ابن العربیؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قولین مآلاً ایک ہیں:

"الامانۃ ھی معان تحصل فی القلب فیأمن بھا المرء من الردی فی الآخرۃ والدنیا و اصلھا الایمان و یلیھا الوفاء بالعھد" الخ۔(کذافی العارضہ)

تیسرا قول: ۔تیسرے قول کے مطابق امانت سے مراد مقابل خیانت یعنی دیانت داری ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ ان تینوں اقوال میں کوئی خاص فرق نہیں کیونکہ یہ تینوں بیک وقت انسانی خوبیوں کا حصہ ہیں جیسے حیاء ہے پھر جس طرح حیاء کے انتفاء سے اعمال صالحہ اور پھر ایمان کی نفی ہو جاتی ہے اسی طرح امانت بمعنی دیانت داری کا تقاضا بھی ایمان ہی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''لا دین لمن لا امانۃ لہ''۔[۲]

قولہ "جَذر" بفتح الجیم وسکون الذال، بعض نے جیم کو مکسور بھی جائز کہا ہے، کسی بھی چیز کی جڑ کو کہتے ہیں، عارضہ میں ہے: ''جذر، اصل کل شئ من خشب او حساب او نبات ''۔قولہ "الوکت" یہ لفظ بفتح الواو وسکون الکاف بروزن شمس ہے، معمولی اثر ونشان کو کہتے ہیں جیسے خال جس کا رنگ سابقہ رنگ سے مختلف

---

[۲] وفی روایۃ احمد لا ایمان لمن لا امانۃ لہ، ولا دین لمن لا عھد لہ ص:۵۹۴ ج:۳ حدیث:۱۱۹۷۵، ایضاً ص:۶۲۶ ج:۳ حدیث:۱۲۱۵۷۔

ہو۔قولہ "المجل" یہ بھی شمس کے وزن پر ہے، ہاتھوں پر محنت طلب کام سے یا پاؤں پر بوٹ کے تنگ ہونے سے جو چھالے پڑتے ہیں جسے آبلہ بھی کہا جاتا ہے، بہرحال غرض یہ ہے کہ یہ دوسرا اثر پہلے اثر سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ آبلہ خال سے زیادہ نمایاں اور بڑا ہوتا ہے۔قولہ "دحرجته" دحرج کے معنی لڑھکانا۔قولہ "فَنَفطت" ضرب وسمع دونوں سے آتا ہے مگر بکسر الفاء بعد النون زیادہ راجح ہے نَفِطت القِدرُ نطفًا اس وقت بولا جاتا ہے جب ہانڈی سے تیز بھاپ کی دھاریں نکلیں، یہاں مطلب پھول جانا ہے۔

قولہ "منتبراً" بصیغۂ اسم فاعل بمعنی اُبھرا ہوا چنانچہ منبر کو بھی اس لئے منبر کہتے ہیں کہ وہ بلند ونمایاں ہوتا ہے۔قولہ "ما احلده و اظرفه و اعقله" تینوں فعل تعجب کے صیغے ہیں جَلُدَ بضم اللام فی الماضی وَجَلَداً بفتح اللام فی المصدر صابر، باہمت اور جرأت مند کو کہتے ہیں یعنی بہادر، جبکہ ظریف ہوشیار کو کہتے ہیں، ظرافۃ کے معنی ذہانت وتیزی طبع کے ہیں۔قولہ "ساعیه" ملک اور سردار کو کہتے ہیں جیسا کہ قبائلی نظام میں ہوتا ہے کہ ہر قبیلے کا ایک بڑا ہوتا ہے سب قبیلے والے اس کی بات کے پابند ہوتے ہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد اس پر مقرر مسلمان والی ونگراں ہو۔

تشریح:۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ انسانی خوبیاں جو انسان کا اصل سرمایہ ہیں ناپید ہونا شروع ہوئی ہیں جو کسی وقت میں اپنے عروج پر تھیں چنانچہ انہیں خوبیوں کی وجہ سے جن میں سے ایک امانت ہے انسان قرآن وسنت کو سمجھنے کے قابل ہوا اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا رہا کیونکہ اسلامی تعلیمات وہاں جذب ہوتی اور کارگر ثابت ہوتی ہیں جہاں ان کے لئے ماحول سازگار ہو جیسے بارش سے صرف ذرخیز زمین فائدہ اٹھاتی اور نفع پہنچاتی ہے اب حال یہ ہوا ہے کہ لوگ ان خوبیوں سے اور خصوصاً امانت داری سے دنیاداری کی طرف بڑھ رہے ہیں ان کا مطمح النظر دنیا ہے خواہ اس کے لئے دھوکا دینا پڑے یا خیانت کرنا پڑے، ان کی نظروں میں دنیا ہی کی قدر ہے دین کی قدر کم ہونا شروع ہوئی ہے حتی کہ حالت یہ ہوجائے گی کہ جو آدمی دنیاوی مال ومتاع جمع کرنے میں ماہر ہو تو اندر سے خواہ انسانی خوبیوں سے کتنا ہی خالی کیوں نہ ہو لوگ اس کی تعریف کریں گے کہ وہ اتنا اِذر ہے، ہوشیار ہے اور عقلمند ہے جیسے آج کل کاروباری لوگوں اور سیاسی لیڈروں اور کارکنوں میں اس کا مشاہدہ عام کیا جاسکتا ہے، قوم کے یہ ہیرو اپنی مکاری کی وجہ سے ہی تو لیڈر بن گئے ہیں، ملک کا خزانہ لوٹ کر بیرون ملک منتقل کردیتے ہیں مگر ان کے ووٹرز ان پر اپنی جان فدا کرتے ہیں کہ وہ اس چیز کو کمال وہنر، دلیری اور عقلمندی سمجھتے ہیں، اس سے بڑا بگاڑ کیا ہوسکتا ہے؟

عام طور پر اعمال نسیان کی وجہ سے زائل ہو جاتے ہیں مگر ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ جب اعمال بہت کمزور ہو جائیں تو وہ نیند سے بھی ختم و کمزور ہو جاتے ہیں چنانچہ زمانے کے مرور کے ساتھ لوگوں کی حالت یہ ہو جائے گی کہ جب آدمی سو کر اٹھے گا تو اس کے دل میں فرق آیا ہوگا پہلے مرحلہ میں یہ ہوگا کہ ایمان کا جتنا نور اٹھے گا تو اس کی جگہ ایک ظلمت وتاریکی پکڑ لے گی مگر اس کی مقدار کم ہوگی جبکہ دوسری بار سونے سے یعنی دوسرے مرحلے میں اس ظلمت کا اثر گہرا ہو جائے گا جیسے چھالہ کی نسبت ہے خال اور نقطہ سے، چنانچہ اس کا مشاہدہ آج کل یوں ہو سکتا ہے کہ بچے عام طور پر جھوٹ، دھوکے اور خیانت سے پاک ہوتے ہیں جبکہ جوانی میں اُن کی کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے اور بڑھاپے میں ان کی خباثتیں مکمل پکی ہو جاتی ہیں، اگر کسی کو شک ہو تو اس کا تجربہ کر لے کہ کسی بھی میدان اور فیلڈ کے لوگوں کو آزمائے خواہ دوکاندار ہو یا سرکاری ملازمین یا پھر سیاسی لیڈر شروع میں ان لوگوں کو حرام خوری میں جھجک محسوس ہوتی ہے مگر آگے جا کر اس کی قباحت دل سے نکل جاتی ہے اور رشوت ستانی، دھوکہ دہی اور خیانت ان کی طبعیت ثانیہ راسخہ بن جاتی ہے چنانچہ چھوٹا لیڈر چھوٹا فراڈ کرتا ہے اور بڑا، بڑا کرتا ہے۔ الا ماشاء اللہ وقلیل مّاھم

وقت گذرنے کے ساتھ ایمانی وروحانی کیفیت اتنی تیزی سے زائل ہوگی جیسے پاؤں پر چنگاری یا کنکری لڑھک جائے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۳۶ھ کے اوائل میں بعد شہادت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہوئی ہے مگر وہ اپنے وقت میں اس تبدیلی کے آثار دیکھ کر فرماتے ہیں کہ پہلے میں کسی سے معاملہ میں کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرتا خواہ وہ کوئی بھی ہوتا اگر مسلمان ہوتا تو اس کا ایمان میرا حق دِلانے پر اس کو مجبور کرتا اور اگر ذمی ہوتا تو اس کا بڑا میرا حق بحفاظت مجھے دِلاتا مگر اب وہ بھروسہ متزلزل ہو گیا، اور میں معاملات میں بڑی احتیاط کرتا ہوں۔

جب اس زمانے کی یہ حالت ان کو پسند نہ آئی حالانکہ وہاں دیانت داروں کی اکثریت تھی تو آج کی حالت کو کون تسلی بخش اور اسلام وانسانیت سے ہم آہنگ قرار دے سکتا ہے؟؟؟

غرض ان کے دور میں خائن لوگ خال خال پائے جاتے تھے مگر وہ اس پر بھی تشویش ظاہر فرما رہے ہیں اور مرفوع حدیث کی پیش گوئی ذکر فرما رہے ہیں کہ پھر امانت دار لوگ خال خال ملیں گے، یہ پیش گوئی بالکل صاف آئی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک ہے۔

باب لَتَرکَبُنَّ سُنَنَ مَن کان قبلکم

"عن ابی واقد اللیثی ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لَمّاخَرَجَ الی حُنین مَرَّبشَجَرَةٍ لِلمشرکین یقال لَهاذات انواط یُعَلِّقُونَ علیهااسلحتهم قالوا:یارسول اللّٰه!اِجعَل لناذات انواط کمالهم ذات انواط فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم:سبحان اللّٰه،هذاکماقال قوم موسیٰ:"اِجعل لنااِلٰهاًکمالهم اٰلِهةٌ"والذی نفسی بیده لَتَرکَبُنَّ سُنَّة من کان قبلکم"۔[1] (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حنین کی جانب نکلے تو مشرکین کے ایک درخت سے گذرے اس پیڑ کو ذات الانواط کہا جاتا تھا اور وہ لوگ اس پر اپنا اسلحہ لٹکاتے تھے (پس یہ دیکھ کر) لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسول! ہمارے لئے بھی ایک ذات الانواط مقرر فرمادیجئے جیسا کہ ان لوگوں کے لئے ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سبحان اللہ'' یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: کہ ہمارے لئے ایک معبود بنادیں جیسے ان (مشرکین) کے معبود ہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تم لوگ ضرور ان لوگوں کے طریقوں کی پیروی کروگے جو تم سے پہلے تھے۔

لغات:۔قولہ "حُنین" بروزن زبیر، مکہ وطائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے: ''ویوم حنین''۔قولہ "ذات انواط" ای ذات تعلیق، نوط کے معنی تعلیق اور لٹکانے کے ہیں چونکہ جاہلیت میں لوگ اس سے اپنے ہتھیار لٹکاتے اس لئے یہ ذات انواط سے معروف ہوگیا یعنی وہ درخت جس پر اسلحہ لٹکایا جاتا ہے، حاشیہ کوکب میں بروایۃ درمنثور وغیرہ کے ہے کہ یہ درخت بیر کا تھا،[2] الکوکب الدری میں ہے کہ خوشی اور تہوار کے موقعہ پر لوگ اس کے پاس جمع ہوتے، اسلحہ اس پر لٹکا کر آس پاس کھاتے پیتے اور کھیلتے رہتے۔قولہ "لترکبن" ای لتتبعن اس میں لام تاکید کے لئے ہے رکوب بمعنی چلنے کے ہے از قبیل ذکر ملزوم والمراد منہ اللازم۔

باب لترکبن سنن من کان قبلکم

[1] رواہ احمد فی مسندہ ص:۲۸۶ ج:۶ حدیث:۲۱۳۹۳ وفیه: انکم ترکبون سنن الذین من قبلکم.

[2] مسند احمد حوالہ بالا میں بھی ہے کہ وہ بیر کا درخت تھا جس پر کفار اپنا اسلحہ لٹکاتے تھے اور اس کے گرد اعتکاف کرتے تھے۔

تشریح:۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ علیہ السلام فتح مکہ کے بعد طائف تشریف لے جا رہے تھے راستہ میں حنین کے مقام پر یہ درخت دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے یہ عرض پیش کیا، بظاہر عرض کرنے والے وہ صحابہ کرامؓ تھے جو ابھی ابھی فتح مکہ کے موقعہ پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے جن کی تعداد دو ہزار تھی جبکہ مدینہ منورہ سے صحابہ کرامؓ کی تعداد دس ہزار تھی، ابن خلدون وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ کل بارہ ہزار تھے چونکہ ایک ہفتہ میں تمام تصفیہ طلب امور کا صفایا نہیں ہوسکتا اس لئے یہ سوال نومسلموں کی طرف سے اٹھنا کوئی غیر معمولی بات نہیں کیونکہ ان کا مقصد شرک کرنے کی اجازت طلب کرنا نہ تھا بلکہ ایک قومی روایت سمجھ کر اس کی اجازت چاہی تھی، تاہم اس قسم کی تعظیمات چونکہ مفضی الی الشرک یعنی شرک کی طرف لے جانے والی ہوتی ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمادیا کہ اس قسم کی خواہشات کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، مگر تمام انسانوں اور آنے والی پوری امت کے دلوں کو اس عنصر سے خالی رکھنے کی کوشش سو فیصد کہاں کامیاب ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی بڑی حکمت ہے اس لئے فرمایا کہ تم لوگ گذرے ہوئے لوگوں کے راستوں پر ضرور چلو گے۔

بعض روایات جیسے صحیحین وغیرہما [۳] میں اس پر یہ اضافہ ہے: ''شبراً بشبر و ذراعاً بذراع حتی لو دخلوا جحر ضبٍّ لَدَخلتموہ ''یعنی تمہاری پیروی واتباع کا عالم یہ ہوگا کہ تمہارے اور یہود ونصاریٰ کے درمیان ایک بالشت کا اور ایک ذراع کا فرق بھی نہیں رہے گا حتی کہ اگر وہ لوگ گوہ کے بل وسوراخ میں داخل ہوں تو تم لوگ بھی اسی میں داخل ہوں گے اس سے بڑھ کر کمال اتباع کیا ہوسکتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ امت سابقہ امم کے نقش قدم پر چلے گی، اس کے تاجران کے تاجروں کی راہ لیں گے، اس کی عورتیں اُن کی عورتوں کا طور وطریقہ اپنائیں گی اور اس کے علماء اُن کے علماء اور اس کے حکمران اُن کے حکمرانوں کے پیچھے ہوں گے، یہ پیش گوئی بھی جوں کی توں صحیح نکلی ہے جو آپ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔

ہاں البتہ اس میں کفر کی پیروی کی بات نہیں کی گئی ہے باقی تمام معاصی ونافرمانیاں مراد ہیں حتی کہ ان

---

[۳] صحیح بخاری ص: ۴۹۱ ج: ۱ "باب ماذکر عن بنی اسرائیل" کتاب الانبیاء، ایضاً رواہ فی الاعتصام باب: ۱۴، صحیح مسلم ص: ۳۳۹ ج: ۲ کتاب العلم ورواہ ابن ماجہ ابواب الفتن باب: ۱۷، مسنداحمد ص: ۲۰۳ ج: ۳ ص: ۳۱۲ ج: ۳ حدیث: ۱۰۲۶۳ و ۳۴۰ ج: ۳ و ۵۰۶ ج: ۳.

لوگوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا اور جب انبیاء نہ ہوتے تو ان کے خلفاء کو قتل کردیتے اس امت میں بھی ایسا ہی ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ورثہ خلفاء وعلماء کو نہیں بخشا گیا۔

اشکال:۔ اس روایت میں لترکبن کے لام تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ اتباع ناگزیر ہے جبکہ بہت سی روایات میں یہود ونصاریٰ کی مشابہت سے ممانعت بھی آئی ہے تو امر لازم سے نہی تو تکلیف بمالا یطاق سی لگتی ہے۔

حل:۔ اس کا جواب شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دیا ہے کہ اگرچہ امت کی غالب اکثریت تو پیروی کرے گی مگر اس کے ساتھ ایک طائفہ منصورہ کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے علی ہذا اتباع کی پیش گوئی اکثریت کے حوالے سے ہے جبکہ نہی کا مطلب یہ ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہئے اور یقیناً ہوگی بھی جو ان یہود ونصاریٰ کی مشابہت سے گریزاں ہوگی: "ففی النهی عن ذالك (التشبه) تكثير لهذه الطائفة المنصورة وتثبيتها وزيادة ايمانها"۔ ("اِقتضاء الصراط المستقیم، مخالفۃ اصحاب الجحیم" ص:۴۴) یعنی نہی میں ترغیب ہے کہ طائفہ منصورہ کے ساتھ رہو چنانچہ آج عام مسلمانوں کے لباس اور اطوار کو دیکھیں گے تو حدیث باب کا مصداق نظر آئے گا مگر جب کسی مدرسہ میں جائیں گے تو آپ کو پاکیزہ ماحول ملے گا۔

باب ماجاء فی کلام السِّبَاعِ

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: والذی نفسی بیده لاتقوم الساعة حتی تکلّم السباعُ الانس وحتی یکلم الرجلَ عذبةُ سوطهِ وشِراكُ نعله وتخبرفخِذُه بمااحدث اهلُه بعده"۔[1] (حسن صحیح غریب)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ باتیں نہ کریں درندے انسان سے اور جب تک بات نہ کرے آدمی کے کوڑے کا پُھندنا اس سے اور اس کے جوتے کا تسمہ اس سے بات نہ کرے اور اس کی ران خبر نہ دے اس کی جو اس کے گھر والوں نے اس کے (گھر سے نکلنے

باب ماجاء فی کلام السباع

[1] الحدیث اخرجه ایضاً احمدفی مسنده ص: ۵۰۴ :۳ حدیث: ۱۱۳۸۳.

کے) بعد کیا ہے۔

لغات:۔قولہ "السباع" بکسر السین، سَبُعٌ بفتح السین وضم الباء کی جمع ہے درندے کو کہتے ہیں۔ قولہ "عذبة" یہ اور "شراک اور فخذ" تینوں سِباع کی طرح مرفوع ہیں کہ سب فواعل ہیں علی ہذا الِانس اور رَجُل دونوں مفعولیت کی بناء پر منصوب ہیں، عذبۃ بفتح العین وسکون الذال بروزن رحمۃ، بعض نے ذال کا فتحہ وکسرہ بھی جائز کہا ہے، کسی چیز کے کنارے کو کہتے ہیں اور یہاں یہی معنی مراد ہے، اس کے معنی اس ڈوری کے بھی آتے ہیں جس کے ذریعہ ترازو اٹھائی جاتی ہے مگر وہ یہاں مراد نہیں۔قولہ "شِراك" بکسر الشین، تسمہ۔

تشریح:۔حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بول چال کا فن ترقی میں اپنے عروج پر پہنچ جائے گا حتی کہ وہ اشیاء بھی ناطق وگویا ہوجائیں گی جن میں بظاہر بولنے کی صلاحیت نہیں ہے، آج کے دور میں ثابت ہوگیا کہ لوہا بھی بولتا ہے اور پلاسٹک بھی، اگر اس حدیث کا مطلب یہ لیا جائے کہ بطور خرق عادت ایسا ہوگا تو پھر تو کوئی اشکال نہیں کہ عالم میں ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں تو جس طرح ماضی کے صحیح واقعات وروایات سے غیر ناطق کا بولنا ثابت ہے جیسے گائے اور بچے کا گہوارے میں بولنا تو مستقبل میں بھی ایسا ہوسکتا ہے جیسے بھیڑیا کا چرواہے سے بات کرنا وغیرہ علی ہذا پھر حدیث باب حقیقی کلام پر محمول ہوگی۔

لیکن اگر اسے ایک امر معتاد کے طور پر لیا جائے تو پھر معنی مجازی مراد ہونگے اور یوں کہا جائے گا کہ اس تعبیر میں کسی معنی دیگر کی طرف اشارہ ہے کہ مثلاً سائنسی ترقی اس حد تک پہنچ جائے گی کہ مذکورہ بالا چار اشیاء بھی بولنے لگیں گی تو اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ بولنے سے مراد صوتی حروف ہوں جیسے ہم موبائل فون وغیرہ پر سنتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد کوئی اشارہ وسگنل دینا ہو چنانچہ آج کل موبائل فون پتلون کی جیب میں ہوتی ہے اور اس سے تار کے ذریعہ منہ اور کانوں سے رابطہ رہتا ہے اور کسی بھی سڑک کے کنارے کھڑے ہوکر بآسانی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ لوگ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے گھر سے باتیں کرتے رہتے ہیں، مزید بریں آج کل "ٹریکنگ ڈیوائس" پر بھی کام وتحقیق جاری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چپس جسے عام طور پر ران میں فِٹ کیا جائے گا جو صوتی وتصویری وغیرہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے جاسوسی نظام کے لئے تیاری کے مراحل میں ہے۔

جہاں تک درندوں کی بات چیت کا تعلق ہے تو اگرچہ یہ موضوع بھی زیر غور ہے مگر اس میں کامیابی بظاہر مشکل ہے کیونکہ سائنس دانوں کے پیش نظر اس وقت یہ بات ہے کہ جانوروں کے خلیوں میں D.N.A

میں تبدیلی کر کے اس میں انسانی D.N.A شامل کرلیا جائے جیسا کہ وہ چوہے پر انسانی کان اُگانے میں کامیاب ہوئے ہیں، اسی طرح ہوسکتا ہے کہ وہ بولنے بھی لگیں مگر یہ امر خاصا پیچیدہ ہے کیونکہ اس کے لئے نفس گویائی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو سمجھنا اور زبان کی ساخت کو تبدیل کرنا وغیرہ بہت مشکل مراحل کو طے کرنا پڑے گا مع ہذا یہ کام سائنس دان چوری چھپے کرتے ہیں کیونکہ علانیہ طور پر کرنے سے ان پر مذہبی طبقے کی طرف سے منصوبہ ترک کرنے کے لئے دباؤ بڑھتا ہے، البتہ انسانی جسم میں D.N.A کی تبدیلی سے نسبتاً زیادہ آسانی سے انسان جانوروں کی زبان سمجھنے کے قابل بن سکتا ہے، کیونکہ انسان باصلاحیت ہے جبکہ جانور بات سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں، اس پیراگراف سے یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ کوڑے کا کنارہ اور جوتے کا تسمہ کس طرح بولے گا؟؟؟

اور اگر مراد مطلق دلالت لی جائے تو پھر تو مطلب بہت ہی آسان ہو جائے گا کیونکہ آج کل پالتو کُتے جن کو خاص تربیت دی جاتی ہے وہ بھی بولتے ہیں۔ تدبر

باب ماجاء فی انشقاق القمر

”عن ابن عمر قال اِنفَلَقَ القمرُ علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: اِشهَدُوا“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم گواہ رہو۔

لغات: ۔قولہ ”اِنفَلَقَ“ ای اِنشَقَ یعنی چاند پھٹ گیا اور دو ٹکڑوں میں منقسم ہوگیا۔ قولہ ”القمر“ کسی سیارے کے گرد سیارچے کا گھومنا اس سیارے کا قمر یعنی چاند کہلاتا ہے، مختلف سیاروں کے متعدد مثلاً درجن اور ڈیڑھ درجن تک چاند دریافت ہوئے ہیں، زمین کا ایک ہی چاند ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔

تشریح: ۔ جمہور کے نزدیک سورۂ قمر کی پہلی آیت: ”اِقتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانشَقَّ القَمَرُ“ سے بھی یہی مذکور فی الحدیث کا واقعہ مراد ہے اگرچہ عند البعض اس سے قیامت کے قیام کے وقت انفلاق مراد ہے۔

زمانہ قدیم میں فلاسفہ نے یہ غلط نظریہ مشہور کردیا تھا کہ چاند نچلے آسمان میں اسی طرح پیوست ہے جیسے چھت میں کوئی کیل ہوتی ہے نیز ان کے نزدیک افلاک میں خرق والتیام کی گنجائش نہیں ہے یعنی یہ ممکن نہیں کہ

آسمان پھٹ جائیں یا پھر جڑ جائیں، مگر آج کل کی تحقیق سے یہ بات سو فیصد یقین تک پہنچ گئی ہے کہ چاند ہمارے کرۂ ارض کے گرد گھومنے والا ایک چھوٹے سائز کا قمر ہے بلکہ آج تو انسان کی رسائی بھی چاند تک ممکن بن گئی ہے بلکہ غالباً واقع ہو چکی ہے اور اگر ہم امریکہ کا دعویٰ اس حوالے سے جھوٹا قرار دے جیسا کہ ایک رائے ماہرین کی یہی ہے تو آئندہ تو یہ ممکن ہے کہ انسان چاند پر چڑھ بیٹھے۔

بہرحال یہ واقعہ خلافِ عادت ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے اور اسی چیز کا نام معجزہ ہے اور یہاں کفار کو یہی بتانا تھا چنانچہ جب قریش کی ایک جماعت حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مطالبہ کیا کہ اگر آپ ساحر و جادوگر نہیں تو آپ چاند کو شق کر دیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے بزعم (جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر گردانتے تھے) ان کا جادو آسمانوں میں تو چل نہیں سکتا تو ہمارے اس مطالبہ سے آپ لاجواب ہو جائیں گے، مگر حضور علیہ السلام تو نبی تھے جادوگر نہیں تھے اس لئے ان کا مطالبہ پورا فرما دیا اور ان کو دکھا بھی دیا کہ تم گواہ رہو، چنانچہ یہ دیکھ کر بعض لوگوں کا مسلمان ہونا ثابت ہے جیسا کہ تفسیر عثمانی میں ہے: ''ہجرت سے پیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مِنیٰ میں تشریف فرما تھے کفار کا مجمع تھا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشانی طلب کی.....وفیہ....تاریخ فرشتہ وغیرہ میں اس کا ذکر موجود ہے کہ ہندوستان میں مہاراجہ ''مالیبار'' کے اسلام کا سبب اسی واقعہ کو لکھتے ہیں۔

بہرحال یہ واقعہ غیر معمولی ضرور ہے کہ معجزہ ہے مگر ناممکن نہیں اور صحیح اَخبار سے ثابت ہونے کی بناء پر اس کا ماننا ضروری ہے اور جہاں تک یہ کہنا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ساری دنیا والے دیکھتے تو یہ سوال ایسا ہی جاہلانہ ہے جیسا کہ فلاسفہ کا پہلا والا اعتراض اور نظریہ احمقانہ تھا، یہ نظام افقی سے ناواقفیت پر مبنی ہے، پھر یہ واقعہ رات کو پیش آیا کیا ضروری ہے کہ ان لمحات میں لوگوں کی نگاہیں آسمان پر لگی ہوئی ہوں اور یہ بھی لازمی نہیں کہ ہر جگہ کا مطلع صاف ہو، مع ہذا مکہ سے باہر مسافروں کی ایک جماعت کا دیکھنا ثابت ہے کہ جب قریش نے یہ بہانہ بنایا کہ اگر یہ جادو نہیں تو ہمارے علاوہ دوسروں نے بھی دیکھا ہوگا چنانچہ معلوم کرنے پر اس کا ثبوت ملا تھا، تاہم بعض کے اسلام لانے کی وجہ سے عام عذاب نہیں آیا یا چونکہ سب نے نہیں دیکھا تھا اس لئے بعض کے اِنکارِ ایمان پر عذاب نہیں آیا۔

باب ماجاء فی الخسف

"عن حذيفة بن أَسِيدقال اشرف علينارسول الله صلى الله عليه وسلم من غرفة ونحن نتذاكرالساعة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم:لاتقوم الساعة حتى تروا عشرايات،طلوع الشمس من مغربها،ويا جوج ماجوج،والدابة،وثلاث خسوف،خسف بالمشرق،وخسف بالمغرب،وخسف بجزيرة العرب،ونارتخرج من قعرعدن تسوق الناس اوتحضرالناس فَتَبِيتُ معهم حيث باتوا وتقيل معهم حيث قالوا"۔[1] (حسن صحيح)

حضرت حذیفہ بن اَسِید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالا خانے سے ہماری طرف جھانکادراں حالیکہ ہم آپس میں قیامت کا تذکرہ کررہے تھے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔(۱) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا (۲) اوریاجوج وماجوج (کا برآمد ہونا) (۳) اوردابہ (کا خروج) اورتین خسوف (۴) ایک خسف مشرق میں (۵) اورایک خسف مغرب میں (۶) اورایک یعنی تیسرا جزیرۃ العرب میں (۷) اورایسی آگ جوعدن کی گہرائی (والی جگہ) سے نکلے گی ہانکے گی لوگوں کو یافرمایا کہ (اوللشک من الراوی) جمع کرے گی لوگوں کوتوجہاں لوگ رات گذاریں گے وہ بھی ان کے ساتھ وہیں رات گذارے گی اوروہیں قیلولہ کرے گی جہاں لوگ قیلولہ کریں گے۔

اس روایت میں سات علامات کا تذکرہ مکمل ہو چکا، دوسری سند میں دھواں مذکور ہے اور تیسری سند میں دخان کے ساتھ دجال کا ذکر ہے گویا یہ نو ہوگئیں جبکہ دسویں نشانی یا تو ہوا ہے جو لوگوں کو اڑا کر سمندر میں پھینک دے گی یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یعنی آسمان سے اترنا ہے جیسا کہ ابوموسیٰ محمد بن المثنیٰ کی روایت میں ہے۔

لغات:۔قولہ "اشرف" اِشراف بلند جگہ سے نمودار ہونا اور جھانکنا، مسلم[2] میں بجائے اَشرَفَ کے "اِطَّلَعَ علینا" کے الفاظ ہیں۔قولہ "غرفۃ" بضم الغین بلندی پر بنا ہوا کمرہ جسے فارسی میں بالا خانہ کہتے

باب ماجاء فی الخسف

[1] الحديث اخرجه مسلم ص:۳۹۳ ج:۲ كتاب الفتن، سنن ابى داؤد كتاب الفتن والملاحم باب:۱۲، سنن ابن ماجه ابواب الفتن باب:۲۱، مسنداحمد ص:۵۷۴ ج:۴ حديث:۱۱۵۷۱۔

[2] مسلم حوالہ بالا اس میں دونوں لفظ ہیں پہلی روایت میں اطلع کا لفظ ہے، دوسری روایت جوابی سریحہ سے ہے اس میں فاشرف کا لفظ ہے۔

ہیں، قرآن کریم میں اہل جنت کے محلات کے لئے ''غرفات'' کے لفظ میں اسی بلندی کی طرف اشارہ ہے۔ [۳]
قولہ "یاجوج وماجوج" الف اور ہمزہ ساکنہ دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے الف کی قرأت اکثر ہے، دو قبیلوں کے نام ہیں اس کے لئے آگے مستقل باب آرہا ہے۔قولہ "خسوف" اور ''خسف'' بسکون السین دونوں مصدر ہیں، زمین میں دھنس جانے کو کہتے ہیں۔

قولہ "بجزیرۃ العرب" جزیرہ دراصل وہ قطعۂ زمین کہلاتا ہے جو چاروں اطراف سے پانی میں گھرا ہوا ہو مگر عرفاً ومجازاً عرب کو بھی جزیرہ کہتے ہیں اگر چہ یہ جزیرہ نما ہے حقیقی جزیرہ نہیں ہے۔قولہ "من قعر عدن" قعر کے معنی جڑ اور گہرائی کے ہیں اور عدن یمن کا مشہور شہر اور علاقہ ہے، بعض نے یمن کا ایک جزیرہ قرار دیا ہے جو صومالیہ اور جنوبی مغربی یمن کے درمیان بحرِ ہند اور بحرِ احمر کے ملنے کی جگہ خلیجِ عدن کے نام سے بہت مشہور ہے جہاں سے تقریباً دنیا بھر کے سمندروں جہاز گذرتے ہیں۔قولہ "تقیل او رقالوا" دونوں قیلولہ سے مشتق ہیں، دوپہر کی استراحت کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔اس حدیث میں سات علاماتِ قیامت کا ذکر ہے ان میں سے اولین یعنی سورج کے مغرب سے طلوع ہونے اور یاجوج وماجوج کے لئے اس باب کے بعد امام ترمذیؒ نے بالترتیب دو باب قائم کئے ہیں، اس پر بحث وہیں ہوگی۔

تیسری نشانی دابہ کا خروج ہے، لغوی اعتبار سے تو زمین پر چلنے والے ہر جانور کو دابہ کہا جاتا ہے مگر عرف عام میں وہ چوپایا جو سواری یا مال برداری کے لئے استعمال ہوتا ہے دابہ کہلاتا ہے۔

اس حدیث میں مراد وہی دابہ ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے: ''واذا وقع القول علیھم اخرجنالھم دَابَّۃً من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بایٰتنا لا یوقنون''۔(سورۂ نمل آیت نمبر:۸۲)

قیامت اس موجودہ نظام اور محسوس عالم کا سب سے بڑا سانحہ وحادثہ ہے تو جس طرح کوئی بڑا واقعہ پیش آتا ہے اس سے پہلے اس کی نشانیاں ظاہر ہونا شروع ہوجاتی ہیں مثلاً جب طوفان آتا ہے تو اس سے بہت پہلے تیز ہوائیں اور بارش ہونا ایک عام سی بات ہے جس کی شدت کا دارومدار طوفان کے صغر وکبر پر ہوتا ہے، لہٰذا قیامت سے پہلے علامات کا ظاہر ہونا لازمی بات ہے۔

پھر ان علامات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ایک قسم کی علامات صغریٰ ہیں اور دوسری قسم کی کبریٰ

---

[۳] کماقال اللہ عزوجل: وھم فی الغرافات آمنون سورۃ سبا آتی:۳۷.

ہیں، علاماتِ صغریٰ کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے، راقم نے ''راہ معرفت'' میں ان کا اجمالاً تذکرہ کیا ہے جبکہ اس حدیث میں علاماتِ کبریٰ کا ذکر ہے جن کی تعداد کم از کم دس ہے، علامات کبریٰ اس وقت رونما ہوں گی جب قیامت بہت زیادہ قریب ہو جائے گی جبکہ صغریٰ تو کافی پہلے سے وجود پذیر ہیں۔ پھر باب کی حدیث میں ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، بہر حال کبریٰ میں سے ایک خروج دابہ ہے جس کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں مندرجہ بالا آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"هذه الدابة تخرج فی آخر الزمان عند فساد الناس و ترکهم اَوَامر الله و تبديلهم الدين الحق يخرج الله لهم دابة من الارض..."۔

یعنی جب آخری زمانہ میں لوگ بگڑ جائیں گے اور احکام خداوندی کو چھوڑ جائیں گے اور دین حق کو تبدیل کر جائیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لئے زمین میں سے ایک دابہ نکال دیں گے پھر اس بارے میں متعدد احادیث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سب علامات لگاتار رونما ہوں گی: ''وایتها کانت قبل صاحبتها فالأخریٰ علی اثرها قریباً''۔

ابن کثیرؒ نے ابوداؤد طیالسی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا خاتم (انگوٹھی) ہوگا، عصا سے کافر کی ناک توڑے گا اور خاتم (کی مہر) سے مؤمن کا چہرہ روشن ہوگا یعنی چمکے گا یہاں تک کہ لوگ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر مؤمن و کافر کی تمیز کر سکیں گے تاہم ترمذی کے حاشیہ میں عصا و خاتم کا عمل و اثر اس کے برعکس بتلایا ہے۔ (کذافی روایة احمد وابن ماجه [۴]) اور اس میں یہ بھی اضافہ ہے کہ مؤمن کے چہرہ پر ''مؤمن'' لکھا جائے گا اور کافر پر مہر لگانے سے کافر لکھے گا، پھر ظاہر یہ ہے کہ یہ دابہ کوہ صفا سے برآمد ہوگا، اس کی لمبائی ساٹھ گز کے برابر بتائی گئی ہے، یہ چوپایوں کی طرح چار ٹانگوں پر چلے گا بدن پر پشم یعنی اُون ہوگی اور مختلف متعدد جانوروں کے نمونوں پر مشتمل ہوگا، کوئی آدمی اس کو پکڑ نہیں سکے گا اور نہ ہی کوئی اس سے بھاگنے میں کامیاب ہوگا۔

حدیث الباب میں تین خسوف کا ذکر ہے حضرت گنگوہی صاحب رحمہ اللہ نے الکوکب میں فرمایا ہے کہ

---

[۴] سنن ابن ماجه ص: ۲۹۵ ابواب الفتن باب دابة الارض قال تخرج الدابة ومعها خاتم سليمان بن داؤد وعصا موسى بن عمران عليهما السلام فتجلوا وجه المؤمن بالعصا وتختم انف الكافر بالخاتم الخ، مسند احمد ص: ۲۷۵ ج: ۳ حديث: ۹۹۸۸، ايضاً رواه الترمذی فی کتاب التفسير سورة: ۲۷.

یہ تینوں ایک ہی نشانی ہیں علی ہذا حدیث الباب میں راوی نے دس کا احاطہ نہیں کیا ہے۔

بعض شارحین حدیث کی رائے یہ ہے کہ یہ تینوں خسوف واقع ہو چکے ہیں، مگر ظاہر یہ ہے کہ ان کا واقع ہونا ابھی باقی ہے کیونکہ پیچھے عرض کیا جاچکا کہ اس حدیث میں علامات کبریٰ کا ذکر ہے اور یہ کہ علامات لگاتار اور قریب بقیامت رونما ہوں گی، حاشیۂ کوکب پر ہے کہ حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے اپنے رسالے مسماۃ بہ ''اشراط الساعۃ'' میں میلان ظاہر کیا ہے کہ یہ تینوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوں گی۔

قولہ "و نار تخرج من قعر عدن" الخ ظاہر یہ ہے کہ یہ آخری نشانی ہے کیونکہ لوگوں کو محشر کی طرف یعنی شام کی جانب جہاں محشر ہوگا لے جانے سے مراد ان کو میدان محشر کی طرف ہانکنا ہے، جن روایات میں ہے کہ: ''تخرج من الارض الحجاز'' [۵] تو دونوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ حجاز راستہ میں پڑتا ہے اس لئے تطبیق یوں ہوگی کہ یمن سے آنے والی آگ حجازی آگ سے آملے گی، آج کل جزیرہ نما عرب تیل کی سیّال دولت اور زیر زمین بلکہ زیر سمندر ذخائر سے لبالب ولبریز ہے ممکن ہے کہ اس میں مزید اضافہ ہونے کی وجہ سے یہ خطہ کسی وقت آگ پکڑ لے مگر اس آگ کا لوگوں کے ساتھ ساتھ ان کی رفتار کے مطابق چلنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دابۃ الارض کی طرح اللہ کی طرف سے کوئی زندہ نشانی یا کم از کم دنیاوی آگ سے مختلف شے ہے۔ واللہ اعلم

قولہ "وزادفیہ الدخان" ظاہر یہ ہے کہ یہ وہی دخان ہے جو سورۂ دخان میں مذکور ہے: ''فارتقب یوم تأتی السمآء بدخان مبین، یغشی الناس ھذا عذاب الیم''۔ (آیت نمبر: ۱۰، ۱۱) اگر چہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے اس آیت کے متعلق یہ ہے کہ اس سے مراد وہ خیالی دھواں ہے جو بھوک کی وجہ سے ضعف بصارت کی بناء پر اور فضاء میں خشک سالی کی وجہ سے آلودگی کی بناء پر نظر آتا ہے جو قریش کے بائیکاٹ کے دوران آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دعاء کی بدولت قریش مکہ کو فضاء میں نظر آتا تھا غرض یہ دھواں گذرا ہے اب یہ آنے والا نہیں ہے۔

مگر باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علامات قیامت میں سے ہے جس کا آنا باقی ہے، بہت سے محققین نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور بہت سارے صحابہ کرامؓ نے بھی ان کی موافقت کی ہے جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں ہے، علاوہ ازیں اس میں کچھ قرائن

---

۵ کذا فی روایۃ البخاری ص: ۱۰۵۴ ج: ۲ "باب خروج النار" کتاب الفتن وصحیح مسلم ص: ۳۹۳ ج: ۲ کتاب الفتن، ان رسول اللہ ﷺ قال لاتقوم الساعۃ حتی تخرج نار من ارض الحجاز تضیی اعناق الابل ببصری.

کا بھی سہارا لیا گیا ہے مثلاً آیت میں لفظ ''مبین'' سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دخان کو ہر ایک دیکھے گا جبکہ پہلی تفسیر میں یہ صرف بھوکے کو بطور خیال نظر آتا، اسی طرح لفظ ''یغشی الناس'' سے بھی اس کا عام اور کثیف ہونا معلوم ہوتا ہے یہ صرف اہل مکہ کے لئے نہیں ہے نیز ''هذا عذاب اليم'' سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے۔

ترمذی کے محشی نے لمعات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ دھواں مشرق تا مغرب ہوگا یعنی بہت زیادہ ہوگا، چالیس دن تک رہے گا، مؤمن اس سے صرف اتنا سا متاثر ہوگا جیسے زکام میں ہوتا ہے یعنی چھینکیں آتی ہیں جبکہ کافر از خود رفتہ بن جائیں گے، بظاہر یہ دھواں ایٹمی جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی آلودگی و تابکاری سے مختلف ہے کیونکہ ایٹمی اثرات سب کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔

قوله ''والعاشرة امار يح تطرحهم في البحر وامانزول عيسىٰ بن مريم'' اس سے سابقہ روایت میں دجال کا بھی ذکر ہے جس کے لئے اور حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول کے لئے آگے مستقل الگ الگ ابواب آرہے ہیں۔ جہاں تک اس طوفانی ہوا کا ذکر ہے جو لوگوں کو سمندر میں پھینکے گی تو شارحین حدیث سے اس بارے میں تفصیل مروی نہیں ہے البتہ آگے ترمذی میں ''باب ماجاء في فتنة الدجال'' کے تحت ایک طویل حدیث کے آخر میں اس ریح کا ذکر آیا ہے جو یاجوج و ماجوج کے بعد بچنے والے مسلمانوں کی جانوں کے قبض کا سبب بنے گی، اسی طرح مسلم جلد اول میں کتاب الایمان کے باب في الريح التي في قرب القيمة'' الخ اور جلد ثانی ص ۳۹۴ پر بھی یہ حدیث ہے: ''ثم يبعث الله ريحاً طيبةً فتوفى كل من في قلبه مثقال حبة من خردل من ايمان فيبقى من لاخير فيه فيرجعون الى دين ابائهم '' جبکہ کتاب الایمان میں ہے کہ یہ ہوا ریشم سے زیادہ نرم ہوگی، ایک روایت میں ہے کہ یہ یمن سے آئے گی جبکہ دوسری میں شام کی تصریح ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں:

> ''و يجاب عن هذا بوجهين احدهما يحتمل انهما ريحان شامية و يمانية و يحتمل ان مبدأها من اَحَدِ الاَقليمين ثم تصل الآخر و تنتشر عنده، والله اعلم۔ (مسلم ص: ۷۵ ج: ۱)

ممکن ہے کہ حدیث الباب میں مذکورہ ہوا اس ریح طیبہ سے بھی مؤخر ہو جو کفار کو اڑا کر ادھر سے ادھر اور خشکی سے بحر و صحرا میں پٹک دے گی کما قال اللہ تعالیٰ: ''يوم يكون الناس كالفراش المبثوث و تكون الجبال كالعهن المنفوش''۔ [۶]

حدیث آخر:۔ ''عن صفية قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاينتهى الناس عن

---

[۶] سورة القارعة آیت: ۴، ۵.

غزو هذا البیت حتی یغزو جیش حتی اذا کانوا بالبیداء او ببیداء من الارض خُسِفَ بِاَوَّلِهِم و اٰخرهم ولم یَنْجُ اوسطهُم قلت یارسول اللّٰه فمن کَرِهَ منهم قال: یبعثهم اللّٰه علی مافی انفسهم"۔(حسن صحیح) [7]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگ اس گھر (کعبہ) پر حملے سے نہیں رکیں گے یہاں تک کہ ایک لشکر حملہ آور ہوگا جب یہ لشکر بیداء مقام یا فرمایا کہ کسی اونچے میدان تک پہنچ جائے گا تو اس کا اگلا حصہ اور پچھلا دھنسا دیا جائے گا اور درمیانہ بھی نہیں بچے گا، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ان میں جو اپنی مرضی سے نہیں آیا ہوگا؟ (یعنی اس کا کیا بنے گا؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ ان کو اپنی اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے گا۔

لغات: ۔قولہ "غزو" حملہ کرنے کو کہتے ہیں۔قولہ "البیداء" بُدُوٌّ سے بمعنی ظاہر ہونے کے، وہ میدان جو کھلا اور اونچائی پر ہو، راوی کو شک ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ بیداء فرمایا جو مسجد ذوالحلیفہ کے قریب مشہور و معروف مقام ہے یا مطلق بیداء فرمایا جو کہیں بھی ہو۔

تشریح: ۔جیسا کہ لغات کے عنوان میں عرض کیا گیا کہ غزوہ حملہ کرنے کو کہتے ہیں لہٰذا "لا ینتھی الناس عن غزو ھذا البیت" سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کفار و فجار کی طرف سے کعبہ شریفہ زادھا اللہ شرفاً وعزاً پر متعدد حملے ہوں گے یا کم از کم منصوبے بنائے جائیں گے۔ مذکورہ بالا حدیث میں صرف ایک حملہ آور لشکر کا ذکر ہے جو سب زمین میں دھنس جائے گا البتہ مسلم [8] کی روایت کے مطابق ایک سرکش کو بچالیا جائے گا تا کہ وہ واپس جا کر لوگوں کو اطلاع کر سکے، بعض روایات میں ہے کہ دو آدمی بچیں گے ان میں سے ایک اپنے حکمرانوں کو اطلاع کرے گا اور دوسرا حضرت مہدی کو خوشخبری دے گا۔ پھر ظاہر یہ ہے کہ لشکر کعبہ کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں نابود ہو جائے گا، تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ واقعہ کب رونما ہوگا مگر جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ علامات کبریٰ لگا تار رونما ہوں گی علی ہذا اگر اس خسف کو کبریٰ میں شمار کیا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ یہ حضرت مہدی کے زمانہ میں ہوگا۔

آخری حدیث میں ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خسف، مسخ اور قذف کا تذکرہ فرمایا تو ام

---

[7] رواہ ایضاً ابن ماجہ ض: ۲۹۵ ابواب الفتن.

[8] صحیح مسلم ص: ۳۸۸ ج: ۲ کتاب الفتن، ایضاً سنن ابن ماجہ حوالہ بالا.

المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا اس وقت بھی ہلاک ہوں گے جب ہمارے درمیان نیک لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نعم اذاظهر الخبث" ہاں جب گناہ عام ہو جائیں گے، خبث بفتحتین فجور یا زنا کو کہتے ہیں اور اگر ہم بضم الخاء وسکون الباء ہو تو خباثت بھی گندگی اور شرارت کو کہتے ہیں یعنی جب بد باطنی کے ساتھ گندے کام عام ہوں تو پھر سب پر عذاب آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بُرے لوگوں کی معیت ودوستی بھی بدانجامی کا سبب ہے اس لئے حتی الامکان بُرائی کی جگہ اور بُرے لوگوں سے دور رہنا چاہئے۔

اس مسئلہ کی کچھ وضاحت "باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر" میں گذری ہے۔ فلیراجع

باب ماجاء فی طلوع الشمس من مغربها

"عن ابی ذر قال دخلتُ المسجد حين غابت الشمس والنبی صلی اللّٰہ علیه وسلم جالس فقال: يا اباذر أتدری این تذهب هذه؟ قال قلتُ: اللّٰه ورسوله اعلم قال: فانها تذهب لِتستأذن فی السجود فیؤذن لها وكأنها قد قيل اطلعى من حيثُ جئتِ فتطلع من مغربها، قال ثم قرأ: وذالك مستقرلها وقال ذالك قراءة عبداللّٰه بن مسعود"۔[1] (حسن صحیح)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں اس وقت داخل ہوا جب سورج اوجھل ہو رہا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر! کیا تو جانتا ہے کہ یہ کہاں جاتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی اللّٰه ورسوله اعلم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک یہ جاتا ہے تا کہ سجدہ کرنے کی اجازت طلب کرے تو اسے اجازت مل جاتی ہے اور گویا اس کو حکم ملا کہ وہیں سے طلوع ہو جا جہاں سے تم آئے ہو، پس یہ مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا فرمایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا: "وذالك مستقرلها" (اور یہ اس کا ٹھکانا ہے) اور حضرت ابوذرؓ نے فرمایا: یہ عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت ہے۔

باب ماجاء فی طلوع الشمس من مغربها

[1] ایضاً روی بمعناه مسند احمد ص: ۱۷۹ ج: ۲ وص: ۲۰۸ ج: ۲ حدیث: ۲۰۹۴۸ عن ابی ذر الغفاریؓ، ورواه الترمذی فی کتاب التفسیر ایضاً.

لغات:۔ قولہ "وکانہا قدقیل لہا" علم بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی مستقبل کی چیز یقینی ہو تو اس کو ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرتے ہیں قرآن شریف میں اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں جیسے: "اَتیٰ اَمرُاللّٰہ فَلَاتَستَعجِلُوہ"۔(نحل آیت نمبرا) چونکہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا طے شدہ امر ہے اس لئے "قِیلَ" ماضی کا صیغہ ذکر کیا ہے جبکہ "کَاَنَّہا" میں قُرب کی طرف اشارہ ہے۔قولہ "مستقرلہا" قرار سے ہے جائے سکون یعنی ٹھکانا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مستقر سے مراد یومیہ حرکت کا منتہی ہے جبکہ بعض حضرات نے سالانہ حرکت میں انقلاب صیفی وشتوی کو لیا ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ مراد اس سے نظام شمسی کا منتہی ہے کیونکہ یہ کہکشاں رواں دواں ہے، علاوہ ازیں بھی بہت سارے اقوال ہیں۔

تشریح:۔دواصولی اعتراضات اوران کے اصولی جوابات:۔

(۱)..زمین گول ہے:۔ پہلا اعتراض: یہ ہے کہ زمین گول ہے اور وہ اپنے محور کے گرد محوری حرکت کرتی ہے جبکہ سورج اپنی جگہ ساکن ہے پس اس محوری حرکت کے نتیجہ میں دن رات پیدا ہوتے ہیں بایں طور کہ اس گردش میں جو حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جو اوجھل رہتا ہے وہاں رات ہوتی ہے، علی ہذا نہ تو سورج چلتا ہے اور نہ ہی طلوع وغروب کسی مخصوص گھڑی میں منحصر ہیں بلکہ ہر آن بیک وقت سورج طالع بھی ہے اور غارب بھی، پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟

جواب:۔ یہ جواب ایک اصول وتمہید پر مبنی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے خطاب میں عام لوگوں کی فہم کی بہت زیادہ رعایت کی گئی ہے اس لئے عام بات متفاہم الناس کے مطابق کی جاتی ہے اور یہ طرز کلام اَمثال، تذکیر بایام اللہ، صفات باری تعالیٰ اور کائناتی نظام سب میں اختیار کیا گیا ہے کیونکہ اگر بطور تحقیق الحقیقت بات کی جاتی تو بجز خاص الخاص لوگوں کے کوئی بھی اس کا مطلب نہ سمجھ پاتا مثلاً اگر طلوع کی نسبت بجائے سورج کے زمین کے افق یا زمین والوں کی طرف کی جاتی تو یقیناً یہ لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتی۔

علی ہذا چونکہ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ سورج چلتا اور طلوع وغروب ہوتا ہے اس لئے یہ نسبت سورج ہی کی طرف مناسب ہے تاکہ جو اصل مطلوب ہے یعنی لوگوں کو اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری پر لانا وہ پورا ہو سکے اس لئے ہر آدمی اپنی سمجھ کی بساط کے مطابق اللہ جل شانہ پر ایمان کا مکلف ہے جو تفصیلی ایمان سے قاصر ہے اس کے لئے مجمل بھی کافی ہے۔اس اصولی تمہید کے بعد اصل اعترج کا جواب یہ ہے کہ مستقر سے مراد ٹھہرنے کی جگہ نہیں

جو حقیقی مستقر ہوتی ہے بلکہ اضافی ہے یعنی سورج جس افق پر ہوتا ہے اس سے بجانب مشرق رہنے والوں کے لئے وہی مستقر ومغرب ہے جیسا کہ عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"فالمرادبذالك ان كل قوم تغرب عليهم او تطلع فان ذالك استقرارلهابالاضافة الينااوان كانت هي في حركتهاالدائمة الغائبة عنّاوهواستقرارفي المشاهدة عنّافعبّرعن زوال الحركة المشاهدة بالاستقراربالاضافة الينا" الخ۔

یعنی سورج جن لوگوں کے حس ومشاہدہ سے غائب ہوجاتا ہے ان کی بنسبت وہی مغرب سورج کا مستقر ہے اگر چہ سورج اس وقت بھی جاری وساری رہتا ہے، علی ہذا سورج کے سجدہ سے مراد ہر وقت اللہ کے حکم سے چلنا ہے کہ جب طلوع وغروب ہر آن میں لازمی ہیں تو اجازت بھی آناً فآناً ضروری اور تعمیل بھی لازمی ہے جس کو سجدہ سے تعبیر کیا اور یہی مطلب عرش کے نیچے جانے کا ہے کیونکہ وہ ہر وقت عرش کے نیچے ہی ہوتا ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سورج ہر وقت اللہ کے حکم کے ماتحت چلتا ہے، اسی کے ملک وسلطنت میں رواں دواں ہوتا ہے اور اسی کے حکم کا ہر وقت منقاد ہوتا ہے اور جب اسے واپسی کا حکم ہوگا تو وہ آگے نہیں بڑھ سکے گا بلکہ واپس پلٹ کر مغرب سے غروب ہوگا جو جمعہ کی رات ہوگی لوگوں پر بہت طویل ہوگی اور جب نصف النہار کے دائرے تک مثلاً بارہ گھنٹے واپس چلے گا تب اس کو معمول کے مطابق چلنے کا حکم ہوگا۔

سورج کے واپسی کے ساتھ ہی توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا البتہ ایک قول کے مطابق اس کے بعد نئے گناہوں سے توبہ قبول ہوگی مگر توبہ کرنے والے کہاں ہوں گے؟ کہ لوگ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھیں گے پھر توبہ کس چیز سے کریں؟

(۲)...نیوٹن کا اصول:۔ نیوٹن ایک مشہور سائنس دان گذرے ہیں ان کے اصول دنیا میں آج تقریباً اتنے ہی مقبول ہیں جتنے کسی زمانے میں افلاطون وغیرہ کے مقبول عام تھے اگر چہ افلاطون والوں کے بہت سے اصول آج غلط ثابت ہوئے ہیں مثلاً فلک الافلاک کی گردش، ستاروں کا چھٹے آسمان میں ہونا، سورج کا چوتھے اور چاند کا نچلے آسمان میں ہونا وغیرہ وغیرہ مگر نیوٹن تا حال سائنس کی دنیا کے ہیرو شمار ہوتے ہیں، ان کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کسی چیز کو حرکت دی جائے تو جب تک کوئی مانع حرکت پیش نہ آئے وہ حرکت دائمی ہوگی علی ہذا چونکہ زمین سورج سے ایک دھماکے کے نتیجے میں علیحدہ ہوگئی تھی تو اس وقت جو رفتار اس کی محوری حرکت کی تھی وہ ابدالابد تک باقی رہے گی، علی ہذا یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب دن رات زمین کی محوری گردش کا نتیجہ

ہیں اور یہ گردش دائمی ہے تو پھر سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے لئے زمین کی حرکت میں تبدیلی چاہیے۔

علم طبیعیات کے قوانین کا جائزہ:۔ دراصل یہ قانون ایک بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اگر اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے تو اصل حقیقت بآسانی منکشف ہو جائے گی، غلط فہمی یہ ہے کہ جب دو چیزوں کے درمیان تسلسل سے معیت دیکھی جائے تو وہاں لزوم کا یقین سا ہو جاتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان تلازم ہے اور یہ نفسیات صرف آج کے انسان کی ہی نہیں بلکہ زمانۂ قدیم سے انسان اس بیماری کا شکار چلا آرہا ہے مثلاً ہزاروں سال پہلے نام نہاد حکماء نے عالم کے قدیم ہونے کا نظریہ اس لئے پیش کیا تھا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے قیامت برپا ہوتی ہوئی نہیں دیکھی تھی، مشرکین عرب نے کسی مردے کو قبر سے اٹھتا ہوا میدان محشر کی جانب جاتا ہوا نہیں دیکھا تھا تو پہلے فریق نے کہا کہ عالم قدیم ہے کیونکہ اگر حادث ہوتا تو اب تک ختم ہو جانا چاہیئے تھا جبکہ دوسرے نے حشر اجساد کا انکار کیا کیونکہ ان کے بزعم اگر قیامت کی بات سچ ہوتی تو اب تک آجانی چاہیئے تھی۔

علی ہذا القیاس لوگ جب بھی آگ کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ حرارت کا بھی تصور کرتے ہیں اور دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں اسی پر باقی اشیاء کو قیاس کر لیا جائے مگر حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ اجسام طبیعیہ کو دیکھتے ہوئے یہ غلط فہمی پیدا ہونا اگرچہ متبادر ہے لیکن یہ قاعدہ اس وقت درست ہوتا جب یہ تقاضے ان اجسام کے ذاتی ہوتے اور ان میں کسی طرح بیرونی قدرت کا عمل دخل نہ ہوتا، پس جن لوگوں نے ان مقتضیات کو اجسام طبیعیہ کی ذوات تک محدود رکھا انہوں نے ان قواعد کو کلیات کی حیثیت دیدی اور کلیات بھی ایسی جن سے کسی طرح کبھی بھی تخلف و انفکاک نہ ہو سکے حالانکہ یہ ضروری ہے کہ ان مقتضیات میں کبھی کبھار انفکاک و تخلف بھی آئے۔

چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت شریفہ تو یہی ہے کہ جب اشیاء پیدا فرماتے ہیں تو ان کے ساتھ کچھ تاثیرات ضرور پیدا فرماتے ہیں مگر یہ لزوم عادی ہے یہ نہ تو تولیدی ہے جیسے معتزلہ کہتے ہیں اور نہ ہی اعدادی ہے جیسے حکماء کہتے ہیں جس کی وضاحت ''باب کراھیۃ البول فی المغتسل'' میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد: اول ص: ۱۳۸)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی صفت تدبیر سے اشیاء میں ایک ترتیب مقرر فرمائی ہے طعام میں بھوک

مارنے اور پانی میں پیاس بجھانے کی خصوصیت ضرور رکھی ہے جس سے لزوم کا تأثر ملتا ہے مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر ماہیت میں اس قاعدے سے کچھ استثناء بھی ہوتی ہے تاکہ لوگ اس تلازم کو مادہ اور جسم کی طبیعت کی طرف منسوب نہ کریں بلکہ اللہ عزوجل کو اس کا خالق و مالک مانیں جس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔

دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام جس آگ میں ڈالے گئے تھے تو وہ اس تاثیر سے خالی تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچے کو قتل کر دیا تھا وہ ماہیتِ انسانی یعنی فطرت سے معرا تھا، لاٹھی غیر جاندار چیز ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدھا بن کر ساحروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کو ہڑپ کر گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے، بعض دفعہ آدمی بغیر اسباب ظاہریہ کے ہوا میں معلق ہوتا ہے جس کو ٹیلی پیتھی کا اصول بھی تسلیم کرتا ہے جو برطانیہ و جاپان میں جاسوسی کے حوالے سے خاصا مقبول ہے۔

غرض اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسباب تو پیدا کئے ہیں مگر اپنا وجود منوانے کے لئے بعض دفعہ ان کی تاثیرات کو سلب کرتا ہے اور بعض دفعہ افراد کو ماہیت کے حکم و تقاضا سے الگ کرتا ہے، اس لئے شہد کی مکھیوں میں پھولوں کا رس چوسنے کا مزاج ڈالا مگر بعض پیشاب پر بیٹھی ہیں، بعض کھیرا کڑوا ہوتا ہے اسی طرح ہسپتال کے ڈاکٹر جمع ہو جاتے ہیں اور ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے ہیں مگر ان کے درمیان سے مریض کی جان پرواز کرتی ہے ان کا سارا نظام فیل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک روز ایسا آئے گا جب دنیا کے معاملات وحقائق الٹ جائیں گے کمینے اشراف بن جائیں گے اور اشراف بے قدر کر دئے جائیں گے تو اللہ عزوجل اس نظامِ زمان کو پلٹ دے گا تاکہ لوگوں کے لئے درس عبرت ہو مگر اس وقت صرف بصارت ہوگی بصیرت نام کی کوئی چیز باقی نہ ہوگی، اگر طول کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس موضوع کو تھوڑا سا اور اُجاگر کرتا مگر ''العاقل تكفيه الاشارة، وللجاهل لاتكفى المنارة''۔

باب ماجاء في خروج ياجوج وماجوج

"عن زينب بنت جحش قالت استيقظ رسول الله صلى الله عليه وسلم من نوم مُحمَرًّا وجهُهُ وهو يقول: لاإلٰهَ الّا اللّٰه يردِّدُها ثلث مرات ويل للعرب من شرٍّ قد اقترب فتح اليوم من رَدمِ ياجوج وماجوج مثل هذه وعقد عشراً قالت زينب: قلت: يارسول الله أفنهلك وفينا

الصالحون؟ قال: نعم اذا كثر الخبث"۔[1] (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت ام المؤمنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے: ''لا الٰہ اللّٰہ'' تین بار اس کو دہرایا، ہلاکت آگئی عربوں کی ایک قریب آنے والے شر سے، آج یاجوج وماجوج کی دیوار میں اتنی جگہ کھل گئی اور (اس کے ساتھ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس کا عقد بنالیا، حضرت زینبؓ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم ہلاک ہوں گے جبکہ ہمارے سرمیان نیک لوگ بھی ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں جب گناہ عام ہوجائیں گے۔

لغات:۔قولہ "محمر" بروزن مضطر یعنی بتشدید الراء احمارّ الشئ اس وقت کہتے ہیں جب وہ بتدریج سُرخ ہوجائے۔قولہ "ردم" بروزنِ شمس، سدّ سکندری مراد ہے یعنی وہ دیوار جس کو ذوالقرنین نے بنایا تھا۔ قولہ "یاجوج وماجوج" یہ اَلفین اور ہمزتین دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے، دونوں عجمی نام ہیں، بعض نے عربی کہاہے اگران کو عربی مانا جائے تو پھر یہ دونوں کس سے مشتق ہیں، اس میں اختلاف ہے کسی نے کہا کہ احیج النار سے مأخوذ ہے، اَجّتِ النار اَجّاً و اَجیجاً اس وقت کہتے ہیں جب آگ بھڑک جائے، بعض نے کہا کہ اَجّۃ بمعنی اختلاط کے ہے، وفیہ اقوال آخر۔قولہ "وعقد عشراً" دس کا عقد یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی کے ناخن کا سرا ابہام کے جوڑ سے اندر کی جانب ملاکر حلقہ بنایا جائے۔

تشریح:۔اس حدیث مبارک میں جس قریبی شر کا ذکر ہے اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ یہ یاجوج وماجوج کے علاوہ کسی دوسرے فتنے کی طرف اشارہ ہو جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی ناپاک جسارت مثلاً۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد وہی یاجوج وماجوج کا فتنہ ہو اور عربوں کی تخصیص ان کے علو مقام کی وجہ سے ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت عجمی دنیا سے اسلام کی بساط لپیٹ دی گئی ہوگی اور صرف عربوں بلکہ جزیرہ نماعرب تک باقی ہوگی جیسا کہ باقی روایات سے ثابت ہے کہ اسلام سمٹ کر حجاز کی طرف ایسا ہی آئے گا جیسے سانپ اپنے بل میں، اور جنگلی بکری پہاڑ کی چوٹی میں پناہ لیتی ہے۔

اس روایت میں اور بخاری شریف کی روایت میں بظاہر تعارض سا معلوم ہوتا ہے جس میں ہے: ''دخل

باب ماجاء في خروج ياجوج وماجوج

[1] الحديث اخرجه ايضاً البخاري ص: ١٠٥٦ ج: ٢ "باب ياجوج وماجوج" كتاب الفتن.

علیھا یومافزعاً'' [۲] مگران میں تطبیق آسان ہے کہ آپ علیہ السلام نیند سے بیدار ہوئے اور جلد ہی ان کے گھر میں تشریف لے گئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور گلاب کی طرح سرخ ہو چکا تھا۔

اسی طرح اس روایت کا اس سے بھی تعارض نہیں ہے جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسعین یعنی نوّے کا عقد بنایا تھا [۳] کیونکہ اصل مقصد عدد بتانا نہیں تھا بلکہ حلقہ اور سُراخ کا اندازہ بتانا تھا، عارضہ میں ہے: ''وفقھه انه لم یقصدبه العددفیعارض قوله:"انالامة امیّة"وانماجاء لبیان صورة معینة خاصة''۔

اس باب میں تین باتیں قابل ذکر ہیں، ان ہر سہ مسائل پر مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ نے قصص القرآن میں بڑی تفصیل سے بحث فرمائی ہے یہاں اس کا خلاصہ پیش ہے۔ حدیث باب میں اگرچہ ذوالقرنین کا تذکرہ نہیں ہے مگر یہ تینوں مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اس لئے کچھ عرض مناسب ہے۔

(۱) ذوالقرنین کے نام اور نسب میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ سکندر نام کی دو شخصیتیں گذری ہیں، بعض مفسرین ومؤرخین نے ان کو خلط ملط کر کے پیش کیا ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے اصل صورت حال اس طرح پیش کی ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا، دوسرا شخص اسکندر بن فیلپس (مقدونی) تھا لوگ اس دوسرے مقدونی کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے حالانکہ دونوں کے درمیان دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ حائل ہے، مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے گذرا ہے اور اس کا وزیر ارسطاطالیس (ارسطو) فلسفی تھا، یہ ایک بت پرست، مشرک، ظالم بادشاہ تھا، یہ شخص رومی ویونانی تھا جبکہ ذوالقرنین جن کا تذکرہ قرآن میں ہے، عربی سامی مؤحد عادل بادشاہ تھا ان کا وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے، کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ امام بخاری کے طرز سے بھی اس کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ واللہ اعلم

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین کے معاملہ میں ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو اہل مشرق میں سے تھا جیسا کہ بعض کا خیال جغفور چین کی جانب ہے اور نہ اہل مغرب میں سے تھا اور نہ ہی یمن والوں میں سے تھا بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان علاقہ کا باشندہ تھا بلکہ وہ سب سے جدا ایک نیک بادشاہوں میں سے

---

[۲] حواله بالا۔ [۳] كذا فى رواية البخارى ص: ۴۷۲ ج: ۱ كتاب الانبياء عن ابى هريرة ايضاً ۷۹۸ ج: ۲ "باب الاشارة فى الطلاق" كتاب الطلاق، مسنداحمد ص: ۱۳ ج: ۳ حديث: ۸۲۹۲ وفيه: وعقد وهيب تسعين.

تھا جن کا نسب قدیم سامی عرب تک پہنچتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کہ خود مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے اس پر بہت زور لگایا ہے کہ ذوالقرنین کے بارے میں اکثر روایات تاریخی اعتبارات سے صحیح نہیں ہیں اس لئے ان کی اپنی تحقیق یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد ایران کا وہ بادشاہ ہے جو ۵۵۹ قبل از مسیح علیہ السلام گذرے ہیں جن کا نام خورس (سائرس) ہے ان کو یہود خورس، یونانی سائرس اہل فارس گورش اور عرب مؤرخین خسرو کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ شخص اس دور میں گذرے ہیں جب وسیع تر ایران دو حصوں میں منقسم تھا، شمالی مغربی حصہ کو میڈیا (ماہات) اور مغربی حصہ کو فارس کہا جاتا تھا، یہ شخص اپنی مقبولیت کی بناء پر ان دونوں حکومتوں، بابل اور نینوئ کو باہم ملانے میں کامیاب ہوا، اسی نے بخت نصر کے جانشین بیل شازار کو شکست دی اور یہود کو دوبارہ بیت المقدس میں آباد کیا اور آسمانی مذہب کو پروان چڑھایا، اس کی دلیل مولانا نے یہ دی ہے کہ قرآن میں ذوالقرنین کا قصہ یہود کے سوال کے جواب میں بیان ہوا ہے لہٰذا اس کا مصداق ایسا شخص ہونا چاہئے جس سے یہود کے حالات ومفادات وابستہ ہوں اور وہ یہی خورس ہیں کیونکہ بخت نصر نے یروشلم (بیت المقدس) کو تاخت وتاراج کر کے یہود کو قتل وقیدی بنایا، ان میں سے ایک حضرت دانیال علیہ السلام بھی تھے، پھر جب بخت نصر مر گیا تو ذوالقرنین یعنی خورس بابل کو فتح کر کے یہود کے لئے نجات دہندہ ثابت ہوئے۔

(۲)....دوسرا امر: ذوالقرنین کی دیوار سے متعلق ہے، بقول مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے خورس (ذوالقرنین) کی مغربی فتوحات کے منتہیٰ سے مراد بحر اسود ہے جبکہ مشرق سے مراد مکران ہے کہ یہاں کی آبادی ہر طرح کی انسانی سہولیات درختوں اور چھتوں سے خالی تھی، تیسرا سفر بجانب شمال کر کے بحر کیپسین سے آگے کوہ قاف کے پہاڑی سلسلوں کے ایک درے کے درمیان مضبوط دیوار قائم کر کے مشرقی ایشائی ممالک چین اور منگول کے لوٹ مار کرنے والوں کا راستہ بند کر دیا چونکہ وہ پہاڑی سلسلے انتہائی دشوار گذار اور برف پوش ہیں اس لئے درے کے بند ہونے سے زمینی رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ چونکہ ایشیا اور یورپ کے درمیان حد فاصل کوہ قاف جسے ''کاؤ کاس'' کہتے ہیں کا پہاڑی سلسلہ ہے جس کی لمبائی شمالاً وجنوباً بارہ سو کلومیٹر ہے، یہ بحیرہ کیپسین سے آزربائیجان، آرمینیا اور جارجیا کے مغرب میں اور مغربی روس تا بحر اسود پھیلا ہوا ہے، اور اس کے مشرق میں دوسرا سلسلہ ''اورال'' کا ہے

یہ انتہائی شمال یعنی قطب شمالی کے قریب سے شروع ہوتا ہے اور جنوب کی طرف بڑھتا ہوا ماسکو کے مشرق میں قازقستان کے انتہائی جنوب میں جاکر ختم ہوجاتا ہے اس کی لمبائی دو ہزار چار سو (۲۴۰۰) کلومیٹر ہے۔

دوسری طرف چین، افغانستان اور تاجکستان کے سنگم پر پامیر دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلوں کا مصدر ومنبع ہے اس سے کوہ ہمالیہ، قراقرم اور کوہ ہندوکش بھی نکلتے ہیں جن میں اول الذکر برما تک پہنچتا ہے، یہ بھی دو ہزار چار سو کلومیٹر لمبا ہے، جبکہ قراقرم پاکستان میں اور ہندوکش افغانستان میں جانکلتے ہیں، اسی پامیر سے دو اور پہاڑی سلسلے نکلتے ہیں، یہ دونوں چین کے اندر ہیں، ایک بجانب مشرق جاتا ہے اس کو ''کولون'' کہتے ہیں، یہ تقریباً سولہ سو کلومیٹر لمبا ہے جبکہ اس کے ساتھ دوسرا بھی تقریباً سولہ سو کلومیٹر ہے، یہ پہلے شمال میں کرغیزستان میں داخل ہوتا ہے اور پھر مشرق کی جانب مڑ جاتا ہے۔

اس کے برعکس ''اورال'' کے مشرق جو روس کا مغربی حصہ بنتا ہے سے بحر شمالی کے ساحلی علاقے یعنی شمالی مشرقی روس سائبیریا تک پورا علاقہ میدانی وصحرائی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ چین اور منگولیا سے پیدل سفر کرنے والوں کے لئے مشرق وسطی تک رسائی کا آسان راستہ شمالی ایشیاء کی ساحلی پٹی اور ماسکو کے راستے پہاڑی دروں سے ہوتا ہوا بحر کیسپین تک ہی تھا بالفاظ دیگر چائنا اور منگولیا کے لوگ شمال میں ساحلی علاقے میں پہلے مغرب کی جانب جاکر پھر جنوب کی طرف مڑ کر دروں میں سے ہوتے ہوئے آرمینیا، آزربائجان اور دیگر علاقوں کی طرف جانکلتے اور وہاں لوٹ مار کا بازار گرم کرتے، جس کی روک تھام کے لئے ذوالقرنین نے پاٹک بند کردیا، اور اس قسم کی دیواریں اس زمانے میں تحفظ کا کامیاب ذریعہ تھا چنانچہ چینیوں نے بھی منگولیوں سے بچنے کے لئے دیوار بنائی تھی جو آج تک قائم ہے۔

(۳)....یاجوج وماجوج کون ہیں؟ بقول مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کے یہ دراصل اسی خطے کے دو قبیلے ہیں جس کا ذکر ابھی اوپر گذر گیا یعنی منگولیا تا تار اور چینی، ان کے دو بڑے قبیلے ہیں ایک کا نام ''موگ'' ہے اور دوسرے کا نام ''یوچی'' (یواجی) ہے، موگ تقریباً چھ سو برس قبل از مسیح یونان میں میک اور میگاگ بنا اور عربی میں ''ماجوج'' ہوا جبکہ غالباً یہی یواجی (یوچی) یونانی میں یوگاگ اور عبرانی اور عربی میں جوج اور یاجوج کہلایا۔ (قصص القرآن ص: ۱۹۵ تا ۱۷۹ جلد: سوم وچہارم، دار الاشاعت)

المسترشد عرض کرتا ہے کہ مولانا موصوف کی یہ تحقیق اپنی جگہ بہت وقیع سرمایہ ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ کے عین مطابق ہو مگر اس میں جو بڑی خامی رہ گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں ان احادیث کی طرف کوئی

اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے جو صحیح ہے ٹھیک ہیں کہ یاجوج وماجوج کے بارے میں بہت ساری من گھڑت روایات بھی پائی جاتی ہیں جن میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا مگر جہاں تک باب کی روایت ہے تو یہ صحیح ہے، شیخین نے بھی اس کی تخریج کی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ امام دار قطنیؒ نے اپنی اس کتاب ''العلل الواردۃ فی الاحادیث النبویۃ'' میں جہاں امام بخاریؒ کی بہت سی احادیث پر اعتراضات کئے ہیں، باب کی حدیث ان میں شامل نہیں۔

بہر حال اگر مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کی تحقیق کو صحیح مانیں تو آج کے حالات کی روشنی میں یہ کہنا شاید بجا ہو کہ روس اور چین دونوں گرم پانیوں کی تلاش میں عرصہ سے مارے مارے پھر رہے ہیں، چین، پاکستان کی آؤ بھگت کر رہا ہے تا کہ اس کو کراچی اور گوادر تک رسائی حاصل ہو مگر دوسری طرف امریکہ نے پاکستان کو اپنی آغوش میں دبایا ہوا ہے، مع ہذا بھارت امریکہ کے اشارے پر قراقرم پر قبضہ کرنے کا خواہاں ہے، ممکن ہے کل حالات ایسے بنیں کہ چین کے لئے یہ واحد راستہ بند ہو جائے اور وہ روس کے ساتھ مل کر شمالی روس کی ساحلی محفوظ پٹی کا راستہ استعمال کر کے اس پاٹک کو دوبارہ کھولیں جس کو ذوالقرنین نے بند کیا تھا، چونکہ چین، منگول اور روس نظریاتی اعتبار سے بھی ایک ہیں اور سیاسی اعتبار سے بھی امریکہ و یورپ کے حریف ہیں اس لئے مستقبل میں ان کا اتحاد اور گرم پانی تک رسائی کے لئے سدذوالقرنین کو دوبارہ کھولنا مستبعد نہیں، یہ وہ زمانہ ہوگا جب مشرق وسطی کی سیال دولت تیل میں دنیا والوں کے لئے بہت جاذبیت ہوگی ملکوں اور قوموں کی موت وحیات کا دارومدار تیل پر ہوگا، اس لئے لڑنا اور مرنا ایک ضروری اقدام سمجھا جائے گا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

سوال:۔ رہا یہ سوال کہ باب کی روایت کے مطابق یاجوج وماجوج اس سد یعنی دیوار میں سُراخ کر چکے ہیں اور یہ بات تو سابق الذکر پس منظر سے مطابقت نہیں رکھتی؟

جواب:۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں خواب کا ذکر ہے اور انبیاء علیہم السلام کا خواب بلاشک وشبہ اگرچہ وحی ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ خواب عالم مثال میں دیکھا جاتا ہے اور عالم مثال میں اشیاء دنیا میں وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی مجسم ہو کر دکھائی دینے لگتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ خواب میں جو بات دیکھی جائے وہ اسی وقت عالم مشاہدہ میں واقع ہو چکی ہو یا جلد واقع ہو جائے بلکہ اس میں سالہا سال بھی لگ سکتے ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرے کا خواب ہے، علی ہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرب قیامت کے مناظر، اشراط وفتن عالم مثال میں دیکھتے تھے اور قیامت تک پورا منظر ان کے

سامنے تھا اس کا یہ مطلب لینا کہ جو کچھ انہوں نے بیان فرمایا، وہ فوراً اور بالفعل رونما ہو شاید صحیح نہ ہوگا، پس مطلب یہ ہوا کہ جب یاجوج وماجوج اس دیوار کو گرانے کی کوشش کریں گے تو اس میں وہ اپنے آلات کے ذریعہ سوراخ کریں گے مگر ان کو کامیابی نہیں ملے گی، ایک دن وہ ان شاء اللہ کہیں گے خواہ عمداً ہو یا غیر ارادی طور سے پس وہ اس سوراخ کو بڑا کرنے میں کامیاب ہوں گے اور سب قفقاز، کوہ قاف اور دیگر پہاڑوں سے ہوتے ہوئے مشرق وسطیٰ میں داخل ہوں گے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

مگر اس حدیث کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے جس کو نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب نہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پُراسرار مخلوق ہو جو اللہ نے اپنے حکم وحکمت سے ہماری نظروں سے اوجھل رکھی ہو اور جب حکم ہوگا تو وہ کود پڑے گی، اس لئے قدیم شارحین حدیث نے اس مسئلہ پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے چنانچہ امام نوویؒ کی عادت خوب تشریح کرنا ہے مگر وہ اس مسئلہ پر خاموشی سے گذرے ہیں۔

ملحوظ:۔ اگر کسی کو پہلی تحقیق پسند ہو تو حدیث کی جو شرح راقم نے عالم مثال کے حوالے سے کی ہے اس کے لئے عالم مثال کی حقیقت سمجھنا لازمی ہے جو حجۃ اللہ البالغہ لشاہ ولی اللہؒ اور تحقیق الرؤیا لشاہ عبدالعزیزؒ کے دیکھنے اور سمجھنے پر موقوف ہے۔

روایات سے جو امر مترشح ہوجاتا ہے وہ یہ ہے کہ اولاً اہل مغرب کے ساتھ مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کی لڑائی ہوگی اور میدان جنگ مشرق وسطیٰ کا علاقہ ہوگا، شروع میں مسلمانوں کو برتری نصیب ہوگی پھر یہود جو کہ آج کل امریکہ ویورپ پر بڑا اثر ورسوخ رکھتے ہیں اپنے دجال کے ساتھ میدان میں کود پڑیں گے پھر وہ حالات رونما ہوں گے جن کا تذکرہ ان شاء اللہ آگے ابواب میں آرہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل فرمائیں گے اور یہود کا خاتمہ فرمائیں گے ثانیاً اتنے میں یاجوج وماجوج کا طوفان اُمڈ آئے گا، گویا پہلا سیلاب مغرب سے آئے گا اور دوسرا مشرق سے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی صفة المارقة

"عن عبدالله قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: یخرج فی آخرالزمان قوم احداث الاسنان سُفهاء الاحلام، یقرء ون القرآن لایجاوزتراقیهم یقولون من قول خیرالبریة یمرقون من الدین کمایَمرُقُ السهمُ من الرمیة" ۔[1] (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آخری زمانہ میں ایک ایسی قوم نکلے گی جو کہ جواں سال ہوگی خفیف العقل ہوگی وہ لوگ قرآن پڑھیں گے وہ ان کی ہنسلی کی ہڈی سے آگے نہیں بڑھے گا (یعنی گلے سے) وہ خیر البریہ کے مطابق بات کریں گے (یعنی آیات کونقل کریں گے) نکلیں گے وہ دین سے ایسے جیسے تیر نشانہ سے گذرتا ہے (یعنی پار ہو جاتا ہے)۔

لغات: قولہ "احداث" حَدَث بروزن قمر کی جمع ہے نئی اور تازہ کو کہتے ہیں مراد چھوٹی عمر ہے۔ قولہ "الاسنان" سن کی جمع ہے بمعنی عمر کے۔ قولہ "سفهاء الاحلام" حِلم بکسر الحاء کی جمع ہے عقل کو کہتے ہیں اور سفہاء سفیہ کی جمع ہے جیسے فقہاء جمع فقیہ اور حکماء جمع حکیم کی ہے، سفہ خفت وہلکاپن کو کہتے ہیں، سفیہ وہ آدمی ہوتا ہے جس کی عقل کم اور رائے ناقص ہو جو نفع نقصان کے مواقع نہ جانتا ہو چنانچہ اسی معنی کے پیش نظر بچوں اور عورتوں کو سفہاء کہا گیا ہے قال اللہ تعالیٰ: "ولاتؤتوا السفهاء اموالکم التی جعل الله لکم قیاماً"۔[2] قولہ "تراقیهم" ترقوۃ کی جمع ہے ہنسلی کی ہڈی کو کہتے ہیں اور مجازاً حلق و گلے پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو یہاں مراد ہے۔ قولہ "من قول خیرالبریة" مراد اس سے قرآن پڑھنا ہے جیسے کہ مسلم کی متعدد روایات میں تصریح ہے۔ قولہ "الرمیة" بمعنی مفعول یعنی مرمیۃ، نشانے کو کہتے ہیں یعنی جیسے تیر یا آج کل گولی نشانے کو چیر پھاڑ کر نکلتی ہے اسی طرح یہ لوگ بھی دین سے یا اطاعت خلیفہ سے بنابر اختلاف قولین نکلیں گے۔

تشریح: چونکہ اسی باب میں آگے اس کی تفسیر خوارج سے کی گئی ہے جو حروراء کے رہنے والے تھے، یہ مقام کوفہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے، یہ خوارج کا مرکز تھا اور مسلم کتاب الزکوٰۃ کے آخر میں

باب ماجاء فی صفة المارقة

[1] الحدیث اخرجه البخاری ص: ۴۷۲ ج: ۱ کتاب الانبیاء، ایضاً فی المناقب والمغازی والتوحید وغیرہ، ومسلم فی کتاب الزکوٰة، ابوداؤد کتاب السنة باب: ۲۸، سنن نسائی زکوٰة باب: ۷۹، ابن ماجه مقدمه باب: ۱۲، مؤطا مالک مس القرآن باب: ۱۰، مسنداحمد ص: ۳۷۱ ج: ۳ حدیث: ۱۰۶۲۵۔ [2] سورة النساء آیت: ۵.

''باب اعطاء المؤلفة ...وبیان الخوارج'' [۳] میں بھی متعدد روایات بعض اشارۃً اور بعض صراحۃً اس پر ناطق ہیں کہ اس کا مصداق خوارج ہیں اس لئے آخرالزمان سے مراد اس خلافت کا آخری دور لیا جائے گا جو بطرز نبوت تھی، چنانچہ صحیح ابن حبان میں ہے: ''الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم تصیر ملکاً'' ۔ [۴] حافظ جلال الدین سیوطیؒ تاریخ الخلفاء کے مقدمہ میں اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں: ''اخرجه اصحاب السنن وصححه ابن حبان وغیره'' ۔(ص:۸، قدیمی کتب خانہ) اور خوارج کا خروج ۳۸ھ میں ہوا ہے۔

خوارج نے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی مصالحت پر اعتراض کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ جملہ کہا: ''ان الحکم الا اللہ'' جس کے متعلق مشہور ہے: ''کلمة حق وارید بها الباطل'' اس کے ساتھ انہوں نے الگ ہو کر مستقل مذہب کی تاسیس کی اور مرتکب کبیرہ کو کافر کہنے لگے، بعد میں مزید غلو کرتے ہوئے بعض مرتکب صغیرہ کو بھی کافر ٹھہرانے لگے اس طرح ان کے بیس فرقے بن گئے۔

جو حضرات ان کی تکفیر کرتے ہیں وہ: ''یمرقون من الدین'' میں دین سے مراد ایمان واسلام لیتے ہیں، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ: ''اختلف العلماء قدیماً (یعنی ان کی تکفیر میں)... والصحیح انهم کفار لقوله صلی اللہ علیه وسلم: یمرقون من الدین'' الخ مگر جو حضرات ان کو کافر نہیں کہتے ہیں یعنی احتیاطاً جو کہ جمہور سلف کا مذہب ہے وہ یہاں دین سے مراد اطاعت لیتے ہیں یعنی یہ لوگ خلیفۂ وقت کی طاعت سے ایسے خارج ہوں گے جیسے تیر نشانہ میں داخل ہونے کے بعد فوراً نکل جاتا ہے، یہ تشبیہ ہے کہ یہ لوگ پہلے داخل ہوں گے مگر پھر جلد ہی نکل جائیں گے، اور قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے آگے تجاوز نہیں کرے گا یعنی دل میں داخل نہ ہوگا تا کہ اس کو سمجھیں یا اس پر عمل کریں یا اوپر کی طرف نہیں جائے گا یعنی قبولیت کے لئے نہیں جائے گا کہ مقبول کلمات وعبادات صعود کرتے ہیں قال اللہ تعالیٰ: ''الیه یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه'' [۵] خوارج بحیثیت جماعت آج موجود نہیں ہیں۔

---

[۳] صحیح مسلم ص:۳۳۷ ج:۱۔ [۴] وفی روایة مسند احمد: الخلافة ثلاثون عاماً ثم یکون بعد ذالک الملک ص:۲۸۹ ج:۶ حدیث: ۲۱۳۱۲۔ [۵] سورۃ الفاطر آیت:۱۰۔

باب ماجاء فی الاثَرَة

”عن أُسید بن حُضیران رجلاً من الانصار قال: یارسول اللّٰہ اِستعملتَ فلاناً ولم تستعملنی فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: انکم سترون بعدی أثرۃً فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض“۔ [1] (حسن صحیح)

حضرت اسید بن حضیر (دونوں مصغر ہیں) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انصار میں سے ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ نے فلاں کو عامل بنایا اور مجھے مقرر نہیں کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک عنقریب تم میرے بعد ترجیحات دیکھو گے پس صبر کرتے رہنا یہاں تک کہ حوض (کوثر) پر مجھ سے آملو!۔

لغات:۔ استعملت، استعمل بمعنی عامل بنایا۔ قولہ ”اثرۃ“ بفتحات بمعنی ترجیح کے، ایثار سے ہے یعنی آنے والے اکثر امرا مستحقین کو ان کا حق نہیں دیں گے بلکہ مستحقین پر خود کو اور اپنے متعلقین کو ترجیح دیں گے۔

تشریح:۔ ان صحابی کو آپ علیہ السلام نے یہ جواب اس لئے دیا کہ وہ گھبرا گئے تھے کہ شائد آپ علیہ السلام نے دوسرے کو مجھ پر ترجیح دے کر مجھے ناپسند کیا، حاصل جواب یہ ہے کہ ایثار تو امور دنیا میں ہوتی ہے جبکہ عامل مقرر کرنا امور مسلمین میں سے ہے نیز ہم کسی خواہشمند یا مطالبہ کرنے والے کو نہیں بناتے ہیں مگر جب آپ کو اس پر بھی صبر نہیں تو بعد میں جب مشترکہ حقوق میں بہت سارے لوگوں کو یا انصار کو نظر انداز کیا جائے گا ان پر کیسے صبر ہوگا حالانکہ ترجیحات کا علاج صبر ہی ہے لہٰذا جب بعد میں تم کو تمہارے حقوق نہیں ملیں گے تو صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے قیامت کے دن آملو، پھر وہاں آپ کے لئے آپ کا حق وصول کیا جائے گا یا مطلب یہ ہے کہ اس صبر پر اتنا بڑا اجر مقرر ہے کہ آپ کوثر اور ساقئ کوثر سے شرفِ ملاقات نصیب ہوتا ہے۔

حدیث آخر:۔ ”عن عبداللّٰہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: انکم سترون بعدی أثرۃً وامورا تنکرونہا قالوا فما تأمرنا؟ قال: أدّوا الیہم حقہم واسألوا اللّٰہ الذی لکم“۔ (حسن صحیح)

باب ماجاء فی الاثرۃ

[1] اخرجہ ایضاً البخاری ص: ۱۰۴۵ کتاب الفتن، ایضاً فی کتاب المساقاۃ باب: ۱۴، الخمس باب: ۱۹، الجزیۃ باب: ۲ وصحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ حدیث: ۱۳۲، سنن نسائی ص: ۳۰۳ ج: ۲ کتاب ادب القضاۃ ”باب ترک استعمال من یحرص علی القضاء“۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آپ میرے بعد ترجیحات دیکھیں گے اور ایسی چیزیں دیکھیں گے جو آپ کو نا آشنا لگیں گی، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں (یعنی ایسے میں ہم کیا کریں؟ ان سے لڑیں یا صبر کریں؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو ان کے حقوق ادا کرتے رہئے اور اپنے لئے اس چیز کی دعا مانگیں جو آپ کے لئے ہے۔

تشریح:۔ یعنی وُلاۃ اور حکمرانوں کے خلاف کاروائی سے اجتناب کرتے رہو اور ان کی اطاعت میں لگے رہو اور اللہ سے سوال کرتے رہو کہ ان کی اصلاح فرمائے یا کوئی متبادل قیادت نصیب فرمائیں، یہ بھی ممکن ہے کہ: ''واسالو االلّٰہ الذی لکم'' سے مراد صبر ہو یعنی اللہ سے صبر و استقامت مانگو۔

یہ مسئلہ پیچھے مکرر گذرا ہے کہ حکومت وقت سے باقاعدہ لڑائی اور جنگ سے اجتناب کرنا چاہئے خصوصاً جب کامیابی کا امکان کم ہو ہاں البتہ اگر خطرہ نہ ہو تو ان کے منکرات کو بزور زبان روکنا چاہئے پھر خطرے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ صرف اپنی حد تک ہو، دوسرا یہ کہ اس کی وجہ سے دوسروں کو بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہو، پہلی صورت جائز بلکہ عزیمت ہے جبکہ دوم جائز نہیں چنانچہ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ شرح الخمسین میں لکھتے ہیں:

"ولیس ھو من باب قتالھم ولا من الخروج علیھم الذی وردالنھی عنہ ...
...واماالخروج علیھم بالسیف فیخشی منہ الفتن التی تؤدی الی سفك دماء المسلمین،نعم ان خشی فی الاقدام علیٰ الانکارعلی الملوك ان یؤذی اھلہ او جیرانہ لم ینبغ لہ التعرض لھم حینئذٍ لمافیہ من تعدّی الاذیٰ الی غیرہ" الخ۔

(ص:۳۹۲، دار ابن حزم حدیث نمبر:۳۴)

ہاں البتہ اگر حکمرانوں کے منکرات ایسے ہیں جو رعایا پر لاگو کرنا چاہتے ہیں تو اس میں نہ ان کی اطاعت جائز ہے اور نہ ہی ان کو قبول کیا جا سکتا ہے، غرض لڑائی سے گریز کرتے ہوئے اپنا دامن بچانا لازمی ہے، خواہ اس کے لئے عہدہ چھوڑنا پڑے یا ہجرت کرنا پڑے۔ تاہم اگر حالات ایسے آجائیں کہ علماء متفقہ طور پر خروج کا فتویٰ جاری کریں جو بظاہر ناممکن لگتا ہے، تو اس وقت فتویٰ پر عمل کیا جانا چاہئے بشرطیکہ اسباب کی رُو سے غلبہ کا قوی امکان ہو اور لڑائی کا مفید ثمرہ یقینی ہو مگر یہ شرائط آج کل ناممکن نظر آتی ہیں کہ اتنے اسباب جمع کرنا بعید از تصور ہے اور تقویٰ والی جنگ بھی آج نہیں ہو سکتی اور پھر جنگ کے بعد ثمرات و مفادات کی لڑائی بھی تقریباً یقینی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب مااَخبرَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصحابہ بماھو کائن الی یوم القیٰمۃ

”عن ابی سعید الخدری قال: صلّیٰ بنا رسول اللّٰہ یوماً صلاۃ العصر بنَھارٍ ثم قام خطیباً فلم یدع شیئاً یکون الی یوم الساعۃ اِلّا اَخبرَنَا بہ حَفِظَہ من حِفظِہ وَنَسِیَہ من نسیہ فکان فیما قال اِن الدنیا خَضِرَۃٌ حُلوَۃٌ وان اللّٰہ مُستَخلِفُکُم فیھا فناظر کیف تعملون اَلَا فاتقوا الدنیا واتقوا النساء وکان فیما قال: اَلَا لا تمنعَنَّ رجلاً ھیبۃُ الناس ان یقول بحق اذا علمہ قال فَبَکیٰ ابو سعید فقال: قد واللّٰہ رأینا اشیاء فَھِبنَا وکان فیما قال صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَلَا انہ یُنصَبُ لکل غادر لِوَاءٌ یوم القیٰمۃ بقدر غَدرَتہ ولا غَدرَۃَ اعظم من غدرۃ امام عامۃ یُرکَزُ لِواءُہ عند اِستِہ وکان فیما حفظنا یومئذ اَلَا ان بنی ادم خُلقوا علی طبقاتٍ شتّیٰ فمنھم من یولد مؤمناً ویحیٰ مؤمناً ویموت مؤمناً ومنھم من یولد کافراً ویحییٰ کافراً ویموت کافراً ومنھم من یولد مؤمناً ویحییٰ مؤمناً ویموت کافراً ومنھم من یولد کافراً ویحیٰ کافراً ویموت مؤمناً، اَلَا وان منھم بَطِیُٔ الغضب سریع الفیٔ ومنھم سریع الغضب سریع الفئی فتلک بتلک اَلَا وان منھم سریع الغضب بَطِیُٔ الفئی اَلَا وخیرھم بَطِیُٔ الغضب سریع الفئی وشرھم سریع الغضب بطِیُٔ الفئی، اَلَا وان منھم حسن القضاء حسن الطلب ومنھم سیئ القضاء حسن الطلب ومنھم حسن القضاء سیئ الطلب فتلک بتلک، اَلَا وان منھم سیئی القضاء سیئی الطلب اَلَا وخیرھم حسن القضاء حسن الطلب اَلَا وشرھم سیئ القضاء سیئی الطلب اَلَا وان الغضب جَمرۃ فی قلب ابن ادم، اَمَا رأیتم اِلیٰ حُمرۃ عینیہ وانتفاخ اوداجہ فمن اَحَسَّ بشیئ من ذالک فلیلصق بالارض قال وجعلنا نلتفت الی الشمس ھل بَقِیَ منھا شیئ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اَلَا انہ لم یبق من الدنیا فیما مضیٰ منھا اِلّا کما بَقِیَ من یومکم ھذا فیما مضیٰ منہ“۔ (حدیث حسن)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہم کو عصر کی نماز دن میں (یعنی معمول سے پہلے جلدی) پڑھائی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لئے

کھڑے ہوئے اور قیامت تک آنے والی کوئی چیز نہیں چھوڑی مگر ہمیں اس سے آگاہ فرمایا (یعنی موٹے موٹے تمام واقعات وحالات کے بارے میں بتلایا) یادرکھا اس کو جس نے یاد کیا اور بُھلا دیا اسے اُس نے جو بھولا پس آپ علیہ السلام نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس میں (ایک فرمان) یہ تھا کہ بے شک دنیا ہری ہری میٹھی میٹھی ہے اور یقیناً اللہ نے تم کو اس کا جانشین بنایا ہے تاکہ دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو پس دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو! اور اس ارشاد میں یہ بھی تھا کہ: خبردار لوگوں کا رعب کسی شخص کو حق بات کہنے سے ہرگز نہ روکنے پائے بشرطیکہ وہ اس کا حق ہونا جانتا ہو، راوی کہتا ہے کہ ابوسعید روئے اور فرمانے لگے بلاشبہ بخُدا ہم نے بہت سی چیزیں دیکھ لیں مگر ہم ہیبت زدہ ہوگئے (یعنی ان منکرات کو روک نہ سکیں کہ ان کی پشت پر حکام تھے) اس خطبے میں یہ بات بھی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگاہ ہو! کہ قیامت کے روز ہر بے وفا کے لئے اس کی غداری کے بقدر ایک جھنڈا گاڑا جائے گا (یعنی بطور علامت کے) اور عام سربراہ کی غداری سے بڑا کسی کا غدر نہیں اس کا علَمِ غدر اس کے سرین کے پاس نصب کیا جائے گا، اور ہم نے اس دن جو کچھ یاد کیا اس میں یہ بھی تھا: باخبر رہو کہ آدم کی اولاد مختلف طبقوں میں (تقسیم کرکے) پیدا کی گئی ہے ان میں بعض ایسے ہیں جو ایماندار پیدا کئے جاتے ہیں اور مؤمن رہتے ہیں اور بحالت ایمان مرتے ہیں، جبکہ ان میں ایسے بھی ہیں جو کافر پیدا کر دیئے جاتے ہیں، کافر رہتے ہیں اور حالت کفر میں مرتے ہیں، اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو مؤمن پیدا کئے جاتے ہیں، ایماندار رہتے ہیں اور کافر بن کر مرتے ہیں جبکہ ان میں بعض ایسے ہیں جو کافر پیدا ہوتے ہیں، کافر رہتے ہیں (یعنی اسی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں) اور ایماندار بن کر مر جاتے ہیں۔

آگاہ ہو جاؤ! کہ ان میں بعض ایسے ہیں جن کو دیر سے غصہ آتا ہے اور جلد ہی غصہ سے لوٹ جاتے ہیں، ان میں بعض ایسے ہیں جو جلدی غضبناک ہو جاتے ہیں اور جلدی واپس ہو جاتے ہیں پس ایک حالت دوسری کے بدلے میں برابر سرابر ہو جاتی ہے، آگاہ ہو! بعض ایسے ہیں جو جلدی غصہ ہو جاتے ہیں اور دیر سے لوٹ جاتے ہیں (یعنی غصہ سے) آگاہ رہو! کہ ان میں سب سے اچھے وہ ہیں جو دیر سے غصہ ہوں اور جلدی باز آجائیں اور ان میں بُرے وہ ہیں جو جلدی غصہ ہوں اور دیر سے باز آجائیں، باخبر رہو! کہ ان میں بعض ایسے ہیں جو ادائیگی میں بھی اچھے ہیں اور مطالبے میں بھی اچھے ہیں جبکہ بعض ان میں سے ادائیگی میں اچھے نہیں طلب میں اچھے ہیں، بعض ان میں سے دینے میں اچھے ہیں مانگنے میں اچھے نہیں ہیں پس ایک حالت دوسری کا بدلہ ہے، خبردار! بعض ان میں ایسے ہیں جو دینے میں بھی اچھے نہیں اور مانگنے میں بھی اچھے نہیں ہیں خبردار! ان میں

سب سے اچھے وہ ہیں جو دینے اور مانگنے دونوں میں اچھے ہوں، اور باخبر رہو! کہ ان میں بُرے وہ ہیں جو ادا کرنے میں بھی بُرے ہوں اور حق مانگنے میں بھی بُرے ہوں۔

خبردار! کہ غصہ آدمی کے دل میں ایک چنگاری (کی مانند) ہے کیا تم نے (دوران غصہ) اس کی آنکھوں کی سرخی اور گردن کی پھولی ہوئی رگیں نہیں دیکھیں پس جو شخص تھوڑا سا غصہ بھی محسوس کرے تو وہ زمین سے لگ جائے (مثلاً لیٹ جائے) حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم سورج کی طرف دیکھنے لگے کہ اس کا کچھ حصہ باقی ہے؟ (یعنی سارا غروب ہوا یا کنارہ ابھی افق کے اوپر ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باخبر رہو کہ دنیا کے گذشتہ زمانے کے مقابلے میں اتنی ہی زندگی باقی ہے جتنا تمہارے آج کے دن کا باقی ماندہ حصہ ہے گذرنے والے حصے کے مقابلے میں۔

لغات مع تشریح:۔ قولہ "ان الدنیا خضرة حلوة" الخ خضرة بفتح الخاء وکسر الضاد جبکہ حلوہ بضم الحاء وسکون اللام وفتح الواو ہے، اول کے معنی ہرے اور سبز کے ہیں جو دل کشی وجاذبیت سے کنایہ ہے کہ سرسبز منظر حسین لگتا ہے، اور حلوۃ سے مراد لذیذ ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا بظاہر بھی خوب صورت لگتی ہے اور نفس بھی اسے اچھا سمجھتا ہے، اب تم لوگ اس دنیا کے باسی اور حکمران بنادیئے گئے ہو مگر اس کی لذات میں انہاک سے بچو، اس کی محبت سے دور رہو، بس ضرورت کے تحت اسے حاصل کرو، غرض ومقصد سمجھ کر اس کے پیچھے مت لگو کہ اس میں آپ کا امتحان لیا جا رہا ہے، پھر آپ علیہ السلام نے خاص الخاص فتنے کا ذکر بطور خاص بعد العام کر کے فرمایا کہ عورتوں سے بچو یعنی ان پر دین قربان کرنے سے بچو، کہ اس سے مقصد اصلی فوت ہو جائے گا، تفسیر خازن میں ہے:

"لان الجمع بین لذات الدنیا والآخرة غیر ممکن فمن اشتغل بتحصیل لذات الدنیا فاتته لذات الآخرة"۔ (جلد نمبر ۱ ص ۶۴ تحت آیة "أولئك الذين اشتروا الحياة الدنيا بالآخرة" من سورة البقرة)

قولہ "ألا لا تمنعن رجلاً هيبة الناس الخ" یعنی حق بات کہنے کے لئے نقصان اٹھانا پڑے تو برداشت کرلیا کرو مگر لوگوں تک حق ضرور پہنچاؤ تاکہ قیامت کے دن کوئی لاعلمی کا عذر پیش نہ کر سکے تاہم اگر امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں خطرہ زیادہ ہو جس کی وضاحت پیچھے گذر چکی ہے تب آدمی معذور ہوگا، عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"ان الخوف ان كان من اِذاية قليلة لم يسقط عندذالك فرض القول،فان كان ضرراً كثيراً تعيّن عليه ترك القول ولزمته خاصة نفسه"۔

قوله "ينصب لكل غادرالخ" یہ جھنڈا اس کی نشاندہی اور اعلام کے لئے ہوگا تا کہ لوگ اس کو بحیثیت غدار دیکھیں اور یاد کریں اور چونکہ امام عام اور حکمران کی دھوکہ دہی وغداری بہت ہی شنیع اور وسیع تر ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ حقوق ومتعلقات کی زیادہ پامالی ہوتی ہے اس لئے اس کی تشہیر جداگانہ انداز سے ہوگی تا کہ شہرت کذائی کے ساتھ اس کی ذلت بھی ہو اور خُلقِ سیءَ کے ساتھ اس کے خلق پوشیدہ کا بھی اظہار ہو۔

قوله "آلاان بنى آدم خلقوا على طبقات شتىٰ الخ" شتیت کی جمع ہے بمعنی مختلف کے جیسے مرضیٰ جمع مریض، آپ علیہ السلام نے لوگوں کے مختلف درجات وطبقات بتائے اور بلاشبہ حقیقت بھی یہی ہے کہ سب لوگ برابر نہیں ہوتے، ہر دور میں دیکھا جاسکتا ہے کہ کوئی آدمی انتہائی خودغرض اور شریر ہوتا ہے جبکہ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو خیر رسانی کے جذبے سے لبریز وسرشار ہوتے ہیں، شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر فلسفیانہ بحث فرمائی ہے، تفصیل تو وہاں دیکھی جاسکتی ہے، تاہم آسان لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح سارے درخت یعنی نباتات مساوی نہیں اور نہ ہی تمام جاندار ایک جیسے ہوتے ہیں بلکہ ہر نوع کے افراد بھی یکساں نہیں ہوتے، ایسا ہی حال انسانوں کا بھی ہے، انسانیت کی سطح زمین بلکہ جانوروں سے شروع ہوتی ہے اور درجہ بدرجہ یہ سلسلہ عرش معلیٰ یعنی ملأ بالا تک پہنچتا ہے۔ (تدبر وتشکر)

اس حدیث میں غصے کو انگارے سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ غصہ حرارت غریزہ کا اثر ہے جب آدمی خلاف طبع بات سنتا ہے یا خلاف مرضی کوئی چیز دیکھتا ہے تو اس حرارت میں ارتعاش پیدا ہوجاتا ہے اس لئے اس کا علاج پانی سے کیا جاتا ہے خواہ وہ پیئے یا وضوء کرے اور چونکہ کبھی غصہ تکبر کی وجہ سے بھی آتا ہے اس لئے زمین پر لیٹنے سے بھی وہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے کہ زمین میں تواضع وخاکساری ہے اور صحبت کا اثر تو ہوتا ہی ہے اس لئے ان ہر دو طریقوں سے غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے، حُبِّ دنیا اور غصہ کی مزید تفصیل درکار ہو تو راقم نے "نقش قدم" میں دی ہے۔ فلیراجع

باب ماجاء فی اهل الشام

”عن معاویة بن قُرَّةَ عن ابیه قال قال رسول الله صلی الله علیه و سلم:اذافسداهل الشام فلاخیرفیکم لاتزال طائفة من امتی منصورین لایضرهم من خذلهم حتی تقوم الساعة“۔[1] (حسن صحیح)

حضرت معاویہ بن قرہ اپنے والد قرہ بن ایاس المزنی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب شام کے لوگ بگڑ جائیں گے تو پھر تم میں بھی خیر نہیں بچے گی، میری امت کی ایک جماعت (ضرور) ہمیشہ منصور (مدد کی ہوئی) رہے گی وہ لوگ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے جو ان کی مدد کرنا چھوڑ دیں گے تا آنکہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

لغات:۔قولہ ”منصورین“ جن کی من جانب اللہ غیبی مدد کی جاتی رہے گی جس سے ان کے حوصلے بلند رہیں گے اور مکارہ و آزمائشوں پر صبر کرتے رہیں گے اس طرح ان کا کام جاری رہے گا اگر چہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں۔قولہ ”من خذلهم“ جو ان کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے اور مدد کرنا بند کر دیں گے جیسا کہ موجودہ حالات میں مشاہدہ عام ہے۔

تشریح:۔اس حدیث میں اہل شام کی منقبت کا ذکر ہے اور یہ کہ جب شام والے بگڑ جائیں تو پھر باقی لوگوں میں بھلائی کی موجودگی ختم ہو جائے گی، اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ چونکہ شام مجاہدین کی ارض ہے اور مجاہدین کے فساد کے بعد دنیا میں خیر و بھلائی کا ناپید ہونا لازمی بات ہے، کسی نے کہا کہ شام مرکز حکومت ہے اور حکام کی خرابی رعیت کی تباہی ہے۔

مگر جو وجہ ابن خلدونؒ نے مقدمہ میں لکھی ہے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، یہ بنیادی طور پر جغرافیائی تاثیرات سے تعلق رکھتی ہے، یہاں اس کا انتہائی مختصر خلاصہ پیش ہے:

”علامہ عبدالرحمٰن بن خلدونؒ ہفت اقلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ چوتھی اقلیم تمام آباد علاقے میں سب سے زیادہ معتدل ہے اور اسے گھیرے ہوئے تیسری اور پانچویں اقلیمیں قریب بہ اعتدال ہیں... چونکہ

باب ماجاء فی اهل الشام

[1] رواه ایضاً احمد ص: ۴۵۹ ج:۴ حدیث: ۱۵۱۷۰ وفیه: ولم تزال طائفة الخ.

عراق وشام تمام دنیا میں وسط میں ہیں اس لئے یہ اعتدال میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں... اور ان معتدل اقالیم کے باشندے انتہائی کامل ہوتے ہیں... انبیاء کرام انہی لوگوں میں بھیجے جاتے ہیں جو نوع انسان میں اپنی پیدائش واخلاق کے اعتبار سے انتہائی کامل ہوتے ہیں.... انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے پاس سے جو شریعت لے کر آئیں اسے یہ لوگ برضا ورغبت قبول کرتے ہیں۔ (تیسرا مقدمہ اقالیم معتدلہ وغیر معتدلہ بتقدیم وتاخیر)

غرض یہ لوگ فطرت کے بہت قریب ہیں اسی وجہ سے ان میں بکثرت انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے کہ ان کا حال گویا کچھ اس طرح ہے کما قال اللہ تعالیٰ: ''من شجرة مبارکة زیتونة لاشرقیة و لاغربیة یکاد زیتها یضيء ولولم تمسسه نار، نورعلیٰ نور ''۔ (النور آیت نمبر: ۳۵) پس جب معتدل لوگ بے اعتدالی وبگاڑ کا شکار ہوں گے تو اندازہ لگائیں کہ باقی اقالیم کا حال کیا ہوگا؟ اگر آپ کا ذہن کسی اشکال کی طرف جائے تو اس کے جواب کے لئے حوالہ بالا مطالعہ کیجئے۔

ملحوظ:۔ اس قسم کی احادیث میں قیامت تک کے الفاظ کا مطلب تا قیام قیامت نہیں لینا چاہئے بلکہ قیامت کا قرب لینا چاہئے یعنی وہ وقت جس کے بعد دوبارہ اصلاح نہ ہوگی بلکہ یہ ارضی کشتی ڈوب ہی جائے گی۔

رہا یہ مسئلہ کہ یہ طائفہ منصورہ جس کا یہاں ذکر آیا ہے کون ہے؟؟؟ اس سے کون لوگ مراد ہیں تو امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ سے نقل کیا ہے''قال علی بن المدینی: هم اصحاب الحدیث ''۔ اسی طرح اور بھی بہت سارے اقوال ہیں: کسی نے کہا کہ مراد فقہاء ہیں، کسی نے مجاہدین کو اس کا مصداق بنایا ہے اور کسی نے صوفیاء کرام کو، مگر سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اہل حق مراد ہیں خواہ وہ کسی بھی نام سے یاد کئے جائیں۔

بابٌ لاترجعوا بعدی کفاراًیضرب بعضکم رقاب بعض

''عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لاترجعوا بعدی کفاراًیضرب بعضکم رقاب بعض''۔[1] (حسن صحیح)

باب لاترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض

[1] ایضاً رواه البخاری ص: ۱۰۴۸ ج: ۲ ''باب قول النبی ﷺ لاترجعوا بعدی الخ'' کتاب الفتن، ایضاً رواه فی کتاب العلم باب: ۴۳، وفی الحج باب: ۱۳۲ وفی المغازی باب: ۷۷، وفی الاضاحی باب: ۵، ادب باب: ۹۵، حدود باب: ۹، صحیح مسلم کتاب الایمان، سنن نسائی تحریم باب: ۲۹، سنن ابن ماجه باب: ۵ ابواب الفتن، سنن دارمی ص: ۹۵ ج: ۲ حدیث: ۱۹۲۱ عن جریر بن عبداللہؓ، مسنداحمد ص: ۳۸۱ ج: ۱ حدیث: ۲۰۳۷، ایضاً ص: ۶۶۴ ج: ۱ حدیث: ۳۸۰۵.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے بعد کفار مت بننا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

تشریح:۔ "لاتـرجـعـوا" بمعنی لاتـصـيـروا کے ہے اور بعدی یعنی میری وفات کے بعد۔ کفاراً یعنی کالکفار یا ایک دوسرے کی تکفیر مت کرو کیونکہ اس سے تم ایک دوسرے سے قتال میں پڑ جاؤ گے" "وقيل المراد كفران النعمة"۔ (کذافی حاشیۃ البخاری جلد اول ص:۲۳۴) یضرب کو مجزوم پڑھنا بھی جائز ہے کہ جواب نہی ہے یا باء اول ثانی میں مدغم ہے، اور رفع بھی جائز ہے کہ جملہ محل صفت میں واقع ہے یا جملہ بدل عن الجملہ ہے۔ (کذافی العارضۃ) غرض یضرب یا حال وغیرہ بن کر ماقبل سے متعلق ہے یا جملہ متانفہ ہے۔

خلاصۃ المرام یہ ہے کہ میرے بعد تم لوگ ایمان واسلام پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کفار کی مشابہت خصوصاً مقاتلہ سے بچتے رہو کہ اس سے دین بھی خراب ہوگا اور دنیا بھی۔

باب ماجاء انه تكون فتنة القاعدفيهاخير من القائم

"عن بُسربن سعيدان سعدبن ابى وقاص قال عندفتنة عثمان بن عفان اشهدان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال:انهاستكون فتنة القاعدفيهاخيرمن القائم والقائم خيرمن الماشى، والماشى خيرمن الساعى،قال اَفَرَأيتَ ان دخل عَلَىَّ بيتى وبسط يده اِلَىَّ لِيقتلنى؟قال كُن كَابِن ادم"۔[1] (حسن)

بسر بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) کے فتنے کے وقت فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ بات یہ ہے کہ عنقریب ایک ایسا (ہولناک) فتنہ ہوگا کہ اس میں بیٹھا رہنے والا کھڑے ہوئے شخص سے بہتر ہوگا اور کھڑا شخص چلنے والے سے افضل ہوگا اور چلنے والا تیز رَو سے بہتر ہوگا حضرت سعدؓ نے عرض کیا بتایئے (یعنی میری رہنمائی کیجئے) اگر کوئی شخص (فتنہ باز) میرے خلاف میرے گھر میں داخل ہو کر اپنا ہاتھ میری طرف

باب ماجاء فتنة القاعد فيها خير من القائم

[1] روى بمعناه البخارى ص:۵۰۸ ج:۱ كتاب المناقب، وص:۱۰۴۸ ج:۲ كتاب الفتن، صحيح مسلم ص:۳۸۹ ج:۲ كتاب الفتن، سنن ابى داؤد ص:۲۳۵ ج:۲ "باب النهى عن السعى فى الفتنة" كتاب الفتن، سنن ابن ماجه ص:۳۸۵ ابواب الفتن باب:۱۰.

بڑھائے تاکہ مجھے قتل کرڈالے (تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن آدم (ہابیل) کی طرح بن جاؤ۔

تشریح:۔اس حدیث کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ شروفساد میں جس کا حصہ جتنا کم ہوگا وہ اس شخص کی بنسبت افضل ہوگا جواس میں زیادہ سرگرم ہو کیونکہ ثواب وعقاب بقدر اعمال ہوتے ہیں علی ہذا ان سب لوگوں کوشریک تصور کیا جائے گا مگر قاعد کا حصہ قائم سے کم اور قائم کا ماشی سے کم اور ساعی سب سے زیادہ ہے۔

دوسرا مطلب جوکہ اظہر ہے، یہ ہے کہ فتنے سے جوشخص جتنا دور ہوگا وہ اتنا ہی محفوظ ہوگا پس قاعد تو اس لئے بہتر ہے کہ وہ بالکل لاتعلق ہے جبکہ قائم سے مراد تماشا دیکھنے والا ہے اور یہ بھی ایک گونہ شرکت ہے تو جس طرح گناہ کرنا جرم ہے اسی طرح گناہ کرنے والوں کا تماشا دیکھنا بھی حسب گناہ جرم وقبیح ہے جبکہ گناہ وفتنے کی طرف آہستہ و پیدل چلنے والا دوڑ کر شامل ہونے والے سے افضل ہے کہ دوڑنے والا زیادہ سرگرم ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر فتنہ گھر کے اندر داخل ہوجائے تب بھی آدمی کو اپنا دفاع نہیں کرنا چاہئے بلکہ حضرت ہابیل کی طرح عزیمت پر عمل کرتا ہوا جام شہادت خاموشی سے نوش کرلینا چاہئے جبکہ بعض دیگر روایات [۲] اور فقہاء کی عبارات سے اپنے دفاع کا حق ثابت ہے، بظاہر یہ تعارض ہے۔

اس کا جواب حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے الکوکب الدری میں یوں دیا ہے کہ اگر اپنے دفاع میں کسی بڑے فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر دفاع کرے اور اگر خطرہ ہو تو پھر دفاع کئے بغیر خوشی سے یا ناخوشی سے موت کو گلے لگالے، لہٰذا دفاع کے جواز کی روایات عدم فتنے کی صورت پر محمول ہیں جبکہ باب کی روایت فتنے کے برپا ہونے کے اندیشے پر، مثلاً اگر آدمی سمجھتا ہے کہ اگر میں اپنے دفاع میں گولی چلاؤں تو حملہ آور میرے گھر کو بارود سے اڑادیں گے جس سے میرے علاوہ اہل خانہ بھی نشانہ بن جائیں گے، یا مجھے قتل کرکے گھر والوں کو قیدی بنالیں گے اس طرح ان کی ایذاء وآبروریزی کا سبب میں بن جاؤں گا تو پھر کوئی مزاحمت نہ کرے، غرض اہون البلیتین کو اختیار کرلینا چاہئے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

---

[۲] كذا في مسند احمد ص:۷۷ ج: حديث: ۱۲۵۲۶.

باب ماجاء ستکون فتنة کقطع اللیل المظلم

"عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: بادروا بالاعمال فِتَناً کقِطَعِ اللیل المظلم یُصبِحُ الرجل مؤمناًویُمسی کافراًویُمسی مؤمناًویُصبح کافراً،یبیع احدُهم دینَه بعرض من الدنیا"۔[1] (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال (صالحہ) سرانجام دینے میں جلدی کرو ایسے فتنوں کی آمد سے پہلے پہلے جو تاریک رات کی مانند ہوں گے آدمی صبح مؤمن اٹھے گا اور شام کو کافر بنے گا اور شام کو مؤمن ہوگا تو صبح کو کافر اٹھے گا، ان میں سے ایک اپنا دین دنیاوی مال ومتاع کے عوض بیچے گا۔

لغات: ۔قوله"بادروا"ای سارعوا و سابقوا یعنی شتابی وجلدی کرو۔قوله"بالاعمال"الف لام عہد کے لئے ہے، مراد اعمال صالحہ ہیں، ای بالاشتغال بالاعمال الصالحة ۔قوله"کقطع"بکسر القاف وفتح الطاء قطعة کی جمع ہے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔قوله"المظلم"بصیغۂ اسم فاعل، ظلمت اندھیرے کو کہتے ہیں۔قوله"فتناً" بفتح التاء فتنة کی جمع ہے۔

تشریح: ۔اس حدیث میں فتنوں کی تشبیہ تاریک اور اندھیری رات کے ساتھ دی گئی ہے اور رات بھی ایسی جس میں جوق درجوق اندھیروں کا ہجوم ہو، ظاہر ہے ایسے میں بصارت کام نہیں کرسکتی ہے ایسا ہی ان فتنوں میں بصیرت فیل اور اندھی سی ہوجائے گی اور کچھ معلوم نہ ہوگا کہ حق کون سا ہے اور باطل کون سا؟ ایسے میں ذہنی انتشار اور پریشانیوں کی بھرمار ہوتی ہے اور اعمال کی طرف توجہ کم یا کم از کم دلجمعی ختم ہوجاتی ہے، مثلاً نماز باجماعت دشوار ہوجائے گی، حج کرنا مشکل بن جائے گا وغیرہ وغیرہ، لہٰذا ان حالات کے پیش آنے سے پہلے ہی عمل تیز کرو مثلاً ایک آدمی یہ سوچتا ہے کہ عمر کے اخیر میں حج کرلوں گا تو اول تو زندگی کی کوئی ضمانت نہیں، دوم حالات کا کیا بھروسہ شائد چندسال کے بعد حالات نامساعد بن جائے۔

پھر آپ علیہ السلام نے ان حالات کی ایک جھلک ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ ایک آدمی صبح کو مؤمن ہوگا مگر شام کو کافر بن جائے گا الخ اس ارشاد کا صحیح مطلب تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر جو کچھ ظاہری مطلب ہوسکتا ہے

باب ماجاء ستکون فتنة کقطع اللیل المظلم

[1] ایضاً رواه مسلم ص: ۷۵ ج: ۱ "باب الحث علی المبادرة بالاعمال الخ" کتاب الایمان ورواه الترمذی فی الزهد باب: ۳۔

وہ امام ترمذیؒ نے اسی باب میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ صبح وہ اپنے مسلمان بھائی کا خون اورآبرواور مال محترم سمجھے گا مگر شام کو یہ چیزیں حلال سمجھنے لگے گا یعنی صبح کامل مؤمن ہوگا تو شام کوایمان کا کمال اڑ جائے گا، یا مطلب یہ ہے کہ وہ کافروں والاعمل شروع کردے گا یا کافروں کی طرح طرز زندگی اپنالے گا۔

المسترشدعرض کرتا ہے کہ روایت میں کافر کے لفظ کومعنی حقیقی واصلی پرمحمول کرنے میں بھی کوئی زیادہ قباحت نظرنہیں آتی کیونکہ دورحاضر میں ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسے لوگوں کودیکھا جن کے نظریات ایک ہی دن میں تبدیل ہوگئے، ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے سے پہلے (جونائن الیون کے واقعہ سے مشہور ہے) لوگوں کے ایمانی جذبات اچھے تھے مگر جیسے ہی امریکی صدر کا پاکستانی صدر پرویز مشرف کودھمکی آمیزفون آیا تو پورے ملک کی پالیسی بھی تبدیل ہوگئی اوراکثریت کا رویّہ بھی یکسر پلٹ گیا، اس سے اندازہ لگانا آسان ہوجاتا ہے کہ جب دجال کا فتنہ اوراس سے پہلے دوسرے فتنے آئیں گے تو یقیناً ایسی مثالیں دیکھنے کوملیں گی۔ پھراس کامزید بیان کرتے ہوئے آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ آدمی اپنا ایمان معمولی دنیاوی متاع کے عوض بیچے گا۔

آج کل ایمان کی جوحالت ہے اورعام لوگوں کے دلوں میں اس کی جوقدرہے اس کے تناظر میں اس جملے کوظاہر پرمحمول کرنا آسان لگتا ہے اورکسی قسم کی تاویل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ آج معمولی فیشن کا مقام ایمان کے مقام سے اونچا سمجھا جاتا ہے، ایک بازاری عورت یا بازاری مرد کے سامنے کوئی ایسی حدیث بیان کرنا جواس کی خواہش کے منافی ہوخواہ وہ فیشن سے متعلق ہو یا مال ونوکری سے کوئی مؤثر حیثیت نہیں رکھتی بلکہ بہت سے لوگ تو حدیث کومانتے نہیں اورقرآن میں مرضی کی تاویلات کرتے ہیں جس کے پیچھے دنیوی متاع کالالچ ہوتا ہے، بے شمارلوگ ایسے ہیں جودنیا کے لئے آغاخانی بن گئے، لاتعداد قادیانی بن گئے اوربہت سے روشن خیال بن گئے یہاں تک کہ اہل علم میں بھی فتوی بیچنے والے پیدا ہوگئے گویا کسی نے پورادین فروخت کیا اورکسی نے اس کے حصے بیچ دیئے ہیں مگر پھر بھی اللہ کا شکر ہے آج تک اہل حق علماء بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ اکابر علمائے دیوبند کوجزائے خیرعطافرمائیں جن کی محنت کے ثمرات تاحال باقی ہیں جن کی بدولت ہم محفوظ ومستفید ہورہے ہیں۔

حدیث آخر:۔ "عن ام سلمة ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم:استیقظ لیلة فقال سبحان اللّٰہ ماذاانزل اللیلة من الفتنة،ماذاأُنزل من الخزائن من یُوقِظُ صواحب الحجرات یارُبَّ کاسِیَةٍ فی

الدنیا عاریة فی الآخرة"۔ [۲] (حسن صحیح)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات (نیند سے) بیدار ہوئے تو فرمایا سبحان اللہ! کس قدر فتنے آج رات نازل کئے گئے اور کس قدر خزانے نازل کئے گئے ہیں کون ہے جوان حجروں والیوں کو جگادے دنیا میں بہت سی آراستہ آخرت میں برہنہ ہوں گی۔

لغات:۔قولہ "ماذا اُنزل" الخ بصیغۂ مجہول اس میں ما استفہامیہ تعجب اور تفخیم کے لئے ہے۔قولہ "یارب" منادی محذوف ہے تقدیریہ یا سامعین! جبکہ رُبَّ تکثیر کے لئے ہے۔قولہ "کاسیة" کسی یکسی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے کاسیہ لباس پہنے ہوئی کو کہتے ہیں جو "عاریة" کے مقابل ہے، عاریة کے اعراب میں دو احتمال ہے، جر بھی جائز ہے کاسیة کے تابع (صفت) ہونے کی وجہ سے، اور رفع بنا بر خبریت بھی صحیح ہے ای ھی عاریة فی الآخرة۔

تشریح:۔حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یا بواسطۂ ملائکہ بتایا گیا کہ مستقبل میں فتنوں اور خزانوں کا نزول ہونے والا ہے، فتنوں سے تو مراد ہلا دینے والے واقعات اور نت نئی ایجادات وغیرہ اوزان پر مرتب عذاب ہے جبکہ خزانوں سے مراد رحمتیں بھی ہوسکتی ہیں اور روم وفارس کے خزانے بھی ہوسکتے ہیں، چونکہ فتنوں کے پیش آنے کی صورت میں انابت الی اللہ میں تیزی لانے کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور تبلیغ وتعلیم اور دفع مضرت میں اپنے نفس واہل خانہ اور قرب وجوار سے آغاز کرنا چاہئے اس لئے فرمایا کہ کون ہے؟ جو صواحب حجرات یعنی امہات المؤمنین کو جگادے، لہٰذا اس کلام کا رخ امہات المؤمنین کی طرف نہیں ہے۔اور یہ جو فرمایا کہ "یارب کاسیة فی الدنیا عاریة فی الآخرة" تو اگرچہ یہ حکم عام ہے مردوں کو بھی شامل ہے مگر عورتیں اس میں پیش پیش رہتی ہیں اس لئے ان کی تخصیص فرمائی کہ عورتوں کے مزاج میں ریاکاری، تفاخر اور نمائش کا تناسب مردوں سے زیادہ ہوتا ہے، ایک روایت میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے "نساء کاسیات عاریات مائلات ممیلات رؤسھن کاسنمة البخت" [۳] اگر دونوں حدیثوں کا مورد ایک مانا جائے تو پھر کہا جائے گا کہ باب کی حدیث مختصر ہے، جیسا کہ اوپر لغات کے ضمن میں عرض کیا گیا کہ کاسیة اور عاریة متضاد الفاظ ہیں اس لئے یہاں کاسیة کے جو بھی معنی مراد ہوں عاریة سے اس کے مخالف معنی مراد ہوں گے پس یا تو اس کا ظاہری مطلب مراد ہے، یا پھر مجازی معنی۔اس لئے یہاں کئی احتمالات ہوسکتے ہیں جو مندرجہ

---

[۲] رواہ البخاری ص: ۲۲ ج: ۱ کتاب العلم، ایضاً ص: ۱۰۴۷ ج: ۲ کتاب الفتن، ایضاً روی بمعناہ المالک فی المؤطا ص: ۷۰۹ کتاب الجامع. [۳] رواہ مسلم ص: ۲۰۵ ج: ۲ کتاب اللباس، مسند احمد ص: ۳۷ ج: ۳ حدیث: ۸۴۵۱.

ذیل ہیں۔

(۱)...کاسیۃ سے مراد کپڑوں میں ملبوث ہونا ہے مگر وہ کپڑے تستر کے مقصد سے خالی ہونے اور زینت کی خاطر زیب تن کرنے کی وجہ سے آخرت میں پردے کا کام نہ دیں گے، پھر محض زینت موٹے کپڑوں اور باریک دونوں سے مذموم ہے۔

(۲)... یا مراد لباس التقوی ہے مگر حقیقی تقوی نہ ہونے کی بناء پر وہ متقی آخرت میں عاری عن التقوی شمار ہوگا۔

(۳)...مال ودولت ودیگر نعمتوں سے مالا مال ہوں گی دنیا میں مگر ناشکری کی وجہ سے آخرت میں شکر کے ثمرات سے محروم ہوں گی۔

(۴)... بظاہر ازدواج کے لباس میں مستور ہوں گی مگر اغیار کی یاری اور شوہر کے ساتھ مکاری وعیاری کی وجہ سے آخرت میں سب مکر وفریب اور زنا سے پردہ اُٹھ جائے گا۔

پھر جس روایت میں مائلات ممیلات الخ کا اضافہ ہے اس کی تشریح میں ابن العربیؒ نے عارضہ میں متعدد احتمالات ذکر کئے ہیں مثلاً چلنے میں دائیں بائیں جھکاؤ، یا چادر اور دوپٹہ کو چہرے سے ہٹانا، یا اپنی باتوں میں مٹھاس ظاہر کرنا وغیرہ جس سے دوسرے کے دل ان کی طرف مائل ہوں تاہم اپنے گھر میں شوہر کا دل جیتنے اور لبھانے کے لئے یہ جائز ہے، عارضہ میں ہے: ''ومعناه ان المرأة اذا كانت فى بيتها مع زوجها فليس شئ من هذا مذموماً على الاطلاق '' الخ۔

باب کی آخری حدیث:۔''عن علقمة بن وائل بن حجر عن ابيه قال: سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجل يسأله فقال: اَرَأيتَ ان كان علينا أمراء يمنعونا حقنا ويسألونا حقهم؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اسمعوا واطيعوا فانما عليهم ما حُمِّلوا وعليكم ما حُمِّلتم''۔

(حسن صحيح)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا دراں حالیکہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر رہا تھا، پس اس شخص نے عرض کیا بتائے گا کہ اگر ہمارے اوپر ایسے اُمراء ہوں جو ہم سے تو ہمارا حق روکیں اور اپنا حق ہم سے مانگیں؟ (یعنی ایسے میں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سُنا کرو اور فرمانبرداری کیا کرو بے شک ان پر وہ لازم ہے جو ان پر لادا

گیا ہے (یعنی عدل وانصاف اور امن وامان وغیرہ کی ذمہ داری) اور تم پر وہ لازم ہے جو تم پر لادا گیا ہے (یعنی اطاعت ومعاونت)۔

تشریح:۔ یہ مضمون پیچھے بارہا گذرا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینا شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ امر ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نافرمانی وبغاوت اور خروج کی اجازت دیدی جائے تو اس طرح ہمیشہ کے لئے طوائف الملو کی کا راج قائم رہے گا اور مسلمان چھوٹی چھوٹی ریاستوں بلکہ ٹولیوں تک محدود ہو کر رہ جائیں گے اس لئے امام کی اطاعت کو والدین کی فرمانبرداری سے زیادہ مؤکد قرار دیا، اور بڑی حد تک ان کی زیادتیوں کو برداشت کرنے کی تلقین کی گئی، تاہم جس طرح مسلمان ماں باپ اور کافر ماں باپ کی تعمیل یکساں واجب نہیں اسی طرح عادل اور فاسق حکمرانوں میں بھی فرق ہے کہ عادل کی اطاعت موافق شریعت واجب ہے حتی کہ بعض علماء نے تو ان کے مباح احکام کو بھی واجب التعمیل قرار دیا مگر فاسق حکمرانوں کی اطاعت کا حکم ماننا گو واجب تو نہیں خاص کر جب وہ شریعت کے خلاف ہو مگر ان کے خلاف خروج بھی واجب نہیں بلکہ آج کل تو یہ کہنا چاہیئے کہ جائز ہی نہیں کیونکہ آج بارود کا دور ہے اور خروج کی صورت میں نہ صرف مرد، حکومت کے ظلم کا شکار بن جاتے ہیں بلکہ عورتیں اور بچے بھی اس کی زد میں آتے ہیں جیسا کہ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۰ء کا تجربہ سب نے دیکھا کہ حکومت پاکستان کے ہاتھوں بے شمار لوگ لقمہ اجل بن گئے یا غائب ہو گئے یا فروخت کئے گئے، بنابریں جب تک کفر بواح نہ ہو تو صبر کا دامن تھامنا ہی عقلمندی ہے تا کہ یہ مقولہ صادق نہ آئے: ''کمن بنا قصرا وهدم مصراً''۔ مزید تفصیل پہلے گذری ہے اس سے بھی زیادہ درکار ہو تو ''المسائرہ اور المسامرہ'' وغیرہ دیکھیں۔

باب ماجاء فی الهَرْج

''عن ابی موسیٰ قال قال رسول صلی اللّٰہ علیه وسلم: ان مِن ورائکم ایّاماً یُرفع فیها العلمُ ویکثر فیها الهرج قالوا: یارسول اللّٰہ اما الهرج؟ قال: القتل''۔[1] (حسن صحیح)

باب ماجاء فی الهرج

[1] ایضاً رواہ البخاری ص: ۸۹۲ ج: ۲ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۳۴۰ ج: ۲ ''باب رفع العلم وقبضه الخ'' کتاب العلم، سنن ابن ماجه ص: ۲۹۳ ''باب ذهاب القرآن والعلم'' ابواب الفتن، مسنداحمد ص: ۶۴۳ ج: ۱ حدیث: ۳۶۸۷، ص: ۵۱۴ ج: ۲ حدیث: ۷۴۹۶.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے بعد ایسے دن ہوں گے جن میں علم اٹھالیا جائے گا اور ہرج (قتل یا فجور) بڑھ جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ''ہرج'' کیا ہے؟ فرمایا ''قتل''۔

لغات: قولہ ''الھرج'' اس کی تفسیر و مراد وہی ہے جو خود ہی حدیث میں آئی ہے یعنی باہمی قتل و قتال، تاہم بعض روایات میں ہرج کا اطلاق فسق و فجور پر بھی ہوا ہے جیسا کہ ترمذی ''باب ماجاء فی فتنۃ الدجال'' کی ایک لمبی حدیث کے ضمن میں آرہا ہے: ''ویبقیٰ سائرالناس یتھارجون کمایتھارج الحمرفعلیھم تقوم الساعۃ''۔[۲] (ص:۴۹) غرض لغت میں اضطراب کو کہتے ہیں، قتل اس کا کامل فرد ہے، حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے دونوں روایتوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ اگر بارہ ائمہ سے مراد قوت اسلام کا زمانہ لیا جائے تو پھر مطلب یہ ہے کہ اسلام کی قوت و شوکت کی کمزوری کی صورت میں باہمی قتل و قتال عام ہو جائے گا: ''فعلی ھذاالتاویل یکون المرادبقولہ ''ثم یکون الھرج'' یعنی القتل الناشی عن الفتن وقوعاً ناشیاً ویستمر ویزداد وکذاکان''۔

اور اگر بارہ ائمہ سے مراد نفس اسلام کے پھیلے ہوئے زمانے پر منقسم دَور لیا جائے تو ''علی ھذا فالمراد بقولہ ''ثم یکون الھرج'' ای الفتن المؤذنۃ بقیام الساعۃ من الخروج الدجال ومابعدہ ''انتھیٰ ای کلام ابن حجر۔ (تاریخ الخلفاء ص:۹، ص:۱۰)

تشریح: بعض نسخوں میں ترجمۃ الباب اس طرح ہے: ''باب الھرج والعبادۃ فیہ'' یہ حدیث بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا ہی فرمایا تھا ویسا ہی ہوا کہ علم گھٹ گیا اور قتل و غارت کا بازار خوب گرم ہے، علم کے رفع کی صورت تو یہ ہے کہ جب بھی کوئی عالم وفات پاتا ہے تو اس کے پیچھے رہ جانے والے خلاء پُر کرنے کے لئے کوئی نہیں ہوتا اس طرح مسلسل گراوٹ ہمارے مشاہدے میں ہے اور جب علم نہ رہے اور اس پر عمل نہ ہوگا تو لازمی بات ہے کہ جہل بڑھے گا اور زمانۂ جاہلیت کا دَور دوبارہ شروع ہوگا کیونکہ جاہلیت زمانے کے کسی مخصوص وقفے کا نام نہیں بلکہ ذہنی و دماغی فطور کا نام ہے کہ جب وہ معیار قائم نہیں رہے گا جو دین اسلام نے قائم کر رکھا تھا تو کہا جائے گا کہ جاہلیت کا دور آگیا، اور انسانی سوچ پھر جاہلیت کی تاریکی میں ڈوب گئی۔

---

[۲] ایضاً رواہ ابن ماجہ ص:۲۹۷ ''ابواب الفتن'' وفیہ: کماتتھارج الحمر الخ۔

ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ امت قتل وغارت گیری سے معصوم ومامون تھی مگر جب اس کے امام حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا تو فتنوں کا بند دروازہ کھول دیا گیا: ''وقد قال لهم عبدالله بن سلام: لاتسلّواسيف الفتنة المغمود عنكم''۔

ایسی صورت حال میں کہ جب اصلاح ممکن نہ ہو کیا کرنا چاہئے اس کو اگلی حدیث میں بیان کیا گیا ہے: ''العبادة فی الهرج کهجرة اِلیّ''۔ [۳] (حسن صحیح) ''فتنوں میں عبادت ایسی ہی ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنا''۔ ابن العربیؒ اس تشبیہ کی وجہ بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ پہلے لوگ دین کی حفاظت کی خاطر ہجرت کرکے دارالکفر سے دارالایمان کی طرف جاتے تھے مگر جب فتنے ہوں (یعنی کوئی جگہ محفوظ نہ رہے) تو اس وقت تحفظ دین کی خاطر لوگوں سے الگ ہو کر عبادت کرنا متعین ہوجاتی ہے جو ہجرت کی ایک قسم ہے، سند میں ''ردّہ'' بمعنی نَسَبَہ ہے یعنی اس کو منسوب کیا۔

حدیث آخر:۔ ''عن ثوبان قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذاوضع السیف فی امتی لم یرفع عنهاالی یوم القیٰمة''۔ [۴] (صحیح)

جب میری امت کے درمیان تلوار رکھ دی جائے گی (یعنی چلنے لگے گی) تو قیامت تک اٹھائی نہیں جائے گی۔

تشریح:۔ کیونکہ ہر گناہ کا یہ ضابطہ ہے کہ آدمی جب تک اس سے دور رہتا ہے تو اس کی شناعت، بُرائی اور ہولناکی وبدانجامی کا تصور ذہن پر غالب رہتا ہے مگر ایک دو دفعہ اس کے ارتکاب سے اس کا خوف ختم ہوجاتا ہے اور وہ عام معمولات زندگی کی طرح زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے علی ہذا جب قتل کا اقدام کیا جاتا ہے تو اس کے بعد اس علاقے یا قوم میں قتل فروغ پاتا ہے۔ والعیاذ باللہ

---

[۳] ایضاً رواہ مسلم ص:۴۰۶ ج:۲ ابواب الفتن، سنن ابن ماجہ ص:۲۸۷ ''باب الوقوف عندالشبهات'' ابواب الفتن، مسنداحمد ص:۶۶۰ ج:۵ حدیث:۱۹۷۸۷ ولفظه: العمل فی الهرج کهجرة الیّ.

[۴] رواہ ایضاً ابوداؤد ص:۲۳۳ ج:۲ کتاب الفتن والملاحم، سنن ابن ماجہ ص:۲۸۳ ابواب الفتن: واذا وضع السیف فی امتی فلم یرفع عنهم الی یوم القیامة، مسنداحمد ص:۱۰۴ ج:۵ حدیث:۱۶۶۶۶ عن شداد بن اوس.

باب ماجاء فی اتخاذالسیف من خشب

"عـن عُدیسة بنت اُهبان بن صیفی الغِفاری قالت جاء علی بن طالب اِلیٰ اَبی فدعاه الی الخروج معه فقال له ابی:ان خلیلی و ابن عمك عهدالِیّ اذااختلف الناس ان اَتّخِذَ سیفاًمن خشب فقداِتّخذتُه فان شئِتَ خرجتُ به معك ؟قالت فتَرَکه"۔[۱] (حسن غریب)

حضرت عُدیسہ (بالتصغیر) فرماتی ہیں کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) میرے والد (یعنی اُھبان بن صیفی رضی اللہ عنہ) کے پاس آئے اوران کو اپنے ہمراہ نکلنے (یعنی جنگ کرنے) کی دعوت دی تو میرے والد نے ان سے کہا کہ میرے دوست اورآپ کے چچازاد بھائی نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ جب لوگ آپس میں اختلاف کرنے لگیں تو میں لکڑی کی تلوار بنالوں، پس میں نے وہی بنائی ہے پس اگرآپ چاہیں تو اسی کو لیئے آپ کے ساتھ نکلوں؟ فرماتی ہیں کہ انہوں (حضرت علیؓ) نے ان کو (میرے والد کو) چھوڑ دیا۔

تشریح:۔ حضرت اُھبان (برزن نعمان) رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے لکڑی کی تلوار بنائی تھی جبکہ حدیث کا اصل مطلب یہ ہے کہ قتال سے اجتناب کیا جائے مگر کبھی کبھار ایسا جاتا ہے کہ راوی حدیث کے ظاہری مطلب کو بھی شامل مراد کرلیتا ہے جیسا کہ ابوداؤد[۲] میں حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت ہے:

"انـه لـمّاحَضَرَه الموتُ دعابثیاب جُدُدٍ فَلَبِسَهاثم قال سمعتُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول :"المیت یُبعثُ فی ثیابه التی یموت فیها"۔

حالانکہ محققین کے نزدیک حدیث بالا میں ثیاب، عمل سے کنایہ ہے۔

غرض فتنے کے زمانہ میں اگرچہ ہتھیار رکھنا دفاع وتحفظ کی غرض سے جائز ہے مگر اس کے غلط استعمال کا احتمال ہروقت رہتا ہے اس لئے عزیمت وبہتر یہ ہے کہ آدمی بالکل خالی ہاتھ رہے کہ مظلوم بننے میں تو کوئی حرج نہیں مگر ظالم بننا آخرت کی بربادی کا سبب ہے۔

باب ماجاء فی اتخاذ السیف من خشب

[۱] ایضاً رواه ابن ماجه ص:۲۸۴ ابواب الفتن، مسنداحمد ص:۶۴ ج:۶ حدیث:۲۰۱۴۷۔

[۲] ص:۸۸ ج:۲ "باب مایستحب من تطهیر ثیاب المیت عندالموت" کتاب الجنائز۔

دوسری حدیث:۔ "عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم:انہٗ قال فی الفتنۃ کسّروا فیھاقِسِیَّکم و قَطِّعُوا فیھااَو تارکم والْزِمُوا فیھااجواف بیوتکم و کونوا کابن ادم"۔ [۳] (ھذا حدیث حسن غریب)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ فتنے میں اپنی کمانوں کو توڑ دو اور اپنے تانت اس میں کاٹ دو اور گھروں کے اندرون کو لازم پکڑ و اور ابن ادم (ہابیل) کی طرح بن جاؤ۔

لغات:۔ قولہ"فی الفتنۃ"ای فی ایامھا وزمنھا ،یہ اگلے افعال کے لئے ظرف ہے۔ قولہ"کسروا" تکسیر سے ہے یعنی توڑ دو۔ قولہ"قِسیکم"قسی بکسر القاف والسین وتشدید الیاء،قوس کی جمع ہے بمعنی کمان کے۔قولہ"وقطعوا" یہ بھی تفعیل سے ہے،دونوں صیغے مبالغے کے لئے ہیں یعنی ضرور توڑ دو اور ضرور کاٹو یا مطلب یہ ہے کہ ریزہ ریزہ کردو۔ قولہ"اوتارکم"وتر کی جمع ہے،کمان کے تانت کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس اشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ فتنے سے گریزاں رہو بایں صورت کہ اپنے گھروں کے اندر ہی رہو کہ وہی نسبتاً سب سے محفوظ جگہ ہے،اور اگر کوئی شخص آپ پر ہاتھ اٹھائے تو تم بجائے دفاع ومزاحمت کے ہابیل کی مانند عزیمت پر عمل پیرا رہو، کیونکہ مظلوم بننا آسان اور محفوظ ترین راستہ ہے، عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ بعض شامی لوگ یوم الحرہ میں ایک غار میں ابوسعید خدریؓ کے تعاقب میں گھس گئے اور ان سے کہا کہ نکلو تو ابوسعید خدریؓ اپنی تلوار ان کی طرف پھینکتے ہوئے نکلے، پھر اس شخص نے ابوسعید خدریؓ سے پوچھا تم ابوسعید ہو؟ انہوں نے کہا''ہاں''تو وہ شخص ان کے قتل سے رُک گیا۔

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ آدمی کو دفاع کا حق ہے مگر عارضہ میں ہے کہ ایسے میں قضائے باری تعالیٰ پر صبر کرنا چاہئے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن فتنوں کی پیش گوئی فرمائی تھی وہ آج اسی رنگ میں سامنے آگئے اور اسلامی دنیا میں وقفے وقفے سے یا باری باری مسلسل گردش کرتے رہتے ہیں،آج کل ہمارا ملک پاکستان شدید فتنوں کی لپیٹ میں ہے،حد یہ ہوگئی کہ ایک موبائل فون کے حصول کے لئے بھرے بازار

---

[۳] روی بمعناہ ابوداؤد ص:۲۳۵ ج:۲ "باب النھی عن الفتنۃ" کتاب الفتن، سنن ابن ماجہ ص:۲۸۵ ابواب الفتن، مسنداحمد ص:۵۵۹ ج:۵ حدیث:۱۹۱۶۳، ص:۵۷۰ ج:۵ حدیث:۱۹۲۳۱۔ حفیظ الرحمن الحنفی عفی عنہ

میں آدمی کو قتل کیا جاتا ہے اور کبھی کسی گھر یا دوکان وغیرہ میں گھس کر حقیر چیز چھیننے میں بھی جان لینے سے گریز نہیں کیا جاتا، سیاسی اغراض ومقاصد کے حصول یا قومیت وعصبیت کی خاطر قتل وقتال کو تو عبادت سمجھا جاتا ہے، بعض لوگ شوقیہ طور پر بھی گولیاں چلا کر بے گناہ کا خون کرتے ہیں۔

ایسے میں اپنا دفاع کیسے ممکن ہے نہ دشمن کا تعین ہوسکتا ہے جس سے بچا جائے اور نہ ہی وضاحت کرنے کا موقعہ ملتا ہے، اس لئے چاہئے کہ ہم ہر وقت توبہ تائب رہیں، عبادت میں سرگرم ہو جائیں اور موت کے لئے تیار رہیں تاکہ ناگہانی موت، گناہ میں نہ آئے۔ وفقنی اللہ وایاکم، وجعل الجنة مثوای ومثواکم
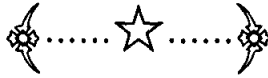
بذل المجهود في حل أبي داود

تأليف

العلامة المحدث خليل احمد السهارنفوري

(ولد سنة ١٢٦٩هـ وتوفي سنة ١٣٤٦هـ)

مع تعليقات

العلامة المحدث الشيخ محمد زكريا الكاندهلوي المدني

الجزء الأول

المحتوى:

كتاب الطهارة

الأحاديث : ١ - ١٤٨

قديمى كتب خانة

آرام باغ - كراچى

الجزء الاول

تحفة الأحوذي

للإمام الحافظ محمد عبد الرحمن المباركفوري

المتوفى ١٣٥٣ﻫ

بشرح

جامع الترمذي

ومعه

شفاء الغلل في شرح كتاب العلل

والشمائل المحمدية والخصائص المصطفوية

للإمام أبي عيسى الترمذي نفسه

حققها ووضع حواشيها

علي محمد معوض و عادل احمد عبد الموجود

قديمی کتب خانہ ـ مقابل آرام باغ ـ کراچی